سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۴) شمارہ (۲)
فبروری ۱۹۴۱ء

سب رس

جلد ۴ — بابت فبروری ۱۹۴۱ء — شمارہ ۲

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اُردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

ارباب ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۱۹۴۰ء

یہ تصویر اردو امتحانات کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات کے موقع پر بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ بتاریخ ۸ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء لی گئی

AZAM STEAM PRESS

ارباب ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۱۹۴۰ع

پہلی صف دائیں طرف سے

ظہیر الدین احمد ام - اے - ایم - سی - ایس — معتمد شعبہ تالیف و ترجمہ
عبدالقادر سروری ایم - اے - ایل ایل - بی — معتمد شعبہ امتحانات و تنقید
سید محی الدین قادری زور ایم - اے - پی - ایچ - ڈی — معتمد عمومی ادارہ

محمد لیاقت اللہ خاں ایم - سی - ایس — نائب صدر ادارہ
نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم - اے — صدر ادارہ
نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر ایل - ایل - ڈی — سرپرست ادارہ

سید علی اکبر ایم - اے — صدر شعبہ اردو و امتحانات
خواجہ معین الدین انصاری ایم - سی - ایس — رکن مجلس انتظامی ادارہ
سید محمد آعظم ایم - اے - بی - ایس - سی (آنرز) — رکن مجلس انتظامی ادارہ
محمد سجاد مرزا ایم - اے — نائب صدر شعبہ اردو و امتحانات

دوسری صف دائیں طرف سے

خواجہ حمید الدین شاہد — مہتمم ادارہ و مدیر سب رس
شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی — نائب صدر شعبہ طلبہ
محمد عبدالقادر صدیقی ایم - اے — رکن مجلس انتظامی ادارہ
سید بادشاہ حسینی — معتمد اردو انسائکلوپیڈیا
فیض محمد صدیقی بی - اے ڈیپ ایڈ — معتمد اردو انسائکلوپیڈیا

محمد راحت اللہ خاں ایم - اے - پی - ایچ - ڈی — معتمد شعبہ زبان
عبدالمجید صدیقی ایم - اے - ایل ایل - بی — معتمد شعبہ تاریخ دکن
نواب مرزا سیف علی خاں — ناظم اعزازی کتبخانہ
سید محمد ایم - اے — معتمد شعبہ شعرا و مصنفین دکن

نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل — رکن مجلس انتظامی ادارہ
عبدالحفیظ صدیقی بی - ایس - سی — مدیر سب رس معلومات

فن تقریر

ادارۂ ادبیات اردو کے کاموں کی ہم نے ہمیشہ تعریف کی ہے، لیکن ایک مرتبہ یہ شکوہ بھی سن لیجئے کہ حال ہی میں ادارہ نے "فن تقریر" پر ایک دلچسپ کتاب شائع کرکے ہمارے ملک کے لڑکوں کی لیڈری کے اسلحہ خانے میں ایک ایسا اضافہ کردیا کہ اگر کہیں واقعی ہمارے تقریر کرنے کے شوقین نوجوانوں اور نوجوان لیڈروں نے اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو اس ملک کی تقریروں سے تھکی ہوئی دنیائے سیاست میں لیڈریت کی کچھ اور زیادہ ہلچل مچ جائے گی! ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب کی اشاعت سے اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں کہ اگر موقعہ ملا تو اس کا ایک جواب اور رد لکھ کر شائع کریں گے۔

"فن تقریر" کے متعلق اس کتاب کی اشاعت میں یہ بے بنیاد مفروضہ بھی مضمر ہے کہ گویا مولف کی رائے میں ہمارے لیڈروں اور نوجوانوں کو ابھی اس فن میں مزید تربیت کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارے ملک کی لیڈریت کے لئے یہ گمان توہین آمیز ہے!

اس کتاب میں کسی مولف یا مصنف کا نام درج نہیں کیا گیا البتہ اس کا "دیباچۂ عمومی" سید محی الدین قادری زور صاحب کا لکھا ہوا ہے، اس لئے اس خطرناک کتاب کی اشاعت کے متعلق بازپرس ان ہی سے ہونی چاہیئے! اگر اس قسم کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا تو ادارۂ ادبیات اردو "لیڈریت" کے ہر شعبہ کے لئے ایک اچھا خاصا کتاب خانہ مرتب کردے گا اور لیڈروں کی دنیا میں ہر قسم کے لیڈرانہ مفاسد کا کچھ اور اضافہ ہوجائے گا!

افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے، ہم اس خطرناک کتاب کے مندرجات پر بالتفصیل تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں تاہم اس کے بعض عنوانات پر "سرراہ" کچھ عرض کردینا ضروری ہے۔ مثلاً پہلے ہی باب میں لکھا گیا ہے کہ "ایک نہایت مفید وصف جو کسی مقرر میں ہونا چاہیئے ...... وہ فہم عامہ ہے" حالانکہ ہندستان میں ہر شخص جانتا ہے کہ ایک جادو بیان لیڈر اس صفت سے جس قدر زیادہ محروم ہوگا اسی قدر زیادہ اس کی تقریر موثر اور بلیغ ہوسکتی ہے! کوئی بڑا لیڈر اپنے "فہم خاصہ" کو کبھی "فہم عامہ" سے آلودہ کرنا گوارہ نہیں کرسکتا اور اگر وہ ایسا کرے تو اس کی لیڈری بہت مشتبہ ہوجاتی ہے!

پھر ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

اصل مقرر جب کھڑا ہوگا تو ایک سرگرم دل والے شخص کی طرح کھڑا ہوگا، بغیر مطلب کے وہ نہ بولیگا اور جب منہ کھولے گا تو اپنے پورے دل اور روح کو اپنی گفتگو میں مستغرق کردے گا۔

حالانکہ اگر صحیح طور پر لکھا جاتا تو یہ فقرہ اس طرح لکھا جاتا کہ:۔

"اصلی مقرر جب کھڑا ہوگا تو ایک اس چالاک سوداگر کی طرح کھڑا ہوگا جو ہراج میں بولیاں بلواتا ہے بغیر مطلب کے وہ بولے گا اور بولے چلا جائے گا اور جب منہ کھولے گا تو زیادہ سے زیادہ کھولے گا تاکہ اگر ضرورت ہو تو اس کے حلق میں تمام حاضرین سما جائیں"

ایک صفحہ پر یہ عنوان قایم کیا گیا ہے کہ

"طالب علم کو محنتی ہونا چاہیئے"

اس ایک ہی عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے

نظریات کس قدر غلط اور دور از کار ہیں جس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ صرف "فن تقریر" ہی تو ایک ایسا فن ہے جس میں کسی قسم کی محنت کی ضرورت نہیں، سوائے اس کے کہ موٹے موٹے الفاظ کو گھمانے اور پھرانے اور دوڑانے کی ترکیب معلوم ہو اور حلق کی رگیں مضبوط ہوں! اگر مقرر کو یہ نکتہ معلوم ہے کہ وہ ہر غلط بات کو اس شدت کے ساتھ بیان کرے کہ سامعین مرعوب ہو کر اس کو صحیح ماننے پر مجبور ہو جائیں تو پھر اس کی فنی قابلیت میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا! —— "محنت" "منطق" اور "غور" کی شرطیں جو اس کتاب کے مولف نے قائم کی ہیں، بالکل پرانے زمانے کی باتیں ہیں!

چوتھے باب میں تقریر کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں مثلاً:-

"اول لکھا ہوا پڑھنا - دوم اول لکھ لینا پھر یاد کر لینا دیکھے بغیر تقریر کرنا، سوم مضمون کا خاکہ تجویز کر کے دل میں رکھ لینا اور ادا کرنے کے وقت اور موقع پر بھروسہ کرنا - وغیرہ وغیرہ۔

اسی کے ساتھ جسم کی حرکتوں کے قلمی نقشے بھی بتائے گئے ہیں - یعنی مقرر کی "نرت" کو بھی فنی حیثیت سے منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے —— جہاں تک تقریر کرنے کے مندرجہ بالا طریقوں کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا تفصیلات دور از کار ہیں بولنے کا مضبوط ارادہ کر کے بے محابا بولے جانا بالکل کافی ہے، البتہ نرت کے طریقے ضرور مفید ہیں، چہرہ کا اتار چڑھاؤ اگر ڈاڑھی ہے تو اس کے مختلف زاویئے اور گوشے اگر مونچھیں بڑی ہیں تو ان کی جنبش شرقاً غرباً یا جنوباً شمالاً جوش کی حالت میں بعض اوقات ہونٹوں کی لرزش، ہاتھوں کی حرکت، انگوٹھے کے اشارے، آنکھوں کی گردش، جسم کا گھماؤ اور رقص غرض یہ کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے زیادہ مفصل خاکے اس کتاب میں درج ہوتے تو اس موضوع کی بہتر طریقہ پر تکمیل ہو سکتی —— ہم امید کرتے ہیں کہ کم از کم دوسرے ایڈیشن میں ابتدائی ابواب کے غیر ضروری مندرجات سے قطع نظر کر کے "نرت" کے طریقوں پر زیادہ زور دیا جائے گا تاکہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہر نو خیز مقرر بھی الفاظ اور مطالب کی کمی کو اپنے ہاتھوں، انگلیوں، آنکھوں اور ٹانگوں کی اضطراری کیفیتوں سے پورا کرنے پر قادر ہو جائے —— لیڈرانہ خطابت کا اصل راز یہی ہے اور "فن تقریر" کے مولف نے اگر اس نکتہ پر غور نہیں کیا ہے تو وہ اب غور کریں!

اس تمام "مخالفانہ" تنقید کے بعد بھی اگر کوئی صاحب اس کتاب کو پڑھنا چاہیں تو ادارۂ ادبیات اردو یا سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد سے طلب فرما سکتے ہیں۔ قیمت صرف ۱۲/ ہے لیکن اگر طلبہ اور لیڈروں کے لئے اس کتاب کا پڑھنا قانون تحفظ حیدرآباد کے تحت —— ممنوع قرار دیا جائے تو ہم اس امتناع کی تائید کرنے پر اپنے کو آمادہ پاتے ہیں!!

قاضی عبدالغفار

پیام ۲۴ جنوری ۱۹۴۱ء

گداگری

سب رس ریڈیو نمبر میں گداگری پر ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں عام اور معروف انداز پر گداگری کو معاشی بیاری ثابت کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے۔ صاحب مضمون کی رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی مضمون نگاری سے مضمون نگار کا ارادہ اور نیت کیا ہوتی ہے۔ آیا قوم کو صرف برائیوں سے آگاہ کرنا۔ یا یا اصلاح اور علاج! جہاں تک صرف آگاہی کا تعلق ہے۔ کون تعلیم یافتہ انسان ہے جو ان باتوں سے واقف نہیں لیکن اصلاح اور علاج اگر مقصود ہے تو ہمارے ملکی ریفارمروں کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ کسی چیز کی برائیوں کے اظہار سے کبھی بھی مطلب برآری نہیں ہو سکتی۔

بدقسمتی سے غلامی میں ریفارمروں کی حسیات میں آزاد انسان کے برعکس یہ نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ نہ تو قلم اٹھانے سے پہلے کوئی خاص نصب العین مقرر کرتے ہیں۔ نہ ہی قوم کی برائیوں کو اپنی برائیاں سمجھ کر خفت اور ندامت محسوس کرتے ہیں تاکہ ان خرابیوں کو دور کرنے کا احساس بھی شدت کے ساتھ پیدا ہو بلکہ مدعا بن جائے۔ البتہ برائیوں کا شمار اور بیان ان کے طریق کار کی انتہائی حد بن کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ میں قوم میں خوبیوں کا اضافہ تو کجا اور برائیوں کی زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر اولاد نالائق یا شاگرد کام چور ہے تو کیا باپ اور استاد صرف ان کی برائیاں کرتا پھرے گا۔ یا محنت اخلاق اور لیگانگت کے ساتھ ان کی فطرتی استعداد اور مادہ قبولیت کو غلط راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے پر ڈالنے کی سعی کرے گا۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہی طریق کار ہمارے مصلحین کو اختیار کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ قوم سے برائیاں دور کرنے کی نیت بھی رکھتے ہیں۔

یہاں اس بات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ استعداد مادہ قبولیت، ذہنیت اور حسیات کی طاقتیں دراصل بھلائی اور برائی میں ایک ہی ہوتی ہیں۔ پارہ کی ماہیت اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جب وہ اعتدال پر ہوتا ہے تو صحت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اوپر اور نیچے ہونے پر انتہائی گرمی اور انتہائی سردی کی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح انسانی فطرت بھی نیک اور بد قالبوں میں ایک ہی ہوتی ہے فرق صرف درجۂ اعتدال پر رہنے اور اوپر یا نیچے ہو جانے کا ہوتا ہے۔ قوت خشم اگر اعتدال پر ہو تو شجاعت، کرم، عالی ہمتی، حلم اور بردباری کہلاتی ہے۔ گھٹ جائے تو بزدلی، بے ہمتی، خوشامد اور مذلت اور بڑھ جائے تو عجب، خودی، لاف زنی بن جاتی ہے اسی طرح قوت شہوت اعتدال پر ہو تو عفت، شرم، قناعت اور صبر کہلاتی ہے۔ کمی اور بیشی کی حالت میں سستی، نامردی اور حرص، شوخی اور پلیدی بن جاتی ہے۔

اس لحاظ سے قوم کے بدکار اور نیکوکار افراد میں استعداد اور مادۂ قبولیت کا فرق نہیں ہوتا بلکہ اعتدال کی یا بیشی کا فرق ہوتا ہے۔ جوہر ایک ہی سب میں ہوتا ہے۔

بلحاظ عمل دونوں برابر ہیں۔ ایک ہی جذبہ ہر جگہ کار فرما ہے لیکن میدان جنگ میں دشمن کی ہلاکت اور خون غازی اور مجاہد بنا دیتی ہے اور حالت امن میں رہزنی آشنامی قزاقی کہلا کر قابل دار بنا دیتی ہے۔

قصور دراصل مادہ قبولیت کے لئے صحیح یا غلط مواد اور ماحول کا ہے نہ کہ استعداد اور قابلیت کا۔

اب ایک صحیح مفکر اور خیر اندیش مصلح کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم کی صفات حسنہ اور برائیوں کو شمار کرتا رہے۔ بلکہ اس کا کام انجن کو غلط سمت سے ہٹا کر ٹھیک رخ پر ڈالنا ہوتا ہے اسٹیم کی وہی پہلی قوت جو غلط رخ پر لے جا رہی تھی اب ٹھیک سمت پر لے جانا شروع کر دے گی۔

آزاد ممالک میں جب ان باتوں کے تجربات کئے گئے تو وہ ان کی صداقت کو پا گئے۔ اناطولیہ میں گذشتہ زلزلہ میں سرکاری عمال نے دیکھا کہ ایک جیل خانے کے قیدی بجائے فرار کے خدمت خلق میں مشغول تھے۔ اسی قسم کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن میں بڑے بڑے سفاک اور بے رحم لوگ مناسب تربیت کے بعد بنی نوع انسان کے محسن بن کر چکے ہیں گداگری کو لعنت سمجھنے کے ساتھ اگر یہ بھی سوچا جائے کہ جن باتوں سے مجبور ہو کر قوم کا ایک درست حصہ آہستہ آہستہ گداگری کی بیماری میں مبتلا ہوا ان مجبوریوں کے پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں قوم کے بخیال خویش بے قصور طبقے کا کتنا ہاتھ ہے تو ذمہ داری کا بوجھ کہیں کا کہیں جا لگتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ برا کہنے والوں ہی کی ذہنیت، نفرت، بے تعلقی اور عدم توجہی ہوتی ہے جو قوم کی معمولی سی کمزوری کو استقلال اور پائداری بخشتی ہے

بہرکیف درد مندوں کو کام کرنا چاہیے اور کام کرنے والوں کے لئے ہر وقت موقع ہے۔ اور خرابیوں کے مقابلے میں گداگری کا علاج اس قدر مایوس کن نہیں ہے۔ نہ زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے۔ صرف کسی بڑے شہر کے قرب میں ایک قطعہ زمین اور چند فی سبیل اللہ کام کرنے والے مخلصین کے استقلال، ہمت اور محنت کی ضرورت ہے۔

کرنا کیا ہے

آپ کے دروازے پر ایک شخص پیسے کا سوال کرتا ہے تو وہ گداگر کہلاتا ہے اور پیسہ بھیک لیکن اگر وہی شخص آپ کے چار کام کر دے تو اس سے زیادہ پیسے اجرت، معاوضہ اور وہی شخص کارکن کہلاتا ہے۔ اس فرق کو تاڑ لیا جائے تو یہی اس راہ میں ہمارا دستور العمل۔ پروگرام اور کامیابی کا سگنل ہے۔ نہ گداگروں کو مٹانے کی عبث سعی کی جائے۔ نہ بھیک بند کرنے کی۔ بلکہ گداگروں سے کام لیا جائے اور بس! گداگری اور اس کے ساتھ اس سے وابستہ تمام برے اور بدنما تخیلات ختم۔ کسی آئندہ موقع پر تفصیلات پیش کر دی جائیں گی سردست اس قدر اشارہ کئے دیتا ہوں کہ گداگروں کی خوبیاں ان کی برائیوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ اور اس گوڈری میں وہ لعل پنہاں ہیں کہ اگر ان کو کارآمد بنا لیا گیا تو قوم کی کایا پلٹ ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی زنان بازاری کی اصلاح کا موقع بھی پیدا ہو جائے گا۔

احمد سعید

شاہ آباد مارکنڈا (ضلع کرنال)

غزل

محبت کا طریقہ اور کچھ ہے　　زمانہ اس کو سمجھا اور کچھ ہے
فلک پر برق بھی مضطر ہے لیکن　　مرے دل کا تڑپنا اور کچھ ہے
ہزاروں درد ہیں دنیا میں لیکن　　غمِ فرقت کی ایذا اور کچھ ہے
حرم کا دَیر کا سجدہ ہے کچھ اور　　تمہارے دَر کا سجدہ اور کچھ ہے
بہت دیکھا ہے پیچ و تابِ سنبل　　خمِ زلفِ چلیپا اور کچھ ہے
سماتا ہی نہیں کوئی نظر میں　　مری آنکھوں میں جلوہ اور کچھ ہے
تماشے یوں تو ہیں دنیا میں لاکھوں　　مگر دل میں تماشا اور کچھ ہے
حسیں کیا چیز ہیں، کیا حسن اُن کا　　تیری صورت کا نقشا اور کچھ ہے

بظاہر سوئے بتخانہ چلا ہوں
معیںؔ دل میں ارادا اور کچھ ہے

نواب معین الدولہ بہادر معینؔ

نئے سال کا تحفہ

(حسن والوں کی بارگاہ میں)

یہ دل، یہ انجمنِ آفتاب نذر کروں　　گلوں کا چھین کے رنگیں شباب نذر کروں
شعاعیں اختر و مہتاب کی کروں حاضر　　نگاہِ حسن کا رنگیں حجاب نذر کروں
صباحتِ رخِ عذرا سے دلکشی لے کر!　　حیاتِ تاج کا رنگین خواب نذر کروں
تم اور سیر کھلے بند صحنِ گلشن کی　　عروسِ نو کی شہانی نقاب نذر کروں
ہو چشمِ ناز جو مائل مطالعہ کی طرف　　حریمِ دل کی سنہری کتاب نذر کروں
جو شعرِ نغمۂ فریاد[۱] گنگناتا ہو　　تو سازِ دل کا یہ بجتا رباب نذر کروں
یہ سالِ نو ہو مبارک! مگر یہ حیرت ہے　　ریاضِ خلد کا ہنستا گلاب نذر کروں

قبول میرے یہ تحفے اگر نہ ہوں جوہرؔ
تو پھر انہیں دلِ خانہ خراب نذر کروں

جوہر فریادی

---

[۱] جوہر فریادی کے کلام کے مجموعے کا نام جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

غزل

یہ غزل جامعہ عثمانیہ کے اس مشاعرے میں جو نواب صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا پڑھی گئی تھی

دل تیری محبت کا دیوانہ ہوا آخر
ہر چیز سے دنیا کی بیگانہ ہوا آخر

صورت گرِ حیرت ہے عرفانِ جنوں کیا کیا
کعبہ بھی نگاہوں میں بتخانہ ہوا آخر

دل نورِ تجلیٰ سے معمور ہے کچھ ایسا
احساسِ محبت بھی پروانہ ہوا آخر

نیرنگِ محبت کی چھائی جو رنگینی !
عالم مری نظروں میں ویرانہ ہوا آخر

بستے ہیں یہیں ارماں رہتی ہی یہیں حسرت
آباد محبت کا کاشانہ ہوا آخر

لبریزِ محبت ہوں فیضان ہے ساقی کا
ایک ایک نفس میرا پیمانہ ہوا آخر

لب تشنہ، دہن تشنہ، دل تشنہ، جگر تشنہ
ساغر ہی نہیں خالی میخانہ ہوا آخر

اک حرف جو بے معنی نکلا تھا کبھی منہ سے
وہ آج محبت کا افسانہ ہوا آخر

پیراہنِ ہستی بھی بخشش ہے محبت کی
سامان عزیز اپنا شاہانہ ہوا آخر

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

فیضی کے منشآت

(بسلسلۂ گزشتہ)

اب ہم مرتب "لطیفۂ فیاضی" کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں، درحقیقت انتہائی تلاش و جستجو کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ تفصیل نہ مل سکی، ہماری دسترس جس قدر ہو سکتی تھی ان سب کتابوں کو پیش نظر رکھ کر، ہم اس موضوع پر معلومات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ ہم حکیم عین الملک اول کی وفات کے حالات میں لکھ آئے ہیں کہ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ حکیم عین الملک نے موضع ہانڈیہ میں انتقال کیا، اور بادشاہ نے اس کی مغفرت کے لئے دعا کی، اور اس کے فرزندوں کو اپنے شاہانہ الطاف میں پناہ دی، تو اس بیان سے، اور ابوالفضل کے اس رقعہ سے جسے ہم نے قبل نقل کیا ہے، یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ حکیم عین الملک کی وفات پر ان کی یادگار چند فرزند تھے، اور ابوالفضل کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطانی عواطف جب ان پر مبذول ہوئے ہوں گے تو یہ بچے سن رشد کو پہنچ سکے ہوں گے۔

"دربار اکبری" میں آزاد نے فیضی کی ایک عرضی نقل کی ہے، جو اس نے خاندیس سے بادشاہ کو لکھی ہے، ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے، اس میں اور اس میں اختلاف ہے، بعض باتیں اس میں موجود ہیں، تو اس میں نہیں، چنانچہ حکیم عین الملک مذکور کا اس عرضی میں فیضی نے جہاں ذکر کیا ہے، اس کی حسب ذیل عبارت مولانا آزاد مرحوم نے درج کی ہے۔

"حکیم عین الملک نقش دہلی وارد، و در خدمت روضۂ مقدسہ و مقامات پیران دہلی، و خدمت فقرا و حسن سلوک بمردم تقصیر می کند، و گو جوان را، زن حاضر می باشند و متعہد بندہ اند کو وزدی نشود۔ پسرش عبداللہ، جوان رشید است، ہموارہ در خدمت بادشاہی می باشد"۔

اس عبارت سے تو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ حکیم عین الملک کے لڑکے کا نام عبداللہ ہے، شاید اس کا لقب نورالدین بھی ہوگا اور خود اکبر بادشاہ نے جب باپ کی وفات کے بعد اس پر عنایتیں کی ہوں گی، تو اس کو اس کے والد کا خطاب "عین الملک" دیا ہوگا، یا جہانگیر کے دور میں اسے یہ خطاب سرفراز کیا گیا ہوگا۔ اس لئے اس عبداللہ کی ساری تصانیف میں اس کا نام ہمیشہ نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک شیرازی ملتا ہے۔

برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد دوم میں، جہاں اس نسخہ کا ذکر ہے، نورالدین محمد عبداللہ کو حکیم عین الملک ہی کا لڑکا لکھا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرتب "لطائف فیضی" شاہ جہاں بادشاہ کے عہد تک زندہ رہا، چنانچہ اس نے "الفاظ ادویہ" کے نام سے ایک کتاب ۱۰۳۸ھ میں تالیف کی ہے۔

افسوس ہے کہ اس کے حالات کی تفصیل تاریخوں سے نہیں ملتی، اپنے آپ کو فیضی کا بھانجا لکھتا ہے مگر جہاں شیخ مبارک کے فرزندوں اور بیٹیوں کا ذکر ہے، اس میں فی الحال کہیں، اس کی بیٹی، جو حکیم عین الملک سے بیاہی گئی ہو، اس کا نام یا حال نہیں ملتا، اور نہ تحقیق ہو سکی۔ مگر اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھانجا کہتا ہے، اور یہ خواہ مخواہ تھوڑا ہی لکھا ہوگا۔

ہمارے پیش نظر نسخہ کے صفحہ ۲۰۰ پر ایک خط خود حکیم عین الملک کے نام پر بھی ہے، ان دونوں بیانوں سے تعجب ہوتا ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا، جب کہ کوئی تفصیل نہیں ملتی تو ان عبارتوں کی روشنی میں گزشتہ بیانات کی تردید کس طرح کی جائے۔ چنانچہ

"لطیفۂ فیاضی" کے آخر پر خود نورالدین محمد عبداللہ عین الملک کے رقعات درج ہیں، اس میں اس نے اپنے والد کو ایک خط لکھا ہے اگر وہ عین الملک جو اکبری عہد کے ہیں، اور اس کے والد ہیں، تو ان کا انتقال اکبر ہی کے دور میں ہو چکا ہے، اور یہ خط جو اپنے پدر بزرگوار کو لکھ رہا ہے، اس میں ابوالفضل کے قتل کے بعد خود اس پر جو حالات گزر رہے ہیں، اس کی تفصیل ہے، حالانکہ حکیم عین الملک کا اکبر اور ابوالفضل دونوں سے پہلے انتقال ہو چکا ہے، اس میں درج ہے کہ:

"اور بچہ کو میرکی پسر خواجہ جہاں، شاہی فرمان کے ساتھ، جس میں تقصیرات کی معافی اور دل جوئی درج ہے، یہاں وارد ہوا ہے۔ فرمان مبارک میں یہ بھی درج ہے کہ شیخ ابوالفضل کی جاگیر سنبل پور، چاند پور وغیرہ تمہیں سرفراز کئے گئے ہیں، اور شال خاصہ بطور تبرک روانہ ہے، فوراً حاضر آستانِ عالی ہونے کی عزت حاصل کرو۔ چنانچہ حکم اقدس کی بنا پر نکل رہا ہوں، آئندہ کیا حشر ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

یہ واقعات جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد کے معلوم ہوتے ہیں، جو ابوالفضل اور اس کے خاندان پر عتاب شاہی نازل کر چکا تھا۔

جب دربار میں پہنچا ہے، تو لکھتا ہے کہ اوائل صفر (غالباً ۱۰۱۴ھ) میں آگرہ پہنچا، اور ۵ صفر چہارشنبہ کو باریابی نصیب ہوئی۔ لیکن دراندازوں کی فتنہ سامانیوں سے، اس فدوی کی طرف کوئی توجہ منعطف نہیں فرمائی، دو دن تک تو سلام کا ہی حکم نہ ہوا۔ تیسرے دن طلب فرمایا، اور بڑی سختی سے گفتگو کی۔ قسمت اچھی تھی، کہ بھلے کو سلامتی کے ساتھ واپس لوٹنا نصیب ہوا۔"

اس کے ایک اور خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی خود صوبہ دکن گیا تھا، اور وہاں کے لشکر کے ہاتھوں رنج واندوہ اٹھا کر لوٹا ہے، اور شیخ علاء الدین اسلام خاں اسلام جاہ گورنر بنگالہ و بہار کے پاس جانے کے ارادے سے نکلتا ہے۔ یہ اسلام جاہ، شیخ سلیم چشتی (المتوفی ۹۷۹ھ) کے پوتے تھے، جہانگیر جب تخت نشین ہوا تو انھیں پنج ہزاری منصب سرفراز کر کے حاکم بنگالہ مقرر کیا تھا، انھوں نے شیخ مبارک کی بیٹی لاڈلی بیگم سے عقد کیا تھا، جو فیضی کی بہن تھی۔ اس لحاظ سے گویا، اسلام جاہ حکیم نورالدین عبداللہ کے خالو ہوتے تھے۔ یہ ان کے پاس ۲۷ شوال ۱۰۱۵ھ کو "جہانگیر نگر" میں جا کر ملتا ہے۔

ہمیں کافی تلاش کے باوجود، حکیم نورالدین عبداللہ کے اس سے زیادہ حالات نہ مل سکے ان کی حسب ذیل کتابیں ہم نے دیکھی ہیں، جن کے مختصر نوٹ بھی اس لئے درج ہیں کہ اس موضوع کے لواحق کی تکمیل ہو جائے۔

(۱) انشائے نورالدین خود اس لطیفۂ فیاضی کے نوٹ کے بعد اسی مضمون میں آخر پر اس کے متعلق ہم نے معلومات بھی درج کئے ہیں

(۲) سبب ستّۂ رشیدی۔ یہ کتاب طب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے چھ اسباب (شش سبب) اور ایک خاتمہ پر حاوی ہے۔ اس میں اس نے اپنا نام "نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک شیرازی الصدیقی القرشی" لکھا ہے۔

ساری کتاب کچھ عجیب وغریب ہے، جس میں ہند کے موسم، ارضی و سماوی مباحث، اور بہت سے اعمال (جن سے صحت برقرار رہ سکتی ہے) بیان کئے ہیں۔ ایک عجیب طرز کی کتاب ہے، لطف یہ ہے کہ علم موسیقی کے باب میں، اس فن کی تاریخ، اور بڑے تفصیلی معلومات درج کئے ہیں، شاید اس لئے کہ طبیب کو علم موسیقی کا بھی جاننا ضروری تھا۔ سبب تالیف میں لکھتا ہے۔

درکف آمد مرا، چو گنجے مفت　　کردم ایثار و آشکار نہفت
بہ ترازوئے دست تنگ لباں　　دانش شش جہات حکمت سنجت

۱؎ دربار اکبری صفحہ ۳۵، مرتبہ محمد ابراہیم منصف امرتسر ۱۹۱۰ء

تکمۂ شش قبائے صحت را — کلک مستی اچنیں جواہر سفت

از خرد نام و سال ومہ پرسی — "سبب ستۂ رشیدی" گفت

۱۰۳۵

اس کا پیش نظر نسخہ ۱۲۵۵ھ کا مکتوبہ ہے، جس کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے:۔

"تمت الکتاب بعون الملک الوہاب بتاریخ ہفتم ماہ جمادی الاول ۱۲۵۳ھ بحسب فرمایش والدی حکیم الحکما حکیم لطف حسین خاں، از دست خواجہ عبدالرزاق عرف محمد مخدوم[1]۔"

(۳) تیسری کتاب "الفاظ ادویہ" نظر پڑی جس میں لکھتا ہے کہ اس خادم الاطبا نیاز مند درگاہ بے نیازی، نورالدین محمد عبداللہ الحکیم عین الملک شیرازی نے، خانہ زادان سلطنت سے ہونے کی وجہ سے انتہائی تلاش وجستجو کے بعد یہ کتاب ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہجہاں کے اوائل جلوس میں لکھی۔ اپنی اس کتاب کی تاریخ تالیف کے لئے لکھتا ہے:۔

وارد کتاب ما چو دوا رو انیسہ

تاریخ و نام نیز شد "الفاظ ادویہ"

۱۰۳۸

یہ کتاب ایک مقدمہ، نتیجہ اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقدمہ کو چار فائدوں میں بیان کیا ہے۔

فائدۂ اول میں:۔ علامات تصحیح اعراب لکھے ہیں،

" دوم میں:۔ علامات زبان "ہر دیار"۔ اور

" سوم میں:۔ تحقیق طبایع و درجات آں، و علاماتے کہ منسوب است بہ آں، و ذکر مجملے از دوا بہ طبع و درجہ و قوت۔

فائدۂ چہارم میں:۔ در بیان مختار و شربت و مصلح و بدل دوا و علامات آں۔

نتیجہ صرف ادویہ کے اسماء اور ان کے ذکر پر ترتیب دیا گیا ہے۔

خاتمہ میں چھ کثیر المنفعت ادویہ، بادزہر، موسیائی، چوب چینی، چائے، قہوہ، اور تمباکو کے خواص و افعال لکھے ہیں، اور لکھتا ہے کہ ان کا ذکر قدما نے بہت کم لکھا ہے، میں تفصیل سے درج کرتا ہوں۔

تمباکو کے خواص کے ضمن میں کہتا ہے:۔

"ظہورش در ہند، انتہائے سلطنت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ است و ابتدائے اورنگ نشینی جنت مکانی، نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ، کہ سال ہزار و چہار دہ ہجری باشد، و بیشتر از جانب فرنگ، دریں دیار آمدہ، و اکنوں در جمیع اماکن ہندوستان کشت و کار او می شود، و ارتکاب کشیدن دخانش شعار کہہ و مہ گشتہ۔"

اسی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک شخص درد قولنج سے گرفتار ہو کر آدھی رات کے وقت میرے پاس آیا، اور قریب مرگ تھا، اور اس وقت کوئی ایسی دوا بھی موجود نہ تھی۔ میں نے اسے تمباکو پینے کی ہدایت کی، اور کہا کہ اس کا دھواں بہت کثرت کے ساتھ نگلتا جا۔ اس ترکیب سے فی الحال اسے بہت کچھ افاقہ ہوا، اس لئے کہ دخان بذاتہ محلل ہے۔

اسی تمباکو کے متعلق ایک دوسرا تجربہ لکھتا ہے کہ ایک شخص مرض استسقا رکھتا تھا، انتہائی دوائیں دی گئیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، اور اس کا معدہ اس قدر ضعیف ہو چکا تھا کہ کوئی دوا قبول نہیں کرتا تھا، میں نے بڑی سوچ اور بچار کے بعد، گویا کہ مجھے الہام ہوا، یہ ہدایت کی کہ جو دوائیں تمھیں دی جارہی ہیں، ان کو بیس گنا اضافہ کرکے، بطور تمباکو استعمال کرکے اس کا دھواں نگلو۔ چنانچہ

[1] یہ کتاب کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں فن طب یونانی فارسی قلمی نمبر (۳۸۱) پر موجود ہے ۱۲۔

عجیب نفع ہوا۔[1]

اپنے تیسرے تجربے میں یہ بیان کرتا ہے کہ اس کے کسی ایک عزیز کو ضعفِ بصر کا سخت عارضہ ہوگیا تھا، جب ایک مدت کے بعد اس سے ملنے گیا، تو اس کو دیکھا کہ وہ کتابت کر رہا ہے اس سے اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ برگ تمباکو کے ساتھ برگِ شنبالو کو نصف نصف لے کر خشک کر لیجیے بعد چند دنوں تک اس کے دھوئیں کا استعمال کیا ہے جس سے یہ فائدہ نصیب ہوا کہ آج میں کتابت کرنے کے قابل ہوگیا۔

واقعی ہر چیز جو اپنے محل پر استعمال کی جائے، فائدہ بخشتی ہے اور اس کی کثرت بجائے فائدے کے نقصان رساں بن جاتی ہے، نہ یہ کہ آج کل عوام نے تمباکو نوشی کو اپنی عادۂ ثانیہ بنا لیا ہے۔ کہیں ان فوائد سے آپ اپنی تمباکو نوشی پر خوش نہ ہوں، کیونکہ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔

اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ نظر سے گزرا، جو ۹ ربیع الآخر سنہ ۱۱۵۴ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام نظام الدین ہے۔[2]

یہ کتاب بعد میں چھپی بھی ہے، ایک نسخہ "مطبع احمدی شاہراہ دلہائی" میں امو جان کے اہتمام سے، اور دوسرا "مطبع ثمر ہند لکھنو" سے شائع ہوا تھا۔[3]

اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، اور ایک خدا بخش خاں کی لائبریری میں بھی موجود تھا۔

(۴) جامع الاطبا کے نام سے بھی ایک کتاب، شاہجہاں بادشاہ کے حکم سے متعدیات طبابت میں لکھی۔ یہ کتاب چودہ فتوحات پر مبنی ہے

[1] آج کل طبی دنیا نے بھی اسی طریقہ کو رائج کیا ہے۔ چنانچہ نزلہ وغیرہ کے لئے متعدد قسم کے سگریٹ و سگار یورپ سے آتے ہیں۔

[2] کتب خانۂ آصفیہ۔ فنِ طب یونانی، فارسی قلمی نمبر (۳۱۴)

[3] ״ ״ ״ مطبوعہ نمبر (۵۵۷) الفاظ ادویہ

اور آخری باب، ہندی و فارسی ادویہ کے اسماء و لغت پر اعراب کی تصحیح کے ساتھ شامل ہے۔

اس کتاب کا زیرِ استعمال نسخہ، غرہ صفر المظفر روز دوشنبہ کو محمد شاہ بادشاہ کے جلوس کے ساتویں سال لکھا گیا ہے، اس پر عباس علی خاں بہادر نامی کسی صاحب کی دو مہریں ہیں، ایک میں سنہ ۱۲۳۶ھ اور دوسری میں سنہ ۱۲۶۴ھ درج ہے۔[1]

(۵) اب اصل کتاب "لطیفۂ فیاضی" کے نوٹ کی طرف رجوع کیجیے۔ اس لطیفہ کا ایک نسخہ جیسا کہ مولوی بادشاہ حسین صاحب نے ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء کے معارف میں لکھا تھا، خود حیدرآباد کے کتب خانہ دفتر دیوانی، مال و ملکی سرکار عالی میں موجود ہے۔ لیکن اس میں یہ کمی ہے کہ جن اصحاب کے نام مراسلت کی گئی ہے، ان کے نام چھوٹے ہوئے ہیں، جن سے خطوط کی تاریخی حیثیت پوشیدہ رہ جاتی ہے، اور یہ نسخہ (۱۸۰) صفحات (تقطیع ۸/۵ انچ) کا ہے۔

ان لطائف کا ایک اور نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ ہمارے پیشِ نظر ہے، جس کے (۲۷۰) صفحات چھوٹی تقطیع پر ہیں۔[2] ایک اور ناقص نسخہ بھی اسی کتب خانہ میں ہے، جو سنہ ۱۱۵۰ھ کا مخطوطہ ہے۔[3]

مولانا آزاد مرحوم نے "دربارِ اکبری" میں فیضی کا حال لکھتے ہوئے اس کتاب پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ایک پوری عرضی جو بڑی لمبی چوڑی ہے، پوری کی پوری، اصل فارسی عبارت ہی میں نقل کی ہے، انھوں نے اس کتاب کے متعلق جو رائے لکھی ہے، وہ حرف حرف صحیح ہے، چنانچہ آپ بھی صفحات آئندہ میں، اس کے اقتباس سے معلوم فرمائیں گے۔ آزاد کے دل نشین انداز میں

[1] کتب خانۂ آصفیہ۔ جامع الاطبا، فنِ طب یونانی فارسی قلم۔ نمبر (۱۳۰)

[2] ״ ״ ״ لطیفۂ فیاضی فنِ انشاء ״ ״ (۳۴۴)

[3] ״ ״ ״ انشائے فیضی فنِ انشاء ״ ״ ״ (۸۰)

اس کتاب کی اہمیت پڑھیئے فرماتے ہیں :-

"انشائے فیضی ۱۰۳۵ھ میں نورالدین محمد عبداللہ خلف حکیم عین الملک نے ترتیب دی ہے اور لطیفۂ فیاضی اس کا نام رکھا ہے، باب اول میں عرضداشتیں ہیں کہ اکثر سفارت دکن سے حضور پادشاہ میں عرض کی ہے، یہ عرضیاں بڑی غور طلب رپورٹیں ہیں کہ رموزِ سلطنت پر مشتمل ہیں، ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں بڑے بڑے نکتے سکھاتی ہیں، اول عجز و انکسار کے انداز، اور مجھے اس میں جتانے کے قابل یہ امر ہے کہ جب ہم ایشیا میں ہیں، اور ہمارے آقا کمال شوق سے آداب و تعظیم کے خریدار ہیں تو ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے میں کیا عذر ہے، آقا کی خوشی بڑی گراں بہا شئے ہے۔"

"پہلی عرضی میں اول رستہ کی حالت، اپنی مملکت میں جس جس شہر سے گزرا ہے، وہاں کی رُوداد، حاکم کی کیفیت، کارروائی اگر ضروری ہے تو ماتحتوں کی بھی خدمت گزاری۔ ملکِ دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت، ملک کی حالت، ہر مقام میں پیداوار، پھول پھل کیا کیا ہیں، اور کیسے ہیں، اہلِ صنعت کے صنائع، علماء و حکماء شعراء وغیرہ اہلِ کمال کے حالات، ان کی شاگردی کا سلسلہ، کن کن استادوں تک پہنچتا ہے، ہر ایک کی لیاقت، اخلاق، اطوار، ہر ایک کے اپنی رائے کہ کون پرانی لکیر کا فقیر ہے، کون نئی روشنی سے اثر پذیر ہے۔ اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے۔"

عرائضِ مذکورہ سے اکبر کی طبیعت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ کن کن باتوں سے خوش ہوتا تھا، اور باوجود سامانِ شاہنشہی کے، ان اہلِ علم او فاضلِ دانش کے ساتھ کس درجے بے تکلف تھا، اور یہ کیسی لطافت سے اسے خوش کرتے تھے، اور کس درجہ کی ظرافت و لطافت ہوتی تھی جو اس کے دل کو شگفتہ کرتی تھی۔"[1]

۲

اصل کتاب "لطیفۂ فیاضی" یعنی فیضی کے نشآت کا اقتباس حمد و نعت کے بعد لکھتا ہے :-

"بادیہ پیمائے بادیۂ سخن سنجی و آبلہ پائے سنگلاخ کاخ سنجی، نورالدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک کہ بہ نسبتِ آبائے کرام از خاکِ پاکِ شیراز است، و بہ حسبِ طینت شکرستانِ ہند سخن طراز، بہ لمعانِ نظرِ امعان و ملاحظہ نمود کہ بسیار مصنفاتِ شگرف، از نظم و نثر ملک الکلام.........

قسطاسِ دانشورانِ ہند، شیخ ابوالفیض فیاضی چوں فروغِ سپہر جہاں آرا و ضیاء گسترِ زمین و زماں گشتہ و برخے از سخنانِ فیض تبیانِ آں شناورِ بحارِ الفاظ و معانی چوں "مرکز ادوار" کہ در جواب "مخزنِ اسرار" است۔"

"رونق افزائے محفلِ دانش پژوہی.......

افضل الاعامی نواب حکیم مستطاب، ابوالفضل علامی فہامی ترتیب دادہ، بہ رشتۂ انتظام کشیدہ، شہرۂ آفاق گردانیدند، مگر بعضے ملتقطات و نشآت کہ از قلمِ عنبریں شمائم، استعجالاً و اختصاراً، نقش پذیر گشتہ بود و ہم چوں گنج در زاویۂ اختفاد گم نامی و گوشۂ خمول و ناکامی پراگندہ افتادہ، و بہ مقتضائے استعدادِ عالی و فطرتِ والا نسیاً منسیاً فرسودہ، بداں کم تر پرداختہ و فراہم نیاوردہ بودند، ازاں جا کہ ایں کم تریں، نسبتِ خواہر زادگی و

---

[1] دربار اکبری صفحہ (۳۷۵)

تلمیذی بہ آں خدیو کشور دانائی داشت خواست کہ ایں جواہر زواہر آب دار کہ اولاً برادران معنوی راقم اند' جریدۂ جداگانہ فراہم آوردہ' درسلک ترتیب کشد' و در مہد ترتیب بہ پروردہ۔ بو کہ بدیں دست آویز مذکور محفل سخن سنجاں و مطبوع خاطر معنی پرداز اں گردد' و بہ یاد کرد انیاں سراپا جاوید زندگی اندوزد۔ تیمناً و تبرکاً سرآغاز ایں گل دستہ ...... بہ افتتاح "تباشیر الصبح دیوان فیضی" معنون ساختہ القصام می نماید' بہ پنج لطیفہ۔

(۱) لطیفۂ اول:۔ عرائض والا درگاہ
(۲) مفاوضات فیاضی بہ شرفا و علما و عرفا
(۳) لطیفۂ سوم:۔ بہ حکمائے معاصر
(۴) لطیفۂ چہارم:۔ بہ امرائے عظام
(۵) بہ نیاک و اخوان

حسب ذیل عبارت سے کتاب کے سنہ تالیف وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

" لطیفۂ فیاضی کہ بتاریخ انجام و انتظام ایں مطلب اہم است موسوم ساختہ' دست ہمت بہ دامن شاہد مقصود می زند۔

و باللہِ التوفیقُ وبہِ المستعانُ"

" لطیفۂ فیاضی" سے ۱۰۳۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

اس کے بعد "تباشیر الصبح" کے نام سے فیضی کی عبارت بطور دیباچہ لکھی ہے' اس کے بعد ایک مثنوی درج ہے۔

مثنوی کے بعد فیضی نے مختصر طور پر اپنی زندگی کے کچھ حالات بھی لکھے ہیں' چنانچہ اپنی قادر الکلامی اور انشا پردازی پر فخر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے اپنے والد ماجد قبلہ کے پاس تعلیم حاصل کی' اور فطری قابلیت و جوہر ذہانت و فطنت سے ترقی کی تحصیل علوم کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی لیکن شہنشاہ اکبر کے فرمان نے مجھے کنج عافیت سے نکلنے پر مجبور کیا' اور تعمیل حکم میں حاضر دربار ہو کر آستان بوسی کی عزت حاصل کی۔ شاہانہ الطاف مبذول ہوئے اور شاہزادہ کام بخش کی تدریس کے فرائض سپرد کئے گئے۔ اس خدمت سے ترقی کر کے' خدائے لایزال کی عنایات کے باعث سلطان کا معتبر ترین خواجہ تاش بننے کی عزت حاصل کر لی۔ بخت نے اور یاوری کی تو دربار کے امرائے خاص سے سمجھا جانے لگا' اور خطاب "ملک الشعراء" حاصل کر کے امتیاز پایا۔

قوت طبع کے بہاؤ اور زور پر بہت کچھ کہتا جاتا ہے' چنانچہ اپنی مدح سرائی کے لئے یہ فقرے استعمال کئے ہیں' جن میں اپنے آپ کو مرد میدان بھی گننے لگتا ہے۔

"ہم در حساب امراء در آمدم و ہم خطاب ملک الشعراء گرفتم۔
اگر شمشیر بہ میاں بستہ ام' اما کلک مجروام کارگرتر است۔
اگرچہ تیر بر کمان می نہم' اما قلم در بنان من راست تر می رود"۔

اس تمہیدی حصہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے:۔

" لطیفۂ اول" کے عنوان کی تحت' عرائض درج ہیں' جن کو وقتاً فوقتاً' شہنشاہ اکبر کے دربار میں پیش کیا ہے۔

پہلی عرض داشت میں' شہزادہ مراد (وفات ۱۰۰۸ھ) کے رکاب میں' اس نے جو دکن کا سفر کیا ہے' اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں' اور ہر جگہ شہزادہ کی جس شان و شوکت کے ساتھ آؤ بھگت کی جاتی ہے' اس سے بھی دربار شاہی کو مطلع کرتا جاتا ہے۔

عرضداشت دوم میں دکن کی پانچوں خود مختار اسلامی سلطنتوں کا کچا چٹھا لکھ کر بھیجتا ہے۔ یہ دکن کے سفر سے متعلق' اسی سلسلہ کا دوسرا معروضہ ہے۔ فیضی کے ان عرائض میں نہایت

عمدہ خصوصیات بھی ہیں، وہ صرف شہزادہ کے استقبال کی روداد ہی دار السلطنت نہیں بھیجتا ہے۔ بلکہ جس مقام پر پہنچتا ہے ایک انگریز مورخ کی طرح وہاں کے سیاسی، تمدنی، معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ، ان قطعوں کے موسم و فصول، پیداوار اور باشندوں کے لباس و وضع قطع کی تفصیل سے بھی اپنی عرضیوں کو دلچسپ بناتا جاتا ہے، عورتوں کے لباس، اور ان کے زیورات پر بھی ان میں روشنی ڈالی ہے۔ غرض ہر معمولی سے معمولی چیز پر، جن کو موجودہ زمانہ میں اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اپنی قلمی جولان گاہوں سے محروم نہیں رکھا ہے، ان خصوصیات کی وجہ سے اس کے یہ انشائی نمونے، اپنے معاصرین میں اسے ایک خاص امتیاز بخش رہے ہیں۔ اس دور میں، اس وسعتِ نظر کے ساتھ، اس قسم کی طرزِ نگارش خال خال لوگوں میں بھی نہیں دکھائی دیتی۔ ایسے طرز پر حالات اکٹھے کر کے بادشاہ کی خدمت میں بھیجنا، اکبر کی ہمہ گیریوں، اور فیضی کے تدبر و سیاسی مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے، جسے آج مغربی مدبرین اہمیت دے رہے ہیں۔

اس عرضداشت کے ضمن میں، محمد قلی قطب الملک سنہ ۱۰۲۰ھ والیٔ گولکنڈہ کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"تشیع دارد، و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ، بھاگ نگر بنام بھاگ متی فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ قدیمۂ اوست۔"

کچھ مختصر سے حالات اور غزلوں وغیرہ کے بعد، یہ قابل الذکر بات درج کی ہے کہ:۔

"تربتِ میر حسن دہلوی، در دولت آباد است، غالباً ہمراہ سلطان علاء الدین آمدہ بود، و ایں عمر مستعار را بہ آخر رسانید، بہ خاطر رسید کہ دیوانِ او کشودہ یک غزل تبرکاً و تیمناً، تتبع نمودہ شود، اتفاقاً ایں غزل برآمد

باز نوائے بلبلاں عشقِ تو یاد می دہد ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بہ باد می دہد

شکستہ لبت گفتہ شد، از اتفاقاتِ حسنہ آں کہ نامِ حضرت شاہزادۂ عالمیاں (یعنی مراد) قافیہ بود۔ بنامِ ایشاں مزین ساختہ فرستادہ و ایں معنی را تفاؤل بہ فتح و نصرت ایشاں نمود، و بہ عرضِ اشرف نیز می رساند۔"

اس دورۂ دکن میں، جب وہ احمد نگر پہنچتا ہے، تو اتفاقاً نظام الملک حارسِ احمد نگر کی سرحد "بندرِ جیول" پر ایک جہاز ایرانی مسافروں کو لے کر لنگر انداز ہوتا ہے، اور فیضی جب یہاں پہنچتا ہے، تو اس کی ان لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، وہ حسبِ عادت ان سے ولایتِ ایران و عراق کے تازہ حالات حتی الامکان تفصیلی طور پر معلوم کر کے بادشاہ کے پاس لکھ بھیجتا ہے، اس میں جس قسم کی باتیں درج ہیں ان کے اسباب پر غور کرنے سے خود فیضی کی سیاسی روش اور اکبر کا رجحانِ طبع جھلکتا نظر آتا ہے کہ وہ کن باتوں کا شائق رہا کرتا تھا

اس سے آگے بڑھ کر، ان حالات کے اختتام کے بعد شہر احمد نگر کی سیر کراتے ہوئے، دو مشہور شاعروں کے واقعات، اور ان کی شاعری پر رائے زنی کرتا ہے، ان دونوں میں، ایک "ملک قمی" ہیں، جن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں، اور دوسرے "ملا ظہوری" ہیں، جن کی تعریف و توصیف اور رنگین بیانی کے ذکر کے ساتھ، لکھتا ہے کہ یہ دربارِ شاہنشہی میں حاضر ہونے کی آرزو رکھتے ہیں، بادشاہ کو واقف کرانے کے لئے، ان دونوں کا نمونۂ کلام بھی درج کیا ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے جس کا ذکر یہاں سود مند نہیں۔ پھر اس کے ختم پر مولانا ظہوری کا

زبان سے ایک قصہ نقل کیا ہے۔ حضرت خواجہ گیسو دراز علیہ الرحمہ کا بھی ذکر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ احمد آباد سے گلبرگہ آجاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:-

"ملا عبد اللطیف دبیر پیرے لشوق و مردے
شگفتہ بود، و در برہان پوری بود و عرائض
راجہ علی خاں را او انشا می کرد۔ نقلے غریب
بہ فقیر گزرانید کہ یکے از اولاد سید محمد گیسو دراز
حضرت اللہ نام دارد و پیش ازیں بہ یک سال
در برہان پور آمدہ بود، خادم او پیش من آمد کہ
حضرت اللہ آمدہ اند و دعا می رسانند و می فرمایند
کہ کجا فرود آئیم گفتم خوش آمدند، صفا آوردند،
و در خانۂ خود فرود آیند۔ روز ملاقات بہ ملا
عبد اللطیف گفت، می دانید کہ من کیستم؟ حضرت
مریم را بہ عرش بردند، و حضرت میر سید محمد گیسو دراز
را حاضر ساختند و بی بی را با حضرت میراں
عقد بستند، ما نتیجۂ ایشانیم"۔

"ملا عبد اللطیف می گوید کہ من گفتم، عجب است
کہ بہ فرنگ تشریف نہ بردند۔ گفت آں ولایت
برادر ماست (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی)
معلوم نیست کہ مردم آں جا بہ ما سلوک لائق کنند"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایسے قصوں کو صرف بادشاہ کی دلچسپی کی خاطر لکھا جاتا ہے، جیسا کہ مشہور بھی ہے کہ اکبر کو اس کا از حد ذوق تھا۔ یہ مناسب ہوگا کہ اگر ہم اہم مقامات پر ترجمہ کرنے کی بجائے فیضی کی عبارت ہی ناظرین کی نظروں کے آگے پیش کرتے ہیں، تاکہ واقعات، جن کو وہ اپنے مخصوص انداز بیان میں لکھتا ہے، پورے طور پر اسی کے الفاظ میں نقل کردیے جائیں۔

مذکورۂ بالا قصہ کے بعد تحریر کرتا ہے کہ:-

"بندہ از خواجہ نظام الدین عیسیٰ کہ شنیدہ و غالباً گجرات
ہم رفتہ بود، دیگر شنیدہ شد کہ "بجز" نام حکیم بود،
نظام الملک بحری او را از فرنگ طلبیدہ، اعتبار کردہ بود۔
روزے حکیم در مجلس او از خواجگی شیخ شیرازی کہ
دانشمند آں مشہور است و شاگرد خواجہ جلال الدین
محمود پرسید کہ اگر آں سر دنیا آتش افروزند مانع
نہ باشد از کوہ و تل، آں آتش دیدہ می شود، با آنکہ
مانع نیست خواجگی شیخ جواب داد کہ از بہت
بعد مسافت دیدہ نمی شود حکیم فرنگی بہ نظام الملک
گفت کہ اگر حکم شود، رقص کنم کہ ایں سخن صد رقص
دارد، در ہماں ساعت شاہ طاہر رسید و پرسید کہ
چہ سخن می گذرد، تقریر کردند، شاہ طاہر گفت،
خواجگی شیخ غلط کردہ، عناصر ہمہ بسیط اند مرئی
نمی شوند، و ایں آتش کہ مرئی می شود بہ جہت
ترکیب است با اجزاء ارض"۔

معین الدین زبیر فاروقی

یاس کا سکون

کامیابی زندگی کی موت ہے۔ وہ خواہش، وہ تمنا، وہ آرزو، وہ امید ہو شرمندہ نہیں ہو سکتی جس کا انجام یاس والم نہ ہو۔ دلوں کے ٹوٹنے میں ایک زندگی ہے۔ آرزوں کی ناکامی میں ایک روحانیت و چہل پہل ہے۔ تمناؤں کی ان بان یاس و غمگینی کے پیمانہ میں اپنا اصلی روپ دکھاتی ہے۔ خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں کی گود میں پلنے والے ہجوم الم کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی حقیقی کامرانی ارمانوں کا ماتم ہے۔ ان خواہشات کو سرخروئی نہیں نصیب ہوتی جن کی میت دھوم سے نہ نکلے۔ یاس میں جو مٹھاس ہے وہ اس آرزو ارمان میں نہیں۔ یہ مانا۔ اس کو تسلیم کرنے سے کس کافر کو انکار ہے کہ دل آرزوں کا گہوارہ ہے۔ مگر ہر آرزو پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتی۔ آرزو کی تو یہی شان ہے کہ وہ انسان کے ساتھ دفن ہو جائے۔ اس تمنا میں کوئی رنگینی نہیں جو ایک کامیاب تمنا سے معنون کی جائے۔ اسی طرح افسانہ بھی اسی وقت ایک کامیاب افسانہ کہلانے کا مستحق ہے جب کہ وہ کسی کی زندگی کا ایک المناک سانحہ بن کر اس سے وابستہ ہو جائے۔ کسی کام کے سرانجام پانے میں پورے ہو جانے میں وہ بات نہیں جو ادھورے پن میں ہوتی ہے۔ محبت ایک کھیل ہے۔ اس کو کھیل ہی سمجھ کر سب کھیلتے ہیں۔ کیوپڈ تیر و کمان لے کر کھیلتا ہے۔ یہ بچہ ہے۔ اس کی معصوم شخصیت دنیا کے ناجائز ہتھکنڈوں سے لاعلم رہتی ہے۔ اسی لئے غالباً محبت بھی بچپن ہی میں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے پریم کو پروان چڑھتے کس نے دیکھا ہے۔ اور شاید یہی اس کی کامیابی کی زبردست دلیل ہے۔ مجھے افسانہ لکھنے کا ایک جنون تھا۔ میں یوں ہی اناپ شناپ قصے کہانیاں لکھتا اور اپنی دانست میں ان کو بہت بڑے پایہ کے افسانے سمجھ رہا تھا۔ دنیا کی نظروں میں نہیں، اپنے آپ کو دھوکہ دینے، میں خود کو ایک زبردست ادیب و نامہ نگار تصور کرتا تھا۔ میرے افسانوں میں نہ کوئی کشش تھی نہ دلچسپی۔ اکثر میرے افسانے مزاحیہ ہوتے تھے۔ جن کو پڑھ کر انسان کا صرف وقت ضائع ہو سکتا ہے۔ اور کوئی نتیجہ ان کا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتے ہوتے، رفتہ رفتہ میں اپنی افسانہ نگاری سے بھی بیزار ہو گیا۔ میں اب ایک جیتے جاگتے انسان کی زندگی کا خود مطالعہ کر کے ایک افسانہ لکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اب ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جس پر سچے معنوں میں ایک رومانی زندگی کا افسانوی رنگ چسپاں ہو سکے۔ جس کو دیکھ کر، جس کو سن کر، جس سے گفتگو کر کے میں ایک فسانہ لکھ سکوں یہ بھی میری ایک انوکھی اور عجیب و غریب تمنا تھی۔ اور تمنا تو ہمیشہ ہی نادر و عجیب ہوتی ہے۔ تمنا کا شاید دوسرا نام جنون یا خبط ہے۔ میں بھی ایک ایسے شہکار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اپنے انوکھے افسانے کا ایک انوکھا ہیرو۔ یوں بھی میرے والدین میری مضمون نگاری کو ایک بے کاری کا شغل سمجھتے تھے۔ طعن و ملامت سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔ وہ مجھ سے میرے حصول علم کا کوئی زبردست معاوضہ چاہتے تھے۔ لیکن میں اس راستے سے دور تھا۔ بہت دور۔ مجھے ملازمت کے نام، اس کی پابندی اور غلامی کے صرف تخیل ہی سے الجھن ہونے لگتی تھی۔ میں ایک آزاد خیال نوجوان تھا۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ مجھے خودکشی پر مائل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ میں ہر کام میں آزادی چاہتا تھا۔ جو ہر انسان کا

پیدائشی حق ہے۔ جب یہ سب کے سب میری طبیعت کی اٹھان سے عاجز و تنگ آگئے تو اب ایک دوسری اسکیم شروع ہوگئی۔ خاموش نگاہوں سے میرے کردار پر غور و خوض ہونے لگا۔ میرے اٹھنے بیٹھنے لکھنے پڑھنے آنے جانے پر بہ ظاہر کوئی روک ٹوک تو نہ تھی۔ اور ہوتی بھی تو یہاں ماننے والا کون تھا ــــ لیکن زبان کو کون روکے۔ چہ میگوئیوں کا بازار گرم تھا۔ سارے کنبہ والے گویا برادران یوسف تھے اور میں تن تنہا یوسف مظلوم ــــ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ ہاں میں ہاں ملانے والے کہاں نہیں ہوتے۔ میرے ملنے والے بہت کم تھے۔ میرے دوستوں سے زیادہ میرے دشمنوں کا حلقہ وسیع تھا۔ میں لڑکپن سے ضدی اور ہٹ دھرم مشہور تھا۔ ان سب کی کٹ حجتی اور دخل درمعقولات نے میری فطرت میں ان خصایل کو اور ابھار دیا تھا۔ مجھے یوں بھی دوست احباب کی محفلوں سے گھبراہٹ سی ہوتی تھی۔ ظاہر داریوں کو قبول کرنے سے میرے ضمیر کو سرے سے انکار تھا۔ "تپاک" کے لفظ سے میرا دم الجھنے لگتا تھا۔ میں جھوٹی بناوٹی اور رسمی خاطرداریوں کو روا رکھنے سے قاصر تھا۔ بس اب تک تو اس تمہید سے آپ میری فطرت کا ایک اچٹتا خاکہ معلوم ہو چکا۔ اب مجھ جیسے مشکل پسند سے اپنے افسانے کے لئے کس قسم کے ہیرو کی تلاش تھی اس کی کچھ روداد سنئے۔

جستجو میری فطرت کا خاصہ ہے۔ اور اپنی اس عادت سے میں مجبور تھا۔ میں آج صبح ہی صبح گھر سے نکل گیا۔ دیوانوں کی طرح۔ جن کا کوئی منزل مقصود ہی نہ ہو۔ میری آنکھیں تلاش دکھوج کے پیک لئے ہوئے راہ گیروں کا مشاہدہ کرنے لگیں۔ یوں بھی تھوڑی دیر کے لئے کوئی لب سڑک کھڑا ہو جائے تو اس کو کیا نظر نہیں آتا۔ دنیا جہاں کے لوگ۔ قسم قسم کی شکل۔ ہر نوع کا انسان، ہر قسم کا آدمی ــــ مجھے ان کانچ کے ٹکڑوں میں ایک ایسے ہیرے کی تلاش تھی جس کے وجود سے میرے افسانے کی دنیا میں چار چاند لگ جائیں۔ سارے عالم کی نگاہیں جو خیرہ کردے۔ ایک کائنات میں اس کی شخصیت پر سب ایمان لے آئیں۔ ایک دقت پسند انسان کا ایک انوکھا ہیرو ــــ میرے راستے میں دشواریاں حائل تھیں۔ اس پتھریلی زمین پر مجھے بغیر کسی رہبر کے چلنا تھا۔ راستہ کا پتہ تھا نہ منزل مقصود کی خبر تھی ــــ کس نرالے انسان کی مجھے جستجو تھی۔ میری تمنا بڑی کٹھن تمنا تھی۔ میرے خواہشات کے سمندر کا دور دور تک ساحل نظر آتا تھا۔ آسمان سے تارے توڑ لانے کی طفلانہ امنگ شاید اسی کا دوسرا نام تھا۔ میری ہمت بہت بلند تھی۔ اور وہی میرا ساتھ دئے جاتی تھی۔ کسی حکیم مطلق کا یہ خیال ع

ہم تو مایل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

تخیل کی گنجان وادیوں میں گونج رہا تھا ــــ اور سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ میری خواہش میں "خلوص" تھا۔ میری تلاش میں "حقیقت" جلوہ گر تھی۔ میری آرزوؤں کی نگری میں "اصلیت" اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ مجھے اپنی قوت ارادی پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ مجھے گوہر مقصود کے ہاتھ آجانے کی کامل توقع تھی۔ اب یہ دشوار تر منزل آسانیوں کے پرتوے معمور ہوتی جاتی تھی۔ راستہ تھا۔ لوگ آجا رہے تھے مختلف قسم کے لوگ۔ اکثر ایسے جن کے چہروں پر اطمینان تھا، سکون تھا، کہیں کسی کسی چہرہ پر مسرت کی ایک ہلکی سی لہر تھی۔ اکثر ایسے سرگرم جن کو دنیا اپنے ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ وہ دنیا سے خوش ہیں اور دنیا ان سے خوش۔ بعض کے قیافہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس جینا اور جیئے جانے کی تمنا کرنا ہی ان کے دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ بھلا ان سے کیا میری تشنگی دور ہو سکتی تھی۔

ان کا افسانہ ہی کیا ہوگا ؟ مجھے اس آب حیات کی تلاش تھی جو ظلمات کی تاریکیوں میں اپنی پوری آب و تاب سے سیماب وش لرزاں تھا۔ میرے نزدیک تو ایسے لوگ داخل آدم ہی نہیں جو درد دل نہیں رکھتے۔

چینی میں بال آجانے سے اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ وہ چیز دو کوڑی کی ہوجاتی ہے لیکن انسان کا دل جس کو عموماً آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں، ٹوٹ کر اتنا بیش قیمت اور انمول ہوجاتا ہے کہ دونوں عالم میں اس کو مول لینے کے لئے کوئی سرمایہ نہیں۔ اس کے افسانے کا پلاٹ جب ہی شروع ہوجاتا ہے۔ ایک المیہ و حزنیہ افسانے کا پلاٹ۔ مجھے ایک ایسی ہی شکستہ دل ہستی کی سعی لاحاصل تھی۔ لیکن "ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔" مالک کے کارخانے میں دیر ہے اندھیرا نہیں۔ آخر صیاد جستجو کو اس کا صید حقیقی مل چکا ——
ایک نوجوان لڑکا درویش جیسی شکل لیئے ہوئے سامنے سے گزر گیا۔ جس کی چال ڈھال صورت شکل اس کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کا دل ایک آتش دان تھا، ایک دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی تھی، جہاں کبھی شراروں نے اس کے لئے جینا وبال کردیا تھا۔ لیکن اب امتداد زمانہ نے ان شراروں کو بجھا کر وہاں خاکستر کا ایک ڈھیر لگادیا تھا۔ محبت کا نام میں نے کئی دفعہ سنا تھا، افسانے پڑھے تھے جن کی اکثریت محبت ہی کے گورکھ دھندے پر مبنی تھی۔ لیکن آج اس کو دیکھ کر محبت کے حقیقی معنے میری سمجھ میں آرہے تھے۔ میرے افسانے تو بالکل پھیکے، بے معنے اور نکمے ہوتے تھے۔ ان شاہکاروں سے ان کا کیا مقابلہ۔ لیکن ان بھولے ہوئے افسانوں کے خواب کی تعبیر مجھے اس کی شکل میں مل گئی تھی۔ محبت کو بعض کوتاہ بینوں نے گناہ سمجھا ہے۔ محبت نہ گناہ ہے نہ کوئی جرم بلکہ ایک مذہب ہے۔ ایمان ہے اور مذاہب تک پہنچنے کا ایک سب سے اونچا زینہ —— اب سمجھنے والوں کا کیا ہے۔ دنیا کس کو اچھا سمجھتی ہے۔ اس کی نظروں میں تو سرے سے سب ہی برے ہیں۔ بدی جن میں بستی ہے اس کو ہر بات میں بدی کا ہی پہلو نظر آتا ہے۔ اچھوں کا خیال کبھی برائی کی طرف نہیں جاتا ——
اس کو دیکھنے سے پہلی نظر میں ہی یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ قدرت نے اپنے جبر و ظلم سے اس کو صبر کرنا بھی سکھلا دیا تھا۔ اس کو برداشت کے سب ڈھنگ آگئے تھے۔ گو صبر کا دامن کبھی کبھی ماضی کی کانٹوں میں الجھ کر پھٹ جاتا تھا۔ اور اس کے لئے زندگی اتنی دوبھر اجیرن ہوجاتی تھی کہ وہ دیوار پر سر پٹک کر مرجانا چاہتا تھا۔ لیکن مر نہیں سکتا تھا۔ وہ خودکشی کو بزدلی سمجھتا تھا۔ بہادر ایک ہی وقت موت کا مزہ چکھتا ہے۔ اور نکمے بزدل دن میں سو مرتبہ مرتے ہیں۔ لیکن شاید محبت کرنے والے فی زمانہ سخت جان ہوتے جاتے ہیں۔ ورنہ کبھی تو یہ ضرب المثل عام تھی ؏

عشق جو کرتا ہے سنتے ہیں جواں مرجاتا ہے

یہ تو صرف اس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد میرا قیاس تھا۔ میں نے اپنے تخیل کا سرچشمہ آسمانی بلندیوں سے ٹکراتا ہوا آرہا تھا۔ جس میں کچھ جان تھی۔ جس طرح کسی بچہ کو کوئی نیا کھلونا ملنے سے خوشی ہوتی ہے۔ اس وقت اس کو کوئی دوسری بات یاد نہیں رہتی۔ اس کو کسی کی موجودگی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ میری یہی کیفیت تھی۔ میری جستجو کی اڑ کو سہارا مل گیا تھا، میری کھوج کے پیک کامیاب واپس آرہے تھے —— اس کی آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھیں —— اس کی کھوسٹ تجربہ کاروں

جیسی چال، قدم اٹھانے میں ایک عجیب قسم کا پس وپیش ـــ گرد و نواح پر ایک ایسی نظر ڈال رہا تھا جیسے دنیا اس کی نگاہوں سے بالکل اتر گئی ہے۔ اس کے ذرہ ذرہ میں اس بوڑھے فلسفی کا نظریہ "دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا" رقص کرتا معلوم ہوتا تھا۔ میں کیسے اس سے گفتگو کروں۔ میں بات چیت میں پہل کروں تو وہ خدا جانے کیا سمجھے۔ میری جسارت ایک مہمل سی بات ہوگی۔ ایسے اور اس قسم کے کئی سوال میرے ذہن میں آمد ورفت کا سلسلہ باندھ چکے تھے۔ مگر کسی اجنبی کو حق ہی کیا ہے کہ وہ اس طرح کسی کو بے تکلفی سے مخاطب کرے۔ لیکن مجھے اس وقت کوئی اور ہی دنیا بسانے کی فکر تھی۔ مجھے اپنی جستجو نے اندھا بنا دیا تھا۔ میری عادت نہیں کہ بات چیت میں کبھی کسی سے سبقت کروں۔ اسی لئے مجھ سے ملنے والے مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔ جو انتہائی غلطی پر ہیں۔ لیکن اس وقت میرا دعوئے خودداری باطل ہوا جاتا تھا۔ میری حمیت کا بھرم کھلنے والا تھا۔ اپنی عادت پر جبر کرنا بھی بعض وقت کتنا سنگین ارادہ بن جاتا ہے۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا اور اس سے بالکل واقف کاروں جیسی باتیں کرنے لگا۔

میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ شاید آپ ـــ اور پھر زبان میں لکنت سی آگئی۔ مجھ پر ایک رعب سا طاری ہوگیا۔ اور آگے میں کچھ بول نہ سکا ـــ پھر بھی بڑی ہمت کرکے یہ۔ یہ لیجئے سگریٹ ـــ اب میں یہ سوچنے لگا کہ صرف صحبت ہی اندھی نہیں ہوتی، تمنا کو بھی اندھا ہونے کا حق ہے۔ اس نے میرے سگریٹ کے سوال پر ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی متانت سے جواب دیا "آپ بھولتے ہیں۔ میں نے تو کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔ مجھے جمالی کہتے ہیں۔ سگریٹ چھوڑے مجھے عرصہ ہوا۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ کب چھوڑا تھا۔ اب تو مجھے کسی چیز کی بھی طلب نہیں رہی۔ مرگ ناگہاں کا طالب ہوں اور بس۔ آپ میری اس بدتمیزی سے ناراض تو نہیں؟" اس کی آواز میں ایک رقت تھی۔ ایک کیف آور سوز و گداز تھا۔ اس کے تیور سے ایک بے بسی و بے کسی کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کی بناوٹی ہنسی غائب ہوگئی تھی۔ اس کے چہرہ کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ میں منزل مقصود کے بالکل کنارے لگ گیا تھا۔ میرا دل متضاد کیفیات کا بازیگاہ بنا ہوا تھا۔ لیکن جذبات چھپانے میں مجھے خوب ملکہ حاصل تھا۔ خوشی و غم کا اظہار بے ڈھنگے پن سے وہ کرے جس کو کبھی کبھی یہ واردات پیش آئے۔ سرے سے جس کی زندگی ہجوم افکار و آلام کے ہنگاموں سے معمور ہو اس کے لئے "مسرت" تو ایک بے معنی سا لفظ ہے۔ اب رہا غم ـــ جو غم دل ہے۔ وہ تو جان سے بھی زیادہ عزیز و پیارا ہے ـــ

ہاں تو میں پھر اس کی جانب ایسے مخاطب ہوا جیسے میرے دل میں کچھ تلاطم ہی نہیں۔ سگریٹ کا دھواں ہوا میں منتشر کرتے ایک انداز استغنا سے:۔ کیوں ایسی کیا دنیا سے بیزاری یہ سن اور ایسی نکمی باتیں۔ تم جیسے نوجوانوں کو تو زیب نہیں دیتیں۔ قومیت کو تم پر ناز ہونا چاہیئے۔ یہ زمانہ قیس و فرہاد کا نہیں رہا۔ دنیا زندہ دل ہستیوں کو آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ رونے والے تنہا روتے رہتے ہیں۔ تم ہنسو دیکھو ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی ہنسی آجائے گی۔ رونا بسورنا چہرہ کی رونق کو بگاڑ دیتا ہے۔

جمالی ـــ (قطع کلام کرتے ہوئے) اف آپ تو حضرت ناصح کے بھی پڑ دادا معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ہی سانس میں اتنی نصیحتیں۔ مگر حضور یہ خادم اب نصیحت کے حلقہ سے باہر ہے آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ مجھ پر کسی کی خفگی کا اب اثر نہیں ہوتا ہے

ہم سے شکستہ بال اسیروں کے روبرو
ناحق خبر نہ لا کے سناؤ بہار کی

معاف کرنا آپ تو مجھے کوئی خفیہ پولیس معلوم ہوتے ہیں۔
میں ـــ کیوں کیا سوائے خفیہ کے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی سے کچھ دریافت کرے؟

جمالی ـــ ہے کیوں نہیں۔ لیکن میری زندگی میں ایسی کوئی دلکشی نہیں جس کو سن کر آپ مطمئن ہوسکیں پھیکے جیون میں رس کہاں سے آئے۔ ندی جب سوکھ جاتی ہے تو بارش کی انتہائی کثرت بھی اس کو از سر نو تر و تازہ نہیں کر سکتی ـــ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے قلب و جگر میں نمی آجائے ـــ جیسے اس وقت آپ کی پرلطف گفتگو سے میرا غم ہلکا ہوتا جارہا ہے ـــ لیکن جونہی یہ نضا ہٹے پھر وہی میں اور وہی میری زندگی ـــ وہی سوکھی ہوئی ندی ـــ وہی تمازت آفتاب سے جھلسی ہوئی ایک پگڈنڈی ـــ "عموماً پتھر کے نیچے پانی رہتا ہے لیکن جمالی کا دل ایک ایسی چٹان تھا جس کی انتہائی گہرائیوں تک صرف پتھر ہی پتھر ہوں۔ ایسی سنگلاخ زمین سے جب دھواں نکلے تو کیا اس کی صرف بھاپ سے ہی سارا سنسار جل نہیں سکتا؟ بات کرتے میں اس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ اس کی آنکھیں مبہوت و ساکت تھیں۔ ان میں جان تھی مگر چمک نہ تھی۔ جگر تک غالباً اس کا جل گیا تھا۔ جہاں آنسو جل چکے تھے۔ میری دلی بے چینیوں میں لمحوں اضافہ ہو رہا تھا۔ اطمینان مجھ سے کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اس لئے آفتاب بھی روپوش ہونے کے لئے پینترے بدل رہا تھا۔ چرواہے ادھر ادھر سے اپنے اپنے مویشیوں کو سمیٹ رہے تھے۔ دیہات کی جھونپڑیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ راستہ پر ایک آسیبی سناٹا چھا گیا تھا۔ درخت بھوتوں کی طرح کھڑے فطرت کے نشیب و فراز پر غور کر رہے تھے۔ چاند میں بتدریج چمک اور روشنی پیدا ہورہی تھی۔ تارے کسی کے دل کی طرح دھڑک دھڑک کر فضائے سماوی پر نمایاں ہورہے تھے۔ غرض ایک دنیا پر روحانی کیفیت تھی۔ ایک عالم پر محویت تھی ـــ لیکن میرے قلب کے ہیجان میں کوئی کمی نہ تھی۔ صبح کا نکلا ہوا۔ بھوک سے میری جان پر بنی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک رسٹراں میں پہنچے۔ وہاں چاء پی۔ کچھ زہر مار کیا۔ اور پھر نکل گئے۔ ہم ایک مختصر سے پارک میں جا بیٹھے۔ درختوں کے سایہ سے چاندنی چھن چھن کر گر رہی تھی۔ بڑا سہانا وقت تھا۔

جمالی نے ایک انگڑائی لی۔ اور کہنے لگا:۔ مگر آپ کا نام۔ آپ نے نہیں بتایا؟ میں ـــ مجھے شاہد کہتے ہیں
جمالی (کچھ سوچتے ہوئے) مجھے اس نام سے ایک عجیب انس معلوم ہوتا ہے۔

شاہد ـــ واقعی؟ تب تو میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ کم از کم میرے نام سے تو تمھیں انس ہے۔ یہ سنتے ہی جمالی پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا ـــ میں مضطرب ہوگیا۔ میرا جی چاہتا تھا اس کے قدموں پر گر جاؤں اور اس کے رونے کا سبب پوچھوں۔ لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ بتائیے آپ کو ایسے اتفاقات ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ میری تو سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی ـــ پہلے تو میں نے اس کو خوب رونے دیا کہ دل کا سوز ذرا ٹھنڈا ہو جائے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ ان آنسوؤں کے فلسفہ پر بہت دل دکھا کے یہ نظریہ کسی نے قایم کیا ہے ؎

سیلاب اشک گرم نے اعضاء میرے تمام
اے درد کچھ بہا دیئے اور کچھ جلا دیئے

جیسے ہر طوفان سے پہلے ایک سکون ہوتا ہے اسی طرح اس طوفان کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جس کو سکون کہنا پڑے گا۔ یہ نظام کائنات کے منتر ہیں۔ دنیا ایک حالت پر نہیں رہتی ـــــ جمالی کا گریۂ پیہم ہچکیوں میں تبدیل ہوتے ہوئے خاموش ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پیر سرد ہوتے جاتے تھے۔ میں نے کہا "تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بچوں کی طرح رونا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ بتاؤ جمالی میں تمہارا دوست ہوں۔ "بھائی" بننا نہیں چاہتا۔ کیونکہ بھائی بہت سے ہوتے ہیں۔ سچے دوست نہیں ملتے"۔

جمالی ـــــ شاہد اب تم سے کچھ چھپانا میرے نزدیک گناہِ عظیم سے بھی کچھ پرے ہے۔ سنو۔ میں نے محبت کی تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی غلطی مجھ سے ہوگئی۔ محبت دور اندیش نہیں ہوتی۔ بھولا بھالا انسان کتنی جلد اس کے ہتھکنڈوں میں پھنس جاتا ہے محبت کی ابتدا کتنی سندر ہوتی ہے۔ لیکن شاید تمنا پوری ہو تو زندگی وہیں ختم ہو جاتی ہے لیکن شاہد یہ مکار اور پاپی سماج سچی و بے لوث محبت کو بھی نام رکھتی ہے۔ گر بلند و بالا کردار والے سماج کی ٹیڑھی نگاہوں، بے تباہ نکتہ چینیوں نارواہیتانوں کو ہمیشہ حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ محبت ایک شریف اور نیک جذبہ ہے۔ ہے نا؟ اور شرافت کا محبت سے گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے تو محبت کا درجہ ایک مذہب کے مترادف ہے۔ شاید قدرت کے احسان مصیبت کی شکل میں بھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے ٹھکانے پر چپ چاپ ایک خاموش زندگی بسر کر رہا تھا۔ گر قدرت کے تیور بگڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے نجانے میرے کون سے گناہ کا بدلہ لینے والی تھی ـــــ "کسی" نے میری زندگی میں قدم رکھ کر ـــــ اب اس کے آگے مت پوچھو اور نہ میں تمہیں بتا سکوں گا۔ یہ میری زندگی کا بہت بڑا راز ہے اب تک تو صرف "اسی کے لئے" جینے کا احساس تھا۔ مگر اب ـــــ یہ داستان بھی ختم ہو چکی ہے۔ میرے جیون کو یونہیں بیت جانے دو۔ ہٹو یہاں سے" وہ کچھ بہک گیا تھا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ رہا تھا ـــــ اس نے جس پتھر پر پیر رکھا تھا وہ ہٹ گیا تھا۔ اس کی زندگی ڈانواڈول ہو رہی تھی ـــــ اس کے بعد میں اور جمالی ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یوں تو اس کے کچھ عزیز تھے مگر وہ سب سے دور رہنا چاہتا تھا ـــــ ہم کو ساتھ رہتے رہتے ۱۰-۱۲ سال ہوتے ہیں ـــــ لیکن جمالی کی حالت میں اب تک کوئی فرق نہیں آیا ـــــ وہی خاموشی ہے ـــــ وہی چپ ہے ـــــ وہی سب کی نظریں بچا کر رونا ہے۔ راتیں سسکیوں کی آواز میں گم ہو جاتی ہیں۔

کسی کی یاد کو سینے میں "دل" بنائے ہوئے
بہانہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں اپنے مرنے کا

واقعی دنیا میں سچی محبت کرنے والے ہزاروں میں "ایک" ہوتے ہوں گے وہ بھی ـــــ شاید ـــــ!!

جہاں بانو بیگم

اردو کے ہندو ادیب

اردو اور نثری ادب کو بنانے اور ترقی دینے میں بھی ہندو ادیبوں اور انشا پردازوں کا اتنا ہی وسیع حصہ ہے جتنا اردو شاعری کو مقبول بنانے اور ترقی کے موجودہ مدارج تک پہنچانے میں ہے۔ نظم اور شاعری میں ان کی کوششیں جس طرح غزل قصیدہ مثنوی رباعی غرض ہر صنف حاوی ہیں اسی طرح نثر میں بھی ان کے کارنامے داستان قصص ناول خطوط ڈراما غرض ہر ادبی صنف میں موجود ہیں ان میں کئی کارنامے ایسے ہیں جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے شعری کارناموں کی طرح "ادب عالی" میں داخل ہو چکے ہیں۔

جس زمانے سے اردو نثر لکھنے کا رواج عام ہونے لگا اور اردو انشا پرداز فارسی کی تقلید میں خیالی مضامین مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھنے لگے، ہندو انشا پردازوں نے بھی اس میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے لیکن ایسے نثری کارنامے اب کم ملتے ہیں صرف تحسین اٹاوی کی "نوطرز مرصع" نمونے کے لئے باقی رہ گئی ہے۔

اردو نثر کی ترقی اور ترویج حقیقی طور پر ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اسی زمانے میں کلکتہ کا وہ مشہور مدرسہ عالیہ قائم کیا گیا جس کے کارنامے اردو نثر کی ترقی میں داغ بیل کا حکم رکھتے ہیں۔ اس مدرسے کے قیام کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان عہدہ داروں کے لئے جو ہندوستان میں خدمتوں پر مامور ہو کر آتے یہاں کی عام زبان میں درس و تدریس کے وسائل فراہم کرنا تھا۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کمپنی کے اعلیٰ عہدہ دار ڈاکٹر گلکرسٹ نے مدرسے میں اطراف ہند سے ہندوستانی زبان کے اچھے لکھنے والے اور ادیب جمع کئے۔ انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ مروجہ طرز عبارت آرائی کو چھوڑ کر عام بول چال کی زبان میں کتابیں لکھیں چنانچہ اسی ہدایت کے بموجب میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" تصنیف کی جو عام طور پر "قصۂ چہار درویش" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ میر امن کے علاوہ حیدر بخش حیدری، للو لال کوی، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاں، بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف وغیرہ نے بھی کتابیں تصنیف کیں اور اس طرح اردو نثر کا ابتدائی ذخیرہ پیدا ہوا۔

ان اہل قلم کی کوششوں میں ادبی لحاظ سے یہ اہمیت رکھتی ہیں۔ طوطا کہانی، لطائف ہندی، سنگھاسن بتیسی، مذہب عشق، چہار گلشن، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی اور گلشن ہند۔

ان آٹھ کارناموں میں سے چار ہندو ادیبوں کے ہیں۔ للو رام اور ان کے ایک اور ساتھی سدل مسرا، درحقیقت ہندی نثر میں کتابیں لکھنے کے لئے مامور کئے گئے تھے چنانچہ انھوں نے ہندوستانی زبان سے عام مسلمان مصنفین کے برخلاف فارسی اور عربی کے الفاظ کو چھانٹ کر ان کی جگہ سنسکرت کے کم اور برج بھاشا کے الفاظ زیادہ داخل کر کے ہندی نثر کی داغ بیل ڈالی لیکن للو لال کی کتابیں "لطائف ہندی" اور "سنگھاسن بتیسی" دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں میں چھپی ہیں اور جس طرح وہ ہندی میں شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں اردو میں بھی عام طور پر مقبول ہیں۔ چنانچہ ان کے کئی ایڈیشن چھپتے رہے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ناول اور مغربی طرز کے مختصر قصوں کی ترویج کے سبب ان قدیم قصوں کا زیادہ رواج نہیں رہا۔

نہال چند لاہوری کی تصنیف "مذہب عشق" اور منشی بینی نرائن جہاں کی کتابیں "نثر بے نظیر" اور "چہار گلشن" اس زمانے کی مروجہ اردو نثر ہی میں لکھی گئی ہیں اور اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے باہر جو لکھنے والے شہرت رکھتے تھے ان میں ہندو ادیبوں کی تعداد مسلمانوں سے

کچھ کم نہیں ہے۔ مسلمان ادیبوں میں صرف رجب علی بیگ سرور فقیر محمد خاں گویا اور مولٰنا غلام امام شہید کے نام لئے جا سکتے ہیں لیکن ہندوؤں میں اور خاص طور پر مقبول اور عام مذاق کے مطابق لکھنے والوں کی تعداد ایک درجن سے کسی طرح کم نہیں ملے گی۔ ان میں سب سے پہلے نیم چند کھتری کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کا قصہ "گل باصنوبر" بے حد مقبول ہوا۔ اور ناول کی ترویج سے پہلے تک بہت پڑھا جاتا تھا۔ اب بھی اردو کے مقبول قصوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرے لکھنے والے منشی جیرو نجی لال ہیں جن کا قصہ "قصۂ سورج پور" کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ ایک اور اچھے لکھنے والے منشی طوطا رام شایاں تھے جنھوں نے "الف لیلیٰ" کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ "نل دمینتی" کے مشہور ناٹک کو اردو میں منتقل کرنے کی خدمت جس ہندو ادیب نے انجام دی وہ منشی بنائک پرشاد تھے۔ منشی ٹھاکر پرشاد اپنی تصنیف "افسانہ پر فضا" کی وجہ شہرت رکھتے ہیں ایک اور انشا پرداز منشی ہیم چند ہیں جن کا قصہ "اگر گل" اتنا ہی مقبول اور مشہور ہوا جتنا "مذہب عشق" یعنی گل بکاؤلی کا قصہ یا آرائش محفل یا حاتم طائی کا قصہ۔ منشی ہلاتی داس کا قصہ "حیرت افزا" بھی اس سلسلے کے مقبول قصوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایک اور قصہ جو کئی بار چھپ چکا ہے۔ منشی انبی پرشاد کا قصہ "طوطا مینا" ہے۔

ان قصہ نگار ادیبوں کے علاوہ کئی ادیب ایسے بھی ہیں جو دوسرے کاموں پر مامور تھے اس لئے ٹھیٹ ادب کے متعلق وہ زیادہ تصنیف و تالیف نہ کر سکے۔ یہ تاریخ، سائنس اور حکمیات اور تذکروں کی تدوین میں مشغول رہے۔ منشی سدا سکھ لال نے "سوپریم گورنمنٹ ایکٹ" کے قانون کو اردو میں منتقل کیا۔ پنڈت سروپ نارائن اور پنڈت شیو نرائن جو اس زمانے میں دہلی کالج کے اعلیٰ اسکالر تھے طبیعات میں ایک کتاب کے مترجم ہیں جو "حکمت عملی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اردو نثر کی ترقی کا ابتدائی دور ہے اس کے باوجود ان مترجمین نے حکمی خیالات کے اظہار کے لئے جیسی عمدہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے اس سے ان کی قدرت زبان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دہلی کالج کے ایک اور مشہور مصنف ماسٹر رام چند ہیں جن کی تالیف "تذکرۃ الکاملین" بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں یونان روما اور انگلستان کے مشہور فلسفیوں کے علاوہ فارسی شعرا اور ہندی مشاہیر کے حالات نہایت سلیس اور صاف زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ماسٹر رام چند کا سب سے بڑا اور نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اردو کے ایسے غیر فانی ادیب جیسے آزاد، نذیر احمد اور ذکاء اللہ نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے۔ "تذکرۃ الکاملین" کے علاوہ ان کی دو اور کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں ایک "اصولِ علم ہیئت" اور دوسری "عجائب روزگار"۔

اردو ادب کا جب جدید دور شروع ہوا۔ اور اردو زبان سر سید احمد خاں، حالی، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور شبلی کی انتھک کوششوں سے جلد جلد وسعت اور ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہی تھی، ہندو ادیب بھی مسلمان ادیبوں کے دوش بہ دوش اس کو ترقی دینے میں مصروف تھے لیکن جدید عہد کی تحریکوں سے وہ اس قدر جلد متاثر نہیں ہوئے بلکہ وہ قدیم دبستان ہی کے پیرو تھے اور اسی انداز میں اپنی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں جو قابلِ ذکر ہیں ان میں سے ایک منشی دیبی پرشاد جو سنجیدہ عالم تھے اور ادب کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تاریخ اور سیر سے ان کو بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اسی مطالعے کے نتیجے کے طور پر جو ذخیرہ ان کے پاس فراہم تھا

اس میں سے تاریخی لطیفوں کو چھانٹ کر انھوں نے ایک کتاب "لطائفِ ہندی" کے نام سے لکھی تھی جو منشی نولکشور کے مطبع سے شائع ہوئی۔ منشی دیبی پرشاد کی تصنیفات تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن اپنے علمی مذاق اور ثقہ ذوق کی وجہ سے وہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اردو شعر و سخن اور ادب کا ذوق انھیں ترکے میں ملا تھا۔ ان کے والد منشی نتھن لال بہجت فارسی اور اردو کے اچھے انشا پرداز اور شاعر تھے۔

ایک اور مصنف بابو جگناتھ پرشاد فیض ہیں۔ جن کا تذکرہ "گلزارِ سخن" ہمیشہ تک زندہ رہے گا۔ یہ تذکرہ نہ صرف شعرا کے حالات پر مشتمل ہے بلکہ اس میں عروض اور قافیے کے متعلق بھی مفید معلومات درج ہیں۔ اس تذکرے کی ترتیب میں مرتب کو اپنے ایک دوست رام کرن سے بڑی مدد ملی تھی جس کا انھوں نے اعتراف کیا ہے۔

اردو میں کنڈر گارٹن یعنے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے موضوع پر غالباً پہلی کتاب جو اس زمانے میں لکھی گئی اس کے مصنف لالہ خزان چند جادلہ بی' اے ہیں وہ ضلع لائل پور کے مہتمم مدارس تھے۔

اس زمانے کے بعض مشہور اخبار نویس بھی ہندو ہیں۔ "سحرِ سامری" کے نام سے جو ہفتہ وار لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اس کے مدیر رائے گمبھیر نرائن تھے "مشہور" اودھ اخبار" کے مالک اور مدیر منشی نولکشور تھے۔

منشی نولکشور اردو ادب کے بقا اور زبان کی اشاعت میں وہ کام کر گئے جو بہت کم لوگوں سے ہو سکا۔ اس زمانے میں جب کہ اردو چھاپہ خانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی انھوں نے اپنے مطبع کے ذریعے "اردو ادبِ عالی" کے جواہر پاروں کو محفوظ کرنے کی جو سعی بلیغ کی ہے وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت کو بھی برقرار رکھے گی۔ اس مطبع کی اردو خدمات کا تذکرہ ایک تفصیلی کتاب چاہتا ہے۔ منشی نولکشور کے بعد ان کے جانشین منشی حالیا پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے اس خدمت کو اسی سلیقے اور بلند ہمتی کے ساتھ جاری رکھا" اودھ اخبار" کی ترقی بھی مطبع کے ساتھ ساتھ جاری رہی۔ اسی اخبار کو پنڈت رتن ناتھ سرشار کی ادارت کا شرف بھی حاصل رہ چکا ہے۔

عصرِ جدید کے اس دور تحریکات کا تذکرہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے کارناموں کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ سرشار اردو کے باقی رہنے والے ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ یہ اور نذیر احمد دونوں اپنے قصوں کے ذریعے آیندہ اردو ناول کے لئے راستہ صاف کر گئے۔ خود سرشار کے آخری قصے انگریزی ناول سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ سرشار کا لازوال کارنامہ ان کا "فسانۂ آزاد" ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے اور خاکے کے اعتبار سے بہت چست نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اس کے بعض کردار ہماری مٹی ہوئی معاشرت کے نقوش کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ سرشار کی تحریروں میں ان کے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں مزاح کی چاشنی زیادہ ہے۔ سرشار کا دوسرا کارنامہ "خدائی فوجدار" ہسپانیہ کے لافانی ادیب سروانٹس سے متاثر ہے۔

یہ جدید عصر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جو تخریب اور تعمیر کی تحریکوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہوتے ایک نسبتاً پرسکون زمانہ شروع ہوتا ہے جس میں منشی ہرگوپال تفتہ، لالہ گوری شنکر ساگر، لالہ کدار ناتھ، منشی بشن نرائن بھارگو وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ تفتہ غالب کے چہیتے شاگرد تھے اور نظم اور نثر دونوں میں غالب کی تحریروں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ گوری شنکر ساگر "ملاپ" کے مدیر تھے اور منشی بشن نارائن" اودھ اخبار" کے مالک اور مدیر اور منشی نولکشور کے جانشین ہیں۔

اس مختصر سے درمیانی زمانے کے بعد موجودہ عہد شروع ہوتا ہے۔ یہ عہد نئی نئی تحریکوں سے پُر ہے۔ اور ہر تحریک میں ہندو ادیبوں کا پُرخلوص حصہ موجود ہے۔ اس زمانے میں ہندو ادیبوں کے کارنامے ہر زمانے سے زیادہ شاندار نظر آتے ہیں۔ ان ادیبوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر کوئی تذکرہ ایسا مرتب کیا جائے جو محض انہی کے کارناموں پر مشتمل ہو تو وہ کئی سو صفحوں پر ختم ہوگا۔ ان میں مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد، چکبست، پریم چند، پنڈت دتاتریہ کیفی، منشی دیا نرائن نگم، جگت موہن لال رواں، پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، پروفیسر مہیش پرشاد، منشی سدرشن، پروفیسر کرشن چند وغیرہ چند مشہور نام ہیں۔

مہاراجہ بہادر جن کی ادبی سرپرستیوں کی گونج ابھی تک اس فضا میں باقی ہے جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کا انداز سادہ اور اظہار راست ہوتا ہے۔ ابتدا میں ان کی عبارتوں پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا کافی اثر رہا۔ چنانچہ ان کا ایک ناول "مطلع خورشید" سرشار ہی کے انداز میں لکھا ہوا ہے۔ ایک سفرنامہ بھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔

چکبست کے متعلق یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شاعری میں زیادہ شہرت رکھتے ہیں یا نثر نگاری میں۔ ان کے ادبی مضامین معرکۃ الآرا ہیں اور کئی امتحانوں کے نصاب میں داخل ہیں۔

موجودہ عہد اور ہر عہد کے ادیبوں میں پریم چند کی ٹکر کا کوئی ادیب نہیں پیدا ہو سکا۔ خاص طور پر مختصر قصہ نگاری میں انھوں نے جو اونچی جگہ پیدا کر لی ہے وہاں تک پہنچنا دوسرے قصہ نگاروں کے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ ان کی طرز کے لکھنے والوں میں منشی سدرشن بھی اردو ادب میں اپنی جگہ پیدا کر چکے ہیں۔ پنڈت کیفی ایک ایسے اسلوب کے مالک ہیں جس میں موجودہ عہد کے راست طریقۂ اظہار کے ساتھ ساتھ آزاد مرحوم کا چوچلا پن بھی موجود ہے۔ پروفیسر مہیش پرشاد کی تحقیقات غالب کے متعلق مستند مانی گئی ہیں۔ پرنسپل رام پرشاد ناشاد، جگیشور ناتھ ورما بیتاب، منشی تلوک چند محروم، رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم، پنڈت امر ناتھ جھا، پنڈت منوہر لال زتشی، جگت موہن لال رواں، نوبت رائے نظر، ہمارے زمانے کے مشہور مصنفین، مقالہ نگار اور شاعر ہیں۔ اس زمانے میں نئے ادب کی جو تحریک برسرِ کار ہے اس کے سرگرم وکیلوں میں کرشن چندر، اپیندر ناتھ اشک، گربخش سنگھ وغیرہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اخبار نویسوں اور مدیروں میں منشی دیا نرائن نگم کا نام سرفہرست ہے۔ وہ تیس سال سے زیادہ عرصہ سے مسلسل اور انتھک اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ رسالہ "زمانہ" ان کی مستقل مزاجی اور ثقہ مذاق کا ثبوت ہے۔ ان کے علاوہ پنڈت دیوان سنگھ مفتون مدیر ریاست، ماسٹر جگت سنگھ مدیر و مالک "رہنمائے تعلیم"، لالہ رام لال وفا مدیر "تیغ"، ڈاکٹر جگناتھ پرشاد مدیر "دکن پنچ"، رائے لچھمن پرشاد صوفی مدیر "مستانہ جوگی"، پنڈت نرسنگ راؤ مدیر "رعیت" دوسرے مشہور اربابِ صحافت میں ہیں۔

حیدرآباد میں بھی اچھے لکھنے والے ہندو ادیبوں کی کسی زمانہ میں کمی نہیں رہی۔ ان میں سے بعض کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ ان کے علاوہ چند اور قابلِ ذکر یہ ہیں۔ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ جن کی قابلِ قدر تصنیف "بستانِ آصفیہ" حیدرآباد کی تاریخ پر ایک یادگار کارنامے کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر وسیع علمی اور ادبی دلچسپیوں کے مالک ہیں لیکن لغت اور زبان کی تحقیق ان کا خاص حصہ ہے۔ پنڈت رگھوناتھ راؤ درد صحافت اور افسانہ نگاری میں کافی شہرت رکھتے ہیں مولوی غلام محمد وفا کے ساتھ وہ رسالہ "تاج" کی ادارت کی خدمت بھی عرصہ تک انجام دیتے رہے۔ ان کے مختصر قصے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ مسٹر جانکی پرشاد "عہد عثمانی" کے مصنف ہیں۔ جو حضرت سلطان العلوم کے عہد کی ترقیوں پر حاوی کتاب ہے۔ رائے گوبند پرشاد، پنڈت وشنو مادھو راؤ اور رائے بھوانی پرشاد صحافت کی دنیا میں مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ نوجوان لکھنے والوں میں رائے مہندر راج سکسینہ حیاتیات کے مفید موضوعات پر دلچسپ مضامین لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ایک دلچسپ کتاب "چیونٹی" کے مصنف بھی ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ان ہندو ادیبوں اور انشا پردازوں کے کارناموں کا ہے جو مختلف زمانوں میں اردو ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ یہ دریا کو کوزے میں سمانے کی ایک کوشش ہے لیکن اس سے تھوڑا سا اندازہ اس بات کا ہو سکتا ہے کہ اردو کی موجودہ ترقی میں ہندو ادیبوں اور لکھنے والوں کا کتنا وسیع حصہ ہے۔

عبدالقادر سروری

حادثہ کے بعد

سکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر میں بچھی ہوئی آہنی بنچ پر دراز ہوگیا، اور ٹرین کے انتظار میں اخبار سے جی بہلانے لگا، مشکل سے چند لمحہ گزرے ہوں گے کہ، ایک گیند میرے پیروں کے پاس آکر گری، میں نے قریب سے آواز سنی، "بیٹا! اُدھر نہ جانا، میاں بیوی بیٹھے ہیں" میں اپنے مطالعہ سے دفعتہ چونک اٹھا اور آواز کی جانب نظر کی، کوئی مسافر عورت اپنے بیٹے سے یہ کہہ رہی تھی، جو گیند کے کھیل میں مصروف تھا، اب میری نظریں اپنے قریب کا جائزہ لینے لگیں، میں نے دیکھا میری بنچ کے دوسرے سرے پر ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھی ہوئی ہے، نسوانیت کا مکمل نمونہ میری نظروں کے سامنے تھا ع

شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے

نگاہوں کے دوچار ہوجانے پر مجبوراً مجھے اپنی نظریں ہٹا کر اخبار کے صفحات پر جمانی پڑیں میں حیران تھا، الٰہی یہ کون لڑکی ہے، اور کہاں جانا چاہتی ہے، اس کے ساتھ کوئی سامان ہے اور نہ کوئی آدمی، اس اثناء میں گھنٹہ بجا، اور ٹرین دھن دھناتی ہوئی سر پر آن کھڑی ہوئی ہمارا ڈبہ مسافروں کے ہجوم سے قدرے ناآشنا تھا البتہ کونے والی نشست پر کوئی نیم انگریز بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا ـــــ اتفاق دیکھئے وہی لڑکی میرے ڈبہ میں گھس آئی، اور میری مقابل کی سیٹ پر اُس نے اپنا قبضہ جمایا ـــــ میں بدستور اخبار کے مطالعہ میں لگا رہا. لیکن میری متجسس نظریں کبھی کبھی اس اجنبی حسینہ تک پہنچنے کی کوشش کرتیں، مگر میرا سارا رجحان اسی کی طرف لگا ہوا تھا وہ کون ہے

اور کہاں جا رہی ہے یہ معلوم کرنے کے لئے میرا دل نہایت مضطرب تھا، میں نے اپنی نظریں اس کے حسین و جمیل چہرے پر جما دیں اس نے میری گستاخ نگاہوں کی تاب نہ لاکر اپنا چہرہ باہر کھڑکی کی طرف کرلیا، میں نے محسوس کیا، اس کے حسین چہرے پر کچھ غم و فکر کے آثار نمایاں ہیں، اس کی بڑی بڑی مستی فروش آنکھوں میں ایک قسم کی غم آلود دوشیزگی پنہاں تھی اس کے لباس اور بالوں کی بے ترتیبی نے مجھے یہ خیال کرنے پر مجبور کیا، کہ وہ ضرور کسی آفت میں مبتلا ہے، میرے دل کی حیرانی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی، میں اس سے گفتگو کرنے کے لئے کسی خاص موضوع کا متلاشی تھا، اس عرصہ میں ایک بڑا اسٹیشن آیا، بے تحاشہ مسافروں کی ایک ریل ہمارے ڈبہ میں گھس آئی اور دیکھتے دیکھتے ہمارے ڈبہ میں اچھی خاصی بدنظمی پھیل گئی، اس انتظام کی خاطر ریلوے محافظ کو اپنی روایات ملحوظ رکھنا پڑے، ٹرین گائیڈ نے ہر ایک صوفہ پر دو دو آدمی بیٹھنے کو کہا، گو میں بہ ظاہر اخبار کے مطالعہ میں محو رہا، لیکن میرا دل مستقبل کے خیال سے سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا، ریلوے محافظ کی ایک چیخ ڈبہ کی فضا میں ٹکرائی "مل مسٹر، تم اپنی وائف کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتا" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا، اخبار میرے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا. مجبوراً میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، اور آنکھوں سے اپنی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے اُس خاتون سے معافی کا خواستگار ہوا، لڑکی نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی، وہ بدستور کھڑکی کے باہر نظریں ڈالے بیٹھی تھی میرے مقابل کی سیٹ پر اب کوئی نوجوان میاں بیوی آکر بیٹھ گئے، وہ دونوں کے دونوں حسین اور زندہ دل واقع

ہوئے تھے میری نظریں چند ثانیوں تک نو وارد مسافروں کا جائزہ لینے کے لئے ادھر ادھر بھٹکتی رہیں "معاف کیجئے گا کیا میں آپ سے یہ دریافت کرسکتا ہوں" میرے مقابل کے نوجوان نے کہا" جناب نے کہاں کا ٹکٹ خریدا ہے" "بمبئی" میں نے اپنے زیر مطالعہ اخبار کو تہہ کر کے کہا " اوہ! بڑی خوشی کی بات ہے، میں بھی وہیں اتروں گا، اور کہاں کہاں جانے کا خیال ہے؟" پھر میرے ہم سفر نے کہا، "بمبئی میں کوئی ایک ہفتہ گزار کر کلکتہ روانہ ہوں گا، اور کشمیر نہیں آپ نے تو شاید رعایتی ٹکٹ خریدا ہوگا؟" "جی نہیں، یونہی، دو ایک کام کے سلسلہ میں مجھے یہ سفر کرنا پڑا، خیر کچھ ہو، تھوڑے بہت دنوں تک تو آپ کا ہمارا ساتھ رہے گا، آئیے ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ میں ہوں شہریار کاؤس جی! حیدرآباد میوزک فرم کمپنی کا پروپرائٹر۔ یہ میری بیوی، ہم دونوں ماہ عسل منانے کے لئے بمبئی اور کلکتہ سے ہوتے ہوئے کشمیر جارہے ہیں یہ سفر ہمارا کوئی ایک مہینہ تک رہے گا، اب مجھے بھی اپنا تعارف کروانا پڑا میں ادیب ہاشمی، والئی سلطان آباد کا پرائیوٹ سکرٹری، سلطان آباد کے نواب صاحب ان دنوں کلکتہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں، ان کے ولیعہد امریکہ سے پرسوں سنیچر کے دن اترنے والے ہیں، بس میں انھیں لینے کے لئے، بمبئی جا رہا ہوں اور ـــ اور یہ آپکی بیوی ہیں، شہریار نے مصافحہ کے لئے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھائے لڑکی کی آنکھوں میں خفگی کا جذبہ امنڈ آیا، مجبوراً اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا، وہ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی، جیسے ایک حسین مرمریں مجسمہ! اس نے اپنے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا اور نہ کچھ کہنے کو میری ہمت بڑھی، شہریار نے مجھ سے کچھ دیر سکوت کے بعد کہا، آپ دونوں میں کچھ تکرار ضرور ہوئی ہے جو اس طرح الگ الگ منہ پھلائے بیٹھے ہیں، بھلا میں اس کا کیا جواب دیتا، ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چپ ہو رہا، آہ کیا معلوم؟ ان لوگوں نے ہمیں کیا سمجھا، کاش ایسا ہوسکتا ـــ

دیکھئے جناب کاؤس نے کہنا شروع کیا، ہمیں چاہیئے اپنی زندگی کے دن ہمیشہ ہنس بول کر گزاریں زندگی اسی کا نام ہے۔

اب مجھے ان میاں بیوی کی زندگی پر رشک آنے لگا، یہ کتنے زندہ دل، کتنے اچھے لوگ واقع ہوئے ہیں، ہمیشہ یہ اپنی زندگی کے دن ہنس بول کر کاٹ لیتے ہیں، میں عجیب کشمکش میں پھنسا ہوا تھا، ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ کیوں میں نے اپنے آپ کو راز میں رکھا لیکن میں کیا کرسکتا ہوں جب کہ لڑکی نے خود اپنے یا میرے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا ہو ہاشمی صاحب، آپ مطمئن رہیئے چند گھنٹہ میں میری بیوی آپ کی بیوی کو ہموار کرلے گی۔ میں خوش ہوں کہ اس طویل سفر میں اسے ایک ہم جنس اور ہم راز مل گیا۔

ہاں ہاں، بیگم کاؤس نے کہا میں ضرور ہاشمی صاحب کی بیوی سے اپنا بہنا پا کرلوں گی، اور مجھے امید ہے کہ وہ میرے اصرار پر ہاشمی صاحب کو کشمیر چلنے پر مجبور کریں گی، میں نے دیکھا کہ اجنبی لڑکی اس درمیان بالکل ساکت و صامت بیٹھی رہی، اس کے چہرے سے اب بھی کرب و اضطراب کے آثار نمایاں تھے، جیسے وہ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہے، ہماری ٹرین تیزی کے ساتھ متعدد اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی اپنا سفر طے کررہی تھی، سورج مغربی وادیوں میں آہستہ آہستہ

قدم بڑھا رہا تھا، صبح ہماری ٹرین دادر کے پلیٹ فارم پر جا رکی، اتفاقاً پلیٹ فارم پر میرے ایک جان پہچان کے آدمی ملے یہ یہاں حیدر آبادی ہوٹل کے منیجر ہیں، مجھے ٹرین میں دیکھتے ہی بے تحاشہ دوڑے آئے اور مجھ سے بڑی تپاک کے ساتھ آملے۔

اوہو ہاشمی صاحب، ارے بھائی آپ خوب ملے دوست، کہئے کیسے آنا ہوا، ارے آپ کے ساتھ زنانہ بھی ہے، چلئے ہمارا ہوٹل بڑا پاک صاف ہونے کے علاوہ آرام دہ بھی ہے کہاں ہے آپ کا سامان، میرا نوکر اسے اتار لے گا، اب میری پریشانی ملاحظہ فرمائیے، رہ رہ کر مجھے اپنی بے کسی پر رونا آرہا تھا، چلئے بانو صاحبہ! منیجر نے میری ساتھ والی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، میری کار باہر آپ کا انتظار کر رہی ہے میں حیران تھا، آخر یہ راز کب وا ہوگا، اجنبی حسینہ حسرت مایوسی کا مجسمہ بنی کھڑی تھی، میرے دل میں اس کے متعلق ہمدردی کی ایک لہر اٹھی، آہ وہ کتنی مایوس و مجبور نظر آتی ہے، چلئے میں نے نامعلوم دلی جذبات سے مجبور ہو کر اپنے ساتھی سے کہا یہ پہلی دفعہ ہے جو میں نے اس سے بات کی، دس منٹ کے عرصہ میں ہم ہوٹل پہونچ گئے ہوٹل کے مالک حیدر آبادی پٹھان ہیں، مجھ سے وہ بڑے اخلاق کے ساتھ ملے تیسری منزل کے دو بڑے کمرے ہمارے تفویض کئے گئے۔ ایک میرے لئے اور دوسرا اس پر اسرار اجنبی خاتون کے لئے۔

اس دن لڑکی تمام دن اپنے کمرے میں بند پڑی رہی رات کا کھانا بھی اس نے اپنے کمرے میں منگوا لیا تھا صبح کے ناشتہ کے بعد مجھ سے شہر یار اور اس کی بیوی ملنے آئے وہ میری بیوی کے متعلق پوچھتے رہے۔ میں نے ان کے سامنے

ناسازی مزاج کا عذر پیش کیا۔ یہ میں نے اپنے دوستوں سے صریحاً جھوٹ کہا۔ اب یہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتے تھے۔ شہر یار اور اس کی بیوی کسی ایرانی ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ میاں بیوی ہمیشہ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر آہ ان لوگوں کو کیا معلوم، میں کس حالت میں خوش رہ سکتا ہوں۔ میں لباس تبدیل کرکے ان کے ہمراہ روانہ ہوا۔ پہلے تار گھر پہونچ کر میں نے تین تار روانہ کئے ایک اپنے وطن کو، دوسرا نواب صاحب کے پاس کلکتہ، تیسرا صاحبزادہ کے پاس جہاز پر بھیجدیا، وہاں سے فارغ ہو کر جہاز کی آمد کا وقت معلوم کرنے کے لئے دفتر کو پہونچا معلوم ہوا کہ ٹھیک دس بجے جہاز بندرگاہ پر آجائے گا۔ وہاں سے رخصت ہو کر دوپہر کا کھانا شہر یار کے ساتھ ایک ہوٹل میں کھایا غرض دن بھر خوب شہر یار اور ان کی بیوی کے ساتھ شہر کی تفریح کرتے رہے رات کے دس بجے میں ہوٹل واپس ہوا۔ کھاتے وقت میں نے ہوٹل کے نوکر سے لڑکی کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بند ہے اور وہیں اس نے اپنا کھانا منگوا لیا ہے رہ رہ کر مجھے اس کا خیال ستا رہا تھا۔ مختلف خیالات میں گھیرا ہوا میں پریشان سا ہو چلا۔ خدایا وہ کون ہوگی اور کہاں جانا چاہتی ہے۔ آخر یہ راز مجھ سے کب تک چھپا رہے گا، میں نے طے کر لیا کہ کل صبح کسی طرح اس سے اس راز کے افشا کرنے کے لئے کہہ دوں گا میں نے اس کا نام اور حالات دریافت کئے بغیر چین نہ لوں گا۔ میں دیر تک انہی خیالوں میں الجھا رہا۔

صبح ہوٹل کے ملازم نے آکر ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی میرے میز پر پہونچنے تک لڑکی ناشتہ شروع

کر چکی تھی میں اس کے سامنے والی نشست پر جا بیٹھا آج اس کا چہرہ بہت زیادہ مغموم اور افسردہ نظر رہا تھا اس نے کوئی لباس تبدیل کیا اور نہ اپنے بالوں میں تیل ڈالا۔ اس نے اپنی عجیب حالت بنا رکھی تھی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اس کی لمبی لمبی پلکیں رنج و غم کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں نیچی نظریں کئے ہوئے وہ اپنا ناشتہ ختم کرنے میں مصروف تھی اس کی یہ غیر حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا آخر کار میں بول اٹھا — خاتون! آپ مغموم —

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ناشتہ ختم کئے بغیر میرے سوال کا جواب آنسوؤں سے دیتی ہوئی چلدی۔ ہوٹل کے ملازم ہماری اس حرکت کو تعجب خیز نظروں سے دیکھتے رہے اس کے چلے جانے کے بعد میں اپنا ناشتہ ختم کئے بغیر کمرے سے باہر چلا آیا۔ میرا دل ناہموار واقعات سے متاثر ہو کر تڑپ اٹھا بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ آہ میں کتنا بدنصیب ہوں میں نے محسوس کیا کہ وہ کیوں میری موجودگی سے گھبراتی ہے وہ کتنی مغموم ہے ضرور وہ کوئی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کاش میں اس کی کوئی مدد کر سکتا مجھے اس کے ساتھ کسی قدر انس ہو گیا تھا۔ جہاز کی آمد کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تبدیل لباس کر کے میں باہر جانے کے لئے تیار ہوا۔ اس عرصہ میں ہوٹل کا منیجر میرے کمرے میں گھس آیا۔ ہاشمی صاحب! انھوں نے میرے کمرے میں داخل ہو کر کہا آپ کی بیوی کے نام یہ خط آیا ہے، چھوڑ جائیے میں اسے پہونچا دوں گا۔ منیجر صاحب لفافہ میز پر رکھ کر چلے گئے ان کے جانے بعد یہ خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا، کیوں نہ میں اس لفافہ کو کھول کر پڑھوں۔ شاید اس کے مطالعہ سے اس اجنبی لڑکی کا راز افشا ہو جائے اس خیال کے آتے ہی میں نے دروازے کے کواڑ بند کئے اور لفافہ چاک کر کے بغور خط کے مضمون کا مطالعہ کیا — لکھا تھا —

بہن عذرا! اس طرح تمہارے اچانک چلے جانے پر گھر میں ایک کہرام مچا ہوا ہے بندی خدا! ذرا کسی سے کہہ کر چلی گئی ہوتی، تمہارے لئے چچی اماں بے قرار ہیں وہ تو وہ تمہارے لئے میرے آنسو کس طرح نہیں تھمتے۔ مگر چچا ابا، کا دل ہے کہ پتھر بنا ہوا ہے وہ کبھی اپنے ارادے کو بدلنے کے نہیں، وہ تمہیں کسی طرح خوفناک تاریک کوئیں میں ڈھکیل دینا چاہتے تھے۔ بہن! دولت کی لالچ میں انسان کو کچھ اچھا برا دکھائی نہیں دیتا۔ شہاب علیم کے مقدمہ میں بالکل بے گناہ ثابت کروایا گیا وہ کل ہی جیل سے چھوٹ کر گھر آیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پیسہ پولیس اور عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے کل سے پھر شہاب کے یہاں رنگ رلیاں شروع ہو گئی ہیں۔

بہن تم نے اچھا کیا جو یہاں سے چلی گئی۔ ورنہ چچا ضرور تمہیں شہاب کے گلے چیپ دیتے، چچی جان کو میں سمجھا دوں گی۔ بھوپال پہونچ کر ضرور اپنی خیریت سے مطلع کرو — تمہاری بہن —

"نوشابہ"

خط کے مطالعہ کے بعد میں نے اطمینان کی ایک سانس لی، چلو کچھ تو حالات روشنی میں آ گئے خط پہونچانے کے متعلق میں نے یہ رائے قایم کی کہ جہاز کی واپسی کے بعد دکھائے گا۔ نیچے اتر کر میں نے ٹکسی والے کو آواز دی اور بندرگاہ چلنے کو کہا میرے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے موٹر کو اسٹارٹ کیا چند سکنڈ میں موٹر کی رفتار نہایت تیزی پر آ گئی میں نے

ڈرائیور کو احتیاط سے چلانے کو کہا اُس نے میری بات سنی ان سنی کردی، اور بدستور اپنی رفتار جاری رکھی، اُس نے شراب کچھ زیادہ مقدار میں پی لی تھی، دیکھو سامنے سے ٹرام آرہی ہے، میں نے پھر اس سے کہا ٹرام والا مسلسل خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا، وہ اب بالکل قریب آچکی تھی، شراب کے نشہ میں ڈرائیور ضرور بھیگا ہوا تھا وہ اپنا توازن قایم نہ رکھ سکا اس کے ہینڈل کو تھامے ہوئے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے، ایک سکنڈ میں الٰہ خدا ایک دھماکہ ہوا طرح ٹکر ہوگئی، میں اُچھل کر دور سڑک پر جا پڑا اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا میں بے ہوش ہو چکا تھا، ہوش آنے پر میں نے محسوس کیا اس وقت میں دواخانہ کے ایک کمرے میں پڑا ہوا ہوں، میری موٹر ٹرام سے ٹکرا گئی اور موٹر پاش پاش ہو کر رہ گئی ڈرائیور کا خاتمہ ہو چکا میری پیشانی اور بائیں ہاتھ کی کہنی پر کاری چوٹ آگئی تھی۔ قدرے ہوش آنے پر پولیس کے عہدہ دار نے میرا بیان قلمبند کیا دن بھر میں دواخانہ میں نیم غشی کی حالت میں پڑا رہا، زخموں سے خون زیادہ مقدار میں بہنے کی وجہ سے مجھ پر نقاہت کے حملے ہو رہے تھے۔

دواخانے والوں نے میرا پتہ معلوم کر کے ہوٹل کا مالک مجھ سے ملنے کے لئے آئے میری یہ حالت دیکھ کر دونوں نے اظہار افسوس کیا منیجر نے رخصت کے وقت مجھ سے کہا ہاشمی صاحب کیا آپ نے اس حادثہ کی اطلاع اپنی بیوی کو نہیں دی اگر واقعی انھیں اس امر کی اطلاع نہیں ملی ہے تو اب میں انھیں جا کر کہہ دونگا۔

میں نے کہا، منیجر صاحب، براہ کرم اس کی اطلاع آپ انھیں نہ دیجئے وہ بیمار ہے ضرور پریشان ہو جائے گی، میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے منیجر اور ہوٹل کا مالک مجھ سے رخصت ہوئے۔ دوسرے دن ڈاکٹر علاج کی خاطر میرے کمرے میں گھس آیا وہ زخموں کو صاف کر کے پٹی باندھ رہا تھا، نرس نے آکر اطلاع دی آپ کے نام حیدرآباد رسٹورنٹ سے ٹیلیفون آیا ہے، منیجر صاحب آپ کی خیریت دریافت کرتے ہوئے اطلاع دیتے ہیں کہ دو دفعہ آپ کی بیوی نے آکر آپ کے متعلق دریافت کیا، ڈاکٹر نے تعجب کے لہجے میں کہا آپ نے اب تک اپنی بیوی کو اس حادثہ کی اطلاع نہیں دی اگر ایسا ہے تو افسوس آپ اس کے حق میں ظلم کر رہے ہیں، مس قلب! ڈاکٹر نے نرس سے کہا، تم ہوٹل کے منیجر سے کہہ دو کہ فوراً ان کی بیوی کو اس حادثہ کی اطلاع کر دیں ڈاکٹر اپنا کام ختم کر کے کمرے کے باہر جا چکا تھا اور نرس بھی ـــــ میں تنہا اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہا، مختلف خیالات مجھے گھیرے ہوئے تھے، مجھے اپنی بے کسی پر رونا آرہا تھا اس میں نرس نے دوبارہ آکر اطلاع دی آپ کی بیوی آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میرا دل دفعتاً بھر آیا، آہ دنیا کیا سمجھتی ہے کاش ایسا ہو سکتا۔

نرس مجھے خاموش پا کر چلی گئی، اور اپنے ہمراہ عذرا کو لے آئی۔

عذرا نہایت خاموشی کے ساتھ میرے پلنگ کے قریب آکر کھڑی ہوگئی میں نے اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہا مگر ناطاقتی کے باعث ایسا نہ کر سکا۔ نہیں نہیں، آپ لیٹے رہیئے اس نے مدھم لہجہ میں کہا آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ دفعتاً میرے آنسو عذرا کے اس سوال کا جواب دینے کے لئے باہر نکل آئے، اب وہ میرے قریب والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

نرس کو آواز دیجئے مجھے تشنگی محسوس ہو رہی ہے۔

وہ اٹھی اور گلاس میں پانی بھر کر لائی۔

لائیے مجھے دیجئے، میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

عذرا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے ہی ہاتھوں سے پانی پلایا۔

آپ مجھے معاف کریں گے، میں نے کہا میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

وہ خاموشی کے ساتھ میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔

بھوپال کب جاؤ گی؟

بھوپال؟ عذرا کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا ——— آپ کو کیسے معلوم؟

یہ خط! میں نے اس کو پڑھنے کی جرأت کی۔

عذرا نے فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھینا، دریچہ کے پاس جا کر وہ اسے پڑھنے لگی ڈاکٹر دوبارہ میرے کمرے میں داخل ہوا اس نے مجھے ایک خوراک دوا پلانے کے بعد کہا اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے، زیادہ گفتگو نہ کریں پھر اس نے عذرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا آپ مطمئن رہیئے، آپ کا چہرہ غموں کے آثار لئے ہوئے متاثر کن معلوم ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کے شوہر چند دنوں میں صحت یاب ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں یہ زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے یہ کہہ کر ڈاکٹر اپنی دیگر مصروفیات کے تحت دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے عذرا کی طرف نظر ڈالی، اس کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ سنا آپ نے ڈاکٹر کیا کہتا ہے اس نے میرے پلنگ کے قریب آ کر کہا۔

عذرا افسوس دنیا ہمیں کیا سمجھی ہوئی ہے کیا معلوم ہم ایک دوسرے کے لئے قطعاً ناآشنا ہیں کاش ہم دنیا کے اسٹیج پر حقیقی معنوں میں اس خواب نما ڈرامہ کو دکھلا سکتے میرے آنکھوں میں آنسو تھے، عذرا کا حسین چہرہ یک بیک خوشی کے مارے دمک اٹھا۔ اس کی محبت نواز آنکھوں میں ایک ملکوتی جذبہ امنڈ آیا۔

ہاں کیوں نہیں ہاشمی صاحب! اس کا لہجہ محبت آمیز تھا اب جب کہ ہم اس ڈرامہ کا کچھ حصہ دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں نے زیادہ دن تک اپنے آپ کو راز میں رکھا، یقیناً میری اس طویل خاموشی نے آپ کو دکھ پہونچایا ہوگا اب آپ اچھی طرح میری مجبوریوں سے واقف ہیں، یہ میری انتہا درجہ کی خوش نصیبی ہے جو اس دورانِ سفر میں ایک رفیق و غمگسار ساتھی مل گیا۔

صابر کوسگوی

سال کے مہینے اور دن

ہم مہینوں اور دنوں کے ناموں سے اس قدر مانوس ہوگئے ہیں کہ ان سب کے نام ایک سانس میں سنا دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم میں بہت کم ایسے ہیں جو ان کے ماخذوں سے واقف اور ان کی تاریخ کا علم رکھتے ہیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کہ ہر کام اور ہر چیز کا ایک دیوتا تھا۔ اور ان سب کا شہنشاہ رومی زبان میں "جیوپیٹر" اور یونانی میں "ذیس" تھا۔ رومیوں نے سال اور مہینوں کے نام اپنے دیوتاؤں کے نام پر رکھے جس کی تشریح ذیل میں کی جاتی ہے۔ اس تشریح سے پہلے ہم یہ بتلائیں گے کہ وقت کے تعین کا خیال کیوں اور کس طرح پیدا ہوا۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ زمین اپنے محور پر چکر لگاتی ہے جس سے روشنی اور تاریکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ہم دن اور رات کا نام دیتے ہیں۔ انگریزی لفظ (Day) بہت قدیم ہے جس کے معنی چمکنا کے ہیں۔ اور اس کے معنے ہیں "وہ وقت جس میں کرۂ ارض کا ایک حصہ سورج کی روشنی سے منور ہو" رفتہ رفتہ وسعت ہوتی گئی اور وہ وقت بھی مراد لیا جانے لگا جو زمین پر سورج کے طلوع ہونے کے بعد سے پھر طلوع ہونے تک۔ سورج کے غروب سے پھر غروب ہونے تک۔ اور ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک۔ رومی آدھی رات سے آدھی رات تک اور بابلی طلوع آفتاب سے طلوع تک کرتے تھے۔ اس طریقہ سے وقت کی اکائی وجود میں آئی دن کا وقت یا یہ اکائی بہت چھوٹی تھی اس لئے ایک دوسرا پیمانہ وضع کیا گیا۔ جو زیادہ طویل وقت کا ہے۔ اور یہ چاند کی بدلتی ہوئی شکلوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا کہ چاند ہلال سے بتدریج بدر اور پھر بدر سے بتدریج غائب ہوجاتا ہے۔ اس لئے ایک ہلال سے دوسرے ہلال تک کا وقفہ ایک مہینہ کہلانے لگا۔ اس وقفہ کو ابتدا میں ہلالی (Month) کہا جانے لگا جو بعد میں ہلالی مہینہ (Lunar Month) میں تبدیل ہوا (Lunar) لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنے چاند کے ہیں اور (Moon) انگلو سیکسن زبان میں اس کا ہم معنی ہے۔

دوسرا پیمانہ 'سال' موسموں کی تبدیلی سے لیا گیا۔ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ گرمی کا ایک زمانہ ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ اس کے بعد سردی شروع ہوتی ہے۔ ایک موسم ایسا آتا ہے جب کہ ہر طرف بہار ہوتی ہے۔ اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب کہ سارے درخت ننگے ہوجاتے ہیں۔

یہ وقفہ اور دور موسم کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک موسم بہار سے دوسرے موسم بہار تک یا ایک موسم سرما سے دوسرے موسم سرما تک۔ بارہ ہلالی مہینے ہوتے ہیں۔ یہی ہلالی بارہ ماہ ایک سال کہلانے لگے۔ موسم کی یہ تبدیلی سورج کے اطراف زمین کی گردش کا نتیجہ ہے۔ سورج کے اطراف پورا ایک چکر لگانے کے لئے زمین کو تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ درکار ہیں۔ لیکن پہلے ہلالی مہینوں کا سال صرف تین سو چوپن دن کا ہوتا تھا۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہونے لگا کہ مہینے موسم سے پیچھے رہ جانے لگے۔ اور دس سال کے بعد جب کہ حسب سابق ایک خاص مہینے میں موسم بہار ہونا چاہیے تھا لیکن موسم

سرا ہی رہا۔ آج کل بھی یہ فرق موجود ہے۔ اس کو صحیح اور درست کرنے کے لئے اس ہلالی سال میں وقتاً فوقتاً دنوں اور مہینوں کا اضافہ کیا جانے لگا۔ اور اس طرح سے اس ہلالی سال کو سورج کے ایک سال یعنی تین سو پینسٹھ دن چھ گھنٹے (۳۶۵ ۱/۴) کے مساوی کیا گیا۔ یہودی انیس سال میں سات مرتبہ اس قسم کا اضافہ کرتے ہیں۔ یونانی ہر آٹھ سال میں تین ماہ کا اضافہ کرتے تھے۔ رومیوں کا پہلا سال صرف دس ماہ کا ہوتا تھا۔ جو مارچ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد انھوں نے سال کے دنوں کی تعداد تین سو چھپن کرنے کے لئے دو ماہ کا اضافہ کردیا۔

اب بھی ایام کی کمی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً دنوں کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ ان اضافی دنوں کے سبب پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ اس کو دور کرنے کے لئے جولیس سیزر نے ۴۶ء قبل مسیح کے سال کو چار سو پینتالیس دن کا کردیا اور آئندہ کے لئے سال کے تین سو پینسٹھ دن مقرر کئے۔ لیکن چونکہ زمین کو سورج کے اطراف اپنی گردش کو پورا کرنے میں تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ درکار تھے اور اس طرح سے ہر سال میں ایک چوتھائی دن چھوٹ جاتا تھا۔ اس لئے سیزر نے حکم دیا کہ ہر چوتھے سال فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کردیا جائے۔ اور "یہ لیپ سال" کہلاتا تھا۔ یہ نام اس لئے تجویز ہوا کہ اس دفعہ سال ایک دن کی چھلانگ مار کر سابقہ چھوڑے ہوئے چوتھائی دنوں کی تکمیل کر لیتا تھا۔ جو چار سال میں ایک دن کے مساوی ہوجاتے تھے۔ یہ جنتری "جیولی آن جنتری" کہلاتی ہے کیونکہ اس کو جولیس سیزر نے ترتیب دیا تھا۔

آخر کار یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ ترتیب بالکل درست ہے لیکن اس وقت بھی ایک معمولی سے غلطی رہ گئی تھی۔ کیونکہ پانچ گھنٹے انچاس منٹ کو چوتھائی دن فرض کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس میں گیارہ منٹ کی کمی رہ جاتی ہے۔ جو واقعی بہت ہی معمولی سا فرق تھا۔ لیکن کئی صدی بعد یہ فرق بڑھ کر دس دن کے قریب ہوگیا۔ اس لئے اب سورج کے حساب کا سال بہت طویل ہوگیا۔ ۱۵۸۲ء میں پوپ جیاگری نے حکم دیا کہ اس سال دس دن چھوڑ دیئے جائیں اور ۴ ر اکتوبر کے بعد کا دن ۱۵ ر اکتوبر محسوب کیا جائے۔ یہ تفریق ۱۷۵۱ء تک انگلستان میں قبول نہیں کی گئی۔ اور جب اس سال ایک دم سے گیارہ دن کم کردیے گئے تو جاہل عوام میں کچھ بے چینی سی پھیلی وہ یہ خیال کرنے لگے کہ ان سے دن چرالئے گئے ہیں۔ اس غلطی کے آئندہ نہ ہونے کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ ایسے سال جو دو صفروں پر ختم ہوتے ہوں جیسے ۱۶۰۰ء ۱۷۰۰ء ۱۸۰۰ء وغیرہ۔ لیپ کے سال نہ سمجھے جائیں۔

جنوری سال کے پہلے مہینے کا نام اہل روم نے جی نوس (Janus) نامی دیوتا سے لیا اور جنوری رکھا۔ جی نوس کے دو سر ہیں اور اس طرح کہ وہ آگے اور پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے۔ جینوس دروازوں اور پھاٹک کا دیوتا تھا۔ لاطینی زبان میں جنیوا (Januae) کے معنی دروازے یا پھاٹک کے ہیں۔ چونکہ دروازے اور پھاٹک وغیرہ سے داخل ہوتے ہیں اس لئے اہل رومہ میں یہ ایک رسم ہوگئی تھی کہ جب کسی نئے کام کو شروع کیا جاتا تو پہلے جینوس کی پوجا کی جاتی۔ یہ دیوتا سورج کو طلوع کرنے والا بھی تھا اس لئے سال کے پہلے مہینے کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا۔ اس مہینے میں تازہ تازہ غذا اور تازہ شراب وغیرہ جیسی چیزیں جینوس کے

مجسمہ پر چڑھائی جاتی تھیں۔

چونکہ دروازہ کے کھلنے سے دونوں طرف دکھائی دیتا ہے اور جینوس دوسروں کا دیوتا ہے اس لئے یہ خیال کیا جانے لگا کہ جینوس ماضی اور مستقبل ہر دو کو دیکھ سکتا ہے۔

روم کے قدیم ترین سکوں پر اس کی تصویر کندہ ہے اس کے ہر دو سروں پر گھنی داڑھی ہے وہ ایک ہاتھ میں عصا، اور دوسرے ہاتھ میں کنجی لئے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ تجارت اور جہاز رانی کا بھی محافظ تھا اور بعض سکوں پر اس کے سر کو جہاز کے اگلے حصہ کی طرح بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے چاہا کہ جینوس کو سال کے دیوتا کی شکل میں ظاہر کریں تو ان کو اس سے بہتر کچھ سجھائی نہ دیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تین سو اور دوسرے میں پینسٹھ کا عدد دے دیں۔

جینوس کی پرستش جینی کولم نامی پہاڑی پر ہوتی تھی۔ یہ ان سات پہاڑوں میں سے ایک ہے جس پر روم کی تعمیر ہوئی۔ چونکہ وہ دروازوں کا دیوتا تھا اس لئے روم کے سارے دروازے اس کے تابع سمجھے جاتے تھے۔ خصوصاً وہ کمان دار دروازہ جس سے افواج جنگ کے لئے جاتیں اور واپس ہوتیں اس کمان دار دروازہ کی جگہ پر ایک گرجا تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام مربع ہونے کی وجہ سے " جینوس کواڈی فرونس " یعنی چو پہلو تھا۔ اس کے ہر ایک بازو پر تین کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا۔ جس سے بارہ ماہ اور چار موسم مراد لئے جاتے تھے۔ زمانہ جنگ میں اس کے دروازے کھول دئے جاتے تھے کیونکہ چڑھاوے چڑھانے کے لئے عوام کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن جب امن ہوتا تو یہ فوراً بند کردئے جاتے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رومی مسلسل جنگ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ سن کر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ سات سو سال میں یہ دروازے صرف تین مرتبہ بند کئے گئے۔

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جینوس سورج کے دیوتا اپالو کا بیٹا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ وہ ہر روز اپنی آتشیں رتھ میں سوار ہوکر آسمان پر چکر لگائے۔ ہر صبح جب کہ صبح کی دیوی " ارورا " مشرق کا دروازہ کھولتی تو اپالو اپنے کام پر روانہ ہو جاتا اور کام ختم کرکے مغربی سمندر میں چلا جاتا جہاں سے وہ اپنے محل میں مشرق میں واپس آجاتا۔

اپالو کا ایک اور بیٹا " فی ٹن " تھا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے درخواست کرکے اس کی آتشیں رتھ پر سواری کی دیر تک تو گاڑی برابر چلائی لیکن بالآخر اپنی تیز طبیعت سے مجبور ہوکر گاڑی کو بہت تیز دوڑانے لگا۔ بہت جلد اس کے قابو سے گھوڑے نکل گئے۔ اور وہ گاڑی کو معمولی راستہ سے بہت دور کھینچ لے گئے۔ اور زمین سے اس قدر قریب پہنچے کہ سارے کھیت جل کر خاکستر ہو گئے۔ دریا کا پانی خشک ہوگیا۔ اور وہاں کے باشندوں کی رنگت بھی سیاہ ہوگئی۔ جو ابھی تک باقی ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کی چیخ و پکار کی آواز شہنشاہ اعظم جیوپی تک پہنچی۔ جب وہ سورج کی گاڑی کو اس حالت میں پایا تو آپے سے باہر ہوگیا۔ اپنی بجلی کو لے کر وہ " فی ٹن " پر حملہ آور ہوا جس کے سبب بجلی گری وہ جھلس کر سر کے بل گرا اور مر گیا۔

اور ایک المناک کہانی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اپالو کو " ہیارسن تھس " نامی ایک انسان سے بیحد محبت تھی جس سے گفتگو کرنے کے لئے وہ ہمیشہ زمین پر آتا تھا۔

سرا ہی رہا۔ آج کل بھی یہ فرق موجود ہے۔ اس کو صحیح اور درست کرنے کے لئے اس ہلالی سال میں وقتاً فوقتاً دنوں اور مہینوں کا اضافہ کیا جانے لگا۔ اور اس طرح سے اس ہلالی سال کو سورج کے ایک سال یعنی تین سو پینسٹھ دن چھ گھنٹے (۳۶۵ ۱/۴) کے مساوی کیا گیا۔ یہودی انیس سال میں سات مرتبہ اس قسم کا اضافہ کرتے ہیں یونانی ہر آٹھ سال میں تین ماہ کا اضافہ کرتے تھے۔ رومیوں کا پہلا سال صرف دس ماہ کا ہوتا تھا۔ جو مارچ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد انھوں نے سال کے دنوں کی تعداد تین سو چون کرنے کے لئے دو ماہ کا اضافہ کر دیا۔

اب بھی ایام کی کمی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً دنوں کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ ان اضافی دنوں کے سبب پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ اس کو دور کرنے کے لئے جولیس سیزر نے سنہ ۴۶ قبل مسیح کے سال کو چار سو پینتالیس دن کا کر دیا اور آئندہ کے لئے سال کے تین سو پینسٹھ دن مقرر کئے۔ لیکن چونکہ زمین کو سورج کے اطراف اپنی گردش کو پورا کرنے میں تین سو پینسٹھ دن پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ درکار تھے اور اس طرح سے ہر سال میں ایک چوتھائی دن چھوٹ جاتا تھا۔ اس لئے سیزر نے حکم دیا کہ ہر چوتھے سال فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر دیا جائے۔ اور یہ "لیپ سال" کہلاتا تھا۔ یہ نام اس لئے تجویز ہوا کہ اس دفعہ سال ایک دن کی چھلانگ مار کر سابقہ چھوڑے ہوئے چوتھائی دنوں کی تکمیل کر لیتا تھا۔ جو چار سال میں ایک دن کے مساوی ہو جاتے تھے۔ یہ جنتری "جولین جنتری" کہلاتی ہے کیونکہ اس کو جولیس سیزر نے ترتیب دیا تھا۔

آخر کار یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ ترتیب بالکل درست ہے لیکن اس وقت بھی ایک معمولی سے غلطی رہ گئی تھی۔ کیونکہ پانچ گھنٹے انچاس منٹ کو چوتھائی دن فرض کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس میں گیارہ منٹ کی کمی رہ جاتی ہے۔ جو واقعی بہت ہی معمولی سا فرق تھا۔ لیکن کئی صدی بعد یہ فرق بڑھ کر دس دن کے قریب ہو گیا۔ اس لئے اب سورج کے حساب کا سال بہت طویل ہو گیا۔ سنہ ۱۵۸۲ء میں پوپ جیاگری نے حکم دیا کہ اس سال دس دن چھوڑ دیئے جائیں اور ۴ ر اکتوبر کے بعد کا دن ۱۵ ر اکتوبر محسوب کیا جائے۔ یہ تفریق سنہ ۱۷۵۲ء تک انگلستان میں قبول نہیں کی گئی۔ اور جب اس سال ایک دم سے گیارہ دن کم کر دیئے گئے تو جاہل عوام میں کچھ بے چینی سی پھیل گئی۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ ان سے دن چرالئے گئے ہیں۔ اس غلطی کے آئندہ نہ ہونے کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ ایسے سال جو دو صفروں پر ختم ہوتے ہوں جیسے سنہ ۱۶۰۰ء سنہ ۱۸۰۰ء سنہ ۱۹۰۰ء وغیرہ۔ لیپ کے سال نہ سمجھے جائیں۔

جنوری: سال کے پہلے مہینے کا نام اہل روم نے جی نوس (Janus) نامی دیوتا سے لیا اور جنوری رکھا۔ جی نوس کے دو سر ہیں اور اس طرح کہ وہ آگے اور پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے۔ جینوس دروازوں اور پھاٹک کا دیوتا تھا۔ لاطینی زبان میں جینوا (Janua) کے معنی دروازے یا پھاٹک کے ہیں۔ چونکہ دروازے اور پھاٹک وغیرہ سے داخل ہوتے ہیں اس لئے اہل رومہ میں یہ ایک رسم ہو گئی تھی کہ جب کسی نئے کام کو شروع کیا جاتا تو پہلے جینوس کی پوجا کی جاتی۔ یہ دیوتا سورج کو طلوع کرنے والا بھی تھا اس لئے سال کے پہلے مہینے کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا۔ اس مہینے میں تازہ تازہ غذا اور تازہ شراب وغیرہ جیسی چیزیں جینوس کے

مجسمہ پر چڑھائی جاتی تھیں۔

چونکہ دروازہ کے کھلنے سے دونوں طرف دکھائی دیتا ہے اور جینوس دوسروں کا دیوتا ہے اس لئے یہ خیال کیا جانے لگا کہ جینوس ماضی اور مستقبل ہر دو کو دیکھ سکتا ہے۔

روم کے قدیم ترین سکوں پر اس کی تصویر کندہ ہے اس کے ہر دو سروں پر گھنی داڑھی ہے وہ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے ہاتھ میں کنجی لئے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ تجارت اور جہاز رانی کا بھی محافظ تھا اور بعض سکوں پر اس کے سر کو جہاز کے اگلے حصہ کی طرح بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے چاہا کہ جینوس کو سال کے دیوتا کی شکل میں ظاہر کریں تو ان کو اس سے بہتر کچھ دکھائی نہ دیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تین سو اور دوسرے میں پینسٹھ کا عدد دے دیں۔

جینوس کی پرستش جینی کولم نامی پہاڑی پر ہوتی تھی۔ یہ ان سات پہاڑوں میں سے ایک ہے جس پر روم کی تعمیر ہوئی۔ چونکہ وہ دروازوں کا دیوتا تھا اس لئے روم کے سارے دروازے اس کے تابع سمجھے جاتے تھے۔ خصوصاً وہ کمان دار دروازہ جس سے افواج جنگ کے لئے جاتیں اور واپس ہوتیں اس کمان دار دروازہ کی جگہ پر ایک گرجا تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام مربع ہونے کی وجہ سے "جینوس کواڈی فرونس" یعنی چوپہلو تھا۔ اس کے ہر ایک بازو پر تین کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا جس سے بارہ ماہ اور چار موسم مراد لئے جاتے تھے۔ زمانہ جنگ میں اس کے دروازے کھول دئے جاتے تھے کیونکہ چڑھاوے چڑھانے کے لئے عوام کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن جب امن ہوتا تو یہ فوراً بند کر دئے جاتے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رومی مسلسل جنگ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ سن کر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ سات سو سال میں یہ دروازے صرف تین مرتبہ بند کئے گئے۔

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جینوس سورج کے دیوتا اپالو کا بیٹا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ ہر روز اپنی آتشیں رتھ میں سوار ہو کر آسمان پر چکر لگائے۔ ہر صبح جب کہ صبح کی دیوی "ارورا" مشرق کا دروازہ کھولتی تو اپالو اپنے کام پر روانہ ہو جاتا اور کام ختم کر کے مغربی سمندر میں چلا جاتا جہاں سے وہ اپنے محل میں مشرق میں واپس آ جاتا۔

اپالو کا ایک اور بیٹا "فی ٹن" تھا۔ اس نے ایک دن اپنے باپ سے درخواست کر کے اس کی آتشیں رتھ پر سواری کی دیر تک تو گاڑی برابر چلائی لیکن بالآخر اپنی تیز طبیعت سے مجبور ہو کر گاڑی کو بہت تیز دوڑانے لگا۔ بہت جلد اس کے قابو سے گھوڑے نکل گئے۔ اور وہ گاڑی کو معمولی راستہ سے بہت دور کھینچ لے گئے۔ اور زمین سے اس قدر قریب پہنچے کہ سارے کھیت جل کر خاکستر ہو گئے۔ دریا کا پانی خشک ہو گیا۔ اور وہاں کے باشندوں کی رنگت بھی سیاہ ہو گئی۔ جو ابھی تک باقی ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کی چیخ و پکار کی آواز شہنشاہ اعظم جیو پی تک پہنچی۔ جب وہ سورج کی گاڑی کو اس حالت میں پایا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ اپنی بجلی کو لے کر وہ "فی ٹن" پر حملہ آور ہوا جس کے سبب بجلی گری و جھلس کر رتھ کے پل گرا اور مر گیا۔

اور ایک المناک کہانی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اپالو کو "ہیا سن تھس" نامی ایک انسان سے بیحد محبت تھی جس سے گفتگو کرنے کے لئے وہ ہمیشہ زمین پر آتا تھا۔

جنوبی ہوا کا دیوتا" زے فائرس" بھی اسی کی محبت میں سرشار تھا ایک دن اپالو اور ہیارسن تھس کھیل رہے تھے کہ زے فائرس آیا اور اپنے رقیب کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوگیا اور اپالو کے لوہے کی کڑی کو جس سے وہ کھیل رہا تھا۔ ہیارسن تھس کی طرف اس زور سے پھینکا کہ وہ مرگیا۔ اپالو کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپالو نے خون کے گرے ہوئے قطروں کو پھول کے گلدستہ میں تبدیل کردیا۔ یہ پھول آج بھی ملتا ہے اور ہیارسن تھس کہلاتا ہے۔ دوسرا پھول جو ہم کو اپالو کی یاد دلاتا ہے وہ سورج مکھی ہے۔

قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لڑکی گلائٹی ہی تھی۔ یہ ہر روز اشتیاق بھری آنکھوں سے سورج کی گردش کو غور سے دیکھا کرتی تھی۔ لیکن اپالو کو اس لڑکی کی محبت کا علم نہ تھا۔ اور وہ بغیر اس کا خیال کئے ہر روز گزر جاتا۔ گلائٹی ایک دریا کے کنارے پر کھڑی سورج کو دیکھا کرتی اور جب وہ غروب ہوجاتا تو اس کا دل بھی بیٹھ جاتا۔ وہ رات کو ساحل سے واپس نہ ہوتی بلکہ رات بھر سردی میں بیٹھی سورج کی پہلی کرن دیکھنے کی منتظر رہتی۔ آخرکار دیوتاؤں نے اس پر رحم کیا اور اس کو سورج کے پھول میں تبدیل کردیا۔ اس کا سبز لباس سبز پتوں کی شکل میں زرین بال زرد پنکھڑیوں کی شکل میں باقی رہے۔ آج تک یہ اپنی اس حالت میں خوش وخرم ہے اور آج بھی اپنا کام کئے جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

انوار احمد صدیقی

رباعیات

(توبہ)

تردید تمنائے ازل کیسے ہو؟
اک مسئلۂ خیال حل کیسے ہو؟
توبہ کا تصور ہی بہت مشکل ہے
پھر ایسے تصور پہ عمل کیسے ہو؟

(مٹی کا کھلونا)

برحق ہر شئے کا نیست ہونا ہی ہی
نقد ہستی سے ہاتھ دھونا ہی ہی
مٹی سے کمہار کچھ بنا لیتا ہے
دنیا مٹی کا اک کھلونا ہی ہی

باقی

پروین

پروین احمد خاں کی جو ایک دولت مند تاجر تھے اکلوتی لڑکی تھی۔ ماں باپ اپنی بیٹی کو ہر وقت خوش دیکھنا چاہتے تھے مگر اس کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا وہ بہت ناز و نعم میں پلی تھی اسے رنج و غم سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ اگر اس کی تیوری پر بل آجاتا تو ماں باپ اپنی جان نثار کرنے کو بھی تیار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ پروین کی ماں یکایک بیمار ہو گئیں احمد خاں اپنی بیوی کو بہت چاہتے تھے اس لئے بہت گھبرائے۔ بہت سے ڈاکٹر بلائے گئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ غشی کے دورے پڑنے لگے ایک دن جب ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی تو بیوی نے احمد خاں کو بلا کر کہا" میں چند گھنٹے کی مہمان ہوں پروین کو تمہارے سپرد کرتی ہوں اس کو اچھی طرح رکھنا کبھی دکھ نہ پہنچنے دینا...... اس کو میری نشانی سمجھ کر پرورش کرنا۔ یہ میری آنکھوں کا تارا ہے دیکھو اس کو کبھی یہ محسوس نہ ہونے پائے کہ یہ بے ماں کی ہے" احمد خاں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے اور انھوں نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا" گھبراؤ نہیں تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی" ان کی بیوی نے اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور کہنے لگیں" نہیں اب میں ہرگز اچھی نہیں ہو سکتی۔ دیکھو موت تمہاری تسلیوں پر مسکرا رہی ہے" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پتھرا گئیں اور ان کی سسکتی ہوئی سانس ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ پروین ماں کی موت کے بعد بہت غمگین رہنے لگی۔ ہر وقت روتی رہتی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب خوشی اس کی قسمت میں نہیں۔ احمد خاں بھی بیوی کی موت سے بہت متاثر ہوئے تھے جب کبھی اپنے دوستوں میں بیٹھے ہوتے تو اپنی بیوی کو یاد کر کے رو دیا کرتے ان کے بعض خیر خواہ دوستوں نے اصرار کرنا شروع کیا۔ کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔ مرنے والا پیچھے والوں کے مستقبل کو غم آلود کر دیتا ہے یا رنگین۔ لیکن ہمیشہ مرنے والے کی یاد گردش ایام کے دھارے پر تیرنے کے ساتھ بہتے بہتے اپنی رفتار دھیمی کر دیتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب کہ [illegible] سے مسرت کی کرن پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ سب کچھ بھول کر صرف اپنے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے احمد خاں کے دل میں بیوی کا داغ کتنا ہی تازہ کیا نہ ہو لیکن وہ زیادہ عرصہ تک غم کے سہارے اپنی آنے والی زندگی کو ٹھکرا نہ سکے اور انھوں نے اپنے دوستوں کی بات مان لی۔ بڑی دھوم دھام سے آخر ان کی شادی رچی پروین کی سوتیلی ماں لیلیٰ اپنے ساتھ ایک چودہ برس کی لڑکی بھی ساتھ لائیں۔ پروین بڑی خوش ہوئی کہ کھیلنے کے لئے ایک ہمجولی تو مل گئی۔ احمد خاں پروین کو بہت چاہتے تھے اور لیلیٰ کی لڑکی کو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھتے ہی نہ تھے۔ جب لیلیٰ نے یہ حالت دیکھی تو سوچنے لگی کہ کیا کرنا چاہئے چنانچہ ایک ترکیب سمجھ میں آئی وہ یہ کہ احمد خاں کے کان پروین کی شکایتوں سے خوب بھر دیئے جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ احمد خاں پروین سے نفرت کرنے لگ جائیں گے اور یہی ہوا جب احمد خاں نے پروین کی شکایتیں سنیں تو اس سے حد درجہ متنفر ہو گئے اور اب وہی احمد خاں کی نور نظر جس کے کھانا کھلانے کے لئے چار نوکر رکھے گئے تھے آج چولھے کے پاس بیٹھی پیٹ کے دوزخ کو پاٹ رہی ہے۔

پروین اپنی بدقسمتی پر ہر وقت آنسو بہایا کرتی تھی جو روز ایک جوڑا بدلا کرتی تھی اس کے جسم پر میلے کچیلے کپڑوں کی دھجیاں رہنے لگیں۔ یہ وہی پروین ہے جس کو احمد خاں ذرا بھی مغموم نہیں دیکھنا چاہتے تھے اب اس کو مسرور دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔ ایک دن جب پروین لیلیٰ کے کمرے کی دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی اپنی بدبختی پر آنسو بہا رہی تھی اس کے کانوں میں لیلیٰ کی آواز آئی جس کو وہ غور سے سننے لگی لیلیٰ احمد خاں سے کہہ رہی تھی " ابا جی پروین کو کوئی نہیں جان سکتا میں جانتی ہوں کہ اس میں کیا کیا گن بھرے ہیں۔ ایک واقعہ تو ایسا ہے جس کو کہتے خود مجھے شرم آتی ہے"۔ احمد خاں نے کہا" کہو تو ایسا کونسا واقعہ ہے" لیلیٰ نے کہا" ایک دفعہ رات کو جب میری آنکھ کھلی تو پروین کے کمرے کا چراغ روشن تھا میں سوچنے لگی آخر اتنی رات تک چراغ کیوں روشن رکھا گیا میں دبے پاؤں جاکر جھانکی تو معلوم ہوا کہ پروین اسی موکھے میں جو اس کے کمرے سے تھا منہ ڈالے کسی سے کہہ رہی ہے اگر کل رات بارہ بجے آؤ گے تو میں تمھارے ساتھ چلوں گی میں نے گلشن کو باہر بھیج کر دیکھ کر تو آ۔ باہر موکھے کے پاس کون کھڑا ہے۔ گلشن نے آکر کہا بیگم صاحب وہی خوبصورت سا لونڈا جو مسجد میں رہتا ہے"۔ پروین نے جب یہ گفتگو سنی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ اس ناکردہ خطا اور اس کی سزا کے تصور ہی سے کانپنے لگی اور مارے خوف کے وہ سہم کر جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد خاں نے پروین کو بلا بھیجا۔ پروین بے چاری ڈرتی ڈرتی گئی اور ادب سے جاکر سامنے کھڑی ہو گئی احمد خاں کہنے لگے" ذلیل لڑکی تو میرے گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہے نکل جا میرے گھر سے اسی وقت اپنا منہ کالا کر"۔ پروین کی اداس آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہنے لگا جیسے انھیں اسی وقت کا انتظار تھا وہ کپکپاتی آواز میں رکتے رکتے کہنے لگی "اباجان آخر واقعہ کیا ہے جو آپ مجھ پر ناحق بگڑ رہے ہیں"۔ لیلیٰ نے کہا" او ہو کیسی نادان بن رہی ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہیں اور باپ کے منہ در منہ کیسے جواب دے رہی ہے بے شرم"

پروین رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "اباجان میں نے کچھ نہیں کیا میں بے گناہ ہوں"۔ احمد خاں اور غصے میں آگئے اور کہنے لگے نکل جا ورنہ ابھی نوکروں کے ذریعہ نکال باہر کروں گا۔ پروین روتی ہوئی گھر سے باہر چلی گئی اس وقت رات کے دس بجے تھے ہر طرف گھرے اور کالے بادل چھائے ہوئے تھے تیز ہوا سے جانداروں کی سانس رک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ پروین اپنی دھن میں دنیا سے بیزار جنگل کی طرف نکل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے صیاد کے ظلم سے تنگ آکر کوئی پرندہ پنجرے ہی کو جنت سمجھتا ہے۔ جنگل کی اس تنہائی میں بھی اسے کوئی خوف نہیں ہو رہا تھا۔ اتنے میں کہیں سے بین بجنے کی آواز آئی جس کو سن کر پروین ذرا ٹھٹکی اور غور سے سننے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ اتنی رات گئے اس بھیانک جنگل میں کون ہوگا جو بین بجا رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد ایک ترنم خیز آواز فضا کو چیرتی ہوئی پہنچی۔ یہ ایک کمسن لڑکی کی آواز تھی جو بین کی سنگت کر رہی تھی ـــ دھوکا ہے سنسار سکھی ری دھوکا ہے سنسار ـــ

پروین آواز کی طرف بڑھتی گئی اس کو ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا۔ وہ بڑھتی گئی زندگی میں اس کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ مسرت کی ناؤ جو غم کے طوفان میں ڈوب چکی تھی

اب موسیقی کے دھارے پر ہچکولے کھانے لگی۔ جب اُس نے آواز کو بہت قریب محسوس کیا تو پوچھا "تم کون ہو!" اس کے جواب میں کسی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا" میں ایک جوگن ہوں مگر تم کون ہو جو اتنی رات کو اس بھیانک جنگل میں آئی ہو شاید تم بھی میری طرح دکھی ہوگی"۔ پروین روتی ہوئی کہنے لگی" ہاں میں بھی ایک دکھی ہوں اور دنیا سے بیزار ہو کر جنگل میں آ گئی ہوں میری یہ التجا ہے کہ میں بھی تمھارے ساتھ اپنی زندگی گزار دوں اس لڑکی نے کہا" آؤ شوق سے میرے ساتھ رہو۔ دو دکھ بھری زندگیاں مل کر ایک ایسی دنیا بنا سکتی ہیں جس میں غم کی تصویر سکون کا رنگ پیدا کر سکے"۔ اس کے بعد کسی نے بین کو چھیڑا اور وہی گیت اور اسی درد بھری آواز میں دو لڑکیاں مل کر گانے لگیں۔ اب ادھر کی سنئیے۔ جب صبح ہوئی تو لیلیٰ اور اس کی لڑکی دونوں گھر سے غائب تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لیلیٰ اپنی لڑکی کے ساتھ بہت سا نقد سامان لے کر اسی لڑکے کے ساتھ جو مسجد میں رہتا تھا اور جس کے ساتھ کہا گیا تھا کہ پروین رات کے وقت موکھے میں سے بات کر رہی تھی فرار ہو گئی جب احمد خاں کو یہ معلوم ہوا کہ پروین بے گناہ تھی اور اس کو ناحق باتیں سنائی گئیں تھیں

تو وہ بہت روئے اور اُس کو تلاش کرنے لگے اخباروں میں بھی حلیہ دے دیا گیا مگر وہ نہیں ملی۔ ایک دن احمد خاں پروین کی یاد میں بیٹھے تھے کہ ایک زور دار دھماکہ کی آواز سنائی دی جس کو سن کر وہ چونک پڑے اور حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان کی مرحومہ بیوی کھڑی کہہ رہی ہیں۔ آپ نے لیلیٰ کی باتوں میں آ کر میری پروین کو گھر سے نکال دیا اس کو آپ نے بہت دکھ دئیے وہ پروین جو آٹھ بجتے ہی سو جایا کرتی تھی اس سے دس دس بجے رات تک کام لیا۔ میری سکھی پروین رات میں دس بجے گھر سے نکالی گئی خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اب پروین کو ڈھونڈنے کی کوشش نہ کیجئے اب وہ آپ کو نہیں مل سکتی" پھر ایک دھماکے کی آواز سنائی دی جو اصل میں جرم کا اعتراف تھا یا ضمیر کی ملامت۔ احمد خاں کے تصور میں تھلکہ مچ رہا تھا۔ احمد خاں کی آنکھ کھل گئی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور تکیہ اور بچھونا آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

حمیدہ بانو

نوائے تلخ

جذبات کے طوفاں میں، یہ ضبطِ فغاں کب تک
مجبور یہ دل کب تک، مرعوبِ زباں کب تک
یہ سُود کے پردے میں آہنگِ زیاں کب تک
الفاظ کے پھندوں میں اعجازِ بیاں کب تک
آزاد ہواؤں میں پر تول نہیں سکتے
اغیار کے ہاتھوں میں عمرِ گزراں کب تک
اُٹھ جذبۂ خود داری! تا چند زیاں کاری
اُٹھ! جوشِ حمیت اُٹھ! یہ خوابِ گراں کب تک
احساس کی بستی میں جب آگ لگائی ہے
اے سوزِ درول آخر! نکلے نہ دھواں کب تک
مقصد تری ہستی کا پوشیدہ ہے کوشش میں
یہ نفس کشی تا کے، یہ خوابِ جناں کب تک
جینا ہے تو جینے کے انداز بھی پیدا کر
کام آئیں گے آبا کے یہ نام و نشاں کب تک
کہہ ڈالیں وہ سب آخر، کہنے کی جو تھیں باتیں
خاموش بشیرؔ آخر! رہتی یہ زباں کب تک

بشیر النساء بیگم بشیرؔ

سنہ ۱۹۴۰ء کا روزنامچہ

جنوری

۱ر جنوری۔ کینیڈا کی فوجیں انگلستان آئیں۔
۲ر " ۔ مدراس میں سائنس کانگریس کا اجلاس۔
۳ر " ۔ جرمنی کا فوجی مشن لینن گراڈ پہنچا۔
۵ر " ۔ وزیر جنگ مسٹر ہور بلیشا مستعفی ہوئے اور ان کی جگہ مسٹر آلیور اسٹانلی آئے۔
۶ر " ۔ ہندوستان کے سپاہی فرانس پہنچے۔
۷ر " ۔ اہل فنستان کو روسی فوجوں پر فتح حاصل ہوئی۔
۸ر " ۔ برطانیہ، فرانس اور ترکی کے مابین ایک تجارتی راضی نامہ طے ہوا۔
۹ر " ۔ مسٹر چیمبرلین نے میانشن ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے جنگ کے چار مہینوں پر تبصرہ کیا۔
۱۰ر " ۔ بمبئی میں وائسرائے بہادر نے ہندوستان کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کے لئے لوگوں سے اپیل کی اور یقین دلایا کہ ہندوستان کو مستعمراتی درجہ ملے گا۔
۱۱ر " ۔ مسلح سرحدی قبیلوں نے بعض ہندوستانی دیہاتیوں پر حملے کئے۔
۱۳ر " ۔ ہلسن کی پر چار سو روسی طیاروں نے پرواز کی۔
۱۴ر " ۔ روس کی حکومت نے اسکانڈی نیویا کے مخالف روسی مسلک پر احتجاج کیا۔
۱۶ر " ۔ دارالعوام میں مسٹر ہور بلیشا کے استعفیٰ پر مباحثہ۔
۱۷ر " ۔ وائسرائے بہادر نے بڑودہ میں تقریر کرتے ہوئے وفاق کی ضرورت پر زور دیا۔
۱۸ر جنوری۔ مہاراجہ ٹی پاز سلوان انڈیا کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔
۱۹ر " ۔ دارالعوام میں مسودہ ترمیم قانون ہند کی دوسری خواندگی۔
۲۱ر " ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے وائسرائے بہادر سے بات چیت کرنے کے لئے گاندھی جی کو منتخب کرلیا۔
۲۲ر " ۔ مسٹر جناح نے حکومت کو متنبہ کیا کہ کانگریس کے ساتھ کوئی علیحدہ سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے۔
۲۳ر " ۔ پیرس میں پادرے ریوسکی کو پولستان کی قومی کونسل کا صدر منتخب کیا گیا۔
۲۴ر " ۔ راج کوٹ کے دربار ویراوالا کا انتقال ہوا۔
۲۵ر " ۔ برطانوی حکومت نے مسٹر جناح کے شاہی کمیشن والے مطالبہ کو مسترد کردیا۔
۲۶ر " ۔ سارے ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا۔
۲۷ر " ۔ اتحادی پارلیمان میں جنرل ہرٹ زاگ کی تحریک ناکام ہوئی۔ اور ان کو ۱۸ کے مقابلہ میں ۵۹، آراء حاصل ہوئیں
۲۸ر " ۔ برطانیہ نے جاپان کے اس احتجاج کی نسبت جو آساما مارو کے واقعہ پر کیا گیا تھا مسٹر ارتیا کو جواب دے دیا۔ جاپان نے انگریزوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں بڑھادیں۔
۲۹ر " ۔ برطانیہ کے مشرقی ساحل پر جرمن طیاروں نے خوب سرگرمی دکھائی ان کا محاذ کوئی چار سو میل کا تھا۔
۳۰ر " ۔ برلن میں ہر ہٹلر نے نازی انقلاب کی ساتویں سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اتحادیوں کے مقاصد جنگ کی مذمت کی۔
۳۱ر " ۔ فنستان میں سخت معرکہ ہوا۔

فروری :-

۱ر فروری۔ جاپان کے وزیراعظم نے اعلان کیا کہ جاپان کی پوری توجہ چین کی طرف رہے گی اور وہ جنگ یورپ میں الجھنا نہیں چاہتا۔

۲ر " ۔ بلگریڈ میں بلقان کانفرنس شروع ہوئی۔

۴ر " ۔ دارالامرا میں مسودہ ترمیم قانون ہند پاس ہوا۔

بلگریڈ میں بلقان کانفرنس نے ایک معاہدہ طے کیا۔

۵ر " ۔ دہلی میں گاندھی، والسرائے گفتگو۔

بین قومی لیبر آفس نے روس کو اپنے دائرہ سے خارج کردیا۔

۶ر " ۔ مرکزی اسمبلی میں موازنہ کا اجلاس شروع ہوا۔ جناح والسرائے خط و کتابت شایع ہوئی۔

۷ر " ۔ اتحادی پارلیمان میں جنرل اسمٹس نے بتایا کہ جنوب مغربی افریقہ میں نازسی کس طرح پروپگنڈا کررہے ہیں۔

۸ر " ۔ ہز ہائینس آغاخاں نے سردار پٹیل کی تائید کی کہ ہندوستان کی گتھی کو سلجھانے کے لئے مفکروں کی ایک کانفرنس بلائی جائے۔

۹ر " ۔ پریذیڈنٹ رزولٹ نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ یورپ کی صورتِ حال کے مطالعہ کے لئے ایک سفیر روانہ کیا جائے گا۔

۱۰ر " ۔ ٹوکیو کے اخباروں نے امریکہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ جاپان کے مفاد کو محدود کرنا چاہتا ہے۔

۱۱ر " ۔ لارڈ زٹلینڈ نے ہندوستان کے کانگریسی لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ لفظی الٹ پھیر سے ہاتھ دھولیں۔

۱۲ر " ۔ کینیڈا کے گورنر جنرل لارڈ ٹویڈزموئر کا انتقال ہوا۔

۱۲ر " ۔ اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوجیں سوئز پہنچیں۔

۱۳ر " ۔ سندھ کی وزارت کا قضیہ۔

۱۵ر " ۔ مولانا ابوالکلام آزاد رام گڑھ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے

۱۶ر " ۔ سر اینڈریو کلاؤ نے اسمبلی میں ریلوے کا موازنہ پیش کیا۔

۱۷ر فروری۔ شانتی نکیتان میں گاندھی جی نے ٹیگور سے ملاقات کی۔

۱۸ر " ۔ دنیا کے سابق وزیراعظم سر عزیز الدین احمد کا انتقال ہوا۔

۱۹ر " ۔ سویڈن نے اس خوف سے کہ کہیں جنگ کی آگ اسے بھی نہ لپیٹ لے، فنستان کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔

۲۰ر " ۔ مسٹر چیمبرلین نے الٹ مارک کے واقعہ پر تقریر کی۔

۲۱ر " ۔ حکومت مدراس نے مدرسوں میں ہندی زبان کو جاری کیا۔

۲۲ر " ۔ گاندھی سیوا سنگھ نے ایک تحریک کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ وہ سیاسیات سے بالکل الگ رہے گا۔

۲۴ر " ۔ ہرہٹلر نے میونخ میں ایک تقریر کی جس میں اتحادیوں کی خوب مذمت کی اور یہ مطالبہ کیا کہ "ہتھیائی ہوئی جائداد واپس ہونی چاہیئے۔"

۲۵ر " ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ رواج کے خلاف تیسری مرتبہ صدارتی انتخاب کے لئے کھڑے ہوئے۔

۲۶ر " ۔ فنستان کی فوجوں نے جزیرہ کوئی دستو کو چھوڑدیا۔

۲۶ر " ۔ سندھ کے وزیراعظم اللہ بخش نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا کیونکہ اسمبلی نے تحریک اعتماد پاس کیا تھا۔

۲۷ر " ۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں بحریہ کا موازنہ پیش کیا۔

۲۸ر " ۔ پٹنہ میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔

مارچ :-

۱ر مارچ ۔ پٹنہ میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے رام گڑھ کانگریس کے لئے ایک تحریک منظور کی۔

۲ر " ۔ خلیج فارس میں جاسک کے قریب "ہانی بال" ہوائی جہاز لاپتہ ہوگیا۔ سوویٹ فوجیں وائی پوری میں داخل ہوگئیں۔

۵ر " ۔ سرجان سائمن، چانسلر آف دی اکس چیکر نے ۳۰ کروڑ پونڈ کے جنگی قرضے کا اعلان کیا۔

۶ر " ۔ فنستان میں سویڈن نے امن کی تحریک شروع کی۔

۱۰؍ مارچ ۔ ربن ٹروپ نے مسولینی سے ملاقات کی۔ ہٹلر نے برلن میں تقریر کرتے ہوئے عمومیوں پر حملے کیے۔
۱۱؍ " ۔ بمبئی میں یوراج میسور کا انتقال ہوا۔
۱۳؍ " ۔ ایسٹ انڈیا اسوسی ایشن لندن کے ایک جلسہ میں سر مائیکل اوڈوائر کو ایک ہندوستانی نے قتل کردیا۔
۱۴؍ " ۔ مسٹر گاندھی نے رام گڑھ کانگریس کی نمائش کا افتتاح کیا۔
۱۵؍ " ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس رام گڑھ میں۔
۱۶؍ " ۔ جرمنوں کا اسکیپا فلو پر حملہ۔
۱۷؍ " ۔ فنستان اور روس کے مابین صلح نامہ پر دستخط ہوگئے۔
۱۸؍ " ۔ ہٹلر اور مسولینی نے اطالیہ کے کسی سرحدی مقام پر ملاقات کی۔
سندھ میں اللہ بخش کی وزارت مستعفی ہوگئی۔
لارڈ زٹلینڈ نے دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہاکہ گکسٹن ہال کے واقعہ کا حکومت کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔
۲۰؍ " ۔ تروپاتی میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا دسواں اجلاس۔
۲۱؍ " ۔ رام گڑھ کانگریس کا اجلاس ختم ہوا۔
۲۲؍ " ۔ لاہور میں مسٹر جناح نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔
۲۳؍ " ۔ مسٹر یعقوب حسن کا انتقال ہوگیا۔
۲۵؍ " ۔ مہاراجہ اندور نے اصلاحات کا اعلان کیا۔
۲۶؍ " ۔ سندھ کی نئی وزارت نے اپنے مسلک کا تعین کرلیا۔
۲۷؍ " ۔ کناڈا کے انتخابات میں لبرل پارٹی کو کامیابی ہوئی۔
۲۸؍ " ۔ شہزادہ جے چند میسور کے یوراج مقرر ہوئے۔
۳۱؍ " ۔ جاپان کے وزیراعظم نے ایک نشری تقریر کی اور چین میں مرکزی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔
ممالک متحدہ نے چین میں جاپان کی قائم کی ہوئی حکومت کو ماننے سے انکار کردیا۔

اپریل

۳؍ اپریل ۔ لارڈ ٹویڈز موئر کی جگہ ارل آف اتھلون کو کناڈا کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔
۵؍ " ۔ کلکتہ میں سی۔ ایف۔ اینڈ روز کا انتقال ہوا۔
۷؍ " ۔ یورپ فتح کرلینے کے متعلق نازیوں کا ایک دہ سالہ پلان منظر عام پر آیا۔
۹؍ " ۔ جرمنی نے ناروے اور ڈنمارک پر حملہ کردیا۔ ڈنمارک پر قبضہ ہوگیا اور ناروے نے مدافعت جاری رکھی۔
۱۰؍ " ۔ شمالی سمندر میں سخت بحری معرکہ۔
۔ مسٹر چیمبرلین نے ناروے کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا۔
۱۲؍ " ۔ ناروے کی فوجیں مختلف محاذوں پر سختی کے ساتھ مقابلہ کرتی رہیں۔
۱۳؍ " ۔ ناروک میں سخت بحری لڑائی۔
۔ برطانوی فوجیں ناروے کے متعدد مقامات پر اتریں۔
۱۶؍ " ۔ جاپانی وزیر خارجہ ارینا نے کہاکہ اگر ڈچ مشرقی ہند پر کوئی اثر پڑے تو جاپان عملی کارروائی کرے گا۔
۱۸؍ " ۔ ممالک متحدہ کی حکومت نے دوسری قوموں سے اپیل کی کہ ڈچ مشرقی ہند کی "حالت موجودہ" کو برقرار رکھا جائے۔
۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے کانگریسی اداروں کو ستیاگرہ کیلئے تیار رہنے کی ہدایت کی۔
۲۰؍ " ۔ بلقان کے متعلق اطالیہ روس اور جرمنی کے مابین پیمان۔
۲۱؍ " ۔ مغربی محاذ پر بڑی ہوائی لڑائی۔
۲۲؍ " ۔ لکسمبرگ نے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے تیاری شروع کردی۔
۲۳؍ " ۔ سرجان سائمن نے دارالعوام میں جنگی موازنہ پیش کیا۔
۲۴؍ " ۔ ناروے میں جرمنی کے مقبوضہ شہروں پر برطانوی طیاروں نے حملے کیے۔

۲۰ اپریل۔ دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس۔

مئی :-

۱ مئی ۔ بمبئی میں نیشنل پلاننگ کمیٹی کا اجلاس۔

۲ " ۔ راج کوٹ کے دیوان اور کونسلروں نے استعفی دے دیا۔

۳ " ۔ ناروے کے بادشاہ اور حکومت کے لیڈر کسی نامعلوم مقام کو چلے گئے۔

۴ " ۔ جنوبی ناروے سے اتحادی ہٹ گئے۔

۵ " ۔ مسٹر لائیڈ جارج نے ناروے کے معاملہ پر حکومت کو بہت مطعون کیا۔

۶ " ۔ ہٹلر نے شاہ گستاؤ کو یقین دلایا کہ سویڈن کی غیر جانب داری کا پورا احترام کیا جائے گا۔

۸ " ۔ دارالعوام میں مسٹر چیمبرلین کے لئے تحریک اعتماد تھوڑی سی اکثریت کے ساتھ منظور ہو گئی۔

۹ " ۔ جرمنی نے ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ پر حملہ کر دیا۔

۱۰ " ۔ اتحادی فوجیں بلجیم اور ہالینڈ کی مدد کو دوڑیں۔

۔ مسٹر چیمبرلین مستعفی ہو گئے اور مسٹر چرچل نے ایک قومی کابینہ بنالی۔

۱۳ " ۔ مسٹر ایل، ایس، ایمری وزیر ہند مقرر ہوئے۔

۱۴ " ۔ ہالینڈ کی ملکہ اور حکومت کے اراکین انگلستان آئے۔

۱۵ " ۔ ہالینڈ نے اطاعت قبول کرلی۔

۱۶ " ۔ اتحادی فوجیں بلجیم کی حمایت میں لڑنے لگیں۔

۱۷ " ۔ جرمن فوجیں برسلز میں داخل ہو گئیں۔

۱۸ " ۔ جنرل گیملن کی جگہ جنرل ویگان اعلےٰ کمان دار مقرر ہوئے۔

۲۰ " ۔ کیمبرائے اور لینڈ ریسیز کے مشرق میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔

۲۱ " ۔ جرمنوں نے آراس اور امینس پر قبضہ کر لیا۔

۲۲ " ۔ مسودہ ضرورتی اختیارات نے قانون کی شکل اختیار کرلی۔

۔ فرانسیسی فوجوں نے آراس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

۲۳ فروری۔ مسٹر ایمری نے ہندوستان کی نسبت حکومت کے مسلک سے متعلق اہم اعلان کیا۔

۲۴ " ۔ آراس، کیمبرائے اور واسن سین کے مقاموں پر سخت لڑائی ہوئی۔

۲۵ " ۔ سی، پی اور بمبئی کے گورنر نے یہ تصفیہ کیا کہ آئندہ سے مقننہ کے اراکین کو تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

۲۶ " ۔ سر ایڈورڈ آئرن سائڈ اعلی کمان دار مقرر ہوئے۔

۲۸ " ۔ بلجیم کے شاہ لیوپولڈ نے اطاعت قبول کرلی۔

۲۹ " ۔ بلجیم کے وزرا نے شاہ لیوپولڈ کے فیصلے کو غیر دستوری قرار دیا۔

۳۰ " ۔ سوویٹ حکومت نے سر سٹافورڈ کرپس کے ساتھ گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

۔ فلانڈرس میں سخت معرکہ۔

جون :-

۲ جون ۔ مسٹر اریٹا نے بحر الکاہل میں جاپانی مفاد پر زور دیا۔

۳ " ۔ حکومت کی طرف سے مدافعت ہند کے قرضہ کا اعلان ہوا۔

۔ پیرس پر جرمنوں نے بمباری کی۔

۴ " ۔ مسٹر چرچل نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ فلانڈرس سے ۳۳½ لاکھ آدمیوں کو بچا لیا گیا۔

۵ " ۔ جرمنوں نے ۱۲۰ میل کا محاذ بنا کر پیرس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

۔ ادھم سنگھ کو سزائے موت۔

۶ " ۔ برطانوی طیاروں نے شمالی مغربی جرمنی پر حملے کئے۔

۷ " ۔ سوم کے محاذ پر سخت معرکہ۔

۸ " ۔ سینیٹر اسالڈو نے ایک نشری تقریر میں کہا کہ پہلا اطالوی حملہ شمالی افریقہ پر ہوگا۔

۹ " ۔ وائسرائے نے مرکزی اسمبلی کی مزید توسیع منظور کی۔

۱۰ر جون ۔ اطالیہ نے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔
۱۲ر ” ۔ جنوبی افریقہ نے اطالیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔
۱۳ر ” ۔ مسٹر رینالڈ نے امریکہ سے مدد کی آخری اپیل کی۔
۔ اعلان کیا گیا کہ پیرس کی حفاظت نہیں کی جائے گی۔
۱۴ر ” ۔ جرمن پیرس میں داخل ہوئے۔
۔ مولانا آزاد صدر کانگریس نے مسلم وزراعظم سے دہلی میں ملاقات کی۔
۱۶ر ” ۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں۔ یہ طے پایا کہ جنگی کمیٹیوں میں شرکت نہ کی جائے۔
۱۷ر ” ۔ فرانس کے نئے وزیراعظم مارشل پیتیان نے فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ کے موقوف کرنے کا اعلان کر دیا۔
۔ چرچل نے اعلان کیا کہ اس سے برطانیہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔
۱۸ر ” ۔ میونخ میں ہٹلر اور مسولینی کا مشورہ۔
۱۹ر ” ٹین ٹسن کی نسبت انگریزوں اور جاپانیوں کے مابین راضی نامے پر دستخط۔
۲۰ر ” ۔ مارشل پیتیان نے ایک نشری تقریر میں فرانس کی شکست کے وجوہ بیان کئے۔
۲۱ر ” ۔ ہٹلر نے فرانس کے سامنے اپنی شرطیں رکھ دیں۔
۲۲ر ” ۔ مسٹر چرچل نے یہ بتایا کہ فرانس کے ہتھیار ڈال دینے کے باوجود ہٹلر کے خلاف جنگ برابر جاری رہے گی۔
۲۳ر ” ۔ فرانس اور جرمنی کے درمیان صلح کی شرائط کا اعلان ہو گیا۔
۲۴ر ” ۔ مارشل پیتیان نے کہا حکومت نے شرائط صلح پر دستخط کر دیئے۔
۲۵ر ” ۔ اطالیہ کی شرائط صلح پر فرانس نے دستخط کر دیئے۔
۲۶ر ” ۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے مارشل پیتیاں کی حکومت پر الزام لگایا۔
۲۷ر ” ۔ سوویٹ فوجیں رومانیہ کی سرحد میں داخل ہو گئیں۔
۲۹ر ” ۔ مارشل بلباؤ مارا گیا۔

۔ جاپان نے شرق بعیدہ میں اصول منرو کا اعلان کر دیا۔
۳۰ر جون ۔ جاپان نے ہانگ کانگ کے برطانوی افسروں پر بے ایمانی کا الزام لگایا۔

جولائی :۔

۱ر جولائی ۔ شملہ میں وائسرائے سے گفتگو کرنے کے بعد مسٹر گاندھی دہلی واپس آئے۔
۔ رومانیہ نے برطانیہ کی ضمانت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
۲ر ” ۔ مسٹر گاندھی نے برطانیہ سے اپیل کی ہٹلر سے جنگ کرنے کی بجائے عدم تشدد پر عمل کیا جائے۔
۔ سوباش بوس کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔
۳ر ” ۔ کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس دلی میں۔ مسٹر گاندھی نے وائسرائے کے خیالات پر روشنی ڈالی۔
۵ر ” ۔ جرمنی نے اصول منرو کے متعلق اعلان کیا کہ وہ اٹل نہیں ہے۔
۶ر ” ۔ چیانگ نے ممالک متحدہ امریکہ اور روس سے مدد کے لئے اپیل کی۔
۷ر ” ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی کامل آزادی کا اعلان کیا جائے۔
۸ر ” ۔ مسٹر گاندھی نے کانگریس کے فیصلہ کی تائید کی۔ خان عبدالغفار خاں نے مجلس عاملہ سے استعفیٰ دے دیا۔
۹ر ” ۔ فرانس کی قومی اسمبلی اس بات پر راضی ہوئی کہ دستور کی نظر ثانی کی جائے۔
۱۰ر ” ۔ رودبار انگلستان پر سخت ہوائی لڑائی۔
۔ ڈیوک آف ونڈسر کو بہاماس کا گورنر بنایا گیا۔
۱۱ر ” ۔ فرانس کی قومی اسمبلی میں ۸۰ کے مقابلہ میں ۵۶۹ آراء سے یہ بات طے ہوئی کہ نیا دستور بنایا جائے۔
۔ مارشل پیتیان آمر کی حیثیت میں۔
۱۲ر ” ۔ ترکی وزیراعظم نے نازی ریشہ دوانیوں کی مذمت کی۔
۱۴ر ” ۔ بمبئی کی حکومت نے اعلان کیا کہ نشہ بندی کو دوبارہ جاری نہیں کیا جائے گا۔
۱۵ر ” ۔ مسٹر چرچل نے ایک نشری تقریر میں کہا کہ اب انگلستان کو ایک طویل جنگ کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔

۱۶ جولائی ۔ جاپانی کابینہ نے استعفیٰ دے دیا۔ نئی قومی کابینہ بنالی گئی۔
۱۷ ر ۔ کلکتہ کی بلدیہ نے سفارش کی کہ ہال ول کے مجسمہ کو گرادیا جائے۔
۔ براکی سڑک کے استعمال کے متعلق انگریزوں اور جاپانیوں کے مابین راضی نامہ۔
۱۸ ر ۔ پارٹی کنونشن نے پریسیڈنٹ روزولٹ کو تیسری دفعہ نامزد کیا۔
۱۹ ر ۔ ہٹلر نے رائش تاغ میں تقریر کرتے ہوئے برطانیہ کو مخاطب کرکے کہا کہ ایک ہولناک جنگ کے مقابلہ میں برطانیہ کو چاہیے کہ اس کی شرائط کو ترجیح دیں۔
۲۱ ر ۔ جنرل اسمٹس نے آمروں کے چیلنج کا جواب دیا۔
۲۲ ر ۔ لارڈ ہیلی فیکس نے ہٹلر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ برطانیہ ...
۔ اسٹونیا، لتھونیا اور لٹویا سوویٹ روس میں شامل ہوگئے۔
۲۳ ر ۔ سر کنگسلی وڈ نے دارالعوام میں "موقتی موازنہ" پیش کیا۔
۲۴ ر ۔ مسٹر فضل حق نے اعلان کیا کہ حکومت بنگال ہال ول کے مجسمہ کو ہٹادے گی۔
۲۵ ر ۔ لندن میں ایک نئی چک حکومت بن گئی جس کے صدر ڈاکٹر بینس مقرر ہوئے۔
۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کا پونہ میں اجلاس۔
۲۶ ر ۔ بندر سعید پر انگریزوں نے رومانیہ کے دو جہازوں کو گرفتار کرلیا۔
۲۷ ر ۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے واردھا کے تصفیہ کو منظور کرلیا۔
۲۸ ر ر ر نے دہلی کی قرارداد کو منظور کرلیا۔
۲۹ ر ۔ انگلستان کے جنوبی ساحل پر سخت لڑائی، متعدد ہوائی حملے۔
۳۰ ر ۔ لارڈ ہیلی فیکس نے ٹوکیو کی گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کیا۔
۔ وشی کی حکومت نے دلادیر، بلیوم، جنرل گیملن اور دوسرے لوگوں پر تحقیقات کرنے کے لیے ایک خاص عدالت قائم کی۔ الزام یہ ہے کہ یہ فرانس کی شکست کے ذمہ دار ہیں۔
۳۱ ر ۔ جرمن فوجیں فرانسیسی ساحل کی طرف بڑھنے لگیں۔

اگست ۴۰ء

ا اگست۔ تلک کی سالگرہ۔
۔ مولوٹوف نے سوویٹ جرمن دوستی کا مکرر تذکرہ کیا۔
۳ ر ۔ بنگلور میں ہزہائینس کرشنا راجندرا وادیار کا انتقال ہوا۔
۴ ر ۔ لتھونیا سوویٹ میں داخل ہوگیا۔
۶ ر ۔ اطالوی فوجوں نے برطانوی سمالی لینڈ پر حملہ کردیا۔
۷ ر ۔ جامعہ آکسفورڈ کی طرف سے سر رابندر ناتھ کو ڈاکٹریٹ عطا کی گئی۔
۸ ر ۔ وائسرائے نے مجلس عاملہ کی توسیع کا اعلان کیا۔
۹ ر ۔ برطانیہ نے چین سے اپنی فوجیں ہٹالیں۔
۱۰ ر ۔ جاپان نے محصورہ رقبہ کی توسیع کی۔
۱۳ ر ۔ نازیوں نے برطانیہ پر دوبارہ ہوائی حملے شروع کئے۔
۔ البانیا اطالیہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔
۱۵ ر ۔ جرمن طیاروں نے کرائیڈن کی ہوائی بندرگاہ پر بمباری کی۔ دشمن کے ۷۸ مشین گرائے گئے۔
۱۶ ر ۔ مسٹر روزولٹ اور مسٹر میکنزی کنگ نے اوگنس برگ کے مقام پر مدافعتی تدابیر کے متعلق بات چیت کی۔
۱۹ ر ۔ شاہی طیاروں نے ادیس ابابا پر حملہ کیا۔
۲۰ ر ۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں جنگ کی صورت حال کے متعلق ایک بیان دیا۔
۲۱ ر ۔ میکسیکو میں لیون ٹراٹسکی کا قتل۔
۲۲ ر ۔ سر آلیور لاج کا انتقال۔
۲۳ ر ۔ اطالیہ نے یونان کو الٹی میٹم دیا۔
۲۴ ر ۔ انگلستان میں ۶۹ نازی طیارے گرائے گئے۔
۔ رومانیا اور ہنگری کے درمیان گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
۲۶ ر ۔ آئر پر نازی طیارے۔
۲۷ ر ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے ایک مسودہ پر دستخط کردیے جس کی

رہے سے امریکی جہاز اس بات کے مجاز ہوگئے کہ یورپ کے جنگی
علاقے میں داخل ہوکر بچوں کو نکال لائیں۔
۔کنٹ میں بڑی ہوائی لڑائی ہوئی۔
۲۹ اگست۔ وائسرائے اور صدر کانگریس کی خط و کتابت شائع ہوگئی۔
۳۰ ر۔ لندن پر نازیوں کے سخت ہوائی حملے۔
۳۱ ر۔ جنوبی افریقہ کی اسمبلی میں جنرل ہرٹزاگ کی تحریک امن ناکام رہی۔

ستمبر

ا ستمبر۔ رومانیہ اور ہنگری کی سرحدوں کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک
کمیشن بیٹھا۔
۲ ر۔ میونخ پر ۵۰ منٹ تک ہوائی لڑائی۔
۔بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کے اعلان کا خیر مقدم کیا۔
۳ ر۔ برطانیہ اور امریکہ کے ابین بحری راضی نامہ
۔ہندچین کو جاپان کا الٹی میٹم۔
۴ ر۔ امریکی تباہ کن جہاز برطانیہ روانہ کئے گئے۔
۵ ر۔ جاپان نے ہندچین کو جو الٹی میٹم دیا تھا اسے عارضی طور پر
واپس لے لیا۔
۔شاہ کیرول نے رومانیہ کے دستور کو منسوخ کردیا۔
۶ ر۔ شاہ کیرول تخت سے دست بردار ہوئے۔
۔ہندچین نے اطاعت قبول کرلی اور ۱۲ ہزار جاپانی سپاہی
اس علاقہ میں داخل ہوگئے۔
۷ ر۔ یو۔ پی کے کانگریسیوں کی گرفتاری۔ الزام یہ کہ انھوں نے
ممانعت کے باوجود ڈرل کی۔
۸ ر۔ لندن پر بڑی ہوائی لڑائی۔
۔شہزادہ جے چامراج میسور کے مہاراجہ بنائے گئے۔
۹ ر۔ لندن پر سخت ہوائی حملہ۔
۔یو۔ بانے برما میں نئی کابینہ بنالی۔

۱۰ ستمبر۔ شاہی ہوائیہ نے برلن اور ہیمبرگ پر ہوائی حملے کئے۔
۱۲ ر۔ اطالوی فوجیں مصر کی طرف بڑھنے لگیں۔
۱۳ ر۔ یہ اعلان ہوا کہ قصر بکنگ ہیم اور دارالامرا کو بمباری سے نقصان پہنچا۔
۱۴ ر۔ بمبئی میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے گاندھی کو مکمل اختیارات دیئے۔
۔اطالوی فوجیں مصری سرحد میں داخل ہوگئیں۔
۱۵ ر۔ کانگریس کے جلسہ میں مسٹر گاندھی کانگریس کی قیادت پر رضامند ہوگئے
اور وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز ہوئی۔
۱۷ ر۔ ہسپانیہ کے وزیر سنیر سونیز برلن گئے۔
۱۸ ر۔ کانگریس کی کابینہ نے مسٹر گاندھی کے وائسرائے سے ملنے تک
سیول نافرمانی کو ملتوی کردیا۔
۱۹ ر۔ اطالویوں نے مصر میں سدی بارانی پر قبضہ کرلیا۔
۲۱ ر۔ ہندچین میں فرانس اور جاپان کے مابین گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
۔مصری کابینہ مستعفی ہوگئی۔
۲۲ ر۔ ہندو مہاسبھا کی مجلس عاملہ نے مطالبہ کیا کہ کونسلوں میں آبادی کے
تناسب کے لحاظ سے نمایندگی ہونی چاہیے۔
۲۳ ر۔ جاپانی فوجیں ہندچین پر چڑھ دوڑیں۔
۲۴ ر۔ فرانسیسی مغربی افریقہ میں ڈاکر کے مقام سے جنرل دوگال نے
اپنی فوجیں ہٹالیں۔
مسٹر جناح نے وائسرائے سے ملاقات کی۔
۲۵ ر۔ جاپانی فوجیں راضی نامہ کے خلاف ہندچین میں داخل ہوگئیں۔
۲۶ ر۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے اعلان کیا کہ خام لوہا جاپان کو نہ
بھجوایا جائے۔
۲۷ ر۔ ۳½ گھنٹے تک گاندھی وائسرائے کی گفتگو شملہ میں۔
۲۸ ر۔ محوری ملکوں کا جاپان سے معاہدہ۔
۲۹ ر۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کے پیش کش کو ماننے سے انکار کردیا۔
۳۰ ر۔ وائسرائے جناح کی خط و کتابت شائع ہوئی۔

اکتوبر :-

ا ر اکتوبر ۔ گاندھی ۔ وائسرائے خط و کتابت شایع ہوئی ۔
۔ وائسرائے نے جنگی کوششوں میں مداخلت کو ناپسند کیا ۔
۲ ر " ۔ جرمنی اور سوویٹ کے مابین ریلوے کا راضی نامہ ۔
۳ ر " ۔ مسٹر چیمبرلین مستعفی ہو گئے ۔ برطانوی کابینہ میں تبدیلیاں ۔
۴ ر " ۔ برمنر پر ہٹلر اور مسولینی کے درمیان گفتگو ۔
۵ ر " ۔ ممالک متحدہ کے سکریٹری ناکس نے جاپان کو دھمکی دی ۔
۔ لیبیا کے اطالوی مرکزوں پر شاہی ہوائیہ کے حملے ۔
۶ ر " ۔ بلقان میں نازی کارروائی ۔
۷ ر " ۔ نازی فوجیں رومانیہ میں داخل ہو گئیں ۔
۸ ر " ۔ مسٹر چرچل نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ۱۷ تاریخ کو برما کی سڑک دوبارہ کھول دی جائے گی ۔
۹ ر " ۔ مسٹر چیمبرلین کی جگہ مسٹر چرچل کو کنسرویٹیو پارٹی نے اپنا رہنما منتخب کر لیا ۔
۱۰ ر " ۔ چین میں جاپانیوں کی نئی سرگرمی ۔
۱۱ ر " ۔ امریکہ نے روسی جہازوں پر جو پابندیاں عاید کی تھیں وہ اٹھالی گئیں ۔
۱۲ ر " ۔ پریسیڈنٹ روزولٹ نے مجموعی مدافعت کے مسلک کو واضح کیا ۔
۱۳ ر " ۔ کانگریس نے مسٹر گاندھی کی اس تجویز کو مان لیا کہ سیول نافرمانی انفرادی طور پر شروع کی جائے ۔
۱۴ ر " ۔ بخارسٹ میں جرمنی کا بحری مشن ۔
۔ برطانوی سفیر رومانیہ سے روانہ ہو گیا ۔
۱۵ ر " ۔ ونوبا بھاوے کو پہلا ستیاگرہی منتخب کیا گیا ۔
۱۶ ر " ۔ برطانیہ کے چانسلر آف دی اکس چیکر سر کنگسلی وڈ نے ایک ارب پونڈ کی رقم طلب کی ۔
۔ چین کے امریکی باشندوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے وطن کو لوٹ جائیں ۔
۱۷ ر اکتوبر ۔ ونوبا بھاوے نے سی پی میں پانر کے مقام پر ستیاگرہ شروع کی ۔
۔ اسلحہ کی حمل و نقل کے لیئے چین اور برما کے درمیان کی سڑک کھول دی گئی ۔
۱۸ ر " ۔ رودبار انگلستان میں بحری جنگ ۔
۔ برما کی سڑک پر ہند چین کے مرکزوں کی طرف سے بمباری کی گئی ۔
۱۹ ر " ۔ ایم ۔ لیون بلیوم اور ایم ۔ رینا ؤ کو نظر بند کر لیا گیا ۔
۲۲ ر " ۔ جاپان کے برطانوی باشندوں سے کہا گیا کہ وہ جاپان سے نکل آئیں ۔
۔ ہٹلر نے ایم ۔ لاوال سے گفتگو کی ۔
۲۳ ر " ۔ فرانس اور اسپین کی سرحد پر ہٹلر نے فرانکو سے گفتگو کی ۔
۲۴ ر " ۔ ہٹلر نے مارشل پتیاں سے ملاقات کی ۔
۲۵ ر " ۔ وائسرائے نے ایسٹرن گروپ کانفرنس کا دہلی میں افتتاح کیا ۔
۔ برطانیہ پر ہوائی حملوں میں اطالیہ نے بھی اشتراک کیا ۔
۲۶ ر " ۔ اعلان ہوا کہ فرانس اور جرمنی کے مابین راضی نامہ طے ہو گیا ۔
۲۷ ر " ۔ مسٹر ایڈن نے کہا کہ جنگ کا دوسرا مرکز ممکن ہے مشرق قریب بن جائے ۔
۲۸ ر " ۔ اطالیہ نے یونان پر حملہ کر دیا ۔
۲۹ ر " ۔ برطانیہ نے یونان کی بحری امداد شروع کی ۔
۳۰ ر " ۔ چینیوں نے نانگنگ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔
۳۱ ر " ۔ اپریل ۱۹۴۲ء سے لارڈ لنلتھگو کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع ہوئی ۔
۔ چھیو کی میں پنڈت نہرو گرفتار کیئے گئے ۔

نومبر:۔

ا۔ نومبر ۔ ڈوور کے پاس جرمن توپوں نے برطانوی جہازوں پر شل باری کی ۔

۲۔ ر ۔ یونانیوں نے البانیہ میں بڑھنا شروع کیا۔

۳۔ ر ۔ آیونیا کے سمندر میں برطانوی اور اطالوی جہازوں کے مابین لڑائی۔

۴۔ ر ۔ اسپین نے ٹانجیر میں فوجی حکومت قائم کر دی۔

۵۔ ر ۔ پنڈت نہرو کو چار سال کی قید بامشقت ۔

۔ وزیر مالیہ سر جیرمی رائس من نے امدادی بجٹ کا مسودہ پیش کیا۔

۶۔ ر ۔ مسٹر روزولٹ تیسری مرتبہ صدر منتخب ہوئے ۔

۹۔ ر ۔ مسٹر چیمبرلین کا انتقال ۔

۔ برطانوی فوجیں کریٹ پہنچیں ۔ امریکہ نے وعدہ کیا کہ انگلستان کو مزید امداد دے گا۔

۱۰۔ ر ۔ دہلی میں اخباری مدیروں کی کانفرنس ۔ ترکوں نے کمال کی دوسری برسی میں حلف اٹھایا کہ وہ آزادی کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں گے۔

۱۱۔ ر ۔ اسمبلی میں کانگریس نے مسودہ مالیات کی مخالفت کی۔

۱۲۔ ر ۔ مولوٹاف نے برلن میں ہٹلر اور رِبن ٹروپ سے ملاقات کی۔

۱۳۔ ر ۔ برطانوی بحریہ نے اطالوی بیڑے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ یونانیوں نے اطالویوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کر دی ۔

۱۴۔ ر ۔ سر رابرٹ بروک پاپہم کو مشرق بعید کا اعلیٰ کمان دار بنایا گیا۔ شہر کوونٹری جرمن بم باری سے تباہ ہوا۔

۱۵۔ ر ۔ سوویٹ روس کو برطانیہ کی ضمانت ۔

۔ برطانیہ پر رات کے وقت جرمن ہوائیہ کا حملہ۔

۔ برلن پر شاہی ہوائیہ کا حملہ ۔

۱۷۔ نومبر ۔ مسٹر پٹیل کو گرفتار کر کے سابر متی لے جایا گیا۔

۱۸۔ ر ۔ برغاف میں شہنیر سونیر نے ہٹلر سے گفتگو کی ۔

۱۹۔ ر ۔ مرکزی اسمبلی میں دوسرا مسودہ مالیہ مسترد کیا گیا۔

۔ ٹرچی میں ڈاکٹر راجن کی گرفتاری ۔

۲۰۔ ر ۔ مرکزی مقننہ میں والسرائے کی تقریر ۔ کانگریس کو تنبیہ۔ وزیر ہند کی تقریر ۔ ہنگری "محور" میں شامل ہو گیا۔

۔ اسمبلی میں جنگی مسودہ مسترد ہوا ۔

۲۱۔ ر ۔ بمبئی میں مسٹر کھیر کی گرفتاری ۔

۲۲۔ ر ۔ یونانیوں کا کورٹ زا پر قبضہ ۔

۲۳۔ ر ۔ مزدوروں کے برطانوی وزیر مسٹر ارنسٹ بیون نے ہندوستانی مزدوروں اور ملاحوں کے لئے ایک نئی اسکیم بنائی ۔ رومانیہ بھی محور میں شامل ہو گیا۔ جناح کی تقریر اور پاکستان کا مطالبہ۔

۲۴۔ ر ۔ پنڈت پنت کی گرفتاری ۔ پوپ نے قیام امن کے لئے ایک ہفتہ روزہ رکھنے کا ارادہ کیا۔

۲۵۔ ر ۔ سر فرانک برلی کا انتقال۔

۲۶۔ ر ۔ لارڈ راتھرمیر کا انتقال ۔

۔ بحر ہند میں ایک انگریزی تجارتی جہاز ڈوب گیا۔

۲۷۔ ر ۔ بہار میں سری کرشنا سنہا کی گرفتاری ۔

۲۸۔ ر ۔ جنرل آچن لیک کو ہندوستان کا اعلیٰ کمان دار بنایا گیا۔

۲۹۔ ر ۔ جاپانی ریل گاڑی کو جو شنگ ہائی سے نان کنگ جا رہی تھی، اڑا دیا گیا۔

۳۰۔ ر ۔ جناح کی تقریر کہ مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں حسب ضرورت مداخلت کریں گے ۔

جاپان نے نان کنگ کی ریاکار حکومت کو مان لیا۔

ڈسمبر۔

۱ر ڈسمبر۔ ستیاگرہیوں کی گرفتاریاں۔ لاہور میں تحریک پاکستان کے خلاف کانفرنس۔

۲ر ،، ۔ ورسائیے فرانس کا دارالسلطنت بنایا گیا۔ لورین کا علاقہ جرمن میں شامل کیا گیا۔

۵ر ،، ۔ جرمنی اور رومانیہ کے درمیان دس سالہ معاہدہ۔

۹ر ،، ۔ جاپان کا اعلان کہ امریکہ جنگ میں شریک ہو تو جاپان جرمنی کا ساتھ دے گا۔

ہز اکسلنسی تائی چی تاؤ شانتی نکیتان میں۔

۱۰ر ،، ۔ مصری محاذ پر اطالویوں کے خلاف برطانوی فوجوں کی کامیاب جارحانہ پیش قدمی۔

۱۲ر ،، ۔ مسٹر ایمری کی تقریر کہ سب جماعتوں کو خودغرضانہ منصوبے ترک کرکے "ہندوستان پہلے" کی آواز بلند کرنی چاہیے۔

۱۳ر ،، ۔ سپرو کی اپیل گاندھی جناح اور حکومت ہند سے کہ سب متحد ہوکر ایک قومی حکومت بنالیں۔

۱۴ر ،، ۔ والسرائے کی ایوان تجارت میں تقریر جس میں اگست والے پیش کش کو دوہرایا گیا۔

۱۶ر ،، ۔ پنجاب اسمبلی میں فوجی بھرتی پر مباحثہ اور خان بہادر کرانی کی تحریک کی منظوری۔

۱۷ر ڈسمبر۔ واردھا سے اعلان کہ کرسمس کے دنوں میں ستیاگرہ بند رہے گی۔

۱۸ر ،، ۔ حبش میں اطالویوں کے خلاف تحریک زور پکڑنے لگی۔

۱۶ر ۱۸ر ،، ۔ لاہور میں انڈین ہسٹری کانگریس کا چوتھا سالانہ جلسہ

۱۹ر ،، ۔ لکھنؤ میں پہلی "انگلش کانفرنس"۔ ڈاکٹر امرناتھ جھا کی صدارت میں۔

۲۱ر ،، ۔ کلکتے میں دوسرے مسودۂ تعلیم کے خلاف احتجاج۔

۲۱ر ،، ۔ بڑودے میں ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کا سترھواں سالانہ جلسہ۔

۲۲ر ۲۳ر ،، وسوا بھارتی کی سالگرہ۔

۲۴ر ،، ۔ امریکہ کو جاپان سے خدشہ۔ فلپائن کو بہت مستحکم کیا جانے لگا۔

۲۸ر ،، ۔ احمد آباد میں مسٹر جناح کی تقریر۔ پاکستان پر زور۔

۲۹ر ،، ۔ مدورا میں ڈاکٹر مونجے نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔

۳۰ر ،، ۔ روزولٹ نے اپنی قوم کو تنبیہ کی کہ اگر برطانیہ ہار جائے تو امریکہ بڑے خطرے میں پڑ جائے گا۔

۲۸ر ۳۱ر ،، پونا میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(ح۔ ص)

گورستان

یہ نظم میری ایک طویل نظم "گورستان" کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے اپنی والدہ صاحبہ کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ (داستان)

وقت کا غصہ، زمیں کا طیش، گردوں کا ستم　　ریت کی جاجم سی یہ اڑتی ہوئی نقشِ قدم
یہ پرانی زاوراہیں، یہ کھلی، پگڈنڈیاں　　ان کو ویرانہ کہوں کیونکر لرزتی ہے زباں
یہ سمٹتی جھاڑیاں، یہ سانس لیتا التہاب　　یہ جواں ہوتی طپش، یہ حرخ کھاتا آفتاب
یہ بگولوں کے بھنور، یہ گرم جھونکوں کا بہاؤ　　یہ خنک سایوں کے مرہم، یہ تپی راہوں کے گھاؤ
یہ جزیروں کے کھنڈر، بیکس مزاروں کے نشاں
ان کو ویرانہ کہوں کیونکر لرزتی ہے زباں

اس احاطہ میں تکلم ہے خموشی کا اسیر　　اس سڑک پر ایک ہو جاتے ہیں سلطان و فقیر
توڑ دیتا ہے یہاں آئینہ احساسِ شباب　　خاک پر چھپتی ہے آئین وضوابط کی کتاب
عشق کے دل میں جنوں کی رو گزر سکتی نہیں　　حسن کی جانب نظر تکلیف کر سکتی نہیں
سیر ہو جاتی ہے بھوک اور سرد پڑ جاتی ہے پیاس　　گھٹنیوں چل کر نہیں جاتے ہیں بچے ماں کے پاس
بھائی کا بھائی سہارا لے کے چل سکتا نہیں　　باپ بیٹے کی طرف کروٹ بدل سکتا نہیں
بے ثباتی ڈال دیتی ہے یہاں آنکھوں میں دھول　　آئینہ سیماؤں کے سینوں پہ اگتے ہیں ببول
ذہن کے حجرے سے باہر آئے کیا لفظوں کی لاش　　نطق کا سانچہ ہی کر دیتی ہے فطرت پاش پاش
اہلِ دولت گنگ ہیں اس انجمن کو دیکھ کر　　ہنس نہیں سکتے غریبی کے کفن کو دیکھ کر
زرد کر دیتی ہے یہ آب و ہوا روئے بہار　　اس زمیں پر جھک کے چلتا ہے غرورِ شہریار
بھول جاتی ہیں یہاں مائیں محبت کے اصول　　امتوں کی دستگیری چھوڑ دیتے ہیں رسول

یہ بُرا ہے، یہ بھلا، یہ تیرہ دل یہ پاک باز
موت کی خوں ریز آنکھوں کو کہاں تھی امتیاز

منصفی، الفت، وفا، یہ اصطلاحاتِ بشر
موت کی کالی زباں پر اور پھر ان کا گزر؟

موت کی خشکی پہ ماتم جال بن سکتا نہیں
اس کا بہرا پن ان آوازوں کو سن سکتا نہیں

ہیں یہاں مدفون وہ سیمیں تن و رنگیں عذار
سیکڑوں قلب و نظر کرتے تھے جن کا انتظار

اس جگہ وہ لوگ دم سادھے ہوئے خاموش ہیں
کارنامے جن کے جرأت بخش و سطوت کوش ہیں

گنگ ہیں سیندور کھائے مطربانِ خوشنوا
جن کی ہر اک سانس تھی مہکی ہوئی موجِ صبا

جن کی آوازوں میں ڈھل کر نغمہ بن جاتا تھا ضو
جن کی مضرابوں سے دل کے ساز دا اُٹھتے تھے تَو

دفن ہیں ان خاک کے تودوں میں وہ آنکھیں وہ دل
منکشف تھے جن پہ اسرار و رموزِ آب و گل

ان میں وہ مزدور بھی ہیں ذی وقار و ذی حشم
جن کے احسانات سے دوہری ہے محرابِ حرم

جن کی محنت سے درخشاں ہیں شوالوں کے کلس
ارتقا کی نبض تھی جن کا ہر اک تارِ نفس

ہیں کلیساؤں کے رُخ پر جن کے جذبے آشکار
جن کی پستی پر ہے عالم کی بلندی کا مدار

خون جن کا جذب ہر دیوار میں ہر در میں ہے
فرش میں محراب میں مینار میں منبر میں ہے

جن کی شہ رگ کا لہو پی کر جواں ہے کائنات
کرتی ہے تصنیف جن کی عمر خونیں واقعات

ناخدا اس گھاٹ کی کشتی کو کھے سکتا نہیں
آدمی کو آدمی آواز دے سکتا نہیں

اب وہ بازو خاک ہو کر مل گئے ہیں خاک میں
مچھلیاں تھیں جن کی مضطر کوششِ آہن چاک میں

نام کھودے ہیں جنھوں نے خود زمیں کے طشت پر
جن کی مہریں ثبت ہیں قرطاسِ بحر و دشت پر

سو رہے ہیں سب کے سب یہ سیکڑوں من خاک میں
غلغلے برپا ہیں لیکن گنبدِ افلاک میں

آ رہی ہے ہلکی ہلکی سی صدا یہ بار بار
موت کا چنگل ہے سر پر جانے والے! ہوشیار!

احسان دانش

نئی کتابیں

۱۔ محمد قلی قطب شاہ (سوانح) از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ... ۵۰۰ صفحات قیمت صہ سب رس کتاب گھر خریت آباد

۲۔ عقل و جنوں (انقلابی نظمیں) از حکیم میر کاظم علی برق موسوی ۹۰ صفحات قیمت ایک روپیہ ۔ مرکز ادب حیدرآباد

۳۔ وجدانیات (مجموعۂ کلام) از شوکت علی خاں فانی قیمت عہ دفتر روزنامۂ پیام ۔ حمایت نگر۔

۴۔ رضا شاہ پہلوی (سوانح) از کے ۔ اے حمید بیرسٹرایٹ لا قیمت ہے مکتبہ ابراہیمیہ ۔ حیدرآباد

۵۔ نازو اور دوسرے افسانے از اختر انصاری ۱۷۵ صفحات قیمت عہ کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی۔

۶۔ بحر تبسم (مزاحیہ مضامین) از شوکت تھانوی قیمت عاں کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی۔

۷۔ اخلاق و فلسفہ اخلاق از حفظ الرحمن سہاروی قیمت للعہ کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی۔

۸۔ غلامان اسلام (سوانح) از سعید احمد قیمت للعہ ر کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی

۹۔ نئی پود (افسانے) از ازہر قدوائی ۱۶۶ صفحات قیمت عہ مکتبہ جامعہ ۔ نئی دہلی۔

۱۰۔ اردو شاعری پر ایک نظر از حکیم الدین احمد عظیم پبلشنگ ہاوس بانکی پور ۔ پٹنہ

۱۱۔ شادی (میری اسٹوپ کی کتاب کا ترجمہ) از توقیر مرزا رزاقی قیمت عہ ۔ ایس ۔ اے ۔ رحیم جنرل مرچنٹ حیدرآباد۔

۱۲۔ ہندوستانی تہذیب کی تکمیل ۔ از کالیداس کپور قیمت ۱۰ر نولکشور پریس ۔ لکھنؤ۔

۱۳۔ خیال آفریں دماغ (ڈراما) از عرش تیموری قیمت ۸ر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

۱۴۔ پاکستان اور مسلمان از انیس الرحمن .. ۴۸ صفحات قیمت ۲ر دفتر روزنامۂ پیام حمایت نگر

۱۵۔ انوار (غزلیں اور نظمیں) از علی اختر ۶۰ صفحات قیمت عہ سب رس کتاب گھر

۱۶۔ ذکر الحبیب صلعم (صدر یار جنگ کی تقریریں) مرتبہ محمد اکبر علی مدیر صحیفہ ۱۹۲ صفحات قیمت عہ دفتر صحیفہ چادر گھاٹ حیدرآباد

۱۷۔ قرآن اور اقبال (خطبات اور کلام کا مجموعہ) مرتبہ محمد ابو مصلح ۱۹۲ صفحات قیمت عاں ۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید ۔ حیدرآباد۔

۱۸۔ دیوان ہاجر از حکیم رگھناتھ سنگھ ہاجر دہلوی ۸۰ صفحات قیمت عہ کنور راج رگھندن سنگھ طاہر ۔ کناری بازار ۔ دہلی۔

۱۹۔ سہارا اور دوسرے افسانے از شفیق بانو شفیق ۱۴۴ صفحات قیمت عہ شفیق بانو ۔ نجیب آباد

۲۰۔ چیونٹی (چیونٹی کے حالات) از مہندر راج سکسینہ ۱۵ صفحات سب رس کتاب گھر خریت آباد۔

۲۱۔ دنیا کے بچے نمبر ۱ (مشرقی بچوں کے حالات) از عزیز رضوی ۴۸ صفحات قیمت ۴ر سب رس کتاب گھر۔

۲۲۔ خوں ناب (غزلوں کا مجموعہ) از اختر انصاری مکتبہ جہاں نما دہلی

۲۳۔ لفٹنٹ (مزاحیہ فسانہ) از مرزا عظیم بیگ چغتائی ۴۸ صفحات قیمت ۶ر دفتر کتابت ۔ جودھپور۔

۲۴۔ اصول صحت حصہ اول و دوم از صفی حیدر کوثر قیمت ۱۴ر اسٹار بکڈپو کلکتہ

۲۵۔ فلسفہ ہومیوپیتھی از ڈاکٹر یار محمد خاں غزنی فارسی ۲۰/۱ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

۲۶۔ کھیتی (ڈراما) از محمد مجیب ۔ مکتبہ جامعہ ۔ دہلی۔

۲۷۔ سلطان محمود غزنوی از پروفیسر حبیب مترجمہ سید جمیل حسین قیمت عہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد

۲۸۔ کرشمات ہیکلائی از ڈاکٹر علی شیر ۱۵۰ صفحات قیمت عہ ۔ اے رشید اینڈ کمپنی ریلوے روڈ ۔ جالندھر۔

۲۹۔ ہم اور وہ از خواجہ محمد شفیع دہلوی ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ر از مصنف بلیماران دہلی

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

بغداد کا جوہری۔ از اشرف صبوحی صاحب دہلوی کتب خانہ علم و ادب دہلی قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۱۶۸۔

اشرف صاحب کی کہانیاں اور مضمون اکثر اردو رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں اور جیسا کہ اس کتاب کے تعارف میں پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب نے لکھا ہے اشرف صاحب کو مغربی افسانوں کو مشرقی انداز اور اسلوب سے بیان کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کے ترجموں پر اصلی اور طبعزاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

بغداد کا جوہری ایک افسانہ ہے جو انگریزی سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن انگریزی میں بھی کسی اور زبان سے منتقل ہوا ہوگا۔ یہ افسانہ ایک شادی شدہ متمول تاجر کی ایک عجیب نفسیاتی کشمکش کو پیش کرتا ہے۔ اور اس میں بڑے کمال سے مشرقی بیوی کی وفاداری اور اطاعت گزاری کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ عہد حاضر میں اتنا دلچسپ اور بامعنی کوئی افسانہ شاید ہی اردو میں طبع ہوا ہو۔

مختصر حالات حضرت بی بی فاطمہ۔ مرتبہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا ۴۲ صفحات اس کتاب کو مرتبہ نے اپنے مرحوم شوہر سید ہمایوں مرزا کے نام معنون کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ مرحوم نے حضرت علی کے حالات پر ایک کتاب شاہ راہ نجات لکھی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کو حضرت فاطمہ کے حالات چھپوانے کا خیال پیدا ہوا۔

یہ ایک چھوٹی سی دلچسپ کتاب ہے۔ اور اس کا مطالعہ خاص کر خواتین کے لئے سبق آموز ثابت ہوگا۔ اس کے آغاز میں دو تین غزلیں اور نظمیں ہیں جن میں نعت اور منقبت کی حد تک تو کوئی عذر نہیں لیکن بی بی فاطمہ کی سوانح حیات کی ابتدا میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی شان میں نظم درج کرنا بے موقع معلوم ہوتا ہے۔

رہنمائے مدینہ۔ مرتبہ مولوی مسعود علی صاحب محوی بی اے صفحات ۲۴۲ قیمت بارہ آنے۔

یہ کتاب مدینۂ منورہ کا کوئی سفرنامہ نہیں ہے بلکہ اس قدیم تاریخی اور مقدس شہر کے آثار کی ایک نہایت ہی مفید اور مستند تاریخ ہے۔ کچھ عرصہ سے اردو میں مقامات مقدسہ کے سفرنامے شایع ہو رہے ہیں۔ لیکن محوی صاحب نے بڑا اچھا کیا کہ سفرنامہ لکھ کر اپنے حالات و خیالات کی نمود و نمایش کرنے کی جگہ خود مدینہ اور اس کے نواح کے متعلق ایک ایسی محققانہ کتاب قلمبند کردی جو ایک بڑا مورخ اور محقق ہی لکھ سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے جو دیار نبی سے کسی نہ کسی طرح کی دلچسپی رکھتا ہو۔

اردو شاعری پر ایک نظر۔ از کلیم الدین احمد ناشر عظیم پبلشنگ ہاؤس بانکی پور۔ پٹنہ صفحات تقریباً چار سو مجلد۔

کلیم الدین احمد صاحب پٹنہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اردو ادب کا بھی اچھا ذوق حاصل ہے۔ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ہماری شاعری اور پروفیسر سروری کی جدید اردو شاعری دو کتابیں اس موضوع پر اب تک لکھی گئی تھیں۔ یہ تیسری کتاب ہے جس میں گزشتہ کتابوں سے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ اردو شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے پہلا حصہ قدیم شاعری پر اور دوسرا جدید سے متعلق لکھا گیا ہے۔ لیکن زیادہ علمی ترتیب یہ ہوتی کہ تین حصے بنائے جاتے اور قدیم شاعری کو

بجائے میر اور سودا سے شروع کرنے کے وجہی و غواصی سے شروع کیا جاتا اور اگر یہ ممکن نہ تھا تو کم از کم ولی اور سراج ہی سے شروع کر سکتے تھے کیونکہ ان لوگوں کا کلام چھپ چکا ہے۔ اور اس دور کے دوسرے دہلوی شعرا مثلاً حاتم، آبرو، اور تاباں وغیرہ کا کلام بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ مصنف نے اس دور کو بالکلیہ ترک کر کے میر، سودا اور درد کو متقدمین میں شمار کیا ہے۔

کتاب کی ترتیب اور کتابت و طباعت بھی اصلاح اور ترقی کی محتاج ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب شعر و سخن کے شائقین میں مقبول ہو کر ان کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگی اور اگر اس کی دوسری طباعت کا موقع آئے تو مرتب اس کے موجودہ نقائص کو ضرور دور کر سکیں گے۔

دنیا کے بچے۔ از عزیز رضوی۔ ۴۷ صفحات ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر قیمت چار آنے۔

اردو میں ادب اطفال کی جو کمی عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی اس کی تلافی اب کچھ کچھ ہوتی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب دنیا کے بچے ادب اطفال کے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس کی اشاعت عزیز رضوی صاحب کے پیشِ نظر ہے۔ اس میں سلیس زبان کے ذریعہ سے مفید معلومات کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو بچے شوق سے پڑھیں گے کیونکہ اس میں بچوں ہی کے آپس کے مکالمے کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

مبادی سیاسیات۔ از پروفیسر ہارون خاں شروانی مکتبہ جامعہ ملیہ ۔ ۱۵۰ صفحات قیمت پانچ روپے۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب کی یہ کتاب اس سے قبل شائع ہو کر اتنی مقبولیت حاصل کر چکی ہے کہ اب جامعہ ملیہ نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے اب تک دنیا کی سیاست نے اتنا پلٹا کھایا ہے کہ پروفیسر ہارون خاں صاحب کو یہ کتاب ایک بڑی حد تک از سرِ نو لکھنی پڑی اس میں بعض حصوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور آخر میں اصطلاحات کی فرہنگیں بھی شامل کی گئی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ ایڈیشن بھی کافی مقبول ہوگا۔

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی۔ از محمد مرزا صاحب دہلوی کتب خانہ علم و ادب دہلی ۲۵۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

یہ کتاب ہندی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس میں مسلمانوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہونے کے بعد سے مسلم لیگ کے جدید ترین مطمحِ نظر تک کے حالات و رجحانات پر نہایت خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو ہندوستانی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔

فنِ تقریر۔ مرتبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو ۹۶ صفحات قیمت آٹھ آنے۔

ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاست اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کی نئی پود فنِ تقریر کی اہمیت سے واقف ہو کیونکہ آئندہ وہی جماعت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکے گی جس کے زیادہ سے زیادہ افراد تقریر کرنے کے ہنر سے واقف ہوں گے۔ اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر ادارہ ادبیات اردو نے یہ باتصویر کتاب شائع کی ہے جس میں متعدد تصویریں بھی شریک کی گئی ہیں۔ تاکہ ان کی مدد سے مقرر کی مختلف حرکات واضح ہو جائیں اور فنِ تقریر کے

طالب علم کو معلوم ہو کہ تقریر کرتے وقت کس طرح کھڑا ہونا چاہیے اور اپنے مختلف اعضاء سے کیونکر کام لیا جاسکتا ہے۔ ابتداً میں فنِ تقریر کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور اس کے بعد تفصیل میں فنِ تقریر سے متعلق ضروری اور اہم معلومات دل نشیں پیرائے میں درج کی گئی ہیں یقین ہے کہ مدرسوں کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

معارفِ جمیل۔ مجموعۂ کلام حکیم آزاد انصاری ملنے کا پتہ کاشانۂ ناز۔ گھانسی بازار حیدرآباد قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ صفحات ۲۵۶۔

حکیم آزاد انصاری ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اور مولانا حالی کے خاص فیض یافتہ اور معتقدوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں خاص روانی اور بے ساختہ پن ہے۔

معارفِ جمیل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ردیف وار مرتب ہونے کے باوجود اس میں تقریباً ہر نظم یا غزل پر تاریخ بھی درج ہے۔ شاہ ظہور الدین حاتم کے دیوان زادہ کے بعد یہ ایک کتاب ایسی نظر سے گزرتی ہے جس میں شاعر نے خاص اہتمام سے اپنے کلام کو مرتب کیا ہے۔ جناب تراب علی خاں باز قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس گنجینۂ سخن کو بڑی خوبی سے شایع کیا ہے۔

دانہ و دام۔ از راجندر سنگھ بیدی مکتبہ اردو لاہور صفحات ۲۳۰ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

یہ دیدہ زیب کتاب اردو کے نوجوان افسانہ نگار راجندر سنگھ کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اکثر افسانے زندگی کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اور ترقی پسند ادب میں ایک اچھے اضافے کا باعث ہیں۔ راجندر سنگھ کے اسلوب بیان اور واقعیت پسندی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ منشی پریم چند کی کتابوں کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ ایک روز یہ ان کے سچے جانشین ثابت ہوں گے۔ جدید اردو افسانہ نگاری کی خصوصیتوں کے پیش نظر دانہ و دام ایک معیاری کتاب سمجھی جاسکتی ہے۔

قرآن اور اقبال۔ از ابو محمد مصلح ناشر ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن صفحات ۱۹۱ قیمت فی جلد دو روپے

ابو محمد مصلح صاحب کچھ عرصہ سے اردو میں قرآن سے متعلق مفید ادب پیش کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے اردو ادب کی چھان بین بھی شروع کردی ہے۔ چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے لازمی تھا کہ انھیں اس میں ان کے کام کی بہت سی چیزیں مل جاتیں۔ حسن اتفاق سے انھوں نے سب سے پہلے علامہ اقبال کے کلام کو منتخب کیا چونکہ اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد قرآن مجید ہی کی رہبری میں اپنی زندگیوں کو سنوارنے میں کوشاں ہے اور علامہ اقبال انہی کے ترجمان ہیں اسی لئے ان کے کلام میں مصلح صاحب کو بہت سا مفید مواد ہاتھ آگیا ہے۔

مغربی علم و فضل کے بہت بڑے ماہر اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کو اس امتیاز پر فخر حاصل تھا کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے ماخذ و مبدا یعنی قرآن مجید کے بڑے رسیا اور فیض یافتہ تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ان کے کلام میں اس عظیم الشان کتاب کے اثرات جگہ جگہ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ انہیں جھلکوں کو مصلح صاحب نے ایک جگہ کرکے اپنی تشریح و توضیح کے ساتھ تابناک بنا دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اقبال کے سمجھنے میں اور بھی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ کتاب چھوٹی کراؤن سائز پر چھپنے کی جگہ اگر اسی نصف رو بکاری سائز پر چھاپی جاتی جس پر اقبال کی کتابیں چھپی ہیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔

خطبۂ صدارت

ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر پی سی۔ کے ٹی۔ ایل ایل ڈی۔ ڈی سی ایل صدر اعظم باب حکومت کا وہ خطبہ جو بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ بتاریخ ۸ جنوری ۱۹۴۱ء کو ممدوح نے ادارۂ ادبیات اردو کے ۱۹۴۰ء کے اردو امتحانات کی سندیں اور انعامات عطا فرمانے کے بعد سنایا تھا۔

جناب صدر صاحب و ارکان مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اردو و دیگر حاضرین!

آج اردو امتحانات کی سندیں اور انعامات تقسیم کر کے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ یہ امتحان ملک میں خواندگی بڑھانے میں مفید ثابت ہو رہے ہیں۔

اردو نہ صرف ہندستان کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے بلکہ ہماری سلطنت کی سرکاری زبان بھی ہے اور اسی وجہ سے یہ ہم کو بہت عزیز ہے اور جو بھی اس کی خدمت کرتا ہے اس کی ہم قدر کرتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو گزشتہ دس سال سے اردو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمت کر رہا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی جب میں نے گزشتہ ہفتہ میں اس کا معائنہ کر کے معلوم کیا کہ اس ادارہ کے کارکنوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق و جستجو کا مادہ موجود ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ بہت سا ایسا مواد جمع کر لیا گیا ہے جو کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوگا اور جس کی اشاعت و حفاظت ہر ترقی یافتہ قوم کا مقدس فریضہ ہے۔

مجھے توقع ہے کہ ادارہ کے کارکن اسی طرح خلوص اور جوش کے ساتھ اپنا کام جاری رکھیں گے اور جب اس ادارہ کی ایک ذاتی عمارت بن جائے گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ حیدرآباد میں تصنیف و تالیف اور علم و فضل کا ایک اچھا مرکز ثابت ہوگا۔

میں آخر میں امتحانوں میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو مبارکباد دیتا ہوں اور متوقع ہوں کہ ہر سال اسی طرح سیکڑوں لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ادارۂ ادبیات اُردو

آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر سید مہدی حسین بلگرامی ایم اے (کیمبرج) معین امیر جامعہ عثمانیہ و صدرالمہام تعلیمات و فینانس دولت آصفیہ کی وہ تقریر جس کو جلسۂ عطائے اسناد میں موصوف کی ناسازیٔ مزاج اور آواز کی خرابی کی وجہ سے مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب اچ سی ایس معتمد فینانس حکومت سرکار عالی نے پڑھ کر سنایا۔

ادارۂ ادبیات اُردو اپنی زندگی کے دس سال ختم کر کے اب گیارھویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس اثناء میں اس نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک مرکزیت حاصل کرلی ہے اور اپنے تحت مختلف مذاق کے اصحاب پر مشتمل بارہ شعبے قائم کر کے تقسیم کار کے مفید اصول پر عمل پیرا ہے۔

اس کی مطبوعات کا سلسلہ بھی برابر ترقی کر رہا ہے چنانچہ اب تک نثر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے بعض مثلاً تاریخ ادب اُردو سائنس کے کرشمے، دفتری معلومات اور اُردو دانی کی کتابیں حیدرآباد میں اور باہر بھی نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ تین رسالے سب رس، بچوں کا سب رس اور سب رس معلومات بھی ہر مہینے پابندی سے شائع ہوتے ہیں اور سلیس و سادہ اور ہر رنگ کے مضامین کی وجہ سے مقبول ہیں۔

قلمی و تاریخی تحقیقات سے متعلق بھی اس نے نمایاں کام کیا ہے اور اس سلسلے میں نادر قلمی و مطبوعہ کتابوں اور کاغذات کا ایک ایسا ذخیرہ فراہم کرلیا ہے جو تحقیقاتی کاموں کے لئے گنج شائگاں ثابت ہوگا جس وقت اس ادارہ کی عمارت بن جائے گی تو اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہوگا کیونکہ اس عمارت کا ایک حصہ ان لوگوں کے قیام کے لئے مخصوص رہے گا جو علمی تلاش و تحقیق کے سلسلے میں باہر سے آتے ہیں۔

ادارہ کا ایک شعبہ ادبی آثار کی حفاظت میں بھی مصروف ہے چنانچہ اس سال اس نے شاہ سراج اورنگ آبادی کے شکستہ گنبد کو بہت ہی خوبصورت بنا دیا ہے۔ انہی شعبوں میں سے ایک شعبۂ امتحانات ہے جس نے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ ان امتحانوں میں ہر مذہب و ملت کے مرد اور عورتوں نے شرکت کی۔ اُردو دانی کے امتحان میں ۹۵ مسلمان اور ۴۶ ہندو شریک تھے اور ۴۴ عورتیں جملہ امتحانات کے شرکا کی تعداد ۲۶۰ تھی۔ پہلے ہی امتحان میں اتنے امیدواروں کی شرکت باعث مسرت ہے۔ آئندہ اس تعداد میں اور اضافہ ہوگا کیونکہ اب بلدہ اور اضلاع کے علاوہ بیرون ریاست کے مختلف مقامات مثلاً مدراس، کرنول، عمرآباد، بمبئی اور پونہ میں بھی ان امتحانوں کے لئے امیدوار تیار ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ آئندہ امتحانات کے لئے ادارہ کو بہت زیادہ مرکز قائم کرنے پڑیں گے یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ممتحنوں میں مقامی اصحاب کے علاوہ بیرون ریاست کے مستند اصحاب بھی شامل ہیں۔

میں آخر میں ادارہ کے سرپرست رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر سے استدعا کرتا ہوں کہ امتحانات کے اسناد اور انعامات تقسیم فرمائیں۔ آپ کے ہاتھوں سے اس نیک کام کا آغاز ادارہ کے لئے مبارک و مسعود ثابت ہوگا۔

جلسۂ عطائے اسناد و انعامات

بتاریخ ۸ جنوری ۱۹۴۱ء ادارہ کے اردو امتحانات کی اسناد اور انعامات کی تقسیم کے لئے ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل نواب سرحیدر نواز جنگ بہادر سرپرست ادارہ کی صدارت میں بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدرآباد ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ارکان باب حکومت سرکار عالی مثلاً آنریبل نواب سرعقیل جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر اور نواب مرزا یار جنگ بہادر کے علاوہ اکثر معتمدین و نظماء نیز حیدرآباد کے اکثر معزز ہندو اور مسلمان اصحاب مثلاً نواب بہادر یار جنگ بہادر، میر اکبر علی خاں بیرسٹر، مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام، راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی، ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ، پروفیسر مہندر راج سکسینہ، مسٹر شنکر جی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ ٹاؤن ہال میں مہمانوں، ادارہ کے رفقاء و معاونین، مجالس ادارہ کے اراکین اور کامیاب امیدواروں کی نشست کے لئے بڑے سلیقہ سے علحدہ علحدہ انتظامات کئے گئے تھے۔ اس جلسے میں پہلے مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر شعبۂ اردو امتحانات نے صدر اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ۱۹۴۰ء کی روئداد سنائی۔ اس کے بعد نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ نے ادارۂ ادبیات اردو کے متعلق ایک معلومات آفریں تقریر فرمائی اور سر اکبر حیدری سرپرست ادارہ سے تقسیم اسناد و انعامات کی استدعا کی۔

اس کے بعد سر اکبر حیدری نے تالیوں کی گونج میں کامیاب امیدواروں کو اسناد و انعامات تقسیم فرمائے امتحان اردو فاضل میں (۱۱) امیدوار شریک تھے جن میں سے چھ کامیاب ہوئے۔ ان میں سے تین نے درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ کامیاب امیدواروں میں ۲ دو خواتین بھی شامل ہیں

امتحانات اُردو عالم میں (۶۸) امیدوار شریک تھے جن میں سے (۴۴) کامیاب ہوئے۔ تین بدرجۂ اول کامیاب ہوئے۔ کامیاب شدہ خواتین (۴) ہیں۔

امتحان خوش نویسی میں (۹) امیدوار شریک ہوئے پانچ کامیاب ہوئے۔

امتحان اُردو دانی میں (۱۳۴) امیدوار تھے (۱۲۸) کامیاب ہوئے۔ پندرہ نے بدرجۂ امتیاز کامیابی حاصل کی۔ اس امتحان میں کامیاب ہونے والی خواتین کی تعداد (۲۳) ہے۔ حسب ذیل امیدواروں نے تمغے حاصل کئے۔ اُردو فاضل۔ طیبہ بیگم بلگرامی طلائی تمغہ بلقیس بانو۔ اُردو عالم۔ تمغۂ ادارۂ ادبیات اُردو، اشرف الدین فیضی (بمبئی) تمغہ محمدی بیگم، عصمت النساء بیگم اور محمودہ بیگم کو دیا گیا۔ تمغہ احمد عبداللہ صاحب بسٹپا (کشتگی)، خوش نویسی میں تمغہ ادارۂ ادبیات اُردو۔ سید اسمٰعیل (اسنور اپور) تمغۂ محمد حسین صاحب۔ کریم داد خاں (کشتگی)۔ اُردو دانی:۔ تمغۂ معطیہ سکینہ بیگم صاحبہ، امجدی بیگم۔ تمغہ رستم جی، آمنہ بی (کشتگی)، تمغہ معطیۂ احمد عبداللہ صاحب، کریم داد خاں (کشتگی)۔ انعام ادارۂ ادبیات اُردو۔ محمد عثمان علی بلدہ، محمد نظام الدین (کشتگی)، عبدالقادر (کلیانی) مہادیو سنگھ (کلیانی) سید شمس الضحیٰ (بمبئی) ہنگنگوڑہ (کشتگی) محمد جعفر (کشتگی)

بین المدارسی فی البدیہ تقریری مقابلہ۔ انعام اول تمغۂ ادارہ۔ مجید احمد فاروقی۔ کپ۔ مجید احمد اور معین الدین (مدرسہ وسطانیہ دار الشفاء)۔

انعام دوم۔ تمغۂ ادارہ سید یعقوب حسن قادری (مدرسہ فوقانیہ مفید الانام) انعام دوم، علی محمد حسین خسرو۔ ترغیبی انعامات ڈھل راؤ و شمس الدین

بچوں کے سب رس میں ۱۹۴۰ء کے بہترین اور سب سے زیادہ مضامین کے لئے تمغۂ ادارہ مسیح الدین خاں متین کو دیا گیا۔

اور لڑکیوں میں تمغۂ ادارہ حبیبہ حبیب الرحمٰن کو دیا گیا۔ تقسیم اسناد و انعامات کے بعد سر اکبر نے اُردو کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ادارۂ ادبیات کے کارناموں کا خراج تحسین ادا فرمایا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری معتمد امتحانات کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

روئداد اُردو امتحانات بابت ۱۹۴۰ء

از مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات و صدر شعبۂ اُردو امتحانات ادارۂ ادبیات اُردو

یہ رپورٹ جلسۂ عطائے اسناد منعقدہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۱ء مطابق ۶ اسفندار ۱۳۵۰ف میں پڑھی گئی۔

میرا سب سے پہلا اور خوش گوار فریضہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے شعبۂ امتحانات کی صدارت کے اہم فرائض میرے تفویض کرکے جو میری عزت افزائی کی اس کے لئے اظہار تشکر کروں۔ ہر چند سرکاری فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ یہ کام میرے لئے دشوار ہوتا مگر بانیان ادارہ کی پرخلوص جدوجہد اور غیر معمولی جذبۂ ایثار نے مجھ پر گہرا اثر کیا اور حتی الوسع ادارہ کی خدمت کرنے پر مجھے آمادہ کیا۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کا دور مسعود ہر جہتی ترقی کے لئے تاریخ دکن میں یادگار رہے گا۔ اس مبارک زمانے کو ہم علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں نئی روح کار فرما ہے۔

قیام جامعہ کے بعد ہی متعدد ادارے ملکی سود و بہبود کے لئے قائم ہوئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ادارۂ ادبیات اُردو بھی ہے جس کی بناء جامعہ کے مایۂ ناز سپوت جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے ۱۹۳۱ء میں ڈالی۔ اس کے قیام کا مبارک مقصد یہ ہے کہ "ماضی" نے جو امانت اُردو زبان کی خدمت سے متعلق حیدرآباد دکن کے سپرد کی ہے اس سے فائدہ اٹھاکر یہ "امانت" "مستقبل" کے سپرد کردی جائے۔ چنانچہ اس وقت ملک دکن نے اُردو ادب کی خدمت گزاری میں نمایاں جگہ حاصل کرلی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام ملک کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، جو ہمارے افکار و اعمال کی فطرتی ترقی کا صحت بخش ذریعہ ثابت ہوچکی ہے۔ اُردو کی ترقی میں ملک کے سپوتوں نے برق رفتاری پیدا کردی جس کا ایک ثبوت ادارۂ ادبیات اُردو کی "دس سالہ سرگزشت" سے ملتا ہے، جس کو آپ سب حضرات ملاحظہ فرماچکے ہوں گے۔

جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس اور ترقی میں عالی جناب رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری بالقابہم صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے جو نمایاں حصہ لیا اس سے ملک کا ہر فرد واقف ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو اسی جامعہ کی بدولت وجود میں آیا۔ یہ ادارہ کی خوش قسمتی ہے کہ ابتدار ہی سے اس کو عالی جناب رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی سرپرستی حاصل رہی، جو اس کی بقا اور ترقی کی ضامن ہے۔ ممدوح الشان نے ایک ہزار کا عطیہ اس کو عنایت فرمایا اور حال ہی میں ادارہ کا معائنہ فرماکر گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا اور آج باوجود گوناگوں مصروفیات کے اپنی علم دوستی کا یہ ثبوت دیا کہ اس محفل میں قدم رنجہ فرماکر ہماری عزت افزائی کی۔ اور اسناد و انعامات تقسیم کرنے کی زحمت گوارا کرکے ادارہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہم جناب والا کا بطور خاص خیر مقدم کرتے ہیں۔

عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام فینانس و تعلیمات جن کا ادبی اور علمی ذوق مسلمہ اور جن کو علمی اور تعلیمی خدمت کا جذبہ ورثہ میں ملا ہے صدر ادارہ کی حیثیت سے اس کے جملہ امور میں دلچسپی لیتے رہے اور ہمیشہ مفید اور نیک مشوروں سے ادارہ کی رہبری فرماتی

اس ادارہ کا ایک جز شعبۂ امتحانات ہے جو ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا۔ اس کا قیام اردو زبان اور ادب کی حفاظت بقا اور ترقی کے سلسلے میں ضروری سمجھا گیا۔ اس کے ذریعہ سے ذوق مطالعہ کو عام کیا جارہا ہے۔ اور ان اشخاص کے لئے جو کسی جامعہ یا

سرکاری ادارہ کی سند نہیں رکھتے یا دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں مگر اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اس شعبۂ امتحانات کا قیام عمل میں آیا۔ تاکہ وہ اپنے ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں۔ شعبہ مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت امتحانات لیتا ہے۔ اور کامیاب امیدواروں کو صداقت نامۂ اسناد اور انعامات دیتا ہے۔ اس شعبہ کا کام ایک مجلس کے تفویض ہے جو اُردو سے دلچسپی رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ اور اس کے ممتحنین میں مقامی ماہرین کے علاوہ ہندستانی جامعات کے پروفیسر اور مستند اصحاب شامل رہتے ہیں۔

ادارہ کی مجلس امتحانات کے ذمہ حسب ذیل امتحانات کا انتظام ہے۔

(۱) سند اُردو دانی (۲) اُردو عالم (۳) اُردو فاضل (۴) خوش نویسی (۵) خطاطی و کتابت

اس شعبہ کے اعلیٰ امتحانات میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین نرے ادبی نہ ہوں بلکہ شرکاء کے لئے عملی طور پر مفید اور ان کی زندگی میں کارآمد ثابت ہوں۔ اسی اصول کے مدنظر اُردو فاضل کے امتحان میں عام معلومات کا ایک پرچہ رکھا گیا ہے جس کا تفصیلی نصاب معاشیات، آئین حکومت، عمرانیات، فلسفہ اور سائنس وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اردو عالم کے امتحان میں بھی علمی قابلیت بڑھانے والے مضامین جو افادی نقطۂ نظر سے ضروری ہیں رکھے گئے ہیں۔ مثلاً خوش نویسی، خطاطی و کتابت، مختصر نویسی، ٹائپ، عام دفتری معلومات اور اناث کے لئے خاص طور پر امور خانہ داری۔ خوش نویسی اور خطاطی و کتابت کو نصاب میں اس لئے شریک کیا گیا ہے کہ یہ ایک شریفانہ فن ہے۔ قدیم زمانے میں بڑے بڑے لوگ اس کو اکل حلال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ چیز اب زوال پذیر ہے اور اس کو سنبھالنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ اُردو کتابوں کی دیدہ زیبی اور صحت و خوبی کا بہت کچھ انحصار اچھے خوش نویسوں اور کاتبوں پر ہے۔

اُردو دانی کے امتحان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کو جس چیز کی شدید ضرورت ہے وہ تعلیم بالغان کا مسئلہ ہے ادارہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنے مقررہ نصاب کی تعلیم کے لئے مختلف مقامات پر مدارس بالغان بھی قائم کرے چنانچہ ایک مدرسۂ بالغات اڈیکمیٹ میں قائم ہو چکا ہے۔ اور اب بیگم بازار، یاقوت پورہ، اور چادر گھاٹ میں مدارس شبینہ بالغوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اُردو دانی کے امتحان سے تعلیم بالغان کی اشاعت میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ چنانچہ گذشتہ امتحان میں ہر مذہب و ملت کے متعدد ملازم پیشہ مرد اور عورتیں شریک امتحان ہوئیں۔ ناظم صاحبان آبکاری و جنگلات مستحق شکریہ ہیں کہ اپنے سررشتہ کے ملازمین ادنیٰ کو شریک امتحان ہونے کی ترغیب گشتی کے ذریعہ دلائی۔ سررشتۂ تعلیمات کی سند امتحان بالغان ڈیڑھ سالہ کورس کی تکمیل پر منحصر ہے اور کسی مدرسہ میں امیدوار کی شرکت بھی ضروری ہے۔ مگر ادارہ کا امتحان ان قیود سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے مقابلتاً زیادہ مقبول ہے۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں دوسری اہم ضرورت مناسب اور موزوں کتب کی فراہمی اور تالیف ہے۔ اس کمی کی تلافی کے لئے ادارہ کی طرف سے مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کی نگرانی میں اُردو دانی کی پہلی اور دوسری کتابیں خاص طور پر تیار کرائی گئی ہیں، جو نہ صرف اس ریاست میں بلکہ بیرون ریاست بھی مقبول ہو رہی ہیں۔

اس کے علاوہ جن اشخاص نے سند اُردو دانی حاصل کر لی ہے اور پڑھنا، لکھنا سیکھ لیا ہے ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی مشق جاری رکھیں اور اپنی قابلیت بڑھائیں۔ ورنہ تھوڑی مدت میں پڑھا لکھا سب بھول کر برابر ہو جائے گا۔ اس مقصد کے تحت آسان اردو میں کتب کی تالیف ناگزیر ہے، جو بالغوں کے مذاق کی ہوں، ان کے مطالعہ کے ذوق کو بڑھائیں، اور ضروری معلومات بھی بہم پہنچائیں۔ اس غرض

کے لئے آسان کتب کی تیاری کا مسئلہ ادارہ کے زیر غور ہے، اور امید ہے کہ مستقبل قریب میں عملی صورت اختیار کرے گا۔ ادارہ نے اردو دانی کی کتابوں کے علاوہ دفتری معلومات اور تاریخ ادب اُردو کی کتابیں بھی امتحانات کے سلسلہ میں تیار کرائی ہیں ۔

تیاری امتحانات

امتحانات کی تیاری کے لئے شعبۂ امتحانات نے بہ مقام کواپریٹو ہال توپ کا سانچہ مختلف ماہر فن اصحاب سے بیس تقاریر کرائیں جن میں جناب سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، جناب عبدالمجید صدیقی صاحب جناب سید محمد صاحب، جناب عبدالقیوم صاحب باقیؔ، جناب عبدالقادر صاحب سروری، جناب صلاح الدین صاحب اور جناب جہاں بانو بیگم صاحبہ وغیرہ نے بطور خاص حصہ لیا۔

عورتوں کی تعلیم کا انتظام معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ کی دلچسپی کی وجہ سے شعبۂ نسوان کے مدرسہ تعلیم بالغات میں کیا گیا ہے جن کی نگرانی اس شعبہ کی صدر جناب رابعہ بیگم صاحبہ نے قبول فرمائی ہے۔ بلدہ کے خانگی امیدواروں نے مولوی سید محمد صاحب اور مولوی عبدالقادر سروری صاحب سے بہ پابندی استفادہ کیا نیز درسگاہ علوم شرقیہ یاقوت پورہ میں خانگی تعلیم کا انتظام تھا۔

مختلف اضلاع پر جلال الدین اشکؔ صاحب، مولوی محمود حسین صاحب اور راگھویندر راؤ صاحب جذبؔ نے امیدواروں کو تعلیم دی اور مولوی سید عارف الدین حسن صاحب، مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیداؔ، مولوی محمد فاروق صاحب ایچ سی ایس قاضی محمد حسین صاحب، عطاء اللہ صاحب، بسٹپا صاحب اور بلونت رائے صاحب گھاٹے نے امتحانات کی اشاعت وتنظیم میں بڑا حصہ لیا۔ اور امتحانات کے جملہ انتظامات ادارہ کے مستعد مہتمم خواجہ حمید الدین شاہدؔ کی ہمہ وقتی مصروفیت اور تن دہی کی وجہ سے بحسن وخوبی انجام پائے ۔

سال حال امتحانات کے مرکز خاص حیدرآباد میں ۲ اور اضلاع میں گلبرگہ، پربھنی، کلیانی اور کشتگی وغیرہ میں ۶ اس طرح کل آٹھ مرکز قائم کئے گئے تھے ۔

باوجودیکہ سال حال پہلی مرتبہ ادارہ کے امتحانات منعقد ہوئے مگر شرکاء کی تعداد بہت امید افزا رہی۔ اُردو دانی کے امتحان میں عورتیں بھی بکثرت شریک تھیں اور شرکاء کی جملہ تعداد ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) تھی ۔

اُردو عالم کے امتحان میں ۶۸ اور فاضل کے امتحان میں گیارہ امیدوار شریک تھے ۔ بہ حیثیت مجموعی جملہ امتحانات کے کامیاب طلبہ کا اوسط یہ رہا ۔

(۱) اُردو فاضل ۔ گیارہ حاضر، چھ کامیاب ۔ تین بدرجۂ دوم ۔ نتیجہ ۵۵ فی صد ۔

(۲) اُردو عالم ۔ اڑسٹھ حاضر ۔ چالیس کامیاب ۔ تین بدرجۂ اول ۔ نتیجہ ۶۵ فی صد ۔

(۳) خوش نویسی ۔ نو حاضر ۔ پانچ کامیاب ۔ ایک بدرجۂ اول ۔ نتیجہ ۵۵،۵ فی صد ۔

(۴) اُردو دانی ۔ ایک سو چونتیس حاضر ۔ ایک سو اٹھائیس کامیاب پندرہ بدرجۂ امتیاز نتیجہ چھیانوے فی صد ۔ چاروں امتحانات میں شرکاء کی مجموعی تعداد ۲۶۲ تھی جن میں سے (۴۰) عورتیں تھیں ۔

انعام خوشی کی بات ہے کہ ادارہ کے کرم فرما اور ہمدرد حضرات نے کامیاب امیدواروں کے لئے انعامات کا سلسلہ قائم کردیا ہے چنانچہ کشتگی کے مرکز سے اُردو عالم، خوش نویسی اور اُردو دانی کے امتحانوں میں اول آنے والے شرکا کو جناب احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری لنگسگور۔ جناب محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری ہنم ساگر اور جناب رستم جی صاحب متاجر نے نیز ادارہ کے مدرسہ تعلیم بالغان سے اول آنے والی امیدوارہ کو جناب سکینہ بیگم صاحبہ نے انعام دینے کے لئے رقمی عطیے روانہ کئے۔ موصوفہ نے اردو فاضل میں اول آنے والی خاتون کو ہر سال " طیبہ بیگم بلگرامی طلائی مڈل" دینے کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔ نواب سر عقیل جنگ بہادر نے خود یا عماد الملک ٹرسٹ سے سال بہ سال اردو فاضل کے امتحان میں اول آنے والے امیدوار کو " عماد الملک مڈل" دئے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ مختلف مرکزوں سے امتحانات کے سلسلے میں تعلیم کے انتظام کے لئے بھی اصرار کیا جا رہا ہے۔ گو پہلے سال ادارے نے نصابی مضامین کی تعلیم اپنے ذمہ نہ لی تھی۔ تاہم انتظام کرنا پڑا۔ اب اس سے زیادہ تنظیم اور باضابطہ پڑھائی کے لئے مختلف ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہوئی چنانچہ یہ کام اور تعلیم بالغان کی نگرانی جناب سید محمد صاحب کے تفویض کی گئی۔

گلبرگہ، کشتگی اور کلیانی کے اطراف واکناف طاعون پھیل جانے کی وجہ سے وہاں کے کامیاب امیدوار سند لینے کے لئے کثیر تعداد میں آج حاضر نہ ہو سکے۔ ان کے نمائندوں کو اسناد دے دی جائیں گی۔ جو ہر مرکز میں ایک جلسہ منعقد کرکے تقسیم کی جائیں گی۔

ادارے کے دوسرے شعبوں کی طرح شعبۂ امتحانات کی کامیابی کا سہرا ادارے کے معتمد اور روح رواں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کے سر ہے۔ ادارے کے قیام اور ترقی میں آپ کی جدوجہد قابل قدر ہے۔ جناب موصوف جس طرح اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اس پر اہل ملک بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ شعبۂ امتحانات کے کام میں کمیٹی کے نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب اور معتمد جناب عبدالقادر صاحب سروری اور دیگر اراکین خصوصاً جناب عبدالمجید صاحب صدیقی جناب سید محمد صاحب اور جناب ظہیر الدین احمد صاحب نے جو قیمتی امداد فرمائی ہے اس کے لئے وہ مستحق شکریہ ہیں۔

رازِ طرب

فریبِ رنگ ہے، رنگینئ نشاطِ خیال
مری نگاہ ہے خود باعثِ فروغِ جمال

مرے ہی قلب حزیں کے لطیف نغمے ہیں
نہیں ہے موجِ نوائے سروش کا یہ کمال

نشاط و عیش کا کیا راز ہے سمجھتا ہوں
فریبِ حسنِ طرب ہے عیاں بہ روئے ملال

محمد مظفر الدین ظفر (عثمانیہ)

مزدور کا گیت

آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
آرزوئے کرم نہ کر تو گلۂ ستم نہ کر
خواہش بیش و کم نہ کر شکوۂ رنج و غم نہ کر
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
جھیل لے دکھ ہنسی خوشی شہد سمجھ کے زہر پی
جی تو برائے نام جی ہے یہی تیری زندگی
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
جب تک اٹھائے شہید غم آنکھوں میں کھیلتا ہے دم
لاکھ کرے کوئی ستم حوصلہ ہو تیرا نہ کم
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا
بھوک ہو چاہے پیاس ہو لاکھ شکستہ آس ہو
جینے سے چاہے یاس ہو لب مگر سپاس ہو
آنکھوں سے خوں بہائے جا ساز نفس پہ گائے جا

راز قاسمی

شرابی

محفل سے اٹھا جھوم کے لہرا کے شرابی پیمانہ و خم پھینک کے ٹھکرا کے گلابی
ساقی کے تبسم کو بھی اک ناز سے دیکھا مطرب کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا
مدہوش تنک ظرفوں پہ ہنستا ہوا نکلا آتے ہوئے میخواروں میں دھنستا ہوا نکلا
کچھ دور خرابات پہ پھر مڑ کے نظر کی تنقید ہر اک بات پہ عادت ہے بشر کی
کہنے لگا مانا کہ ہوں صہبا کے اثر میں پر اور تجلی ہے مرے قلب و جگر میں
جذبات مقدس ہیں تخیل میں ہے پرواز ادراک منور ہے تصور ہے خدا ساز
رنگینیٔ آفاق ہے نظروں میں مری ہیچ بھاتا نہیں دل کو مرے زلفوں کا خم و پیچ
احساس مری روح میں قدسی منشی کا تقویٰ نہیں جچتا ہے نگاہوں میں کسی کا
اس وقت جو حاصل ہے مجھے قرب الٰہی یہ چیز کبھی میں نے عبادت میں نہ پائی

محمد عبدالحی خاں شارق

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۴ بابت مارچ سنہ ۱۹۴۱ع شمارہ ۳

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارہ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی - وو چریا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شایع ہوا

بھاگ متی یا حیدر محل

بھاگ متی کو دکن اور خاص کر حیدر آباد کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ حیدر آباد جیسا فرخندہ بنیاد شہر اسی کی عشق و محبت کی دائمی یادگار ہے۔ بھاگ متی کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی عشق عاشقی کا تذکرہ سب سے پہلے خود اسی کی زندگی میں تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، منشآت فیضی اور قطب مشتری وغیرہ کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ قطب مشتری کے مصنف ملا وجہی نے تو اس واقعہ کے متعلق استعارہ کے پیرایے میں تفصیلی حالات بیان کردے ہیں۔ طبقات اکبری (سنہ ۱۰۰۲ھ) میں لکھا ہے :۔

"برپاترے بھاگ متی نام عاشق شدہ شہرے بنا کردہ بھاگ نگر موسوم ساخت و یک ہزار سوار نوکر آں فاحشہ ساخت کہ دایم ملازم رکاب او بودند تا غایت سنہ اثنی والف ہجری نہہ سالست کہ حکومت می کند" صفحہ ۴۴۴ مطبوعہ منشی نولکشور

جب فیضی کو شہنشاہ اکبر نے دکن کی مہم کے لئے روانہ کیا تو اس نے اپنی ایک عرضداشت میں دکن کی خودمختار اسلامی سلطنتوں کا حال بادشاہ کی اطلاع کے لئے لکھ بھیجا تھا جس میں محمد قلی قطب شاہ سے متعلق لکھتا ہے :۔

"تشیع دارد و معمورہ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ قدیمۂ اوست"

یہ عرضداشت منشآت فیضی میں درج ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ مورخ فرشتہ نے لکھا ہے :۔

"و آں قطب فلک اجلال در اوائل پادشاہی بر فاحشہ بھاگ متی عاشق شدہ ہزار سوار ملازم او گردانیدہ تا بطریق امرائے کبار بہ دربار آمد و شد می نمودہ باشند۔ و در آں ایام چوں از زبونی آب و ہوائے گولکنڈہ خلایق متنفر و پُر اندوہ بودند قطب شاہ در چہار کروہے بلدہ مذکور شہرے ...... ساختہ موسوم بہ بھاگ نگر گردانید" (صفحہ ۱۷۴)

محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد گولکنڈہ میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں بھاگ متی کا حال درج نہیں ہے۔ البتہ بعد کی تاریخوں مثلاً حدیقۃ العالم، تاریخ قطب شاہی (قادر خاں) اور گلزار آصفی میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ موخر الذکر تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کے بیان میں لکھا ہے :۔

"پل دریائے موسیٰ بسبب تعشق شہزادہ مرزا محمد قلی کہ بر حسن جانفزائے بھاگ متی طوائف میلے کلی داشت تیار گردید۔ حقیقت آں ایں کہ شہزادۂ مذکور بر طبق عادت معہود کہ مواصلت خفیہ لذت بسیار میدہد ہموارہ بوقت شب از قلعہ محمد نگر بخانۂ طوائف مذکورہ در موضع چچلم کہ آبادی بلدہ حیدر آباد بر زمین ہمون موضع واقع است آمد و شد می داشت۔ روزے موسم باراں موافق معمولِ خود بوقت شب قصد نمودہ چوں بر سر دریائے موسیٰ رسید دید کہ طغیانی آب از حد زیادہ است کہ فیل نہ دستی کوہ پیکر نمی تواند قدم اندرونش گذارد فوراً در جذبۂ عشق و محبت اسپ سواری خود را بے اندیشہ در تلاطم تموج آب انداخت و بہ زور حفظ حقیقی بسلامت برآمد" (صفحات ۱۴ و ۱۵)

یہ واقعہ حیدر آباد میں زبان زد خاص و عام ہے اور راقم الحروف نے اس تاریخی واقعہ کو افسانے کی شکل میں پیش کر کے "چچلم کی رقاصہ" کے عنوان کے تحت اپنی کتاب سیر گولکنڈہ میں شامل کیا ہے۔

گلزار آصفی سے تقریباً پچاس سال قبل حیدر آباد میں ایک اور تاریخ حدیقۃ العالم لکھی گئی تھی اس میں بھی بھاگ متی کا ذکر موجود ہے کہ :۔

"بادشاہ در آں ایام بزنانہ بھاگ متی نام تعلق خاطر داشت

چنانچہ ہزار سوار ملازم او گردانید تا ہمچو امرائے کبار بدربار آمد و شد می نمودہ باشد۔ لہٰذا تخت آں (شہر حیدرآباد) را بہ بھاگ نگر موسوم ساخت و مستقر سریر سلطنت خود گردانید" (صفحہ ۲۱۵)

بہرحال موجودہ معلومات کی بناء پر اتنا یقین سے کہا جاتا ہے کہ محمد قلی عنفوان شباب ہی میں (یعنی ۱۴ سال کی عمر میں) بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اس کی خاطر طغیانی رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا جب اس خطرناک جرات کی خبر اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ابراہیم کا انتقال ہوگیا اور محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی محبوبہ کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کی خاطر ہزار سوار اس کے یہاں متعین کر دیئے جو ہر وقت اس کے جلوس میں رہتے اور وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ موضع چچلم سے گولکنڈہ آیا کرتی تھی اور خود محمد قلی بھی اس کے یہاں جایا کرتا۔ اسی اثناء میں اس نے اپنی محبوبہ کے گاؤں کو ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل کرنے کی ٹھانی اور جب یہ شہر بن گیا تو اسی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔

حیدرآباد میں خود دولت خانۂ عالی اور دیگر محلات کے بن جانے کے ساتھ ہی محمد قلی نے بھاگ متی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا اور شادی کے بعد مشتری اور بعد کو حیدر محل کا خطاب دیا۔ اور اس کے لئے ایک خاص محل بھی بنوا دیا جس کا نام حیدر محل یا حیدر منڈ وہ رکھا گیا۔ پھر اس خطاب کی مناسبت سے بھاگ نگر کا نام بھی حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔ بعض مورخین کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ محمد قلی نے بھاگ متی کے انتقال کے بعد پشیمان ہو کر شہر کا نام بدل دیا کیونکہ اس نے خود اپنی نظموں میں اپنی محبوبہ حیدر محل کا ذکر کیا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ خطاب بھاگ متی ہی کو دیا جا سکتا تھا جو آخر وقت تک جملہ مورخین کے قول کے مطابق اس کی چہیتی محبوبہ تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ حیدر محل کا خطاب دینے کے بعد محمد قلی نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ بھاگ متی اور بھاگ نگر کا نام لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے اور حیدر محل اور حیدرآباد رائج ہو جائیں۔ چنانچہ جب وجہی نے بھاگ متی سے عشق عاشقی کا قصہ لکھا تو اس میں بھی اس نام کو چھپائے رکھا اور خود محمد قلی نے بھی اپنے کلیات میں اس نام کی بجائے جگہ جگہ حیدر محل کا نام لکھا ہے۔ ورنہ لازمی تھا کہ جب وجہی مشتری کے سامنے محمد قلی کی معشوقاؤں کا تذکرہ کرتا ہے تو بھاگ متی کا بھی ضرور ذکر کرتا لیکن اس نے تو خود بھاگ متی ہی کو مشتری کے نام سے ظاہر کیا ہے۔ اور اس مشتری یا بھاگ متی کے متعلق محمد قلی نے اپنے کلیات میں دو نظمیں اور مختلف جگہوں پر اشعار لکھے ہیں۔

یہ نظمیں کلیات کے صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۴ پر درج ہیں۔ ایک نظم میں وہ مشتری کو اپنی آنکھ کی پتلی کہتا ہے اور اس کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ:۔

"سب کو تیرے جوبن سے عشق ہے۔ تیرے ہونٹ کوثر کا پیالہ پلاتے ہیں، ان پر محبت کا نشان ہے اور ان کے چومنے سے نبات شرما جاتی ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار عورتوں میں تو ہوشیار ہے اسی لئے میں تجھے منا کر اپنے دل میں بٹھاتا ہوں وغیرہ۔"

ایک دوسری نظم میں وہ کہتا ہے:۔

اے قطب شاہ تو اپنے معشوقوں کی سلامتی کے لئے دعا کر کیونکہ اس کے جینے سے تمام دنیا پر تیری فرمانروائی ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو۔ اور ہمارا دل ہمارا معشوق ہے جس میں عشق کی مستی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے دل میں عرصے سے جگہ پائے ہوئے ہے، جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشنما اور روشن ہے۔ زحل نے بہت سے دشمنوں کے طالعوں کو

میٹ دیا ہے اور مشتری کے طالع کی وجہ سے ہمارے
طالع کو بقا حاصل ہے۔ اس لئے اے خدا قطب شاہ کے
اس تارے کو اپنی عنایت سے سرفراز رکھ"

ان نظموں کے علاوہ محمد قلی نے مختلف جگہوں پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے کہ:۔

اے قطب شاہ تو شادی و خوشی کر کہ تیرا رشتہ اس کے رشتہ
سے بندھا ہوا ہے اور مشتری تیرے لئے باعث برکت
ثابت ہو رہی ہے۔

تو ثانی سلیمان ہے اور فتح و فیروزی تیرے ہی لئے ہے
اور تو نے اپنا منظورِ نظر بنا کر مشتری کو بھی شرف یاب کر دیا۔

اس کے شعر ہیں ؎

رشتہ ترا اس رشتہ سوں ہے بند معانی
شادی و خوشی کر کہ اہے مشتری تج راس
توں سلیماں ثانی و تج برج فیروزی و فتح
مشتری پایا شرف تیری نظر منظور تھے

بعض شعروں میں وہ مشتری کو اپنی بزم میں رقص کناں
ظاہر کرتا ہے جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بھاگ متی ہی کا پہلا
خطاب تھا:۔

ع کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت ع زہرہ و مشتری سوں پاتر نچھاؤ

ندما روما و لی موتیاں کی آرتی بھر کر
سو زہرہ مشتری کے ہت پیلا ڈ لائے آج

اسی طرح حیدر محل یا حیدر پیاری کے متعلق بھی اس کے
کلیات میں تین نظمیں اور مختلف اشعار دستیاب ہوتے ہیں۔
جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر محل فن موسیقی کی ماہر تھی اور محمد قلی
کی خاص معشوقہ۔ وہ ایک نظم میں کہتا ہے کہ:۔

حیدر محل محبت سے نبات گھولتی اور روز بروز
عیش و عشرت کے ساتھ عشق کے طبل بجاتی ہے۔
اس کے سرو جیسے قد پر نورتن کا جلوہ نظر آتا ہے
اور سب معشوقائیں اس کو دیکھ کر شرماتی ہیں۔ وہ اپنی
پیشانی پر عشق کا ٹیکا (قشقہ) لگاتی ہے اور چاروں
طرف نورتن کے تار بجتے ہیں وہ عشق کی چادر اوڑھ کر
بیر بہوٹی کی طرح سرخ نظر آتی ہے۔ اے قطب شاہ
تو شکر کر کہ حیدر کی غلامی کی وجہ سے تجھ کو یہ مہ جبین
ملی جس کی وجہ سے تیرے سر پر تاج سجتا ہے (دیکھو صفحہ ۲۵۷)

ایک دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

نبیؐ کے صدقے میں حیدر پیاری ملی ہے جس نے اپنے
مختلف انداز سے میرے دل کو اپنے دل سے باندھ
لیا ہے۔ وہ عشق کے پر اسرار راگ گاتی ہے، اس
کے بال میں کنول کی تازگی اور آفتاب کی چمک ہے
وہ اپنی بھوؤں میں کاجل لگاتی ہے جسم میں نارنجی
رنگ کی تنگ چولی پہنتی ہے۔ اور آنکھوں کے
خط سرمہ کے ذریعے سے میرے دل پر حملہ کرتی ہے۔ (دیکھو صفحہ ۲۵۸)

ایک دوسری نظم میں جو نامکمل دستیاب ہوئی ہے لکھا ہے کہ:۔

حیدر محل محبت و عشق کا جلوہ گائے اور بزدانی نغمہ
بجائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جلوے کے لئے
کنگن پہن رکھا ہے، وہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو
تتلیوں کی طرح نچائے وغیرہ (دیکھو صفحہ ۲۵۸)

محمد قلی نے اس حیدر محل یا حیدر پیاری کے لئے ایک
محل بھی بنا دیا تھا جس کا نام حیدر محل یا حیدر منڈوہ رکھا تھا
اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ اس نظم میں لکھتا ہے:۔

حیدر محل میں حیدر پیاری کا جلوہ گاؤ اور اس
خوشی میں زمین و آسمان اور عرش بر فتح و نصرت کے

طبل بجاؤ۔ اے ساقی سیم ساق میری بزم میں صراحی لے آ۔ اور پیالے کی روشنی میں مجھے اپنے سائیں کی صورت دکھا۔ (یہ قاعدہ ہے کہ جلوہ کے وقت آئینہ میں دولھا کو دلہن کی صورت دکھاتے ہیں) اور سورج کے طبق سے لے کر نقل و شراب اپنے رخساروں میں رکھ لو اور پیاری کی محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔ اس نیک ساعت میں سینوں پر پستانیں زیب دیتی ہیں۔ دودھ اور مصری سے آبحیات کے ان گھڑوں کو بھر دو۔

اس جلوے کے وقت بادشاہ اتنا اچھا نظر آتا ہے کہ پدمنیاں اور چترنیاں سب شاہ کے روپ کی دیوانی ہو گئی ہیں۔ اے سکھیو ان کے ہاتھ سے قول کا بیڑا اٹھا کر شہ کو کھلاؤ۔ نبیؐ کے صدقے میں آج قطب شاہ کو جلوے میں بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔ اس لئے حوروں اور پریوں کو چاہیے کہ شہ پر سے خود کو واریں۔" (صفحہ ۲۱۷)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم حیدر محل کے ساتھ شادی کرنے کی تقریب میں لکھی گئی ہے۔ اور بھاگ متی کو نکاح کے وقت ہی حیدر محل کا خطاب دیا گیا تھا۔ اور بعد کو اسی کے خطاب کے لحاظ سے بھاگ نگر کا نام حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔

بھاگ متی نے محمد قلی کی زندگی میں ۱۰۲۰ھ سے قبل چالیس بیالیس سال ہی کی عمر میں وفات پائی۔ کیونکہ تاریخ فرشتہ اور قطب مشتری دونوں کی تصنیف کے وقت اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے زمانۂ وفات کا یہ اندازہ اس وجہ سے صحیح نکلتا ہے کہ بعض مورخوں نے شہر کے نام کی تبدیلی کو بھاگ متی کی وفات سے لازم و ملزوم قرار دے کر بتایا ہے کہ تعمیر کے سترہ سال بعد اس کا نام حیدرآباد رکھا گیا۔[1] گویا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۰۱۶ھ کے لگ بھگ گولکنڈہ کی یہ مشہور مہ جبین اپنے عاشق جانباز کو داغ مفارقت دے گئی۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی مولفہ قادر خاں بیدری ۱۲۴۹ھ میں لکھا ہے:۔
"بعد ہفدہ سال بہ حیدرآباد موسوم گردید" (صفحہ ۱۶)

آخر میں نمونے کے طور پر خود محمد قلی کی ایک نظم کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ ساڑھے تین سو سال قبل کی اُردو ہے:

حیدر محل میا تے نابات گھول سا جے — دن دن انند سیتے طبلاں مدن کے باجے
(محبت سے نبات) (سے عشق بجاتی ہے)

اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا — عشق کے پاتراں سب اس کا س دیکھ لاجے
(اس کے) (شرماتے ہیں)

سب عاشقاں کے دل میں ہی عشق پھول جلوہ — پتلیاں نین کیاں میرمن میں انند سوں کا جے
(پھول کا) (آنکھ کی)

چادر عشق کا اوڑھے ہے جوں بیر بہوٹی دیسے — تیرے عشق کے لاجاں دیکھے ہیں لاجوں بھاجے
(نظر آتے)

صدقے نبی شکر کر تج کوں ملی اے پاتر — حیدر غلامی سیتے تجہ سیس تاج ساجے
(یہ) (کی سے تیرے سر پہ سجتا ہے)

سید محی الدین قادری زور

سماج

دھرا ہوا ہے جہالت کے سر پہ تاج ابھی　　نہیں "عروس" کی آزادیوں کا راج ابھی
دلوں کے بھید سے واقف نہیں سماج ابھی　　ہر آرزو کو کچل دو یہ ہے رواج ابھی
جو پائے حسنِ اطاعت پہ حسرتیں بیچ دو
تو والدین کی مرضی پہ زندگی بیچ دو

مراد یہ نہیں مغرب کے کان کاٹے ہند　　خلیج عفت و عصمت گنہ سے پاٹے ہند
فضائے عیش و طرب میں بھرے سپاٹے ہند　　بتانِ نفس پرستی کے پاؤں چاٹے ہند
مگر ضرور ہے شادی کو اذن کا سہرا
نہ یہ کہ "رُعبِ ادب" کا دکھا دیا پہرا

جنھیں مراسمِ فرسودہ ناپسند نہیں　　مُقلّدینِ قدامت ہیں ہوشمند نہیں
نہیں کسی کی تباہی سے کچھ گزند نہیں　　غرض کہ بزمِ محبت میں سربلند نہیں
رواں زبانوں پہ اپنی پسند کی "لے" ہے
یہ جانتے نہیں "میلانِ طبع" کیا شے ہے

ہوا ہوں آج میں گستاخ اس کی شادی سے　　بدل گئی جو مرادوں کو نامرادی سے
چُرا رہا ہوں نگاہیں خوش اعتمادی سے　　ٹپک رہا ہے مری "نظمِ بے ارادی" سے
سماج نقد و نظر کے لئے سنبھل جائے
سناؤں گا وہ حقیقت کہ جی دہل جائے

وہ جس نے مجھ سے کیا تھا نباہ کا وعدہ　　عنایت و کرم بے پناہ کا وعدہ
رخِ صبیح پہ زلفِ سیاہ کا وعدہ　　حکایتِ غمِ دوری پہ آہ کا وعدہ
تبسمِ لبِ رنگیں میں عہدِ دلجوئی
نگاہِ مست میں قول و قسم کی یکسوئی

جو مجھ کو مقصدِ ہستی قیاس کرتی تھی　　جو دردِ سوز دروں التماس کرتی تھی
جو مجھ سے چشمِ مروت کی آس کرتی تھی　　جو میرے جذبۂ صادق کا پاس کرتی تھی

وہ ہر ادائے محبت اساس پر مائل
ہیں دل سے ہدیۂ ہوش و حواس پر مائل
وہ ہم کے ساتھ رہے کمسنی کے کھیلوں میں　　گلاب توڑ لئے۔ جا چھپے ہیں بیلوں میں
سفر میں جھول گئے۔ کھڑکیوں پہ ریلوں میں　　کمر میں ہاتھ دئے پھر رہے ہیں میلوں میں
یہی کہ جن پہ ہوئی جہل کی بلا غالب
سمجھ رہے تھے ہمیں ایک جان دو قالب
تُلے ہماری تباہی پہ یہ ظلوم د جہول!　　خطا معاف! نہیں ٹھیک جن کی عقل کی چول
تراش رکھے ہیں اِن سب نے وہ اصولِ فضول　　نہ جن میں حسنِ تدبر، عمق نہ عرض نہ طول
بزرگ ہیں انھیں خامی پہ ٹوکنا کیسا
بڑے ہیں اِن کو ارادوں سے روکنا کیسا
"رسومِ شرق" نے مجبور کر دیا ہم کو　　جنونِ عشق ہیں مشہور کر دیا ہم کو
یگانگت سے بہت دور کر دیا ہم کو　　غمِ فراق سے معمور کر دیا ہم کو
نشاطِ جلوۂ دیدار و باز دید بھی بند
پیام و سلسلہ جنبائی "رسید" بھی بند
لکھا یہ اس نے کہ اب زہر کھا رہی ہوں میں　　غمِ آل سے پیچھا چھڑا رہی ہوں میں
غلط رویّہ شادی مٹا رہی ہوں میں　　تم آؤ جلد کہ دنیا سے جا رہی ہوں میں
سمجھائے جا کہ جو میں نے اُسے نشیب و فراز
گلے میں ڈال کہ باہیں کہا "قبولِ نیاز"
سماج ہم پہ تو یہ ظلم کر چکی لیکن　　وہ آگیا ہے زمانہ قریب ہیں وہ دن
جہاد کے لئے اٹھیں گے نوجواں ہم سن　　بہے گی چار طرف سیلِ جذبۂ باطن!
نہ ہو سکے گا کہیں "اختیارِ نفس" پہ جبر
کرے گا اپنی تباہی پہ "اِذنِ بے جا" صبر

شاد عارفی

گونگی لڑکی

شہر میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بھی تھیں محل بھی تھے، کوٹھیاں بھی تھیں۔ اوسط قسم کے چھوٹے بڑے نئی پرانی وضع کے کچے اور پکے مکانات بھی تھے۔ ٹوٹی پھوٹی بے کواڑ کی کوٹھریاں بھی تھیں اور گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بھی، لیکن ایک غریب گونگی لڑکی کے لئے نہ محلوں میں جگہ تھی نہ مکانوں میں نہ جھونپڑیوں میں۔

قیمتی نفیس سامان سے آراستہ باعظمت ایوانوں اور دلکشا باغوں کی لطیف فضا میں سانس لینے والوں کے پاس دولت تھی، پیسہ تھا لیکن نظر نہ تھی اور احساس نہ تھا کہ وہ اپنی امیرانہ دلچسپیوں اور قیمتی مسرتوں کی بھول بھلیاں سے تھوڑی دیر کے لئے بھی باہر آکر اپنے گردوپیش کی کثیف فضا کو دیکھ سکتے، مفلس سسکتی ہوئی روحوں کی تکلیف اور درد کو محسوس کر سکتے اور اپنی خود غرضیوں کو جان سکتے۔ متوسط طبقے کے پاس نظر تھی کچھ احساس بھی تھا اور کچھ پیسہ بھی لیکن وہ تو اپنی ہی خواہشوں اور آرزوؤں کے گورکھ دھندے میں الجھے ہوئے تھے۔ اور انھیں اپنی اصلی حیثیت اور شخصیت پر مصنوعی خوش نما پردے ڈالنے، دولتمندوں کی ریس کرنے، ذاتی مسرتوں کے حصول کے لئے وسیلے تلاش کرنے، اپنی دلچسپیوں کے لئے نئی نئی تجاویز اور پروگرام بنانے سے کب فرصت تھی کہ وہ اپنے مبہم احساس ہمدردی اور جذبۂ انسان دوستی کو زیادہ وسیع بنا سکتے اور اپنی ذہنی مسرتوں سے علٰحدہ ہو کر دوسروں کے لئے بھی کچھ سوچ سکتے اور اس پر عمل کر سکتے۔

جھونپڑیوں اور شکستہ مکانوں میں جینے والوں کے پاس نظر تھی احساس تھا، دل تھا، دل میں درد تھا۔ وہ زندگی کے طوفان میں روندی ہوئی زندہ نعشوں کو دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آہ و بکا کو سن سکتے تھے۔ ان کے درد کو اپنے درد کی طرح محسوس کر سکتے تھے۔ بھوک کی جان لیوا تکلیف کو جانتے تھے، سمجھتے تھے۔ مگر ان کے پاس پیسہ کہاں تھا کہ وہ بھوکی روحوں کو آسودہ کر سکتے اور انھیں زندگی کے طوفان سے بچا لیتے۔

وہ خدا اور خدا کے دولتمند بندوں کی نظروں سے گری ہوئی اکیلی، بے گھر، بے سہارا بھوکی، پیاسی، خستہ تن ہستیوں کو گلیوں اور سڑکوں پر درد اور تکلیف سے کراہتے اور گھسٹتے ہوئے دیکھتے تو ان کا دل دکھتا وہ ان کی بے کسی پر دل ہی دل میں آنسو بہاتے مگر وہ ان کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ وہ تو خود ہی دولت کی چکی میں پس رہے تھے ان میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ ان کے لئے بھی روٹی فراہم کرتے اور ان کی تنہائی کی بے کسی کو دور کر سکتے۔

تاہم غریب گونگی لڑکی بالکل تنہا اور بے یار و مددگار بھی نہ تھی اگر خدا کی برتر مخلوق، انسان کی ہمدردیاں اور محبتیں اس کے لئے نہ تھیں تو نہ سہی۔ ابھی اس سرزمین پر ایسی مخلوق باقی تھی جو انسان اور خدا دونوں کی نظروں میں ذلیل و خوار سہی مگر ہمدردی اور محبت کے جذبہ سے بیگانہ نہ تھی۔

چند بے ہنگم، بدصورت، لال، پیلے گلیوں میں پھرنے والے کتے اس کے دوست اور مددگار تھے۔

غریب لڑکی کے پاس زبان نہ تھی اور اس کے ساتھی بھی بے زبان تھے وہ آپس میں ایک دوسرے سے باتیں

نہ کرسکتے تھے - مگر ان کی نگاہیں زبان تھیں وہ ایک دوسرے کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے -

جب گونگی لڑکی بھوکی ہوتی تو اس کے دوست دروازوں پر جھٹکے ہوئے دسترخوانوں کے سوکھے روٹی کے ٹکڑے چن کر اس کے کھانے کے لئے لاتے اور موقعہ پاتے تو دوکانوں اور ہوٹلوں سے تازہ روٹی اور کیک بھی چرا لاتے اور جب رات تھوڑی دیر کے لئے " انسانی درندوں " کو اپنے پرسکون گہوارے میں جھلا جھلا کر غافل کر دیتی اور گونگی لڑکی بھی دن بھر کی آوارہ گردی سے تھک کر کسی دوکان کے سامنے یا پل کے کنارے سخت پتھروں پر نیم برہنہ جسم کو صرف اپنے لانبے گھنے بالوں سے ڈھک کر سو رہتی تو اس کے وفادار ساتھی اس کی حفاظت کرتے اور اُسے ہر خطرے سے محفوظ رکھتے -

---

راہرو ایک انسانی شکل کو چند ذلیل جانوروں کی ہمراہی میں سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا دیکھتے تو ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتیں - بھویں سکڑ جاتیں اور وہ حقارت کے ساتھ اپنی نظریں دوسری طرف پھیر کر تیزی سے آگے بڑھ جاتے - دولت کی فراوانی میں پلے ہوئے بے فکر نوجوان شام کی تفریح کے لئے اپنے دوستوں کی ہمراہی میں قہقہے لگاتے، بیکار اور فضول گفتگو کرتے، قیمتی کپڑوں اور سوٹ بوٹ میں ملفوف، بار بار شیروانی کی سلوٹیں برابر کرتے - ٹائی کو ٹھیک کرتے آپ اپنی رفتار کی نزاکت پر اتراتے نگاہوں میں غرور و تمکنت کی جھلکیاں لئے ہوئے باہر نکلتے - اور گونگی لڑکی کو کتوں کے ساتھ دوکانوں کے سامنے کی گری پڑی چیزیں کھاتے دیکھتے تو ایک لمحے کے لئے ان کے شگفتہ قہقہے تھم جاتے - اور وہ اپنے جسموں کو انتہائی بیزاری اور نفرت کے انداز میں سکیڑ کر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ جاتے گویا وہ ڈرتے تھے کہیں یہ نجاست انھیں نہ چھو جائے - لیکن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے دل کی نہیں متحرک نہ ہوتیں اور وہ بھول کر بھی کبھی یہ نہ سوچتے تھے کہ زندگی کے اس کریہہ منظر کی ذمہ دار بڑی حد تک خود اُن کی ہستیاں ہیں اور انہی کی مالکانہ اور امیرانہ خود غرضیوں، عیش پسندیوں، بے فکری اور بے حسی نے ان کے ساتھی مخلوق کو حیوانوں اور جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے -

فینسی، خوش نما ساڑیوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں خوش رنگ موٹروں میں اپنے ناز پرور دہ جسموں کو ریشمی گدیلوں کا سہارا دئے سڑک پر سے گزرتیں اور اتفاقاً کبھی اُن کی نظر گونگی لڑکی پر پڑ جاتی اور وہ اس کے بالوں کو دیکھتیں تو ایک بے اختیار جذبۂ تحسین سے بے چین ہو جاتیں لیکن یہ جذبہ دوسرے ہی لمحہ رشک و حسد میں تبدیل ہو جاتا وہ سوچتیں بھلا ایک گلیوں اور سڑکوں پر ماری ماری پھرنے والی فقیر لڑکی کو اتنے لانبے اور خوبصورت بالوں کی کیا ضرورت اور وہ قدرت کی اس بے وجہ فیاضی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتیں اور اللہ میاں کی اس بے انصافی پر اس طرح برہم ہوتیں گویا دولت اور ثروت کی مالک بن کر وہ خدا کو بھی اپنی ملک جانتی اور سمجھتی تھیں خدا صرف امیروں کے لئے ہے غریبوں سے اُسے کیا سروکار اور وہ کیوں اس کی عنایت اور مہربانی کے مستحق قرار پائیں - اور شاید ان کی زندگی میں کبھی کوئی لمحہ ایسا نہ آتا جب کہ وہ اپنے اس خود غرضانہ احساس پر متاسف ہوں - انھیں اپنی قیمتی

مصروفیتوں سے کبھی اس کی فرصت ہی نہ ملتی تھی ۔

سورج کی روشنیاں چاند کی ضیاؤں میں اور چاند کی ضیائیں سورج کی روشنیوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ دن گزرتے رہے۔ شہر کے شکستہ پرانے مکانات ٹوٹتے پھوٹتے اور نئی عمارتیں بنتی رہیں۔ دوکانوں پر نیا نیا مال آتا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتا رہا۔ سر برآوردہ عہدہ داروں کی تنخواہوں میں ہر سال اضافہ اور مزدور پیشہ لوگوں کی روزی میں دن بدن کمی ہوتی رہی غرض زندگی اور موت کا کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل بدستور کھیلا جاتا رہا گونگی لڑکی کے ساتھیوں میں کچھ کمی ہوئی کچھ اضافہ لیکن اس کی زندگی کے ساکن دریا میں کوئی نمایاں تلاطم پیدا نہ ہوا۔ وہ یوں ہی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتی اور گری پڑی چیزیں کھا کر زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی لیکن اسے دیکھنے والے اب اس سے اتنے بیگانہ نہ رہے تھے۔ اکثر راہروؤں کی نظریں اب اس پر پڑتیں تو تھوڑی دیر کے لئے ضرور اس کے چہرے پر ٹھیر جاتیں بلکہ اکثر آوارہ گرد، شوقین مزاج نوجوان راہ چلتے چلتے اسے دیکھ کر رک جاتے اور جلدی سے اپنی بے داغ صاف اور ملائم انگلیوں میں کوئی چمکدار سکہ پکڑ کر شوق کے ساتھ اس کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے نہیں کہ اس کی ناداری اور مغلوک الحالی پر ان کا دل دکھتا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہمدردی اور نیکی کرنا چاہتے تھے بلکہ صرف اس لئے کہ بچپن اور جوانی کے معصوم امتزاج نے اب اس کی نگاہوں اور چہرے میں ایک عجیب غم آمیز دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ مفلس جوانی کی اس ارزاں شراب سے نہ صرف اپنی نگاہوں ہی کو سیر کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کے تکلم کی شیرینی سے اپنے سامعہ کو بھی مسرور بنانا چاہتے تھے۔ لیکن جب وہ جانتے کہ وہ گونگی ہے اور ان کی خود غرضانہ دریا دلی کے جواب میں ہمیشہ پیوست رہنے والے لب متحرک نہیں ہوسکتے اور وہ انھیں کوئی دلنواز نغمہ نہیں سنا سکتی تو دل ہی دل میں اپنی فیاضی پر کسی قدر پشیمان ہوتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔

بہت جلد ہر ایک جان گیا کہ اس کی جوانی گونگی تھی اور اس کا حسن بے آواز اور اب پھر دنیا کی نگاہوں میں اس کی حیثیت اس تنکے کے مانند تھی جسے لوگ مسلسل پیروں تلے روندتے ہیں اور انھیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

تین دن کی مسلسل بارش کے بعد پانی تھما تو گونگی لڑکی کانپتی، لڑکھڑاتی اپنی غیر محفوظ جائے پناہ سے باہر نکلی۔ شام بہت دلنواز تھی۔ ہواؤں میں موسم بہار کی سی تازگی اور شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ مکانوں اور دوکانوں کے چھجوں سے ابھی تک پانی کے قطرے موتیوں کی جھالر کی طرح لٹک رہے تھے اور سورج کی آخری کرنیں گہرے اودے اور نیلے بادلوں کو گلابی اور سنہرا بنا رہی تھیں۔ سڑکوں پر معمول سے زیادہ ہجوم تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر ایک نئی کیفیت تھی موسم کی دلفریبی سے ہر دل متاثر نظر آرہا تھا اور متفکر چہروں پر بھی آج تبسم کی جھلکیاں تھیں۔ لیکن گونگی لڑکی آج بہت خستہ اور پریشان تھی اس کے ساتھی پانی اور آندھی سے گھبرا کر نہ جانے کہاں چھپ گئے تھے اور وہ تنہا رہ گئی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف متجسس نظریں ڈالتی ہوئی آگے بڑھی مگر پانی میں بھیگتے رہنے سے خون اس کی رگوں میں جم گیا تھا اور اس کے پاؤں حرکت کرنے سے

جواب دے رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک گلی کے نکڑ پر پہونچ کر رک گئی اور ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑی ہو کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا بوڑھا دوست تو ضرور آئے گا۔ اُسے اس کا یقین تھا اُسے اس کی وفاداری اور دوستی پر پورا اعتماد تھا اور محبت کے اسی اعتماد نے زندگی کی کلفتوں کو اس کے لئے بہت کچھ سہل بنا دیا تھا۔

شام کا دھندلکا بڑھتا جا رہا تھا۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ لیکن گونگی لڑکی کے منتظر کانوں کو کوئی آواز سنائی نہ دی۔

بھوک کی شدت سے اس کے اعضا سنسنا رہے تھے تین دن سے اس نے کچھ بھی نہ کھایا تھا اور وہ اس ناقابل برداشت جانکاہ تکلیف سے مجبور ہو کر اپنے غلیظ پانی میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے پھٹے ہوئے چیتھڑے نوچ نوچ کر چبا رہی تھی کہ دفعتاً ایک بالوں دار جسم کے لمس نے اسے چونکا دیا۔

یہ اس کا بوڑھا دوست تھا جو اس کے پیروں سے اپنا سر رگڑ رہا تھا۔ گونگی لڑکی نے ایک بے تاب خوشی کے ساتھ اسے اپنے سے لپٹا لیا اور بے اختیار اس کے سر اور پیٹ کے بالوں کو چومنے نہیں بلکہ چبانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر مسلسل اس کے بالوں کو چبا رہی تھی بوڑھے جانور کی آنکھیں بھی نم تھیں اور اس کے دوسرے ساتھی بھی قریب کھڑے خوشی سے اپنی دُمیں ہلا رہے تھے۔

قریب سے گذرنے والے اس کریہہ منظر کو دیکھ کر ناک بھوؤں چڑھا رہے تھے اور غریب لڑکی کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اس کی غلاظت پسند فطرت پر اس سے اظہار نفرت کر رہے تھے۔ لیکن گونگی لڑکی کو ان کی کیا پروا تھی وہ اس وقت اس ہجوم اور شور و غل میں بھی اپنے سچے پریمی دوستوں کے ساتھ تنہا تھی۔ اسے ان دو پاؤں کے جانوروں سے بھلا کیا سروکار تھا جن کی جیون بھنی پریم کے راگوں سے یکسر ناآشنا تھی۔ وہ بغیر کسی خیال کے اسی طرح بوڑھے جانور کو لپٹا لپٹا کر پیار کرتی اور اس کے نرم بالوں کو چباتی رہی یہاں تک کہ اس کے بھوکے پیاسے ہیجان میں کچھ ٹھیراؤ اور سکون پیدا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی نمناک نگاہیں سڑک کے اس پار ہوٹل کی طرف اٹھائیں اور اپنے ساتھیوں کے طرف دیکھا بے زبان جانور اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بوڑھے کتے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور دوسرے کتوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے فوراً سڑک کے کنارے پہونچ گیا اور منتظر تھا کہ ذرا آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو اور وہ سڑک پار کر کے ہوٹل پہونچے اور اپنی گونگی مالکہ کے لئے تازہ روٹی چرا کر لائے۔ وہ اور اس کے ساتھی اسی انتظار میں مستعد کھڑے تھے کہ اسی وقت ایک سائیکل سوار اپنی سائیکل کے پیچھے روٹیوں کا ایک بڑا سا پلندا باندھے سامنے سے گزرا۔ گونگی لڑکی اور بوڑھے جانور کی نظریں ایک ساتھ روٹی پر پڑیں اور دوسرے لمحہ معمر جانور ایک چھلانگ میں سائیکل کے پیچھے تھا اور اچک کر ایک روٹی کو اپنے دانتوں کی گرفت میں لینا ہی چاہتا تھا کہ سائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ آگے نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر بیچ سڑک پر گرا اور پیچھے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار موٹر کا پورا پہیہ اس کے جسم پر سے گزر گیا۔

گونگی لڑکی نے جس کی نگاہیں برابر اس کا تعاقب کر رہی تھیں یہ دیکھا اور زندگی میں پہلی بار اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ راہروؤں کو ہٹاتی، ڈھکیلتی

دیوانوں کی طرح اس کے قریب پہونچ گئی اور دم توڑتے ہوئے جانور کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے زخموں سے بہتے ہوئے خون کو اپنے بالوں میں جذب کرنے لگی۔

وفادار جانور نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھول کر آخری بار اس کی طرف دیکھا وہ اپنی ناکامی پر نادم معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں رنج و تاسف کے آنسو تھے کہ وہ اپنی بھوکی مالکہ کے لئے کھانا فراہم نہ کرسکا۔ آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کے بالوں میں جذب ہوگئے اور پھر اس نے آنکھیں بند کرکے اپنی مالکہ کی گود میں دم توڑ دیا۔

اس وقت تک گرد و پیش لوگوں کا کافی ہجوم ہوگیا تھا۔ ہر شخص متجسس تھا اور ایک دوسرے کے شانوں پر سے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ واقعہ کیا ہے۔ موٹر بھی مجبوراً رکی ہوئی تھی۔ اور صاحب موٹر جو اپنے لباس اور وضع قطع سے کسی ذی مرتبت اور دولتمند خاندان کا سپوت معلوم ہوتا تھا چہرے پر غرور اور تمکنت کے آثار لئے۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ڈالے اپنی سیٹ پر اسی طرح سینہ تانے خاموش بیٹھا تھا اور ایک ذلیل جانور کے لئے لڑکی کی اس مجنونانہ فریفتگی پر حقارت سے مسکرا رہا تھا گونگی لڑکی نے اس کے تبسم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اُمڈ آیا۔ یہی اس کی زندگی کے عزیز ساتھی کا قاتل تھا۔ اس نے رنج و غصہ اور جذبۂ انتقام سے بے تاب ہوکر دوسرے کتوں کی طرف دیکھا جو اُس کے ساتھ ہی وہاں پہونچ گئے تھے۔ اور قریب ہی کھڑے اپنے بزرگ ساتھی کا خاموش ماتم کر رہے تھے۔ انھیں تو صرف اشارہ کی دیر تھی۔ انھوں نے اپنی مالکہ کی غضبناک نظریں دیکھیں تو دیوانہ وار وحشی درندوں کی طرح خوش پوشش نوجوان کی موٹر کی طرف جھپٹ پڑے اور قریب تھا کہ ان کے تیز دانت اس کی نرم کھال میں دھنس جاتے کہ پولیس موقعہ پر پہونچ گئی اور ان کے ڈنڈوں نے کمزور جانوروں کو مار بھگایا "یہ لڑکی دیوانی ہے" اس نے دیوانے کتوں کو پال رکھا ہے" دولتمند انسان اب ضبط نہ کرسکا اور چلا چلا کر گونگی لڑکی کو پاگل اور دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہاں یہ لڑکی سچ مچ پاگل ہے" "ہم نے اکثر اسے سڑکوں پر کتوں کے ساتھ پھرتے دیکھا ہے" "اور وہ آپ اپنے کپڑے چبایا کرتی ہے۔ اور کتوں کے بالوں کو بھی چباتی ہے" دولتمند انسان کی حمایت میں مجمع سے ایک ساتھ مختلف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

بیچاری غریب لڑکی سوگوارانہ انداز میں مردہ جانور کے جسم کو اپنے بالوں میں چھپائے اسی طرح خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر اس کے رنج و غم سے کسے سروکار تھا۔

ذی اثر اور باوقار ہستی کی کوششیں کامیاب ہوگئیں اس کے عقلمندانہ فیصلہ نے گونگی لڑکی کو پاگل خانہ بھجوا دیا اور اس کے بقیہ ساتھی زہر دے کر مار ڈالے گئے۔

اب وہ سچ مچ پاگل ہوگئی تھی اور تمام پاگلوں میں سب سے زیادہ خطرناک سمجھی جاتی تھی۔

اس کے نوجوان چہرے پر جھریاں پڑگئی تھیں جسم کی کھال لٹک پڑی تھی اور آنکھوں میں زندگی کی روشنیوں کی بجائے موت کی تصویر تھی اور وہ ایک بائیس سالہ لڑکی کی بجائے ایک چالیس سالہ بڑھیا

معلوم ہوتی تھی - اور اس کی شکل کچھ ایسی بھیانک ہو گئی تھی کہ ہر شخص اس سے خوف کھاتا تھا -
اسے پاگل خانے میں سب سے علحدہ ایک تاریک کوٹھری میں رکھا گیا تھا اس لئے کہ وہ انسانی شکلوں کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگتی تھی اور انھیں کاٹ کھانے کے لئے دوڑتی تھی - دوسرے پاگل بھی اس سے ڈرتے تھے اور کوئی اس کے قریب جانے کی جرأت نہ کرتا تھا حتیٰ کہ اس کا کھانا بھی اسے اس وقت پہونچایا جاتا تھا جب کہ وہ سوئی ہوتی یا اپنے بالوں کو چومتی اور چباتی ہوتی تھی جو اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اس وقت وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہوتی تھی -

رضیہ

غم کا روگ

دل کی دھڑکن بڑھتی جائے　　دُکھ کی ندی چڑھتی جائے
آشا بے سدھ سوئی پڑی ہے　　پریم کی ناگن پاس کھڑی ہے
لب پر نالے گھوم رہے ہیں　　آگ کے بادل جھوم رہے ہیں
نینن میں اک باغ کھلا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

دیوانہ مشہور ہوا ہوں　　عقل سے کوسوں دُور ہوا ہوں
دنیا دیکھ کے ہنس دیتی ہے　　مجھ سے کیا بدلہ لیتی ہے
نیند کا دریا رُک سا گیا ہے　　خوشیوں کا سر جُھک سا گیا ہے
جینا اب مرنے سے بُرا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

راز کا مجھ کو ہوش کہاں ہے　　نام کسی کا وردِ زباں ہے
گانا سُن کر رو دیتا ہوں　　زخموں کا منہ دھو لیتا ہوں
آنکھوں میں ساون آیا ہے　　اک پردیسی گھبرایا ہے
پی بن جینا کیا جینا ہے
من کو غم کا روگ لگا ہے

الطاف مشہدی

ہوس کا دھوکا

آج سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ یہی میاں شاہد جو اب مجنوں کا سا حال اٹھائے بلکتے بلبلاتے میرے سامنے بیٹھے ہیں، کلی کی طرح چٹکتے، مسکراتے میرے ہاں آئے تھے۔ وہ دن بھی یاد رہے گا اور آج کا دن بھی۔ اُس وقت ان کا یہ عالم تھا جیسے سکندر اعظم کے ساری دنیا کو فتح کرنے کے منصوبہ کو انھوں نے پورا کر دیا ہے۔ اور ساری دنیا ان کے زیرِ نگیں ہے اور بات کیا تھی تو صرف اتنی کہ کسی لڑکی نے ان سے بے تحاشا کہہ دیا کہ .... "میں تم سے محبت کرتی ہوں" اور شاہد اس بے چاری کی خوش نمائی، ملائک خصلتی اور قدر شناسی کا قصیدہ بڑے والہانہ انداز میں میرے گوش گذار کرنے لگے۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا تم کو یہ نصرتیں مبارک ہوں، لیکن اس کے انجام سے تمھیں آگاہ کر دینا ہر ناصح کا فرض ہے۔ آج سے نہیں جب سے تم میں اِس مرضِ عشق کی علامتیں رُونما ہونے لگیں ہیں میں نے تمھیں سنبھالنے کی کوشش کی ہے۔ تم ہمیشہ مجھ سے بدکتے رہے اور میں تم سے ہاتھ دھو کر رہرو راہِ محبت کا خدا ہی حافظ کہہ کر چپ ہو رہا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس لڑکی کا اعترافِ محبت تمھیں کہیں کا نہ رکھے گا ...... تم کیا جانو عورت کے دل کتنے ہوتے ہیں، زبانیں کتنی ہوتی ہیں"

میرے آخری جملہ پر شاہد نے اپنے کان کھڑے کئے۔ دیدے پھاڑ کر تمسخرانہ انداز میں کہا "تم کیا جانو..." مجھ پر اس کے تمسخر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا "ہم بہت کچھ جانتے ہیں ...... کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے ہم بہت کچھ جانتے ہیں ...... میں نے تجربہ کارانہ انداز سے گردن ہلائی اور سوچنے لگا کہ اپنی داستانِ محبت سنا دوں اسے ...... اور میرے ذہن میں اس وقت کتنی بھولی بسری باتوں نے کروٹ لی ...... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زخموں کے انگور کسی نے نوچ ڈالے۔ "اُف" کر کے میں چپ ہو رہا ...... ہونٹوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا ...... اعضا میں خفیف سی لرزش دوڑ گئی ...... شاہد مسکرانے لگا ...... ہم بھی تو سنیں آخر کیا ہیں ترے افسانے، میں نے اپنی اضطراری کیفیت پر قابو پا لیا۔ سوچا کہ گزشتہ پر صلواۃ بھیجنا ہی بہتر ہے ...... اور پھر شاہد سے کہنے کا تو کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اسے اپنی پڑی ہے، اور اس منزل میں ہے جہاں ہوش و حواس چھن جاتے ہیں اور ایک سُرور کی سی کیفیت طاری رہتی ہے ...... محبت اور محبوب کے سوا کسی تیسری چیز کا دھیان ہی نہیں ہوتا ...... میں نے اپنے آپ کو مسرور و مطمئن ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ شاہد چھوڑو اِس قصہ کو۔ پھر کبھی کہیں گے ...... ہاں تم سناؤ ...... سناؤ اپنے افسانے ...... شاہد تو بس چھیڑ چاہتا تھا ...... ایک سرد لمبی آہ پوری طرح سینہ سے باہر نہیں نکلی تھی کہ زبان چلنے لگی۔ "آہ! کچھ نہ پوچھو دوست ...... لوگ کہتے تھے محبت میں مزہ ہوتا ہے ...... آج مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوا ہے ...... لوگ سچ کہتے تھے ...... میں نے محبت کا مزہ چکھ لیا ہے ...... محبت ایک آسمانی برکت ہے۔ سُرورِ سرمدی ہے، کیفِ لازوال ہے ...... نعمتِ غیر مترقبہ ہے لیکن تمھیں کبھی مجھ سے اتفاق ہو گا کہ ان ساری مزیداریوں کا انحصار صرف مطلوب سے محبت کا جواب محبت سے ملنے میں ہے، میرا مطلب سمجھ گئے نا تم ...... میں نے جواب دیا۔ ہاں سمجھ گیا لیکن تم سمجھنے میں غلط فہمیاں نہ کر بیٹھنا ...... میں پہلے بھی

کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ وہ زمانہ گیا جب اوتھیلو جیسے کریہہ حبشی پر کسی شہزادی کا دل آجاتا تھا......... آپ آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا ناغہ نہ کیا کیجئے...... آج کل محبت ظاہری صورت شکل سے ہوتی ہے ہر زمانہ کا ایک ایک معیار ہوتا ہے...... لوگ کہتے ہیں کہ دوست اور آئینہ کے یکساں فرائض ہیں۔ میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اس صدی کی بدصورت سے بدصورت لڑکی آپ پر ایک چھوڑ ہزار جان سے بھی عاشق نہیں ہو سکتی..... تم کو دھوکا دیا جارہا ہے، تم کو الّو بنایا جارہا ہے..... تم سے کھیلا جارہا ہے...... جس لڑکی نے تم سے کہا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے وہ جھوٹ بول رہی ہے...... تمہاری تباہی کے درپے ہے۔ لڑکی آپ سے محبت کرتی ہے کوئی اور وہ بھی کیسی لڑکی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں سرو قامت، گداز جسم، خوش مزاج..... اور آپ کی صورت تو دیکھنا چاہیے...... شاہد ہکا بکا میرے جذبہ تقریر کی حرکات پر غور کر رہا تھا...... میں اس قدر جوش میں کیوں آگیا تھا۔ شاہد کے ساتھ اس قدر درشتی کیوں برت رہا تھا مجھے خود اس کا احساس نہیں۔ لیکن ہاں اس کا تو مجھے بھی اعتراف ہے کہ شاہد کی اس کامیابی پر مجھے رشک سا ہو رہا تھا۔ کیوں اس لڑکی نے اعتراف محبت کیا؟ حالانکہ میرے بارے میں تو کسی نے یہ بھی باور نہ کیا کہ مجھے ان سے محبت ہے..... میں نے شاہد سے معافی چاہ لی۔ اور وہ مایوس اور دل گرفتہ میرے ہاں سے چلا گیا۔

لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ شاہد نے پھر اس قسم کا تذکرہ چھیڑا ہی نہیں۔ دوسرے ہی دن...... ہر پھر کے وہی "دوست عجب لڑکی ہے..... حسن بھی محبت بھی......

جی چاہتا ہے کہ اس پر سے نچھاور ہو جاؤں..... تم کہتے تھے کہ عورت بُری چیز ہے۔ بابا ہم تو سچی محبت کے قائل ہو گئے۔ ذرا اس سینہ کو چیر کر دیکھو...... کتنا خوبصورت دل دھڑک رہا ہے۔ اس کی نظر میری صورت پر نہیں۔ میرے دل پر پڑی اور دل نے اپنے جوہر دکھا دیئے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"۔ مجھے شاہد کو کھری کھری سناتے جھجک سی محسوس ہونے لگی میں نے کہا "تم بہت خوش قسمت ہو۔ خدا نے تمہاری بدصورتی کی تلافی یوں کی کہ ایک حسین چاہنے والی مل گئی۔ تم دونوں کی محبت دن پر دن استوار ہوتی جائے۔

شاہد نے فوراً ٹوک دیا "ارے پرسوں ہی کے واقعہ کو لو میں ذرا دیر سے گیا تو بس کیا دیکھتا ہوں...... حیران، پریشان...... اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہی ہے، کسی پہلو چین نہیں..... مجھ پر نظر پڑی تو فور مسرت سے چہرہ دمک اٹھا۔ لیکن اس طرح منہ پھُلا لیا جیسے بہت خفا ہے۔ "کہاں تھے اتنی دیر"؟ اس انداز میں پوچھا ہے کہ میں وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا...... ہائے..... یہی تو زخم کلیجے کو کھائے جاتے ہیں...... میں نے کہا ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا...... آپ کے لئے ایک ناچیز تحفہ خریدتے میں دیر ہو گئی۔ کمر پہ ہاتھ رکھ، بھویں سکیڑ لیں اور..... نا صاحب اس طرح کی خوشامدوں سے میں بہت دور بھاگتی ہوں...... بھاگئے۔ میں نے کہا اور بڑھ کر اس کی کلائی پر چھوٹی سی خوبصورت گھڑی باندھ دی بھاگئے نا..... میں نے ہانپتے ہوئے کہا..... جیسے بھاگ بھاگ کر آرہا ہوں...... اور کام کیا تھا تو صرف آگے بڑھنا اس کی کلائی تھامنا..... اور گھڑی باندھ دینا......

ہانپ گیا قسم ہے...... پھر کیا ہوا...... میں نے دلچسپی کا اظہار
کرتے ہوئے کہا پھر یہ ہوا کہ رات کا کھانا ساتھ کھائے۔ بڑے
اصرار کے ساتھ روکا مجھے اور کھاتے وقت کی دلگی تو نہ
پوچھو...... اِدھر میں نوالہ اٹھاتا ہوں تو وہ بھی اٹھاتی ہے
ادھر میں منہ کھولتا ہوں تو ادھر وہ...... ہنسی تو روکے نہ رکی
اور شرارت کی انتہا ہو گئی نا...... میں ہنستا ہوں تو ادھر بھی ہنسی
لاحول ولا قوۃ بڑی شریر ہے...... اور یہ دیکھو...... شاہد
نے جیب سے ایک چھوٹا سا پرزہ نکالا...... اور میری طرف
بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ پڑھو اِسے' میں تو کوئی بیس دفعہ
پڑھ چکا ہوں...... چٹھی پر زنانی خط میں لکھا تھا......
پیارے! تم مجھے بے حد یاد آتے ہو...... تم بڑے بے درد ہو
میری محبت کا تمھیں اعتبار نہیں۔ میں نہیں جانتی تمھیں اس کا
کیسے یقین دلاؤں...... تم تو مانتے ہی نہیں...... سچ کہتی ہوں
تمھارے بغیر نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند...... خواب
میں بھی تمھیں کو دیکھتی ہوں...... اور اکثر یہ شعر گنگناتی ہوں۔

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

فقط تمھاری

لو اسے سنبھال کر رکھو تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام
آئے...... شاہد نے مسکراتے ہوئے چٹھی لے لی...... اور
سنجیدہ بن کر پوچھنے لگا۔ "اب کیا کروں" میں نے جواب دیا......
"شادی"۔ شادی کا نام سنتے ہی ہشاش بشاش چہرہ
ٹھٹھر کے رہ گیا...... "وہ کیوں؟" میں نے تشویش کے ساتھ
پوچھا...... کچھ نہیں...... بات در اصل یہ ہے کہ وہ عجب
خیالات کی لڑکی ہے۔ شادی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت
نہیں۔ کہتی ہے کہ سچی محبت ہو تو پھر دنیوی راہ و رسم کی پابندی
ضروری نہیں...... میں اتنا سن کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا......
ارے یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔ یار! واقعی تم پر تو اب
رشک آجائے ہے...... کس مزے میں ہو اور کیسے سستے
چھوٹ رہے ہو...... لاؤ ملاؤ تو رمہ کا ہاتھ...... لیکن شاہد
مطمئن نہ تھا...... ہٹو یار تمھیں تو مذاق کی سوجھی ہے اور
یہاں تلوؤں سے لگی ہے...... میں نے اسے چھیڑنا مناسب
نہ سمجھا...... اور چپ ہو رہا۔ شاہد بھی اسی طرح خاموش
سوچتا ہوا بیٹھا رہا...... پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگا......
جیب سے ایک مخمل کی ڈبیہ نکالی...... اور میری طرف
بڑھاتے ہوئے کہنے لگا...... دیکھو تو کیسی ہے...... میں نے
ڈبیہ کھولی' ایک چم چم کرتی سونے کی انگوٹھی نظروں کے
سامنے تھی...... میں نے تھوڑی دیر تک انگوٹھی کو بڑے غور سے
دیکھا...... خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی تھی۔ شاہد نے پوچھا۔
محبت کو تحفے تحائف سے مالا مال کر دینا چاہیے کیوں؟......
میں نے اسی طرح انگوٹھی کو ہیر پھیر کر دیکھتے ہوئے کہا "برا
خیال نہیں"۔

اسی طرح شاہد کی محبت تحفے تحائف...... خوشامد
برآمد اور کھلونوں کے سہارے پھلتی پھولتی رہی...... اور
میرا دوست بھلے چنگے انسان سے خاصا مجنون بن گیا......
سوتے جاگتے میں اسی کی باتیں...... ہچکی آئی نہیں کہ دیکھو
شاید اس نے یاد کیا...... ڈاکیہ پکارا نہیں کہ...... کیوں
بھئی میرے نام کوئی خط...... بس جب دیکھو اس کی رضاجوئی
کے لئے سرگرداں...... میں بھی تماشائی کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ
دھرے بیٹھا دیکھتا رہا کہ کون کون سے رنگ بدلے جائیں گے
کیا کیا کھیل کھیلے جائیں گے...... میں نے شاہد سے تو کچھ کہا
نہیں۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ شاہد کا ستارہ بہت جلد گردش میں

آنے کو ہے ...... میرا قیاس صحیح نکلا ...... مجھے اس سے
خوشی نہیں الٹا افسوس ہے ...... شاہد میاں میرے سامنے
بیٹھے ہوئے ہیں ہلکتے بلبلاتے ...... میں بھی غمگین ہوں ......
دردمند لہجے میں پوچھ رہا ہوں ... کیا ہوا؟ ... شاہد جواب
دینا چاہتا ہے۔ لیکن جیسے حلق میں پھندا پڑ گیا ہو ......
میں نے پھر پوچھا کیا ہوا' ارے یہ کیا .... شاہد بچوں کی طرح
بلک بلک کر رونے لگا ...... ارے یہ کیا بچپن ہے ..... رونے ہو
شاہد کے آنسو اِس طرح ٹپاٹپ گر رہے تھے جیسے لڑھکی
ہوئی شیشی میں سے گولیاں ...... میں آگے بڑھ گیا ......
اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے سر کو تھام لیا "بندہ خدا
کچھ کہو بھی .... آخر کیا افتاد پڑی .... شاہد کے آنسو تھمنے
لگے۔ ہچکیوں کو وہ پی پی جا رہا تھا ..... لیکن خود میرا حال
غیر ہونے لگا اپنے ایک عزیز دوست کی آنکھ میں آنسوؤں
کو دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا ...... اور میری آنکھیں بھی پُرنم
ہوگئیں ...... میں نے دھیمے لہجہ میں پوچھا "کیا ہوا شاہد"
تو میری آواز میں بھی آنسو تھے ..... شاہد سنبھل رہا تھا ....
میری آواز کو سن کر پھر پھوٹ بہا ...... کوئی آدھ گھنٹہ کے
بعد دونوں کے دل قابو میں آئے اور شاہد نے کہنا شروع کیا
جو نہ ہونا تھا سو ہوا ..... جس چیز کا شان و گمان بھی نہ تھا
وہ حقیقت بن کر سامنے آگئی ..... تمہاری باتیں میرے
لئے مذاق تھیں لیکن آج وہ سچی پیشین گوئیاں ثابت
ہو رہی ہیں۔ مجھ بدنصیب سے کھیلا گیا ...... مجھ بدصورت
کو محبت کا دھوکا دیا گیا۔ الو بنایا گیا ...... مجھے کہیں کا نہ
رکھا گیا۔ میرا دل روند دیا گیا .... مٹی
میں ملا دیا گیا۔ آہ ..... کون الو کا پٹھا کہتا ہے کہ محبت میں
مزہ ہوتا ہے ..... میں کہتا ہوں محبت سے ہی کہاں اِس
مکّار دنیا میں نہ محبت نہ مزہ ...... ہاں محبت کی کینچلیاں
پہن پہن کر ناگنیں ڈستی پھرتی ہیں ...... آہ! میرا دل ...
میرا دل ...... کیا ہوا شاہد .... آخر کچھ کہو بھی ....
میرے دوست سب کچھ ہو گیا' میں زندہ بھی کیا گیا .... مارا بھی گیا
دفنایا بھی گیا ..... اٹھایا بھی گیا اور دوزخ میں پھینک بھی
دیا گیا ...... کیا ہوتی ہیں یہ لڑکیاں اور کیا ہوتی ہے ان
کی محبت ..... تمہیں یاد ہے نا وہ چٹھی .... تمہیں یاد ہے نا
اور وہ ساری باتیں جو میں نے تم سے کہی تھیں ..... وہ سب
دھوکا تھا .... مکر تھا .... اور تھا .... تھا .... میں دیوانہ ...
ارے بھئی آخر کچھ کہو نا۔ کیا ہوا .. کیا کیا اس نے .... کیا
تمہارے تحائف واپس کر دئے ..... تمہیں برا بھلا کہا ......
کیا ہوا آخر ...... میں نے بے صبری سے پوچھا۔

اس لڑکی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو کسی جلّاد
سے ممکن نہیں .... خدا کرے آج ہی قیامت آجائے۔
آسمان ٹوٹ پڑے۔ زمین شق ہو جائے ...... کیا اچھا
صلہ ہے محبت کا ...... وفا اور انصاف تو کوئی اس سے
سیکھے ... پرسوں کی بات ہے .... چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔
مجھے کسی طرح اس سے ملنے کا موقع مل گیا .... نارنگی کے
درخت کے نیچے ہم دونوں کھڑے تھے ..... نارنگی کے پھولوں
کی تیز خوشبو نے مست بنا دیا ...... اور پھر ان کی سج دھج
بھی آنکھوں میں کھُبی جا رہی تھی۔ مستی کے عالم میں مجھ سے
کونسی حرکت سرزد ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم ہوش ٹھکانے ہوئے
تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور کا تھپڑ میرے گال پر
مارا ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں تو وہ بھی غائب .... دیوانگی
کی سی حالت میں افتاں و خیزاں گھر پہنچا۔ رات بھر کسی کروٹ
چین نصیب ہوا ہو تو جیسی چاہو قسم لے لو ..... صبح کو اٹھا تو

سر میں درد تھا...... اور مریض کی طرح دنیا کی ہر چیز کو بے کیف اور اداس دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے مجھے خط لادیا... خط پڑھتا ہوں تو پاؤں تلے زمین نکل گئی خداوندا یہ کیا...... کل تک محبت کرنے والی...... میرے لئے بے چین رہنے والی آج یکایک کیسے بدل گئی۔ کس طرح لکھ سکی ہو گی۔ تمھاری محبت کو آزمالیا۔ تم آئندہ سے میری دہلیز میں قدم نہ رکھنا۔ ورنہ بے عزتی کے ساتھ نکلوا دئے جاؤ گے سمجھے...... میں نے سخت غلطی کی تھی جو تمھاری پیشقدمیوں کو طرح دے گئی۔ تمہاری صورت کی طرح تمھاری روح بھی مکروہ ہے۔ تم مردوں کی سب سے ارزل قسم ہو عورت کی تنہائی اور اس کے اعتماد سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہتے ہو... شرم... شرم... شاہد اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے جذبات کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے...... اس کے صدمہ کی شدت کو وہی محسوس کرسکتے ہیں' جن کے دل بھی ٹوٹے ہوں' امیدوں اور ارمانوں پر پانی پھر گیا ہو منزل کی طرف جارہے ہوں... لیکن پیچھے سے کوئی انھیں زخمی کردے...... اڑنے کے لئے پر تول رہے ہوں اور گرفتار کرلئے جائیں' میرے دل کا حال نہ پوچھئے۔ زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا...... دہکتی آگ کی طرح دہک رہا تھا میں اپنے دوست کے حال پر آنسو بہا رہا تھا...... اور اس سنگدل لڑکی کے لئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ مل جائے تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں.... میں نے گڑگڑا کر خدا سے دعا کی کہ وہ اس کی خوشیوں کو بھی اسی طرح پامال کرے......

...... اور اس کا دل بھی اسی طرح ٹوٹے.... وہ بھی اسی طرح آنسو بہاتی رہے... سر پٹختی رہے.... اس کا بھی سکون واطمینان چھن جائے..... خداوندا تو اس سے اس ظلم کا انتقام لے.....

شاہد نے گردن اٹھائی...... اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے...... وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا... ہاں شاہد نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تم سے کہا نہیں شاید آج کل ایک حسین نوجوان آنے جانے لگا ہے.... خدا جانے کیا ہونے کو ہے...... کچھ نہیں..... سب ٹھیک ہوگا.. قدرت انتقام لے رہی ہے..... وہ بھی ستائی جائے گی تباہ کردی جائے گی...... اس کے سکون... خموشی.... اور عزت کے پرزے پرزے اڑادئے جائیں گے "سمجھے" میں اس جوش کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ جیسے شاہد سے نہیں مجھ سے بے انصافی کی گئی ہے...... اور واقعی میں بھی تو ستایا ہوا تھا...... اپنی بدنصیبی کا خیال آیا تو میں خود کو سنبھال نہ سکا۔ روتا ہوا شاہد کے گلے لپٹ گیا..... اور ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے...... .

رشید قریشی

باپ کا ترکہ

مرحوم از قبیلۂ اہلِ نگاہ تھا		جوشِ سخا کا جس کے زمانہ گواہ تھا
ظالم کے حق میں منتقمِ بے پناہ تھا		تھا راستی میں فردؔ گر کج کلاہ تھا

سنگم بنا ہوا تھا جدید و قدیم کا
زندہ مجسمہ تھا مذاقِ سلیم کا

طوفانِ غم میں اشک بہاتا نہ تھا کبھی		شکوے گلے زبان پہ لاتا نہ تھا کبھی
اہلِ دوَل کے ناز اٹھاتا نہ تھا کبھی		باطل کے آگے سر کو جھکاتا نہ تھا کبھی

آلائشِ جہاں سے رہی پاک زندگی
گزری مثالِ شعلۂ بے باک زندگی

تھا راہِ مستقیم کا جانباز شہسوار		مقبولِ خلق عاشقِ آقائے نامدار
مظلوم کا رفیق، غریبوں کا غمگسار		غیروں کا درد مند، عزیزوں کا جاں نثار

اہلِ وطن کو تحفۂ اخلاق دے گیا
گنجِ متاعِ حسنِ عمل ساتھ لے گیا

کہنے کو داغِ ہجر دیا یاد کے لئے		چھوڑا غم ایک خاطرِ ناشاد کے لئے
کچھ نونہالِ گلشنِ ایجاد کے لئے		رکھا نہ آسرا کوئی اولاد کے لئے

مردِ خدا نے دولتِ بیدار چھوڑ دی
لختِ جگر کے واسطے تلوار چھوڑ دی

سکندر علی وجد

سوانح نگاری

گذری ہوئی یادوں کو تازہ کرتے رہنا ایک فطری جذبہ ہے ہر زندگی سے ماضی کی کوئی نہ کوئی یاد ضرور وابستہ رہتی ہے جب اس یاد سے دل میں یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ موجودہ زندگی ہم کو ماضی سے ورثہ میں ملی ہے اور یہ ماضی کی ایک ودیعت ہے جس کو مستقبل کے ہاتھ سونپنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے تو پھر یہی یاد ہماری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے ہر دور ماضی سے کچھ افکار اور شعائر لیتا ہے اور ان کو مستقبل کے حوالے کر دیتا ہے سوانح کا مقصد بھی کچھ یہی واضح کرنا ہے کہ کسی خاص شخصیت نے زمانے کو کیا افکار دئے اور شعائر حیات میں اس نے ..... کس طرح حصہ لیا۔ سوانح نگاری کے مقاصد یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس کا ایک اہم مقصد اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے جب تک کہ اس شخصیت کے کردار اور حالات کو ان کے اصلی روپ میں پیش نہ کیا جائے۔

سوانح نگار حال کے دامن کو ماضی سے باندھ دیتا ہے اس اعتبار سے مورخ اور سوانح نگار دونوں کا دائرہ عمل تقریباً ایک ہو جاتا ہے لیکن مورخ جہاں پوری ہیئت اجتماعی سے بحث کرتا ہے سوانح نگار صرف کسی خاص فرد کے ذاتی حالات اور کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ہیئت اجتماعی میں اس کا مقام معین کرتا ہے۔

سوانح نگاری کے بعض جدید نظریوں نے اس کے دائرہ عمل کو بہت محدود کر دیا ہے بعض کی رائے میں سوانح نگار کے فرائض صرف یہیں تک محدود ہوتے ہیں کہ وہ کسی شخصیت کے افکار، ذاتی حالات اور کردار کا ایک مکمل خاکہ پیش کر دے۔ ان کے نزدیک ماحول پر روشنی ڈالنا صرف مورخ کا کام ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ شخصیت اور ماحول پر بیک وقت گفتگو کرنا کسی قدر مشکل ہے ایسا کرنے میں بسا اوقات شخصیت ماحول میں ضم ہو کر رہ جاتی ہے لیکن بڑی شخصیت کو ماحول سے جدا کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ ہر بڑی شخصیت اپنے ماحول کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک اس کے ذاتی حالات کا مطالعہ ماحول سے ملا کر نہ کیا جائے اس کی حیات عمل کے سارے پہلو نمایاں ہونے نہیں پاتے

کامیاب سوانح نگار شخصی حالات میں ماحول کی تاریخ کو کچھ اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ سوانح نگاری کا یہ عیب بجائے خود ایک حسن بن جاتا ہے۔

قدیم زمانے کا سوانح نگار کسی شخصیت پر بعض محاسن اخلاق کو اجاگر کرنے یا اس کے برے پہلوؤں کو واضح کرنے کو ہی سوانح نگاری سمجھتا تھا خود شخصیت سے اس کی دلچسپی دوسرے درجہ کی ہوتی تھی - یہ خیال کہ سوانح میں کسی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی جائے کہ اس میں سیرت و عمل کے صحیح خد و خال نظر آجائیں سترھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے سوانح کی شخصیت اخلاقی اصولوں اور فلسفیانہ نظریوں کے دھندلکے میں بالکل مبہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ خود پلوٹارک کی لکھی ہوئی شہرہ آفاق سوانح عمری بھی اس خامی سے پاک نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ سوانح نگار کو ایک ادیب اور مورخ کے دھرے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں لیکن سوانح نگاری کا تعلق زیادہ تر ادب سے ہی ہے ادب کی کوئی راست اور قطعی غرض و غایت

تو نہیں ہوتی لیکن اس میں ایک چھپا ہوا اغایتی میلان ضرور ہوتا ہے سچا ادب وہی ہے جو نظریوں کو دماغ پر مسلط کرنے کی بجائے ان کو چپکے چپکے دلنشین کر دے اور اس طرح ہمارے سیکھنے اور سمجھنے والے شعور کو جس کو آپ چاہیں تو درس گیر شعور سے تعبیر کر سکتے ہیں انجانی میں بیدار کر دے

سوانح نگار کا فرض کسی زندگی کے بیتے ہوئے حالات کو من وعن بیان کر دینا ہوتا ہے یہی اس کی مورخانہ حیثیت قرار دی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ جب وہ ان تاثرات کا بھی ذکر چھیڑ دیتا ہے جن کا کسی زندگی کے بنانے میں بڑا حصہ رہا ہے تو اس کا یہی جذباتی تاثر اس کی سوانح عمری کو ایک غیر فانی ادبی کارنامہ بنا دیتا ہے ۔

نام رفتگاں کو باقی رکھنا اور ان کی یاد کو تازہ کرتے رہنا ایک فطری جذبہ ہے سوانح نگاری کا محرک عموماً یہی جذبہ ہوتا ہے کسی فرد کی سوانح حیات ہی سب سے زیادہ اس کے نام کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے مجسموں تصویروں عمارتوں اور اس طرح کی دوسری یادگاروں میں ہم زندگی کی وہ روح نہیں دیکھ سکتے ۔ جو سوانح عمری میں ہر جگہ جھلکتی ہے سوانح نگار اپنی ادبی فن کاری سے کسی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دیتا ہے ایسی تصویر پیش کرنے کے لئے بڑی فن کارانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے یہ نہ ہو تو آپ سمجھ لیجیئے کہ اس نے کسی زندگی کی محض تاریخ لکھ دی ہے اور اس کا سوانح عمری سے جو ایک مستقل اور اہم صنف ادب ہے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ سوانح عمری کے علاوہ دوسری یادگاروں سے دل میں اس زندگی کا کوئی موہوم اور مبہم تصور تو آجاتا ہے جس کی وہ پرتو ہوں لیکن کسی اچھی سوانح حیات میں آپ اس زندگی کی اور کبھی اس کے ماحول کی دل کی دھڑکن تک سن سکتے ہیں ۔

سوانح نگار کسی شخصیت کی تصویر اس کی سیرت اور عمل سے بناتا ہے ۔ سوانحی مقاصد کے اعتبار سے سیرت کو جسے آپ چاہیں تو عالم افکار سے تعبیر کر سکتے ہیں اعمال سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ ہر انسان کے کچھ ذہنی افکارات اور فطری رجحانات ہوتے ہیں ان ہی سے اس کی سیرت بنتی ہے عمل ان افکار اور رجحانات کی صورت پذیری کا نام ہے وہ افکار جو اپنے آپ کو اعمال کے سانچے میں ڈھال سکیں ۔ سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے بیکار ہیں ایسی شخصیتیں جن کے فکر و عمل میں ہم آہنگی نہ ہو سوانح کا صحیح موضوع نہیں بن سکتیں ۔

بڑی شخصیتوں کے افکار اور رجحانات بھی بلند ہوتے ہیں یہ جب ایک بار عمل کے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں تو ان کا اثر شخصی اور انفرادی حدود سے نکل کر پوری ہیئت اجتماعی پر پڑتا ہے سوانح نگار اپنا موضوع منتخب کرتے ہوئے یہی دیکھتا ہے کہ کسی شخصیت کے عمل نے اس کی فکر کا کہاں تک ساتھ دیا ہے اور ہیئت اجتماعی نے اس سے کیا اثرات قبول کئے ہیں ان اثرات کو واقعات اور حالات میں اپنی طرف سے ردّ و بدل کئے بغیر وہ جس قدر موثر انداز میں محسوس کرا سکے اسی قدر زیادہ اس کا کارنامہ غیر فانی سمجھا جائے گا ۔ پڑھنے والوں کے دل میں چپکے چپکے یہ احساس پیدا کر دینا کہ وہ ایک ایسی زندگی کے حالات پڑھ رہے ہیں جو بہر نوع ایک قیمتی زندگی تھی یا اس زندگی میں عام لوگوں کی توجہ اور دلچسپی جذب کر لینے کے بہت سے سامان تھے دراصل سوانح نگاری کا وہ چھپا ہوا اغایتی میلان ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا تھا ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس مختصر تشریح کے بعد آپ

مجھ سے اِس بارے میں متفق ہو چکے ہوں گے کہ سوانح کے موضوع کے انتخاب کے لئے کچھ حدود اور ضابطے معین کرنے ضروری ہیں ۔ ادب کا مقصد اب صرف تفریحی نہیں رہا ہے آرٹ حسنِ محض کا نام نہیں ہے آج ہمارا اجتماعی وجدان آرٹ میں حسن اور حقیقت کو ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے ۔ اور اِس بات کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آرٹ کے ذریعے حقیقت سے محض واقف ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کو محسوس کر کے غیر شعوری طور پر اپنی زندگی کے کچھ ایسے خاکے تعمیر کرے جو اس میں زندگی کی تاب پیدا کر سکیں اور اس کے جذبۂ عمل کو متحرک کر سکیں ۔ وہ زمانہ گیا کہ سید انشا مرحوم کسی چڑیا کی بات جو چونٹے کہی ہو ہر ایک سے پوچھتے پھرتے تھے تاکہ اس میں اپنی طرف سے نون مرچ لگا کر والیٔ شہر کو خوش کر سکیں ۔ آج دنیا کو ایسے قصوں کی ضرورت ہے نہ اس کو اتنی فرصت ہے کہ اس مسابقت اور کشمکش کے دور میں اپنا وقت ان پر صرف کر سکے ۔

اِس اعتبار سے سوانح حیات کی اہمیت اس دور میں یوں بڑھ جاتی ہے کہ اس کی بنیاد زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر رکھی جاتی ہے اور یہ حقیقتیں کچھ ایسے دلنشیں پیرایہ میں پیش کی جاتی ہیں کہ طبیعت پر گراں نہیں گزرنے پاتیں اور جی ان کو بہر نوع قبول کر لینے کو تیار ہو جاتا ہے ۔

سوانح کی اِس اہمیت کو محسوس کر لینے کے بعد یہ سوال فطری طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی کونسی حقیقتیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ جن کی بنا پر کسی شخصیت کو سوانح کے موضوع کے لئے انتخاب کیا جا سکے ۔ میں نے آپ سے کہا ہے کہ شخصیت کو ماحول سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ ہر بڑی شخصیت ماحول کو متاثر کرتی ہے ۔ اِسی وجہ سے اس کے حالات سے عام طور پر دلچسپی لی جاتی ہے اور اس کے حالات، افکار اور واقعات کو سوانح کے ذریعے محفوظ کر لینے کا خیال عام طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے گویا سوانح حیات صرف انہی شخصیتوں کی مرتب کی جا سکتی ہے جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے زمانے اور ماحول کی توجہ جذب کی ہو یا اُن کی زندگی میں کچھ ایسی خصوصیتیں رہی ہوں جن کو زمانے کی عام نظر غیر معمولی قرار دے ۔ معلمِ اخلاق، مصلحِ معاشرت، سیاسی رہنما، شاعر فلسفی سب کسی نہ کسی حیثیت سے زمانے کی توجہ جذب کرتے ہیں زمانے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے حالات ان کے افکار اور ان کے طریقِ عمل سے آگہی حاصل کرے اور آنے والی نسلوں کے لئے ان کی یاد کو غیر فانی بنا دے سب سے پہلے سوانح نگار نے خواہ کسی غرض اور غایت سے سوانح نگاری کی ابتدا کی ہو اِس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اہلِ ادب کے لئے ایک مستقل شاہراہ کھول دی اور ایک بڑی اہم صنفِ ادب کی بنا ڈالی ۔ اس صنف نے کیا کیا ارتقائی مدارج طے کئے اور کن کن منزلوں سے گزرتی رہی اس کے متعلق میں نے دو ایک اشارے ابھی کئے ہیں ۔

سوانح کے موضوع انتخاب کے لئے جس طرح بعض شرائط اور ضابطے معین کئے جا سکتے ہیں ویسے اس کے طرزِ اسلوب اور طریقۂ فکر کے لئے معین نہیں کئے جا سکتے ۔ باسول نے ڈاکٹر جانسن کے سوانح حیات لکھے، لاک ہارٹ نے اسکاٹ کی سوانح عمری تصنیف کی، رابرٹ ساوِدی نے نلسن کی زندگی لکھی ...... یہ سب سوانح نگاری کے بے حد کامیاب نمونے

سمجھے جاتے ہیں لیکن آج کے سوانح نگار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان نمونوں کے جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل حیثیت رکھتے ہیں پیروی کرے۔ آرٹ یا ادب کا کوئی بنا بنایا ضابطہ نہیں ہوتا بے ساختگی، اپج اور تخلیقی قوت کی بنا پر ہر ادبی کارنامہ اپنا مقام آپ پیدا کرلیتا ہے بات یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں ترقی کی راہیں مسدود نہیں ہوگئی ہیں اسی میں سوانح نگار سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے کہ وہ ایسے قدم ترقی بڑھائے بغیر قدیم نمونوں کی وفا شعارانہ پیروی کرے گا۔ ایسا کرنے سے ایک طرف اگر اس کے آرٹ کے ترقی پسند رجحانات کو ٹھیس لگتی ہے تو دوسری طرف ہمارا اجتماعی شعور، طرز کی یکسانی سے اکتانے لگتا ہے اور سوانح عمری کی اثر انگیزی اس سے متاثر ہوتی ہے۔

زندہ شخصیتوں کی سوانح حیات مرتب کرنے کا رجحان آج کل بہت عام ہو چلا ہے اور ایسی سوانح عمریاں بہت مقبول ثابت ہو رہی ہیں تاہم اس کی مقبولیت کا راز سوانح نگاری کے فن اور خوبی سے زیادہ شخصی عظمتوں میں پنہاں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان شخصیتوں کی زندگی کے ہنگامہ پرور دور کے گذر جانے کے بعد ان کی سوانح حیات میں مستقبل کے لئے کوئی کشش باقی نہ رہے سوانح نگار کی ادبی اور فنی خام کاری ہے ہر اہم تخلیقی ادبی کارنامے کی طرح اچھی سوانح عمری وقت اور زمانے کی قید سے آزاد رہتی ہے۔ سوانح نگاری کے مشہور معلم اور نقاد سڈنی لی کے نزدیک سوانح حیات کا مکمل ہونا اس کی کامیابی کے لئے اہم ترین شرط ہے چونکہ موت کے بغیر کوئی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی اس لئے زندہ شخصیتوں کی سوانح بھی اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہتی ہے جب تک ان کی زندگی اور کارناموں پر تکمیل کی مہر نہ لگادے۔

ڈاکٹر جانسن نے کسی موقع پر کہا تھا کہ خود نوشتہ سوانح عمری یا آپ بیتی سے بہتر کوئی سوانح نہیں ہو سکتی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس رائے سے کاملاً اتفاق کیا جاسکے لیکن بعض خاص ضرورتوں میں اس رائے کی صحت تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے بہت کم مصنفین ایسے ہوں گے جو آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنے جذبۂ پندار و خودنمائی کو دبا سکیں لیکن کہیں کہیں ان آپ بیتیوں میں کچھ ایسے تاثرات اور جذبات ہوتے ہیں جن کا ظاہر کرنا شاید کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہوسکتی انگلستان کے مشہور مصنف ایچ جی ویلز نے ابھی ابھی ایک خود نوشتہ سوانح عمری شائع کی ہے اس میں ہم کو بعض ایسے دلچسپ اور جذباتی تاثر سے بھرے ہوئے موقعے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے جس وقت اپنی رائے قائم کی ہوگی اس وقت شاید اس کے ذہن میں کچھ اس طرح کی سوانح عمری کا خاکہ ہوگا۔

ویلز نے جس تاثر اور جذبہ کے تحت یہ آپ بیتی لکھی ہے اس کا اندازہ اس کے پہلے باب کی ابتدائی سطروں سے ہوسکتا ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے "وہ دن بیت گئے وہ گھڑیاں گذر گئیں جب میں زندگی کے ہر مظہر کو دلچسپ اور انوکھے انداز سے دیکھتا تھا آج میں ان بیتے ہوئے دنوں پر نظر ڈالتا ہوں تو دل میں پھر سے کچھ نئی امنگیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں"۔ یہی احساس زندگی ہے جس نے ویلز کی سوانح عمری کو ایک غیر فانی کارنامہ بنا دیا ہے۔

میں نے دو چار انگریزی کی مشہور سوانح عمریوں کا ابھی ذکر کیا ہے ان کے خصوصیات اور ان کے طرز پر گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے تاہم باسول کی لکھی ہوئی جانسن کی

زندگی کا ذکر کرنا سوانح نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے ناگزیر ہو جاتا ہے
بعض ناقدین اس مشہور سوانح عمری کو اس اندھی عقیدت کا
نتیجہ سمجھتے ہیں جو باسول کو جانسن کی ذات سے تھی لیکن
حقیقت یہ ہے کہ خواہ یہ سوانح عمری اندھی عقیدت کا نتیجہ
ہو یا نہ ہو اس میں کچھ ایسی جاذبیت ہے کہ ہر دور میں اور
ہر زمانہ میں اس کی مقبولیت اور دلچسپی مسلّم رہی ہے اگر یہ
عقیدت مندی کا ہی نتیجہ ہے تو شاید یہ کہنا پڑے گا کہ
باسول سے پہلے کسی سوانح نگار نے اپنے جذبۂ عقیدت کا
اس سے بہتر طرز اور پیرایہ میں استعمال نہیں کیا تھا۔

اُردو میں سوانح نگاری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے
شبلیؔ اور حالیؔ کو چھوڑ کر بہت کم ادیبوں نے اس اہم صنفِ
ادب کو مشکور کیا ہے شبلیؔ کی سوانح عمریوں میں تاریخی پہلو
بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے گو کہیں کہیں ان کے لطیف اسلوب
بیان اور پاکیزہ طرز انشا سے ان کی سوانح عمریوں میں بڑی
قوت اور زندگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی پڑھنے
والے پر اس کا اثر ہوتا ہے کہ اس نے کسی زندگی کی تاریخ
کا مطالعہ کیا ہے زندگی کا احساس ان سوانح عمریوں میں
پوری قوت کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ الفاروق اور سیرت النبی
شبلی کی سوانح نگاری کا شہکار سمجھے جا سکتے کہیں کہیں تو
ان کتابوں کو پڑھنے والا شبلی کے پیدا کردہ ماحول میں
جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالیؔ نے بھی سوانح نگاری کی
طرف توجہ کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے
سوانح عمریوں کے بعض نہایت کامیاب نمونے چھوڑے
ہیں۔ اُردو کے انشا پردازوں میں حالیؔ اپنے غیر جذباتی
اور سنجیدہ طرز کے لئے مشہور ہیں اس کے باوجود حیاتِ جاوید
اور یادگار غالبؔ میں جذباتی تاثر کی بہت سی مثالیں
موجود ہیں۔ النذیرؔ افتخار عالم مارہروی کی تصنیف ہے اور
بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے اُردو زبان کی اچھی سوانح
عمریوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

کسی زندگی کا ایک باب یا ایک پہلو بعض اوقات مکمل
سوانح سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے فرحت اللہ بیگ کا
مضمون ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی
زبانی اور عبدالماجد دریا بادی کا مضمون مرزا رسوا اپنی
نوعیت کے اعتبار سے مکمل سوانح عمریوں سے زیادہ دلچسپ
واقعاتی اور اثر انگیز ہیں۔

ان قلیل قدر کارناموں کے ہوتے ہوئے بھی یہ
کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی ادب کے اعتبار سے ابھی ہماری
زبان بہت تہی مایہ ہے زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی
کی راہیں بالکل مسدود نہیں ہو گئی ہیں ترقی کرنے کا گُر یہی
ہے کہ گذشتہ کارناموں کی روشنی میں آئندہ کی راہیں
تلاش کی جائیں یہی وہ سبق ہے جو ہم کو سوانح نگاری کے
مقاصد سے ملتا ہے۔ اِسی پر کاربند ہو کر ہم اپنے لئے
ذہنی مسرت اور سرشاری کے لازوال خزانے اپنے
لئے مہیا کر سکتے ہیں۔

عمر مہاجر

اپنے قائد سے!

مبارک اپنی قوم کی قیادت اے خجستہ خو	ہر ایک کے خیال میں لبا ہوا ہے تو ہی تو
تری نظر سے جلوہ گر مُدبّرانہ جُستجو	ترے اثر سے بہرہ ور مُفکّرانہ آرزو

فلاحِ قوم کے سوا تری کچھ آرزو نہیں
جو منفعل ہو قوم سے وہ تیری جستجو نہیں

محبتِ وطن کی مے پلا کے سب کو مست کر	وفا پرست جو نہیں انھیں وفا پرست کر
مطابق اپنی رائے کے وطن کا بند و بست کر	موافقوں کو ساتھ لے مخالفوں کو پست کر

یگانگت جتائے جا تو اپنے حال و قال کی
بلندیاں دکھائے جا اسی طرح خیال کی

تجھی سے پُوری قوم کی لگی ہوئی ہے آج لَو	کہ رہبر انقلاب کی ترے خیال کی ہے ضَو
اُدھر بہا کے لے چلے یہ تیری قائدانہ رَو	جدھر تجلیاں کرے "حیاتِ تازہ" نو بہ نَو

نظر فروز وسعتیں ہوں عرصۂ حیات کی
ضرورت آج قوم کو ہے تیرے التفات کی

ہر ایک دل میں جوشِ زن حیات کی اُمنگ کر	بنا غیور قوم کو' لحاظ نام و ننگ کر
اصابت اپنی رائے کی دکھا' عدو کو دنگ کر	بوقت صُلح صُلح کر بوقت جنگ جنگ کر

وہ کام کر جو مقتضٰی ہے فطرتِ بلند کا
سوال اب نہیں رہا پسند و ناپسند کا

علی منظور

وہم

ایک رومانی شام کو میں سیدھا سادا لباس زیب تن کئے، تفریحی دھن میں، خفیف سی تبدیلی کے ساتھ اقبال مرحوم کا مصرع "حسن نسوانی ہے بجلی میری فطرت کے لئے" گنگناتا ہوا آبادی کے ایک گنجان حصہ میں چلا جارہا تھا۔ دفعتاً میری نظر انگریزی وضع کے ایک بنگلے کی کشادہ کھڑکی میں رکی۔ ایک دوشیزہ حسن و شباب کی مکمل تصویر، بیٹھی، البیلے انداز سے اپنے بکھرے گیسو سنوار رہی تھی اِس بے پناہ جلوۂ حسن نے مجھ پر عالم محویت طاری کردیا۔ کوئی دو منٹ بعد، آس پاس دیکھ، راہروؤں کی نظریں بچا کھڑکی کے قریب، ایک مخفی مگر "کھڑکی نما" کنج میں کھڑا ہوکر، میں نے اس "حسین منظر" پر اپنی نظریں جمادیں۔ ادھر وہ اپنی دھن میں محو آرائش تھی اور ادھر میں نے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اس کے حسن کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ اتصال نگاہ پر کچھ مرعوب سا ہوا مگر پھر سنبھل کر موقع کو غنیمت جان ٹکٹکی لگادی۔ اس نے بھی کچھ دیر، پلکوں کو جنبش دئے بغیر، اپنی نگاہوں سے مجھ پر بجلیاں گرائیں، پھر دو منٹ کی غیر حاضری کے بعد کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال، میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پیسہ پھینکا۔ میری غیور و خود دار طبیعت نے اس بے عزتی کا تحمل نہ کیا۔ جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال یہ جملہ "دام کا نہیں پریم کا بھکاری" لکھا اور پیسہ پر لپیٹ دھاگا باندھ، تیزی سے کھڑکی میں پھینکا۔ اس نے جملہ کو پڑھ کر مسکراتے ہوئے اندر کی راہ لی، کامل ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد بصد مایوسی "دل ہمارا لے کے رخصت ہوگئیں" گنگناتا ہوا گھر لوٹا کرسی پر دراز ہوکر خیالات کی رو میں بہ گیا۔

اس...... کی مسکراہٹ ضرور...... کیا واقعی میرے پریم بھرے جملہ نے اس کے دل میں بھی......؟ نہیں...... تو پھر مسکرانا......؟...... حقارت...... تو پھر آثار خفگی کا عدم وجود......؟ شاید پہلی ہی نظر میں میری اس جسارت پر اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیل گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کھڑکی میں رہ کر میری اس "ناشائستہ" حرکت کا...... ائیں!...... جواب کیوں دینے چلی جب کہ میرے "پریم کی بھیک" نے اس کے دل پر...... ٹھیک بالکل درست! اور یہی تاثر مسکراہٹ کی صورت میں نمودار ہوا اچھا تو اس نے غائب ہوکر پھر نمودار ہونے کا نام کیوں نہ لیا؟...... تو پھر وہ معشوق ہی کیا ہوا...... بصد کرب و اضطرار وقت کٹا دوسرے دن سرِ شام اپنے خیال کا تائیدی یا تردیدی جواب حاصل کرنے کے عزم مصمم سے نکلا۔ الحمد اللہ وہ کھڑکی میں بدستور موجود تھی نظریں دوچار ہوئی ہی تھیں کہ بجلی کی سی تیزی سے غائب ہوگئی۔ میں نے سابقہ "محفوظ جائے پناہ" پر استادہ ہوکر، مشغلۂ بیکاری کے طور پر بار بار کھڑکی کی تیلیاں شمار کرنی شروع کردیں کوئی پانچ منٹ بعد، میری پڑوسن، کریم بی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو سیدھا ہوکر منہ سے سیٹی بجاتا ہوا متانت سے پوچھا "کریم بی! تم کدھر؟" اس نے کہا "میاں! میں سامنے کے بنگلے میں ملازم ہوں، چھوٹی بیگم صاحب نے یہ چٹھی تمہیں دینے کو کہا ہے" چٹھی دی اور چلتی بنی۔ میں نے نظر اٹھائی کھڑکی خالی تھی۔ پھر امید و بیم کی حالت میں چٹھی کو پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:-

پریم کی بھیک، معشوقوں کی طرف سے
"جوتیوں" کی شکل میں تقسیم کی جاتی ہے اگر
سر کھجلا رہا ہو تو بسم اللہ، ہم بھی تیار ہیں"

ایں! "جوتیاں"؟ ایک تھرا تو دنگاہ کھڑکی کی طرف دوڑائی قہقہہ...

یا وحشت! دل بانسوں اچھلنے لگا۔ جوشِ غضب نے حواس مختل کردیئے۔ غیر ارادی طور پر غیظ آمود آواز میں میری زبان سے نکلا "مگر یاد رہے! بھیک کی نوعیت پر بھکاری کی دعا یا بددعا کا انحصار ہے" بھڑکے ہوئے دل کو سنبھالتا اور اپنے مکردہ اقدام پر کڑھتا ہوا گھر پہنچا۔ محبت گئی بھاڑ میں۔ جذبات نفرت نے دل میں ڈیرے ڈالے، طبیعت پر ظلم کرکے اس "جگر خراش واقعہ" کو صفحہ دل سے محو کردیا۔

کوئی دو ہفتے بعد ایک دن جب میں بیٹھک میں مصروفِ مطالعہ تھا، کریم بی گھبرائی ہوئی داخل ہوئی اور گفتگو میں مجھ سے سبقت کرتے ہوئے پریشان لہجہ میں بولی "رضیہ بی بی سخت علیل ہیں" میں نے گھبرا کر پوچھا "کون رضیہ؟" اس نے کہا "وہی جنھوں نے آج سے کچھ دن پہلے میرے ذریعے آپ پاس چٹھی روانہ کی تھی" مٹھیاں بھینچتے ہوئے میں نے دل میں کہا رضیہ۔ ناہنجار رضیہ .... تو اِس سے مطلب؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ فکر کے آثار چہرہ سے دور کرکے سنجیدگی سے کہا۔ "تو اس سے مجھے کیا غرض؟" کہنے لگی "میں کیا جانوں، بی بی کے حکم سے آپ کو خبر دینے آئی ہوں، بخار جنبش نہیں کھلا ہے ڈاکٹر عاجز آگئے ہیں"۔

یا للعجب! وہ .... اور مجھے اپنی علالت کی خبر دے؟ تعجب ہے! دل ہی دل میں سوچ کر "ہو نہ ہو یہ میری زبان سے نکلے ہوئے لفظ بددعا کا ہی اثر ہے۔ اونھ، عورت کی ذات بھی کس قدر وہمی ہے"۔ جذبات نفرت پر محبت غالب آنے لگی۔ میں نے کچھ غور کے بعد کہا "ان کے کان میں آہستہ سے کہہ دو کہ بھکاری کی دعا اُن کے ساتھ ہے"

کریم بی کی زبانی معلوم ہوا کہ دوسرے ہی دن بخار اتر گیا تھا۔ واہ رے اعتقاد۔

کچھ دن بعد رضیہ نے کریم بی کے ذریعہ مجھے طلب کیا۔ میں نے اپنی شان خود داری نباھنے کی خاطر، حقارت آمیز انداز میں وہاں جانے سے انکار کردیا۔ دوسرے ہی دن یہ چٹھی پہونچی:۔

"........ آپ کے انکار سے مجھے قلبی صدمہ پہنچا۔ میں آپ کی دعا کی برکت سے اچھی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے مزاحیہ جملے نے آپ کو بددعا پر آمادہ کیا، اُف! مرد بھی کیسے جلد باز اور انتقام پسند ہوتے ہیں۔ آپ کو میری قسم آج شب کے آٹھ بجے ضرور ہمارے خانہ باغ میں تشریف لائیے۔ کیونکہ آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے"　　رضیہ

آخر "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" بھر آیا اور میں آواز ضمیر کی مخالفت کرتا ہوا معینہ وقت پر "حسن کی سرکار" میں پہنچا۔ رضیہ نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا، مگر مجھے محوِ سکوت پاکر اس کے نازک چہرہ پر فکر کے آثار نمایاں ہوگئے۔ کچھ سوچ کر، متبسم لب وا کئے اور "جوتیوں" والا جملہ واپس لیتے ہوئے صفائی چاہی۔ میں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کو معاف کردیا۔

بہت دیر تک ہم دونوں میں دلچسپ موضوعوں پر گفتگو رہی۔ دورانِ گفتگو میں اس نے لطیف اور غیر محسوس انداز میں مجھ سے نفرت کا تو نہیں مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور بپایان کار گھبراتی ہوئی کہنے لگی "ایک بات عرض کروں اگر خاطر شکنی نہ ہو" گفتگو ہی سے تاڑ گیا تھا مگر اس جملہ پر مجھے یقین کُلّی ہوگیا کہ یہ ضرور میری محبت کو ٹھکرائے گی۔ خیر مستقبل اللہ کے ہاتھ دل کو مضبوط کرکے میں نے کہا "بھلا آپ جیسی عقلمند میری خاطر شکنی کیوں کرنے چلیں، ہاں ہاں فرمائیے

سنتری

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ فرانس اور جرمنی کے دریا برف سے منجمد ہو گئے تھے۔ برف باری کے خوف سے لوگ مکان سے باہر قدم رکھتے ہچکچاتے تھے۔ غریب مزدور پیٹ بھرنے کی خاطر نکلتے اور کام کرتے کرتے برف کی طرح سرد پڑ جاتے۔

ایسے خوفناک موسم میں ایک نوجوان سنتری پہرہ پر کھڑا اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ کڑاکے کے جاڑے ہیں اس کے اعضا مفلوج ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن وہ بت بنا کھڑا رہا۔

جب اس کی محبوبہ کو اس کا علم ہوا تو وہ بے تابانہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ڈیرے کی مدھم روشنی میں سنتری کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ تاریکی میں آنے والے کو سنتری نے پہچان لیا۔ اور منہ موڑ کر ٹہلنے لگا۔ کہ شاید وہ اس سے واقف ہو جائے اور منت سماجت کرکے اسے اپنے فرائض سے غافل کر دے۔

آتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی۔ اور اس کو گرمانے کے لئے اپنی نازک ہتھیلیوں سے اس کا چہرہ رگڑنے لگی اور بے ساختہ بوسوں سے اس کو پریشان کر دیا۔

لڑکی نے اس سے منت کی کہ صرف تھوڑی دیر کے لئے اس کے گھر چل کر کچھ کھا پی لے۔ مگر سنتری نے انکار کر دیا۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑی اور گڑگڑا کر التجا کرنے لگی۔

”صرف چند لمحوں کے لئے چلے جاؤ۔ اپنی لوسی کی خاطر“

”میں مجبور ہوں پیاری میں یہاں سے ایک انچ بھی ہٹ نہیں سکتا“

”اگر تم نہیں مانتے تو میں بھی یہیں کھڑی رہتی ہوں“

”لیکن تم نازک ہو اور میں قوی“ ”میں نے جی کڑا کر لیا ہے“

”ہٹ نہ کرو۔ فرض سے ہٹنا موت کو بلانا ہے۔ ایک سپاہی کے لئے سب سے بڑی بدنامی!“

”میں بھی تمھارے ساتھ ٹھنڈی ہو جاؤں گی“

خیمے کی روشنی ٹمٹما کر خاموش ہو گئی۔ یکّے دکّے تارے جو چمک رہے تھے وہ بھی کُہر میں چھپ گئے۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اور اس کے تھپیڑوں سے نازک لڑکی ڈگمگانے لگی۔ ادھر سپاہی گرا ہی چاہتا تھا۔ لڑکی کے دل میں یکایک جوش پیدا ہوا۔ اس نے اس کے بٹن کھول کر وردی اتاری، بندوق ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے اس کو جھنجوڑتے ہوئے کہا ”سیدھے گھر چلے جاؤ۔ میں تمھاری جگہ کھڑی رہتی ہوں“ اور اس نے وردی پہن لی۔ اور لبادا اور ٹوپ اوڑھ لیا، وہ چلا گیا اور یہ اپنی فتح پر اس قدر نازاں تھی کہ موسم کی تلخی کو بھول گئی۔

اتفاقاً ایک افسر جیبی برقی روشنی ڈالتا ہوا ادھر سے گزرا۔ لڑکی نے سلامی نہیں دی۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ افسر اس کے پاس آیا۔ اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی لڑکی اس قدر مرعوب ہو گئی تھی کہ اس کو کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اور اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔

وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آتش دان کے پاس بٹھا دیا۔ جب اس کا خوف کم ہو گیا تو اس نے رکتے رکتے تمام واقعہ بیان کر دیا۔

علی الصبح سپاہی کو طلب کیا گیا۔ لیکن وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے اسے ڈاکٹر کے پاس رجوع کر دیا گیا۔

چوتھے روز جب اسے سزائے موت سنائی گئی تو اس صدمے سے اس کی محبوبہ کا سینہ پھٹ گیا لیکن اس نے

عزم کرلیا کہ ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی کوشش کرے گی ورنہ جان دیدے گی۔

وہ پریشان حال سب افسروں سے ملی۔ اور کمانڈر کے قدموں پر گر کر اس کی جان بخشی کی التجا کرنے لگی۔ سب اسے جانتے تھے۔ اس کے بین پر کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کا دل نہ بھر آیا ہو۔ افسروں کی بیویوں نے بھی سفارش کی۔

بالآخر اس نے دلوں کو موم کردیا۔ اور اس کا محبوب اسے مل گیا۔

شبیر حسین قیس

کیفیات

مرے دلِ پُرمحن کی دھڑکن عجیب نغمہ سنا رہی ہے
سُنو کہ اس سازِ زندگی سے صدا ترنم کی آرہی ہے

عجب زمانہ تھا بے دلی کا دلِ حزیں تو غضب ہی نکلا
میں جس تمنا پہ ہنس رہا تھا وہی مجھے اب رلا رہی ہے

جسے سمجھتا تھا دل کی دھڑکن وہی ہے مضرابِ ساز ہستی
وہ ساز جس پر تری محبت ترانۂ شوق گا رہی ہے

ہمارے نالوں کے جوش میں بھی ہے اک سکونِ خوشی کا عالم
بھنور کے دامن میں کشتیٔ غم قریب ساحل کے آرہی ہے

وہ اک مرا بدنصیب دل تھا ہوا نہ جو آج تک شگفتہ
نہیں تو گلزارِ آرزو میں کلی کلی مسکرا رہی ہے

مرے دلِ مضطرب سے شعلے اگر نکلتے ہیں کیا تعجب
کہ اس کے برقِ نظر کی گرمی کمال اپنا دکھا رہی ہے

عجیب مشکل کا سامنا ہے کروں گا کس طرح عرضِ مطلب
مری تمنا ہزاروں شکلیں بنا بنا کر مٹا رہی ہے

وہ غنچۂ آرزو ہمارا جو کب کا مرجھا چکا تھا ہادیؔ
نسیمِ امیدِ کامرانی اسی کو اب پھر کھلا رہی ہے

ہادیؔ مچھلی شہری

ترقی پسند ادب

انسان زبان کے ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو خدائے قادر نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ اسی سے انسانوں اور حیوانوں میں فرق و امتیاز ہوتا ہے رفتہ رفتہ انسان نے وہ چیز ایجاد کی جسے ہم تحریر کہتے ہیں۔ تحریر کی ایجاد ظاہر ہے کہ تمدن کی ضرورتوں کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ یہ ایجاد انسانی تہذیب کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ منفعت بخش ایجاد ہے۔ تحریر ہی کے ذریعہ سے حکمائے قدیم اور عقلائے عالم کے خیالات ہم تک پہنچے ہیں۔ اور اسی سے ہمارا ترقی پسند دور آنے والے دوروں کے لئے ایک شمع ہدایت ہوگا جس کی روشنی میں وہ اپنی اور ہماری حالتوں کا موازنہ کریں گے۔ جیسا کہ آج ہم اپنی اور عہدِ سلف کی حالتوں کا موازنہ کرتے ہیں۔

ادب کیا ہے

قومیں جوں جوں ترقی کرتی ہیں ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور تہذیب و تمدن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی مختلف پہلوؤں میں تقسیم ہوجاتی ہے بعض طبائع جو زیادہ نازک زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہیں اور جن میں غور و خوض کا مادہ خاص طور پر زیادہ ہوتا ہے وہ اپنی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو ظاہر کردینا شروع کردیتی ہیں کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسان کے مشاہدے اور تجربے میں کچھ چیزیں محفوظ رہ جاتی ہیں یا فطرت ان کو ایسی قوت ودیعت کرتی ہے کہ ان میں ان مشاہدوں اور تجربوں کے محفوظ کرنے کی صلاحیت اوروں سے زیادہ ہوتی ہے یہ گروہ جب اپنے خیالات، محسوسات، تجربات اور مشاہدات عمدہ پیرایہ میں بیان کرتا ہے تو اس کو فن لطیف کہتے ہیں جس کا دوسرا نام ادب ہے۔

ارتقائے ادب

دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ پر ایک خاص حالت میں نہیں رہتی۔ تغیر اور تبدیلی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پیدائش، نمو، بلوغ، شباب، شیب اور فنا ہر چیز کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ زمین و آسمان کے لئے بھی جب کہ ہر چیز کی فطرت کا یہی تقاضہ ہے تو پھر خیالات و محسوسات تجربات و مشاہدات کے اثرات بھی مختلف دور زندگی میں مختلف ہوں گے۔ خود بیان کرنے والوں کے لئے بھی اور اس بیان کے سننے والوں کے لئے بھی۔ ادب پرتو ہے کسی قوم کے رجحانات کا اور جوں جوں ان رجحانات میں تغیر ہوتا جائے گا ادب میں بھی تغیر ہوتا چلا جائے گا' اذہان قومی کی سطح ایک دور میں قریب قریب یکساں رہتی ہے اس لئے اس ہر دور کا ادب بھی یکسانیت لئے ہوئے ہوتا ہے ایک جملے سے ایک مصرعہ سے تصویر کے ایک ہلکے سے عکس سے یا کسی بت کی تراش سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کس دور کی پیداوار ہے۔ مثال کے طور پر ہم اردو ادب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اردو کا بالکل ابتدائی دور دیکھئے۔ اس کے بعد دکنی دور پر نظر ڈالئے۔ خصوصاً ولی اور سراج کے کارناموں پر غور کیجئے اس کے بعد دہلی میں شعر و سخن کے چرچوں کو دیکھئے۔ لکھنوی دورِ ادب پر نظر ڈالئے۔ میر اور سودا کی کوششیں مشکور ہوتی ہوئی دیکھئے۔ ذوق، مومن اور غالب کے جلسوں میں شرکت کیجئے اور ان سب کے بعد موجودہ دور کا مطالعہ کیجئے صاف نظر آجائے گا کہ اردو ادب نے کیونکر بتدریج ارتقا حاصل کیا ہے اور صدیوں کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کے بعد کیونکر وہ اب اس درجہ پر پہنچا ہے جس پر کہ وہ آج ہے۔

رجحاناتِ ادبی

ادب میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا ادب قومی رجحانات کا تابع ہے یا وہ قومی رجحانات کو اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ اس مسئلہ میں

اختلاف ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ادب اس وقت تک مقبول نہیں ہوسکتا اور زندہ رہ سکتا ہے جب تک وہ فوری رجحانات کا ساتھ نہ دے اور بعض کے نزدیک وہ ادب ادب ہی نہیں جس کو مقبول ہونے کے لئے قوم کی خوشامد کرنی پڑے۔ ان کے نزدیک ادب کا کام یہ ہے کہ وہ قومی رجحانات کی رہبری کرے۔ اگر اس میں کوئی نقص اور خامی ہو تو اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر پستی ہو تو رفعت بخشے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ادب کا زیادہ حصہ تابع ہوتا ہے قوم کے رجحانات کے اور ایسا ادب جو رجحانات و خواہشات کا تابع نہیں ہوتا، بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس زمانے میں نہ وہ مقبول ہوتا ہے نہ مطبوع۔ یہ ممکن ہے کہ کسی آئندہ دور میں وہ سرسبز ہو جائے۔

دنیا کی تاریخ انقلاب میں یہ عجیب بات ہے کہ انقلاب سے سالہا سال پہلے ایسے مصور، شاعر، مصنف اور فلسفی پیدا ہوئے جنھوں نے آنے والے انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا۔ بلکہ اگر نگاہ عمیق سے دیکھا جائے تو اصلی انقلاب تو یہی لوگ کر چکے تھے بعد میں لوگ انھیں کے تاثرات سے متاثر ہوئے اور سیاسی و ادبی دنیا میں جو انقلابات ہوئے وہ دراصل نتیجہ تھے انھیں ذہنی انقلابات کے جو یہ لوگ قوم کے دماغوں میں پہلے سے پیدا کر گئے تھے۔

ترقی پسند ادب

عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہے کہ صدیوں کی قائم شدہ روایات سے بغاوت کی جائے۔ اس کی ابتدا فرانس سے ہوئی۔ جہاں سب سے پہلے تخت سے بغاوت کی گئی۔ اس کے بعد مذہب سے۔ مذہب سے بغاوت کا سبب یہ ہوا کہ کلیسا نے شہنشاہیت کی پشت پناہی کی۔ کلیسا کا قبضہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ والٹیر نے پادریوں کا اس قدر مذاق اڑایا کہ مذہبی لوگوں کی عزت و توقیر دلوں سے جاتی رہی۔ روسو نے انقلاب کا پیغام فرانس کو اور تمام دنیا کو دیا۔ اس کے بعد فرانس کے شاعر نے "رسائی" والی نظم لکھی جس نے فرانس کے گوشے گوشے میں آگ لگا دی۔ لوگ جوق جوق انقلابی فوج میں شریک ہوگئے جمہوریہ فرانس کے ابتدائی دور میں مذہبیات ایسا کفر تھا جس کی طرف اہل فرانس بھول کر بھی رخ نہیں کرتے تھے۔ رابس پیری کی پوجا، عقل کی دیوی کی پوجا، قوم اور ملک کی پوجا ان کا شعار تھا اور مذہب کی طرف رخ کرنا گناہ۔

فرانس کے انقلاب نے کسی ملک پر ایسا اثر نہیں ڈالا جیسا روس پر۔ ملک استبداد و انانیت کے پنجے میں گرفتار تھا۔ ظلم و ستم کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ امرا اپنے فرائض سے بے خبر غریبوں کی گاڑھی محنت کی کمائی پر عیش و عشرت کرتے تھے۔ آخر کار وہاں بھی بغاوت ہوئی۔ ٹالسٹائی اور دیگر انقلاب پسند ادیبوں نے ناول ڈراما اور مختصر افسانہ نویسی کے ذریعہ عوام کو بغاوت اور انقلاب پر آمادہ کیا۔ غریبوں کی زندگی کا مطالعہ کرکے ان کی تصویریں دنیا کے سامنے پیش کیں۔ امیروں کی کھوکھلی زندگی کی ہیبتناک تصویریں منظر عام پر لائی گئیں جس نے حکومت کرنے والی ذات کا رعب ختم کردیا ٹالسٹائی سے لے کر گورکی تک اکثر مصنفین نے یہ کام انجام دیا۔

مختصر افسانہ نویسی اور اس نئے آرٹ کا شہرہ تمام دنیا میں ہوگیا اور مظلوم قوموں نے بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوشش شروع کردی۔ اپنی قوم کو بیدار کرتے نیز ان کے دماغوں میں انقلاب کا بیج بونے کے لئے افسانے اور نظمیں لکھی جانے لگیں۔ فرانس کی طرح روس میں بھی کلیسا نے تخت کی حمایت کی چنانچہ شہنشاہیت کے خلاف انقلاب، پادریوں کی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے کلیسا کے خلاف بھی انقلاب بن گیا۔

چنانچہ مذہبی لوگوں کا مذاق اڑانا اور ان پر پھبتیاں کسنا انقلاب اور ترقی پسندی کا جزو لازمی بن گیا۔

ترقی پسند ادب ہندستان میں

روس کے انقلاب کی دھوم اور ترقی پسند ادب کی اہم طاقت کے چرچے ہندستان میں بھی پہنچے یہاں ایک جماعت ایسی موجود تھی جو حکومت کے خلاف لوگوں کو آمادہ کرنا اپنا نصب العین سمجھتی تھی۔ ہمارے ملک میں جو ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی وہ زیادہ تر کانگریس یا کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے کانگریس کے ایک حصے پر اشتراکی رنگ جس طرح حاوی ہوتا چلا جارہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اشتراکیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات روس کی پیروی کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں روس میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انقلاب صرف تخت کے خلاف نہیں ہوا بلکہ کلیسا کے خلاف بھی۔ اس کی تقلید میں ہمارا ہر ترقی پسند ادیب مذہب سے خفا ہے اور اس کا مذاق اڑا کر اپنے ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ مثال کے طور پر "انگارے" کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ میری رائے سے متفق ہو جائیں گے۔

کیا ترقی پسند ادب کی بقا ممکن ہے؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آسان نہیں۔ دنیا کا بڑا حصہ اپنے ہر قسم کے عقائد میں پختہ ہوا کرتا ہے اور اپنی زندگی میں "بدعت" کو راہ دینے سے حتی الامکان گریز کرتا ہے۔ اس چیز کو دیکھتے ہوئے کم از کم ہندوستان میں تو امید نہیں کہ ترقی پسند ادب سرسبز ہو۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بغاوت در اصل بغاوت ہے بھی یا ہم نے ارتقائی ادب کا نام ترقی پسند ادب رکھ لیا ہے۔ انسان تہذیب و تمدن، ادبیات مذہب غرض ہر شئے میں بتدریج ترقی کرتے کرتے اس درجے پر پہنچا ہے کیا کوئی چیز اصل سے جدا ہو کر قایم اور زندہ رہ سکتی ہے؟ چنانچہ اب یہ صورت قایم رہ سکتی ہے یا نہیں۔ دنیا کے لئے اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا یا برا یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا حل کبھی نہ کبھی ہوگا ضرور لیکن ابھی نہیں !!!

بڑا خطرہ

ترقی پسند ادب کو بقائے دوام حاصل ہو یا نہ ہو لیکن فی الوقت تو یہ چیز ہمیں بڑے خطرے سے آگاہ کرتی ہے۔ مذہب کو سیاسی میدان میں لا کر پارٹی بازیوں کی کشاکش میں ڈالنا خطرناک ہے۔ ہمارے علماء اگر ایک سیاسی جماعت کی موافقت کریں گے تو دوسری جماعت جب کبھی برسر اقتدار ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے حریفوں ہی کو نہیں بلکہ علماء کو بھی اور ان کے مذہب کو بھی کچلنے کی کوشش کرے گی۔ یہ کوئی خیالی اور فرضی خطرہ نہیں۔ بلکہ فرانس، روس اور مختلف ممالک کے انقلاب کی تاریخ ہماری اس رائے کی شاہد ہے۔

بلقیس بانو

اردو فاضل (ادارہ ادبیات اردو)

مددگار مدرسہ فوقانیہ نسواں۔ نامپلی

عظمت اللہ خاں مرحوم

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے ؎ یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

عظمت اللہ خاں مرحوم میرے عزیز بھی تھے۔ اور عزیز دوست بھی۔ مگر میری اور اُن کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا میں قدامت پسند ہوں۔ اور وہ زمانے سے دو قدم آگے رہنا چاہتے تھے۔ میں پرانے شاعروں کو اپنی تحریروں سے زندہ کرنا چاہتا ہوں اور انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "شاعری" ہے اِس سرے سے اُس سرے تک سارے اُردو کے شاعروں کو دنیائے شاعری سے بارہ پتھر باہر کر دیا ہے۔ میں لکیر کا فقیر ہوں اور وہ جدت پسند تھے۔ اور جدت پسند بھی ایسے کہ باوجود اس تن و توش اور مضبوط قویٰ کے مرے بھی تو کس مرض میں، کہ "دق" میں۔

لکھنے کا انھیں ہمیشہ سے شوق تھا۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ لکھتے کس وقت تھے۔ کیونکہ اُن کے پاس لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ایک ہے کہ اپنا مضمون سنا رہا ہے۔ دوسرا ہے کہ شعر پڑھ رہا ہے.... یہ آرام کرسی پر بیٹھے واہ واہ اور سبحان اللہ سے اس کا دل بڑھا رہے ہیں۔ اور اسی واہ واہ اور سبحان اللہ میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جس سے مضمون میں اصلاح بھی ہو جائے۔ اور پڑھنے والے کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ اس پر اعتراض کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس مقام میں وہ رہتے تھے وہاں رہ کر انسان لکھنا پڑھنا تو درکنار جی بھی کیسے سکتا ہے۔ مکان کیا تھا، خاصہ اچھا قفس تھا۔ اول تو صحن ہی چھوٹا تھا، اس پر گملوں کی بھرمار نے اس کو اور بھی تنگ کر دیا تھا ...... دروازے میں گھستے ہی داہنے ہاتھ کی طرف ایک پتلا سا برآمدہ اور بہت ہی پتلا سا کمرہ تھا، کمرے کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں کے نیچے ہی موری تھی اور سڑک کے دوسرے طرف شراب خانہ، میونسپل کمیٹی کی موری کی تعریف میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ایک طرف موری کی خوشگوار بُو اور دوسری طرف شراب کے بھبکے، اس کمرہ میں بیٹھنا بس عظمت اللہ خاں ہی جیسے شخص کا کام تھا۔ اور کوئی دوسرا ہوتا تو گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا، یہ انہی کے قویٰ تھے کہ کئی بار اس مصیبت کو برداشت کر گئے۔ لیکن آخر کہاں تک، دق ہو گئی، اور مر گئے۔

وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ کوئی اِن کے ہاں بیٹھا تو انھوں نے کتاب الٹ میز پر رکھ دی اور اس سے باتیں کرنے لگے، وہ گیا اور انھوں نے کتاب اٹھائی۔ ہاں لکھتے ہوئے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا، پھر بھی انھوں نے اتنا لکھا ہے کہ چھپنے پر ان کے مضامین کی شاید دو جلدیں ہو جائیں اُن کو قطعاً شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں تھا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ اُردو شاعری کا جو رنگ پڑ گیا ہے اس کو بالکل نیا جامہ پہنا دیا جائے اِس لئے انھوں نے نہ صرف ہندی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی شاعری کا مطالعہ بھی بڑی گہری نظر سے کیا۔ انگریزی مضمون کے ترجمے کئے، ہندی پنگل کو سائنٹیفک اصول پر ڈھالا اور ان کی محنت کا نتیجہ اب "سریلے بول" کی شکل میں آپ کے سامنے آرہا ہے، اِن کی زندگی ہی میں لوگوں نے اس نئے راستے پر چلنا شروع کر دیا تھا، اور اب یہ رنگ ذرا ابتر ہو رہا ہے۔ اگر اس رنگ میں لکھنے والا کوئی میر یا مرزا پیدا ہو گیا تو یقین جانئے کہ پرانا رنگ مدھم پڑ جائے گا اور گل و بلبل کی بجائے اُردو کے باغ میں آم پر کوئل کوکنے لگے گی۔

عظمت اللہ خاں کے مرنے کے بعد ہی ایک مضمون "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اسی کی چند سطریں

یہاں دیتا ہوں، اس سے اُن کی تحریر اور اُن کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔

مطالعہ کے شوق نے اُن کی معلومات کو وسعت دی۔ اُن کی تحریر میں قوت پیدا کی، اُن کے قلم میں زور دکھایا، یہی مطالعہ تھا جس سے اُن کو مختلف زبانوں کی طرز تحریر سے باخبر کیا۔ مختلف خیالات سے آگاہ کیا، اور بالآخر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے طریقے پر شروع کیا جس میں انگریزی کی متانت، فرانسیسی کی خوشی، فارسی کی ظرافت اور ہندی کے درد کی جھلک تھی۔ وہ کسی تاریخ دہلی میں پیدا ہوئے تو ہوئے ہوں انھوں نے اجمیر کالج میں کبھی بہ حیثیت طالب علم نام پیدا کیا ہو تو کیا ہو، انھوں نے انگریزی میں (ESSAY) لکھنے میں سونے کا تمغہ پایا ہو تو پایا ہو، مگر صرف دو تاریخیں ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گی، ایک وہ تاریخ جس روز انھوں نے اُردو ادب پر قلم اٹھایا اور دوسری وہ تاریخ جب دستِ قضا نے اُن کے ہاتھ سے قلم چھین کر ان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

اس وقت "سُریلے بول" آپ کے سامنے ہے، اس میں پہلا مضمون "شاعری" پر ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ اُردو شاعری کیا ہے اور اس کو کیا ہونا چاہیے، انھوں نے شاعری کی بہترین تعریف سمجھی ہے کہ "شاعری تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا ہے" اور اس کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو چیز موجود ہو مگر سامنے نہ ہو اس کو لفظوں میں اس طرح دکھایا جائے کہ اصل صورت سامنے آجائے، دوسری یہ کہ جو چیز موجود نہ ہو اس کو ایک تخیلی پیکر اس طرح دیا جائے کہ ہر پڑھنے والے کے سامنے ایک ایسی تصویر کھچ جائے کہ وہ اس کو اصلی سمجھنے لگے، اسی پر بحث کر کے انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تخیلی پیکر اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک نظم مسلسل نہ ہو، اور اسی بنا پر انھوں نے کہا ہے کہ ....

میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ میری اور مرحوم کی طبیعت میں اختلاف ہے میں اُردو شاعری کو اتنا ناقص نہیں سمجھتا جتنا وہ سمجھتے ہیں، اور شاعری کے لئے نظم کے مسلسل ہونے کو لازم نہیں جانتا' اردو شاعری میں "حیات انسانی کا تجربہ" تو نہیں ہے لیکن اس میں انسانی احساسات کے نقشے بدرجۂ اتم موجود ہیں اور "سو سنار کی اور ایک لوہار کی" والی مثل کی طرح اس کا ایک شعر اکثر نظم مسلسل کے سو شعر پر بھاری پڑتا ہے، مثلاً غالب کا یہ شعر لیجئے ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر کو پڑھ کر جو واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں ان کو اگر نظم مسلسل میں ادا کیا جائے، تو یقین مانئے خاک اثر نہ رہے کیا انسانی طبیعت کی الجھن عبدالرحمن خاں احسان کے اس شعر سے بہتر کسی نظم مسلسل میں اس اثر کے ساتھ ظاہر کی جا سکتی ہے، لکھتا ہے ؎

دیکھیو میری طرف سچ کہیو اے اختر شناس
کیوں فلک کو تو نے دیکھا میرے اختر دیکھ کر

یہی وجہ ہے کہ اُردو کے بہت سے اشعار زبان زد خلائق ہو گئے، اور ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ ان کو بے تکلف پڑھتا اور لطف اٹھاتا ہے۔ اگر وہ رنج میں ہے تو یہ شعر اس کے رنج میں ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں، اگر وہ خوشی میں ہے تو یہ شعر اس کی خوشی کو دوبالا کر دیتے ہیں، مرحوم نے ہندی شاعری کی تقلید پر زور دیا ہے مگر ہندی کی کوئی نظم مسلسل ایسی موثر نہیں ہے جیسے اس کے "دوہے" وجہ یہ ہے کہ نظم مسلسل کا

لطف باغوں میں آرام کرسی پر لیٹ کر فرصت سے پڑھنے میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں اردو رائج ہے وہاں والوں کو یہ آرام کہاں نصیب ہے، یہ تو ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے چاہتے ہیں۔ (خواہ وہ نثر میں ہوں یا نظم میں) جن کو بآسانی یاد کر لیا جا سکے، جن کو چلتے پھرتے پڑھا جا سکے، اور جن سے انسانی احساسات کی مردہ قوتوں کو جگایا جا سکے۔

لیکن باوجود اس کے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اب تک نظم مسلسل کی ہمارے ادب میں کمی ضرور تھی جو، اب ایک حد تک پوری ہو رہی ہے۔

اسی شاعری کے مضمون میں مرحوم نے علم عروض سے بھی بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ کس طرح بحروں کے پھندوں سے نکال کر ایک سائنٹیفک اصول پر لایا جا سکتا ہے، ہندی پنگل پر سب سے بہتر کتاب قدر بلگرامی مرحوم نے لکھی ہے میں نے اس کو بھی دیکھا ہے۔ علم عروض کی بھی کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور انگریزی کی "پروسیڈی" کو بھی کالج والوں نے میرے دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے، ان سب کے پڑھنے پڑھانے کے بعد میری وہ رائے قائم ہوئی ہے جو پانچ چھ سو سال قبل مولانا روم قایم کر چکے تھے۔

شعر می گویم بہ از آب حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

یعنی یہ کہ جب تک آدمی "کن رس" نہ ہو اس وقت تک یہ پنگل اور عروض سب بیکار ہیں، اندھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ بہرا شاعر نہیں ہو سکتا اور انسان کی طبیعت کو بحروں سے یا کسی سائنٹیفک پیمانہ سے محدود نہیں کیا جا سکتا، استاد ذوق کا واقعہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ انھوں نے ایک غزل ایسی کہی تھی جو کسی بحر میں نہیں آتی تھی، لوگوں نے اعتراض کیا جواب دیا گیا کہ یہ ایک نئی بحر سہی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس بحر کا اضافہ علم عروض میں ہو گیا، بہر حال میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کے لئے علم عروض یا پنگل کی گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ذوق سخن ایک ایسا پیمانہ ہے جو اِن تمام پابندیوں سے بالاتر ہے، پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عظمت اللہ خاں مرحوم نے جو طریقہ اشعار کے جانچنے کا قائم کیا ہے وہ ایک بہت آسان طریقہ ہے، اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اوزان کی کوئی حد بندی نہیں رہی ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی نظموں میں عملاً بتلا دیا ہے کہ یہ طریقہ کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے، یہ ضرور ہے کہ جو کوئی اِن نظموں کو پہلے پہل پڑھے گا اس کا دل شروع میں اچاٹ رہے گا لیکن ایک آدھ دور کے بعد اس کو اِن نظموں میں مزا آنے لگے گا، کیونکہ ہر نظم اصلیت پر مبنی ہے اور دلی جوش کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "کل جدید لذیذ"

اس کتاب میں آپ بعض ایسی نظمیں بھی دیکھیں گے جو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس ترجمے میں روانی ایسی ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ سبب یہ ہے کہ مرحوم نے اِن نظموں میں مکھی پر مکھی نہیں ماری ہے بلکہ جہاں ان کو اپنے ملک کے خیالات کے لحاظ سے تبدیلی کی ضرورت ہوئی وہاں بلا تکلف تبدیلی کر دی اول تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہی ایک مشکل کام ہے اور پھر نظم کو جوں کا توں نظم میں تبدیل کرنا ایک ناممکن سا کام ہے، ایسی صورت میں بہتر طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان نظم کا ترجمہ نظم میں کرتے وقت زیادہ زور مضمون اور مضمون کی اسپرٹ پر دیا جائے۔ تاکہ اس نظم کے اصلی خیالات

اور تشبیہات ترجمہ میں آجائیں اور اس کے ترجمے کو لفظی ترجمہ نہ کہا جاسکے۔

بہرحال اب اس کی ضرورت ہے کہ ان لوگوں کو جنھیں شاعری سے واقعی لگاؤ ہے، اس جدید رنگ کو اختیار کرنے میں "لومتہ لائم" کی پروا نہ کرکے اور اس دُھن میں لگ کر کہ ہم کو یہ جدید رنگ اردو ادب میں داخل کرنا ہے، پوری کوشش کرنی چاہیے اگر یہ رنگ اصلی ہے تو پختہ ہو کر ہمیشہ کے لئے قایم ہو جائے گا، اگر نقلی ہے تو چند دنوں کے بعد خود بخود مٹ جائے گا خود ان لوگوں کا نام دنیا میں قایم رہے گا، اردو ادب کا پھیلاؤ بڑھے گا، اور ساتھ ہی ساتھ عظمت اللہ خاں مرحوم کا نام زندہ ہو جائے گا، جنھوں نے اپنی ساری عمر اس جدید رنگ سے لوگوں کو روشناس کرنے میں صرف کردی۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضایع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

فرحت اللہ بیگ

رقص

جس طرح انگڑائیاں لیتی ہے شاعر کی امنگ
جس طرح بجتے ہیں کالی بدلیوں میں جل ترنگ

جس طرح دل پر اثر کرتا ہے لحنِ آبشار
جس طرح دل میں اتر جاتا ہے پھولوں کا نکھار

جس طرح ٹھنڈی ہوا سے گرم ہو جاتا ہے دِل
کیفیاتِ درد میں جس طرح کھو جاتا ہے دل

جلوہ آرا جس طرح ہوتی ہے گلشن میں بہار
خواب سے جس طرح چونکاتی ہیں بوندوں کی پھوار

جس طرح چھنتی ہے کالی بدلیوں سے چاندنی
فصلِ گل میں جس طرح ہوتی ہے رخشاں زندگی

یونہی دِل میں رقص سے ہوتے ہیں زندہ ولولے
رُوح میں تحلیل ہو جاتے ہیں شیریں زمزمے

رقص جب کرتا ہے کوئی دلبرِ شیریں صفات
بے تکلف رقص کرتی ہے یہ ساری کائنات

جھومتے ہیں نخل، گرمِ رقص ہوتی ہے صبا
مُسکراتے ہیں گلستاں، وجد کرتی ہے فضا

چاند کے سینے میں جو شوق ہوتی ہے رواں
رقص سے معمور ہو جاتا ہے تاروں کا جہاں!

رقص کے جادو سے یوں معمور ہوتی ہے فضا
وسعتِ دل کیا، بساطِ ذرۂ ناچیز کیا

مسکراتی ہے زمیں سے تا بہ گردوں زندگی
نبضِ ہستی میں نظر آتی ہے جنبش رقص کی

تحسین سروری

فیضی کے منشآت

مشاہیر حکما، میں، حکیم مصری، حکیم عماد الدین محمود اور کمال الدین حسین وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ حکیم مصری کے متعلق اُس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"دریں دیار نام حکیم مصری بسیار است و کارنامہ ہائے علاج او بے شمار الحق بایں دانائی و دقیقہ رسی و تشخیص امراض......... امروز طبیبے بمثل او نشاں نمی دہند۔"

حکیم عماد الدین محمود کے متعلق سرسری طور پر درج ہے کہ مدت ہوی کہ یہ مشہد میں انتقال کر گیا ہے۔ دوسرے طبیب حکیم کمال الدین حسین تھے، جن کو خان احمد گیلانی نے عراق سے طلب کیا تھا، اور ان سے "قانونِ شیخ" پڑھا تھا۔ گزشتہ سال ہی یہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

حکیم ابوالفتح کے متعلق یہ اظہار خیال کرتا ہے کہ:۔

"شاگرد رشید حکیم عماد الدین محمود بود، غریب دریافتے و رسائی در ہمہ چیز داشت طبیبے یک گوشۂ فضائلِ او بود، نادرۂ زماں بود"

آگے چل کر لکھتا ہے کہ:۔

"حکیم ہمام استاذ دیدہ است و اجازت نامہ ہائے اوستادان دارو بہ بندہ نمودہ بود کہ از علم و عمل ادا قتعا عمل و فضلِ او بسیار نوشتہ۔ والحق جنیس ست و غریب فطرتِ عالی دارد۔ نظر حضرت کیمیا وی وجود و کمال بخشِ مستعداں است۔ خوش صاحب استعداد کہ آئینۂ فطرتِ او بجاکِ ایں آستاں انجلا یابد۔"

لکھا ہے کہ نظام الملک (والئی احمد نگر) کے دربار میں دو مشہور و معروف طبیب ہیں، ایک حکیم کاشی، جو مدت سے یہاں ہے، اور اپنے آپ کو گمنام کر رکھا ہے، شاید اس کو حکیم مصری پہچانتا ہو، اور دوسرا حکیم علی گیلانی، جو کہ شیراز سے ہندوستان آیا ہے۔ بقیہ ہندی اطبا، میں معمولی ہندو ہیں، جن میں سے کوئی بھی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ علی گیلانی، حکیم فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ ایک زمانہ سے اس فتح اللہ شیرازی کی بڑی شہرت سنی جاتی ہے، سنا کہ سال گزشتہ اس کو عادل بیگ نے چالیس تومان بھیج کر شیراز سے طلب کیا تھا، اور اب وہ ٹھٹہ میں ہے۔ اگر خانِ خاناں کے نام فرمان صادر فرمایا جائے کہ اس کو درگاہِ والا میں بھیجے تو اس بے چارے باکمال کی سرفرازی کا باعث ہوگا، اور وہاں سے شیراز کا رستہ بھی قریب ہے۔

اس کے بعد دو عرضداشتیں ہیں، جو احمد نگر سے ۶ اخور داد اور ۱۰ آبان ماہ الٰہی کو لکھی گئیں، لیکن سنہ درج نہیں۔

تیسری میں لکھا ہے کہ یکایک فرمان ملنے پر فدوی حسب الحکم روانہ ہوا، اور ۹ جمادی الاولیٰ کو برہان پور پہنچا تو لوگ تعجب کرنے لگے کہ ۵۲ کوس کس طرح ایک ہی منزل میں طے ہو گئے۔

ان عرائض کے ختم ہونے کے بعد کتاب کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے، چونکہ ابواب "لطائف" سے تعبیر کئے گئے ہیں، اس لئے یہ "لطیفۂ دوم" ہے، جس میں شرفا، علما، اور عرفا، کی مراسلت کے مکتوبات شامل کئے گئے ہیں۔

پہلے تین خطوط مولینا معین الدین محمد الہاشمی کے نام ہیں، جو عربی میں درج ہیں، چوتھا جوان ہی کے نام فارسی میں لکھا گیا ہے، اس میں تحریر ہے کہ خود اس نے ۹۸۸ھ

ہیں علوم دین کے متعلق ایک غیر منقوط کتاب لکھی ہے، اس اطلاع کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت میں اس کو ملاحظہ کے لئے بھیجنا بھی ہے۔
ذیل کا اقتباس اس اجمال پر تفصیل کے لئے پیش ہے۔

"آں کہ در سنہ خمس وثمانین وتسعمائۃ، کتابے غیر منقوط، بہ علوم دین مربوط، تالیف نمودہ، موشح بنام ہمایوں انتظام، حضرت ظل اللٰہی خلد اقبالہ بہ نظر خورشید اثر در آوردہ، بہ عربستان (کہ تجلی اسم متکلم درآں ولایت بہ مثابہ ایست کہ پایۂ فصاحت و بلاغت بہ معراج اعجاز رسیدہ) ارسال داشتہ بود، وبہ نشان .... صِل وبخل تہل ......
صناوید عرب واساطین ادب ممتاز داشتہ۔"

"چوں آں حقایق پناہ را توجہ خاص بابیاضے کہ اشعار تازہ فقیر دارد، بہ توقیع ترویج، ذترویج بہ مجلس عالی (لازال مجمعا الافاضل والاہالی) مرسل داشت۔ امید کہ بہ انظار قدسیہ منظور گردد وازبصائر شموس نظایر، پروانہ نوریابد۔ والسلام علیکم اولاً وآخراً۔"

اس کے بعد ایک ایسا خط درج ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے عصر سے، کسی نے اس کی مزاج پرسی کی ہے، تو اس کا جواب ایک پرلطف لطیفہ کے ذریعہ دیتا ہے، کہتا ہے کہ:۔

"سخن ہماں است کہ از یکے پرسیدند کہ چونی ــــ؟
گفت، چناں کہ می دارند
گفت ــــ چوں می دارند؟
گفت ــــ چوں می خواہند

زیادہ بریں چہ نویسد، وازحالات ایشاں چہ پرسد۔
الحمد للہ علیٰ کل حال، والسلام فی المبداو والمآل۔"

اس لطیفہ کے اختتام پر، مولوی شیخ جمال اللہ نامی ایک بزرگ سے مراسلت کرتا ہے۔ جس میں عضدالدولہ (غالباً شاہ فتح اللہ شیرازی) کی تاریخ وفات ۲ر شوال سنہ ... آخر روز لکھتے ہوئے بڑے ہی افسوس کا اظہار کیا ہے، لیکن سنہ ہی درج نہیں۔

اس خط کے بعد ملا ظہوری کے نام ایک محبت نامہ لکھا گیا ہے، جو عجیب وغریب ہے، اس سے بہت سے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اور صاحبان کمال کی قدر دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظہوری کو خطاب کرتا ہے کہ میں تمھاری آتش فراق میں جل رہا ہوں، لیکن تمھیں کچھ احساس بھی نہیں۔ انتہائی صداقت اور خلوص سے کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت تمھیں بے حد یاد فرماتے ہیں، اور آج کل عزیمت شاہانہ بھی پورے پورے طور پر دکن فتح کرنے کی طرف مائل ہے، تم خط تو پہلے ہی سے بہت کم لکھتے ہو، اور جب جواب دیتے ہو، تو بڑی دیر سے ملتا ہے، تمھاری ان ہی باتوں پر تو دل خون ہوتا ہے۔ خط لکھنا کس قدر آسان کام ہے، پھر تم کس لئے اس معاملہ میں بخل سے کام لیتے ہو۔

فیضی کے اس خط کو پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کو اپنے فضل وکمال پر گھمنڈ اور غرور ہونے کے باوجود اس نے ظہوری سے اس طرح عاجزانہ مراسلت کس طرح روا رکھی۔ یا ظہوری کے دربار اکبری میں حاضر ہونے میں کوئی خاص سیاسی مصلحتیں وابستہ تھیں، یا اس کے فضل وکمال کا اس وقت اس قدر رعب بیٹھا ہوا تھا۔

ظہوری کے نام ۱۴ر محرم سنہ ۹۹۲ھ کا مکتوبہ ایک اور خط ہے۔

جس میں وہ اشعار لکھ بھیجے ہیں جو اس نے شہزادۂ سلیم (جہانگیر) کے عقد کے موقع پر کہے تھے، جس کے ہر مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے۔

"زہے عقدِ دُر پاش سلطان سلیم" "کہ بر تو دہد سال امید را"
"ز پرورونِ آن آبِ دول" "قرانی شدہ ماہ و ناہید را"

۹۹۳ ۹۹۳ ۹۹۳ ۹۹۳

وحید الدین میر شاہ میرزا می کوئی بزرگ ہیں، انھیں لکھا ہے کہ اس سے پہلے میں نے ایک غیر منقوط رسالہ جو بادشاہ کے نام سے لکھا ہے، اسے آپ کی خدمت میں بھی بھیجا تھا، شاید آپ کے مدرسہ میں اس پر درس ہوتا ہوگا۔

اس کے بعد کا خط ایک نامعلوم صاحب کے نام ہے جنھیں اپنی کتابیں تحفتہً بھیجی ہیں، لیکن ان کے نام نہیں لکھے۔

مشہور دبیر، منشی ملا عبداللطیف (برہان پوری) کو لکھتا ہے کہ اس عاجز کو آج کل طبی کتابوں کا بڑا شوق ہے، آپ کی ولایت میں جو اہلِ کمال کا منبع و ملجا ہے اگر طب کی نایاب کتابیں دست یاب ہو سکتی ہوں تو مجھ پر کرم فرما کے میرے لئے خرید لیا کیجیے۔ میں نے آنے جانے والوں سے سنا ہے کہ شہر احمد نگر میں معمولی اور بے کار کتابیں بھی بڑی قیمت میں فروخت ہوتی ہیں، وہاں سے بھی آپ اپنے مذاق اور انتخاب سے، جس قیمت پر بھی ہو، کتابیں خرید کر بھیجیے، قیمت کے معاملات میں تکلف کی ضرورت نہیں۔

حسبِ ارشاد جو دیوان کہ حال ہی میں مرتب اور صاف ہوا ہے، عجلت اور ضرورت کی وجہ سے بغیر کسی مقابلہ کے روانہ کر دیا جاتا ہے۔

ملک محمود کے بعد، کمال الدین حسین خطاط شیرازی کو لکھتا ہے کہ، مولانا عبدالقادر سے معلوم ہوا کہ آپ عمارات اور مزاروں کی مرمت کی خاطر آگرہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، لاہور کی سیر کے بعد ضرور اُدھر تشریف لے جائیے۔ کیونکہ اُن عمارتوں پر آپ کی توجہ کی سخت ضرورت ہے یہ خط رجب ۹۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد کے خط میں شیخ جمیل الدین پور شیخ جلال ساکن کالپی کو مخاطب کرتا ہے، اور بڑی منت و سماجت کے ساتھ، ان سے تشریف آوری کی درخواست کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے حال ہی میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ کو اپنی "بے نقط تفسیر" مکمل کر لی ہے، جو صاحبانِ فضل کو حیران کر دے گی۔ اس کے خاتمہ پر (۹۹) فقروں میں جو عبارت لکھی ہے، وہ مقاصد کو حاصل ہونے کے سوا، تبارک و تعالیٰ کے اسماء حسنہ پر مشتمل ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر فقرہ سے تفسیر کا سالِ اختتام بھی معلوم ہوتا ہے۔ حال ہی میں عراق سے میر حیدر معمائی ایک فاضل یہاں آیا ہے، اتفاق کی بات ہے، یا تائیدِ غیبی سمجھئے کہ اس نے بھی پورے سورۂ اخلاص سے تفسیر کا سالِ اتمام حاصل کیا ہے۔ بے شک یہ اتفاقات کچھ الہاماتِ غیبی ہی پر دلالت کرتے ہیں۔

اس کے بعد کا خط بھی موصوف ہی کے نام ہے۔ جس میں مندرج ہے کہ، میں نے سنا ہے کہ آپ آگرہ تشریف لا چکے ہیں، اور پھر بعد کو معلوم ہوا کہ نہیں وطنِ مالوف تشریف لے جا چکے ہیں۔ آج کل موسم اچھا ہے، اگر لاہور تشریف لے آئیے گا تو بہتر ہے۔

ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ میں جو تفسیر مکمل ہوئی تھی، وہ اسی سال صاف بھی ہو گئی ہے، اعلیٰ حضرت نے خاص طور پر ایک خمسہ کہنے کی فرمائش کی ہے، اور "افسانۂ نل دمن" کو جو کہ ہندوستان کے مشہور عاشق و معشوق ہیں، پہلی مرتبہ مجھے نظم کرنے کے لئے

حکم صادر فرمایا ہے کہ، جو بحر کہ عمدہ ہوگی، نظم کی جائے گی۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ:۔

"چوں بحور اربعہ "خمسہ" تقسیم یافتہ، ایں را در زمین لیلیٰ مجنوں گفتن لایق دید، بموجب اشارۂ عالی کہ آں چہ گفتہ شود، ماہ بماہ بعرض اقدس رسد۔ در عرض چہار ماہ، ہزار بیت گفتہ شد، معدودے ماندہ۔ دریں دو روز، خاتمہ گفتہ می شود۔ امید کہ پسند دوستاں افتد۔ دیگر سوانح آں کہ، بموجب اشارتے کہ از غیب روئے نمود۔ "فیاضی" تخلص کردہ می شود۔ بہر دو تخلص اگر نفسے چند باقی باشد، شعر گفتہ خواہد شد

اسامی کتب خمسہ ایں است:۔

اول:۔ "مرکز ادوار" (کہ اکثرے در تسبیح بود) گفتہ شدہ بود

دوم:۔ "سلیمان و بلقیس" پیش ازیں بہ ہفت سال، در لاہور بنیاد کردہ بود۔

چیزے چند ازاں گفتہ۔

سوم:۔ "نل دمن" کہ تمام شد۔

چہارم:۔ "ہفت کشور" کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، و آں در زمین ہفت پیکر خواہد بود۔

پنجم:۔ "اکبر نامہ" آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود، چوں سخن پیش آمدہ، بتازگی گفتہ خواہد شد۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

"دیگر دریں شہر ہنگامۂ شعر بسیار گرم، طبائع را ابلائے دیگر است، فقیر خود ترک صحبت ہا کردہ، خلوت گزیں است، بہر حال بیابید کہ بزودی مسرور و محظوظ خواہند رفت، دیگر چہ گوید والدعا"

مکرمی نویسید کہ رنجہ قدم فرمایند، دریغ داشتہ و خیال مستغاث گرامی راہ نہ دہند۔ العبد الاقل فیضی"

موصوف الصدر کے نام ایک اور خط لکھنے کے بعد، دوسرے میں حاجی شیخ عبدالحق کو بھی اپنی تفسیر کے بارے میں لکھتا ہے، اور ان سے بھی اس کو ملاحظہ فرمانے کی استدعا کی ہے۔ ان کے نام اور پانچ خط ہیں، جن میں کوئی بات قابل ذکر نہیں۔

اس کے بعد کے خط میں "مولانا" برادر نقبائے شیرازی سے مراسلت کی ہے۔ مولانا غوثی کے نام دو خط درج ہیں، پہلے میں لکھا ہے، میری تفسیر کے آغاز کی تاریخ سید محمد شامی نے (جو احمد نگر میں ایک بزرگ تھے)

لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین

سے استخراج کی تھی۔

دوسرا خط قلعہ تمورت سے ۱۰ رمضان کا لکھا ہوا ہے" سنہ درج نہیں، ایک نظم احمد آباد (گجرات) کی حسن شکایت میں لکھی ہے، کہتا ہے۔

منم کہ کشتۂ گجراتیانِ بیدادم — خراب کردۂ خوبانِ احمد آبادم

سہی قدے ز سر ناز جلوۂ نہ نمود — کہ ہم چو سرو بدنبالِ او بیفتادم

بہ ہر طرف کہ خرامید، سرو آزادی — غلام او شدم، و خطِ بندگی دادم

چو رشک گلشن فردوس، احمد آباد است — از و بہ باد، بروئم کنند چوں آدم

بروں نرفتن از آں جا تصور آمحال — چرا بروں نہ روم، من ہم آدمی زادم

بہ حسن مردم گجرات یاد نیست و لے — نمی روند جوانانِ دہلی از یادم

حدیث عشق تو فیضی کہ نقل مستاں ست — بہ بزم جرعہ کشیے دہلوی فرستادم

اسی ضمن میں لکھتا ہے کہ میں نے اس سفر کے حالات ایک مثنوی کی صورت میں لکھے ہیں، جب صاف ہو جائیں گے، تو ضرور ارسال خدمت کروں گا۔ نمونتہً ۲۱ شعر نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ مولانا غزالی نے آدھی رات کے وقت احمد آباد میں، ساتویں رجب کو انتقال فرمایا، اور سرکھیج میں

مدفون ہوئے۔ یہیں نے بھی ان کی تاریخ وفات یہ لکھی ہے۔

چوں غزالی مشہدی بہ جہاں　　بود از شاعران نام فریب
سال تاریخ فوت آں، زاں بود　　می شود "شاعر عوام فریب" ۹۹۰

شیخ حسن کالپی کے نام تین خط لکھے ہیں، پہلے میں شیخ صاحب کو کہا ہے کہ آپ آتے ہوئے کتاب "مقاصد الشعرا" لیتے آئیے کیوں کہ تذکرہ (؟) کا انصرام اسی کتاب پر موقوف ہے، اور دوسری کتابیں بھی جو حاصل ہو سکتی ہوں، ساتھ لے آئیے۔

دوسرے خط میں کوئی اہمیت نہیں، البتہ تیسرے میں لکھا ہے کہ "طبقات ناصری" کے لئے آپ نے جو خط لکھا ہے وہ میرے پاس اجمیر بھیجا گیا تھا، چونکہ میں وہاں نہیں تھا، اس لئے اب یہاں آیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ نے کتاب مانگی ہے اور مشاغل کی کثرت کی وجہ سے یاد بھی نہ تھا کہ یہ کتاب میرے پاس ہے، اپنی صاحب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گزشتہ سال میرے بھائی شیخ ابو الفضل یہاں آئے تھے، اور وہ اس کتاب کو لے گئے ہیں ان کے اس یاد دلانے پر مجھے بھی خیال آیا۔ خیر آپ کسی وقت میاں ابو الخیر کو بھیج دیجئے کہ وہ آکر بھائی صاحب کی کتابوں سے اس کو تلاش کر کے نکال لیں۔ بھائی کی کچھ کتابیں تو آگرہ میں پڑی ہیں اور کچھ ان کی حویلی میں۔ اس لئے سب ایک جگہ نہیں، متفرق ہیں، جب وہ گھر آئے تھے تو عجلت میں "طبقات" کو ان کے حوالہ کر دیا تھا، لیکن آج تک واپس نہ ملی۔ جب آپ کی وجہ سے اس کتاب کی ضرورت پڑی تو یہ یاد آئی، اس یاد سے میں کچھ مضطرب سا ہو گیا ہوں، اگرچہ کتاب ضایع نہ ہوئی ہو گی، مگر ضرورت کے وقت جب نہ ہو تو اس کا نہ ہونا، فوت ہو جانے کے مماثل ہے، انشاء اللہ فقیر بعد میں بھیج دے گا۔

اس کے بعد یہ ایک شستہ فقرہ لکھا ہے، اس سے آپ جو چاہیں مطلب نکال لیجئے۔

مجموعۂ کہنہ راحق و ملک خود، دانستہ، در فرستادن آں
بسیار صعب نمودہ، ملازماں ازاں دست بشویند کہ ایں
مقدار تصرف جائز است۔"

اس باب کے آخر پر دس خط اور ہیں، جن میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جو معرض بیان میں لائی جائے۔

تیسرے باب، یعنی "لطیفہ سوم" میں، حکما، معاصر وغیرہ کے نام کل چھ خطوط ہیں۔ صفحہ (۷۰) پر ۱۳ر شوال سنہ شنبہ کو جو خط حکیم عین الملک کے نام ہے، اس میں لکھا ہے کہ نواب وحید الزمانی علامۃ العلما شاہ فتح اللہ نے کشمیر میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ اعلیٰ حضرت اس طرف تقریباً ۲۰ کوس آچکے تھے، یہ خبر سنی تو نہایت افسوس فرمایا۔

۱۹ر شوال پنجشنبہ کی رات میں حکیم ابو الفتح نے بھی انتقال کیا تو حکم شاہی ہوا کہ ان کو مقام "حسن ابدال" میں سپرد خاک کیا جائے۔ اس سانحہ سے اعلیٰ حضرت کو انتہائی رنج ہوا، اور بے اختیار آنسو بھر آئے۔

"لطیفۂ چہارم" میں امرائے عظام، اور احبائے کرام کے موسومہ خطوط ہیں۔ پہلا خط راجہ علی خاں مرزبان خاندیس کے نام ہے، جس میں لکھا ہے کہ:

"بموجب استدعا، می نماید کہ از کتاب تعلق نامہ کہ از
انفاس مقدسۂ امیر خسرو است، چند ورق از اول
وچندے از آخر رفتہ التفات فرمودہ، دو جزو از اول
وہمیں قدر از آخر بہ یکے از خدمت گاراں امر فرمایند
کہ بہ خطے مسودہ بہ جہتہ بندہ مصحوب حاملان عریضہ
بفرستید۔"

اس کے بعد مرزا عبد الرحیم خان خاناں کے موسومہ تین خط نقل کئے

گئے ہیں، دوسرے خط میں لکھا ہے کہ یہ فقیر بادشاہ کے حکم کی بناء پر فرمانِ شاہی کو لیکر ولایتِ دکن پہنچا، اور سید عبدالقادر عیدروسیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، جو بڑے زبردست اور باکمال بزرگ ہیں۔

اس باب کے چھٹے خط میں جو میر محمد معصوم بکری کے نام ہے، لکھا ہے کہ برادرِ علامی (ابوالفضل) سخت علیل تھے، اور زندگی سے مایوسی ہوچکی تھی، تو عین اس موقع پر حکیم مصری یہاں ایک عطیۂ الٰہی کی طرح پہنچے، اکثر حکمار کے غلط معالجہ اور سہو کی وجہ سے ڈھائی مہینے تک سخت علالت رہی، پھر بھی مرض کی تشخیص نہ ہوسکی تھی، بالآخر حکیم مصری نے ایسا علاج کیا کہ مزاج صحت کی طرف مائل ہوگیا اور خدا نے فضل فرمایا۔

زیرِ نظر کتاب کا آخری باب "جو لطیفۂ پنجم" سے موسوم ہے اس میں اس کی انشاء پردازی کے نمونوں کے علاوہ " والد بزرگوار دا خوانِ خلت آثار، و اقارب و اعارف" کے نام مشتمل ہیں۔

پہلا خط اپنے والد "مبارک" کو لکھا ہے، دوسرے میں ابوالفضل کو خطاب کرتا ہے کہ

"دو ایک دن میں نقلِ مکان ہوجائے گا، فقیر کی کتابوں میں، کتاب مصیبت نامہ شیخ عطار ہے، اسے مطالعہ فرمائیے۔ سیورہ نامی ایک شخص ہندوی زبان کی ایک کتاب لے آیا تھا، اس کو ہیبت خاں کے پاس بھیج دیا، تو انھوں نے خرید لی، اور کہتے تھے کہ بڑی اچھی کتاب ہے۔"

۱۴ ربیع الثانی دوشنبہ کو ایک اور خط ابوالفضل کے نام لکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ

"آپ نے کتاب ظہور الانوار کے جمع کرنے کے متعلق جو فرمایا ہے، وہ مبارک ارشاد ہے۔ فقیر نے فتح پور میں ایک رسالہ جمع کیا تھا، جس میں بارہ ابواب تھے لیکن افسوس کہ یہ حوادثِ روزگار سے تاراج ہوگیا، کیا لکھوں بڑا تعجب ہے کہ لاہور پہنچنے تک ایک مصرعہ بھی مجھ سے موزوں نہ ہوسکا۔"

دو خط اور ہیں، آخر کے خط میں بھائی کو لکھا ہے کہ، اس نامہ کے حامل مولانا کمال کشمیری ہیں اور جو اخلاص کی وجہ سے آرہے ہیں، ان سے ملاقات فرمائیے۔

سب سے آخر پر، شیخ افضل محمد بن شیخ یوسف قادری اکروی کے نام دو خط ہیں، بعد کے خط میں اپنی تفسیر کے متعلق لکھا ہے کہ

"تفسیر سواطع الالہام کے چار جزو، میاں سدید الدین کے ہمراہ بھیجتا ہوں، اس کو بعض عامی کاتبوں نے اصل مسودہ سے نقل کیا ہے، جس کا پڑھنا مشکل ہے، اگر فرصت ہو تو بیاض سے مقابلہ کرلیجیے، اور بالفعل وسیلۂ یادگار رہنا چاہیے۔"

۳

اس "لطیفۂ فیاضی" کا ایک دوسرا جزو اس کے مرتب حکیم نورالدین عبداللہ عین الملک شیرازی کے منشآت پر مشتمل ہے حکیم صاحب نے اپنے ماموں فیضی کے رقعات کے ساتھ آخر پر اپنے بھی مکتوبات شامل کردیئے ہیں یہ "منظومۂ سیوم" سے موسوم ہے۔ حمد و ثنا کے بعد لکھتا ہے :۔

در عہد شاہ نورالدین جہانگیر | کہ یاد از عدل او عالم منور
فراہم آمدہ رقعاتِ نامی | سواد حرف ہا چوں مشک اذفر
ز تربیتش بجستم سالِ تاریخ | بگفتہ "انشائے نورالدین احمر"

"انشائے نورالدین احمر" سے سنہ (۱۰۲۲) ہجری برآمد ہوتا ہے، اور خود "لطیفۂ فیاضی" سے جو اس پورے مجموعہ کا نام ہے، جیسا کہ ہم نے ابتدا میں لکھ دیا ہے۔ سنہ ۱۰۳۵ ہ نکلتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نورالدین نے فیضی کے رقعات جمع کرنے سے قبل علاحدہ

طور پر اپنے خطوط اکھٹے کرلیئے ہوں، اور اس وقت ہی اپنے مکاتیب کے لیئے یہ تاریخ کہی ہو، اور بعد میں اس مجموعہ میں انھیں بھی شریک کردیا ہو۔

نورالدین نے اس باب کی تمہید کے بعد ایک جگہ اپنا نام اس خط میں جو ڈھاکہ (صوبہ بنگالہ) سے غرہ شعبان ۱۰۳۲ھ کو لکھا گیا تھا، یہ لکھا ہے۔

" نور الدین محمد عبداللہ حکیم عین الملک المسمی بہ شمس الدین علی شیرازی "

اس حصہ کے خطوط میں سنہ اور ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اس لیئے یہ غیر مرتب حالت میں نظر آتے ہیں۔

ایک عرضی جو اسلام جاہ شیخ علاؤ الدین اسلام خاں کے نام ہے، لکھا ہے کہ صوبہ دکن میں لاحاصل محنت کے بعد کہ وہاں کے لشکر کا نفاق، بغض اور ان کی خرابیاں تو آپ پر ظاہر ہیں، بڑے ہی مشکل سے چھٹکارا پاکر نکلا، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے پٹنہ تک آیا تھا کہ یہاں نواب افضل خاں سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے روک لیا ہے، اس لیئے آپ میری طلب میں ایک خط ان کے نام لکھئے۔ یہاں خانِ موصوف کے اعزہ نے بڑی کوشش اور جبر سے اس پریشانی کے عالم میں، میری شادی کرادی ہے۔

ایک خط میں اپنے پدر بزرگوار کو یہ حالات لکھ بھیجے ہیں کہ ۹ ذیحجہ کو میرکی پسر خواجہ جہاں شاہی فرمان کے ساتھ جس میں تقصیرات کی معافی، اور دل جوئی درج ہے، یہاں وارد ہوا ہے۔ فرمان مبارک میں یہ بھی درج ہے کہ شیخ ابوالفضل کی جاگیر سنبل پور، چاند پور وغیرہ تمھیں سرفراز کئے گئے ہیں، اور شالِ خاصہ بطور تبرک روانہ ہے، فوراً حاضر آستانِ عالی ہونے کی عزت حاصل کرو۔ چنانچہ حکم اقدس کی بنا پر نکل رہا ہوں۔ آیندہ کیا حشر ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

۱۶ ربیع الاول غالباً ۱۰۲۰ھ کا ایک خط ہے، جس میں یہ لکھا ہے کہ اوائل صفر میں، میں آگرہ پہنچا، اور ۵ صفر چہارشنبہ کو دربار میں حاضر خدمت اقدس ہوا، لیکن دشمنوں کے کہنے سننے کی وجہ سے اس فدوی کی طرف توجہ نہیں ہوئی، دو دن تک تو سلام کا ہی حکم نہ ملا تیسرے دن طلب فرمایا، اور بڑی سختی سے گفتگو فرمائی، اور غنیمت ہے کہ سلامتی کے ساتھ واپس لوٹنا میسر ہوا۔

اس کے بعد کے خطوط میں کوئی اہمیت نہیں ہے مگر ان لوگوں کے نام لکھ دیئے جاتے ہیں جن کے لیئے یہ تحریر کئے گئے ہیں۔

حکیم حیدر علی ملازم و مصاحب نواب مہابت خاں۔ عموی حکیم عبدالحی۔ عموی حکیم طاہر۔ اکرم خاں پور اسلام خاں چشتی۔ شیخ عبدالصمد المخاطب کرم خاں پور معظم خاں کوکلتاش چشتی فتح پوری۔ افضل خاں۔ مرزا سیف اللہ پور قلیج محمد خاں۔ مرزا اسداللہ۔ موسیٰ خاں چشتی المشہور مور۔ شیخ ابوتراب، مرزا لطف اللہ، حاجی علی بیگ۔

زیر نظر نسخہ کے چھوٹی تقطیع پر (۲۷۰) صفحات ہیں۔

کتب خانہ آصفیہ میں ایک اور ناقص نسخہ " انشائے فیضی " کے نام سے نمبر (۸۰) فن انشائے فارسی پر موجود ہے۔ یہ بہت مختصر اور کم ہے، بہ ظاہر اس ناقص نسخے اور مکمل نسخے میں جس سے یہ مضمون مرتب کیا گیا ہے، کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور معلوم ہوتا ہے۔

اس ناقص نسخہ میں ایک مقام پر یہ عبارت درج ہے۔

"تمت تمام شد این نسخہ کہ .... نسخہ است علی
ید الضعیف اقل العباد الاحد الصمد نور الدین محمد ابن
عبداللہ حکیم ولد حکمت پناہ حکیم عین الملک عفا عنہم ختمت
بالخیر والسعادت ۔ رقم یافت ۱۰ محرم الحرام ۱۱۵۸ھ
روز یکشنبہ من مقام احمد نگر"
اس ناقص نسخے کے (۹۴) صفحے ہیں، اور یہ بھی چھوٹی تقطیع
پر لکھا گیا ہے۔

معین الدین رہبر فاروقی

حیات محمد قلی قطب شاہ

صحیح حالات و واقعات کو بہم پہنچانے کے لئے موصوف نے
بڑی جانکاہی سے کام لیا ہے..... کتاب کے متعلق مزید لکھنا تحصیل
حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کا نام ہی اس کتاب کے ہر طرح مکمل ہونے کی
ضمانت ہے۔ ہندوستان کا گوشہ گوشہ جہاں اردو پڑھی اور
سمجھی جاتی ہے ڈاکٹر صاحب کی اردو کی بے لوث خدمات کا معترف
ہے...... کتاب کئی حیثیتوں سے نہایت دلچسپ ہے۔ ایک شاعر
بادشاہ کی خلوت وجلوت کی داستان، اردو ادب کے ابتدائی
دور کی کہانی، سلطنت گولکنڈہ کی عظمت و شوکت کا فسانہ اردو
ادب و تاریخ سے ذوق رکھنے والے حضرات کو میرے خیال
میں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

کاروان یکم فروری ۱۹۴۱ء

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے عدیم النظیر حیثیت رکھتی
ہے اور انداز بیان میں مورخانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ افسانوی
رنگینی جلوہ گر ہے۔ زور صاحب چونکہ ادبیات کے تاریخی پہلو پر
مورخانہ نظر رکھتے ہیں اس لئے اس تاریخی تصنیف میں بھی ان
کی ادیبانہ ہمہ دانی کا عنصر غالب ہے۔

عالمگیر فروری ۱۹۴۱ء

ڈاکٹر زور اردو کے ان مخلص اور سرگرم کارکنوں میں
سے ہیں جنھوں نے اردو ادب کے دامن کو ادب و شعر اور تاریخ
وسیاست سے مالا مال کر دیا ہے..... متعدد کتابوں کی چھان بین
قلمی اور مطبوعہ تواریخ کا مطالعہ، حیدرآباد کی سیکڑوں عمارتوں،
مقبروں، عاشورخانوں اور کتبوں کی تلاش۔ غرض اس تاریخ کو
قلمبند کرنے کے لئے اور صحیح حالات بہم پہنچانے کے لئے موصوف
نے بڑی جد و جہد کی ہے۔　　**شاعر آگرہ دسمبر ۱۹۴۰ء**

نمود زندگی

یہ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کی ایک سو ایک نظموں
اور غزلوں اور رباعیوں کا دوسرا بیش بہا مجموعہ ہے۔ جناب موصوف
حیدرآباد کے مشہور و معروف اور پختہ مشق شاعر ہیں اردو کا شاید ہی
کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جو آپ کے کلام کی اشاعت سے
محروم رہا ہو..... علی منظور صاحب قدیم و جدید رنگ شاعری
کی معتدلانہ روش پر نہایت استقلال کے ساتھ چل رہے ہیں اور
آپ اس رنگ میں جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں صوفیانہ
جذبات کی سادگی اور مشق سخن کی پختگی آپ کے کلام کی نمایاں
خصوصیات ہیں...... ہمیں امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کا
یہ مبارک تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کریگا۔ **سہیل گیا
جنوری ۱۹۴۱ء**

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ پاکستان اور ہندوستان۔ (تحریک پاکستان کی تشریح) از عبدالقدوس ہاشمی ۲۳۶ صفحات قیمت مجلد عالی پتہ محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد دکن۔

۲۔ واردات (مسلمانوں کی عہد گزشتہ و حاضرہ کی سرگزشت) از سرمست خاں آزاد قیمت ۲ر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

۳۔ فلاح دین و دنیا (اسلامی انسائیکلوپیڈیا) ساتواں ایڈیشن ۶۰۰ صفحات قیمت للعہ خواجہ بکڈپو۔ دہلی۔

۴۔ رہبر اختیاری ریاضی (میٹرک کے گیارہ سال کے پرچوں کا حل) از شاہ حامد صدیقی ۱۵۶ صفحات قیمت عہ دکن بٹن فیاکٹری حسینی علم حیدرآباد دکن۔

۵۔ حیات اویس قرنی (عہد عالمگیر کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ) از منظور حسن رضوی ۱۰۸ صفحات قیمت عہ مہتمم کتب خانہ مطبع رضوی دہلی۔

۶۔ شہید کربلا قرآن کی روشنی میں۔ از ابو مصلح ۲۷۲ صفحات قیمت سے ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید۔ حیدرآباد۔

۷۔ راجپوت گوتیں (راجپوت قوم کی تاریخ) از چودھری محمد افضل خاں ۳۲۰ صفحات قیمت عہ منیجر اخبار مسلم راجپوت لاہور۔

۸۔ خوفناک دنیا حصہ اول و دوم (افریقہ بورنیو وغیرہ کے جنگلوں کے حالات) ۴۹۲ صفحات قیمت عالہ ڈاکٹر سبزواری۔ ڈنٹل کالج چوک آرہ۔ صوبہ بہار۔

۹۔ یاران میکدہ (مختلف لوگوں کے کردار مزاحیہ انداز میں) از عبدالشکور ۱۵۰ صفحات۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

۱۰۔ ٹروٹسکی کا بیان (خود نوشت سوانح) مترجمہ ایم۔ ایم جوہر ۱۱۵ صفحات قیمت ۱ر مکتبۂ جامعہ دہلی۔

۱۱۔ بادۂ اقبال (نظمیں) مرتبہ غلام سرور نگار ۱۲۰ صفحات عہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔

۱۲۔ پھلوں سے علاج۔ از حکیم محمد عبداللہ ۲۵ صفحات قیمت عہ منیجر العلاج۔ روڑی۔ ضلع حصار۔

۱۳۔ حلفیہ مجربات (مجرب نسخے حلف کے ساتھ) از حکیم محمد عبداللہ ۱۲۸ صفحات قیمت عہ منیجر العلاج روڑی ضلع حصار۔

۱۴۔ فولادتن اسٹالن (سوانح) از شانتی نرائن ۲۸۶ صفحات مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

۱۵۔ ابن سعود (سوانح) از محمد عبداللہ ۱۱۲ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔

۱۶۔ حور ایران (تاریخی ناول) از محمد صادق حسین ۳۴۸ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور۔

۱۷۔ تواریخ ٹاک کھشتریہ از جھنڈا سنگھ ۲۴۸ صفحات وزیر ہند پریس امرتسر۔

۱۸۔ تاریخ جموں از حشمت اللہ خاں ۹۴۴ صفحات محمد تیغ بہادر پریس۔ لکھنؤ۔

۱۹۔ جدید قانون قبضہ اراضی صوبہ متحدہ از نرائن پرشاد ۲۰۰ صفحات محمد تیغ بہادر پریس۔ لکھنؤ۔

۲۰۔ خوشنما زندگی کا راز (طبی نسخے) از بابا برج لال ۲۲۶ صفحات مرکنٹائیل پریس۔ لاہور۔

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

نازو اور دوسرے افسانے :۔ از اختر انصاری بی اے آنرز ناشر مکتبۂ جہاں نما دہلی۔ صفحات ۱۷۴ قیمت ایک روپیہ۔

اختر انصاری صاحب اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے افسانے اکثر اردو رسائل میں چھپتے اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ ان کے چودہ مختصر قصوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر جاں گداز داستانیں ہیں اور سماج کی تلخیوں کی بے تکلف تصویریں۔ اسلوب بھی دلچسپ ہے۔ توقع ہے کہ کتاب مقبول ہوگی

بیدر کا ظالم ہمایوں اور اس کی ملکہ :۔ از احمد اللہ خاں صاحب منصور ۱۰ صفحات قیمت چار آنے۔

کسی ملک کی تاریخ کا ذوق اس وقت تک عام نہیں ہو سکتا جب تک کہ ٹھوس تحقیقی کتابوں کے علاوہ ایسی چھوٹی چھوٹی دلچسپ کتابیں نہ لکھی جائیں جن میں تاریخی واقعات کو دلکش اسلوب میں نہ بیان کیا جائے۔ خاص کر دکن کی تاریخ سے متعلق ابھی بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ منصور صاحب نے یہ چھوٹی سی کتاب بیدر کے ایک بہمنی بادشاہ کے متعلق سبق آموز پیرایے میں لکھی ہے۔ اور بچے اس کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

عربوں کی گزشتہ تجارت اور انگلستان کی صنعت و حرفت ۔ مرتبہ مولوی مجیب احمد صاحب تمنائی صفحات ۹۰ قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب ایک عرصہ قبل اس وقت شائع ہوئی تھی جب کہ ہندستانی مسلمان تجارت اور صنعت و حرفت کو حقیر نظروں سے دیکھا کرتے تھے اب اس کا دوسرا ایڈیشن مصنف کے دوست حاجی محمد خاں صاحب نے شایع کیا ہے۔ کیونکہ سفر حج کے اثنار میں جب انھوں نے حرم شریف کے اکثر و بیشتر باشندوں کی نکبت وافلاس کی حالت دیکھی تو ان پر بڑا اثر ہوا کیونکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ عربوں کی تجارت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے شوق جستجو کے آگے بڑے سے بڑے سمندر بھی کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اسی کے اسباب و علل اور عروج و زوال کے حالات اس کتاب میں قلمبند کیے گئے ہیں اور اس کا دوسرا ایڈیشن اس لئے شایع کیا گیا ہے کہ اس کی آمدنی سے حرم شریف کے باشندوں کی امداد کی جائے۔

نمودِ زندگی :۔ مجموعہ کلام سید علی منظور۔ ناشر ادارۂ ادبیات اردو۔ ۲۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

یہ مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے منظور صاحب پختہ مشق اور مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی سادگی اور پرکاری میں پوشیدہ ہے۔ وہ عہد حاضر کے ان کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کی ترجمانی کو اپنا اہم مقصد قرار دے رکھا ہے۔ جدید رنگ کے انقلابی شاعروں کی طرح علی منظور جذبات کی رو میں بہنا نہیں چاہتے بلکہ جذبات کو اپنے قابو میں رکھ کر ایک پختہ گام سالک کی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نوجوانوں کے کلام کی طرح مجذوب کی بڑ نہیں معلوم ہوتی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں خود بھی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی سو سے زیادہ نظمیں اور چند غزلیں اور رباعیاں بھی شریک ہیں۔ لیکن وہ اصل میں ایک نظم گو شاعر ہیں اور نظمیں ہی ان کے کمال سخن کی بہترین نمائندہ ہیں۔

باقیاتِ بجنوری :۔ مرتبہ محمد فاتح فرخ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی

صفحات ۲۴۴ مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

یہ کتاب اردو کے ایک جواں مرگ انشا پرداز ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مضامین مکاتیب اور منظومات کا مجموعہ ہے، جو ٹائپ کے حروف میں بہت ہی پاک صاف اور انگریزی کتابوں کی طرز پر چھاپا گیا ہے۔ ابتدا میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا ایک مختصر سا تعارف بھی ہے۔ لیکن کتاب کی ترتیب میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے ادب کے طالب علم کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ خطوط کن کے نام لکھے گئے تھے۔ اور مضامین میں کونسے ایسے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ اور کونسے غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح نظموں کی ترتیب بھی بجنوری کے شایان شان نہیں کی گئی ہے۔ ہر نظم نئے صفحہ سے شروع ہونی چاہیے تھی کیونکہ نظموں کے عنوان جلی قلم میں نہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی نظم ہے جس میں کئی ذیلی سرخیاں آگئی ہیں۔

ترتیب کی اس خامی کو اگر زندہ ہوتے تو عبدالرحمن بجنوری مرحوم بھی پسند نہ کرتے اور اسی لئے یہ خامیاں شدت سے محسوس ہو رہی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر پوری کتاب اس قابل ہے کہ اردو ادب کا ذوق رکھنے والے اس کو آنکھوں سے لگائیں۔ اسلوب بیان کے علاوہ بجنوری مرحوم کے خیالات بھی ایسے لطیف اور پاکیزہ تھے کہ ان کی نظیر بہت کم اردو انشاپردازوں میں مل سکتی ہے۔ محاسن کلام غالب کے مصنف کی تحریریں ایسی نہیں ہیں کہ عہد حاضر کی نثر نگاری میں ان کو اہمیت حاصل نہ ہو سکے۔ دیوان غالب کا نسخۂ حمیدیہ مرتب کر کے مرحوم نے اردو کے اہل ذوق ادیبوں اور خدمت گزاروں کی صف میں ایک اچھی جگہ حاصل کرلی ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں فکر کی بلندی اور عقل کی پختگی نمایاں ہے۔ یہی حال ان کی نظموں کا بھی ہے اگرچہ وہ عظمت اللہ خاں مرحوم کی طرح مروجہ تکلفات شعر و سخن سے آزاد رہنا چاہتے تھے لیکن ان کے کلام میں وہ لوچ اور درد پیدا نہ ہو سکا جو عظمت مرحوم کا حصہ تھا۔ اس کی وجہ یہی ہے، کہ بجنوری مرحوم دماغ سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اور عظمت کے یہاں دل کی حکمرانی ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ رہتے تو اقبال کی طرح اپنی فکر کی رسائیوں کی وجہ سے کیا تعجب کہ ایک پیغام گو شاعر ثابت ہوتے۔ زمانے نے ان کو موقع نہ دیا۔ بجنوری نے اپنے شعر و سخن کے رباب کو چھیڑا ہی تھا کہ ان کی انگلیاں ہمیشہ کے لئے ساکت و صامت ہو گئیں۔

افسوس ہے کہ محمد فاتح فرخ صاحب نے جو بجنوری مرحوم کے فرزند ہیں خود کوئی دیباچہ یا مقدمہ نہیں لکھا۔ ضرورت تھی کہ ان کے حالات بھی شریک ہوتے اور ان اصحاب کا بھی اس موقع پر شکریہ ادا کیا جاتا جنھوں نے مرحوم کے خطوط اور نظموں کی فراہمی میں مرتب کا ہاتھ بٹایا۔ خاصکر آصف علی صاحب بیرسٹر دہلی اور مرزا حسین علی خاں صاحب پروفیسر حیدرآباد کا ذکر ضروری تھا جنھوں نے خطوں اور نظموں کا ایک قابل ذکر حصہ مرتب کو فراہم کردیا۔

عقل و جنوں :۔ از حکیم برق موسوی بڑی سائز ۶۸ صفحات مجلد قیمت ایک روپیہ مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد۔

یہ حکیم میر کاظم علی صاحب برق موسوی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں پہلے نوجوان مصنف نے تعارف کے عنوان سے اپنے حالات سے روشناس کیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ برق صاحب حکیم میر نادر علی صاحب رعد کے فرزند حکیم سید نوازش علی آلعہ مرحوم کے بھتیجے۔ میر کاظم علی خاں

شعلہ کے پوتے اور امیر الشعرا میر احمد علی خاں شہید دہلوی کے پڑپوتے ہیں۔ اس طرح سے شعر و سخن کا ذوق ان کو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا ہے۔ یہ سب بزرگ صاحبان دیوان اور متعدد کتابوں کے مصنف و مولف گزرے ہیں۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس صاحب علم و فضل خاندان کا یہ ورثہ اب تک محفوظ چلا آرہا ہے۔ اور وہ مثل صحیح معنوں میں صادق آتی ہے کہ

دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا

برق صاحب کا جو کلام اس مجموعہ میں شامل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو زبان اور خیالات پر قابو حاصل ہے اور وہ ایک روز اردو کے اچھے شاعروں کی صف میں آجائیں گے۔ بشرطیکہ یہی مشغلۂ شعر و سخن جاری رہے اور برق صاحب ابھی سے سستی شہرت کے طلبگار نہ ہوں۔ اس مجموعہ کی بعض نظمیں مثلاً۔ رکشا عابد روڈ، حسین بھکارن، نکمے کی دعا۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب اردو ادب کے جدید رجحانات سے بھی واقف ہیں اور اگر وہ کوشش کریں تو ایک اچھے ترقی پسند شاعر ثابت ہوں گے۔

بُستانِ تجلّیات :۔ از میر غضنفر علی شاہ صاحب بیتاب حیدرآبادی رائل سائز ۲۰۰ صفحات قیمت ڈیڑھ روپے مطبوعہ بہت دکن پریس سلطان بازار حیدرآباد۔

یہ مولوی میر غضنفر علی شاہ صاحب قادری الجمالی کے کلام کا مجموعہ ہے جو مولوی بشیر الدین صاحب بشیر قریشی کے اہتمام سے شایع ہوا ہے۔ بیتاب صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں اور ان کے کلام میں زیادہ تر ایسی ہی نظمیں پائی جاتی ہیں جو تصوف و عرفان سے تعلق رکھتی ہیں۔ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے جو لوگ نعت و منقبت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب گنج شائگاں ثابت ہوگی۔ کتابت و طباعت بھی نہایت پاک و صاف ہے۔

ابتدائی حیوانات حصۂ اول :۔ از ستیا نارائن سنگھ ایم ایس سی۔ عبدالرحمن خاں ایم ایس سی۔ سید مہدی علی ایم ایس سی چھوٹی سائز۔ ۱۴۴ صفحات۔

یہ کتاب ابتدائی حیوانات کے موضوع پر لکھی گئی ہے اور اس کی ترتیب کے وقت مولفین نے جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کے معیار کو پیش نظر رکھا ہے تاکہ عوام کے علاوہ اس جماعت کے طالب علم بھی مساوی طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ حیوانات سے متعلق اردو میں عام فہم کتابوں کی کمی ہے۔ اور نوجوان مصنفوں نے یہ کتاب مرتب کرکے اردو کی ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں اور نقشے شامل ہیں۔ اور پوری کتاب ترتیب، طباعت، اور کاغذ کے لحاظ سے ایک انگریزی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں سے پہلے میں حیوانیات پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے ابواب میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ملیریائی طفیلی۔ زمینی کینچوا۔ جھینگر۔ مچھر اور گھریلو مکھی جیسے دلچسپ موضوعوں پر مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ کتاب کا اسلوب اس قابل ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ اس سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔

ٹروٹسکی کا بیان :۔ ترجمہ ایم ایم جوہر صاحب ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی چھوٹی سائز ۸۱ صفحات قیمت دس آنے۔

جامعہ ملیہ کی طرف سے کچھ عرصہ سے علوم جدیدہ اور سیاسیات حاضرہ سے متعلق ایسی چھوٹی چھوٹی مفید کتابیں شایع ہو رہی ہیں جن کے مطالعہ سے قوموں میں مفید ذہنی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کا مطالعہ ان نوجوانوں کے لئے معلومات آفریں ثابت ہوگا۔

جو بیسویں صدی کے مشہور روسی انقلاب کو ٹھیک طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ لینن کے معاونین اور شرکائے کار میں ٹروٹسکی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور علمی اور اصولی لحاظ سے بھی لینن کے بعد اسی کو انقلاب روس کا سب سے بڑا آدمی اور انقلابی نظریوں کا سرگرم ترین علمبردار سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ زمانہ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ لینن کا دست راست ہونے کے باوجود ٹروٹسکی کو اس کی جانشینی کا موقع حاصل نہ ہوا۔ اور اس کے رقیب اسٹالین کی خاموش کوششوں اور تدبیروں نے اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ ٹروٹسکی کو تمام عمر جلاوطنی اور خانہ بدوشی میں گزارنی پڑی لیکن وہ نچلا بیٹھنے والا آدمی نہ تھا۔ اس نے ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنا کام جاری رکھا اور اس کی یہی سرگرمی تھی جس کی وجہ سے اسٹالین کو ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا۔ اور اسی لئے اس نے اپنے قدیم رفیق اور سردار کے خلاف کئی بار مقدمہ دائر کیا اور ہر وقت قابل گردن زدنی ثابت کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ اس کو کامیابی ہو گئی اور ٹروٹسکی کو اپنی سرگرمیوں اور اصول پرستی کی سزا بھگتنی پڑی۔ زیر نظر کتاب میں ایک ایسے ہی مقدمہ کی کارروائی پیش کی گئی ہے۔ اور جواب کے طور پر ٹروٹسکی نے جو بیان دیا تھا اس کو محفوظ کر کے عوام کی اطلاع کے لئے شایع کیا گیا ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں چھپی تھی۔ اور اب جامعہ ملیہ کی طرف سے اس کا ترجمہ شایع ہوا ہے۔

ٹروٹسکی نے اپنے بیان میں بہت سی ایسی باتیں پیش کی ہیں جن کے مطالعہ سے لینن کے انقلابی گروہ کی اندرونی سازشوں اور جماعت بندیوں کی نسبت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نیز اشتراکی رجحانات اور اصول کے سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔

رگبی کی زندگی :- ۲۴۰ صفحات مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ یہ دلچسپ اور مفید کتاب سلسلۂ یاد ایام مدرسہ کی ایک کڑی ہے۔ جس کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نے قائم کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے متعلمین اور معلمین دونوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور ان دونوں کی تربیت و اصلاح کو پیش نظر رکھ کر ہی اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے تعارف کے آخری حصہ میں مولوی سجاد مرزا صاحب نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ۔

"سلسلۂ یاد ایام مدرسہ انگریزوں اور جرمنوں کے قومی مدارس کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر کے نہ صرف اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کرے گا بلکہ ہماری تعلیمی تحریکوں کو ایک تعمیری صورت میں تبدیل کر دے گا۔"

یہ ایک بڑا اچھا خیال ہے اور اگر اس سلسلہ کی اور کتابیں چھپ جائیں تو یقین ہے کہ ہماری تعلیمی تحریکیں ایک تعمیری صورت حاصل کر سکیں گی۔

رگبی کی زندگی اصل میں ایک انگریزی کتاب ہے جس کا ترجمہ مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی میں مختلف اصحاب نے کیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حصہ بلبیر پرشاد صاحب ایم اے ڈپ ایڈ کا ہے جنھوں نے زبان کی سادگی اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف اساتذہ اور طلبہ ہی اس کا مطالعہ کریں بلکہ طلبہ کے والدین کو بھی ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بشریٰ :- از عنایت رسول صاحب عباسی چریا کوٹی۔ بڑی سائز ۲۴۴ صفحات مطبوعہ شروانی پرنٹنگ پریس علیگڑھ۔

یہ کتاب آنریبل ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ دہلی کی فرمائش اور ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے مصارف سے محمد مقتدی خاں صاحب شروانی کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے۔ ابتدا میں موخر الذکر صاحب نے ایک تعارف بھی لکھا ہے جس میں نفس کتاب کے بعض مذہبی معتقدات کا تحلیہ کیا ہے۔ اصل کتاب بھی بہت محنت اور تلاش و جستجو سے لکھی گئی تھی اور اس کے چھپنے میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے لیکن عبرانی حروف کے لئے بہتر ہوتا کہ اصل لوہے کا ٹائپ استعمال کیا جاتا۔ کیونکہ آج سے ایک عرصہ قبل سر سید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق میں عبرانی حروف ٹائپ میں چھپوائے تھے۔ کتاب کا موضوع یہ ہے کہ آنحضرت پیغمبر اسلام کے متعلق توریت و انجیل اور دیگر صحف انبیاء میں کیا کیا بشارتیں درج ہیں۔

یہ کتاب ان لوگوں کے لئے قابل مطالعہ ہے جو مذہب اسلام کے آغاز اور پیغمبر اسلام کی فضیلت اور اہمیت سے متعلق تاریخی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

رسالے

ساقی دہلی کے مرتب اردو کے مشہور ادیب اور محسن مولوی نذیر احمد کے پوتے مولوی شاہد احمد صاحب بی اے آنرز دہلوی ہیں۔ جو خود بھی اردو کے ایک اچھے ادیب اور لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اور گیارہ سال سے ایک دلچسپ اور معیاری رسالہ ساقی دہلی سے شائع کر رہے ہیں۔ اس کا سنہ ۱۹۴۱ء کا سالنامہ ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر افسانے شامل ہیں۔ اس سالنامہ کی طرح ساقی کے عام پرچوں کی بھی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں اعلیٰ پایہ کے افسانوں اور اردو ڈراموں کے علاوہ دوسری زبانوں کے شاہکار ڈراموں اور افسانوں کے مستند ترجمے بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ نظموں کا حصہ بھی برا نہیں۔ خاص طور پر بہزاد لکھنوی، شاد عارفی، سید علی منظور اور تابش دہلوی کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ مضامین اور افسانوں میں امتیاز علی تاج، عنایت اللہ دہلوی، سید بادشاہ حسین، ماہر القادری اور کرشن چندر کے رشحات قلم بطور خاص لائق مطالعہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے معیاری افسانے جتنے ساقی میں شائع ہوتے ہیں اردو کے کسی دوسرے رسالے میں نہیں ہوتے۔

ساقی کے عام پرچوں کی طرح اس سالنامے میں بھی ایک کمی یہ ہے کہ اس میں تصویریں شامل نہیں ہیں۔ اور اس کے بعض مضامین اتنے خفی قلم میں لکھوائے گئے ہیں کہ ان کو پڑھنا بار معلوم ہوتا ہے۔

ادب لطیف کے مدیر مسئول برکت علی صاحب بی اے اور مدیران اعزازی باری۔ احسان دانش اور راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ اس کا سر ورق بہت سادہ رکھا گیا ہے۔ اور ساقی کے سالنامے کی طرح رنگین اور دیدہ زیب نہیں ہے۔ لیکن اس میں دو تصویریں شامل ہیں اور پورے سالنامے کو مختلف عنوانوں مثلاً۔ افسانہ، شعرستان، بحث و نظر اور ڈرامہ کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ آخر میں انتظاریہ کے عنوان سے چند ایسے مضامین شامل کئے گئے ہیں جو دیر میں وصول ہوئے تھے۔ پورے سالنامے کی ترتیب بڑے سلیقے اور محنت سے کی گئی ہے۔ اکثر مضامین اردو کے مشہور ادیبوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ جن میں عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج، عبدالقادر سروری۔ شاہد احمد، حکیم احمد شجاع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح شاعروں میں علی اختر۔ احسان دانش۔ جوش ملیح آبادی۔ اختر شیرانی فصاحت جنگ جلیل۔ جگر مراد آبادی۔ سیماب اکبر آبادی شامل ہیں۔ رسالے کے آغاز اور اختتام پر اشتہارات کے بیسیوں

صفحات شریک ہیں جن سے حجم میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ بعض دواؤں کے اشتہارات اس قابل نہ تھے کہ شریک کئے جاتے۔

عالمگیر لاہور کا سالنامہ ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر کے نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اس میں جو علمی اور تحقیقی مضامین شریک ہیں وہ بہت اچھے ہیں۔ چند رنگین تصویریں بھی ہیں جو زیادہ تر عوام کے مذاق کو ملحوظ رکھ کر منتخب کی گئی ہیں۔ مضمون نگاروں میں شبلی بی کام، ماہر القادری، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، پروفیسر حامد حسن، میرزا ادیب، بادشاہ حسین، اور احسان علی شاہ اور شاعروں میں، جلیل، سیماب، امجد، احسن اور شاکر میرٹھی قابل ذکر ہیں۔ کتابت طباعت اور کاغذ اور ترتیب کے لحاظ سے یہ سالنامہ ساقی اور ادب لطیف سے بہت پیچھے ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۲۷۶ ہے لیکن درمیان میں دواؤں وغیرہ کے متعدد اشتہار بھی شریک ہیں۔ جن میں سے ایک دو ایسے بھی ہیں جن کو قطعاً شریک نہ کرنا چاہیے تھا۔

سہیل افسانہ نمبر۔ رسالہ سہیل گیا کا خاص نمبر ہے۔ جو افسانوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں شایع ہوا اس میں چند اصحاب کی تصویریں بھی شریک ہیں اور متعدد اچھے افسانوں کے علاوہ فن افسانہ سے متعلق معلوماتی اور تنقیدی مضامین بھی درج ہیں یہ ایک کامیاب کوشش ہے اور اس کے بعض افسانے اور نظمیں اردو ادب میں اضافہ سمجھے جا سکتے ہیں۔

ہمایوں لاہور۔ یہ ۱۹۴۱ء کا سالگرہ نمبر ہے جو صرف ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سالنامے میں صرف میاں بشیر احمد ایڈیٹر کا مضمون اردو ۱۹۴۰ء میں اتنا اہم اور پراز معلومات ہے کہ بجائے خود ایک کتاب معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون کو اگر اور تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا تو صرف یہی ایک موضوع ایسا تھا جو پورے سالنامے کے لئے کافی ہوتا۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں جو دوسرے مضامین نظم و نثر شامل ہیں وہ کوئی کم درجہ کے ہیں پورا پرچہ خاص توجہ اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اگر دوسرے رسالوں کے مدیر صاحبان بھی اسی طرح ہر سال اپنے سالناموں میں گزشتہ سال کی اردو خدمات کا جائزہ پیش کرتے رہیں اور اپنے اپنے نقطہ نظر سے دوران سال کی کاوشوں پر تبصرہ کریں تو اردو سے متعلق ہر سال تعمیری مواد جمع ہوتا رہے گا۔

بشیر احمد صاحب کی اس قابل تقلید پیش قدمی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اطلاعیں

اردو لائبریری

نیا سنسار (کتاب گھر) بانکی پور پٹنہ کی طرف سے ایک زبردست ادبی اسکیم تیار کی گئی ہے۔ اس قسم کی کوششوں کی اردو کو بڑی ضرورت ہے تاکہ ادب کا ذوق عام ہو اور کم دام میں اچھی کتابیں فراہم ہوسکیں۔ اس اسکیم کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ اس سیریز میں کم سے کم ایک کتاب ہر مہینے شایع ہوگی۔
۲۔ ہر کتاب کم سے کم (۹۶) صفحوں کی ہوگی۔
۳۔ ہر کتاب کی قیمت آٹھ آنے ہوگی۔
۴۔ کتابیں ادبی، تنقیدی، نفسیاتی، معاشرتی، معاشیاتی اور سیاسی موضوعات پر ہوں گی۔
۵۔ ہر کتاب مختصر، مکمل، مستند اور عام فہم ہوگی۔
۶۔ سر دست ذیل کے موضوعات پر کتابیں تیار ہیں :-

اردو افسانہ نگاری، اردو ادب، نئے زاویہ نگاہ سے، نفسیاتی خاکے، میکسم گورکی کی کہانیاں، سیاسی نظریئے، ریبہ، ایک بنگالی ناول۔

مجلس احیاء خوش نویسی

اس نام سے حیدرآباد میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کے صدر نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد میر لطیف علی صاحب اور اراکین نواب بہادر یار جنگ بہادر، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، سید احمد محی الدین صاحب ایڈیٹر رہبر اور خواجہ محمد احمد صاحب ہیں۔ اس مجلس کی خواہش ہے کہ فن خوش نویسی کو از سر نو نمایاں کیا جائے چنانچہ فی الحال ایک کل ہند مقابلہ خوش نویسی مقرر کیا گیا ہے جس میں ماہرین فن سے بہترین نمونے طلب کر کے ان نمونوں کے لئے جو مقابلتہً سب سے بہتر ثابت ہوں انعامات دئے جائیں گے تاکہ اس فن کی جانب دوسروں کو رغبت پیدا ہو۔ اس غرض کے لئے فی الحال چھ سو (سماء) روپے کے انعامات منظور کئے گئے ہیں جو حسب ذیل نمونہ ہائے خطاطی کے لئے مقابلہ کنندگان کو دئے جائیں گے۔

(۱) خط نسخ پہلا انعام (ماء) ایک سو روپے، دوسرا انعام (صہ) پچاس روپے (۲) خط نستعلیق۔ پہلا انعام (ماء) ایک سو روپے دوسرا انعام (صہ) پچاس روپے۔ (۳) خط کوفی۔ پہلا انعام ایک سو روپے، دوسرا انعام، پچاس روپے۔ (۴) طغرا پہلا انعام
" " " " " " مزید معلومات معتمد حسینی محلہ مکان مرزا حیدر حسین بیگ صاحب حیدرآباد سے مل سکتی ہیں۔

مرکز انسداد بیکاری

غالب صاحب حیدرآبادی نے گول بنگلہ حیدرآباد میں ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں ہر قسم کے ملازم (تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ فن داں و غیر فن داں) اندرون تین یوم فراہم کردئے جاتے ہیں۔ جو لوگ ملازمت چاہتے ہیں یا جن اصحاب کو ملازمین کی ضرورت ہے وہ اس پتے پر مراسلت کریں۔ یہ مرکز کامیاب ہوسکتا ہے اگر دونوں قسم کے ضرورتمند اصحاب اس کے ساتھ تعاون کریں۔

ادارہ کی خبریں

افتتاحیہ شاخ بلارم

۵ رفروری کو صدر بازار بلارم میں ادارہ کی شاخ کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر سروری صاحب نے حسب ذیل تقریر فرمائی ۔

سب سے پہلے، میں اِس مایوسی میں، آپ کے ساتھ شریک ہونے کا اظہار کرتا ہوں جو اِس وقت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی ہر دلعزیز شخصیت کی بجائے ایک گم نام شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر، آپ کے دلوں میں پیدا ہوئی ہوگی ۔ ڈاکٹر صاحب ایک اور اہم علمی خدمت کے سلسلے میں، شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں ۔ اِسی لئے اِدارۂ ادبیات اردو کی شاخ کے افتتاح سے متعلق خدمت مجھ کو انجام دینی پڑ رہی ہے ۔

آپ میں سے اکثر حضرات واقف ہوں گے کہ ادارۂ ادبیات اُردو دس سال سے حیدرآباد میں، نہایت خاموشی کے ساتھ، اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اور اس نے اب تک ستر کے قریب کتابیں مختلف علوم و فنون کی شایع کی ہیں جن میں سے بعض، اردو زبان کی نہایت اہم کتابوں میں شمار ہونے لگی ہیں ۔ اس کے خدمت گذاروں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے ۔ اور ریاست کے کئی اضلاع میں اس کی شاخیں قایم ہو چکی ہیں ۔ اس کا کام کئی شعبوں پر تقسیم ہے، جن میں سے شعبۂ زبان، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن شعبۂ تنقید، شعبۂ اطفال، شعبۂ طلبہ، شعبۂ خواتین اور شعبۂ اردو امتحانات نے اب تک نمایاں کام انجام دیئے ہیں ۔ اِن شعبوں کی مختلف مجلسوں میں آپ کو ملک بھر کے بہترین علمی خدمت گذاروں کے نام نظر آئیں گے جو مختلف علمی کام انجام دے رہے ہیں

ادارہ کا قیام اور اس کی ترقی دراصل، ڈاکٹر زورؔ کی اَن تھک محنت کا نتیجہ ہے ۔ قیام یورپ سے واپسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں مصنفین اور مولفین کے لئے ایک ایسے مرکز کی شدید ضرورت ہے، جو نہ صرف ان کی اچھی اچھی کتابوں کو شایع کرے، بلکہ بضرورت ان کے کام میں مشورے بھی دے سکے اور ان کے باہمی ربط اور تبادلہ خیال کے لئے مرکز فراہم کرے ۔ اُردو کے چند پُر خلوص خدمت گذار فوراً اُن کے ساتھ شامل ہو گئے اور اپنے عطیوں سے، کام کے آغاز کا موقع فراہم کر دیا آج نہ صرف حیدرآباد میں ادارہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں، اس کے کام کی شہرت ہے اور اس کی کتابیں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہیں ۔

ادارہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت والا شان اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار و ولی عہد سلطنت آصفیہ، اس کے سرپرست اعلیٰ اور رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ اور راجہ شام راج بہادر وغیرہ اس کے سرپرست اور نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات اس کے صدر ہیں ۔

ادارہ کے ماہوار آرگن یعنے رسالہ "سب رس" کو آپ حضرات پڑھ چکے ہوں گے، یہ نہ صرف حیدرآباد کا بہترین رسالہ ہے، بلکہ ہندوستان بھر میں اردو کے بہترین اور مقبول رسالوں میں شمار ہو رہا ہے ۔ اس کے علاوہ، ایک رسالہ، بچوں کے لئے، "بچوں کا سب رس" بھی جاری ہے ۔

اِدارہ میں اردو زبان کی تمام مطبوعات فراہم کر کے ایک مرکزی کتب خانہ بھی قایم کیا گیا ہے ۔ جو کتب خانہ آصفیہ، اور کتب خانہ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر کو چھوڑ کر، حیدرآباد میں اردو کا سب سے وسیع کتب خانہ ہے، جس میں ہر علم و فن کی مطبوعات اور مخطوطات کی اتنی تعداد موجود ہے کہ، حیدرآباد کا

تاریخ، تمدن، ادبی ارتقا اور اردو زبان کے عام مسائل پر تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی گنجایش موجود ہے، چنانچہ حیدرآباد سے باہر کی جامعات سے علماء آتے اور اس کتب خانے سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ابھی جامعہ بمبئی کے ریسرچ اسکالر مسٹر میستری یہاں آکر استفادہ کر گئے ہیں۔

ادارہ کی شاخیں اس وقت گلبرگہ، کلیانی، جالنہ، محبوب نگر، کشتگی وغیرہ میں قایم ہیں اور اردو کی نشرو اشاعت میں نہایت قابل قدر کام انجام دے رہی ہیں۔

ادارہ کے اردو امتحانات یعنے سند اردو دانی، اردو عالم اور اردو فاضل، خوش نویسی اور خطاطی و کتابت، حیدرآباد کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئے ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے اصحاب اور خواتین ہیں جو کسی مدرسہ یا کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے اور اسی لئے، آئندہ ذہنی اور علمی ترقی کے موقعوں سے باز رہ گئے ہیں ان کے لئے ادارہ نے، تین مدارج کے امتحانات مقرر کئے ہیں، ان امتحانات کو ریاست اور بیرون ریاست میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکے گا کہ پہلے ہی سال امتحانات میں تین سو سے زیادہ امیدوار شریک ہوئے بمبئی میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پونا میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور مدراس کے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ان امتحانات کی ترویج کی کوشش کی جارہی ہے۔

ادارہ کی شاخ قایم کرنے سے، دراصل زیادہ سے زیادہ علمی خدمت گذاروں کو ادارہ کی علمی برادری میں شریک کرنا مقصود ہے۔ اس کے قواعد و ضوابط، آپ حضرات مطالعہ فرماچکے ہوں گے۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ادارہ کے اغراض و مقاصد یعنے اردو مطالعہ خانے اور کتب خانے قایم کرنا، بالغوں کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا اور اردو امتحانات کے لئے امیدوار کو تیار کرنا، مولفین اور مصنفین کی مشوروں اور دوسرے طریقوں سے امداد کرنا، اردو زبان کی خدمت اور صحیح ادبی اور علمی ذوق کو نشو و نما دینا۔

ــــ ان تمام اغراض کی تکمیل میں ادارے سے متعلق تمام اصحاب ہمیشہ آپ کی مدد اور تعاون کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ ایک فوری فائدہ آپ کو یہ حاصل ہے کہ ادارہ کی تمام مطبوعات آپ کے کتب خانے کے لئے نصف قیمت پر مل جائیں گی۔

میں اس ریاست گیر اور جو خدا نے چاہا تو ہندستان گیر، علمی برادری میں آپ کی شرکت کے لئے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، اور اس گرد و نواح کے لئے آپ کی شاخ کو فال نیک سمجھتا ہوں مجھے توقع ہے کہ اس علمی مشعل سے جیسے چند خاموش کارگذاروں نے شہر حیدرآباد میں روشن کیا ہے، آپ ایک برقی قمقمہ روشن کریں گے اور اس کی ضیا سے اطراف و اکناف کو منور کردیں گے۔

بلارم کی شاخ کے معتمد مولوی شیخ عبداللہ صاحب منتخب ہوئے ہیں اور سرگرمی کے ساتھ ادارہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔

عبدالقادر سروری

کپل میں ادارہ کی شاخ

۲۳ فروری کو مولوی سرفراز علی صاحب بی اے۔ ڈپ ایڈ پرنسپل مدرسہ کپل کی توجہ سے ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں ادارہ کی شاخ قایم کرنے کی تحریک منظور ہوئی اور حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا:۔

معتمد مولوی محمد حسین صاحب۔ شریک معتمد مولوی محمد عبدالرزاق صاحب۔ منتظم مولوی امین الدین صاحب۔ قاضی کپل اور اراکین میر سعادت علی صاحب کپل، سید امین الدین حسینی صاحب کپل۔ سراج الحسن صاحب قادری، تاجر عبدالرشید صاحب سید اسمٰعیل صاحب علوی، بشیر الدین صاحب۔ شرف الدین صاحب

سید نبی اللہ صاحب۔ عبد السبحان صاحب۔ پنڈت بشنو پنت۔

اِس شاخ نے اُردو علم اور اُردو دانی کی جماعتیں کھول دی ہیں اور اِن جماعتوں میں تعلیم پانے والوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس وقت تک تیئیس ۲۳ اُردو عالم اور چالیس ۴۰ اُردو دانی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ اِس سال کیل ہیں ایک زنانہ مرکز امتحان بھی قایم کرنا پڑے گا۔

دُوسری نئی شاخیں

عثمان آباد اور رخانہ پور میں بھی شاخیں قایم ہوئی ہیں جن کی تفصیل آئندہ شمارہ میں درج رہے گی۔

پربھنی میں اُردو امتحانات کا جلسہ تقسیم اسناد

۲۴ جنوری ۱۹۴۱ء کو ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام مولوی دلی حسن صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی کی صدارت میں مارکیٹ پویلین ہال میں منعقد ہوا جس میں جملہ مقامی عہدہ دار مثلاً راجہ ڈھونڈے راج بہادر ناظم عدالت، شرف الدین احمد صاحب منصف، حبیب الرحمٰن صاحب زائد ناظم عدالت، شیو کمار لال صاحب مہتمم پولیس، ابرار حسین صاحب صدر مدرس عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری، احمد عبد الحی صاحب مددگار مہتمم پربھنی اور دیگر اصحاب نے شرکت کی، احمد عبد الحی صاحب کی تحریک اور معتمد شاخ حمید اللہ خاں شیدا کی تائید سے صدر جلسہ نے کرسی صدارت کو زینت بخشی گل پوشی کے بعد معتمد شاخ پربھنی نے اسناد، تمغے اور تین عدد سرگذشت ادارہ جناب صدر کی خدمت میں پیش کئے جس کی ایک ایک کاپی راجہ ڈھونڈے راج بہادر اور سید عارف الدین حسن صاحب کو جناب صدر نے منجانب صدر ادارہ عطا کی اور کامیاب طلبہ اُردو عالم کو اسناد و تمغہ تقسیم کرنے کے بعد نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی، راجہ ڈھونڈے راج بہادر ناظم عدالت نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے نہایت دلچسپ تقریر کی اور کامیاب طلبہ سے کہا کہ کامیابی کی اسناد لینے کے بعد تمھارا کام ختم نہیں ہوا بلکہ اب علمی کام ختم ہوا اور عملی کام باقی ہے جس کا پورا کرنا تمھارا فرض ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم لوگ اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے راہبر ثابت ہوں گے۔ اس کے بعد مولوی ابرار حسین صاحب نے بھی نہایت دلچسپ تقریر فرمائی جس میں موصوف نے طالب علم اور متعلم کے فرق کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا اور طلبہ کو نصیحت کی معتمد شاخ نے یہ تحریک پیش کی کہ ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے نائب صدر مولوی جلال الدین صاحب اشک کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے اس جگہ کرسی کا انتخاب ابھی تک عمل میں نہیں آیا جس کے لئے مولوی ابرار حسین صاحب بہ اتفاق آرا نائب صدر منتخب ہوئے۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ موصوف نے نہایت سرگرمی سے حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کے خاموش اور سرگرم رکن مولوی عبد الواحد صاحب یم لیس سی مددگار مدرسہ فوقانیہ درس و تدریس ہیں، سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں اور وعدہ فرمایا ہے کہ معلومات سائنس اُردو فاضل کو بھی پڑھائیں گے جس کے لئے ہم موصوف کے ممنون ہیں۔

مولوی ابرار حسین صاحب کی تقریر کے بعد حمید اللہ خاں شیدا معتمد نے روئداد ادارہ مرتبہ جناب علی اکبر صاحب صدر امتحانات شعبہ پڑھ کر سنائی جس سے حاضرین ادارے کی کارگذاریوں سے واقف ہوئے۔ آخر میں ادارے کی قابل فخر ہستی مولوی سید عارف الدین حسن صاحب نے صدر جلسہ کے توسط سے یہ اعلان فرمایا کہ سال ۱۳۵۰ف کے ہونے والے امتحان اُردو فاضل، اردو عالم اور اُردو دانی میں پربھنی سے اول آنے والے طالب علموں کو ایک ایک مڈل عطا کیا جائے گا جو "عطیہ عارف الدین حسن" ہوگا شکریہ کے بعد آخر میں مولوی میر احمد علی شاب منصرم تحصیل دار ہنگولی نے دعا فرمائی کہ خداوند کریم ہمارے بادشاہ ذی جاہ حضرت سلطان العلوم

کی عمر اقبال میں ترقی عطا کرے جن کی بدولت آج اردو ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ زینے طے کر رہی ہے۔

پربھنی میں اُردو کی نمائش

عرس کے موقع پر پربھنی میں جو نمائش منعقد ہوئی تھی اس میں نہایت نمایاں جگہ پر ادارۂ ادبیات اُردو شاخ پربھنی کا اسٹال اعلیٰ پیمانے پر سجایا گیا تھا اس کے لئے آٹھ یوم کی مسلسل کوششوں سے چند چارٹ اور تصاویر وغیرہ بنائے گئے تھے۔ پربلی سے اشرف الدین صاحب فیضی بھی آگئے تھے اور انھوں نے کام میں بڑی مدد کی۔ اُردو کے قدیم شعرا' جدید شعرا۔ اُردو کے بہترین نثر نگار۔ اُردو جرائد کے ایڈیٹروں کی تصویریں۔ ادارہ ادبیات اُردو کے تمام شعبوں کو تقسیم کیا جاکر تفصیل کار اور کارکنانِ ادارہ کی سرگرمی کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہندستان کے نقشے میں اردو کے ابتدائی دور اور مرکزوں کو بھی بتلایا گیا تھا۔ دکن میں اردو کی ترقی کے سلسلے میں ادارے نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل وغیرہ کے چارٹ بنائے گئے تھے۔ بہرحال اسٹال نہایت خوبصورت سجایا گیا تھا۔ جس کو تقریباً پانچ ہزار لوگوں نے دیکھا اور نہایت اچھے تاثرات لے گئے۔ ادارے کا لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔ عوام کو اردو امتحانات میں شرکت کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ امید ہے کہ اس مرتبہ زیادہ سے زیادہ طلبہ شریک ہوں گے۔ ہماری یہ کوشش بہت کامیاب رہی۔ چنانچہ اسٹال کو دیکھ کر کمیٹی نمائش نے ایک نقرئی مڈل اور ایک سند عطا کی جس کو فریم کرکے ادارے کے مطالعہ گھر میں لگا دیا گیا ہے۔ اس نمائش کے موقعہ پر اسٹال وغیرہ کی ترتیب میں مولوی عارف الدین حسن صاحب نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور مولوی محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار نے بھی مدد کی جو لائق شکریہ ہیں۔ دیگر اراکین میں خاص طور پر محمد لیٰسین صاحب جلالی' مرزا عزیز بیگ صاحب' ناصر بن حبیب اور اشرف الدین صاحب فیضی نے خاص طور پر حصہ لیا۔ اس خصوص میں ہم عبدالعلام صاحب کے شکرگذار ہیں کہ موصوف نے اپنی قیمتی تصاویر اور کتب خانہ وغیرہ عطا کئے۔

ادارہ کے نئے رکن

حسب ذیل خواتین و حضرات نے ادارہ کی رکنیت قبول فرماکر اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے

رکن دوامی۔ محل مرزا مہدی خاں کوکب مرحوم

رکن الف۔ بلقیس بانو صاحبہ' بشیر النساء بیگم صاحبہ' اعظم النساء بیگم صاحبہ' عزت بیگم صاحبہ' رابعہ بیگم صاحبہ' محمد اکرام الدین صاحب تحصیل بلغور' سید میر صاحب (دستور آباد) الحاج قاسم خاں صاحب (خانہ پور)

رکن ب۔ جیلانی بیگم صاحبہ' وحید بانو صاحبہ۔

رکن شعبۂ طلبہ۔ اکرام حسین صاحب (خانہ پور) محمد قطب الدین صاحب (خانہ پور) عزیز احمد صاحب (خانہ پور) محمود علی صاحب (خیرت آباد) عبدالمجید قریشی صاحب (نظام شاہی) مظفر علی خاں صاحب (خیرت آباد) عارف علی خاں صاحب (خیرت آباد) خدا بخش صاحب' عبدالرزاق صاحب' رشید احمد صاحب' محمد مزمل حسن صاحب' مجید احمد صاحب فاروقی' حسن الدین علی صاحب' برہان الدین صاحب' محمد معین الدین صاحب۔

ادارہ کا معاینہ

یوں تو ایسا کوئی دن نہیں گذرتا جب کہ ادارہ کے معاینہ اور استفادہ کے لئے کوئی نہ کوئی صاحب تشریف نہ لاتے ہوں' لیکن گذشتہ دو تین ماہ میں ہزاکسلنسی سر اکبر حیدری' آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر اور آنریبل سید عبدالعزیز کے علاوہ مختلف علم دوست اصحاب مثلاً غلام احمد خاں صاحب' ہاشم علی خاں صاحب' سید محی الدین صاحب' سید تقی الدین صاحب' احمد محی الدین صاحب انصاری اور انوار اللہ صاحب وغیرہ نے ادارہ کے کتب خانے اور کام کا دلچسپی سے معاینہ کیا۔

ادارہ کے شعبے ادارے کے مختلف شعبے برابر سرگرم کار ہیں جن میں چند کی روئداد یں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

شعبۂ زبان اس اثناء میں اس شعبہ کے دو جلسے ہوئے جن میں سے صرف ایک کی روئداد یہاں درج ہے۔ یہ جلسہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا

حاضرین:- مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی سید محمد صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سروری، پنڈت دتاتری دھرم صاحب، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب

سابقہ جلسے کی روئداد پڑھی گئی اور ارکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

(۱) حسب ذیل امور بغرض تصفیہ پیش ہوئے:-

۱۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی کی مراسلت ارکین کے روبرو پیش کی گئی۔ دارالترجمہ کی جانب سے ادارۂ ادبیات اردو کو چند کتابیں بطور تحفہ اس شرط کے ساتھ ارسال کی گئیں کہ ان پر تنقید نہ کی جائے۔ اسی سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ یہ شعبہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ ارباب متعلقہ کو یہ بتادے کہ اس کے حق تنقید پر اس طرح کی پابندی کسی صورت میں گوارا نہیں کی جاسکتی اور یہ امر افسوسناک ہے کہ حکام متعلقہ نے ایسی شرط قایم کرنے کو مناسب خیال فرمایا۔ یہ شعبہ بہرحال ضروری سمجھتا ہے کہ دارالترجمہ کی جن کتابوں پر ضرورت ہو آزادانہ تنقید کرے۔

(۲) مدرسہ کورو کر و کنگ' کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ جناب ناظم صاحب تعلیمات کی مراسلت کے حوالہ و نقل کے ساتھ محکمہ سرکار کو اس طرف توجہ دلائی جائے۔

(۳) دکھنی محاوروں، کہاوتوں وغیرہ کے سلسلے میں محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ و محترمہ احمد النساء بیگم صاحبہ ثریا جبیں کی مرسلہ فہرستیں مولوی قاضی عبدالغفار صاحب کے سپرد کی گئیں تاکہ عام محاوروں سے دکھنی محاوروں کو علحدہ کرلیا جائے اور طے پایا کہ بعد ازاں یہ فہرست بغرض تشریح مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری کے پاس روانہ کی جائے۔

(۴) شعبہ کی جانب سے اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ تحریک استحکام وقار زبان سرکاری بدفاتر سرکاری کے سلسلے میں رکن شعبہ مولوی سید محمد صاحب انجمن طیلسانئین کے مشترکہ وفد میں نمائندگی فرمائیں۔ اراکین نے اس انتظام کی توثیق فرمائی۔

(۵) حسب قرارداد نمبر ۲/۱۱ اجلاس منعقدہ ۸ر امرداد ۱۳۴۹ف صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے اردو ترجموں میں یکسانیت پیدا کرنے اور ان کو معیاری بنانے کے لئے طے پایا کہ ایک مجلس مقرر کی جائے جو مندرجۂ ذیل اراکین پر مشتمل ہوگی:-

(۱) مولوی قاضی عبدالغفار صاحب (۲) مولوی عبدالقادر صاحب سروری (۳) ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب (۴) مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری (۵) پنڈت دتاتری دھرم صاحب

اس مجلس کے اجلاس ہر فصلی ماہ کے دوسرے اور چوتھے جمعہ کو شام کے ساڑھے چار بجے دفتر روزنامۂ پیام میں منعقد ہوا کریں گے۔

(۶) بالاتفاق حسب ذیل قرارداد یں منظور کی گئیں اور طے پایا کہ مقامی اخبارات میں ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

(۱) اردو کی ہرجہتی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ

لسانیات کے مسلمہ اصول کے مطابق غیر زبانوں کے جو الفاظ اردو میں داخل ہو گئے ہیں اور جن کا تلفظ بھی اُردو زبان کی فطرت اور اُردو دانوں کی کثرت استعمال سے بدل گیا ہے ان کو مروجہ طریقہ پر لکھا اور بولا جائے نہ کہ اصل زبان کے تلفظ کے مطابق مثلاً ستمبر اور دسمبر نہ کہ سپٹمبر اور ڈسمبر۔ ادارہ کا یہ شعبہ تمام انجمنوں، اداروں اخباروں اور دفتروں سے یہ اپیل کرتا ہے کہ اردو میں غیر زبانوں کے مروجہ لفظوں کو نہ صرف اردو صرف و نحو کے مطابق استعمال کریں بلکہ ان کا تلفظ بھی اردو طریقہ سے کریں

(۲) اردو کتابوں کی افادیت بڑھانے کے لئے بہت ضروری ہے کہ ہر کتاب کے آخر میں مضمون واری اور نام واری اشاریہ (انڈکس) شایع کیا جائے تاکہ حوالوں کی تلاش اور مطلوبہ موضوع سے متعلقہ عبارت معلوم کرنے میں سہولت ہو۔ یہ شعبہ تمام ناشروں سے عام طور پر اور جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، ہندوستانی اکاڈیمی، دار المصنفین اور جامعہ ملیہ کے ارباب سے خاص طور پر اپیل کرتا ہے کہ آئندہ اپنی ہر کتاب کے ساتھ اشاریہ (انڈکس) ضرور شایع کریں۔

شعبۂ نسوان

شعبۂ نسوان کا سولھواں اجلاس بمقام جوبلی ہال بتاریخ ۱۹ جنوری ۱۹۴۱ء شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا اور ذیل کی خواتین نے شرکت کی:—

(۱) رابعہ بیگم صاحبہ (۲) جہاں بانو بیگم صاحبہ (۳) بشیر النساء بیگم صاحبہ (۴) معتمد شعبہ۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اکثر خواتین نے باوجود اعلان اور تاکید کے بھی پرچۂ دستخط پر اپنے نہ آسکنے کی اطلاع نہ دی۔ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اتنی تکلیف وہ ہماری خاطر گوارا کریں تاکہ دوسروں کو زحمت انتظار نہ ہو۔ اگر انھیں فاصلہ پر اعتراض ہے تو کوئی ایسی جگہ مقرر کی جائے جہاں انھیں آنے میں سہولت ہو۔

اجلاس میں جن امور پر غور کیا گیا ان میں سب سے زیادہ اہم مدرسۂ بالغات واقع اڈک میٹ کے قیام کا سوال تھا تصدق فاطمہ بیگم کی غیر موجودگی میں اس کے بند کرنے کا سوال ملتوی رکھا گیا اور یہ تجویز ہوئی کہ تاوقتیکہ دوسرا مدرسہ کسی محلہ میں قایم نہ کر لیا جائے یہ مدرسہ بدستور قایم رہے۔

طالبات کی کمی اگر محسوس ہو تو دوبارہ اعلان کروایا جائے۔

مسز باقر علی خاں سے استدعا کی جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً مدرسہ کو اپنی مبلغ بہارائے سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

مسز حسن لطیف سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ سوزن کاری سکھانے میں ہماری مدد کریں گی یا نہیں۔ اور ان کی آمادگی پر طالبات کو ہفتہ میں ایک بار انہی کے گھر بھجوانے کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ شعبے نے سر دست ایک لڑکیوں کا مدرسہ بھی اڈک میٹ میں قائم کر رکھا ہے، جس کی نگرانی بھی رابعہ بیگم صاحبہ کے ذمہ ہے۔ اس کے لئے قبل ازیں امداد کی درخواست صدر مہتممہ کو دی گئی تھی۔

۳۔ اراکین کی رائے ہوئی کہ اضلاع پر شعبہ کی شاخوں کا قیام زیادہ کارآمد ثابت ہوگا چنانچہ نرمل، ناندیڑ، محبوب نگر ورنگل وغیرہ میں ان کے قیام کے متعلق تجویز عمل میں آئی۔

بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بنگلور میں ایک شاخ قایم کرنے کی اور جہاں بانو بیگم صاحبہ نے کلکتہ میں قایم کرنے کی رائے دی اور اس کے متعلق کوشش کرنے کا ذمہ بھی لیا۔

۴۔ یہ طے پایا کہ بشیر النساء بیگم صاحبہ کا کلام شعبے کی

طرف سے شایع کرنے کا انتظام کیا جائے اور بشیر النسا بیگم صاحبہ سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنا کلام چھپوانے کی ہمیں اجازت دیں۔

شعبۂ شعراء و مصنفینِ دکن

۱۱ر جنوری ۱۹۴۱ء کو اس شعبہ کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ کے علاوہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے شرکت کی۔ تاریخ ادب عربی مرتبۂ مولوی ابوالفضل صاحب ایم اے کی نسبت طے پایا کہ یہ کتاب مولف کو نظر ثانی کے لئے دی جائے، تاکہ وہ اس کو مختصر کریں اور مصر کی مطبوعہ تاریخ مولفہ کے طور پر بی۔ اے کے نصابی معیار کے مطابق مرتب کریں۔

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے مجموعۂ نظم "کھوئے ہوؤں کی جستجو" کی اشاعت کی اس شرط کے ساتھ سفارش کی گئی کہ شاعر اپنی ان تاریخی نظموں پر مختصر سے نوٹ تحریر کردیں تاکہ ان کی افادیت اور لطف اندوزی میں اضافہ ہو۔

مرقع نثر کی ترتیب سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ اس کی تفصیل آئندہ مجلس میں پیش ہو۔

مولوی علی اختر صاحب کے مجموعۂ کلام "انوار" کو جلد از جلد شایع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

تاریخی آثار کا معائنہ

ادارہ کی طرف سے ہر چھٹی یا فرصت کے موقع پر ان مقامات کا سفر کیا جاتا ہے جو حیدرآباد کے اطراف واکناف تاریخی یا ادبی اہمیت کی وجہ سے قابل معائنہ ہیں۔ چنانچہ اس عرصے میں بھی عہد قطب شاہیہ کے مشہور وزیر اعظم میر محمد مومن کی بنائی ہوئی مسجدوں، تالابوں اور بستیوں کا معائنہ کیا گیا۔ ماہ جنوری میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی سید محمد صاحب مولوی میر عباس علی صاحب (نبیرۂ میر محمد مومن) اور مولوی صدیق علی صاحب نے دو بار سید اباد (موجودہ سیداباغ) کی بستی مسجد اور سرائے کا معائنہ کیا اور مسجد میں میر محمد مومن کا لگایا ہوا جو کتبہ موجود ہے اس کے چربے لئے گئے۔ ان کی تصویریں آئندہ کسی موقع پر سب رس میں شایع کی جائیں گی۔

سیداباد میں میر صاحب نے جو سرائے بنائی تھی وہ کسی زمانہ میں بڑی آباد ہوگی۔ کیونکہ یہ شاہی راستے پر واقع تھی۔ اب بھی اس کے کچھ بچے کھچے کمرے غریبوں کے مکان بن گئے ہیں اور اس طرح سے یہ سرائے آباد ہے۔

مسجد کے عقبی حصے کی طرف اس سرائے کی جملہ کمانیں اس وقت تک محفوظ ہیں۔ حالانکہ اس کو بن کر آج تین سو چھیالیس سال کا عرصہ ہوچکا ہے۔ اس میں جملہ چھپن کمرے بنائے گئے تھے۔ عقبی حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں پہلوؤں کے وسط میں دروازے تھے۔ اور ان دروازوں کے دونوں طرف سات سات کمانیں تعمیر کی گئی تھیں۔ سرائے کے عقبی حصہ میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں چھت سے باہر نکال کر جو خوبصورت چھجا بنایا گیا تھا اس کے اہتمام اور مضبوطی کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ سرائے کس عمدہ پیمانے پر بنائی گئی تھی۔

سیداباد کے معائنے کے بعد میر محمد مومن کے بنائے ہوئے ایک دوسرے گاؤں میر پیٹھ کا معائنہ کیا گیا۔ چنانچہ پہلی بار ۲ر فروری ۱۹۴۱ء کو مولوی سید محمد صاحب ام اے اور ڈاکٹر زور صاحب نے ظل اللہ گوڑہ (موجودہ جل اللہ گوڑہ) اور میر پیٹھ کا سفر کیا وہاں کے تالاب مسجد اور کتبہ وغیرہ کے دیکھنے کے بعد جب یہ یقین ہوگیا کہ یہ سب میر محمد مومن ہی کے بنائے ہوئے آثار ہیں تو ۵ر فروری کو ادارہ کی طرف سے تاریخی

معائنے کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر زور صاحب، پروفیسر مجید صدیقی صاحب، پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی عبدالرحمن شریف صاحب، مولوی صدیق علی صاحب (ماہر چربہ) اور بھگوان داس صاحب (فوٹوگرافر) نے اس روز کئی گھنٹے میر پیٹھ میں گذارے۔ اور مسجد کی تصویریں اور کتبوں کے چربے لئے گئے۔ میر پیٹھ کے دونوں معائنوں کے وقت مولوی عبدالرشید صاحب بی۔ اے نے (جو حسن اتفاق سے اسی باغ میں رہتے ہیں جو میر صاحب کا لگایا ہوا ہے) بڑی زحمت اٹھا کر اس جماعت کی معلومات میں اضافہ کا انتظام کیا اور ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ چنانچہ مسجد کو درختوں وغیرہ سے صاف کیا، دھلوایا، کتبوں میں سے چونا اور گرد و غبار نکلوایا اور اس جماعت کی پرتکلف ضیافت بھی کی جس کے لئے ادارہ کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

میر پیٹھ شہر حیدرآباد سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق کی سمت میں واقع ہے اور اس کا راستہ چمپا پیٹھ، کرمن گھٹ اور ظل اللہ گوڑہ پر سے گذرتا ہے۔ لیکن چمپا پیٹھ کے بعد سے کچی سڑک ہے جس پر سے موٹر قدرے زحمت کے ساتھ میر پیٹھ تک پہنچتی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہدؔ
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۴ | بابت اپریل سنہ ۱۹۴۱ء | شمارہ ۴

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیاتِ حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

کارلائل کی ”بلو مین“

حیدرآباد میں رزیڈنسی کے قریب موٹر بس کا ایک اسٹانڈ ہے جس کا نام ”پتلی باؤلی“ ہے کیونکہ یہاں اس نام کی ایک خوش نما باولی تھی جس میں لوگ سیڑھیوں کے ذریعہ سے اتر سکتے تھے۔ یہ باولی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہی اب بند کر دی گئی ہے اور آج کسی دیکھنے والے کے لئے اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ شہر سے آنے والی سڑک کا ایک حصہ اسی کے نام سے موسوم ہے ایک کتبے کے مطابق اس باولی کو حیدرآباد کے مشہور رزیڈنٹ میجر کلیس کرک پٹرک نے ۱۸۰۱ء میں تعمیر کیا تھا اور یہ اس تقریب کی یادگار میں کہ اسے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ یہ بچی بعد کو اس قدر حسین نکلی کہ خود انگریزی ادب میں اس نے اپنے لئے جگہ پیدا کرلی چنانچہ اسے کارلائل نے اپنی مشہور ناول ”ریمی نی سنس“ میں ”کٹی کرک پٹرک“ اور ”سارٹر رسارٹس“ میں ”بلو مین“ کے نام سے پیش کیا ہے۔ مشہور مصنف اسکاٹ نے اس لڑکی کو ایک جگہ ان الفاظ میں یاد کیا ہے:- ”وہ نصف بیگم تھی اور اس میں ایک تمثیلی انگریز عورت کا حسن بھی جھلکتا تھا“ وہ کس طرح کارلائل کی دوست بن گئی اور کس طرح اس کردار نگار نے اس کی تصویر پیش کی، اس چیز کا مطالعہ آج بڑی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن اس زمانے تک پہنچ جاتا ہے جب کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل یورپ ہندوستان کے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے آزادی کے ساتھ میل جول بڑھاتے تھے۔

خیر النساء

اٹھارویں صدی عیسوی کے آواخر میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ میجر جیمس کلیس کرک پٹرک تھے اور یہ حضور نظام علی خاں کا عہد حکومت ہے ان کے لایق اور تجربہ کار مدار المہام ارسطو جاہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان دونوں کے ساتھ میجر کرک پٹرک نے بڑے اچھے تعلقات قایم کرلئے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی آٹھ سال کی مدت ملازمت میں حیدرآباد کے ساتھ تین معاہدے بھی طے کئے۔ انہی میں ایک وہ معاہدہ بھی تھا جس کی رو سے حضور نظام نے فرانسیسی فوجی دستے کو اپنی ملازمت سے نکال دیا اور انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد طے کیا۔ میجر کرک پٹرک حشمت جنگ کے خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے، قدیم تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے اور انھوں نے خیر النساء نامی ایک مسلمان لڑکی سے شادی بھی کرلی تھی خیر النساء سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور ایک اچھے ایرانی خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے نانا انگریزی فوجی دستے کے بخشی تھے۔ اس عہدے کی وجہ سے بہت سے انگریز اُن کے گھر آیا کرتے اور ان کی دعوتیں بھی ہوتی رہتیں۔ میجر کرک پٹرک بھی ان آنے جانے والوں میں شامل تھے اور چونکہ وہ نوجوان اور خوبرو تھے ان کے مردانہ حسن کے چرچے گھر کی عورتوں میں بھی ہونے لگے تھے۔ جب خیر النساء نے ان کو پہلی مرتبہ اپنے نانا کے گھر میں پردے کے پیچھے سے دیکھا تو وہ ان سے محبت کرنے لگی اور ایک بڑھیا کو پیام سلام کے لئے مقرر کیا۔ کرک پٹرک نے اپنے بڑے بھائی کے نام جو خط لکھے ہیں ان میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے مکان میں تنہا بیٹھا تھا کہ ایک بڑھیا آئی اور اس سے کہنے لگی کہ ایک مرتبہ خیر النساء نے تمھیں دیکھ لیا ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے بڑھیا نے اس سے یہ بھی التجا کی کہ تم اس کی درخواست کو منظور کرلو لیکن کرک پٹرک نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ بعد میں وہ دو تین

مرتبہ پھر آئی اور اسی طرح واپس کردی گئی۔

بالآخر ایک رات کو خود خیر النساء کرک پیٹرک کے پاس آئی اور اس نے بذات خود اپنی درخواست پیش کی۔ کرک پیٹرک نے اس نوجوان حسینہ سے بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع کیا مگر آخر میں اسے ناکام ہونا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی اصول کے مطابق ایک معاہدہ نکاح طے پاگیا حضور نظام نے بھی جنھوں نے اس شادی کی اجازت دی تھی' اپنی طرف سے نوشہ کو بہت سے قیمتی چڑھاوے دئے اور اسے "فرزند محبت پیوند" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا لیکن اس شادی کے بعد شہر حیدرآباد میں ایک ہلچل مچ گئی اصل میں کمپنی کی حکومت کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کے ناظم ہندستانی عورتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کریں کیونکہ اسے ڈر تھا کہیں یہ لوگ ہندستانیوں کے زیر اثر نہ ہو جائیں۔ حیدرآباد میں میجر کرک پیٹرک کے بہت سے دشمن بھی تھے۔ انھوں نے گورنر جنرل کے پاس یہ رپورٹ کی کہ کرک پیٹرک بداخلاقیوں کا مرتکب ہے۔ لیکن جب گورنر نے تحقیقات کی اور کرک پیٹرک کے خلاف جو الزامات لگائے گئے تھے انھیں بے بنیاد پایا تو اس نے کرک پیٹرک کو بحال کردیا اور اس کی بہت ستایش بھی کی کہ وہ اس کے مسلک کے مطابق بہت کامیابی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

اُن کے بچے

حیدرآباد میں رزیڈنسی کی عالی شان عمارت کے نقشے کی ترتیب اور اس کی تعمیر کرک پیٹرک ہی کے زمانے میں ہوئی۔ اس وسیع رقبے میں اپنی بیوی کے لئے ایک زنانہ حصے کی بھی تعمیر کی تھی اور اس میں مصنوعی چشمے بنوا کر اسے بہت فرحت بخش بنا دیا تھا۔ عمارت کے اس زنانہ حصے کی دیواروں پر رنگ برنگ کے پھول' میوے' پودے' پرند اور دیگر جانور اتارے گئے تھے اور یہ حصہ اس قدر خوش رنگ ہو گیا تھا کہ اس کا نام "رنگ محل" رکھا گیا مگر یہ عمارت ۱۸۶۰ء میں گرادی گئی۔

خیر النساء سے کرک پیٹرک کو دو بچے ہوئے جن میں سے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ ان دونوں کو جب کہ ان کی عمریں ۴ اور ۳ سال کی تھیں ان کی ماں کی رضامندی سے انگلستان بھجوا دیا گیا تاکہ وہاں ان کی تعلیم و تربیت ہو۔ یہ بچے انگلستان میں اپنے دادا کے ساتھ رہنے لگے لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو پھر یہ اپنی چچا زاد بہن کے زیر نگرانی رکھے گئے لیکن انگلستان جانے کے بعد ان بچوں کو پھر اپنے ماں' باپ سے ملنا نصیب نہ ہوا کیونکہ ان کی روانگی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یعنی ۱۸۰۵ء میں میجر کرک پیٹرک کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا اور خیر النسا حیدرآباد واپس آگئی ہندستانی ماں نے اپنی لاڈلی بچی کا نام صاحب بیگم بی بی صاحبہ رکھا تھا لیکن اب یہ نام بدل گیا اور وہ کیا تھرین آرورا یا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کٹی کرک پیٹرک کے نام سے موسوم ہو گئی۔ اس نے ۸۷ برس کی عمر پائی اور اس کے کئی بچے بھی ہوئے لیکن اس کا بھائی جوان مرگیا۔ اس کی ایک بیوہ اور تین لڑکیاں تھیں۔

کارلائل سے دوستی

جب کارلائل نے اپنی جامعہ کی زندگی ختم کی تو اس کے سامنے بہت سی مشکلیں تھیں۔ چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ اس نے چرچ مدرسہ اور قانون سب کو چھوڑ دیا۔ ۱۸۲۲ء میں اس نے اپنے دوست ایڈورڈ اروِنگ کے توسط سے مسٹر بلرنگ رسائی حاصل کرلی اور ان کے بچوں کا اتالیق ہو گیا۔ موصوف جو بہت مالدار آدمی تھے' ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ مالگذاری میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور اب انھوں نے وظیفہ حاصل کرلیا تھا۔ بلر خاندان کی بدولت کارلائل سماج کے ایک ایسے دولتمند'

مہذب اور متمدن طبقے سے روشناس ہوا جس کے ساتھ ملنے جلنے کا اسے اب تک اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈ کے ساتھ لندن آیا تو یہاں مسز بلر نے اس کو اپنی بہن مسز اسٹراچی سے ملا دیا اور یہی لڑکی ہے جس کے متعلق بعد میں کارلائل نے "عورتوں میں ہیرا" کے الفاظ استعمال کئے۔ یہ دونوں بہنیں ولیم کرک پیٹرک کی لڑکیاں تھیں جو کٹی کا چچا تھا۔ کارلائل نے کٹی سے پہلی مرتبہ ایڈورڈ ارونگ کے مکان پر ملاقات کی اور اس "نازک سیاہ آنکھوں اور بھورے بالوں والی ساحرہ" سے بہت متاثر ہوا۔

"کٹی اپنے دلفریب حسن کے لحاظ سے آپ اپنا جواب تھی اس کا لوٹا سا قد تھا سیاہ آنکھیں تھیں، بھورے بال تھے، گندمی رنگ تھا پیکر محبت بہت خوش مزاج بھی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ زندگی بھر کسی دوسرے پر کبھی خفا نہ ہوئی تھی۔ وہ خود مختار تھی اور پچاس ہزار پونڈ کی دولت کے ساتھ دولت حسن کی بھی مالک تھی لیکن اس کے باوجود اس میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھی بلکہ وہ بہت منکسر المزاج واقع ہوئی تھی"۔ چند روز بعد جب کارلائل اور کٹی زیادہ ملنے جلنے لگے تو یہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے چنانچہ ۱۸۲۴ء میں یہ دونوں پندرہ دن کے لئے پیرس بھی ہو آئے۔ لیکن اسی زمانے میں کارلائل نے یہ سنا کہ مسز اسٹراچی اپنی اینگلو انڈین بہن کے لئے ایک اچھے بر کی تلاش کر رہی ہیں اس سے کارلائل بہت متاثر ہوا چنانچہ اپنی کیفیت میں اس نے لکھا ہے "مجھے یہ چیز زیادہ تکلیف دیتی ہے گو اس وقت بھی میں اس سے متاثر تھا۔ مسز اسٹراچی چاہتیں تو وہ آسانی سے اپنی بہن کے لئے میرا انتخاب کر سکتیں اور پھر ہم دونوں ہمیشہ انہی کے ساتھ رہتے"۔ لیکن حالات ناموافق ہو گئے اور دونوں نے مختلف راہیں اختیار کیں۔ پیرس سے واپس آنے کے چند ہی مہینے بعد کارلائل کی شادی جین ولش سے ٹھیر گئی جو "ایک تیز نظر اور چرب زبان دوشیزہ تھی"۔ اسی طرح کٹی کے لئے بھی جیمس ونسلو فلپس کا انتخاب ہو گیا جو ساتویں ہسار کا کپتان تھا۔ کارلائل نے اس شادی کے بعد کٹی کے فوجی شوہر پر جس نے ہندستان میں اپنی خدمت انجام دی تھی، اس طرح چوٹ کی ہے
"کٹی سپاہیوں کے کسی سابق کپتان کو انعام میں دے دی گئی"۔

کارلائل کی تصانیف میں اس کا تذکرہ

کٹی کا کوئی خاکہ پیش کرنے میں کہ اس کے مشرقی حسن و جمال کا کیا عالم تھا ان الفاظ کا حوالہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن میں کارلائل نے اس کی تصویر کھینچی ہے۔ اس نے اس کی تصویر یوں پیش کی ہے "وہ ایک انوکھی رنگت کی دوشیزہ تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں تھیں، وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کے حسن میں ایک دلکشی تھی، اس کی آواز میں نرم اور موسیقیت تھی اور وہ واقعی مسز اسٹراچی کی بہن معلوم ہوتی تھی"۔ ایک جگہ یوں لکھا ہے "اس حسینہ کے چرچے ہر جگہ ہوتے تھے۔ اس کا حسن، اس کے اوصاف اور اس کی طبیعت کی رنگینیاں ہر محفل میں بار بار دہرائے جاتے تھے، اس کی آنکھوں میں نور تھا اور اس کے عارض گلگوں پر ایک طرف کاکل سیاہ سے پرچھائیں پڑتیں تو دوسری طرف نور کی متبسم شعاعیں اڈ آتی تھیں"۔ ایک اور موقع پر کارلائل کے جذبات ان الفاظ میں پھوٹ پڑتے ہیں "جب کبھی بلومین اپنی معصومیت کے ساتھ چھوٹی بڑی عورتوں کی صف میں کھڑی ہو جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کے ٹمٹماتی شمعوں میں ایک آسمانی تارا ٹوٹ آیا ہے" اپنی پرانی ملاقاتوں کی یاد میں کارلائل لکھتا ہے "اس کے تبسم میں ایک جادو تھا اور اس کی ہر بات ہنسی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھی۔ اس کے لب نازک کا دہنا گوشہ خم کھایا ہوا تھا۔

اس کے سر اور آنکھوں کی حرکت میں ایک دلربائی تھی۔ جب وہ اپنے لب نازک کو جنبش دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ دیکھیے سروں میں ننھے نکل رہے ہیں جو اپنے ساتھ تبسم لئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت ملنسار اور محبت آگیں تھی۔ وہ ایک پیکر لطافت اور اس کے ساتھ ساتھ جاذب نظر بھی تھی۔ اس کی زیر لب سریلی آواز دل میں اتر جاتی تھی اور اس کی ہر آواز لطیف و معنی خیز ہوتی تھی"۔

غرض کارلائل نے اپنے خاص جوشیلے انداز میں ایک ایسی لڑکی کے متعلق اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے جس کی ماں حیدرآباد کی ایک مسلمان خاتون تھی وہ کبھی "بلومین" کی دلربا شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی "کٹی کرک پیٹرک" کے نام سے ہمارے سامنے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے جو انگریزی ادب کے دلدادہ ہیں بڑی دلچسپی کا سرمایہ ہے۔

نیلم راجہ رام

(ترجمہ حفیظ صدیقی)

تاریخ گولکنڈہ

فاضل مولف نے ہر حصہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اس صورت میں تاریخ کا کوئی پہلو بھی نظرانداز نہیں ہوسکا ہے۔ قطب شاہی عمارات و سلاطین کی تصویروں نے اور بھی اس کی زینت بڑھادی ہے۔ کتاب ہر پہلو سے مفید اور دلچسپ ہے۔ زبان میں سلاست اور ادب کی چاشنی بھی موجود ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس کتاب کا ضرور ضرور مطالعہ فرمائیں اور اس کی موجودگی سے اپنی لائبریری کی قدر و قیمت بڑھائیں۔ جناب عبدالمجید صاحب صدیقی اور ادارۂ ادبیات اُردو اس گراں قدر تصنیف کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔ **"سہیل"** گیا۔ جون ۱۹۴۰ء

گولکنڈے کو جو تاریخی اہمیت حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ گولکنڈہ دکن کا دل ہے اور اس کی تاریخ کے مطالعہ کے بغیر دکن کی سیاست و تمدن کو کماحقہ سمجھ لینا تقریباً امر ناممکن ہے۔ جناب عبدالمجید صدیقی نے یہ معرکہ آرا تاریخ لکھ کر نہ صرف گولکنڈہ کے تاریخی حقایق بیان کئے ہیں بلکہ دکن کی تمام تاریخ بھی پیش کردی ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے مستند مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ **"ادب لطیف"**۔ ستمبر ۱۹۴۰ء

کتاب بہت محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے اور گولکنڈے سے متعلق غالباً اپنے پائے کی پہلی اور آخری کوشش ہے قطب شاہی سلطنت کی تاسیس و بنیاد سے لے کر اس کے عروج و زوال تک کے تمام حالات پوری روشنی میں دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں گولکنڈے کے تمدنی، سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات، بادشاہوں کی علمی سرپرستی اور شہر و عمارت کی تاریخ بھی شامل ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اس کی جاذبیت میں تصویروں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ **"البیان"** مئی ۱۹۴۰ء

گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ ہوا ہے۔ جسے عرف عام میں تاناشاہ کہتے ہیں۔ مغل مورخین نے اس کی شخصیت اور کیرکٹر کو بہت مذموم رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے مستند حوالوں سے کام لے کر مغل مورخین کے تمام الزامات رفع کرنے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا حال کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے۔ **"زمانہ"** جنوری ۱۹۴۱ء

نہایت جامع اور دلچسپ تاریخ اور اس عہد کے تمدن و معاشرت اور سیاسی حالات کا ایک نہایت کامل اور دیدہ زیب مرقع ہے۔ یہ بلند پایہ کتاب اہل ذوق کے پڑھنے کے قابل ہے۔ **"ہمایوں"** مارچ ۱۹۴۱ء

غزل

پوچھنا کیا اس کا جو دن رات میخانے میں ہے
ذوق و کیفِ زندگی بس ایک پیمانے میں ہے

اس کی دلچسپی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
کیسی دنیا بھر کی وحشت تیرے دیوانے میں ہے

لوگ میرے ساتھ ان کو بھی کیا کرتے ہیں یاد
ان کا افسانہ بھی شامل میرے افسانے میں ہے

موجِ مے کی لرزشیں ہیں دل کی بیتابی کا راز
مے نہیں ہے بلکہ میری جان پیمانے میں ہے

میکدے میں صرف اتنی سی ہے میری کائنات
تھوڑی شیشے میں ہے باقی تھوڑی پیمانے میں ہے

جان میری لے کے بجھنا پڑے گا آپ کو
شمع کی رسوائی پروانے کے جل جانے میں ہے

یا اُدھر ہو یا اِدھر اس کشمکش سے فائدہ
لب ہیں صرف توبہ دل لبریز پیمانے میں ہے

شمع اس سے کچھ جو واقف تھی تو جل کر رہ گئی
کس قدر سوز و گدازِ عشق پروانے میں ہے

ہوں وہ سرمستِ ازل میں کہہ نہیں سکتا معینؔ
کون میخانے کے باہر کون میخانے میں ہے

معین الدولہ بہادر معینؔ

مطربہ سے

اپنی دھن میں مست ہو کر جس گھڑی گاتی ہے تو
اک جہاں کو رودِ موسیقی بنا جاتی ہے تو

نشہ کے بادل سے چھا جاتے ہیں فرش و بام پر
دل مچل جاتا ہے اک کیفیتِ بے نام پر

آتے ہیں دوشِ فضا پر مستیوں کے کارواں
پیدا ہو جاتا ہے نشہ کا جہاں اندر جہاں

رقص کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے دل
پھول کی مانند کھل جاتا ہے قلبِ مضمحل

وجد ہو جاتا ہے طاری پرسکوں ذرات پر
خلد کا ہوتا ہے دھوکا بزمِ موجودات پر

ذرے ذرے سے ابل پڑتا ہے دریائے سرور
منجمد خاموشیوں کا ٹوٹ جاتا ہے غرور

وادیوں میں دل کی گاتے ہیں سریلے آبشار
کھلتے ہیں نغمات کے غنچے قطار اندر قطار

اک بہشتِ رنگ و بو میں جا کے کھو جاتا ہے دل
زمزموں کی نکہتوں میں جا کے سو جاتا ہے دل

یہ گماں ہوتا ہے گردوں پر اڑا جاتا ہوں میں
سیل اک جادو کا ہے جس میں بہا جاتا ہوں میں

خود بخود کھلتے ہیں دل پر رازہائے زندگی
دینے لگتے ہیں صدائیں سازہائے زندگی

آگ سے نغموں کی جل جاتا ہے جب روحوں کا زنگ
دل میں اک بیدار ہو جاتی ہے وجدانی امنگ

ایک کیفِ سرمدی کو ہر طرف پاتا ہوں میں
مجھ میں کھو جاتی ہے تو اور تجھ میں کھو جاتا ہوں میں

اخترؔ ہوشیارپوری

غزل

پیری میں اور قوتِ طبعِ رواں بڑھی
یعنی عزیزؔ تیزیٔ تیغِ زباں بڑھی

محمل کا اِس غبار میں کیونکر پتہ چلے؟
ہر ہر قدم پہ گردِ پسِ کارواں بڑھی

کِھلنے نہ پائے تھے ابھی غنچے کہ ہائے ہائے
اوراقِ گل اڑانے کو بادِ خزاں بڑھی

دم توڑنا فراق میں دشوار ہو گیا
کم طاقتی کچھ ایسی دلِ ناتواں بڑھی

تقدیر جب خراب ہو تدبیر کیا کرے؟
اشکوں سے اور آتشِ سوزِ نہاں بڑھی

ملتا تھا بات بات پہ تکرار کا مزہ
عشقِ ادا شناس کی یوں داستاں بڑھی

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند ساقیا!
میخوار کیا کریں گے جو مے کی دوکاں بڑھی

صبحِ شبِ فراق بڑھی آن بان سے
آہِ شرر فشاں طرفِ آسماں بڑھی

بجلی بھی تیز گام گھٹائیں بھی بے لگام!
آندھی بھی ساتھ ساتھ سوئے آشیاں بڑھی

دل کے خمیر میں تھی محبت کی چاشنی!
ہمت اِسی سے اپنی دمِ امتحاں بڑھی

کیونکر نہ اُس کے نام پہ دل ہو فدا عزیزؔ
جس کے قدم سے رونقِ کون و مکاں بڑھی

عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

پھول

ہے پھول کہاں تو بھٹکا
کن کانٹوں میں آ اٹکا
ہیں سوکھی ڈالیں
اپنے میں تجھے چھپالیں

(۲)

سُندرتا (حسن) ایسی دے کر
پتوں کا دیا تجھے گھر
کیا الٹا ہوا وِدھاتا (خدا)
جو جوڑا ایسا ناتا

(۳)

کیا تیری مدھر ہنسی ہے
کن کن (ذرہ ذرہ) میں شری (حسن) بکھری ہے
جب اِدھر اُدھر تو ہلتا
آنکھوں کو جیون ملتا

(۴)

یہ رنگت اور کہاں ہے
جو تجھ میں بھری یہاں ہے
تو چپ ہو کر وہ کہتا
کوئی جسے نہ کہہ کہہ سکتا

(۵)

کیسا ہے جادو تجھ میں
یہ آتا نہیں سمجھ میں
ہیں چیتن (جان دار) جڑ (بے جان) ہو جاتے
اور جڑ چیتن ہو جاتے

(۶)

دیکھا ہے جب سے تجھ کو
کچھ نہیں سُہاتا مجھ کو
بس ایسا مست ہوا ہوں
دنیا کو بھول گیا ہوں

(۷)

اب آتا ہے یہ جی میں
تیرے ہی پاس رہوں میں
نہیں ایک پلک بھی جھپکوں
تجھ کو ہی دیکھوں دیکھوں

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار

جدید افسانہ

ادب زندگی کا عکس ہوتا ہے لیکن زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بعض وقت کسی زمانے کے ادیبوں کے کارناموں میں اس کے مظاہر کی تلاش دشوار ہو جاتی ہے حالی سے پہلے کے انشا پردازوں اور شاعروں کا یہی حال ہے لیکن محض اس بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس زمانے کے ادب کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اس زمانے کے صناعوں نے ایک نہایت رسمی اور استعارے کا طریقہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اختیار کر لیا تھا۔ تاہم وہ اپنے زمانے کے علمی خیالات اور معاشی اثرات سے بیگانہ نہیں تھے۔

جدید افسانوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی پیدائش اور ان کے نشو و نما کے پیچھے حالات اور خیالات کا ایک وسیع پس منظر ہے۔ جب تک ہم ان حالات اور خیالات کو ذہن نشین نہ کریں اس زمانے کے افسانوں کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

لیکن ہم اس وقت صرف مختصر قصوں کا ذکر کریں گے کیونکہ افسانے کی اصطلاح عام اور وسیع ہے۔ اس میں داستان حکایت ناول مختصر قصے غرض ادب کا وہ تمام ذخیرہ شامل ہو جاتا ہے جس کو قصے سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہو۔ اس زمانے میں داستانیں اور حکایتیں نہیں لکھی جاتیں۔ یہ مختصر قصوں اور ڈراموں کا دور ہے۔ ناول کی طرف بھی اب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

مختصر قصے کے لئے انگریزی میں " " کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں عام طور پر اسے مختصر افسانہ اور بعض وقت محض افسانہ کہتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں افسانہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کو انگریزی اصطلاح " " کے ہم معنی سمجھنا چاہیے۔ افسانے کی ایک خاص شکل کے لئے عام اصطلاح استعمال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اسی سے دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی سے بچنے کے لئے ہندی ادیبوں نے اس صنف کے لئے "کہانی" کا نام اختیار کیا ہے۔ کہانی " " کا ترجمہ ہے۔ لیکن مختصر قصہ نہ تو افسانہ ہے اور نہ کہانی۔ اس کا فن ان سب سے الگ اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نئی ادبی شکل کا نیا نام ہونا چاہیے۔ اسی لئے اس کو مختصر قصہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مختصر قصہ ہماری زبان میں انگریزی کی توسط سے پہنچا۔ ایشیائی قوموں کی مخصوص ذکاوت کو قصہ گوئی سے بہت قدیم اور فنی تعلق رہا ہے۔ اسی لئے یورپ کی اس ادبی شکل سے ہم اس قدر جلد مانوس ہو گئے کہ وہ ہمارے ادب کا ایک مقبول جز بن گئی ہے۔

یورپ کی زبانوں میں بھی مختصر قصہ فنی حیثیت سے بہت بعد میں پیدا ہوا اس کی ترقی دراصل موجودہ زمانے کی مصروف اور میکانکی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ یورپ کے اہم ملکوں جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی، اطالیہ روس اور امریکہ میں صنعتی ترقیوں کے بعد سے عام زندگی کی کش مکش اس قدر بڑھ گئی کہ درمیانی اور ادنیٰ طبقوں کو قدیم زمانے کے لوگوں کی طرح بڑے بڑے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہنی اور دماغی تفریح کی ضرورت گھٹی نہیں۔ بلکہ اور بڑھ گئی۔

اسی لئے ایک ایسی ادبی صنف کے نشو و نما کی ضرورت ہوئی جو مصروف لوگوں کی فرصت کے چند لمحات کو پُر کر سکے اور ایک مکمل تفریح ثابت ہو۔

یورپ کی گزشتہ جنگِ عظیم تک اس فن کو ناول اور ڈرامے کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی۔ پہلے پہل اکثر ناول نگار اس کو ایک وقتی تفریح کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاہم ان کے سرانجام میں وہ بڑے قصوں کی طرح محنت کرتے اور اپنے مقصد کو نمایاں کرنے میں وہ قدیم قصہ گوئی کے سارے لوازم صرف کر دیتے تھے اسی لئے ان کے مختصر قصے بھی کافی طویل اور قصہ گوئی کے پورے لطف سے پُر ہوتے تھے۔ ان کے موضوع عموماً ادبی اور خیالی ہوتے تھے۔

لیکن جنگ کے بعد سے جو اہم تبدیلیاں یورپ کی سیاسی اور معاشی، سماجی اور علمی زندگی میں رونما ہوئیں ان کی وجہ سے یورپی ادب میں بہت بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔

ان اثرات سے ہندوستان بھی نہ بچ سکا۔ اردو کے موجودہ مختصر قصوں میں بھی ہم وہ تمام ظاہری اور معنوی خصوصیات دیکھ سکتے ہیں جو یورپی قصوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہمارے قصوں کا بہت بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو یورپی زبانوں سے ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حصہ ماخوذ ہے اور کچھ اسی نمونے پر ڈھالا گیا ہے۔ ملکی ذہنیت بھی اب اس پر اس قدر قابو پا چکی ہے کہ اپنی ذکاوت کے مناسب اس میں تصرف بھی کرنے لگی ہے۔ اسطرح ہمارے مختصر قصوں میں ایک طرف مابعد جنگ اثرات موجود ہیں تو دوسری ان پر یورپ کے خاص خاص ملکوں جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی اور خاص طور پر روس کے باکمال قصہ نگاروں کے مخصوص قومی اور شخصی رجحانات کے گہرے اثرات بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ یورپی قصہ نگار زیادہ تر ایسے ہیں جو جنگ سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں گویا ہمارے قصے جنگ سے پہلے کے ادبی تخیلات اور اس کے بعد کے اثرات کا مجموعہ ہیں۔

روسی قصہ نگاروں میں تورگنیف ڈوستووسکی چیخوف میکسیم گورکی اور خاص طور پر ٹالسٹائی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ کئی رسالے اور کتابیں ان کے قصوں اور ان کی صناعی کو سمجھانے کے لئے اردو میں شایع کی گئی ہیں۔ نوجوان انشا پردازوں کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جس کا مقصد روسی ادب اور خیالات کی اشاعت ہے۔ ان میں سعادت حسن منٹو کا مرتبہ فیروز الدین منصور، شاہد لطیف، وغیرہ بہت پیش پیش ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسین رائے پوری کے افسانے بھی روسی اثرات ہی کے مظہر ہیں۔

تورگنیف اور ڈستووسکی روسی ادب میں درحقیقت اس افسانہ نگار گروہ کے پیرو تھے جس کا نشو و نما گوگول اور فرانسیسی مختصر قصہ نگار ژروژ رسان ر کے اثرات کے تحت ہوا۔ اسی دبستان کی خصوصیات ہم عصر روسی زندگی کے صحیح نقشے پیش کرنا سماجی مسئلوں سے دلچسپی اور ان پر تنقید اور عجائبات اور رومانیت کی افراط و تفریط سے کنارہ کشی ہے۔ یہ لوگ ایسے اسلوب بیان پر زور دیتے تھے جو سادہ اور واضح ہو اور چیزوں کی سچی تصویر پیش کرے۔ تورگنیف اس اسکول کی غیر فانی یادگار ہے۔ اس کے قصے سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور کرداروں میں اس کے مرد عموماً کمزور اور عورتیں طاقتور ہوتی ہیں۔ اس کا

اسلوب حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود تہذیب سے نہیں گرتا اور جوش کے بغیر شاعرانہ ہے۔ ڈوستووسکی غریب اور دیہاتی طبقوں کی زندگی پیش کرتا ہے۔ "غریب منشی" اس کے مشہور کردار بن گئے ہیں۔

ٹالسٹائی اردو میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی عظمت کی بنیاد اس کے قصوں کا انسانی عنصر ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی اخلاقی بہتری چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک نئی اخلاقی عیسائیت کا پرچار کیا۔ سب سے بڑھ کر اس کا بے مثل سادہ اندازِ بیان ہے جس میں لفاظی اور علمی نمائش کو بالکل دخل نہیں ہے۔

چیخوف کے کارنامے اس ہستی کے مظہر ہیں جو ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان روسی ادب پر طاری رہی۔ اس کے بہترین افسانے اس کے زمانے کے ذہین لوگوں کی فریب خوردگی اور بے کاری کے مرقعے ہیں۔

کارل مارکس کے عقائد کی نشر و اشاعت سے روس میں جو نئی روح پیدا ہوئی اس کی یادگار میکسم گورکی ہے۔ وہ نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اس کی ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ بیکاری اور آوارہ گردی میں بسر ہوا تھا۔ اس نے اپنے قصوں میں آوارہ گردوں کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ حقیقی ہونے کے باوجود رومانیت سے پُر ہیں۔ یہی دو خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس کے قصے ساری دنیا میں مقبول ہیں۔ جنگِ عظیم کا اثر روس میں بولشویک انقلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس عہد میں مملکتی سیاست کی جو پابندیاں ادیبوں پر عائد ہوگئی ہیں ان کے اثر سے ادب میں یکسانیت، میکانیت اور پروپگنڈے کی خصوصیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لئے موجودہ زمانے میں عالمی شہرت کا کوئی قصہ نگار پیدا نہ ہوسکا۔

فرانس کے باکمال قصہ نگاروں میں یوں تو بلزاک سے لیکر رومین رولان تک سب کے اچھے قصے اردو میں ترجمہ ہوچکے ہیں لیکن ماپساں کی سی مقبولیت کسی کو حاصل نہ ہوسکی۔ ماپساں فرانسیسی ادب میں حقیقت نگار گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے اپنے زمانے کے عیش پسند فرانس کی سچی اور حسن کارانہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اس کے اکثر قصے صنفی تعلقات کے وسیع پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب بیان حقیقت اور صناعی کی آمیزش کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اردو کے بعض قصہ نگار جن میں جلیل قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اسی سے متاثر ہیں۔ اس کے بہترین قصوں کا اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

جنگِ عظیم سے فرانس کے نوجوان ادیبوں کی مصروفیتوں میں رخنہ پڑگیا۔ ان میں سے بعض تو جنگ میں کام آئے جو بچ رہے ان میں جوشِ اظہار قابلِ دید ہے۔ اس زمانے کے کارنامے جذبات کی صداقت وطنی جوش اور قومی شجاعت کے دلولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جنگ کا خطرہ دور ہوجانے پر وہ جوش تو کم ہوگیا لیکن نوجوان ادیبوں نے اس طرح کام شروع کیا گویا انھیں اگلے ادیبوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انھوں نے ایک نئی دنیا بسانے کی کوشش کی لیکن انھیں جلد محسوس ہوگیا کہ وہ اگلے لوگوں کے اثر سے نہیں بچ سکتے۔

موجودہ قصہ نگاروں کے رجحانات قابلیتوں کے اختلافات اور ان کے مقصد اتنے ہی وسیع ہیں جتنے موجودہ اردو

قصہ نگاروں کے نظر آتے ہیں۔ ان کی فکر میں اتحاد کم ہے اور ہر شخص اپنے طبعی میلان کی پیروی کرتا ہے۔ اسی لئے ان کی گروہ بندی کی کوشش دشوار نظر آتی ہے۔ تاہم ایک چیز جو ان میں مشترک ہے وہ نفسیاتی تجسس ہے۔ یہ چیز بعض موجودہ اردو قصوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

اطالوی قصہ نگاروں کا اثر یورپی ادب پر کافی پڑا ہے۔ اردو میں بھی جستہ جستہ قصوں کے ترجمے ہوچکے ہیں جن میں بوکاچیو سے لے کر میکاویلی باندیلو کارلوگوزی اور گریزیا ڈیلیڈا جیسے حال کے قصہ نگاروں کے قصے تک شامل ہیں۔ لیکن ان قصوں کا کوئی خاص اثر اردو لکھنے والوں پر نہیں پڑا۔ یہی حال جرمن قصوں کا بھی ہے۔

گرم پال ہائز شانزلر وغیرہ کے کچھ قصے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں لیکن ان میں کوئی نمونہ نہیں بن سکا۔ جرمنی کے صاحب فکر ادیبوں جیسے گوئٹے شلر ہیگل کانٹ اور شوپنہار کے اثرات فرانس انگلستان روس اور دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیبوں پر وقتاً فوقتاً پڑتے رہے۔ لیکن اردو میں ان کا کوئی راست اثر سوائے اقبال کے کلام کے کسی اور جگہ کم نظر آتا ہے۔ گوئٹے کے شاہکار "فاوسٹ" کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے اس کا بھی کوئی معین اثر اردو میں ظاہر نہیں ہوا حالانکہ یہ کارنامہ نہایت معرکتہ الآرا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپی قصوں کے اثرات اردو میں زیادہ تر انگریزی زبان کی توسط سے پہنچے لیکن یہ بات خاص طور پر دیکھنے کی ہے کہ انگریزی قصہ نگاروں مثلاً کپلنگ، ساقی چسٹرٹن، ایچ جی ویلز اور گالز وردی کا اثر بھی ہمارے قصہ نگاروں پر بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ کپلنگ، ایچ جی ولز اور گالز ورذی کے اکثر قصے اردو میں منتقل ہوچکے ہیں۔ انگریزی قصوں کے زیادہ مقبول نہ ہونیکا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ انگریزوں کی مخصوص ذکاوت مزاج اور لطف گفتار کا ہم پورا حظ نہ اٹھا سکتے ہوں۔ اس کے برخلاف فرانسیسی اور روسی قصے جو انگریزی کی توسط سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ ترجمے میں اپنی بہت سی انفرادی خصوصیات کھو دیتے ہیں۔ اسی کا ایک ثبوت امریکی قصے بھی ہیں۔ واشنگٹن ارونگ کے قصے ہمارے پاس او ہنری اڈگر ایلن پو، مارک ٹوین اور برٹ ہارٹ کے قصوں سے زیادہ مقبول ہوئے۔ اوران میں زیادہ تر وہ قصے ہیں جو اسلامی اسپین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو میں ترجمہ ہوتے ہوتے یہ مشرقی لباس اختیار کرلیتے ہیں اس کا اندازہ نیاز فتحپوری کی نگارستان کے قصوں کو پڑھنے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

اردو کے تمام موجودہ قصوں پر اس وقت تبصرہ کرنا ممکن نہیں اس لئے ہم صرف نمایاں دبستانوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

سب سے پہلا اور نمایاں دبستان معاشرتی اور قومی قصہ نگاروں کا ہے۔ اس کی بنیاد منشی پریم چند نے رکھی تھی۔ سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اس طرز کے مشہور پیرو ہیں۔ ان کے قصے ہندستان کی سادہ دیہاتی زندگی کے مرقعے ہوتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں بھی یہ بےحد سادگی پسند کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کا موضوع بھی معاشرت ہے۔ لیکن ان کے قصے زیادہ پیچیدہ اور ان کا اسلوب نفسیاتی ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ رومانی اور نفسیاتی قصہ نگاروں کا ہے

جن کے موضوع عام زندگی سے ہٹے ہوئے اور شاعرانہ ہوتے
ہیں اسلوب کے لحاظ سے یہ دبستان یورپ کے "موجودہ" کے
مماثل ہے۔ ان کا کمال تخیل کی مدد سے غیر محسوس کو محسوس بنانا
ہے۔ اس طرز کے مشہور لکھنے والے سجاد حیدر یلدرم، نیاز
فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی ہیں۔ پروفیسر
محمد مجیب اور اختر حسین رائے پوری کے قصے نفسیاتی تجزیہ کے
ساتھ ساتھ صداقت اور سادگی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

تیسرا مکتب مزاحیہ قصہ نگاروں کا ہے جس میں
عظیم بیگ چغتائی سب سے پیش پیش ہیں ان کے قصے
مختصر قصوں کے تمام اجزا پر حاوی بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے
مزاحیہ نگار مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی
پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ایم اسلم اور ملا رموزی وغیرہ
شکل یا صنف کے پابند رہ کر نہیں لکھتے۔ لیکن ان کے
مضامین کبھی کبھی مختصر قصے کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

چوتھا اور آخری گروہ وہ ہے جس میں زیادہ تر
ترجمین شامل ہیں۔ یہ جلیل قدوائی، منصور احمد مرحوم،
عابد سلیمان، سعادت حسن منٹو اور ان کے ساتھیوں پر
مشتمل ہے۔ منصور احمد نے دنیا کی مشہور زبانوں کے بعض قصوں
کا ترجمہ دنیا کے بہترین افسانے کے نام سے شایع کیا تھا۔
جلیل قدوائی نے موپاساں کے کئی قصوں کا ترجمہ کیا اور
سعادت حسن منٹو اور ان کے شریک کار روسی ادب اور
مختصر قصوں کو اردو سے روشناس کرنے کی کوشش میں
مصروف ہیں۔

جنگ سے پہلے کے قصوں کا ہمارے پاس بہت زیادہ
ذخیرہ نہیں ہے لیکن جو کچھ موجود ہے یا پھر یورپ کے اگلے
اساتذۂ فن سے حاصل ہوا ہے اس کا مقابلہ موجودہ زمانے
کے قصوں سے کرنے پر یہ ظاہر ہوگا کہ قدیم قصہ نگاروں
کا بڑا کمال ذوق قصہ گوئی میں ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے
قصوں میں یہ چیز ان کے آرٹ یعنی صناعی کے مقابلہ میں
کم نمایاں ہے۔ موجودہ قصہ نگار نہایت ایمائی اشاروں
سے کام لیتا ہے۔ اس کا رجحان ایجاز یعنی اختصار کی طرف
بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ ہمارے زمانے میں حیاتیات، نفسیات
اور سائنسی علوم کو جو ترقی ہوئی ہے اس کا ذخیرہ بھی
موجودہ قصہ نگار کے پشتے کے طور پر موجود ہے۔ جدید قصوں
میں اکثر ایسے ہیں جن میں نہایت مجمل طور پر نفسیاتی تجزیہ
سے کام لیا گیا ہے۔ اس زمانے کے سماجی معیاروں اور
صنفی خیالات میں جو بھاری انقلاب ہوگیا ہے اس کے
اثرات بھی قصوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ موجودہ
لکھنے والے اپنے پیش رو اساتذہ کے مقابلہ میں بھی زیادہ
غیر رسمی نظر آتے ہیں۔ ان کے موضوع پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور
انکے لئے کوئی چیز ناگفتنی نہیں رہی ہے۔ وہ ادب کا کمال صناعی سمجھتے
ہیں موضوع خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ وہ عام رجحانات ہیں جو یورپی قصوں
کی طرح اردو قصوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عبدالقادر سروری

سماج کے دلنشیں محل میں

ندی کے پورب میں، فاصلے پر "سماج کے دلنشیں محل میں"
بڑی عقیدت سے گا رہی ہو — ستار لے کر دعا کے گانے
خیال یہ ہے کہ پا رہی ہو — "پتی" کو اپنے اسی بہانے
سماج ہی کو سنا رہی ہو — سماج کے ظلم کتنے فسانے
ہنسی میں مورت کی کھو نہ جائے تمہاری پوجا حسیں محل میں

پرستشوں کی ہر ایک شئے پر — تمہارے غم خوار ہنس رہے ہیں
بھجن کی اس باخلوص لے پر — ستار کے تار ہنس رہے ہیں
کرشن جیسے تمہاری لَے پر — ندی کے اُس پار ہنس رہے ہیں
یہی کہ مذہب کے جھوٹے معنی کوئی بھی دیوتا نہیں سکھاتا
کسی کو دوشیزگی کے رنگیں دنوں میں "بیوا" نہیں بناتا!

کسی سے بچپن کے دن سے مانا — تمہاری شادی کا فیصلہ تھا
تمہاری معصومیت کا بدلہ — سماج کا ایک قہقہہ تھا
مگر تصور بھی اب نہیں ہے!
کہ کس سے باندھا تھا ماں نے رشتہ
تمھیں بتاؤ، تمھیں یقیں ہے
کہ "وہ" ہیں اس مورتی میں زندہ؟

قسم ہے تم خود سمجھ رہی ہو، قسم ہے تم کو یقیں نہیں ہے
میں جانتا ہوں تمہاری خاطر یہ مورتی "دلنشیں نہیں" ہے
مگر پرستش کی کوششوں میں خیال اپنا بٹا رہی ہو
سمجھ رہی ہو "دعا کے گانے" بڑی عقیدت سے گا رہی ہو
تمہارا کہنا کہ "یہ ہے مذہب"، تمہارا کہنا "سماج یہ ہے"
تمہارا کہنا کہ "عورتوں کے بلند رتبے کی لاج یہ ہے"
غلط ہے، دھوکا ہے، عورتوں پر یہ قہر ہے، ظلم ہے، ستم ہے

معاف جس کو نہ کر سکے گی کبھی بھی "انسانیت" قسم ہے!!

اگر ضروری ہے "ایسی صورت　　اور اس پہ یہ گیروا دوشالہ"
اگر ضروری ہے "یہ نزاکت　　اور اس پہ اتنی طویل مالا"
اگر ضروری ہے "یہ عبادت　　تمہاری خواہش کا پاٹ شالا"
تو آؤ مالا یہ توڑ بھی دو
کہ "پھول کا ہار" آگیا ہے!
تو آؤ مندر کو چھوڑ بھی دو
تمہیں بتاؤ، دھرا ہی کیا ہے
ندی کے پورب میں، فاصلے پر "سماج کے دلنشیں محل میں"

سلام (مچھلی شہری)

فلسفی سے

تو عقل سے ہے طالبِ اسرار و معارف　　اس راہ میں ہے پیکِ جنوں پختہ و چالاک
تو زیست کے اسرار سے واقف ہو تو کیونکر　　گم کردۂ منزل ہے تری خامیٔ ادراک
ہر ذرہ ہے آسودۂ اسرارِ کم و کیف　　وہ سرو و سمن ہوں کہ ہجومِ خس و خاشاک
گو اوجِ فلک پر ہیں چمکتے ہوئے تارے　　ان تاروں سے خالی نہیں یہ انجمنِ خاک
ہر چند رہا صیدِ ستم ہائے زمانہ　　پھر بھی مری فطرت رہی آشفتہ و بیباک
منزل مری احساس کی حد سے بھی ہے آگے　　اور تو ہے ابھی گم شدۂ جادۂ ادراک
جینے کا مزہ غم سے ہے غم ڈھونڈ رہا ہوں　　آنکھیں مری آلام کے اشکوں سے ہیں نمناک
اے کاش کہ آگاہ ہو تو لذتِ غم سے　　فطرت تجھے دے اک دلِ گرم و نگہِ پاک

ظفر (عثمانیہ)

ایک گلاس پانی

ع وہ دن گئے کہ کہتے تھے شوہر نہیں ہوں میں

اس سال کے مسعود و مبارک ماہ ربیع الاول میں میری' شادی خانہ آبادی' رچادی گئی۔ میری منتوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ میرے عذرات اور دلائل اِس کان سن کر اُس کان اڑا دیئے گئے۔ کوئی ہرج نہیں اگر میں بے روزگار ہوں' زیرِ تعلیم ہوں' کمسن ہوں.... کوئی ہرج نہیں.... شادی بہرحال ہونی تھی۔ سرپرستوں کو میرے سر سہرا دیکھنے' اور بہو گھر لانے کی آرزو تھی.... اور وہ ہو گئی۔ آپ جانیئے ہندستانی نوجوان' شادی' کے معاملہ میں لڑکیوں سے کچھ کم مجبور نہیں.... اس کی مرضی بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی.... ماں باپ راضی ہوجائیں تو گھر پر نوبت نقارے بجنے لگتے ہیں' اور ایک بیچارے طوطی کی "نہیں' نہیں.... ابھی نہیں" کی فریاد کو کوئی نہیں سنتا....

شادی میں عزیز اقربا' دوست احباب سب شریک تھے۔ سب کو خوشی تھی۔ سہرے لکھے گئے۔ مبارکبادیاں دی گئیں.... اور تناول طعام ما حضر سے داعی کو ممنون و مشکور فرماتے ہوئے' رقص و سرود کی محفل میں تھوڑی دیر "لوٹ پوٹ" کر کے سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے.... اور میں اکیلا اپنی دلہن کے پالے پڑا۔

میری قسمت جیسی بھی ہو۔ ان کی قسمت تو قابلِ رشک تھی۔ ایک اطاعت گزار' تعلیم یافتہ' رحم دل خاوند ان کے حصہ میں آیا تھا جس کے نزدیک دل دکھانا سب سے بڑا گناہ تھا.... جو اپنی گفتگو سے اپنی حرکات و سکنات سے.... غرض کسی طریقہ سے بھی "ان نازک آبگینوں کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا تھا۔ چاہے اس احتیاط سے اس کی جان پر ہی کیوں نہ بن جائے....

قسمت کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ "گربہ کشتن روزِ اول" کے ہتیار کو میرے بدلے وہی سنبھال بیٹھیں اور حجلۂ عروسی سے باہر نکلتے ہی' انھوں نے پیٹ سے پاؤں نکالنے شروع کر دیئے۔

حکم ہوا کہ دوست احباب سے ملنا کم کردوں۔ اور ان کی تعداد کو بالکل گھٹا دوں.... صرف شادی شدہ دوست احباب سے دوستی رکھوں' باقی کو جواب دے دوں کہ "گھر پہ نہیں ہوں".... "ایک بات اور"..... وہ یہ کہ سگریٹ ایک دم نہیں تو رفتہ رفتہ ضرور ترک کردوں۔ سینما بینی بھی موقوف کردوں۔ اور راتوں کو دیر تک پڑھتا بھی نہ رہوں.... اور.... اور.... مختصر یہ کہ ع

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اور کسی کا کیا جائے گا' یہی حال رہا تو گھٹ گھٹ کے مرجاؤں گا ایک دن۔ لیکن کوئی ان سے بھی تو پوچھے کہ' شوہرِ محترم' کو' قید و بند' کی زنجیروں میں جکڑ کے آخر ان کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ کیا کرنے والی ہیں۔ کچھ نہیں کریں گی.... انھیں کرنا ہی کیا رہتا ہے..... صبح سے شام تک تکیہ سے لگی بیٹھی رہیں گی۔ تکیہ بنی ہوئیں' نہ ہلنا نہ جلنا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ پاندان کھسکا لیا' چھالیہ کترنے لگیں پان لگایا' کھائیں' اگالدان اٹھایا' پیک تھوک دیا۔ اور زمانہ بھر کی باتیں۔ بلا سے چاہے گھر کا انتظام بھاڑ میں جائے۔ پروا نہیں اگر دھوبی ہر دھلائی میں کپڑے کم لاتا ہے۔ فکر نہیں جو ماما غلہ چرا چرا کر اپنا گھر بھر رہی ہے۔ خاوند کے کپڑے تار تار ہو رہے ہیں' اختلاج قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے.... میرا کام تو فقط ان کی ہدایت کے مطابق صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور ان کے آرام کا خیال

رکھنا ہے۔ میں اپنا دکھڑا کیسے روؤں؟ کبھی دبی زبان میں کچھ کہتا بھی ہوں تو جواب ملتا ہے کہ "یہ ہمارے خاندان کا طریقہ نہیں"۔ اب اُن سے کون کہے "منہ پھٹ" ہو کر کہ ہمارے پاس سو پشت سے یہی دستور چلا آتا ہے کہ بیوی گھر کی' اور گھر والے کی ذمہ دار ہوتی ہے... دونوں کا خیال سب پر مقدم ہے..... مگر کون کہے؟"......

ان کے راج میں گھر کا نقشہ بھی دیکھ لیجئے کہ کس طرح کا ہے۔ جہیز کا سامان اس طرح منتشر پڑا ہے جیسے اب ان کا نیلام کیا جائے گا.... کوئی چیز قرینہ سے جمی ہوئی نہیں دیوانخانے کا سامان باورچی خانہ میں... میرے کمرے کا سامان کچھ گودام میں کچھ مودی خانے میں... ان کا مطلب شاید یہ ہو کہ میں آپ ہی جھک مار کر سب کچھ سلیقہ سے رکھ لوں گا..... مگر ع رگوں میں میرے خون ہے پانی نہیں ہے گھر پھونک کر تماشہ دیکھوں لیکن وضع داری پر آنچ نہ آنے دوں... گھر کل کا بگڑنے کا آج بگڑتا ہے... بگڑا کرے مجھے کیا... سوچ لیا ہے کہ کسی نہ کسی دن وہ مجھے الزام دیں گی ضرور... اس وقت سمجھ لوں گا.... ایسی خبر لوں گا کہ یاد کرتی رہیں گی... فی الحال تو ہم دونوں خاموش ہیں۔ میں تو خیر اس لئے بھی خاموش ہوں کہ ابھی روزگار سے نہیں لگا... اور شاید وہ بھی یہی سوچ کر خاموش ہوں کہ جب یہ کما کر لگائیں گے' تب ہم پیر پھیلائیں گے....

دنیا کا دستور ہے کہ چاہے کسی کی شادی ہو یا نہ ہو' دوست احباب' ملنے جلنے والے' اس کے گھر آتے ہیں... کچھ دیر بیٹھتے ہیں.... صاحب خانہ مقدرت رکھتا ہو تو' تواضع بھی کرتا ہے... اور خلوص کے رشتہ کو اور بھی مضبوط بناتا ہے.... خود ہم اپنے کئی دوستوں کے یہاں وقت بے وقت جا دھمکتے ہیں' خدا کے فضل سے وہ بھی شادی شدہ ہیں... ہمارے آنے کی خبر سن کر سو کام چھوڑ کر ملنے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش نظر آتے ہیں۔ بیوی کی طرف سے کوئی اندیشہ دل میں نہیں رہتا... الٹا اس کی تعریف میں ان کے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں... پان آتے ہیں... کہلوایا جاتا ہے کہ دولہے میاں کے دوست آئے ہیں' تو سلام آتا ہے... کچھ مٹھائی بھی بھیج دی جاتی ہے.... اپنے خاوند کے دوستوں کی عزت اور تواضع بیوی کا اولین فریضہ ہے... لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ دوست تو دوست رشتہ دار بھی آجائیں تو چڑھی تیوری اترنے کا نام ہی نہیں لیتی... لاکھ سمجھاتا ہوں کہ عزت اور وقار کا سوال ہے.... جھوٹے منہ تو ہنس بول لیا کرو۔ لیکن ایک "اونہہ" ہزار "اونہہ"۔ حسن کا میں پہلے ہی سے روادار نہیں ہوں۔ میں تو سلیقہ شعاری اور حسن سیرت کا شیدا تھا... پردہ کا رواج نہ ہوتا تو شاید لوگ مجھے خوش قسمت سمجھتے کہ ایک حسین بیوی کا شوہر ہوں۔ اب تو رونا ہی رونا ہے۔ گھر کا ڈھنگ ایسا بیوی کی طبیعت ایسی... جو بھی دیکھے گا نام رکھے گا... کوئی ملنے آتا ہے تو پہلے تو صاف چلے جانے کو کہا جاتا ہے۔ کوئی مارے خلوص کے ڈھیٹ بنا کھڑا ابھی رہے تو مجھے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ "فوراً اس سے پیچھا چھڑا لو"... اب چاہے وہ شخص کتنی ہی دیر بیٹھا رہے۔ اندر سے نہ تو پان آتے ہیں نہ کچھ اور۔ الٹا بار بار ماما ٹپکتی رہتی ہے کہ "اندر بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں...." ... گھر چھوڑ کر ہی بھاگ جاؤں گا تب انھیں ہوش آئے گا۔

پرسوں کے واقعہ سے تو دل پر ایسا گھاؤ پڑا ہے کہ ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے... بچپن کا ایک دوست مجھ سے ملنے آیا... مجھے اس سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ

اسے دو تین دن روک رکھوں، اور موقع سے اس کے گلے لپٹ کر خوب جی بھر کر روؤں.... خوب خاطر تواضع کروں، اور اس کا بھی تقاضا تھا کہ "شادی کی دعوت دو...." مگر.... خیر.... باتوں ہی باتوں میں کامل ایک گھنٹہ گزر گیا، اندر سے نہ تو پان آتے ہیں اور نہ چائے.... بے چارے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "بھئی ذرا پانی تو منگا دو...." میں نے ماما کو آواز دی.... وہ باہر آئی. میں نے کہا "ایک گلاس میں پانی تو لا".... وہ اندر گئی تو گویا بھاپ بن کر اڑ گئی.... ہم دونوں کی نظریں دروازہ پر لگی ہیں کہ اب آتا ہے پانی اور اب.... آخر مایوس ہو کر اس نے باتوں کا سلسلہ چھیڑا.... "کہو یار مزے میں تو ہو نا شادی کی زندگی واقعی بڑے مزے کی ہوتی ہے" میں خون کے گھونٹ پی رہا تھا.... دل میں تو آیا کہ چیخ چیخ کر کہوں.... "نہیں نہیں. شادی میرے لئے لعنت ثابت ہوئی. بیوی بلائے ناگہانی. اور شادی کی زندگی.... سکرات سے بڑھ کر تکلیف دہ.... مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ کہنے کو تو کہہ دوں گا.... لیکن نتیجہ کیا. ! جگ ہنسائی کے سوا اور ہوگا کیا! .... خود کو بڑے "احتیاط" سے ہشاش بشاش بنا لیا. چہرہ پر شرم آلود مسرت طاری کر لی.... "ہاں بھئی. بڑی پر لطف زندگی ہے. شادی.... خوشیوں اور مسرتوں کی کیاری ہے سمجھو.... اور بیوی. کیا کہنے ہیں بیوی کے.... سراپا دلہن.... سراپا ناز سراپا حسن.... مجھے مبارکباد دو.... قسمت کا دھنی ہوں...."

اتنے میں ماما اندر سے پانی لے آئی. مگر نہیں وہ تو چائے لا رہی تھی. میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا.... کیا وہ اتنی سمجھدار ہو گئی ہیں.... چند گھنٹوں میں انھیں عقل سلیم نصیب ہو گئی. سلیقہ شعاری پر کمر باندھ لیا ہے انھوں نے.... میرا دوست پانی منگائے.... اور بھیجی جائے چائے.... میں نے فرطِ مسرت سے بے اختیار ہو کر کہا "لا. لا" لیکن ماما چہرہ کو سو سو جگہ سے بگاڑے کچھوے کی رفتار سے آ رہی تھی میرے دوست نے اپنی قلبی کیفیت کو چھپاتے ہوئے، ازراہِ تکلف کہا.... "ارے یہ کیا، بھئی یہ بھی کوئی وقت ہے چائے کا.... اور پھر میں ابھی ابھی گھر سے چاء پی کر آ رہا ہوں...." .... نہیں صاحب یہ تو نہیں ہو سکتا. چاء آپ کو پینا ہی پڑے گی.... نہ جانے جلدی میں کیسی بنی ہے.... مگر میاں چاء بنانے میں ہماری بیوی کمال کرتی ہیں اور اس معاملہ میں تو وہ سب سے بڑھی چڑھی ہیں. یعنی وقت بے وقت چاء سے تواضع کرتی رہتی ہیں. وہ تو کہو تمھاری قسمت ذرا خراب ہے ورنہ خوان پر خوان خالی کرنے پڑتے. لاکھ سمجھاتا ہوں کہ آخر اس تواضع سے مطلب کیا ہے تمھارا. لوگ آنا چھوڑ دیں گے.... مگر وہ تو جیسے قسم کھا رکھی ہیں کہ میرے ہر دوست کو بغیر کچھ کھلائے پلائے جانے ہی نہ دیں گی...... مجھے افسوس ہے کہ تم اتنے دنوں بعد آئے. اور صرف چائے پر ٹلائے جا رہے ہو.... اور دیکھنا چاء بھی کیسی نکلتی ہے. میں نے کہا نا جلدی میں تیار ہوئی ہے...." ... میرے دوست نے پھر کہا.... "نہیں صاحب مجھے معاف ہی کرو تو بہتر ہے.... تمھارا.... بھابی جان کا لاکھ شکریہ.... پھر کبھی سہی...." مگر میرے دل میں تو خوشی کا ایسا طوفان لہریں مار رہا تھا کہ دوست کو پچھاڑ کر اس کے حلق میں چاء انڈیلنے کو تک تیار تھا.... میرا حال اس فقیر کا سا تھا جو صدا لگاتے ہی "لے جاؤ شاہ صاحب" کا جواب سنتا ہے.... "چاء نہیں پئیں گے، بونگر نہیں پئیں گے" پینا ہی پڑے گی.... اور لکھ دینا پڑے گا کہ "میں نے چاء پی...." اور میں سب کو دکھاتا پھروں گا کہ کیوں خواہ مخواہ میری بیوی کو بدنام کرتے

پھرتے ہو۔ دیکھو میرا ایک دوست کیا لکھتا ہے...." میں نے چاہ پی۔
ہاں۔ ہاں... میری بیوی نے.... میری شریک حیات نے میری
وائف نے میرے دوست کے لیئے چار بھوائی۔ اپنے ہی نازک نازک
ہاتھوں سے بنا کر....

ماما کے پیروں پر جیسے ریت کے تھیلے بندھ گئے....
یوں آرہی تھی جیسے ہوا اسے ڈھکیلتی لارہی ہے... مگر اس کی
یہ سست رفتاری بھی بارِ خاطر نہ تھی۔ وہ چار لارہی تھی۔ بس یہی
کافی تھا.... وہ اگر اسی طرح چار کی پیالی دکھاتی دور ہی دور کھڑی
رہتی تو بھی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا.... میں نے مسکراتے
ہوئے اپنے دوست کی طرف دیکھا تو وہ خود کو چار پینے کے لیئے
تیار کر رہا تھا۔ اور چہرہ پر اس کیفیت کو طاری کر رہا تھا جو چار
پینے سے پہلے طاری ہوا کرتی ہے۔ یعنی سراپا ممنونیت سراپا خلوص
.... اور اس کے چہرے پر چار کا لطف اور ذائقہ ابھی سے اپنی
پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ ماما قریب آئی تو میں نے اس انداز
سے کہا..... جیسے ہر دوست کی آمد پر ایسی ہی خاطر تواضع ہوتی
ہے اور یہ کہ یہ تو ایک بالکل معمولی بات ہے...." دے صاحب کو
دے" اور ماما پیالی کو میرے دوست کے ہاتھ میں پکڑا کر تیزی
سے اندر چلی گئی.... کچھ دیر ٹھیرتی تو میرا ارادہ۔ بغیر طشتری کے
پیالی لانے پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا تھا.... لیکن وہ تو
جا چکی تھی۔ اب میں اپنے دوست کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں
تو دودھ کی طرح سفید.... اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ..
میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے غٹا غٹ پیالی کو خالی کر دیا
اور اسے میز پر رکھ دیا.... میں نے آگے جھک کر پیالی کے
اندر دیکھا تو.... خون خشک ہوگیا.... چار تو کسی حال اس میں
نہ تھی چار ہوتی تو وہ ایک ہی گھونٹ میں سب کی سب کیسے پی
جاتا؟ پیالی کی تہہ میں چار کا رنگ کیوں نہیں؟ میرا چہرہ شرم سے
سرخ ہوگیا... ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا..
میری آنکھیں جھک گئیں.... میرا دوست نہ جانے کس حال میں تھا۔
کافی دیر ہوچکی تھی۔ اس لئے وہ جانے کے لئے اٹھا... اور جانے
کی اجازت طلب کی۔ میں نے گردن اٹھانی چاہی تو ایسا محسوس
ہوا جیسے کمرہ کی چھت کا سارا بوجھ میرے سر پر دھرا ہے... اسی طرح
گردن جھکائے میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "خدا حافظ"....
اور یہ تک نہ دیکھا کہ میرا دوست ہے بھی یا چلا گیا۔ میں وہاں سے
پیچ و تاب کھاتا اٹھا.... اور نیچی گردن کئے۔ آہستہ آہستہ
قدم اٹھاتا... اندر داخل ہوا غم و غصہ کی چنگاریاں میرے تن
بدن میں چٹک رہی تھیں.... "کہاں ہے وہ ماما کی بچی" میں نے
داخل ہوتے ہی پوچھا وہ باورچی خانہ سے باہر آئی۔ "جی" اس نے
مجھے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔ "جی.... کیوں ری
تو ہمارا نمک کھاتی ہے اور ہماری ہی عزت کے درپے ہے..."
"میں نے کیا کیا سرکار"....

"تو نے کچھ نہیں کیا۔ ارے تو نے تو ہماری عزت پر پانی
پھیر دیا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تجھے گھر سے باہر کر دوں.. تو کمبخت
.... ماما ہے یا چڑیل...." ماما میرے اس جملہ پر واقعی چڑیل کی
طرح تیز ہو کر بولی "آخر میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے جو آپ
مجھے "غیر غلط" بول رہے ہیں۔ بیگم صاب بھی مجھے آج تک
تم سے تو نہیں بولے...." "اری نمک کی بچی.... پانی پلانے کا
یہ کوئی طریقہ ہے، پیالی میں پانی پلاتے ہیں شریف آدمیوں کو
.... پیالی میں.. اف...." اتنے میں وہ بھی آگئیں۔ "کیا
ہو رہا ہے.. بے چاری پر خواہ مخواہ کیوں برس رہے ہو...."
"آئیے آپ بھی کچھ سنیئے.... میرے دوست نے پانی مانگا تو

گوالن

انسانیت کی قدر، خلوص اور محبت آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں میں کہاں؟ یہ نعمتیں اُن لوگوں کا حصہ ہیں جن کو مہذب طبقہ "گنوار" قریہ باش کہتا اور نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔

اُس زمانے میں جب کہ میسور پر پالیگاروں کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا، انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی، رحم و کرم کی جگہ بربریت اور غارتگری کا دور دورہ تھا، انسانوں کا قتل محض دل کا بہلاوا خیال کیا جا رہا تھا، ایسے وحشت خیز دور میں چند ایسی ہستیاں خدا نے پیدا کردیں جن کا وجود ایک دیوتا یا فرشتے سے کم نہ تھا۔

میسور کا ملک اُس وقت پہلوانوں کا اکھاڑا تھا، کوئی دن، کوئی ساعت، ایسی نہ گزرتی جس میں انسانوں کا خون پانی کی طرح نہ بہایا جاتا ہو، ہر زور آور یہی چاہتا تھا کہ کمزور کی ہستی کو نیست و نابود کردے، درندوں کی طرح لڑتے رہنا، مچھلی کی طرح کمزور کو مار کر اپنی آتش شکم کو بجھانا اور اپنی کامیابی پر اکڑنا معمولی مشغلہ تھا، اس وقت ایسا کرنا ناگوار بھی نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ عام فضا یہی تھی۔ حیرت تو یہ ہے کہ آج کل کے جیسے شائستہ زمانے میں ایسی ناشائستہ حرکتیں اچھی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں۔ بھلا یہ کونسا انصاف ہے کہ ہم اپنے زمانے میں بربریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو کچھ نہ کہیں اور گزرے ہوئے لوگوں کی برائیوں کو طشت از بام کریں۔

چتل درگ کا نایک ایک معمولی راجا تھا لیکن چند معرکوں میں اُس کی کامیابی نے بہت زیادہ مغرور بنا دیا تھا۔ آس پاس کے معمولی قلعداروں پر اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اپنی کامرانی کے بعد اس نے یہاں کے پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ بنایا، یہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی مضبوط فصیل ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک جھیل ہے جو پہاڑ کے تین چوتھائی حصے کو گھیری ہوئی ہے، قلعے میں پہنچنے کے لئے سنگین سیڑھیاں بنائی گئی ہیں اور جگہ جگہ رہنے کے لئے سنگین مکان ہیں اور ان مکانوں میں پتھر کے بت رکھے گئے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر سنگین محل اور محل سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں بارش کے موسم میں پانی زیادہ رہتا ہے۔ پہاڑ پر کچھ دور چڑھنے کے بعد قلعے کا صدر دروازہ ملتا ہے جو بہت بلند اور پتھر کا بنا ہوا ہے۔ صنعت و کاریگری کا تو نام و نشان نہیں نظر آتا لیکن ایک سیاح کا دماغ اسوقت کے لوگوں کی طاقتوں کا اندازہ آسانی سے کرسکتا ہے۔ معمولی پتھر کے سادہ اور اونچے ستون کھڑے کردئے گئے ہیں۔ صدر دروازے سے پہاڑ کی چوٹی تک دو ایک دروازے اور ملتے ہیں۔ ان دروازوں کے درمیان کھنڈر ہی کھنڈر ہیں جہاں کسی زمانے میں شاندار عمارتیں ہونگی لیکن اب تو ان پر اُلو بول رہے ہیں۔ جابجا ٹوٹی پھوٹی دیواریں، ان میں بھیڑیوں اور گیدڑوں اور ابابیلوں نے اپنا مسکن بنالیا ہے۔ درخت اور خار دار جھاڑیاں جابجا اُگی ہیں، وہ بھی شباب رفتہ کا نوحہ کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اسی کھنڈر کے درمیان درختوں کے جھرمٹ میں ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی آبِ حیات سے بھی سوا ہے۔ یہ پانی پہاڑ کی ایک ٹوٹی ہوئی چٹان سے نکلتا ہے۔ گڑھے میں جمع ہوتا ہے اور وہاں سے ایک نالے کی صورت میں آہستہ آہستہ بہہ کر نیچے دامن میں آتا اور ایک سرنگ سے گزرتا ہے۔ اس سرنگ کے قریب کئی نکیلی چٹانیں ہیں اور ان چٹانوں کے درمیان کئی گھنے درخت ہیں، خار دار جھاڑیوں نے اس سرنگ کو اور بھی خوفزدہ بنا دیا ہے۔ ان چٹانوں میں گزرنے کے لئے ایک پگڈنڈی بنائی گئی ہے جس کے نیچے اوپر چٹانیں ہی چٹانیں ہیں یہاں

اکثر چیتے اور بھیڑیے رہتے ہیں لیکن اگلے زمانے میں یہ ہی پگڈنڈی قلعے میں پہنچنے کے لئے "چور راستہ" کہلاتی تھی۔

جب حکومت بیجاپور نے نواب حیدر علی خاں کو سرا (رستم آباد) کا گورنر بنایا اور آس پاس کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے کا انھیں اختیار دیا تو حیدر علی نے ان پالیگاروں سے خراج وصول کرنا شروع کیا۔ لیکن جب چتل درگ کے نایک سے خراج کی طلبی ہوئی تو اس نے نواب کی درخواست کو ٹھکرایا ہی نہیں دیا بلکہ جنگ کا اعلان کر دیا اب تو نواب کو بھی مجبوراً اس کی سرکوبی کرنا پڑی۔ نواب اپنے لشکر کے ساتھ سرا سے نکلے اور دو ایک مقام کے بعد چتل درگ کا محاصرہ کر لیا۔ کئی دنوں تک نواب کی فوجیں یہیں پڑی رہیں مگر قلعہ فتح نہ ہوا سپاہی ہر روز قلعے پر چڑھنے کی کوشش کرتے مگر ناکام رہتے، اس لئے کہ محصور فوجیں، جن کے دلوں میں تعصب اور انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، فصیل پر چڑھنے والے سپاہیوں کو تیروں کا نشانہ بناتی، آگ پھینکتی یا گرم گرم تیل انڈیلتی تھیں۔ چڑھنے والے سپاہی، نشانہ لگاتے ہوئے پرندوں کی طرح نیچے گرتے اور وہیں ڈھیر ہو جاتے تھے۔ کئی دن تک یہی حال رہا، لاشوں کے انبار لگ گئے، بہت سی لاشیں سڑ گئیں، ان کی بدبو نے گاؤں والوں کو ہراساں کر دیا تھا، گاؤں والوں سے ایسی بیرحمی کب تک دیکھی جاتی، وہ بھی تنگ آ گئے تھے مگر کسی کو یہ ہمت نہ تھی کہ نواب کی فوجوں سے مل کر قلعے کے خفیہ راستوں سے آگاہ کر دے اکثر لوگ ان راستوں کو جانتے بھی نہ تھے اور جو جانتے تھے وہ راجا کے ہی خواہ تھے یا اس سے زیادہ خوف زدہ۔

قلعے سے ایک میل دور نواب کی فوجوں نے قیام کیا تھا۔ وہیں ایک چھوٹا سا قریہ بھی تھا، رتنا اسی قریہ میں رہتی تھی۔ اس گاؤں میں ادھر ادھر چند جھونپڑیاں تھیں، سامنے کھیتوں سے لگے ہوئے ڈومٹی کے گھر تھے جن میں پٹیل اور پٹواری رہا کرتے تھے، رتنا کی جھونپڑی سے لگی ہوئی ایک دوسری جھونپڑی تھی جس میں رمّو رہتا تھا، ان دونوں جھونپڑیوں کا ایک ہی آنگن تھا۔ رمّو کی جھونپڑی سے بالکل قریب کئی سایہ دار درخت تھے اور درخت کے نیچے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ رتنا نے آنگن میں کئی قسم کی ترکاریوں کی بیلیں لگائی تھیں اور ان کے لئے چھوٹے چھوٹے منڈھے بھی ڈالے تھے۔ درختوں سے لگا ہوا ایک گئوشالہ تھا جس میں رتنا اپنے گائے بیل باندھتی تھی۔ پٹیل کے مکان کے سامنے کنواں تھا جس سے گاؤں کے تمام لوگ پانی لیتے تھے۔ رمّو کے بیوی بچے مر چکے تھے۔ وہ تنہا اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا ایک کھیت تھا اور چند گائے بیل۔ مگر رمّو مسلمان تھا اور رتنا ہندو۔ ان دونوں کا تعلق باپ بیٹی کا سا تھا۔ ایک روز صبح کو سورج کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آنگن میں گر رہی تھیں، رتنا بیٹھی دودھ دوہ رہی تھی، بوڑھا رمّو کمبل اوڑھے، کھانستا ہوا ہاتھ میں چلم لے کر جھونپڑی سے باہر نکلا اور رتنا کی جھونپڑی کے پاس آ کر پکارا، رتنا نے دھتے ہوئے جواب دیا، کیا ہے — ؟ باواجی! — بوڑھے نے پلٹ کر دیکھا اور کہا: بیٹیا تو دودھ دوہ رہی ہے، چولھے میں آگ ہے کہ نہیں؟ ہو تو ذرا چلم بھر لوں — ہو گی باواجی! اندر جاکر لے لو، دھوپ نکل چکی ہے کلے کو جانا ہے، دیر ہو جائے گی رتنا نے کہا — بوڑھا رمّو دعائیں دیتا ہوا اندر گیا، آگ لی اور باہر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھا حقہ پیتا اور کھانستا جاتا تھا، سامنے رتنا دودھ دوہ رہی تھی۔ کام ختم کر لینے کے بعد رتنا چارپائی کے پاس آئی، دودھ سے بھرے ہوئے لوٹوں کو سامنے رکھ کر

قریب ہی بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے پوچھا کیوں رتنا ابھی نہیں جائے گی تو؟ —— جا تو رہی ہوں باواجی! مگر آج تم سے چند باتیں کرنا ہیں —— رتنا نے کہا۔ وہ کیا بیٹا! —— باواجی نباب کی فوج والے کتنے بھلے آدمی ہیں کہ وہ غیر عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ آج تک انھوں نے نہ ہمارے کھیت اجاڑ کئے، نہ گھر لوٹے —— میں تو باواجی شام سویرے وہیں سے آتی جاتی ہوں مگر انھوں نے ڈانٹا تک نہیں، کیا باواجی یہ ہمارے دشمن نہیں ہیں؟ رتنا نے حیرت سے پوچھا —— بوڑھے نے ہنستے ہوئے جواب دیا: وہ ہمارے دشمن کیوں ہوتے رتنا! ہم گریبوں نے نباب صاحب کا کیا بگاڑا ہے؟ دشمن ان کا راجا ہوگا، اس کے گرور کا بدلہ اسے ملے گا، ہمارے لئے تو سب ایک ہیں، ہم کیا جانیں کون نباب کون راجا —— ٹھیک ہے باواجی پھر —— رتنا یہاں ٹھیر گئی اور پھر کہا، باواجی! وہ جو پچھلے سال مائی کنڈہ کے پالیگار پر اس ہمارے راجا نے لڑائی کی تھی تو کتنے ستم توڑے تھے، گھر بار سب جلا دیے، لوگوں کے کھیت اس نے ماتھے پر ٹیکا لگایا، جالم کہیں کا، اسی لڑائی میں تو میرے پتی نے بھی جان دی، میری آرجوؤں کا ستیاناس ہوا، میرا سہاگ لٹ گیا، پر یہ لوگ ایسے نہیں، میرے دل میں تو ان کے لئے پریم ہے، یہ دکھی ہیں، میں ان کو اس دکھ سے بچانا چاہتی ہوں، دوائی ہوئی ہے تو رتنا! عورت جات ان سورماؤں کے دنگل میں کیا کر سکتی ہے، دن رات گولیوں کی آواجوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں، آدمی کتوں کی طرح مر رہے ہیں، دیکھتی نہیں آنکھوں سے تو، ہم بھی رحم کھاتے ہیں مگر آخر —— تم کم جور، تیرا ہے کوئی نہیں، چپ رہ، بول مت، راجا کو کھبر ہوگی تو تیری جان جائے گی —— اے باوا! اب ہے کون، جو روئے، جب سے میرا پتی مرا، میں تمھاری آڑ میں جی رہی ہوں، ساری آرجوئیں

پھنا ہو چکیں۔ مگر میں ان دکھیوں کو پاپیوں کے ظلم سے ضرور بچاؤں گی —— رتنا! تو دھن کی پکی ہے، کسی کی نہیں مانتی جو من میں آئے کر، مگر اس بوڑھے کو اپنے کرتوت سے بچائے رکھنا —— مانے گی کہ نہیں، رتنا چپ تھی، بڈھے نے پھر کہا، بولتی کیوں نہیں، بھگوان دیا کرے تجھ پر —— اچھا! باواجی کلہ ہو آتی ہوں —— رتنا نے رمو سے اجازت لی اور دودھ لیکر قلعے کی طرف چلی گئی۔

دھوپ تیز ہو چکی تھی، نواب کے سپاہیوں نے قلعے پر دھاوا بول دیا تھا، وہ ہر چند قلعے میں پہنچنے کی کوشش کرتے تھے جان کھوتے تھے مگر کامیاب نہ ہوتے تھے، رتنا یہ سب کچھ دیکھتی تھی دل بھر آتا تھا مگر بے بس تھی، وہ جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی، نواب کی فوج والوں نے دیکھا مگر خیال نہ کیا، وہ چور دروازے سے قلعہ میں پہنچی، دودھ دیا، اور قلعے کی فصیل کے پاس آئی جہاں راجا کے سپاہی تیل اور آگ انڈیل رہے تھے۔ انھوں نے کہا —— کیوں ڈر گئی تو رتنا —— جاتی نہیں —— ہاں بھیا! کیسے جاؤں، لڑائی جو رکی ہو رہی ہے، دشمن کی فوجوں نے راستے بند کر دیے ہیں، رتنا نے جواب دیا —— راستے بند کر دیے ہیں، ان میں سے ایک نے اس جملے کو حیرت سے دہرایا —— اچھا! آج رات دیکھنا دشمن کی فوجوں کا خون ندی، نالے کی طرح بہیگا۔ رتنا خاموش رہی، جواب دینا پسند نہ کیا، باہر نکل گئی۔ آنکھ بچاتی، چھپتی چھپاتی گاؤں میں پہنچ گئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، مگر کبھی کبھی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوتے تھے۔

بوڑھا رمو، درختوں کے سایے میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ گرمی زور کی تھی، گاؤں کے تمام لوگ کھیتوں کو چلے گئے تھے، چند بوڑھی عورتیں، گھروں کے باہر چبوتروں پر سو رہی تھیں۔

بچے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کھیل رہے تھے۔
رتنا جھونپڑی میں گئی، لوٹے دھوئے اور برتن میں چپاتیاں
لے کر بوڑھے رمّو کو آواز دی ـــ روٹی کھاؤ گے باواجی!
ـــ رتنا تو آگئی؟ بوڑھے نے اٹھتے ہوئے جواب دیا ـــ
ہاں ابھی ابھی آئی ہوں باواجی! کیا حال ہے کچھ سنا تو،
بوڑھے نے جھونپڑی میں جاتے ہوئے کہا ـــ سناتی ہوں
باواجی! پہلے روٹی تو کھالو۔ رتنا نے کہا ـــ بوڑھا ہاتھ
منہ دھوکر آیا اور روٹی کھانے لگا۔ رتنا نے روٹی توڑتے
ہوئے کہا ـــ باواجی! راجا کے سپاہی آج رات کو نباب
کی فوج پر حملہ کرنے والے ہیں۔ سپاہی کہتا تھا دیکھ آج رات کو
دشمن کا کھون ...... ندی، نالوں کی طرح بہیگا۔ باواجی!
یہ سن کر میں سہم گئی، نباب صاب کو اس کی کھبر کردیں تو بہتر
ورنہ وہ ناحق مارے جائیں گے ـــ تیرا کہنا تو ٹھیک ہے پر بہت
مشکل ہے رتنا! تو جائیگی کیسے؟ ـــ نہیں باواجی میں
تو آج جرور جاؤں گی، رتنا نے جوش اور غصے سے کہا ـــ
بوڑھے نے سر اٹھایا، رتنا کا چہرہ سرخ تھا، کوئی جذبہ بھڑک چکا
تھا، اس کے چہرے سے استقلال ظاہر ہو رہا تھا، رمّو نے زیادہ
بولنا مناسب نہ سمجھا۔ اچھا، کہہ کر کھانے میں مشغول ہو گیا،
کیونکہ وہ رتنا کی پھرتی اور عزم سے واقف تھا۔ رمّو کھانے
کے بعد باہر آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ رتنا نے برتن باہر لاکر
دھوئے، اندر گئی اور پھر چولھا جلا کر کھانا پکانے میں مشغول
ہو گئی۔

دن ڈھل رہا تھا، دھوپ کم ہوتی جا رہی تھی، پرندوں
کی بولیاں شام کی خبر دے رہی تھیں۔ دور، بہت دور چرواہے
بانسری بجا بجا کر جانوروں کو جمع کر رہے تھے، کھیتوں کو
گئی ہوئی نوجوان عورتیں، تیتریوں کی طرح تھرکتی ہوئی،
کبھی نالوں میں، کبھی مینڈھوں پر، کبھی جوار کے پودوں
میں چھپتی چھپاتی، جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی آرہی تھیں، خاموش
گاؤں میں پھر زندگی کی رو دوڑ گئی۔ پرندوں نے اپنے شور
سے گاؤں میں ہل چل ڈال دی، گائے بیل اپنی اپنی جگہوں
میں باندھے جانے لگے۔ عورتیں، برتن، مٹکے سر اور کمر پر لیکر
کنویں کی جگت پر جمع ہوگئیں کوئی پانی کھینچ رہی ہے، کوئی باتیں
کر رہی ہے، چھوٹے چھوٹے بچے کنویں کے پاس کھیل رہے
تھے، بوڑھا رمّو گائیوں کو آتے ہوئے دیکھ کر چارپائی سے اٹھا،
رتنا کو آواز دی، جواب نہ پاکر جھونپڑی میں گیا، دیکھا، ڈھونڈا
پتہ نہ پایا، چولھے کی آگ تیز تھی، کھانا پک چکا تھا۔ رتنا نہیں
تھی، فکر میں ڈوب گیا، بات تو ظاہر کرنے کی نہ تھی، خدا
نگہبان کہہ کر باہر آیا۔ گائے بیل باندھے، آنگن صاف کیا،
حقہ جلاکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے کسان گھروں کو
پہنچے۔ ہل رکھے، بیلوں کو باندھا اور چلم لیکر رمّو کے پاس
آگئے۔ رمّو بہت فکرمند تھا، آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ
غور کر رہا تھا، جھرّی دار چہرے سے بشاشت دن کی روشنی
کی طرح اڑ چکی تھی، محض بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے لوگوں کا
حال دریافت کر رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے پوچھا۔ باواجی!
رتنا کہاں ہے؟ نجر نہیں آتی ـــ بھیا! وہ تو پھجر گئی
ہوئی اب تک نہیں آئی لڑائی جور کی ہے، نباب کی فوج
کے لوگ بہت مر رہے ہیں۔ بھگوان جانے رتنا کا کیا حال ہے!
اسی پھکر میں بیٹھا ہوں، رمّو نے جواب دیا ـــ نا باوا،
پھکر کی کوئی بات نہیں، وہ سـے کلے ہی میں ہوگی، اس کو
بھی تو جان کی آس ہے۔ کسی نے جواب دیا اور ادھر ادھر
کی باتوں میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی دیر کی گپ شپ کے
بعد گاؤں پر سناٹا چھا گیا۔ رات بڑھتی جا رہی تھی، بندوقوں

کی آوازیں کم ہوگئیں تھیں۔ گاؤں کی جھونپڑیوں کے چراغ جنگل
میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ بوڑھا رمّو اپنی چارپائی سے
اٹھا، لکڑی کے سہارے کیمپ کی طرف چل دیا، کیمپ گویا ایک شہر
تھا، سپاہی گھوڑوں کو دانہ چارہ دے رہے تھے، کچھ لوگ
ہتھیاروں کو صاف کر رہے تھے، گھوڑے ہنہنا رہے تھے، لشکر
کے قلب میں لکڑیوں کا انبار تھا، جس میں آگ لگائی جا رہی تھی۔
رمّو چادر اوڑھے، کمر پر ایک ہاتھ رکھے، لکڑی کے سہارے ادھر
اُدھر دیکھتا جا رہا تھا کہ سامنے سے سفید گھوڑے پر کسی کی سواری
آئی، سپاہی نے بگل بجایا، تمام سپاہی قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے
سلامی دی گئی، نواب نے فوج کا جائزہ لیا اور سب کو کچھ
حکم دینے کے بعد اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوا۔ بوڑھا رمّو بھی
ساتھ ہولیا مگر کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ نواب
اپنے ڈیرے کے قریب آکر ٹھیر گئے، گھوڑے سے اترے
اور ابھی اندر قدم رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ انھوں نے
کسی کو اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے دیکھا، قدموں کو
جھٹک کر تلوار سے وار کرنا چاہتے تھے کہ آواز آئی، ہجور!
میں آپ کی ـــ کون ـــ عورت ـــ یہاں کیوں آئی؟
جان بکسی ہو تو کچھ کہنا چاہتی ہوں ـــ اچھا جو کچھ کہنا ہے کہہ
نواب نے فرمایا ـــ ہجور! آج رات کو راجا کے سپاہی
آپ کی پھوج میں گھسنے والے ہیں، میں گوالن ہوں،
کلے کو ہر روز دودھ لے جاتی ہوں، وہاں میں نے یہ بات
سنی، رتنا نے جواب دیا ـــ تو رہتی کہاں ہے؟ ـــ
برابر والے گاؤں میں سرکار، اچھا!! تو باہر نہ جا، یہ کہہ کر
نواب نے سپاہی کو آواز دی، سپاہی آیا، نواب نے کہا
باہر کوئی اور ہے؟ ہاں حضور! کوئی بوڑھا، کمر پر ہاتھ دھرے
کھڑا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے ـــ اس کو اندر لاؤ،

نواب نے حکم دیا۔ سپاہی گیا اور بوڑھے کو بلا لایا، بوڑھا اندر
آیا، نواب کو دیکھا، سلام کیا اور ڈیرے کے چاروں طرف
حیرت سے نگاہ ڈالی، اس کی نگاہ رتنا پر پڑی تو وہ بیساختہ
پکار اٹھا، رتنا! اُن دونوں کی آنکھیں لڑیں اور جو واقعات
رتنا نے کہے تھے ایک ایک کر کے رمّو کے دماغ میں آگئے۔ نواب
نے دونوں کی حالت کا بغور مطالعہ کیا اور بوڑھے سے پوچھا
یہ عورت تیری کون ہے۔ ہجور! یہ میری منہ بولی بیٹی ہے،
میرا تو دنیا میں کوئی ہے نہیں، صرف اسی کو دیکھ دیکھ جیتا
ہوں، ہر روز کلے میں دودھ دینے جاتی ہے، کوئی ڈوا بکر
کھیت ہے، اسی میں اپنی جندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ہم
میں پھرک ـــ ہے تو یہی کہ وہ ہندو ہے میں اللہ محمدؐ کو یاد
کرتا ہوں، بوڑھے نے ابھی یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ نواب نے فرمایا
ـــ ایں تو مسلمان اور وہ ہندو، خوب ـــ اچھا! تم
دونوں یہاں کیوں آئے ہو، بوڑھے نے عرض کیا، ہجور! رتنا
کا پریم مجھے یہاں کھینچ لایا، وہ کہتی تھی، نباب سے ملوں گی اور
آج رات کا ہونے والا کِسّہ سناؤں گی، وہ آج دوپہر سے
غائب تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، اس لئے ڈھونڈتا ڈھانڈتا
یہاں پہنچا۔ نواب نے کہا، کیا تو سچ کہہ رہی ہے رتنا! ہجور!
دھوکا باجی ہمارا کام نہیں، یہ کام ان مردوں کا ہے جو
انسانوں کی کدر نہیں کرتے۔ میں عورت جات ہوں
راجا کے جُلم سے تنگ آگئی ہوں، اس نے جو کھون
کی ندی بہائی ہے اسے دیکھ دیکھ میرا جی کڑھتا ہے، کیا
راجاؤں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں ہجور! کھون گریب
سپاہیوں کا ہو، پرجا بھوکی مر رہی ہو، تو ان کو کھبر نہیں،
یہ لوگ آرام سے محلوں میں رہتے ہیں، گریبوں کا کھون
چوستے ہیں، سچ مانئے میرے دل میں آپ کے لئے پریم ہے

یہ روز روز کا کھون، کنل مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، حاضر ہوئی ہوں، چاہے کچھ ہو۔ نواب نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ اسکی آواز میں زور الفاظ میں صداقت ہے، دل نے شہادت دی کہ یہ واقعی بہی خواہ ہے۔ نواب نے پوچھا: اچھا تو رتنا! اب کیا کرنا چاہیے — حجور! کچھ نہیں، پوج کے تین ٹکڑے بنائیے، ایک ٹکڑا پہاڑ کے کنارے کھیتوں میں چھپا رہے، دوسرا ابھی یہیں رہے مگر ہشیار اور تیسرا دستہ میرے ساتھ بھیج دیں، میں اس کو جنگلوں میں چھپتی چھپاتی چور دروازے کے پاس لیجاونگی، جب راجا کے سپاہی آپکو مارنے کیلئے کلے سے باہر نکلینگے تو میں اس دستے کو لیکر چور دروازے سے کلے میں گھس جاؤں گی اور راجا کے سپاہی کیمپ کے سپاہیوں کو ہشیار پاکر کلے کے چور دروازے کے کریب آئیں گے تو آپ پہاڑ کے کنارے کے دستے کو لیکر انپر ہلہ بول دینا اور سیدھا چور دروازے سے کلے میں گھس آنا، فوج تھوڑی رہیگی، راجا پھنس جائیگا، کنل اور کھون بھی زیادہ نہ ہوگا۔ رتنا نے کہا اور فکر میں ڈوب گئی، بس میری سمجھ میں تو یہ آئے ہے حجور! نواب نے بھی اس کی باتوں پر غور کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس پر عمل کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے، سپہ سالار کو طلب کرکے کان میں کچھ کہا، آگ بجھادی گئی، سونے کا بگل بجا اور کیمپ پر سناٹا چھا گیا۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی، تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، ہوا ساکت تھی رتنا فوج کے ایک دستے کو لیکر چور دروازے کے قریب آئی، چٹانوں اور جھاڑیوں میں انھیں چھپا دیا۔ دشمن کو کیا خبر کہ بساطِ جنگ کی کایا پلٹ ہونے والی ہے وہ نشۂ غرور میں سرشار، دبے پاؤں چور دروازے سے ایک ایک نکلے، آن کی آن میں ایک انبوہ کثیر ہتھیار باندھے میدان میں جمع ہو گیا۔ کیمپ کیطرف بڑھا، کیمپ خالی تھا، ڈیرے پر سنتری تک نظر نہ آتا تھا۔ انھوں نے مالِ غنیمت خوب لوٹا اور ہنستے خوش ہوتے واپس ہوئے۔ دشمن کی چال بازیوں سے ناواقف سردار اور فوج کے بے خبر سپاہی اپنی کامیابی پر ناز کر رہے تھے کہ چاروں طرف سے گولیوں کی سنسناتی ہوئی آوازوں نے انھیں پریشان کر دیا، یہ ادھر اُدھر بھاگ ہی رہے تھے کہ نواب کی فوجوں نے گھیر لیا اور قتل و خون کا بازار گرم کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں راجا کے تمام سپاہی موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔ ادھر رتنا فوج کے دستے کو لئے ہوئے قلعے میں داخل ہوئی وہاں جو کچھ فوج تھی، اس نے نواب کی فوج کا مقابلہ کیا، گھمسان کی لڑائی ہوئی، نواب کی فوج نے محل کا محاصرہ کر لیا، راجا نے اپنی فوج کی تباہی کا حال سنا تو خوف و الم کے آثار چہرے سے نمودار ہوئے، ہمت کرکے تلوار سونت کر باہر نکلا، تھوڑی دیر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑتا رہا، آخر پیغام اجل آ پہنچا۔ فوج تھوڑی تھی اسمیں بھی بہت سے کٹ چکے تھے، کب تک نواب کا مقابلہ کرتا، کئی زخم کھائے، پسینے کی بجائے خون میں تر بتر ہو گیا، طاقت نے خیرباد کہی، ہمت کی جگہ یاس نے لی، لڑتے لڑتے سر چکرایا، زمین پر گرا اور ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

نواب کی فوجیں رات بھر قلعے میں رہیں، صبح ہوتے ہی نقارہ پر چوٹ پڑی، سپاہی نے بگل بجایا، فوجیں قطار باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ نواب نے فوج کا جائزہ لیا، اسلامی علم قلعے پر لہرایا گیا، نواب کے چہرے پر بشاشت کھیلی لیکن پھر فکر میں ڈوب گئے، نواب نے فرمایا: رتنا کہاں ہے، حاضر کرو، فوج والوں نے سارا قلعہ چھان مارا، کہیں پتہ نہ لگا، تمام لاشوں کی شناخت کیگئی مگر وہاں بھی رتنا کا وجود نہ تھا۔ نواب اپنی غفلت پر پچھتانے لگے، افسروں کو دھمکی دی، رتنا کا پتہ نہ لگنا تھا نہ ملا، اسی فکر میں ڈوبے ہوئے، رنجیدہ خاطر اپنی قیام گاہ کیطرف قدم اٹھا رہے تھے کہ رتنا دودھ لیکر قلعے میں داخل ہوئی، سپاہی نے روکا، اندر جانے سے منع کیا، نواب نے پلٹ کر دیکھا تو رتنا کو بلایا، وہ آئی اور نواب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، نواب نے فرمایا، رتنا بیٹی! میری کامیابی کا سہرا تیرے سر رہے ہے حجور! یہ سب بھگوان نے آپکو دیا ہے، ورنہ میں عورت جات کیا کرتی، میں خوش ہوں کہ اب بہت سی استریوں کو اپنے اپنے پتی کی سیوا کرنے میں چین ملیگا اور وہ بیوہ ہونے سے بچ گئیں۔ میں بیوہ ہوں، گریب ہوں، گریبی کی قیمت سوگ کی تکلیف جانتی تھی، ہر روز آنکھ سے دیکھتی تھی، اسلئے میں نے ایسا کیا، رتنا نے کہا۔ اچھا تو چاہتی کیا ہے؟ نواب نے پوچھا — میرا کون ہے حجور! جس کیلئے دھن دولت چاہوں، اکیلی پیدا ہوئی، شادی کو دو سال نہ ہوئے تھے کہ بیوہ ہوئی، اکیلی ہوں، اکیلی مروں گی، ارمان، آرزوئیں کوئی ہیں نہیں، پرماتما سے چاہتی یہ ہوں کہ جبتک اس جیون پر آکاش کا سایہ رہے آپ بلا منت رہیں اور آپکی حکومت رہے۔ رتنا نے جواب دیا، کورنش بجا لائی اور روانہ ہو گئی، نواب نے بہت کچھ سمجھایا، منایا، منت کی، خوشامد کی، گردھن کی بچی رتنا نے کوئی چیز قبول نہ کی، کیونکہ اسکو بڑا معاوضہ مل چکا تھا۔ انتقام کی آگ بجھ چکی تھی اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا تھا!

عبدالواسع عمری

قاسم

یہ مضمون میرے ایک عزیز دوست قاسم سے متعلق ہے، جس نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۱ء دوشنبہ کو انتقال کیا۔ اس میں میں نے دوسرے لوگوں کی دلچسپی کے لئے قاسم کی گفتگو کو ادبی رنگ دیدیا ہے، ورنہ مفہوم متاثر نہیں کیا۔

کام کرتا بیٹھا ہوں کہ آدمی نے خبر دی "آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا، اور......" میں ہنسا کہ میرے عزیزوں میں کون ایسا ستر را بھتر ا ہے کہ بغیر مجھے اطلاع دئے یوں اچانک مرجائے سب ایسے ہٹے کٹے کہ خدا نہ کرے مجھے کسی کا غم دیکھنا نصیب ہو۔ اتنے میں ایک اور صاحب نے آن کر تصدیق کی کہ "قاسم کا انتقال ہو گیا"

قاسم کا انتقال ——— !

اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے ملنے والوں میں مجھے قاسم سے زیادہ عزیز اور کون ہو سکتا ہے۔

قاسم !

کتنی حسرت ناک موت ! کتنا جوانا مرگ !۔ آدمی سا آدمی کہ دیکھے سے نظروں میں جچے نہ جچے، پر ڈھونڈے سے ہزاروں میں نہ ملے ! خوبیاں اتنی ہی بلند، خامیاں اتنی ہی پست، اضداد کا مجموعہ، لیکن اخلاق کا مجسمہ ! گویا صحیح معنے میں انسان !

ارشادی گھرانے کا فرد، شریف النسب سید، کوئی تیس کی عمر، اوسط قد، اوسط جثہ، گندمی رنگ، ناک نقشہ بس سیدھا سیدھا گول چہرہ، دبی صورت، ابھری پیشانی، مجموعاً بھلا سا انسان، کئی بہنوں کا بھائی، کئی بھائیوں کا ساتھی، ماں باپ حیات، گھر کا ولی عہد صاحب مقطعہ، کاروبار میں پختہ، چھچھوروں میں چھچھورا، سنجیدوں میں سنجیدہ، مرنجاں مرنج، جس سے ملے خوش کرے، ہنسے، بولے ہنسے ہنسائے اور رخصت۔ طبیعت ذرا پھکڑپن کی طرف مائل، عشق پیشگی فطری، مگر زیادہ تر خیالی۔ منشی فاضل تک تعلیم، ادبی ذوق، شاعری کا شوق غالباً صدر محاسبی کے اہلکار، شادی کی بڑی آرزو، لیکن شادی کی

اور سال ڈیڑھ سال میں سدھار گئے۔ مقطعہ تھا کافی آمدنی کا، اس لئے لہلاتا کھیلتا بچپن، ہنستی کھیلتی جوانی۔ لیکن ادھر کوئی چار پانچ سال سے مقطعے میں دو سرے دعویدار بھی پیدا ہو گئے تھے، گھر کے جھگڑے سرکار پر چڑھے، منبطی آئی، اور دن ذرا بھاری ہو گئے۔ ابھی ابھی مقدمے میں جیتے تھے کہ زندگی سے ہارے۔ اُدھر مقطعہ جھگڑوں سے آزاد ہوا تھا کہ اِدھر روح جسم سے آزاد ہوئی۔

یہ تو ہوا ان کا ایک ذاتی یا خانگی خاکہ جس سے مجھے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس سے زیادہ کبھی میں نے جاننے کی کوشش کی، اور میں سمجھتا ہوں کہ تکمیل سوانح کے لئے اتنا کافی بھی ہے۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ قاسم اپنے گھر میں کیا تھا، بلکہ اس سے کہ میرے ساتھ کیا تھا، اور میرے پاس کیا تھا، اس لئے میں اس کی زندگی کے اسی پہلو کو زیادہ اہمیت دوں گا، گو اندیشہ ہے کہ اس سے خود میری خود ستائی یا دکانداری کا پتہ چلے گا، لیکن اگر اس سے بھی کم بیان کروں تو واقعات کی اصلیت بالکل مسخ ہو جائے گی اور یہ اصول سوانح کے خلاف ہو گا۔

مطمئن گھرانے کے لڑکے عموماً کھیل کود آرام و عیش سے فارغ ہوتے ہوتے پچیس تیس سال گزر چکے ہوتے ہیں، گویا صحیح معنے میں ان کا سن بلوغ یا شعور پچیس سال سے شروع ہوتا ہے اور پھر جب ماحول بھی کچھ اسی کے موافق ملے تو گویا بلوغ کا آنا ہی ناممکن۔ مشیر آباد کا محلہ بلگرام کے محلہ سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہے۔ سنتے ہیں کہ رقبہ اور حیثیت وغیرہ میں وہ اس سے بڑا نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ الیاس مردم خیز خطہ ہے کہ جتنے اکابر ہوئے ہیں

اکثر یہیں سے تعلق رکھتے ہیں، اور مشیرآباد بالکل اس کے برعکس
واقع ہوا ہے، ورنہ اس ایک ذیلی فرق کو ہٹا کر دیکھیں تو دونوں
میں غالباً چنداں فرق نظر نہ آئے گا۔

ایسے گھر اور ایسے محلے میں پیدا ہو کر قاسم کوئی خاص
اہلیت کا مالک ہوتا اور وہ بھی اتنی چھوٹی عمر میں، ایک عبث توقع ہو
لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو صلاحیتیں اس نے فطرتاً
پائی تھیں، اگر انھیں منجھایا جاتا اور وہ انھیں بکار آمد بناتا تو یقیناً
ایک نمایاں شخصیت ہوتا، اور اب اس میں یہ شوق پیدا ہو چلا تھا
کہ عمر نے دغا دی۔

ادب اور خصوصاً سیاست کا بہت ذوق تھا اکثر سیاسی
بحثیں چھیڑتے، مجھے اس نام نہاد سیاست دانی جیسی کہ حیدرآباد
میں ہے اور اخباری زٹلوں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی قاسم صاحب
میری اس خصوصیت یا خامی کو اس نظر سے دیکھتے جیسے مجھ میں
کوئی انسانی صفت ہے ہی نہیں۔ اکثر افسوس کا اظہار کیا کرتے
بالآخر مجھے مجبور کر دیا کہ اخبار جاری کراؤں میں نے انھیں کے
نام جاری کرادیا، سمجھنے لگے کہ اب میں اخبار کا شوقین بھی
ہو گیا ہوں، آتے اور پوچھتے کہ آج کا اخبار دیکھا؟ کیا لکھا ہے؟
میں سنجیدگی سے کہہ دیتا "جی ہاں دیکھا، لکھا ہے کہ پیالیس ٹاکیز
میں "وچن" چل رہا ہے، اور زمرد محل میں "زمبو کا بیٹا" اور
سلکٹ میں "لٹارو للنا"۔ "زمبو کا بیٹا" اور "لٹارو للنا"
عید کے خاص پروگرام ہیں۔ ایک بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کو
ملکیت اور مہر کے دعوے کی نوٹس دی ہے، اور دوسری
صاحبزادی نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے شوہر ایک ہفتہ کے
اندر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر خلع نہ کرالیں تو مجبوراً وہ خود
انھیں طلاق دے کر کسی دوسرے شوہر کو اپنے نکاح میں لالیں گی
آئندہ جمعہ کو عبدالعزیز خاں کے پاس شاندار ہراج ہوگا۔
خریدار حضرات جمعرات کے دن معائنۂ مال فرمالیں ......"
ہنستے بھی اور کڑھتے بھی۔

ادب کا اچھا ذوق پایا تھا، یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایسا
ذوق پایا تھا جو مجھ سے مشترک تھا، اور سچ پوچھئے تو یہی ایک
سبب ان کے اور میرے ربط کو مضبوط کرنے میں زیادہ حصہ رکھتا تھا

ادب و سیاست سے ہٹ کر بلکہ ان سے بڑھ کر عشق و عورت
ان کا ایک استمراری موضوع بحث تھا۔ اکثر اس سلسلہ میں بڑی
دلچسپی لیتے۔ لیکن حسن و محبت کے معاملے میں ان کا وہی نظریہ تھا
جو عام نوجوانوں اور خصوصاً ایسے پھکڑ مزاجوں کا ہونا چاہیئے۔
جب کبھی سنتے کہ "محبت ایک نہایت اعلیٰ پاکیزہ و بے غرض
جذبہ ہے" تو ہنسی اڑاتے کہ "پاکیزہ و اعلیٰ ہونے کی بھی ایک ہی
کہی ...... غرض اب پھکڑ باتوں پر اتر آتے، جن کا حاصل یہ
ہوتا کہ ہوس ہی کا ایک شاعرانہ نام لوگوں نے محبت رکھ لیا ہے
ورنہ کہنے کو کوئی ایسی مثال ہی بتا دیجئے کہ کہیں بڈھا بڈھی میں بھی
عشق ہوا ہو"۔ یہ صحیح ہے کہ قاسم کہ

"There can be no love without lust"

مگر محض اس کو سب کچھ قرار دینا زیادتی ہے۔ اس کا انحصار ہے
زیادہ تر چاہنے والوں کی ذہنیتوں اور اخلاقی قوتوں پر! ۔
بعض ایسی مثالیں بھی ملیں گی کہ ان کی محبت بہت ارفع و
اعلیٰ ہوتی ہے ......"

ورنہ اگر محبت کی تشریح وہی ہوتی جو تم کہہ رہے ہو تو
ایک ہی شخص کی خصوصیت نہ ہوتی۔ تم یہ مانتے ہو نا کہ محبت
اسی وقت کہلاتی ہے جب کہ وہ ایک ہی سے ہو؟ ہوس
کی تکمیل تو سب ہی سے ہوسکتی ہے، پھر کسی مرد کو ایک خاص
عورت سے یا کسی عورت کو ایک خاص مرد سے شغف ہونا
چہ معنے دارد؟

یہ صحیح ہے کہ محبت کی بناء میں حیوانی جذبہ کو بھی دخل ہے لیکن وہ اس لئے کہ اس لطیف جذبہ کی عملی توثیق بھی ہو سکے، نہ اس لئے کہ یہی سب کچھ ہے، ورنہ تم دیکھتے کہ جہاں باہم شادی نہ ہو وہاں محبت مٹ جاتی، حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا۔

یا یوں سمجھو کہ "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" اس لئے محبت سی لطیف شئے بھی ہوس سی کثیف شئے سے تعلق رکھتی ہے، جس کے معنے یہ ہوئے کہ جس طرح ایک خوبصورت اور مضبوط عمارت کی بنیاد میں سخت، کثیف اور ادنی چیزیں بھی ڈالی جاتی ہیں، اسی طرح محبت کی بناء میں بھی ہوس شامل ہے، لیکن جس طرح ساری عمارت، نہایت پاکیزہ، بلند اور خوبصورت ہوتی ہے، اسی طرح محبت کا بھی بلند اور نفیس ہونا ضروری ہے، اس کے معنے یہ نہیں ہوئے کہ محض ہوس کا نام محبت ہے اور نہ یہ کہ ایک نفیس عمارت کی بناء کثیف چیزوں پر ہی ہونا ضروری ہے۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ وصل کے بعد محبت نہیں ہوتی بلکہ محبت کا نتیجہ وصل ہوتا ہے، اور وہ اس لئے کہ محبت کی خواہش ہوتی ہے کہ عاشق معشوق ہمیشہ ایک دوسرے سے قریب سے قریب رہیں اور یہ خاص کر معاشرت کی پابندیوں کے تحت بغیر وصل کے ممکن نہیں، نہ اس لئے کہ صرف وصل ہی مدعائے تمام ہے۔

ہم جو کسی سے متاثر ہوتے ہیں تو اسے دیکھ کر یا سن کر جس کے معنے یہ ہوئے کہ پہلے ہماری روح متاثر ہوتی ہے، اس لئے گویا سچی محبت کا تعلق روحی ہے، نہ کہ جسمی اور تم دیکھو گے کہ وہی محبت زیادہ استوار ہو گی جس کی بناء روحانی یا اخلاقی اصول پر رکھی جائے۔ اور جن لوگوں میں محبت کا ایسا اعلیٰ جذبہ ہو وہ مرتے دم تک نہیں مٹتا، ورنہ یہ ایک فطری بات ہوتی کہ جہاں سے معشوق حاصل نہ ہو محبت بھی فنا ہو جائے۔

اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ہوس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک حسین سے بڑھا ہوا دوسرا حسین نظر آئے تو میلان دوسرے کی طرف ہو جائے، لیکن ایسا نہیں ہوتا، بلکہ محبت کا معیار حسن بھی کچھ عجیب ہوتا ہے کہ "معشوق من است آں کہ بنزدیک تو زشت است"، بلکہ عام نظروں میں جو غیر معمولی حسین ثابت ہو وہ ایک عاشق کے نزدیک اپنے معشوق کے برے حسن کے مقابلہ میں بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا یہیں سے محبت اور ہوس کا فرق کھلتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ جس طرح ہر بری بھلی چیز کے مختلف معیار ہوتے ہیں اسی طرح محبت کے بھی مختلف معیار و مدارج ہیں۔ ہوس کا نام محبت رکھ لینے سے محبت کی خوبی و عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا یہی وجہ ہے کہ دنیا میں محبت بہت کم یاب ہے، اور یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ جو چیز جتنی لاجواب ہو گی اتنی ہی وہ کمیاب و نایاب ہو گی۔

اب رہا تمہارا یہ استدلال کہ بڈھا بڈھی میں عشق نہیں ہوتا، اس لئے محبت کے معنے ہوس کے ہیں، تو چونکہ بڈھا بڈھی کے اولاد بھی نہیں ہوتی، اس لئے یہ نتیجہ نکالنے کے مساوی ہے کہ عورت مرد سے اولاد نہیں پیدا ہو سکتی۔ کیا یہ صحیح ہو گا؟ —

ہر چیز کا ایک وقت اور موسم ہوتا ہے۔

"یہ سب صحیح ہے خداوند، مگر ہم تو وہی ......"

"تم بڑے بیوقوف ہو قاسم، ایسی بحثیں مت کیا کرو میرے ساتھ"

"اچھی بات ہے سرکار جانے دیجئے! اب کون لگلے آپ سے آپ ایک بلا ہیں!"

طبیعت میں خوش مزاجی بہت تھی، اس لئے غصہ بہت کم آتا تھا۔ سخت کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، اور سخت سننے

سے بھی نہیں، بلکہ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے کہ جہاں محفل کچھ بدمزہ یا سونی سی معلوم ہوئی کہ خود ہو کر بننے لگے، لوگوں کو گالیاں دیں، جوش میں لائے، اور خاصی شگفتگی پیدا کر دی۔

مذہب کے بڑے پکے تھے، بہ وجہ من الوجوہ زیادہ تر اس لئے بھی کہ مرشد کے بیٹے تھے۔ لیکن ان کا سارا مذہب عام لوگوں کی طرح سپھسپھسے عقائد پر مبنی تھا۔ بات بات پر کفر کا خدشہ، بات بات پہ ایمان جانے کا اندیشہ۔ اس سلسلہ میں بھی مجھ سے اکثر بحثیں کیا کرتے، اور فیصلہ کرتے کہ میری صحبت میں بیٹھ کر کافر ہو جائیں گے۔ لیکن بعد کو وہ دور آیا کہ مجھی کو مرشد ماننے لگے اور چونکہ میں ہر مذہب کا طرفدار ہوں کبھی "السلام علیکم مرشد" کہتے اور کبھی "رام رام گروجی" وغیرہ کہہ کے ملتے۔

کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چوں کہ میرے پاس کوئی تکلف نہ کرتے تھے جب کبھی بلا تا کھانے پہ آ بیٹھتے۔ اچھا ہوا تو خیر، ورنہ ناک چڑھی کہ "بھئی تمھارے پاس تو اچھا کھانا کھانے کی حسرت رہی۔ تم میں سب باتیں اچھی ہیں شاکر، گر ایک بات بہت بری ہے اور وہ یہ کہ تمھارا کھانا اچھا نہیں ہوتا......" (گویا کہ یہ بھی میری بات ہے!)

اور جب کبھی پسند آیا تو کہا "آہا ہا، آج عمر میں پہلی دفعہ تمھارے ہاں اچھا کھانا کھایا ہے۔"

باتوں میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ جب سے عقیدتمندی کا دور آگیا تھا، انھیں میری تقریباً ہر بات پسند آنے لگی تھی پھڑکتے اور داد دیتے تو یوں کہ "واللہ" شاکر آج عمر میں تم نے پہلی دفعہ یہ کام کی بات کہی ہے!" خواہ ایسی "پہلی دفعہ" ایک ہی نشست میں کئی بار کیوں نہ آ جائے! ۔ کبھی میں نے یاد دہی کی کہ "پرسوں بھی تو تم نے یہی کہا تھا!" کہنے لگے ارے بھئی، پرانی باتوں میں کیا رکھا ہے، یہ البتہ نئی بات ہے جو تم نے پہلی دفعہ کہی!"

چوٹیں چلنے اور فقرے کسنے کا بڑا شوق تھا، لیکن ہر چوٹ کی انتہا یہی کہ کسی نہ کسی طرح مخاطب کو عورت بنا دیا جائے یا کتا۔

لیکن جب دیکھا کہ چوٹوں میں بھی مجھ سے ہار جاتے ہیں تو کہنے لگے "تمھاری فطرت بچھو اور کھٹمل کی سی ہے شاکر، جب ڈنک نہ مار و چین کہاں سے آئے گا۔ اگر خاموش ہو جاتے تو کیا ہرج ہو جاتا۔"

چونکہ مجھے بھی ان کی خوشنودی زیادہ منظور تھی، اکثر ان کی چوٹیں سن کر بھی اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے میں سچ مچ ہار گیا ہوں، اپنی فتح پر بہت خوش ہوتے۔

دماغ کسی قدر قانونی یا مکارانہ بھی پایا تھا، اور پھر مقطعہ کے سلسلے میں جو مقدمات کے تجربے اٹھانے پڑے تھے انھوں نے کریلہ کو نیم چڑھا دیا تھا، اور جس طرح "پرانا مریض آدھا حکیم ہوتا ہے" اسی طرح یہ پرانا پیرو کار آدھا وکیل تو ہو ہی گیا تھا اور اب پورا وکیل بننے کی بہت آرزو تھی، چنانچہ غالباً درجۂ اول کی وکالت کا امتحان دینے والے تھے۔

میں نے شاید ایک آدھ دفعہ کہدیا تھا کہ "تم دیکھنا قاسم میں مستقبل قریب میں کیا بننے والا ہوں!" بس یہ بات شاید ذہن میں رہ گئی تھی، دعویٰ کرنے لگے کہ تم دیکھنا شاکر دس پندرہ سال کے اندر ہی اندر میں کتنا بڑا وکیل بننے والا ہوں!"

میں نے کہا "بھئی دعوے کے ثبوت کے لئے وقفہ تو بہت مختصر رکھا ہے!"

کہا "اس لئے رکھا ہے کہ اگر بڑا نہ بن سکا تو اس وقت تک یا تو میں نہ رہوں، یا تم نہ ہو، یا پھر اتنے طویل عرصے تک تم میرے دعوے ہی کو بھول جاؤ!"

شعر گوئی کا بھی شوق تھا، لیکن چونکہ ذوق بلند تھا معمولی شعر غالباً خود کو نہ بھاتے ہوں گے اور اعلیٰ شعر کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت ہے، اور بھلا یہ ایسے خوش باش مستوں سے ہو سکتی ہے!

سب سے پہلے جو نظم سنائی وہ خود میری مذمت میں تھی یہ اُس وقت کی بات ہے جب کہ ان میں مجھ سے ٹکر لینے کا جذبہ تھا اور ایک طرح سے وہ بھی میرے مخالف تھے۔ نظم میں مجھی سے خطاب تھا، اور ردیف تھی "آپ کی" اور قافیہ غالباً "طبیعت" "عادت"، وغیرہ تھا اس میں میری بداخلاقی، خشک مزاجی و بد دماغی کا رونا رویا تھا۔ نظم اچھی تھی۔ مجھے دکھانے کو تو دکھا دی، لیکن میں جو خوش ہوا تو ان کی حیرت اور پشیمانی کی عجیب کیفیت تھی۔ افسوس ہے کہ وہ نظم نہیں مل رہی ہے ورنہ چند شعر لکھ دیتا، جن سے ان کے ذوق شعر کا بھی اندازہ ہو جاتا وہ نظم میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ایک دو نظمیں اور سنائی تھیں جن میں سے ایک کا عنوان غالباً "مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے" تھا۔

دو غیر معمولی خوبیاں یہ تھیں کہ غالباً آٹھ نو سال وہ مجھ سے ملتے رہے، لیکن اس اثناء میں میں نے کبھی کسی کی شکایت یا غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی، جس کسی کا ذکر کیا، اچھے الفاظ میں کیا۔ کسی کو بڑھتے دیکھا تو خوش ہوئے اور گرتے دیکھا تو اس طرح افسوس کیا جیسے خود کو نقصان پہنچا ہو۔ اگر کبھی زیادہ ملنے والوں میں سے کسی پر بگڑ بھی گئے تو اس کے غائبانہ میں بھی صرف اتنا کہا کہ اگر وہ سامنے ہوتا تو اس سے زیادہ کہتے اور سخت کہتے۔

وضعداری کا یہ عالم تھا کہ اتنی طویل مدت میں کبھی دوستی کو غرض سے ملوث نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ دوستانہ رنگ میں دس دفعہ انھوں نے مجھ پر احسان کیا ہوگا تو ایک آدھ دفعہ میں نے ان کی خدمت کی ہوگی سنتا تھا کہ یہ آخری پانچ چار برس ان پر کافی تنگ تھے، اس کے باوجود یا سدا ر تنگ تھے۔

صرف ایک دن ایسا ہوا کہ دوپہر میں میرے ہاں آئے اور کہا "شاکر ایک آنے کے پیسے ہوں تو دو" کافی جلدی میں معلوم ہوتے تھے۔ اتفاقی بات کہ اس وقت میرے نزدیک ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا "تم چلو!" کہنے لگے "کہاں؟" "تم چلو تو سہی!"۔ پاس ہی میرا دھوبی رہتا ہے، کہا "ارے دھوبی آپ کو ایک آنہ دیدے!"۔ عجیب کیفیت طاری ہوئی مجھے بہت غور سے دیکھا، قریب آئے، بازو تھامے اور کہا "شاکر تم میرے لئے کتنی ذلتیں اٹھاتے ہو، کیا تمھیں دھوبی سے پیسے مانگتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

شرم تو صرف مانگنے سے آنی چاہیے قاسم! جب یہ اٹھی تو پھر کیا دھوبی سے اور کیا رانی سے!

"اہا ہا! کیا پیاری بات بتائی، پیارے شاکر تم نے صرف ایک آنہ ہی نہیں دیا بلکہ ایک آنے کی بات بھی بتا دی!"

"جی تو یہ غنیمت ہے ہماری بات کی!"

"نہیں شاکر، باتیں تو تمھاری لاکھ لاکھ کی ہوتی ہیں، مگر میں اس وقت اپنی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے قیمت لگا رہا ہوں!"

پھر ذرا آگے بڑھے، اور کہنے لگے "تم چاہو، کچھ ہی کہو، لیکن میرے ذہن میں تو یہی تھا کہ تم اپنے ماموں کے پاس سے منگا دوگے، یا کسی دوست کے پاس سے۔ دھوبی کا تصور تو میرے ذہن میں ہی نہ آسکتا تھا......"

"یہی فرق ہے تمھارے اور میرے ذہن میں! تم نے غور کیا کہ یہ جو چھوٹے لوگ ہوتے ہیں کبھی کچھ دے کر بھی خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے "صاب کی خدمت کی"، اور بڑے لوگ

اس کے بعد انھوں نے معمول سا مقرر کر دیا کہ جب کبھی آنٹی کو خط لکھوں تو انھیں سنا کر ڈالوں' یا اس کی نقل ضرور رکھوں ۔ اور یہیں سے ان ہیں سے استادانہ رنگ ہٹ کر شاگردانہ رنگ آنے لگا۔

اس اثناء میں انھوں نے کئی دفعہ مجھے مجبور کیا کہ مضامین لکھوں اور رسالوں کو بھیجوں۔ میں اس بات سے کتراتا تھا جس کی وجہ انھیں کو نہیں' بلکہ میرے اور بھی ملاقاتیوں کو مجھ سے سخت شکایت تھی ۔

ایک دن یکایک ایک نظم "سب سے نرالا اپنا فسانہ سب سے انوکھی اپنی کہانی" ذہن میں آنے لگی اور تیار بھی ہو گئی ۔کیا بتاؤں سنا کر کیسی آفت مول لی ہے۔ ایک ایک بند بلکہ ایک ایک مصرع سنتے اور میری رانوں پر ہاتھ مارتے کبھی اچھلتے' کبھی بیٹھتے کہ آہ ۔شاکر کیا نظم لکھی ہے !......." ان حضرت کا داد دینے کا طریقہ بھی کچھ عجیب تھا کہ لوگ تو شاید پھڑکتے ہیں تو اپنی رانیں ٹھونکا کرتے ہیں' مگر یہ حضرت میری رانوں کا قلع قمع کیا کرتے ۔جب یہ رنگ دیکھا تو صوفہ چھوڑ میں نے اس طرح کچھ سنانے کا طریقہ اختیار کیا کہ میز کی ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف حضرت ! تاکہ دستِ شفقت سے محفوظ رہ سکوں ۔ غرض جب نظم اور داد ختم ہوئی تو حکم ہوا کہ " فوراً کسی رسالہ کو بھیجدو ! " میں نے کہا " دماغ خراب ہو گیا ہے ؟..... بگڑ گئے کہ " دیکھو شاکر' اگر آج تم نے نہ مانا تو میری تمہاری بہت بگڑ جائے گی ! جو ہو سو ہو ! " " ارے بھئی میری طبیعت نہیں چاہتی کہ....." " یہ سب کچھ میں نہیں جانتا ' آپ کو بھیجنا ہو گا !" خیر اچھی بات ہے " جی نہیں اسی وقت میرے سامنے !" پیاڈ سامنے رکھا' دوات اپنے ہاتھ میں پکڑی" اور قلم میرے ہاتھ میں دے کے بکڑ لیا کہ " چلو" " ابھی لکھو !" " واہ یہ اچھی زبردستی ہے !" اور کیا آپ جیسوں سے " عدم تشدد " سے کام چلے گا !" " لیکن یاد رہے کہ میں ٹکٹ وغیرہ کے پیسے نہیں دوں گا !" جھک مارے آپ ! میں خود لگا کے ڈال دوں گا ' بلکہ اگر خط اچھا ہوتا تو نظم بھی میں خود ہی لکھ لیتا !" " لیکن کس کو بھیجو گے !" " ساقی کو !" جب نظم لکھی کہنے لگے ایک خط بھی مدیر کو لکھو !" " ارے بھئی مجھے کیا ضرورت ہے ! ویسے رسمی طور پر آپ بھی لکھ سکتے ہیں !" " ہم تو لکھ ہی سکتے ہیں لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ بھی کچھ لکھ سکتے ہیں یا نہیں !" " کیا لکھوں ؟" " جو جی میں آئے !"

سنا' اور پھر کہنے لگے کہ " دیکھا اس لئے لکھوایا تھا تم کیا جانو شاکر کہ تم کیا ہو !" اکثر غور بھی کیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل میری ادبیات ہی میں کوئی بات ہے یا ان کی عقیدتمندی میں کوئی ایسی خوبی یا خامی تھی کہ وہ میری ہر چیز کے اس قدر گرویدہ تھے ۔نظم لے گئے' اور خود ہی ڈاک کے حوالے کر آئے !

غرض اس کے بعد ان کا ایک معمول ہی ہو گیا کہ مجھ پر جبر کر کر کے نظم و نثر لکھوائیں اور بھجوائیں۔ پھر جب دیکھا کہ مجھے عادت ہو گئی ہے تو ایسے مطمئن ہو گئے جیسے کسی باپ نے اپنے نالایق لڑکے کی بری صفات کو دور کر کے کسی اچھے ڈھرّے لگا چھوڑا ہو۔

ممکن ہے یہ باتیں لوگوں کی دلچسپی کی نہ بھی ہوں لیکن اس اعتبار سے کہ وہ قاسم سے متعلق ہیں میرے لئے خاص قیمت رکھتی ہیں اور اگر کوئی ایسا وقت بھی آیا کہ میں کچھ بن سکا تو یہی باتیں ہوں گی جو یاد دلاتی رہیں گی کہ جس نامور شخص کو دنیا جانتی ہے' اس کی شہرت کی بناء ایک گمنام ہستی کے ہاتھوں ڈالی ہوئی ہے' اس لئے اگر وہ نامور شخص یاد رکھنے

کے قابل ہے تو یہ گم نام بھی بھلانے کے لایق نہیں۔

اس چھوٹی سی گنجائش میں ساری باتیں لکھی جائیں اور لکھتے وقت ساری باتیں یاد آجائیں یہ بہت دشوار ہے، لیکن پھر بھی اتنی طمانیت ہے کہ جو کچھ برا بھلا لکھا گیا ہے وہ ایک بچھڑے ہوئے کی یاد دلانے اور ایک فانی کی یادگار بننے کے لئے بہت کافی ہے۔ فانی! جس نے فنا ہو کر بقائے دوام حاصل کی اور اپنی ہر دلعزیزی کے سبب سب سے گم ہو کر بھی سب میں موجود ہے۔

خبر نہ تھی کہ ایسی جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی، لبھاتی، بناتی مورت ہم سے اس طرح چھین لی جائے گی کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو کہ قاسم کوئی بیمار ہے، اور اچانک موت کی خبر آجائے، لیکن خوبی و عظمت کا یہ کھلونا نہ صرف انسانوں کو عزیز تھا بلکہ خود قدرت کو بھی، فرط رحمت اور رشک محبت سے لوگوں کے ہاتھ سے اس طرح چھینا کہ ٹھیک سے لوگوں کی نظر بھی اس پر پڑنے نہ پائے۔ قدرت نے چاہا اور آسمان نے دست ستم بڑھایا، نازک جان تھا، آن کی آن میں دم توڑا۔ چرخ ستمگر کو بھی احساس ہوا کہ ایسی موہنی جان کوئے کر اس کا دل بھی شق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا رویا اور اس قدر رویا کہ تین دن تک آنسو نہ تھمے ورنہ ۵ ار تیر کی چلچلاتی دھوپوں میں لگاتار بارش کے کیا معنے ہوتے ہیں۔

اس عجوبۂ قدرت سے لوگوں کا دل اور ہلا اپنا پرایا، چھوٹا بڑا جس نے لاشے کو دیکھا رو پڑا لیکن زندہ دل قاسم کی وہی انوکھی شان کہ گو چہرہ سوتا ہوا ہے حالت بالکل بدل چکی ہے، چار ہی دن کے نمونیہ نے یہ حال کر دیا ہے کہ شکل نہ پہچانی جائے، لیکن آنکھیں کچھ کھلی ہوئی ہیں، اور دانت علانیہ نظر آتے ہوئے، گو یا دنیا ساری روتی رہی، لیکن قاسم نے ثابت کر دکھایا کہ وہ دنیا کی خوشی و غم اور اچھے، برے سب ہی کو ایک نیم نگاہی سے دیکھتا ہے، اور سارا فلسفۂ مرگ و زیست اس کے نزدیک ایک ادائے تبسم سے بڑھ کر نہیں! جیا تو مسکراتا ہوا، اور مرا تو مسکراتا ہوا!۔۔۔ کتنا بہادر تھا وہ! اور شاید اسی بہادری کا پرتو اس نے مجھ پر بھی ڈالا تھا، ورنہ جانتے ہو قاسم کہ تمھاری لاش پر تمھاری ماں رو رہی ہیں، باپ رو رہے ہیں، بھائی، بہنیں رو رہی ہیں، اپنے پرائے رو رہے ہیں اور میں ہوں کہ بت بنا ہوا کھڑا ہوں!۔ تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھاری موت کا مجھے کو یا کچھ غم ہی نہیں ہوا؟ سچ تو یہ ہے کہ تم ہی نے تو میری چھوٹی عظمت کا اعتراف کر کر کے مجھے اتنا بے بس بنا دیا کہ غالباً تمھاری ہی مانی ہوئی عظمت کے خلاف سمجھ کر میں تمھاری لاش پر دو آنسو بھی نہ بہا سکا، بلکہ فی الحقیقت تمھارا بے لوث جسم اس سے بہت ارفع تھا کہ مجھ جیسے گندہ اور ادنیٰ آدمی کے آنسو تم پر گرتے! اور پھر اب تمھیں ان آنسوؤں کی پروا بھی کیا ہے!

تم میرے آنسوؤں کی پروا کرو نہ کرو، دوسروں کے غم کی تمھیں فکر ہو نہ ہو، لیکن رونا تو یہ ہے کہ تم اتنے عیش پسند انسان رہے، اور تمھیں خود اپنے عیش و مسرت کا بھی تو خیال نہ رہا۔ کیا یہی تھی تمھاری بہار عیش کہ جب غنچہ چٹکنے کو ہو تو اسے مسل دو، کیا یہی تھی تمھاری زندگی، کہ جب اس کے عروج کا وقت آئے تو تم خود غروب ہو جاؤ۔ کسی اور کا نہ سہی، لیکن کم سے کم تم نے اپنی اس بھولی بیوی کا تو خیال کیا ہوتا، جس کی تم نے بارہا تعریف بھی کی اور کبھی کمزوریاں بھی گنائیں، جس کے سہاگ کے پھول کھلے ابھی پورا ڈیڑھ سال بھی تو نہیں ہوا تھا اندازہ کرو اس معصوم دل کا جو لوگوں کو روتے دیکھتی ہے، لیکن تر دامنگیر ہے، خود اُف نہیں کر سکتی، دم گھٹتا ہے، اور مر نہیں سکتی۔ کیا تم نے اسی دن کے لئے اس سے شادی میں اتنی جلدی اور کوشش کی تھی کہ اپنے وداع کے ساتھ

اس کی دنیا بھی اندھیر بنا جاؤ؟ یہی تھا تمھارا حاصل عیش کہ خود حسرت لے جاؤ اور اسے تڑپا جاؤ؟۔ خیر تم نے بیوی کو چھوڑا چھوڑا کبھی اس ننھی کلی کو بھی دیکھا جس کا "چٹانا" کئے تمھیں ابھی شاید ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا؟ تم نے اس کی بلکتی ہوئی آواز کی بھی پروا نہ کی؟۔ تمھیں میرے پاس بیٹھتے ہوئے تو اس کے دودھ کی بڑی فکر ہوتی تھی، لیکن اب دنیا سے جاتے ہوئے خیال نہ آیا کہ اس کے دودھ کا انتظام کون کرے گا؟ اسی لئے شاید میری زبان سے نکلتا تھا کہ "تم ابھی سے اِن شادی کے جھگڑوں میں نہ پڑو قاسم!" لیکن تم کہتے کہ "ہٹاؤ شاکر تم تو نرے فلسفی ہو، کہاں کی محبت، کہاں کا فلسفہ، بس کھاؤ پیو مزے اڑاؤ شادی کرو...... اور چلتے بنو!"۔ کیا ایسی ہی کر دکھائی! لیکن آخر ایک وقت اِن جھگڑوں سے تنگ آئے ہی اور کہا "ان جھگڑوں سے اب کچھ جی اکتا سا جا رہا ہے شاکر۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بالکل الگ گھر لے کر تمھاری طرح تنہا رہوں!"۔ کتنا اچھا الگ گھر لیا تم نے! کہ نہ جھگڑے ہیں، نہ مخمصے ہیں، نہ بیوی ہے، نہ بچے ہیں، نہ غذا ہے، نہ دوا ہے، نہ خوشی ہے، نہ رنج ہے!۔ یہ سکون کی انتہا ہے، اور وہ تم نے پالی! اگر تم جیسے زندہ دل اور بے چین فطرت آدمی کے لئے اس کی اتنی جلدی بھی کیا تھی قاسم؟

شاکر

فن تقریر

دنیا کی تاریخ بتلاتی ہے کہ جس قوم میں اچھے اچھے مقرر پیدا ہوئے وہ قوم ہمیشہ نیک نام رہی، ان کے جذبات اور احساسات ہمیشہ بیدار رہے اور انھوں نے انسانی زندگی کی تاریخ اور تمدن بنانے میں بڑا حصہ لیا ــــ انھیں خیالات کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اُردو نے "فن تقریر" کے نام سے یہ کتاب ترتیب دی جس میں بتلایا ہے کہ ایک مقرر کے لئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ اور وہ کس طرح ایک کامیاب اور ہردلعزیز مقرر بن سکتا ہے، دیباچہ کے تحت جس میں بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں کئی ایک تصویریں بھی ہیں۔ جن میں مقرر کو نقل و حرکت کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی کتابیں اُردو میں زیادہ سے زیادہ منتقل ہوں۔

سہیل (گیا) جنوری ۱۹۴۱ء

یہ چھوٹی سی کتاب اپنے موضوع کی ہمہ گیری کے اعتبار سے صد درجہ اہم اور مفید ہے۔ دیباچہ میں فن تقریر کی تاریخ مختلف اقوام کے انداز خطابت کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد مقرر کی خصوصیات اور تقریر و خطابت کے مختلف پہلوؤں پر معلومات افزا بحث کی گئی ہے۔ اور قواعد، خطابت اور مقررانہ اوصاف و خصائل وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

عالمگیر فروری ۱۹۴۱ء

غزل

فغاں آشنائے اثر ہو رہی ہے
مری زندگی مختصر ہو رہی ہے

قیامت یہ کیا چشمِ تر ہو رہی ہے
کہ ہر شامِ غم کی سحر ہو رہی ہے

محبت میں اب یوں گذر ہو رہی ہے
بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

ہر اک ضرب دل کارگر ہو رہی ہے
نظر مبتلائے نظر ہو رہی ہے

میں خود تو زمانے سے غافل ہوں لیکن
زمانے کو میری خبر ہو رہی ہے

مری انتہائے محبت سلامت
تری ہر جفا بے ضرر ہو رہی ہے

کہاں آفتاب اور کہاں ذرہ اختر
مری زیست نقشِ جگر ہو رہی ہے

اختر رضوانی

کلام وجد

اک پرتوِ دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

اے جوشِ جنوں دولتِ دیدار مبارک
صد شکر نقابِ رخِ محبوب نہ سرکا

رہتی ہے نظر تشنۂ نظارۂ فطرت
شکوہ ہے تنک مایگیِ شام و سحر کا

ہنگامِ سحر قطرۂ شبنم کی ضیا میں
انجام جھلکتا ہے شبابِ گلِ تر کا

ہر شئے کے خریدار تھے بازارِ جہاں میں
طالب نہ ملا وجدؔ کوئی جنسِ ہنر کا

سکندر علی وجد

مرہٹی زبان میں افسانوی لٹریچر

اس زمانے میں جب کہ مہاراشٹر غفلت کی میٹھی نیند سو رہا تھا، وہاں کے باشندوں کے پیروں میں غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں ادب بھی قعر مذلت میں گرا ہوا تھا، ایسے ہی تاریک زمانے میں ایک لڑکا دینا نیشور نشک ــــ میں موضع آلندی میں پیدا ہوا۔ اس نے عنوان شباب ہی سے مذہبی پرچار شروع کیا اور مہاراشٹر کے باشندوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔

اس نوجوان سادھو نے دینا نیشوری، لکھی جو مرہٹی ادب میں ایک ناقابل فراموش یادگار ہے۔ یہ بھاگوت گیتا کی منظوم شکل ہے اور مرہٹی زبان کی سب سے پہلی کتاب مانی جاتی ہے اس کے بعد سے اس خطہ میں کئی بڑے بڑے سنت و سادھو پیدا ہوئے جنھوں نے عوام میں بیداری کی روح پھونکی اور ادب کی ترقی میں کوشاں رہے۔ تکارام نے اپنے کلام کے ذریعے لوگوں پر ایک قسم کی وجدانی کیفیت طاری کردی، رامداس سوامی نے ان میں مذہبی و سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ ایکناتھ نے چھوت چھات رفع کرنے کی کوشش کی غرض اس دور میں ادب بھی ارتقائی منازل طے کرنے لگا۔

ابتداء میں عوام کا رجحان بھکتی کی جانب زیادہ مائل تھا چنانچہ تکارام، نامدیو اور جنا بائی کے کلام کو لوگ بڑے شوق سے سنتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ پورانی پریم کی کہانیاں بھی بہت شوق سے سنی جاتی تھیں، رادھا کرشن، نل دمینتی اور ستی ساوتری کے واقعات لوگوں پر ایک قسم کا روحانی اثر رکھتے تھے۔ اور انہی قصوں سے وہ افسانوی ادب سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

جب مرہٹوں کا عروج تمام ہندوستان میں ہو گیا۔ تو عوام کی توجہ زیادہ تر رزمیہ نظموں کی جانب مبذول ہو گئی ان کو مرہٹی میں "پواڑے" کہتے ہیں۔ ان میں بہادران قوم اور شیران وطن کے گیت گائے جاتے ہیں، عموماً یہ نظمیں سیوا جی اما جی نائک جیسے بہادروں کے کارناموں پر لکھی گئی ہیں۔

مرہٹوں کے زوال کے بعد بھی یہ صنف کافی مقبول رہی اور یہ جا بجا محفلوں میں سنائے جانے لگے تاکہ لوگوں میں پھر سے وہی روح عود کر آئے، آج بھی مہاراشٹر میں "پواڑے" بکثرت سنے جاتے ہیں اور ان سے عوام میں بیداری پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

انگریزوں کی عملداری آمد کے بعد سے عوام کی توجہ انشاء لطیف کی جانب مائل ہوئی۔ اور ان میں ناول اور افسانے تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگے اس وقت کی اکثر کتابیں سنسکرت یا انگریزی کی ترجمہ ہوتی تھیں مثلاً ہتوا پدیش، پنچ تنتر، بال متر وغیرہ رفتہ رفتہ ادب میں رومان کا نشو ونما ہونے لگا۔ بتیال پچیسی سنگھاسن بتیسی جیسی بے نظیر کتابوں سے لوگ اپنا دل بہلانے لگے ۱۸۶۱ء میں چپ لونکر کی چمتکارک گوشٹی شائع ہوئی اور اسی اثناء میں مدن منجری، رتن پربھا، کتا مالا جیسے عشقیہ ناول شائع ہوئے جن کی بدولت ان میں کئی برس تک رومان کا زور و شور رہا۔ اور ناظرین کو ادب کی اس صنف کا خوب چسکا لگ گیا۔

۱۸۷۹ء میں مرہٹی ادب میں ایک انقلاب شروع ہوا ہری نارائن آپٹے آنجہانی نے جو مرہٹی کے مشہور ترین ناول نویس ہیں کرم نک، نامی اخبار جاری کیا اور اس کے ذریعہ اچھی ناول کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت اصلی اور اچھی ناولوں کا مطلق رواج نہ تھا، ہیں مگر کون شناخت کرتا اگر غور سے کون سنتا

گوارا کرے) جو اُن کا مشہور سماجی ناول ہے اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اس وقت کی کہانیاں موجودہ مختصر افسانوں کی جیسی نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ خود ایک ناول کی سی حیثیت رکھتی تھیں، آپ کی اکثر کہانیاں سماجی ہیں آپ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سات کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس کے چار حصے ہیں، ان میں تقریباً بیس کہانیاں ہیں جن میں، احسان کا بدلہ، قحط تو بہت کٹھن گزرا، غریبی کا سنسار اور ڈپٹینیا پڑھنے کے قابل ہیں۔ قحط تو بہت کٹھن گزرا ۱۸۹۷ء میں لکھا۔ اس میں انھوں نے قحط زدہ لوگوں کی دردناک تصویر کھینچی ہے کیسے دن گزرے، میں پونا کے ۱۸۹۹ء کے طاعون کے وحشتناک زمانے کا ذکر ہے ڈپٹینیا آپٹے صاحب کی مزاحی کہانی ہے۔ ہاتھ لگاتے ہی سونا، وغیرہ انگریزی طرز کے افسانے ہیں۔ اسلوب بیان فطری اور زوردار ہے۔ کرم نک اخبار نے مرہٹی ادب اور افسانے کی بہت خدمت کی۔ ۱۸۹۵ء سے مرہٹی افسانوی ادب میں ایک دوسرا انقلاب آتا ہے، کاشی ناتھ رگھو متر آنجہانی نے، منورنجن، رسالہ جاری کیا ان میں مختصر افسانے شائع ہوتے تھے جو زیادہ تر بنگالی زبان کا ترجمہ ہوتے تھے۔ کاشی ناتھ راؤ اور ان کے شریک مدیر وٹھل سیتارام گرجر کی کہانیاں، منورنجن میں شائع ہوئیں متر آنجہانی نے رام کا اجودھیا لیلا اور راما مادھو وغیرہ ناول لکھے جو ٹھیٹھ بنگالی کے تراجم ہیں، گرجر صاحب نے بھی بابو جلدھر سین، بابو پربھات کمار، مکرجی اور پروفیسر کالی پرسن داس گپتا وغیرہ جیسے بنگال کے مشہور انشاپردازوں کی تصانیف کے ترجمے کئے۔ آپ کی ناولوں میں پونم کا چاند، خاوند بیوی، دیوتا بہت مشہور ہیں آپ بنگالی افسانوں کو مرہٹی جامہ پہنانے میں خوب مشاق ہیں، زبان شستہ اور بامحاورہ ہے، عموماً آپ کے پیش نظر تعلیمی

اور سماجی چیزیں رہی ہیں۔

۱۸۹۶ء میں بال گنگادھر تلک آنجہانی نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور مراٹھا نامی ہفتہ وار اخبار نرسمہن چنتامن راؤ کیلکر کی مدد سے جاری کیا۔ اس وقت مہاراشٹر میں صحافت کافی ترقی کر چکی تھی چنانچہ اس وقت کے مرہٹی اخبارات، کیسری دینان پرکاش وغیرہ تھے۔ اسی زمانے میں کیلکر پروفیسر پراجپے آنجہانی، کولھٹ کر، پروفیسر وامن ملہار جوشی، آنندراؤ کرشناجی ٹیکاڑے وغیرہ جیسے مشہور مصنفین نے چیدہ چیدہ کہانیاں لکھیں اور اسی زمانے میں کیلکر اور کولھٹ کر نے مرہٹی ادب میں (ESSAY) لکھنے کا رواج ڈالا۔ کولھٹ کر کی کہانیوں میں مدیرہ غریب بیچارہ بھگا وُ بہترین ہیں۔ کولھٹ کر نے سماج سدھار کے لئے جان توڑ کوششیں کیں چنانچہ کیلکر جیسے مشہور سدھارک اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں کہ، سماج کے سدھارنے میں کولھٹ کر مجھ سے بھی بازی لے گئے، ان کے افسانے کتھا پستک کے نام سے شائع ہوئے ہیں جن میں کیتاراؤ، چندون علی گڑھ میں میں نے ریل گاڑی کس طرح مس کی، دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں پلاٹ سیدھا سادہ مگر نہایت دلچسپ ہے پروفیسر شیورام مہادیو پرانجپے مہاراشٹر کے مشہور مقرر اور ادیب تھے آپ کی کہانیاں زیادہ تر سیاسیات سے متعلق ہیں آپ نے افسانوں کے ذریعے ملک میں ملک کی عزت اور خدمت کے خیالات پیدا کرنے کی کوشش کی ان کے افسانوں میں ایک کارخانہ، رام بھاؤ کی کہانی، ایک پتھر پھوڑنے والے کی کہانی، ایک جاترا، وغیرہ مشہور ہیں۔ پروفیسر وامن ملہار جوشی کے افسانوں کا مجموعہ، لوپشپ کرنڈک کے نام سے شائع ہوا ہے ان میں بعض مزاحیہ افسانے بہت عمدہ ہیں۔ اس وقت مرہٹی زبان بہت ترقی کر رہی تھی، بھنڈارکر اور راناڈے

جیسے عالم و فاضل اپنی تحریروں سے اس کی خدمت کر رہے تھے۔
مشہور سیاس کرشنا جی گوکھلے آنجہانی نے بھی میدان صحافت میں قدم رکھا اور اپنے افسانوں کو منورنجن میں شائع کیا' آپ عموماً انگریزی افسانوں کو مرہٹی جامہ پہناتے تھے۔ آپ کے چند افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ منورنجن میں بنگالی' انگریزی' گجراتی' فرانسیسی اور ہندی افسانوں کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں اگست کے مہینے سے واسودیو گوند آپٹے آنجہانی نے آنند نامی ماہ نامہ جاری کیا' آپ انگریزی اور بنگالی زبان کے ترجمے کرتے تھے۔ بنکم چندر چٹرجی اور ہنری وڈ وغیرہ کے اکثر ناولوں کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کیا ہے۔

۱۹۱۰ء کے بعد سے مرہٹی افسانہ نگاری کے میدان میں چند نئے افسانہ نگاروں نے قدم رکھا جن میں ناتھ مادھو آنجہانی' سہکاری کرشن آنجہانی' نارائن ہری آپٹے اور نارائن سیتارام پھڑکے اور سرسوتی کمار مشہور ہیں اس وقت منورنجن کے ڈھنگ پر نویگ' ادیان' مدھوکر' کرتوسکر وغیرہ ادب لطیف کے ماہ نامے نکلے' اس زمانے میں انگریزی کی جاسوسی کہانیاں کثرت سے مرہٹی ادب میں منتقل ہونے لگیں پریم چند راور ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ بھی اسی دوران میں کیا گیا چنانچہ پریم چند کی کہانیاں' آنند راؤ جوشی اور کتھا کدمب' ایس آر مراٹھے نے جو ٹیگور کے افسانوں پر مشتمل شائع کیا۔

ناتھ مادھو مہاراشٹر کے مشہور ناول نگار تھے' آپ نے بھی چند افسانے لکھے ہیں۔ سہکاری کرشن کے چند افسانے' سنسار کتھا کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ سرسوتی کمار کے افسانے زیادہ تر سماجی ہیں جو بال منڈوانے' بچپن کی شادی اور عمر رسیدہ مردوں کی شادی اور برے رسم و رواج سے متعلق ہیں۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے مرہٹی افسانہ نگاری میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ کئی ماہ نامے مثلاً سہھیادری' ایشونت' جیوتسنا' کرتوسکر' منوہر وغیرہ نکلے' جن میں افسانے بکثرت شائع ہونے لگے۔ اسی دوران میں ٹالسٹائی' ہارڈی' گالزوردی' چیخوف' گورکی' موپاساں وغیرہ کے افسانے مرہٹی زبان میں کثرت سے منتقل ہوئے' نئے نئے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے جن میں سے بعض اب چوٹی کے افسانہ نگار شمار کئے جاتے ہیں مثلاً پروفیسر پھڑکے' کھانڈیکر' ماڈکھولکر' اترے' ودیرکر وغیرہ

پروفیسر پھڑکے' نارائن سیتارام پھڑکے مرہٹی کے ہر دلعزیز ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں' اب تک آپ کی ۴۶ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ۱۳ ناول ہیں۔ ہری نارائن آپٹے آنجہانی کے بعد سے آپ ہی مرہٹی کے سب سے بڑے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں' مسافر' آرزو' دولت' نرنجن' جادوگر وغیرہ بہت مشہور رہیں۔ افسانے بھی خوب لکھتے ہیں' آپ کے افسانے دل پذیر اور دلچسپ ہوتے ہیں' عوام کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں' نوجوانوں کے دلوں کو گرماتے اور محبت بھری کہانیاں لکھنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ آپ کے افسانوں کے تین مجموعے' پروفیسر پھڑکے کی کہانیاں (۲ جلدیں) اور بولا اور دیگر افسانے' شائع ہوئے ہیں۔ شانتا دنیا میں پہلا قدم' بھالچندر کی ٹنکار میں' آپ نے بچہ' عورت اور مرد کی نفسیات کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا ہے' کالج کی شرارتیں' میں کالج کی شرارتوں کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے' دیگر افسانوں میں لکشمی پوجن' بولا' وتسلا وغیرہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپ کے افسانوں کا پلاٹ عموماً بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ اور قارئین کی دلچسپی افسانے کے ساتھ ساتھ پڑھتے ہی جاتی ہے۔ اسلوب بیان نہایت دلچسپ

اور زبان کسی قدر سلیس ہوتی ہے ۔

کھانڈے کر۔ وشنو سکھارام کھانڈے کر مرہٹی کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۴ بتائی جاتی ہے جن میں آٹھ ناول اور گیارہ افسانوں کے مجموعے ہیں ۔ آپ کے ناولوں میں سفید بادل دل کی پکار، پہلا پریم بہت مشہور ہیں ۔ افسانے کے مجموعوں میں پھول اور پتھر، پوجن، سادھی پر کے پھول، گرمی اور بارش وغیرہ بہت مقبول ہیں ۔ کھانڈے کر کو مرہٹی زبان کی افسانہ نگاری میں وہی درجہ حاصل ہے جو اردو زبان میں منشی پریم چند مرحوم یا ڈاکٹر اعظم کریوی کو، آپ کے افسانوں میں بھی منشی پریم چند یا ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانوں کی طرح کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے، چند سال قبل مرہٹی ادب میں آرٹ اور زندگی کی بحث خوب چھڑی، کھانڈے کر اس خیال کی تائید میں تھے کہ آرٹ زندگی کے لئے ہے اور پروفیسر پھڑکے کا خیال تھا کہ آرٹ آرٹ کے لئے، چنانچہ اس طرح مہاراشٹر میں دو اسکول پیدا ہوگئے ایک کھانڈے کر کا دوسرے پھڑکے کا۔ کھانڈے کر کا قول ہے کہ وہ ادب یا آرٹ بالکل بیکار ہے جو زندگی کے لئے کار آمد نہ ہو چنانچہ ان کی ہر تحریر میں یہی چیز کارفرما دکھائی دیتی ہے

کھانڈے کر کی افسانہ نگاری کا میدان بہت وسیع ہے وہ بہت بڑا مصلح ہے اس کے پیش نظر ہر افسانہ لکھتے وقت کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے، چنانچہ اس کے آنسوؤں میں وہ موجودہ لیڈروں اور مقرروں کی دھوکا بازی کو نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے ۔ مردوں کا پریم، میں اس نے مردوں کی عیاری کو ظاہر کیا ہے، وہ مزدوروں، غریبوں اور دکھی انسانوں کا بہت بڑا ہمدرد ہے ۔ چنانچہ انصاف، دکھی انسان، بھٹا ہوا قمیص اس کی بہترین مثالیں ہیں ۔ کھانڈے کر بہت بڑا ماہر نفسیات ہے

چنانچہ یتیم لڑکی، ٹھہرو وغیرہ میں اس نے بچوں کی نفسیات کا نہایت خوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے، رومانی افسانوں میں بیرون خانہ، دوسری بیوی، ڈھلکتے ہوئے آنسو، پڑھنے کے قابل ہیں ۔

کھانڈے کر کی زبان نہایت سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے ۔ افسانے نہایت ستھرے اور پاکیزہ ہوتے ہیں ۔ پلاٹ حد درجہ دلکش ہوتا ہے تشبیہیں اور استعارے بکثرت ہوتے ہیں ۔ بعض تشبیہیں تو اتنی عمدہ ہوتی ہیں کہ انسان سر دھننے لگتا ہے ۔ افسانوں میں مزاح کی چاشنی بھی نہایت ہی لطیف پیرایہ میں ہوتی ہے ۔ حقیقت میں مرہٹی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو اتنا بڑا آرٹسٹ ملا ۔

(باقی آئندہ)

امجد علی خاں یوسف زئی (عثمانیہ)

سرگذشت

ادارۂ ادبیات اردو ——— مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد

ادارہ کی دس سالہ سرگذشت نہایت ہی محنت اور سلیقہ سے مرتب کر کے شایع کی گئی ہے ۔ اس میں ادارۂ ادبیات اردو کی ہمہ جہتی علمی و ادبی خدمات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل کتاب ہوگئی ہے ۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کا پتہ چلتا ہے بلکہ حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں اور اردو نوازیوں کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے ۔

کتابت و طباعت بہت ہی نفیس اور پاکیزہ ہے

تعداد تصاویر ۲۵ خوشنما جلد اور گرد پوش بھی ہے

تعداد صفحات (۳۴۴) قیمت صرف ۱۲ ر

گل بوٹے

ایک "روحانیت" بھرے بزرگوار جنھوں نے نامِ خدا زندگی کی صرف ساٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں، اپنی خزاں کو بہار کا سندیسہ دے کر ساتویں مرتبہ گھر بسانا چاہتے ہیں، ماشاء اللہ سے آپ بالکل "صحیح سالم" ہیں، البتہ کسی قدر لرزہ براندام رہتے ہیں، لقوہ سے منہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے مگر منہ میں دانت نہ ہونے سے بدنمائی پیدا نہیں ہوئی ہے، بصارت کی کمزوری آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے مگر عمر کے بڑھنے سے "بصیرت" بڑھ گئی ہے، کانوں سے برابر سنائی دیتا ہے، صرف چلانا پڑتا ہے۔

آپ کے کئی عدد چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ہیں، سب سے بڑے لڑکے نے پچھلے مہینہ چالیسویں برس میں قدم رکھا ہے اور سب سے چھوٹی لڑکی اٹھائیسویں سال میں کھیل رہی ہے ان سب کو آپ نے "اعلیٰ تعلیم" دلائی ہے، بڑا لڑکا انگریزی میں تار کا مضمون اچھی طرح سمجھ لیتا ہے، اردو تو "پدری زبان" ٹھیری! اس میں سب کو کافی مہارت ہے، البتہ بعض "پیچیدہ" الفاظ کی املا میں ایک آدھ حرف کی غلطی ہو جاتی ہے، جیسے آم کو "ع" سے، سلام کو "ص" سے، صبح کو "س" سے اور عقل کو "الف" سے بھی لکھا جاتا ہے، انگریزی لکھنے کا کام نہیں پڑتا اس لئے اس کی املا میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں! بولنے میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے ذرا تکلف ہوتا ہے، اس لئے "یس" اور "نو" پر ہی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکوں کی تربیت کی طرف بھی پوری پوری توجہ کی گئی ہے اور بڑی کوشش سے ان میں "اعلیٰ کردار" اور "بلند اخلاق" پیدا کئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ آج کل کی "شریف" صحبتوں میں دن رات گھنٹوں بیٹھے اعلیٰ درجے کے "مہذب" کھیل مثلاً برج، پوکر، فلش وغیرہ میں جی کھول کر حصہ لیا کرتے ہیں، موسمی تفریحیں مثلاً گھوڑ دوڑ اور بارش کے سٹہ پر بھی تھوڑی بہت ہار جیت ہوا کرتی ہے، ایسے موقعوں پر ایک گونہ بے خودی پیدا کرنے کے لئے "بنت عنب" کو بھی دعوت دی جاتی ہے، "ولایتی" سے زیادہ رغبت ہے کیونکہ "دیسی" صحت کو بگاڑ دیتی ہے، جب یہ "مس صاحبہ" جلوہ گر ہوتی ہیں تو سارا گھر اُن کے عشوہ و ادا کی کافرماجرائی پر مرمٹتا ہے، یہاں تک کہ پدر عالی مقام بھی ان کے حسنِ جہاں سوز سے اپنی بے نور آنکھیں سینک لیا کرتے ہیں۔

بچوں کی "سعادت مندی" کا یہ عالم ہے کہ ابا جان کتنا ہی خفا ہوں خاموش رہتے ہیں، کبھی غصہ آجاتا ہے تو صرف ڈیم فل، بلڈی فل وغیرہ کہہ دیا کرتے ہیں، اس قسم کے انگریزی لفظ جب بچوں کے منہ سے پھول بن کر جھڑتے ہیں تو پدر بزرگوار پھولے نہیں سماتے اور فرماتے ہیں "بچہ اب اچھی انگریزی بولنے لگا ہے"!

لڑکیوں کی لیاقت لڑکوں سے کچھ ہی کم ہے، مگر سب کی سب پڑھی لکھی ضرور ہیں، ان کی تعلیم میں بھی آپ نے کافی روپیہ صرف کیا ہے، اس لئے جب کبھی کسی لڑکے کی جانب سے جہیز وغیرہ کا سوال ہوتا ہے تو آپ بہت برہم ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"تعلیم یافتہ لڑکی کی بھی خواہش کی جاتی ہے اور پھر جہیز بھی مانگا جاتا ہے، اگر جہیز جمع کیا جاتا تو ایسی "اعلیٰ تعلیم" کیسے دلائی جاتی"!

مگر اب تک آپ کو ایک بھی ایسا اعلیٰ خیال، علم دوست برخوردار داماد نہیں ملا جو آپ کی کسی لڑکی سے محض اس کی اس "مخصوص" اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بیاہ کرنا پسند کرتا، حال ہی میں بڑی لڑکی

کے لئے پیغام آیا تھا مگر شرط یہ تھی کہ ایک "اشد ضروری" قرض کی ادائی کے لئے فی الحال صرف پندرہ ہزار رُپے دئے جائیں، ایک اور "صاحب بہادر" نے یورپ جانے کے لئے بارہ ہزار رُپے طلب کئے تھے، آج کل کے یہ "تعلیم یافتہ" صاحبزادے بیویوں کے ریے سے اپنی دنیا سنوارنا چاہتے ہیں، معلوم نہیں ایسے شرمناک مطالبوں کا کب منہ کالا ہوتا ہے اور کب آپ کی صاحبزادیوں کے سہرے کے پھول کھلتے ہیں۔

لڑکیوں کا بیاہ کچھ تو ان کی "کم سنی" اور کچھ پدر بزرگوار کے بیاہ پر بیاہ کی مصروفیت کی وجہ سے آج تک نہ ہوسکا، آپ کے عزیز اور دوست کبھی ان کے بیاہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتے ہیں تو مسکرا کر فرماتے ہیں۔

"ابھی بچے ہیں جلدی کیا ہے"!

مگر ان معصوم بچوں نے چپکے چپکے اپنے بیاہ کر لئے ہیں، اور بڑی چھان بین کے بعد "بازار" سے اپنے اپنے جوڑے خرید لائے ہیں، والد محترم کے بقول جوانی دیوانی ہوتی ہے اور ایسے کھیل تو سبھی کھیلتے ہیں!

بعض احمق لوگ اپنی لڑکیاں آپ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ سعادت مند اور ہونہار لڑکوں کو اس لئے دینا پسند نہیں کرتے کہ وہ بے روزگار ہیں حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے، دوسری "نامعقول" وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچوں کے بچے ہوگئے ہیں، مثل مشہور ہے "آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے"! اس میں تعجب کی کیا بات ہے!! ایں سعادت بزور بازو نیست!!!

خیر کوئی اپنی لڑکی دے کہ نہ دے، جو لیلی کا جوڑا ہے ایک دن جوتیاں چٹخاتے آئے گا اور ضرور آئے گا! اس لئے آپ نے لڑکوں کے بیاہ کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے، لڑکے بھی باپ کے ہم خیال ہیں اور فی الحال افزائش نسل "دوبابہ" میں مصروف ہیں، ان کی کوششیں خوب پروان چڑھ رہی ہیں اور گھر میں کچھ عجیب "میلہ" لگ رہا ہے۔

چند روز سے باپ بیٹوں میں ذرا چشمک ہوئی ہے بچے چاہتے ہیں کہ اباجان "نئی امی جان" کو نہ لائیں مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جوانی کی یہ راتیں اور مرادوں کے یہ دن آخر کس طرح کٹیں!! اس لئے کسی ایسی موزوں امی جان کی تلاش جاری ہے جو برس پندرہ یا سولہ کی ہو!!

جب سے لڑکوں نے اباجان کے بیاہ کی خبر سنی ہے وہ بھی اپنے اپنے جوڑے بدلنے کی فکر میں ہیں، خدا وہ دن جلد لائے کہ ان سب کی فکریں دور ہوں اور باپ بیٹے اپنی اپنی مرادیں پائیں! آمین!!

"باغباں"

اُردو مثنوی کا ارتقاء

پروفیسر عبدالقادر سروری ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب میں اُردو مثنوی کی پیدائش سے لے کر موجودہ دور تک اس کی ترقیوں اور تبدیلیوں کی مختصر تنقیدی تاریخ پیش کردی ہے۔ اور ہر عہد کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ **شاہکار** لاہور۔ نومبر ۱۹۴۰ء

ادارۂ ادبیات نے اس کتاب کو شایع کرکے اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ امید ہے کہ صاحب ذوق حضرات اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ **سہیل** گیا۔ مئی ۱۹۴۰ء

صنف مثنوی کے متعلق جس قدر تالیفات اب تک شایع ہوئی ہیں۔ ان میں یہ کتاب تفصیل تنقید اور تشریح کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ **البیان**۔ مئی ۱۹۴۰ء

مثنویوں پر پُرمغز تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب کے طلبہ کے لئے ناگزیر ہے **جامعہ** جولائی ۱۹۴۰ء

فطرت کا انتقام

اک زمانہ وہ بھی تھا، یا دش بخیر اے ہمنشیں
کائناتِ حسن و نغمہ تھی مرے زیرِ نگیں

ہائے کیا دن تھے بہ فیضِ شہرتِ شعر و سخن
میری ہمراہی پہ نازاں تھے عروسانِ چمن

کتنے پھولوں کو دیا تھا میری نظروں نے شباب
کتنی کلیاں بن گئیں تھیں چاند تاروں کا جواب

کتنے گل میرے لئے کھل کھل مرجھاتے رہے
کتنے دل میری جواں سالی کو بہلاتے رہے

کتنی آوازوں کی مے میرے لئے بہتی رہی
کتنی آنکھوں کی جوانی بارِ غم سہتی رہی

کتنے جلوے میری نظروں میں سما کر کھو گئے
کتنے چہرے نذرِ بے مہری بہم ہو گئے!

کتنے معصوموں کے دل ہنس کر چرا لاتا تھا میں
کتنے ساغر آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جاتا تھا میں

پھول سے چہرے رہے غم آشنا میرے لئے
پنکھڑی سے لب رہے وقفِ دعا میرے لئے

ہر نظر اک جلوۂ تازہ میں کھو جاتا تھا میں
ہر قدم اک منزلِ نو کی خبر لاتا تھا میں

ہر نفس پیغامِ سرمستی سناتا تھا مجھے
کھیلنا تھا، کھیلنے میں لطف آتا تھا مجھے

اِس طرف یہ رنگ تھا اور اُس طرف فطرت کا قہر
میرے جامِ زندگی میں بھر رہا تھا کوئی زہر

کیا خبر تھی ایسے دن، ایسی گھڑی بھی آئے گی
زندگی کی بادشاہی بھی کہیں جھک جائے گی

کیا خبر تھی عشق میں ایسا بھی اک دن آئے گا
جو کہیں جھکتا نہ تھا، ہائے وہ سر جھک جائے گا

بے نیازی خاک چھانے گی دو عالم کی نظر
قیصریت بھیک مانگے گی درِ محبوب پر

شادمانی جان دے گی درد کے آغوش میں
زہر کی تلخی بھی ہوگی، بادۂ سرجوش میں

وقف ہوں گے قہقہے آنسو بہانے کے لئے
رات آئے گی تو آئے گی جگانے کے لئے

گاہ شکرِ غم نوازی، گاہ کربِ انتظار
گاہ آنسو، گاہ مجبوری کا دامن تار تار

لاکھ ہشیاری میں بھی سویا کرے گی زندگی
حلقۂ احباب میں رویا کرے گی زندگی

نیند ایسی آئی، کوئی صبح چونکاتی نہیں
کوئی عالم ہو طبیعت جوش میں آتی نہیں

فکرِ مستقبل، خیالِ یار، دردِ روزگار!
لب فسردہ، روح خوابیدہ، نگاہیں بے قرار

ایک دل اور اِس قدر رنج و تعب میں مبتلا
کتنی ظالم ہے مشیت، کتنا جابر ہے خدا

نظر

اُردو کی نئی کتابیں

۱۔ گنجینۂ صحت (جلد اوّل) از حکیم بشیر احمد ۹۶ صفحات۔ بھوشن پرنٹنگ پریس۔ جگادھری۔
۲۔ مجربات سلطانی (حصہ سوم) از حکیم محمد یار خاں۔ ۲۴۰ صفحات تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور
۳۔ مجربات جیلانی (جلد سوم) از حکیم غلام جیلانی۔ ۱۶۰ صفحات آفتاب برقی پریس۔ امرتسر۔
۴۔ تحفۂ مقبول۔ جلد اوّل (طبی نسخے) از پیر مقبول عالم ۱۷۲ صفحات حجازی پریس۔ لاہور
۵۔ سائیکلوپیڈیا آف ہومیوپیتھک ورکس (حصہ اوّل) از کانشی رام ۹۵۰ صفحات۔ فائین پریس۔ لکھنؤ
۶۔ اقتصادی ہند۔ از برج نرائن ۲۶۹ صفحات۔ امرت الکٹرک پریس لاہور
۷۔ ہمزاد کے درشن (سحر و طلسم) از پنڈت سادھو رام ۱۶۴ صفحات حجازی پریس۔ لاہور
۸۔ کامل جدید موٹر گائیڈ۔ از ایم۔ ایس ظفر آغا۔ ۱۰۴ صفحات حجازی پریس۔ لاہور
۹۔ اشکِ خونیں (نظمیں) از رامیشور پرشاد بسمل ۹۴ صفحات وزیر ہند پریس۔ امرتسر۔
۱۰۔ سرودِ غم (نظمیں اور سلام وغیرہ) از سیماب اکبرآبادی ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲/۔ دفتر رسالہ شاعر۔ آگرہ۔
۱۱۔ حیات محمد عبدہ (سوانح) از محمد مظہر الدین ۸۳ صفحات قیمت ۱۲/۔ دفتر اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔
۱۲۔ بادۂ سرجوش (مجموعۂ کلام) از پنڈت بھورام جوش ۱۲۰ صفحات قیمت عہ۔ مرکز تصنیف و تالیف۔ نکودر۔ جالندھر۔
۱۳۔ بھگوت گیتا۔ مترجمہ پروفیسر محمد اجمل خاں۔ قیمت عسعہ کتاب گھر۔ الہ آباد۔
۱۴۔ ترتیب نزول قرآن کریم۔ مترجمہ پروفیسر محمد اجمل خاں قیمت (صہ) کتاب گھر۔ الہ آباد
۱۵۔ بستان تجلیات (مجموعہ کلام) از میر غضنفر علی شاہ بیتاب ۲۷۶ صفحات قیمت (عاں) اعانت دکن پریس۔ حیدرآباد دکن۔
۱۶۔ بشریٰ (آنحضرتؐ کی نسبت توریت اور انجیل وغیرہ کی بشارتیں) از۔ عنایت رسول عباسی۔ ۳۴۴ صفحات۔ شروانی پرنٹنگ پریس۔ علی گڑھ۔
۱۷۔ افتتاح الاندلس (تاریخ) مترجمہ پروفیسر جمیل الرحمن ۴۱۶ صفحات قیمت (عہ) کتابستان۔ الہ آباد
۱۸۔ خلافت اور سلطنت (تیسری صدی ہجری کے واقعات) از ڈاکٹر امیر حسن مترجمہ سبطین احمد۔ ۳۷۰ صفحات۔ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔
۱۹۔ مشاہیر عالم کی داستان مصیبت (سولہ مشاہیر کے حالات) از آتش گوجرانوالیہ ۱۶۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل۔ لاہور۔
۲۰۔ سنہرے سپنے (۶۱ گیت) از تنویر قریشی۔ ۷۲ صفحات قیمت ۱۲/۔ نرائن دت سہگل۔ لاہور۔
۲۱۔ مسافر کی ڈائری باتصویر (سفرنامہ) از خواجہ احمد عباس ۱۹۲ صفحات قیمت عہ۔ حالی پبلشنگ ہاوس۔ اُردو بازار۔ دہلی
۲۲۔ جاہ و جلال (ڈراما) مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ۔ قیمت عسعہ ڈرامیٹک کلب۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور
۲۳۔ بہار داغ (داغ کا منتخب کلام) مرتبہ سید نذیر نیازی قیمت عہ۔ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔
۲۴۔ علم خانہ داری۔ از محمودہ صدیقی۔ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد حیدرآباد دکن

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

شہید کربلا قرآن کی روشنی میں

از ابو محمد مصلح ناشر ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد د۔ ۲۷۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی کو قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سید الشہداء کی پوری زندگی ان کے باپ اور نانا کی زندگیوں کی طرح اس عظیم الشان کلام الٰہی کی تفسیر تھی اور اس موضوع پر اتنا مواد مل سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب سے کئی گنا ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

ابو محمد مصلح صاحب نے امام حسینؑ کی حیات ایک نئے پیرائے سے لکھی ہے اور اس جدت کی حد تک وہ قابل مبارکباد ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب اور فراہمی مواد موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے کہ بغیر تلاش و جستجو اور قدیم کتابوں کے مطالعہ کے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور اس کے لئے کافی وقت اور صبر کی ضرورت ہے۔ محمد مصلح صاحب کے یہاں بظاہر اتنا وقت نہیں کہ وہ صرف اسی موضوع کے لئے ایک عرصے تک وقف ہو جائیں۔ اسی لئے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب روا روی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا اسلوب شگفتہ اور کتابت و طباعت شایستہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو مطالعہ کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے یہ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی اور اس وقت تک جب کہ اس موضوع پر کوئی بسیط کتاب شائع نہ ہو یہی بہت سی مفید معلومات کا ذریعہ بنی رہے گی۔ اس کتاب کو مصلح صاحب نے مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات سرکار عالی کے نام معنون کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے قوم کے ان نوجوانوں کے نام ایک پیام پہنچانے کی کوشش کی ہے جو قرآن کی روشنی میں حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب کی قیمت میں کمی کی کافی گنجائش ہے۔

سفینۂ نجات

از صغرا بیگم ہمایون مرزا ۴۸ صفحات مطبوعہ شمس المطابع حیدرآباد۔

اس چھوٹی سی کتاب میں تقریباً پچاس نوحے درج ہیں۔ یہ اصل میں اس سے قبل دو بار چھپ چکی ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۲ء میں اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ان دونوں طباعتوں کے نسخے مفت تقسیم کر دئے گئے تھے اور غالباً اس تیسری طبع کے نسخے بھی ہدیتاً ارسال کئے جا رہے ہیں۔ اس میں مناجات، نعت اور سلام کے بعد نوحے درج کئے گئے ہیں۔ جن پر یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ کونسے نوحے کن تاریخوں میں پڑھے جائیں۔ اس طرح پہلی سے دسویں محرم اور پھر بارھویں اور بیسویں محرم اور ۲۸ صفر کو پڑھنے کے قابل نوحوں کی کافی تعداد اس کتاب میں شایع کی گئی ہے۔

سراج اور ان کی شاعری

از عبد القادر سروری۔ مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس۔ ۹۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

اس کتاب میں اورنگ آباد کے مشہور صوفی شاعر سید شاہ سراج الدین سراج کے حالات زندگی اور خصوصیات سخن تفصیل سے درج کئے گئے ہیں پہلا حصہ جو شاعر کی زندگی سے متعلق اعلیٰ پایہ تحقیقات پر مشتمل ہے تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک خاصے کی چیز سمجھا جائے گا۔ اس میں خاص تلاش و جستجو کے بعد سراج اور ان کے ماحول اور ان کے حالات سے متعلق تفصیلی معلومات درج کی گئی ہیں۔ یہ حصہ ابتدائی ۶۵ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ شاعری سے متعلق ہے اور تقریباً اتنے ہی صفحات اس کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سراج نے کس طرح حافظ اور ولی کے رنگ میں شاعری کی اور سراج کے بعد کے شاعروں مثلاً میرا اور غالب کے کلام میں سراج کا رنگ کس طرح جگہ جگہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے پوری کتاب اس قابل ہے کہ اردو ادب کا ذوق رکھنے والے اس کو شوق سے

پڑھیں گے اور مصنف کی محنت اور قابلیت کی داد دیں گے۔

فکر مت کرو از قاضی محمد زین العابدین۔ ۱۵۱ صفحات قیمت عہ۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ ڈراما ۱۹۱۶ء میں اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ اس کے مصنف سیول سردیس کی ٹریننگ کے لئے امراوتی (برار) میں مقیم تھے۔ اس وقت یورپ کی جنگ عظیم زور و شور سے جاری تھی اور اس کے شعلے مشرق تک پہنچ چکے تھے۔ ہندستان بھی اس زمانے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے اس معرکہ میں کود پڑا تھا۔ اور اس کے ہر صوبے میں سپاہیوں کو بھرتی کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اسی سلسلے میں مصنف نے کمشنر صاحب برار کی فرمایش پر یہ ڈراما قلمبند کیا تھا۔ اس میں ایک لطیف پیرائے میں جنگ میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دلائی گئی ہے۔ اگرچہ اس کا اصل موضوع ترغیبی ہے لیکن پورا ڈراما ادبی لطافتوں اور خاکہ کی خوبیوں سے معمور ہے۔ اور جگہ جگہ مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔

یہ ڈراما عرصہ تک برار میں اسٹیج پر بھی پیش ہوتا رہا ہے۔ اس میں مصنف نے ہندستان کی موجودہ سیاست اور اہل ہند کی معاشرتی حالت کی طرف بھی بلیغ اشارے کئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ ہندستان اسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب کہ اس کے رہنے بسنے والے جوانمردی اور ایثار کے لئے تیار ہوں۔ جب تک یہ جوہر پیدا نہ ہوگا اہل ہند نہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہو سکتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں جو انھیں بیرونی آفتوں اور مداخلتوں سے بچانا چاہتے ہیں۔

آئندہ زمانہ از محمد فضل الرحمن۔ ۱۱۲ صفحات قیمت ایک روپیہ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ دو ایکٹ کا ڈراما ہے۔ جس میں ہماری سماج پر مذاحیہ پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاشرتی اور سماجی نقائص پر اسی انداز میں ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔ اس ڈرامے کو دیکھنے سے اب اس امر کا یقین ہوتا چلا ہے کہ اردو کے ادیب زندگی کی کامیاب ترجمانی کرنے میں کسی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے نہیں ہیں۔

اس ڈرامے کے مصنف مولوی فضل الرحمن صاحب حیدرآباد کے مشہور ادیب اور چوٹی کے ڈراما نگار ہیں۔ اس سے قبل ان کے تین ڈرامے ظاہر و باطن، نئی روشنی اور حشرات الارض شایع ہو چکے ہیں اور اسٹیج پر بھی کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ ڈراما بھی مقبول ہوگا۔

علم خانہ داری از محمودہ صدیقی ۱۵۰ صفحات قیمت (عہ) ناشر سب رس کتاب گھر حیدرآباد۔

اردو زبان میں خواتین کے اور خواتین سے متعلق ادب کی بہت کمی ہے۔ علم خانہ داری جو عورتوں کے لئے نہایت ضروری فن ہے۔ اس میں تو اور بھی زیادہ کمی نظر آتی ہے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ادارۂ ادبیات اردو نے محترمہ محمودہ صدیقی صاحبہ سے یہ کتاب مرتب کرا کے شایع کی ہے۔ یہ دس فصلوں پر منقسم ہے جن میں جسم اور اعضائے جسمانی حفظ صحت، ہوا، پانی اور غذا۔ گھر اور اس کی نگہداشت امراض اور ان کی روک تھام، تیمارداری اور فرسٹ ایڈ۔ گھر کا انتظام اور کھانوں کے نسخے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہر عنوان کے تحت کئی ذیلی سرخیاں قایم کر کے سلیس اور سادہ زبان میں مفید معلومات قلمبند کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ مولوی فیض محمد صاحب نے لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق اس وقت تک جو اردو کتابیں موجود ہیں ان پر تبصرہ کر کے زیر نظر کتاب کی خصوصیات اور اس کی افادیت کو واضح کیا ہے۔ ہر پڑھی لکھی خاتون کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ناموران سیاست (حصۂ اول) از عبدالمجید محمد نسیم ۶۶ صفحات قیمت ۶/ ناشر مکتبہ جامعۂ دہلی۔

یہ کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے کیونکہ موجودہ جنگ کی وجہ سے اکثر لوگوں کی زبان پر ہٹلر اور مسولینی، روزولٹ

اور اسٹالن، چرچل اور جمبرلین کے نام سنائی دیتے ہیں۔ لیکن ان کے حالات سے بہت کم لوگ واقف ہیں جس کی وجہ سے سیاست حاضرہ کے سمجھنے میں ان کو دشواری ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

اس میں عہد حاضر کے ۳۲ سیاسی مشاہیر کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ یہ اگرچہ مختصر ہیں لیکن اخبار بینوں کی ضرورت کو پورا کرسکتے ہیں۔ البتہ اس میں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور وہ ان مشاہیر کی تصویریں ہیں۔ بہتر ہوتا کہ جس طرح حالات کی ترتیب میں انگریزی اخبارات اور رسائل سے مدد لی گئی ہے اسی طرح ان ذریعوں سے تصویریں بھی حاصل کی جاتیں۔

عرفان حافظ

از شیاما چرن داس ۵۰ صفحات مجلد قیمت ایک روپیہ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس۔ دہلی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں حافظ کے کلام سے مختلف موضوعوں سے متعلق اشعار منتخب کرکے توضیح و تشریح کے ساتھ شایع کئے گئے ہیں اس کے مولف شیاما چرن داس صاحب کو ادب کا اچھا ذوق ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ان کے مطالعہ کے دوران میں تین کتابیں انھیں سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ایک دیوان حافظ (۲) بھگوت گیتا (۳) ایمرسن کا کلام۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"دیوان حافظ عشق حقیقی کی تعلیم کا نادر و نایاب خزانہ ہے۔ اور خواجہ حافظ کو دنیا کا وسیع تجربہ ہے۔ اس پر ان کی قادر بیانی نے تو ان کے کلام کو اور بھی چار چاند لگادئے ہیں۔ میرا ناچیز خیال تو یہ ہے کہ فارسی زبان میں عشق حقیقی کی بہترین تعلیم شاید دیوان حافظ سے زیادہ اور کہیں نہیں ملتی یہی وجہ تھی کہ شاہ عالمگیر کو دیوان حافظ اس قدر عزیز تھا کہ روزانہ سرہانے رکھ کر سویا کرتے تھے"۔

اس طرح آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"اس خاک پانے بیس سال کے مطالعۂ حافظ اور محنت شاقہ کے بعد دیوان حافظ میں سے ان تمام اشعار کے انتخاب کرنے کی کوشش کی ہے جو عشق حقیقی کے مختلف مراحل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتخاب کے بعد ان اشعار کو چوبیس فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ طالبان حق کے لئے عشق حقیقی کی مکمل تعلیم اختصار کے ساتھ اس طرح تیار ہوجائے کہ وہ باآسانی روزانہ وظیفہ کرسکیں"۔

خود مولف کی اس وضاحت کے بعد اس کتاب کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ یہ واقعی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے اور خواجہ حافظ شیرازی کے اشعار کی جو توضیح کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف کو تصوف کا اچھا ذوق ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب میں یہ کتاب ضرور مقبول ہوگی۔

اردو رسم خط

از محمد سجاد مرزا ایم اے (۲۸) صفحات قیمت ۸ر مطبوعہ انتظامی مشین پریس

اس چھوٹے سے رسالے میں رسم خط سے متعلق نہایت تحقیقی اور اہم معلومات درج کی گئی ہیں اور مختلف خطوں کے جو نمونے دئے گئے ہیں ان کی وجہ سے اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اردو میں اپنے موضوع سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے جس میں اتنے اہتمام اور حسن ذوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مختلف عنوانوں مثلاً رسم خط کی ابتدا اور ارتقاء۔ اردو رسم خط کے پیش رو اور خود اردو رسم خط کے تحت مفید معلومات ایک جا کردی گئی ہیں۔ اور اردو کے لئے ایک نئے خط کی ضرورت دکھاتے ہوئے مولوی شیخ حسین صاحب متہدی دشاہ آبادی کے بنیادی رسم خط سے متعلق جو نمونے اور تجویز پیش کی گئی ہے وہ بھی اردو کے لسانی ارتقاء جیسے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

نقش اولیں طلبہ کلیہ ورنگل کا ششماہی رسالہ۔ مدیر سید اختر حسین ایم اے۔

ورنگل کالج سے اس سے قبل بھی ایک رسالہ شائع ہوتا رہا ہے لیکن اس سال سے اس نے نئی وضع اور جدید تراش خراش حاصل کرکے اپنے پیشرووں کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی ہے۔ اور جس انداز سے اب نکل رہا ہے اگر یہ جاری رہ سکے تو یقین ہے کہ یہ رسالہ ان تمام رسائل سے بازی لے جائے گا جو مملکت حیدرآباد میں طلبہ کی طرف سے شائع کئے جاتے ہیں۔ اس مجلہ کی کامیابی کا سہرا اس کے مدیر سید اختر حسین ایم اے اور نائب مدیر سید شاہ بلیغ الدین کے سر ہے۔ اس رسالے کے تمام مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ اگرچہ اس میں زیادہ تر طلبہ کو حصہ لینا چاہیے لیکن دوسرے اصحاب کے مضامین کی شرکت بھی ضروری ہے۔ تاکہ طلبہ ان کے مطالعہ سے اپنے ذوق ادب اور معلومات میں اضافہ کرسکیں، نظموں کا حصہ بھی بلند پایہ ہے۔ توقع ہے کہ اس رسالہ سے ورنگل کالج کے طلبہ کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اور خاص کر دوسرے مدرسوں کے طلبہ ضرور استفادہ کریں گے۔

کنڑی شاعری کے جدید رجحانات از ڈی کے بھیم سین راؤ ایم اے۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ (۱۱۶) صفحات۔

یہ اصل میں مجموعہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کے ساتویں سالنامہ کا چھپا ہوا حصہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد کی ایک مقامی زبان کنڑی کی شاعری کس خوبی کے ساتھ ترقی کرتی جارہی ہے۔ کنڑی ادب کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا کرناٹک میں اس وقت سے شروع ہوئی جب کہ پانچویں صدی عیسوی میں جین مذہب کو عروج حاصل تھا۔ چنانچہ کنڑی کی اکثر ابتدائی کتابیں جین مذہب ہی کے شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ دور ۱۱۶۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد جب لنگایت مذہب کو شہرت حاصل ہونے لگی تو کنڑی ادب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا آغاز کرنے والے لنگایت مذہب کے پیرو تھے۔

کنڑی شاعری کا تیسرا دور پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ کنڑی بولنے والوں میں برہمنی مذہب کو مقبولیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔

اس رسالے میں مولف نے جدید کنڑی شاعری کی زبان صنائع وبدائع اور مطالب وموضوعات سخن پر دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح ملک کی دوسری مقامی زبانوں کے ادب پر بھی پُراز معلومات مضامین شائع کئے جائیں۔ **شعبۂ تنقید**

نمود زندگی

یہ جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کی ایک سو ایک نظموں اور غزلوں اور رباعیوں کا دوسرا بیش بہا مجموعہ ہے۔ جناب موصوف حیدرآباد کے مشہور ومعروف اور پختہ گو شاعر ہیں اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا بلند پایہ رسالہ ہوگا جو آپ کے کلام کی اشاعت سے محروم رہا ہو۔ علی منظور صاحب قدیم وجدید رنگ شاعری کی معتدلانہ روش پر نہایت استقلال کے ساتھ چل رہے ہیں اور آپ اس رنگ میں جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ صوفیانہ جذبات کی سادگی اور مشق سخن کی پختگی آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو کا یہ عمدہ تحفہ دنیائے ادب میں مقبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔ **سہیل** گیا۔ جنوری ۱۹۴۱ء

مقام مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو نے جناب سید علی منظور صاحب کے کلام کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ سید صاحب جدید طرز کے شعرا میں بہت بلند پایہ ہیں ان کا کلام ہمایوں میں چھپتا رہتا ہے۔ **ہمایوں** مارچ ۱۹۴۱ء

لفافے بدلنا (ایک تنقیدی نظر)

جناب احمد علی خاں صاحب مجاہد نے سب رس بابت ماہ مارچ ۱۹۶۱ء میں ایک مضمون "لفافے بدلنا" تحریر فرمایا ہے، اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرات کر رہا ہوں۔ اس کی وضاحت بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ نہ مجھے جناب مجاہد سے کوئی پرخاش ہے اور نہ حضرت جگر کے کلام کا ضرورت سے زیادہ معتقد ہوں۔

اگر کسی قوم یا کسی جماعت کے افعال پر انگشت نمائی کی جاتی ہے تو اس کے کسی ایک ہی فرد کو "اپنے دعوے کی دلیل میں" نہیں پیش کیا جاتا۔ خواہ اسی ایک فرد میں وہ تمام برائیاں کیوں نہ یکجا ہوں جو تمام قوم میں ہیں۔ لیکن اگر اس جماعت کی مجموعی مثال نہیں پیش کی جاسکتی تو اس جماعت کے متعدد افراد پر نکتہ چینی کر کے تمام جماعت کے متعلق نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اپنے تمام مضمون میں محترم نقاد نے ایک عام کمزوری کے متعلق خاص طور پر حضرت جگر کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ اور محض ان کی غزل گوئی میں نکتہ چینی پر ہی بس نہیں کیا بلکہ جگر جیسے بڑے اور اریجنل شاعر کو

"جہاں متقدمین کا کوئی اچھا شعر نظر آئے
بس رال ٹپکنے لگی، فوراً چوری کے مال کو گلا دیا
الفاظ بدل دیئے بحر و ردیف تبدیل کردی
تخلص ٹھونس دیا"

جیسے سبک الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اگر کسی جماعت میں انفرادی برائیاں نکالنا جائز قرار دیا جائے تب بھی ادب واحترام اور طریقۂ تنقید کو بالائے طاق رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قابل نقاد کا مقصد ایک عام کمزوری کو ظاہر کرنا تھا تو تمام محلہ میں صرف ایک مکان کو نشانہ بنانا کہاں کا طریقہ ہے؟

اب رہا فی نفسہ "لفافے بدلنے" کا سوال تو ظاہر ہے کہ دوسرے سے سیکھ کر ہی کچھ آسکتا ہے۔ ایک طرف اگر انسان کی فطرت میں جدت طرازی ہے تو دوسری طرف اپنے سے بہتر چیز کی نقل کرنا یا دوسرے کی اچھی چیز کی برائیوں کو اپنی اس سے کم اچھی چیز کی اچھائیوں سے چھپا لینا بھی اس کی فطری عادت ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک پھل کا زیادہ تر حصہ اچھا اور کم تر حصہ سڑا ہوا ہے تو بجائے تمام پھل کو پھینک کر دوسرے کو تلاش کرنے کے اسی پھل کے سڑے ہوئے حصے کو نکال کر پھینک دیتا ہے اور اچھے حصے کو کھا لیتا ہے۔ اسی طرح وہ شاعر اصلی معنیٰ میں شاعر نہیں کہا جاسکتا جو دوسروں کے اشعار کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال کر پیش نہ کرے۔

بہر حال قابل مضمون نگار کا یہ نظریہ کہ شاعری میں جدت اور اریجنالٹی ہونی چاہیے بڑی حد تک درست ہے اور بہترین شاعر وہی ہے جو اپنی شاعری میں ایک انوکھا پن پیدا کر دیتا ہے

مصطفیٰ کمال خاں شروانی

ادارہ کی خبریں

اُردو امتحانات

اس سال اِدارہ کے اُردو امتحانات (اُردو دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل خوش نویسی اور خطاطی و کتابت) ۲۱، ۲۲، ۲۳؍ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷؍ مہر ۱۳۵۰ف کو لئے جائیں گے۔ اور درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ یکم ... مقرر کی گئی ہے۔ اب تک متعدد مقامات سے شریک ہونے والے امیدواروں کی درخواستیں وصول ہو چکی ہیں۔ جو اصحاب ان امتحانوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ دفتر ادارہ سے مطبوعہ فارم (ایک آنے کا اسٹامپ روانہ کرکے) منگوالیں۔ اور خانہ پُری کرنے کے بعد فیس کے ساتھ جلد دفتر میں داخل کر دیں۔

جملہ بہی خواہان اُردو سے توقع ہے کہ اپنی خواتین کو ان امتحانات کی تیاری میں مدد دیں گے۔ اور اپنے جملہ ملازمین کو خواندہ بنا کر کم از کم اُردو دانی کے امتحان میں ضرور شریک کرائیں گے تاکہ ملک میں اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اور اہلِ ملک کا معیارِ شائستگی و خواندگی بڑھے۔

تعلیم کا انتظام اور تقریریں

ادارہ کے اُردو امتحانات کی تعلیم شہر حیدرآباد کی مختلف درسگاہوں (مثلاً درسگاہ ادبیہ بیگم بازار، درسگاہ لمعات شرقیہ بیرون یاقوت پورہ، مرکز ادبیہ سلطان پورہ وغیرہ) کے علاوہ اضلاع میں بھی پربھنی، کیپل، گلبرگہ، کنگلی، کلیانی، ورنگل، خانہ پور، عثمان آباد وغیرہ میں دی جارہی ہے۔ دیگر مقامات میں بھی جو اصحاب اس قسم کا قومی کام کرنا چاہتے ہوں وہ اِدارہ سے مراسلت کریں تاکہ ان کو مفید مشورہ دیا جاسکے۔

ان تعلیمی انتظامات کے علاوہ گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی حیدرآباد میں ایسی مفید تقریروں کا انتظام کیا گیا ہے جو ادارہ کے امتحانوں کی نصابی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر مختلف ماہرین فن اصحاب سے دلوائی جارہی ہیں۔ ان تقریروں کا تفصیلی نظام نامہ اسی ہفتہ مقامی اخباروں میں چھپ چکا ہے اور سب رس کے اس شمارے میں صفحہ ۶۲ پر درج ہے۔

اِدارے کے شعبے

اس دوران میں ادارہ کے کئی شعبوں کے جلسے ہوئے جن میں سے چند کا تذکرہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

شعبۂ زبان

اس شعبے کا جلسہ ۲؍ فروری ۱۹۴۱ء مطابق ۱۹؍ فروردی ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مولوی سید محمد صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
مولوی ضیاء الدین احمد صاحب انصاری، مولوی نور الحسن صاحب
پنڈت دلنشی دھر صاحب، نواب سیف علی خاں صاحب
مولوی عبدالقادر صاحب سروری، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب

ف ۱ سابقہ جلسے کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

ف ۲ مندرجہ ذیل امور بغرض تصفیہ پیش ہوئے:۔

(۱) حسب تحریک مولوی سید محمد صاحب بالاتفاق طے پایا کہ مردم شماری اور اُردو زبان کے متعلق موجودہ حالت کے پیش نظر حسب ذیل قرار داد منجانب ادارہ مقامی اخباروں میں شایع کرائی جائے:۔

”ادارۂ ادبیات اُردو مردم شماری کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اہل ملک کو خاص طور پر یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہے کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تمام لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے عام اس سے کہ وہ کسی فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھیں کہ

مردم شماری کی خانہ پری میں مادری زبان صحیح طور پر لکھوائی جائے اِس لئے کہ اردو زبان کی ترقی کا بہت کچھ انحصار آئندہ مردم شماری کے اعداد پر ہونے والا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کی مادری زبان اُردو نہیں لیکن جو اُردو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی اس کا اندراج صحیح طور پر کرائیں اور احتیاط کے ساتھ دیکھ لیں کہ ان کے منشاء کے مطابق اندراج ہوا ہے یا نہیں"۔

(۲) صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے اردو ترجموں کے متعلق بالاتفاق طے پایا کہ اس سلسلے میں ذیلی مجلس کے اجلاس ہر فصلی ماہ کے پہلے پنجشنبہ کو دفتر پیام میں شام کے ۵½ بجے منعقد ہوا کریں۔ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب آئندہ سے اس مجلس کے داعی ہوں گے۔ نیز طے پایا کہ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کو بھی اس جلسے میں مدعو کیا جائے۔

(۳) اراکین مجلس نے سرکاری اداروں وغیرہ کے مزید چند ایسے نام پیش کئے جو مدرسہ "کور وکرو کنگ" کی طرح ثقیل اور غیر مانوس ہیں مثلاً قانون انسداد بیرحمی بر جانوراں و دواخانہ امراض مرغی وغیرہ۔ بالاتفاق طے پایا کہ ایسے ناموں کی ایک فہرست تیار کی جائے تاکہ حکومت سرکار عالی اور متعلقہ محکموں سے ایسے ناموں میں مناسب اصلاح ترمیم یا تبدیلی کی استدعا کی جاسکے۔

(۴) دکنی محاوروں وغیرہ کے سلسلے میں بالاتفاق طے پایا کہ بغرض تشریح نواب سیف علی خاں صاحب کے پاس بھی فہرستیں روانہ کی جائیں تاکہ تشریح کا کام جلد ممکن ہوسکے۔

شعبۂ زبان کی ذیلی مجلس

پنجشنبہ ۶ مارچ کو ادارۂ ادبیات اُردو کی ضمنی کمیٹی اصطلاحات جدیدہ کا جو جلسہ قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام کے یہاں منعقد ہوا تھا اس میں قابل توجہ الفاظ کی دو فہرستیں پیش ہوئی تھیں۔ کمیٹی نے اِن فہرستوں کے بعض اجزاء پر غور کیا اور بعض ترجمے وضع بھی کئے گئے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ اِن تمام الفاظ کی پھر ایک فہرست مرتب کرکے تمام اراکین کمیٹی کی خدمت میں بھیج دی جائے تاکہ وہ کافی غور و فکر کے بعد آئندہ جلسے میں تشریف لائیں۔

اراکین سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس قسم کے اور بھی انگریزی الفاظ جمع کرتے رہیں گے جن کا ترجمہ ہونا چاہیے کام کو جلد ختم کرنے کے خیال سے شعبہ زبان کی اِس کمیٹی کا آئندہ جلسہ ۱۶ ار اردی بہشت یوم پنجشنبہ کو بوقت (۵) بجے شام دفتر "پیام" میں منعقد ہوگا۔

شعبۂ امتحانات

مجلس امتحانات کا جلسہ ۱۷ فروری ۱۹۴۱ء روز دوشنبہ (۹) بجے صبح محکمہ نظامت تعلیمات میں مولوی سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

صدر اور معتمد کے علاوہ مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی غلام ربانی صاحب، مس جیسی سندی صاحبہ، نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ، پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی اور پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے نے شرکت فرمائی۔

حسب ذیل امور طے پائے:-

(۱) آئندہ امتحانات کیلئے ۲۱/۲۲/۲۳ راگست ۱۹۴۱ء مطابق ۱۵/۱۶/۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کی تاریخیں مقرر کی گئیں۔

(۲) امتحان خوش نویسی کے نصاب میں حسب ذیل کتابیں منظور ہوئیں۔

(۱) رسم خط آموز از مولوی اظہر الدین صاحب

(۲) اُردو رسم خط از مولوی سجاد مرزا صاحب (سرسری مطالعہ کیلئے)

(۳) ممتحنین کے متعلق طے پایا کہ حسب سال گذشتہ برقرار رکھے جائیں

(۴) اردو عالم میں خواتین کے نصاب امور خانہ داری کے لئے "علم خانہ داری" مرتبہ محترمہ محمودہ صدیقی (مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو) منظور کی گئی۔

(۵) خطاطی کے نصاب میں (۱) "کتابت وطباعت" مرتبہ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب (۲) "اردو رسم خط" مرتبہ مولوی سجاد مرزا صاحب کی منظوری دی گئی۔

(۶) تمام امتحانوں کے نصاب پر نظر ثانی کرنے کا کام سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا اور مولوی سید محمد صاحب کا سب کمیٹی میں اضافہ کیا گیا۔

(۷) اُردو عالم کے پرچوں کا وقت گھٹا کر (۳) کی جگہ ۲½ گھنٹے مقرر کرنے کی تحریک پیش ہوئی' لیکن اس کو بھی سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔

شعبۂ انسائیکلوپیڈیا

۵ رمارچ ۱۹۴۱ء کو شام کے پانچ بجے ادارہ کے دفتر میں شعبہ انسائیکلوپیڈیا کا چوتھا جلسہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے صدارت کی اور معتمدین کے علاوہ عبدالمجید صاحب صدیقی' عبدالقادر صاحب صدیقی' سید محمد صاحب' ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب اور عبدالقادر صاحب سروری نے شرکت کی۔

انسائیکلوپیڈیا کے کام کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ کرتے ہوئے کمیٹی نے بہ اتفاق آرا طے کیا کہ فیض محمد صاحب کے علاوہ سید بادشاہ حسین صاحب کو بھی معتمد مقرر کیا جائے۔

چونکہ عوام کو اس کام کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور خود لکھنے والوں کے پیش نظر کوئی نمونہ نہیں ہے اس لئے کمیٹی نے سفارش کی کہ سولہ یا چوبیس صفحات حسب ضرورت بطور نمونہ شایع کئے جائیں۔ اس نمونے میں مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین سے لکھوائے جائیں اور متعدد صاحبان ذوق ونظر کے پاس بغرض نقد ونظر بھیج کر اُن کی آراء حاصل کی جائیں۔

کمیٹی نے اِس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ مختلف علوم وفنون کے الفاظ ماہرین علم وفن سے ہی لکھوائے جائیں تاکہ معلومات کی صحت کی ضمانت ہو سکے۔

سارے اراکین نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ایشیا اور خصوصاً ہندستان سے متعلق الفاظ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا جائے اور دوسرے ممالک کے الفاظ پر کم توجہ کی جائے کیونکہ ہر وہ ملک جو اس قسم کی حوالہ جاتی کتاب شایع کرتا ہے اپنے ملک کے الفاظ کو تفصیل کے ساتھ لکھتا اور دوسروں کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے الفاظ پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ ہماری زبان میں حوالہ جاتی کتابوں کے فقدان نے اُردو دانوں کی معلومات کو محدود کر رکھا ہے۔

اُردو انسائیکلوپیڈیا میں کام کرنے والے ماہرین علوم و فنون کی ایک مبسوط فہرست از بس ضروری ہے اور اس کے لئے کمیٹی نے سفارش کی کہ معتمدین کے علاوہ عبدالمجید صاحب صدیقی تاریخ کے جملہ شعبہ جات کی' ڈاکٹر راحت اللہ خاں عربی علوم کی عبدالقادر صاحب صدیقی اسلامی علوم کی اور سید محمد صاحب فارسی زبان وادب کی الگ الگ فہرستیں مرتب فرمائیں۔

شعبۂ تالیف وترجمہ

اس شعبے کا ایک جلسہ ۱۴ رمارچ ۱۹۴۱ء کو منعقد ہوا جس میں پروفیسر فضل حق صاحب' ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور' عبدالقیوم خاں صاحب باقی' سید محمد صاحب' میر حسن صاحب' سید بادشاہ حسین صاحب' سید ابو الفضل صاحب اور ظہیر الدین احمد صاحب (معتمد شعبہ انے

شرکت کی حسب ذیل امور طے پائے :۔

مولوی سید محمد صاحب اور مولوی سید بادشاہ حسین صاحب کو اس شعبہ میں شریک کرنے کی توثیق کی گئی۔ حسب ذیل مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ پیش ہوا اور ان کے متعلق حسب ضرورت مناسب تصفیے کئے گئے۔

بیرون ریاست کے مصنفین :۔ (۱) مجنوں گورکھپوری مختلف کتب

(۲) غلام جیلانی برق کیمبل پور دو کتابیں

(۳) عبدالوسیع عصری بنگلور ڈرامے

(۴) محمد ابراہیم زبیری برار اشتراکیت

(۵) مخمور عثمانی دہلی زندہ لاش

(۶) عزت رامپوری افسانے

(۷) الطاف مشہدی لاہور پریت کے گیت

(۸) زخ ش مرحومہ کلام

اضلاع کے مصنفین :۔ (۱) عطا کلیانوی رباعیات

(۲) مراد علی طالع بھکنڈہ درس عبرت

(۳) سید عبدالقادر جیتور بالغوں کی پہلی کتاب

(۴) انور شاہ آبادی نغمۂ معصوم

(۵) حمید اللہ خاں شید اپربھنی۔ سوانح حیات بہادر جنگ

(۶) علی بن عبدالحبیب الحضری سچ کا جادو

(۷) صادق نواب عماد الملک کی تعلیمی سرگرمیاں

بلدہ کے مصنفین :۔ (۱) مرزا عصمت اللہ بیگ فن کتابت و طباعت

(۲) ابوالقاسم سرور مجموعۂ مضامین

(۳) ناصر علی ایم اے معاشیات

(۴) اعجاز الحق قدوسی بنات رسول

(۵) میر حسن ایم اے تہذیب و تمدن کے اجزائے لطیف

(۶) شجاع احمد قائد کشمکش نانی

(۷) شجاع احمد قائد بات چیت

(۸) عزیزہ رضوانی سراب

(۹) غلام جیلانی گاندھی جی

(۱۰) علی شاکر مضامین اور افسانے

(۱۱) جلال الدین اشک از بسمت تا برلن

ان کے علاوہ حسب ذیل تجویزوں پر غور اور تصفیہ کیا گیا:۔

(۱) بدر شکیب صاحب ترجمہ اے شارٹ ہسٹری آف سائنس

(۲) عزیز الحق صاحب بہترین مضمونوں اور نظموں کا انتخاب اور ترتیب

باقی صاحب نے اطلاع دی کہ کتاب اے مینگ اف لائف کا نصف سے زیادہ ترجمہ کر چکے ہیں لیکن اب وہ اس کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے اس لئے وہ ایک دوسری کتاب ابی کا مبی کی ایڈیا آف گریٹ پوئٹری کا ترجمہ کرکے ادارہ کو بغرض اشاعت دیں گے۔ پروفیسر فضل حق صاحب نے میاتھیو آرنلڈ کے مضمون آن پوئٹری کا جو ترجمہ کیا ہے اس کے متعلق طے پایا کہ رسالہ سب رس میں بالاقساط شایع کیا جائے۔

مسز نائیڈو کے حالات زندگی ترتیب دینے کی سفارش کی گئی۔

شاخیں

ادارے کے شاخیں برابر سرگرم عمل ہیں۔ پربھنی کی شاخ کی طرف سے طلبہ اُردو دانی، اُردو عالم، اُردو فاضل کے درس کا انتظام کردیا گیا ہے اور پابندی سے اساتذہ اور طلبہ مصروف عمل ہیں۔ زنانہ مرکز بھی قایم کردیا گیا ہے۔ محترمہ رحیم النسا بیگم صاحبہ صدر معلمہ نسوان اُردو پربھنی کی جدوجہد لایق صد آفریں ہے کہ موصوفہ نے باوجود اپنی شدید مصروفیات کے زنانہ مرکز قائم کرنے میں بڑی مدد کی اور اُردو دانی اور اُردو عالم کی طالبات کو تعلیم دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور موصوفہ کی کوششوں سے اُردو عالم میں چار اور اُردو دانی میں دس طالبات نے شرکت کی ہے امید ہے کہ زنانہ مرکز قایم ہوجانے سے اور بہت ساری طالبات شریک ہوں گی، دوسرا امر مقل تعلیم بالغان کا انتظام تھا اور

جس کی شدید ضرورت تھی خدا کا شکر ہے کہ اس کی تعلیم اور طلبہ کی فراہمی کا بھی انتظام ہو گیا جس کے لئے مولانا سید محمد صاحب ذکیؔ فاضل دیوبند صدر امام مسجد مہتاب علی شاہ پربھنی لائق تشکر ہیں کہ مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے طلبہ کی فراہمی اور ان کی تعلیم میں خاص طور پر حصہ لینے کا وعدہ فرمایا ہے اور درس کا آغاز ہو چکا ہے اب تک (۱۷) طلبہ شریک درس ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے دارالمطالعہ کے لئے مولوی محمد عبدالجلیل صاحب بی ایس سی، اے، جی مددگار کاٹن ریسرچ ہاٹنسٹ محبوب باغ پربھنی نے اپنے عزیز مولوی سید مرتضیٰ صاحب مرحوم گرداوری تقریباً (۵۰) عدد کتابیں عوام کے افادہ کے لئے مرحمت فرمائیں۔ جس کے لئے ہم موصوف کے مشکور ہیں۔

مولوی عبدالعلام صاحب اہلکار دفتر ماہر پیشہ صدر مزرعۂ زراعت پربھنی نے دو عدد مڈل عطا کرنے کا اعلان فرمایا ہے یہ مڈل ان طالبات کو دیئے جائیں گے جو زنانہ مرکز شاخ پربھنی سے اردو دانی اور اردو عالم میں بدرجۂ اول کامیاب ہوں گے جس کے لئے ہم موصوف کے مشکور ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۴۱ء کی شب میں مارکٹ پولیس ہال میں شاخ پربھنی کی طرف سے ایک نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا جس کے لئے حسب ذیل مصرع طرح دیا گیا تھا۔

آباد محبت کا ویرانہ ہوا آخر

مختلف شعراء مثلاً مسرتؔ، شبابؔ، بیکرؔ، ماجدؔ، معزؔ، خیالؔ اور سحرؔ نے اچھی غزلیں سنائیں (مرسلہ حمید اللہ خاں شہید معتمد)

کتب خانہ اس اثناء میں ادارہ کے کتب خانہ کو مولوی خواجہ اسد اللہ خاں صاحب کی طرف سے مہاراجہ بہادر کی تصنیف بزم خیال کی تینوں جلدیں اور مولوی ابو سعد سید اسمٰعیل صاحب فنا شور اپوری کے توسط سے مولوی عبدالحق صاحب محتسب بنولہ کی معطیہ پانچ قلمی کتب (۱) نکات مرزا بیدل (۲) رسالہ اصلاح مسلمانان (۳) رسالہ شرک بدعت (۴) دیوان بیدل (۵) رسالہ ظہوری اور تین مطبوعہ رسائل زیارت قانع۔ (۲) ام العرفان اور (۳) عیسیٰ مرے اور چند مختلف کاغذات بطور عطیہ وصول ہوئے جس کے لئے ان سب اصحاب کا نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ادارتِ سب رس

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے پرانے رفیق صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکشؔ گذشتہ ماہ سے مجلس ادارت میں شریک نہیں ہیں۔ یہ ماہ نامہ دراصل انہی کی خواہش، جذبۂ عمل اور ابتدائی اخراجات سے جاری ہوا تھا لیکن چند ماہ بعد جب ان کا سرمایہ ختم ہو گیا اور انھوں نے خواہش کی کہ اس کو بالکلیہ ادارے کی ملک قرار دے دیا جائے تو ادارے نے از سر نو اس کی بقا کا انتظام کیا۔ بعد کو جب میکشؔ صاحب سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے تو یہ کام ایک مجلس ادارت کے تفویض کیا گیا جو اب تک یہ کام انجام دے رہی ہے۔ اس اثناء میں میکشؔ صاحب نے مصروفیتوں کی بنا پر بارہا خواہش ظاہر کی کہ ان کا نام مجلس ادارت سے خارج کر دیا جائے اس لئے بادل ناخواستہ گذشتہ مہینے کے پرچے سے اُن کا نام شریک رسالہ نہیں کیا جا رہا ہے آئندہ سے سب رس کے بارے میں جملہ مراسلت مہتمم مدیر سب رس رفعت منزل خیریت آباد کے پتے سے کی جائے۔

اردو امتحانات کی تقریریں

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو عالم و اردو فاضل وغیرہ جو ۱۵، ۱۶، اور ۱۷، مہر ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوں گے اُن کے سلسلے میں ادارے سے حسب ذیل تقریروں کا انتظام

کیا گیا ہے جن میں امیدواروں کے علاوہ دوسرے اہل ذوق بھی شریک ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ان سے نصاب کے علاوہ علم و ادب سے متعلق عام دلچسپ معلومات کی اشاعت بھی مقصود ہے۔

	عنوانات	مقررین	تاریخ
۱۔	اُردو ادب کا قدیم دور	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۴ اپریل
۲۔	اردو ادب کا درمیانی دور	مولوی سید محمد صاحب	۶ ر ر
۳۔	جدید اُردو ادب	مولوی عبدالقادر سروری صاحب	۱۱ ر ر
۴۔	اُردو کے ڈرامے	مولوی سید بادشاہ حسین صاحب	۱۸ ر ر
۵۔	اجتماعی زندگی	مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب	۲۲ ر ر
۶۔	اُردو کے ناول اور افسانے	مولوی عبدالقادر سروری صاحب	۲۵ اپریل
۷۔	معاشیات کے ابتدائی مسائل	مولوی میر ناصر علی صاحب	۲ مئی
۸۔	روزمرہ کی سائنس	مولوی فیض محمد صدیقی صاحب	۹ ر ر
۹۔	جذبات اور احساسات	مولوی صلاح الدین صاحب	۱۶ ر ر
۱۰۔	ادبی تنقید	مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی	۲۴ ر ر
۱۱۔	اردو کے عناصر اربعہ	مولوی سید محمد صاحب	۳۰ ر ر
۱۲۔	فن شعر	مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب	۶ جون
۱۳	ر	ر ر ر	۱۳ ر ر
۱۴	ر	ر ر	۲۰ ر ر
۱۵۔	آج کل کے ادبی رجحانات	مولوی میر حسن صاحب یا مولوی مخدوم محی الدین صاحب	۲۷ ر ر

ادارہ کی سرگذشت

ادارۂ ادبیات اردو کی دس سالہ سرگذشت (از خواجہ حمید الدین شاہد) کے اب چند ہی نسخے دفتر میں رہ گئے ہیں۔ اس کتاب نے اُردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کی اور ادارہ کی خاموش مصروفیتوں سے متعلق واقفیت پیدا کرنے کے علاوہ اُردو زبان اور ادب کی ٹھوس خدمت کرنے کے طریقوں سے بھی اہل اُردو کو واقف کیا جن اصحاب کو اردو کی تاریخ سے دلچسپی ہے وہ یہ کتاب ضرور مطالعہ کریں۔ اسی لئے تین سو سے زیادہ صفحات کی کتاب کی قیمت صرف ۱۲ ار رکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے متعلق اور ادارہ کی مصروفیتوں کے نسبت ہمارے معاصرین نے جو رائیں ظاہر کیں ان کے چند اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

"حیدرآباد میں ادبیات اردو کے نام سے ایک مجلس چند سالوں سے قایم ہے جس نے نہایت قلیل عرصے میں عظیم الشان کام کیا ہے اس مجلس کی زیر نگرانی ادبی ماہ نامہ "سب رس" بھی جاری ہے متعدد کتابیں انجمن شایع کرچکی ہے۔ اور یہ سرگذشت درحقیقت اس ادارے کے کارناموں کی تفصیل ہے۔ ہندستان بھر میں جہاں کہیں بھی چھوٹی بڑی علمی انجمنیں قایم ہوں یا جو لوگ اس سلسلے میں کام کرنا چاہیں انھیں یہ کتاب منگوا کر ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ان میں بھی کام کرنے کا جوش اور ہمت پیدا ہو۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پنجاب میں اِس قسم کی ایک بھی انجمن قایم نہیں۔ اس سے قبل میاں بشیر الدین احمد بی اے (آکسن) مدیر "ہمایون" نے انجمن ترقی اُردو کی شاخ لاہور میں قایم کی تھی تو خیال تھا کہ اس سلسلے میں کچھ عملی کام بھی ہوگا۔ لیکن اب تک کوئی قابل ذکر نتیجہ نہیں نکلا اور انجمن ترقی اردو پنجاب ایک قرار دادیں منظور کرنے والی انجمن ہو کر رہ گئی ہے جس کا سال بھر میں ایک آدھ پرائیویٹ جلسہ ہو جائے یا سال بھر میں ایک دو آرٹیکل محترم میاں صاحب تحریر فرما دیا کریں۔ ضرورت ہے کہ انجمن ترقی اُردو سرگذشت ادارۂ ادبیات اردو کا مطالعہ کرکے اس سے بھی بڑے پیمانے پر کام کی ابتدا کرے۔"

نیرنگ خیال لاہور۔ مارچ ۱۹۴۱ء

"ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۳۱ء میں اردو زبان اور ادب کی توسیع وحفاظت کے پیش نظر قایم کیا گیا تھا۔ اور اس دس سال کے عرصے میں ادارۂ مذکور نے نہایت ہی قابل رشک کام کیا ہے سرگذشت اس ادارہ کے گذشتہ دس سال کے کام کی تفصیل ہے۔

اس وقت اردو کی توسیع وحفاظت کے مرکز دو ہیں۔ پنجاب اور حیدرآباد دکن۔ ادارہ ادبیات اردو کی گذشتہ دس سالہ کاروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خاموشی اور استقلال سے کام کرنے والے ایسے ہی چند ادارے اور ہوں تو اُردو نہ صرف ہندستان کی قومی زبان بن سکتی ہے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شامل ہونے کا دعویٰ کرسکتی ہے۔ دس سال کی قلیل مدت میں ادارے نے مختلف موضوعوں پر (۶۹) کتابیں شایع کی ہیں۔ اور سرگذشت ادارہ سترویں کتاب ہے۔ ان اہم تر مطبوعات میں 'تاریخ'، 'تاریخ ادب'، 'تذکرہ'، 'تنقید'، 'نظم ونثر'، افسانے ناول اور ڈرامے غرض کہ ہر شعبۂ فن کی کتابیں شامل ہیں۔ اور اکثر کتابیں قابل قدر اور اُردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہیں۔

سرگذشت ادارۂ ادبیات اُردو اس لحاظ سے بے حد قابل قدر چیز ہے کہ اس میں ایک ایسے ادارے کی دس سالہ زندگی کی مکمل تفصیل موجود ہے جس نے قابل رشک کام کیا ہے جو لوگ اُردو زبان وادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب ایک رہنما کا کام دے گی۔ اور وہ ادارۂ ادبیات اُردو کی طرز پر زبان وادب کی خدمت خوش اسلوبی سے کرسکیں گے۔"

شیرازہ لاہور۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۱ء

"تقریباً نوسال تک خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے بعد اب ادارہ کی خدمات کا دلچسپ خاکہ ان اوراق میں پیش کیا گیا ہے حیدرآباد میں اردو زبان کی توسیع وترقی کے لئے ادارۂ ادبیات اردو جو کچھ کام کرتا رہا ہے اس سے اب ملک کوبی واقف ہو چکا ہے ادارہ کی یہ سوانح عمری جو سرگذشت کے نام سے شایع کی گئی ہے اس کی مصروفیات کے ہر شعبہ پر حادی ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ نوسال کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے ادارے نے اتنے شاندار نتائج حاصل کر لئے ہیں کہ اب حیدرآباد میں اس کی مرکزی حیثیت مسلمہ ہوگئی ہے۔ ان اوراق میں ادارے کے ہر شعبے کی خدمات کے نتائج کو پیش کیا گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک کے بہت سے "انجمن باز" ان اوراق کا مطالعہ کرکے اس ... حقیقت سے روشناس ہوسکتے ہیں کہ محض اخباری پروپگنڈے سے زیادہ موثر ادارات کا ٹھوس کام ہوتا ہے جو بجائے خود سب سے زیادہ موثر اور دور رس پروپگنڈا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے ملک میں جو حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اس کی بنیادیں اس لئے مضبوط ہیں کہ اس مرکز پر ٹھوس کام کیا جارہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ادارۂ ادبیات کو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زیادہ تائید حاصل ہے اور اس لئے اس کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ سرگذشت کے صفحات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادارے نے نہ صرف بہت سی اچھی کتابیں شایع کی ہیں بلکہ حیدرآبادی ارباب قلم کی برادری میں ادبی ذوق کو صحیح سمت میں بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ نوسال کی مختصر مدت میں تقریباً ۷۲ کتابوں کی اشاعت کے یہ معنی ہیں کہ ادارہ تقریباً ۸ کتابیں ہر سال شایع کرتا رہا ہے۔ تاریخی شعبہ میں ادارے نے ملک کو اس کی قدیم تاریخ سے روشناس کرنے کی بہت قابل تحسین کوشش کی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ اُردو زبان میں دکن کی تاریخ کا بہترین مواد جمع کردے گا'

ہم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور آپ کے مخلص

رفقاء کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس ادارے کو اردو زبان میں ادب کے احیاء کا ایک مضبوط مرکز بنا دیا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ ملک کی عام رائے ادارے کی جد وجہد میں اس کی زیادہ سے زیادہ تائید کرے گی۔

اردو کے امتحانات کا جو نیا سلسلہ ادارے نے شروع کیا ہے وہ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کو عام رائے سے اور بھی زیادہ قریب کر دے گا اور اس طرح اس کی تحریکات کو عوام تک پہنچانے کے نئے راستے پیدا ہو جائیں گے۔ **پیام** حیدر آباد۔ ۲ر فروردی ۱۳۵۰ف

"تین سو صفحات سے زاید کی یہ نفیس چھپی ہوئی مجلد و مصور کتاب ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں کا نہایت روشن مرقع ہے۔ اس کتاب میں ادارۂ ادبیات کے مختلف شعبوں اور مختلف کارکنوں کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں اس کے علاوہ اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانان دکن کا یہ ادارہ کتنا منظم اور بلند پایہ ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی سرگذشت پڑھنے کے قابل ہے اور حوصلہ افزائی اور تقلید کے بھی۔ اہل اردو کو ایسے ادارے کی دل کھول کر سرپرستی کرنی چاہیے **ہمایوں** لاہور۔ مارچ ۱۹۴۱ء

ادارہ کی مطبوعات

اس مہینے ادارے کی طرف سے دو کتابیں رسائل طیبہ اور انوار شایع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ایک عرصے سے زیر طبع تھیں۔ اور کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہو گئی کہ یہ اس سے قبل شایع نہ ہو سکیں۔

رسائل طیبہ

یہ کتاب (۳۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ اور محترمہ طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے مضمونوں، تقریروں اور خطوں کا مجموعہ ہے۔ مرحومہ طیبہ بیگم جس پایہ کی ادیب اور اہل ذوق تھیں اس کا اندازہ محض اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کا ایک ناول "حشمت النساء" علامہ عبد اللہ یوسف علی کے مقدمہ اور دوسرا ناول "انوری بیگم" مولوی ڈاکٹر عبد الحق معتمد انجمن ترقی اردو کے مقدمہ کے ساتھ شایع ہوا۔

مرحومہ نے حیدر آباد میں علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کی ترقی و اصلاح میں بڑے بڑے مفید کام کئے ہیں۔ ان کی زندگی کیسی سرگرمیوں اور خلق خدا کے فلاح و بہبود میں گزری اس کا اندازہ ان مفید اور اخلاقی و اصلاحی مضامین اور تحریروں کے مطالعہ سے ہو سکے گا جو اس مجموعہ "رسائل طیبہ" میں شامل ہیں۔ کتاب میں

....

....

ان کی تحریروں کے عکس بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ خواتین کی علمی، سماجی اور مذہبی اصلاح و بہبودی کا ضامن ہوگا۔

انوار

حضرت علی اختر ...... کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوشؔ کے کوئی شاعر اُن کی ٹکر کا نہیں۔

۱۶۸ صفحات قیمت ۱۲ر

اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

وقت کی دو اہم چیزیں

نازیت ۔ مصنفہ شاہد حسین رزاقی ۔ مصنف نے بتایا ہے کہ نازیت اور ہٹلر ہم معنی لفظ نہیں ہیں یہ سمجھنا کہ نازیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو نازیت خود بخود فنا ہو جائے گی بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔

مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نازیت کا موجودہ ارتقاء ایک بحرانی کیفیت میں ہوا ہے اس لئے ہٹلر کے وجود سے قطع نظر بھی اس کا دیرپا ہونا مشکل ہے قیمت (عہ)

اسلامی ممالک کی سیاست ۔ مصنفہ عشرت علی صدیقی ۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی او رتاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ٹرکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کی کیا حالت تھی جنگ عظیم کے اختتام پر ان کی سیاسی اہمیت کیا باقی رہ گئی۔

مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی سیاسی تحریکیں اٹھیں ان کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی پوزیشن کیا ہے۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ سیاست اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ایسے وقت میں جب کہ ہر شخص اسلامی ممالک کی موجودہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت عہر

قومیت اور بین الاقوامیت (زیر طبع) ۔ **بحرالکاہل کی سیاست** (زیر طبع)

صدر دفتر ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ نئی دہلی

شاخیں ۔ (۱) مکتبہ جامعہ جامع مسجد دہلی (۲) مکتبہ جامعہ امین آباد پارک لکھنو (۳) مکتبہ جامعہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور (۴) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبی ۳

ایجنسیاں

ا کتاب خانہ عابد شاپ حیدر آباد دکن ۔ ۲ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور

مقدمہ "زندگانی محمدؐ"

عہدِ حاضر کی ایک بے مثال کتاب

"زندگانی محمدؐ" علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے۔ اس کتاب کی قدر و عظمت کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہو گئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئیں۔ پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا۔ اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے مقدمہ زندگانی محمد کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہلِ مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دئیے گئے ہیں۔ اس کے متعلق مشاہیر و جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ زندگانی محمدؐ ایک قابل قدر تالیف ہے (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ زندگانی محمد کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے پُر ہے میں نے اِس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے، مصنف کی کوششیں مستحقِ اجر و قابل داد ہیں (مولٰنا عبدالماجد دریا بادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانی محمد) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے (طلوع اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہل مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں، ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے (حمایت اسلام)

۱۰۔ ہندستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے، جو اِس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے (پیام نسواں)

لکھائی چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات تیرہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ
دفتر امت مسلمہ امرتسر
(پنجاب)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۴ بابت مئی ۱۹۴۱ء شمارہ ۵

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات علیا حضرت مادر دکن نور اللہ مرقدہا

تو اے ذاتِ علیا کہ در تربتی
بہ عالم ہمان سایۂ رحمتی

کند عرض تاریخِ رحلت جلیل
دعا الحق الا او ادخلی جنتی

سنہ ۱۳۶۰ھ

(دیگر)

طالبِ مولا کہ بودہ بر درِ مولا رسید
طائرِ روحش بہ اوجِ عالمِ بالا رسید

رفت آن قدسی شمائل گفت تاریخش جلیل
مادر ظلِ خدا در سایۂ زہرا رسید

سنہ ۱۹۴۱ء

فصاحت جنگ جلیل

تعزیتی قرار دادیں

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبہ طلبہ کا ایک تعزیتی جلسہ بتاریخ ۱۶ خورداد سنہ ۱۳۵۰ف شام میں پانچ بجے ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ و صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اراکین شعبہ طلبہ اور کارکنانِ ادارہ نے بھی شرکت کی حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

"شعبہ طلبا ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی والدۂ ماجدہ حضرت بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کے انتقال پر ملال پر اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتا ہے۔ اور دست بدعا ہے کہ مرحومہ و مغفورہ کو خداوند تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور اعلیٰحضرت شاہ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا ہو۔" آمین

معین الدین احمد انصاری
(معتمد شعبہ)

ادارہ کے شعبۂ نسوان کا جلسہ جو ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء کو محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

" ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کی اراکین نسوانی دنیا کی ایک عظیم الشان اور بے نظیر ہستی یعنی حضرتہ بڑی بیگم صاحبہ قبلہ مرحومہ و مغفورہ کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہیں۔ اور دست بدعا ہیں کہ خدا مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں مقام ارفع اور شاہ ذیجاہ کو صبر جمیل اور ہم سب کو ان کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے۔" آمین

سکینہ بیگم
معتمد شعبہ

سانحۂ عظیم

یہ نظم بتاریخ ۲۴ اپریل ۱۹۴۱ء انجمن خواتین اسلام کے جلسۂ تعزیت کے موقع پر سنائی گئی تھی۔

(سکینہ بیگم)

ملکِ دکن پہ چھائیں گھٹا ٹوپ بدلیاں — رنج و الم اُداس فضاؤں سے ہے عیاں

چہرے اُداس، خاک بسر اور چشم تر — اہلِ دکن ملول و پریشاں ہیں سر بہ سر

دفتر، دکانیں، مدرسے، بازار بند ہیں — مندا ہے کاروبار، سبھی فکرمند ہیں

اس سرزمیں پہ صبح سے جھاڑو نہیں ہوئی — کنگھی کو فکرِ زینتِ گیسو نہیں ہوئی

ماتم کدہ پرانی حویلی ہے رات سے

محشر بپا ہے "امِ دکن" کی وفات سے

بے چین و بے قرار و پریشان ہیں حضور! — فرطِ الم سے جسم معلّٰی ہے چُور چُور

دل ہِل گئے، پرانی حویلی کا در کھُلا — وابستگانِ ملک کا سیلاب امنڈ پڑا

کہرام مچ گیا کہ چلیں مادرِ دکن! — چلنے نصیب قبر کے، سوتی ہے انجمن

ہمراہئ جلوس ہیں گو فاصلہ ہے دُور — اللہ رے احترام! کہ پیدل چلے حضور

ہر سمت تذکرے تھے یہی خاص و عام میں — کتنا وقار "ماں" کا ہے قلبِ نظام میں

منظر وہ ہائے "مسجدِ جودی" کے سامنے — سرکار آگے آئے سواری کو تھامنے

مقبول بارگاہ میں ماں کی دعا ہوئی!

فرزند ہی سے آخری خدمت ادا ہوئی!

اس دور میں کہ حفظِ مراتب کا کال ہے — ماں باپ کے حقوق کا کس کو خیال ہے

لیکن حضورِ والا نے جو حق ادا کیا
دنیا کو درسِ خدمتِ مادر سکھا دیا

فرزند! اور وہ بھی ریاست کے حکمراں
قلب و دماغ امورِ سیاست سے سرگراں

پھر بھی یہ ذوق و شوقِ اطاعت کا حال تھا
بیمار ماں کا ہر گھڑی، ہر دم خیال تھا

جس وقت سے کہ ماں کی طبیعت خراب تھی
کیا بے قرار، ذاتِ جلالت مآب تھی

آرام تھا نہ نیند۔ نہ کچھ بھوک پیاس تھی
رہتے اُداس اُداس، پہ صحت کی آس تھی

تبدیلیٔ مزاج پہ ہر لحظہ تھی نظر
تیمار داریوں میں رہے رات رات بھر

موجود جاں نثار اگرچہ ہزار تھے
لیکن دوا پلاتے تھے خود اپنے ہاتھ سے

رحمت خدا کی اُس شہِ عالی مقام پر!
ماں نے دعائیں جس کے لئے کی ہوں عمر بھر!

اے خوش نصیب مادرِ شہ، مادرِ دکن!
کس کو نصیب ہے ترے مرنے کا بانکپن؟

اے مہرباں ماں! تری شفقت کی یاد ہے
غمگین اور اُداس عروس البلاد ہے

چاروں طرف سے تعزیتی تار آئے ہیں
دلداریٔ حضور کا پیغام لائے ہیں

ماتم کی مجلسیں ہیں کہیں بزمِ تعزیت
سلطاں کے ساتھ سوگ میں ہے ساری سلطنت

یہ موت وہ ہے جس پہ کہ ہے زندگی نثار
ہے کارنامہ تیرا سیاست کا شاہکار

دَم سے ترے وقارِ دکن کو ثبات ہے
بیٹے کے کارناموں میں "ماں" کی حیات ہے،

دنیا کبھی نہ بھولے گی اُس نیک نام کو
ترکے میں جس نے چھوڑا ہے سابع نظام کو

بشیر النساء بیگم بشیر

مہاراجہ بہادر اور سر محمد اقبال کے غیر مطبوعہ خط

وارڈن ویسفلڈ روڈ بمبی۔

مئی ڈیر اقبال! شاد باش و شاد زی از فضلِ رب۔

اے وقت توخوش کہ وقت ما خوش کردی۔ اس یاد فرمائی کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھ جیسے ناچیز فقیر کو جس طرح آپ دل سے چاہتے ہیں، خدا کی مہربانی بھی آپ پر دونی رہے۔ بمبئی اقبال۔ سچے دوست کی یہی تعریف ہے کہ ایک ناچیز اور ہیچ میرز دوست کے ساتھ دوستی نباہ دے۔ مجھے اب تک اس کا عقدہ نہ کھلا کہ آپ سے مجھے کیوں دلی خلوص ہے بجز اس کے کہ آپ ہی کا خلوص اس کا باعث یا عقدہ سمجھوں۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے ایسے دوست کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ نہ اس قابل ہوں۔ اس سفر میں زیر باری بہت ہوئی امید ایک حبہ کی نہیں۔ زر می طلبی سخن درین است۔ نہ اجمیر کے دربار میں حاضر ہو سکا نہ لاہور، نہ امرتسر میں اپنے احباب سے ملا، نہ ہردوار کے منظر کے درشن ہوئے۔ ہائے۔ اس قید بے زنجیر کا ستیاناس ہو انسان دنیوی اغراض کے لئے کس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور آزاد ہو کر غلامی قبول کرتا ہے۔ یا اللہ جس قدر عمر باقی ہے اس کو تو ہی آزادی میں بسر کرا دے۔ اب میں باز آیا۔ ایسی امارت سے توبہ توبہ۔ بجز اس کے کہ دولہ کی دلالی میں رو سیاہی کی ہی توقع ہر طرح ہو سکتی ہے۔ سرخروئی محال ہے۔ الامن یشاء شاد میں اگر جاذبہ کی قوت ہوتی تو پھر کیا پوچھتے۔ مگر شاد تو ہر طرح ناکارہ ہے۔ کوئی بات بھی حاصل نہ کی۔ صرف فضل کا امیدوار ہے۔ اگر خلوص ہے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ اقبال سے حیدرآباد کا اقبال چمک جائے گا۔ ہوائی جہاز کا منظر بے شک اچھا ہوا ہو گا۔ مگر یہ تو کہئے کہ سب کے حواس قایم تھے یا ہوائیوں کے ساتھ ہوا ہو گئے۔ بہرحال آپ ہر طرح کے تماشے دیکھیے اور ہمیں ترسائیے۔ ایک غزل تازہ مرسل خدمت ہے۔ مالکِ یوم الدین کہاں ہیں ان کی خدمت میں کہہ دیجئے ایاکَ نعبدُ و ایاکَ نستعین۔

بڑے ہوشیار (نعبد) کے مطلب کو تو قبول کر لیتے ہیں مگر نستعین پر انجان ہوتے ہیں۔ اللہ ان کو شاد و بامراد رکھے۔

۸ر مارچ کو انشاء اللہ تعالیٰ بندہ یہاں سے راہی حیدرآباد ہوگا۔ مہربان آپ کے بچوں کی تصویریں اور اپنی ایک تصویر ضرور بھیجئے۔ یوں تو میرے دل میں آپ کی تصویر ہے مگر اپنے احباب کو اگر دکھانا منظور ہو تو کس طرح دکھاؤں کہ یہ اقبالِ شاد نواز ہے۔ خدا حافظ

جوابِ علامہ سر اقبال

(لاہور، مارچ ۱۹۱۷ء)

سرکار والاتبار تسلیم مع التعظیم!

والانامہ پرسوں مل گیا تھا جس میں سرکار دولت مدار کے حیدر آباد واپس جانے کی خبر تھی لہذا یہ عریضہ حیدر آباد ہی کے پتہ پر لکھتا ہوں کہ سرکار کل بمبئی سے رخصت ہو جائیں گے۔

فارسی غزلوں کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کا والانامہ بار دوم میں ملا تھا۔ یہاں کے وکالت پیشہ احباب میں بعض ذوقِ سخن رکھتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کے دلوں پر آپ کا نقش تو پہلے سے ہے۔ فارسی غزل "کیستم من" جب پڑھی گئی تو اربابِ ذوق سرمست ہو گئے۔ واقعی لاجواب غزل ہے۔ انہیں باتوں سے اقبال آپ کا گرویدہ ہے۔ امارت، عزت و آبروٗ جاہ و حشم عام ہے مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں نہیں ہوتا۔ کیا خوب ہو اگر سرکار عالی کا فارسی دیوان مرتب ہو کر دیدہ افروز اہلِ بصیرت ہو۔

مجھے جو خلوص سرکار سے ہے اس کا راز معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں یہ راز مضمر ہے اس دل میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے۔ سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے اور اس چیز پر جا ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے۔ الحمد للہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں اور نہ انشاءاللہ ہوگا۔ انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پرور دہ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ انشاءاللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے۔ اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دل غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے۔ اللہ اکبر سے دو چار روز ہوئے ملاقات ہوئی تھی آپ کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔ ایاک نستعین کا دور دورہ پھر ہو جائے گا مطمئن رہیے۔ آج کل لاہور میں سلطان کے سرائے میں ایک مجذوبہ نے بہت لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ کسی روز ان کی خدمت میں بھی جانے کا قصد ہے۔ شاد کا پیغام بھی پہنچا دوں گا۔

قید سے گھبرانا کیا! اس کی شدت انشاءاللہ لطفِ آزادی کو دوبالا کر دے گی۔ عرصہ ہوا میں نے پھول سے خطاب کیا تھا۔

"اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے"

تصویر ابھی کوئی پاس نہیں نئی بنوا کر سرکار کی خدمت میں حاضر کروں گا۔ لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔

نازِ تا ناز است کم خیزد نیاز
نازہا سازد بہم خیزد نیاز

اس کی تصویر بھی انشاءاللہ حاضر ہوگی۔ والسلام مخلص قدیم

محمد اقبال

مزدور

وہ جو پسینے میں شرابور دن رات محنت میں مصروف ہے،
مزدور کہلاتا ہے۔
اس کا نغمہ اس کا رونا۔ اس کی روزی ہے۔
وہ بادشاہت کا دشمن ہے۔
شہنشاہ کے خلاف آواز بلند کرنا اس کا کام ہے۔
پر وہ سکّہ جس پر بادشاہ کی تصویر کندہ ہے،
اسے حاصل کرنا اس کا مقصد ہے۔

چغتائی

ٹوٹا ہوا ریکٹ

پانی کا اک بلبلہ جیسے
حد سے زیادہ پھول گیا ہو!
میلا سا اک قمقمہ جیسے
کوئی فضا میں بھول گیا ہو!
جیسے اک ننھا غبارہ — اُڑ اُڑ کر نغمے گاتا ہے!
دن میں ایک بڑا سیارہ — دو جانب آتا جاتا ہے!
صاف زمیں پر جال ہے اس پر دل کی اک دنیا اڑتی ہے
یہ "تارا" کی "گیند" نہیں ہے، یہ میری آشا اڑتی ہے!
امرت رکھنے والی ناگن
جالی اور گل کاری کا بن
حرکت کی آتی ہے آہٹ
وہ اٹھا اک "نازک ریکٹ"!!
گاہے اچھا ہاتھ لگا کر — اپنے اوپر اِتراتی ہیں
گاہے ضربیں "خالی" پا کر — غصے میں شرما جاتی ہیں!
دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقع دیتے ہیں
کچھ لمحے کے بعد ہرا کر غصے کی لذت لیتے ہیں!
کالج کے رومانی لڑکے پاس ہی سے آتے جاتے ہیں
دیکھ کے "ٹینس لان" کی جانب سیگل کے گانے گاتے ہیں!
پوچھ رہی ہیں ساتھی سے وہ، بولو کیسا کھیل رہی ہوں؟
سوچ رہی ہیں اپنے جی میں سب سے اچھا کھیل رہی ہوں!
ہاں، یہ کیسی گیند کی تیزی
کیا اب کھیل ترقی پر ہے؟

یہ متواتر ضربیں کیسی
کیا مقصود اپنا جو ہر ہے؟
لیکن یہ کیا کھیلنے والے کیسے اچانک رک سے گئے ہیں؟
کچھ ہنس کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ تارا کو دیکھ رہے ہیں؟!
چپ ہیں وہ ماتھے پہ پسینہ ان کے جیسے چھوٹ گیا ہے
کھیلتے کھیلتے جانے کیسے ان کا ریکٹ ٹوٹ گیا ہے!
"ٹینس لان" کو جاؤں کیسے، میں کب اس سوسائٹی کا ہوں
بس ان کا "ٹوٹا ہوا ریکٹ" دور، یہاں سے دیکھ رہا ہوں!

سلام (مچھلی شہری)

غزل

حسن بھی چارہ ساز ہو نہ سکا　　　غم سے دل بے نیاز ہو نہ سکا
حسن سے ترکِ ناز ہو نہ سکا　　　اہتمامِ نیاز ہو نہ سکا
حسن ہو کر عیاں، عیاں نہ ہوا　　　عشق کا راز، راز ہو نہ سکا
فطرتِ عشق بندگی ہی تو ہے　　　حسن بندہ نواز ہو نہ سکا
کیا قیامت ہے ان جفاؤں پر　　　تجھ سے میں بے نیاز ہو نہ سکا
دہر ہے ناشناسِ لذتِ درد　　　غم ترا جاں نواز ہو نہ سکا
اک حقیقت ہے زندگی، یعنی!
میں رہینِ مجاز ہو نہ سکا

سلیمان اریب

ایک خط

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہم سفر جائیں

روحنا ——— نمستے!

مگر تم کہو گی ہم نہیں سمجھتے۔ اور حقیقت میں کوئی کیونکر سمجھے۔ "ن" خود اپنے اندر انکاری خصوصیت رکھتا ہے۔ خیر چھوڑو اس ہندی اردو کے قضیے کو ع

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تو تم کو انسان انسان میں تمیز کرنی آ گئی ہے۔ اچھا یہ کب سے؟ مگر انسان کا پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنے نفس پر قابو پانا۔ تم نے بھی کھیل سمجھا ہے شاید اس کو۔ بعض لوگوں کو کبھی تم نے کسی کا مذاق اڑاتے نہیں دیکھا؟ یعنی بہ الفاظ دیگر محفل میں چار لوگوں کو دیکھ کر کسی "ایک" کو بنانے کی کوشش کرنا۔ کسی کی بیماری کا ٹھٹول کرنا۔ کسی کے درد و کرب کو سن کر اپنی تنگ نظری و بے حسی کا ثبوت دینا۔ اس طرح کہ سننے والے کے دل کو ٹھیس لگے۔ مگر روحنا۔ ایسے لوگ آنکھوں میں سے گر جاتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ سماج ایسی ذہنیت والوں کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ انسان کو انسان سے ہمدردی کے صرف دو بول کی امید ہی تو رہتی ہے۔ ایسے لوگ اپنی ہر دلعزیزی کے موقع کو بھی کھو دیتے ہیں، جو سب سے بڑی طاقت ہے۔ دوستوں کے دلوں کا پھٹ جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مگر ایسوں کو دوست کون سمجھتا ہے۔ فرض کرو تمھارے سر میں درد ہے اور میں کہوں "اُفوہ! آپ کے سر میں درد بھی ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی ایسی بڑی چیز نہیں" تمھیں بخار آتا ہے۔ دنوں رہتا ہے۔ دھیما دھیما ٹمپریچر۔ جو طبی نقطۂ نظر سے ۱۰۴° بخار سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور میں تمھاری حرارت کو سن کر تمھارا اس طرح مذاق اڑاؤں "سنا ہے آپ کو بخار ہے اور ٹمپریچر کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں۔ ارے ہم تو ۱۰۲° بخار میں سینما دیکھتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔" میری ان سفاکانہ سفلی باتوں کو سن کر تم اخلاقاً مسکرا دو گی۔ کیونکہ بعض مواقع زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں کہ کوئی چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہو اور اس کو مجبوراً مسکرانا پڑتا ہے۔ مگر تمھارے دل سے پوچھو اس وقت کیا کہتا ہے اور اس کے پاس میری کیا عزت یا وقعت باقی رہی ہے۔ دکھ بیماری کوئی اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ یہ ہمارے اور نیچر کے ساز باز ہیں۔ ہم نیچر کے خلاف چلتے ہیں۔ اس کے اصول کی پابندی نہیں کرتے۔ نیچر ہمارا انتقام لیتی ہے۔ تو اس میں کسی غیر کا بے معنی، بے ہنگام و بے موقع دخل کتنی تضیع اوقات کا باعث ہے۔ اصولاً میری ایسی باتوں سے تمھارا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ برسوں کی دوستی پر پانی پھر جاتا ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی تم مجھے انسان سمجھو تو پھر مجھے تمھیں ازلی سمجھنے میں مجبوراً پس و پیش ہوگا۔

بعض وقت کسی "ایک خاص شخص" سے سوسائٹی کے ایک گروہ کو کچھ حسد یا جلاپا سا ہو جاتا ہے۔ بس اس کے پیچھے تو یہ جاہل اور ناسمجھ ٹکڑی ہاتھ دھو کے پڑ جاتی ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ جتنی جتنی سمجھ اتنی اتنی ان بچاروں کی باتیں۔ لیکن تم ان پست فطرت ہستیوں کی فطری و جبلی کمزوری کو کیسے بدل سکتی ہو۔ ع

وحشت نہ یہ جنون نہ یہ اختلاج ہے   یہ درد وہ ہے درد ہی جس کا علاج ہے

غرض انسان، نام ہی کا بس انسان ہے رو حنا۔ ورنہ اس کے اوصاف و کردار میں تو انسانیت کا کوئی جوہر نہیں۔ منطق کے پرچہ میں ایک سوال آیا تھا "ایک احمق، انسان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ انسان ایک ذی عقل ہستی ہے۔" اسی طرح نفسیات کے اس سوال نے تو واقعی میرے ہوش گم کر دیے تھے "ہم ہر چیز کو دو آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ چیز ایک ہی دکھائی دیتی ہے۔" میں نے تو یوں تیوں اس کا جواب دے کر ممتحن کو تشفی دے دی تھی، لیکن تم بتا سکتی ہو کہ یہ کیونکر ہوتا ہے؟

اسی طرح ایک اور سوال تھا "انسانی فرد بجائے خود ایک جماعت ہے۔ تم بہ حیثیت ماہر نفسیات اس معمہ کو کس طرح حل کرو گے؟" تم کہو گی اسی چیز کو تو غالب نے بہت دنوں پہلے بتا دیا تھا ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خیالات ملتے جلتے ہیں، لیکن ڈگر علحدہ، ایک کا راستہ شاعری ہے دوسرے کا نفسیات لیکن بات تو پتہ کی ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ماہر نفسیات ہی بن کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ نفسیات ایک ضروری علم ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو انسان کو پہچاننا چاہتے ہیں ــــــ اور جب تک تمہارا اپنا ظاہر و باطن یکساں نہ ہوگا۔ تمھیں دوسرے میں نیک وبد کی تمیز مشکل ہو جائے گی۔ ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔ ایک ایسے شخص کا دل جو دوسرے کے دل کو دکھاتا ہے، میرے نزدیک اس پتھر سے بدتر ہے جو تمام دن تمہارے صحن میں پڑا ہوا تمازت آفتاب سے جلتا رہتا ہے، وہ جلتا ہے۔ جلاتا نہیں۔ تم کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں مت کرو روحنا۔ حالانکہ جماعت میں جب کبھی معلمہ پوچھتیں کہ "سمجھ لیا نا آپ نے؟" اور تم اپنی سواگز کی گردن زور زور سے ہلا دیتیں مطلب یہ کہ ہاں میں سمجھ گئی۔ لیکن مجھے معلوم تھا تمہارے خیالات کہیں دور دور بھٹکتے رہتے اور صرف ان کو خوش کرنے تم سفید جھوٹ کہتیں اور اپنی گردن ہلا دیتیں۔ تم کہتی ہو "ظرافت اور مزاح میں ایسا کیا فرق ہے؟" زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظرافت کا سلسلہ خوش خلقی اور تواضع سے ملتا ہے۔ ظریف خوش مزاج ہوتا ہے دل شکن نہیں ہوتا۔ وہ ہنساتا ہے۔ رلاتا نہیں۔ اس کے برعکس مزاح کا تعلق ٹھٹول، بے جا ہنسی، بھونڈے اور دل گداز مذاق سے ہے۔ جو صرف آزاد منش بے حس لوگ ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن کے دلوں کی حس قریب قریب مردہ ہے۔ حساس طبیعتوں کے لئے ایسی صحبتیں وبال جان ہو جاتی ہیں۔

ہاں مرجانا مشکل ہے، لیکن زندہ رہنا بھی تو کوئی آسان کام نہیں۔ فرض مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ تم اس کو نہیں جانتیں۔

اسی لئے کہتی ہوں کہ تم مجھے خط تو لکھو لیکن اس کے جواب کی توقع مت رکھو۔ میں اظہار بیان میں بہت بھڑک جاتی ہوں۔ دریا کا بند جب ٹوٹ جاتا ہے تو سیلاب مشکل سے رکتا ہے، اور یہ اسی وقت رکتا ہے، جب کہ طوفان و تلاطم میں کمی ہو جاتی ہے۔ دکھتی ہوئی رگ کو مت چھیڑو اب ختم کر دوں گی ــــــ فقط

جہاں بانو بیگم

مہذب چور

(ایک مختصر نثری ڈراما)

کردار

(۱) شیردل ۔ ایک سائنس داں مہذب چور۔
(۲) ناصر ۔ شیردل کا ساتھی۔
(۳) ڈاکٹر توفیق مرزا۔ جو جسم انسانی پر ریڈیم کی شعاعوں کے اثر کی تحقیق کرنی چاہتے ہیں۔
(۴) صدر جلسہ اور سامعین۔

مناظر

منظر اول۔ شیردل اور ناصر کی گفتگو۔
منظر دوم۔ ڈاکٹر توفیق مرزا کی تقریر۔
منظر سوم۔ شیردل اور ناصر کی دوبارہ گفتگو۔
منظر چہارم۔ ڈاکٹر کا چور کو پکڑنا۔ دونوں کی بحث۔
منظر پنجم۔ چور پر ڈاکٹر صاحب کا تجربہ ٹیلیفون کے ذریعہ گفتگو۔
منظر ششم۔ ڈاکٹر صاحب خود تجربہ خانے میں۔ ٹیلیفون پر مکالمہ۔

پہلا منظر

ناصر۔ آج کل تو بہت سوکھی گزر رہی ہے۔ بہت دنوں سے کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔ بھئی شیردل اب تو تمہاری باری ہے۔

شیردل۔ ہاں ٹھیک ہے اب میری ہی باری ہے۔ مجھے خود اس کی فکر ہے۔ ممکن ہے قریب میں ایک صورت نکل آئے۔

ناصر۔ آخر میں بھی تو معلوم کروں تم نے کیا منصوبہ باندھا ہے؟

شیردل۔ تم نے آج کا اخبار تو دیکھا ہی ہوگا۔

ناصر۔ مگر اس میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔

شیردل۔ کیوں کیا ڈاکٹر توفیق مرزا کے متعلق کوئی خبر نہیں پڑھی۔

ناصر۔ بس یہی کہ آج شام کو ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر ہے۔ شاید کچھ ریڈیم منگوایا ہے۔ کچھ تحقیق کرنی چاہتے ہیں۔

شیردل۔ ہاں۔ ریڈیم کوئی بیس ہزار روپیوں کا ہے، اور یہ میرے لئے کافی ہے۔

ناصر۔ مگر وہ تم کو ملے گا کیسے؟ اور پھر ریڈیم جیسی تیز شعاعوں والی چیز کا اٹھالانا بھی تو ممکن نہیں۔

شیردل۔ ان سب باتوں کو تو ہم پر چھوڑ دو۔ ہم نے بھی سائنس پڑھی تھی آخر وہ کس دن کے لئے؟ اچھا اب میں تو ٹاؤن ہال تقریر سننے کے لئے جاتا ہوں۔ تم ذرا ڈاکٹر کے گھر جاؤ۔ مکان کا نقشہ ذرا تفصیل سے دیکھ کر آؤ۔ میں بھی تقریر کے بعد یہیں واپس آتا ہوں۔

ناصر۔ اچھی بات ہے۔ (دونوں جاتے ہیں۔ پیروں کی آواز)

دوسرا منظر

(ٹاؤن ہال میں جلسہ)

صدر جلسہ:۔ حضرات!

بزم سائنس عظیم آباد کی جانب سے آج کا جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر توفیق مرزا ریڈیم کے متعلق ایک عام فہم تقریر فرمائیں۔ اب میں ممدوح سے

ملتمس ہوں کہ ہم کو اپنے خیالات سے مستفید کریں۔

(تالیاں)

ڈاکٹر: جناب صدر و معزز حاضرین!

میں بزم سائنس کا ممنون ہوں کہ مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا اس طرح موقع عطا فرمایا گیا۔ مجھے اس وقت کوئی طویل تقریر کرنی نہیں ہے۔ ریڈیم کے متعلق میں نے جو سرسری معلومات حاصل کی ہیں ان کے بیان پر اکتفا کروں گا۔ میں نے خود کچھ ریڈیم منگوایا ہے اور تحقیقاتی کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں اس میں کامیاب رہا تو شاید مزید معلومات پیش کرسکوں گا۔ آج کی تقریر گویا ایک تمہید ہے۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں پیرس کے مشہور سائنس داں پروفیسر بیکورل نے غیر بصری شعاعوں کا پتہ چلایا۔ ایک مرتبہ رات کو انھوں نے یورینیم کی شیشی اتفاقاً ایک عکسی تختی کے قریب رکھ دی تھی۔ دوسرے دن انھوں نے دیکھا کہ باوجود تاریکی کے تختی پر تصویر کا خاکہ بن گیا۔ پروفیسر صاحب نے یہ خیال کیا کہ شاید اس دھات میں سے کوئی ایسی شعاع نکلتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس تجربے کا حال سن کر پروفیسر کیوری اور ان کی بیوی میری کیوری نے تحقیق شروع کی ان دونوں نے معلوم کیا کہ بعض اور دھاتیں بھی ہیں جن سے ایسی غیر بصری شعاعیں نکلتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد پروفیسر کیوری نے تو انتقال کیا لیکن سنہ ۱۹۱۱ء میں ان کی خاتون میری کیوری نے دنیا کی سب سے قیمتی دھات ریڈیم کا انکشاف کیا۔ یہ دھات اس قدر کم یاب ہے کہ آج بھی دنیا میں اس کی مجموعی مقدار ۲۰ تولے سے زیادہ نہیں ہے۔

ریڈیم چاندی کی طرح سفید اور چمک دار دھات ہے۔ اس سے تین قسم کی غیر بصری شعاعیں نکلتی ہیں۔

بعض شعاعیں ایسی تیز ہوتی ہیں کہ لوہے کی ٹھوس تختی بھی ان کو روک نہیں سکتی۔ ریڈیم کی تیز شعاعوں سے سرطان کا علاج کیا جاتا ہے۔ جب شعاعیں قریب سے ڈالی جاتی ہیں تو سرطان میں داخل ہوکر جراثیم اور فاسد مادے کو جلا دیتی ہیں۔

طبی نقطۂ نظر سے اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ ایک محفوظ فاصلے سے جسم انسانی پر ریڈیم کی شعاعوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تجربوں کے ذریعہ جب ہم یہ معلوم کرلیں گے کہ انسان کتنے فاصلے سے اور کتنی دیر تک شعاعیں برداشت کرسکتا ہے تو یقین مانیے کہ ہم تمام امراض پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تحقیق سے ایک نیا طبی دور شروع ہوجائے گا اور دنیا میں کوئی ایسا مرض باقی نہ رہے گا جس کو ہم لاعلاج قرار دیں۔

(تالیاں)

تیسرا منظر

ناصر۔ تقریر تو ۵ بجے ختم ہوچکی ہوگی، مگر شیردل کا اب تک پتہ نہیں۔

(شیردل داخل ہوتا ہے)

شیردل۔ معاف کرنا ناصر تمھیں انتظار کرنا پڑا۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے میں وقت پر نہ آسکا۔ کہو تم مکان دیکھ آئے۔

ناصر۔ ہاں، اچھی طرح سے۔ یہ مکان کا نقشہ ہے۔ دیکھو یہ نیا تجربہ خانہ ہے۔ بالکل جدید وضع کا۔ مگر اس میں داخل ہونے کا

صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر چور گھنٹی لگی ہے۔ کوئی اس دروازے کے قریب گیا اور گھنٹی خود بخود بجنی شروع ہوئی

شیر دل۔ اچھا۔ اور یہ کمرہ، تجربہ خانے سے کتنی دور ہوگا۔
(نقشے پر انگلی سے بتاتا ہوا)

ناصر۔ یہی کوئی دو سو قدم پر۔ اچھا کہو تو تقریر میں کوئی کام کی بات بھی سنی۔

شیر دل۔ ہاں ہاں میرا جو قیاس تھا وہ صحیح نکلا۔

ناصر۔ پھر ہمیں بھی تو بتاؤ۔

شیر دل۔ بھئی ناصر، اب وقت تنگ ہے۔ مجھے جانے دو۔ میں یہ نقشہ بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ پھر کل ہمیں ملیں گے۔

ناصر۔ اچھی بات ہے، کل ہی سب تفصیل معلوم ہو جائے گی۔
(شیر دل چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر

ڈاکٹر۔ (اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے غور و فکر کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے)
میں سمجھتا ہوں کہ انسان ۱۰ فٹ کے فاصلے پر ایک گھنٹے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ تجربہ اندیشناک ہے۔ کوئی کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالے گا۔
(کمرے سے کچھ دور کسی کے دبے پاؤں چلنے کی آواز)

ڈاکٹر۔ (چونک کر) اس وقت تجربے خانے کی طرف پیروں کی آہٹ کیسی!
(چور گھنٹی بجتی ہے ٹر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر۔ ر.....)

ڈاکٹر دوڑتا ہے۔ چور بھی دوڑتا ہے (دونوں کے پیروں کی آواز)

ڈاکٹر۔ ٹھیر جاؤ ورنہ میں طفنچہ چلا دوں گا۔
(چور رک جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ "تم کون ہو؟" (ذرا غصے سے)

چور۔ "آپ کی طرح ایک انسان" (اطمینان کے ساتھ)

ڈاکٹر۔ "اتنی رات گئے تمھارا یہاں کیا کام؟"

چور۔ "اس خیال سے آیا تھا کہ کچھ ہاتھ لگے تو لیتا جاؤں"

ڈاکٹر۔ "چہرے اور لباس سے تو تم ایک مہذب آدمی معلوم ہوتے ہو، معمولی حالات میں تو شبہ بھی نہ ہو کہ تم اس قدر ڈھیٹ ڈاکو ہو۔"

چور۔ "ڈاکٹر صاحب۔ خانگی افکارات اور پریشانیاں ایک مہذب آدمی کو بھی چوری پر مجبور کر دیتی ہیں۔"

ڈاکٹر۔ "مگر مہذب ہونے کا دعویٰ تم کو پولیس کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ تم پولیس کے حوالہ کئے جاؤ گے۔"

چور۔ ڈاکٹر صاحب میں ایک شریف آدمی ہوں، تباہ حالی، مفلسی اور کثیر العیالی نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ آخر انسان اپنے بچوں کو کب تک بلبلاتا ہوا دیکھ سکتا ہے؟ آپ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔ میری خطا معاف کر دیں۔"

ڈاکٹر۔ "میں تمھاری باتوں میں نہ آؤں گا۔ چور ایک سماجی مجرم ہوتا ہے۔ سماج کی عافیت کے مدنظر تم کو پولیس کے حوالے کر دینا میرا فرض ہے۔ مجھے معاف کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

چور۔ "ڈاکٹر صاحب اس سے تو بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے جہنم

کردیں۔ باوجود مفلسی کے مجھے اپنی عزت جان سے زیادہ عزیز ہے۔ خدا کے لئے آپ میری عزت بچا لیجئے۔

ڈاکٹر۔ " نہیں، نہیں۔ (پھر ذرا سوچ کر) تمھاری رہائی کی صرف ایک صورت ہے۔ اگر تم میری شرط منظور کرلو۔"

چور۔ " ڈاکٹر صاحب آپ جو شرط چاہیں پیش فرمائیں مجھے ہر طرح منظور ہے۔"

ڈاکٹر۔ میں ایک طبی تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ (خوش ہوکر) مگر یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اس تجربے کے دوران میں آپ کو جسمانی تکلیف ہوگی۔ اگر آپ اس کو قبول کریں تو مجھے بڑی مدد ملے گی اور میں بہت ممنون ہونگا۔

چور۔ " ڈاکٹر صاحب۔ میں گرفتاری اور بے عزتی کے مقابلہ میں سخت سے سخت تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ (خوش ہوکر)

ڈاکٹر۔ آپ اس تجربہ خانے میں چلے جائیے میں باہر سے دروازہ بند کردوں گا پھر تجربہ ختم ہونے تک آپ باہر نہ آئیں گے۔ میز پر ریڈیم رکھا ہے۔ سامنے کرسی رکھی ہے۔ قریب میں تھرمامیٹر اور گھڑیال رکھی ہے۔ ٹیلیفون کے ذریعہ میں کوئی آدھے گھنٹے کے فاصلے سے کیفیت دریافت کروں گا۔ آپ تفصیل سے بیان کریں۔

چور۔ جی بہت خوب۔

پانچواں منظر

ڈاکٹر۔ ہالو!

چور۔ ہالو۔ ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا۔ بتائیے اب کیا کیفیت ہے۔

چور۔ ڈاکٹر صاحب تپش ۱۰۲° ہوگئی ہے۔ گھبراہٹ بے انتہا ہے۔ اتنے ہوش نہیں کہ نبض شمار کروں۔

ڈاکٹر۔ گھبرائیے نہیں، میں آدھے گھنٹے کے بعد پھر آپ سے بات کروں گا۔ اب آپ کچھ گانا سنئے۔

(ٹیلیفون رکھ دیتا ہے)

(کوئی ۵ سکنڈ کا وقفہ)

ڈاکٹر۔ ہالو! اب ایک گھنٹہ ہوچکا، کہئے کیا حال ہے۔

چور۔ مردود۔ موذی۔ قاتل آخر تیرا ارادہ کیا ہے۔ کیا مجھے یوں ہی مار ڈالے گا؟

ڈاکٹر۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ پھر آپ کا اتنا گڑنا کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ آپ ایک اہم تحقیقات میں مدد دے رہے ہیں تھوڑی سی تکلیف اور سہی۔

چور۔ تیری تحقیق کی ایسی تیسی۔ میں تو مرا جارہا ہوں اور تجھ پر تحقیق کا بھوت سوار ہے۔ ارے ظالم اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل سینے سے باہر نکل آئے گا۔ بدمعاش۔ خونی جانور کو بھی تو اس بری طرح نہیں مارتے۔ اُف۔ اُف۔ اوف (دھڑام)

(کرسی پر سے گرجاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (ٹیلی فون رکھتے ہوئے) او ہو بے ہوش ہوگیا (گھبراکر) کہیں مر نہ جائے۔ مجھے جلد وہاں جانا چاہیے (تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جاتا ہے)

تجربہ خانے کا دروازہ کھولتا ہے (کچھ سرسراہٹ ہوتی ہے)

ڈاکٹر۔ یہاں تو سب اندھیرا پڑا ہے۔ (کھٹکا دباکر روشنی کھولتا ہے) ہائیں یہاں نہ تو وہ چور ہے اور نہ ریڈیم۔

(باہر سے کوئی دروازہ بند کرلیتا ہے)

ڈاکٹر۔ (گھبراکر) ہائیں یہ باہر سے دروازہ کس نے بند کیا۔

(دوڑ کر کھولنے کی کوشش کرتا ہے)

چھٹا منظر

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔

ڈاکٹر۔ ہالو۔ کہاں سے۔

شیردل۔ "کہیے جناب ڈاکٹر صاحب آپ کی تپش اور نبض کی رفتار کیا ہے؟" (الفاظ پر زور دیتے ہوئے طنزاً)

ڈاکٹر۔ "تم بڑے موذی اور نالایق ہو۔" (ذرا گرم ہوکر)

شیردل۔ "دیکھیے ڈاکٹر صاحب آپ کو ایسے الفاظ زیب نہیں دیتے۔ میز کے خانے میں تپش پیما رکھا ہے۔ براہ کرم اپنی تپش سے مطلع کیجیے۔ آپ ایک ایسی تحقیق میں مدد دے رہے ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے بیحد مفید ثابت ہوگی اور آپ کا نام تاریخ تحقیقات میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔" (طنزاً)

ڈاکٹر۔ "میں تجھے ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں" (برہم ہوکر)

شیردل۔ ہاہا! معاف فرمایئے اب وقت گزر چکا۔ آپ کمرے میں ہر طرح محفوظ ہیں۔ پولیس تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔ میں نے دروازہ باہر سے مقفل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر۔ "ٹھیر جا، پاجی تو جاتا کہاں ہے۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن کو ٹیلیفون سے اطلاع دیتا ہوں۔"

شیردل۔ " اس کی زحمت نہ کیجیے۔ آپ نے نہایت دور اندیشی سے تجربہ خانے کے ٹیلیفون کو صرف اس کمرے سے وابستہ رکھا تھا تاکہ جو غریب آپ کے تجربے کا شکار ہو اس کی آہ و فغاں کوئی سن نہ سکے۔ اپنی اس دور اندیشی کی داد مجھ سے لیجیے۔ اب آپ کسی اور سے گفتگو نہیں فرما سکتے صرف میری تحقیقات میں مدد فرما سکتے ہیں۔ فرمایئے گھبراہٹ تو نہیں محسوس ہوتی؟ ہونٹ، زبان اور حلق میں خشکی تو نہیں معلوم ہوتی؟"

" مردود۔ نالایق۔ پاجی۔ کمینے " (برافروختہ ہوکر)

" میں آپ کی کیفیت پوچھ رہا ہوں اور آپ اپنے صفات عالیہ گنائے جارہے ہیں جناب عالی براہ کرم اپنی کیفیت واضح طور پر بیان کیجیے "

ڈاکٹر۔ " بدمعاش۔ چور۔ ڈاکو " (اور برافروختہ ہوکر)

شیردل۔ "جناب عالی۔ میں نہ بدمعاش ہوں نہ ڈاکو۔ ایک مہذب، شائستہ اور چالاک انسان ہوں۔ خدا نے عقل دی ہے، کم عقلوں سے فائدہ اٹھا لیتا ہوں۔ اس عمل کو چوری جیسے گھٹیا لفظ سے تعبیر کرنا کتنی بڑی غلطی ہے۔"

ڈاکٹر۔ " بدمعاش۔ چور میں اور تجھ میں کیا فرق ہے؟"

شیردل۔ " ڈاکٹر صاحب یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس میں اتنا الجھنا نہ چاہیے۔

[چور میں اور مجھ میں وہی فرق ہے جو ایک ہنر اور ڈاکٹر میں ہوتا ہے۔

ہنر آپ کے بول و براز کو صاف کرتا ہے، ڈاکٹر بھی قارورے اور فضلے کا امتحان کرتا ہے۔ اگر آپ محض اس سطحی مماثلت کی بنا پر ڈاکٹر کو ہنر کی طرح حقیر خیال کرنے لگیں تو کتنی بڑی غلطی ہوگی؟]

بات یہ ہے کہ حقارت نفس عمل سے نہیں ہوتی بلکہ اس طریق عمل کے لحاظ سے ہوتی ہے جس کے ذریعے کوئی عمل کیا جائے۔ آپ نے روپیہ کے ذریعہ ریڈیم حاصل

کیا تھا اور میں نے تدبیر کے ذریعے۔ نہ میں چور اور نہ آپ چور۔ آپ جسم انسانی پر اس کے اثرات کی تحقیق کرنی چاہتے تھے مگر ناکام رہے۔ البتہ میں اپنی تحقیق میں کامیاب رہا۔

ڈاکٹر۔ "بے ایمان۔ دغاباز۔ چوری کو تحقیق کہتا ہے؟"

شیر دل۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب نہیں۔ بس آپ تو واللہ خفا ہی ہو گئے۔ سنئیے تو، میں نے یہ معلوم کیا تھا کہ جب ریڈیم کی اشعاعی قوت زائل ہوجاتی ہے تو وہ سیسہ بن جاتا ہے۔ پس میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی شعاعیں سیسے میں سے نہ گزر سکتی ہوں گی۔ چنانچہ میں نے سیسے کی ایک ڈبیہ پورے اہتمام کے ساتھ تیار کروائی اور اپنے خیال کی تصدیق کے لئے یہاں حاضر ہوا۔ جب آپ نے مجھے تجربہ خانے میں بند کیا تو میں نے نہایت احتیاط سے ریڈیم کو ڈبیہ میں منتقل کیا۔ اب یہ میری جیب میں گھنٹے بھر سے ہے۔ میرے جسم پر کوئی مضر اثر نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے میں اپنی تحقیق میں کامیاب رہا۔ بہرحال خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی محنت ٹھکانے لگی۔ تحقیق ہو چکی۔ آپ نے نہ کی میں نے کی۔ صبح تک اپنے تجربہ خانے میں آرام فرمائیے مجھے اس ریڈیم کے کئی حصے کرکے پوری احتیاط کے ساتھ مختلف شہروں کو بھیجنا ہے۔ خدا حافظ۔"

حبیب احمد فاروقی

(حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

غزل

احساس بے خودی تک پہونچی ہیں سرد آہیں
توبہ کے توڑنے کو جی چاہتا ہے میرا
جور و جفا نے ان کی کیا سحر کر دیا ہے
تاریک ہو رہی ہے دنیائے رنج و فرقت
محشر اٹھا رہی ہیں، فتنے جگا رہی ہیں

ناسازگارِ الفت ہیں میری التجائیں
مجبور کر رہی ہیں اٹھتی ہوئی گھٹائیں
اب دل کی دھڑکنیں بھی دینے لگیں دعائیں
نالوں کی بجلیاں ہیں آہوں کی ہیں گھٹائیں
رکتی ہوئی نگاہیں، جھجکی ہوئی ادائیں

عظیم حیدرآبادی

مہاراجہ بہادر کی شاہ پرستی

اور دیگر حالات

سطورِ ذیل اس لئے قلم بند کر کے اشاعت کے لئے بھیجی جارہی ہیں کہ وہ آپ کے رسالہ کے ذریعے محفوظ ہو جائیں۔

اس وقت تو سب ہی یہ جانتے ہیں کہ مہاراجہ کے چراغِ ہستی نے جو رونق و ضیا دکھلائی، اور جس جود و سخا اور خلق و مروت سے ایک جہان کو مسخر کر لیا، وہ صرف دربارِ آصفیہ کا تصدق تھا، اور عالی قدر سلطانِ دکن آصفجاہ سادس و سابع کی ایک ادنیٰ نظرِ التفات تھی کہ اس کی بدولت مہاراجہ وہ سب کچھ بن گئے، جس سے اب ایک دنیا واقف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی اس کامیاب زندگی میں ان کی فطری صلاحیتوں اور خوبیوں کو بھی دخل تھا، مگر اس سے کون انکار کر سکے گا کہ بے نظیر، مردم شناس اور قدر داں شاہانِ جلیل القدر نے ان کو ان کے ان صفات و کمالات کا وہ صلہ عنایت فرمایا، جو سلطنت میں اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، اور دمِ آخر تک الطافِ شاہانہ برابر مبذول رہے۔ مہاراجہ کا علاج معالجہ توجہ شاہی کا مرکز بنا رہا، اور حضور پر نور ہر وقت اطباء کے نام فرامین اور ہدایات جاری فرماتے رہے۔ عیادت کے لئے خود سواریٔ مبارک آیا کرتی۔ جب وہ سانحہ پیش آگیا، جو لابدی تھا، تو اپنے ایک قدیم وفادار اور بے مثل شخص کی موت سے حضرت پیر و مرشد کو بیحد رنج پہنچا، ؎

شہنشاہِ جہاں را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشکِ حسرت ریخت، کا فلاطوں زعالم شد

صدارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد، مہاراجہ بہادر کا اکثر وقت علمی و تفریحی مشاغل میں صرف ہوتا تھا، اور قریباً ہر روز شب میں سکندرآباد کسی ایک سینما تشریف لے جاتے، اور رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے ایوانِ شاد کو واپسی عمل میں آتی تھی، جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، وہ اوائل ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کا ہے، اور جسے راقم الحروف کے ایک دوست نے اس کے وقوع پذیر ہونے کے دوسرے یا تیسرے ہی دن ہم سے بیان کیا۔ وہ راوی ہیں کہ حسبِ قاعدہ مہاراجہ بہادر کی سواری، جب رات میں سکندرآباد سے واپسی کے وقت چار مینار سے گزرتی، تو ایک بڑھیا، جو ایک مینار کے پائین میں بیٹھا کرتی ہے، صدائیں لگاتی، اور کہتی کہ "اللہ میرے بچے والے راجہ کو سلامت رکھے عمر و اقبال میں ترقی دے" مہاراجہ بہادر اپنی فطری عادت کے موافق اسے سرفراز فرماتے، اور سواری گزر جاتی تھی۔ قریباً ہر روز رات میں یہ بڑھیا دستِ سوال دراز کرتی، اور سخی راجہ دستِ کرم بڑھا دیتے۔

ایک رات جب کہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے مہاراجہ کی سواری چار مینار کے مشرقی مینار کے قریب سے (جو یونانی صدر شفاخانہ کی جانب ہے) گزر رہی تھی، مینار کے پائین سے حسبِ عادت یہ صدا آئی کہ "اللہ میرے بچے والے سخی راجہ کے عمر و اقبال میں ترقی دے" موٹر سے سخی داتا کا ہاتھ اٹھا اور ابرِ جود و سخا بن کر برس گیا۔ گاڑی کچھ ہی آگے بڑھی تھی، حکم ہوا کہ لوٹالو، اور اس مینار کے قریب اس

بڑی بی کے پاس لے چلو۔ ملازمین موٹر کا دروازہ کھولتے ہیں، اس کے باوجود کہ موٹر میں بیٹھنا اٹھنا ان کے لئے سخت مشکل تھا بدقت تمام نیچے اتر پڑے۔ اور بڑھیا سے خطاب کرکے فرمایا کہ :-

"تم ہر روز مجھ ایسے بوڑھے کو عمر و اقبال کی ناحق دعائیں دیتی ہو، میں تو امروز فردا کا مہمان ہوں، بلکہ تمہاری سچی اور دلی دعائیں اس بادشاہ کے حق میں ہونی چاہئیں، جس کے در پر مجھ سے ہزاروں غلام اور کتے پڑے ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ پاک اس ریاست کے بادشاہ سلامت اور ان کے شہزادگاں و شہزادیاں کے عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے، اور اس ریاست کو دشمنوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھے"۔

یہ فرمانے کے بعد بوڑھیا سے اصرار فرمایا کہ وہ ان دعاؤں کو ان کے سامنے اپنی زبان سے دہرائے چنانچہ اس نے دہرانا شروع کیا، اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، اور اس بڑھیا کے ساتھ ساتھ خود بھی ان فقروں کو دہراتے جاتے اور آمین کہتے جاتے تھے، آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس وقت ان پر کچھ اس طرح بے کلی اور اضطراب کا عالم طاری تھا کہ ایک عجیب رقت انگیز کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود کہ لوگوں کو انھیں سہارا دینا پڑتا تھا، بڑی دیر تک کھڑے رو رہے تھے، اور جسم تھرا رہا تھا، پیر لڑکھڑاتے تھے۔ جب کچھ سکون ہوا، ملازمین کے سہارے موٹر میں سوار ہو گئے، اور گاڑی ایوان شاد روانہ ہو گئی۔ مجھ سے اور لوگوں نے اس کی تصدیق کی کہ بعد راتوں میں اس مینار کے پاس ایک بڑھیا بیٹھا کرتی ہے۔

مہاراجہ نے زندگی بھر داد و دہش کی، اور ہر روز خزانہ سے رُپے آتے اور تقسیم ہو جاتے۔ بیمار ہونے سے قبل تک اس طویل عمر میں کسی دن یہ بے نظیر عادت ترک نہ ہوئی اور یہ ان کے لئے بمنزلۂ فریضہ بن گئی تھی۔ دوسرے راوی نے مجھ سے بیان کیا کہ تین دن تک چونکہ مہاراجہ بالکل بیہوش رہے، اس لئے خیرات ملتوی رہی۔ ۵ ربیع الثانی دوشنبہ کے دن روح پرواز کرنے سے کچھ دیر قبل کسی نے کہا کہ سرکار کی عادت کے خلاف تین چار دن سے آج تک غربا پر کچھ تقسیم نہ ہوا، اور سرکار مرض کی شدت کے باعث سخت تکلیف میں مبتلا ہیں، چنانچہ اس پر توجہ کی گئی، اور اکنیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں منگوائی گئیں، اور ملازمین کو فقرا پر تقسیم کرنے کے لئے دی گئیں جو سیکڑوں کی تعداد میں ڈیوڑھی کے سامنے جمع تھے۔ ان لوگوں نے ان پر تھیلیاں لٹا دیں اور جونہی کہ ادھر یہ تقسیم ختم ہوئی ادھر مہاراجہ کی روح پرواز کر گئی، عقیدت مند کہنے والوں نے کہا کہ شاید سرکار کی روح زندگی بھر اس صفت حسنہ کے ناغہ ہونے کو پسند نہ کرتی تھی، اس لئے جسدِ خاکی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی، جوں ہی کہ خیرات ختم ہوگئی، نزع کی کیفیت دور ہو کر، روح نے خوشی سے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

مہاراجہ اپنی علمی قابلیت میں ایسے فرد فرید تھے کہ اس دور میں ہندوستان میں اس طرح "مجمع العلوم والکمال" افراد بہت کم پیدا ہوئے، اور اتنی خوبیوں کا ایک شخص کی ذات میں جمع ہو جانا فی الحقیقت ایک حیرت انگیز بات ہے۔ مہاراجہ فارسی، انگریزی، عربی، مرہٹی، کنڑی، ہندی اور

پنجابی زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے، اور اول الذکر دو زبانوں میں اہلِ زبان کی طرح گفتگو کرتے ہوئے ان کو بہت سے آدمیوں نے سنا ہے۔ خصوصیت سے فارسی کا لب و لہجہ بالکل ایرانیوں کا سا تھا۔ اردو، ان کی مادری زبان تھی۔ مختلف فنون میں انھیں بلا مبالغہ استادانہ منصب حاصل تھا۔

(۱) ان کا خطِ نسخ و نستعلیق ایک ماہر کے درجہ کو پہنچ چکا تھا۔ امرا میں نواب لطف الدولہ وغیرہ ان کی ہمسری کرتے تھے۔ لیکن خطِ شکستہ نہایت پختہ اور عجیب شان رکھتا تھا، ضعیفی کے باوجود آخر عمر تک بھی اس کے رنگ میں فرق نہ آیا، مولانا محمد علی، اور ڈاکٹر اقبال کا خط بھی عمدہ تھا۔ ہمارے پاس مہاراجہ کے بیسیوں خطوط ہیں، اور ہماری رائے ہے کہ ان کا خط ان حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ ان کے دستخط بھی خوبصورت اور خاص شان کے مالک تھے۔

(۲) ایک اچھے مصور بھی تھے، ہم نے ان کے کھینچے ہوئے قلمی تصاویر و مناظر دیکھے ہیں۔ اپنے بعض مقربین کو جنھیں وہ چاہتے تھے۔ ان کی تصویریں بنا کر انھیں مرحمت فرمائی تھیں۔

(۳) فنونِ طبیہ میں، مشرقی اور مغربی دونوں طرز کی طبابت کی، اور اپنے ابتدائی دور میں باضابطہ مطب بھی کیا تھا۔ بیسیوں نسخے خود اپنی ذاتی صلاحیت سے مرتب کیا کرتے۔ میں نے ان کی مرتبہ و مرکبہ جوارش شاد اور دیگر معاجین وغیرہ دیکھی ہیں۔

(۴) اپنے نانا کی توجہات پر فن موسیقی میں بھی مہارت حاصل فرمائی تھی۔ راجہ نریندر بہادر نے ایک دفعہ ایک صوفی صاحب کے روبرو مہاراجہ بہادر سے ارشاد کیا کہ بابا ہمیں ہمارے دادا (یعنی چندو لال) نے شاکر علی، باقر علی نامی دو بڑے مشہور گویوں سے تعلیم دلائی تھی، تم بھی اس فن کو سیکھو،

فقیر صاحب جو اس وقت موجود تھے، انھوں نے سن کر یہ کہا مہاراج آپ بھی غضب کرتے ہیں، یہ گانا سیکھ کر کیا کریں گے، اس پر راجہ نریندر بہادر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اجی شاہ صاحب یہ بہت بڑا اور اعلیٰ فن ہے افسوس ہے کہ گویوں اور طوائف کے اس کو اختیار کر لینے سے حقیر سمجھا جانے لگا، اگر یہ اس کمال سے واقف نہ ہوں گے تو کل اہلِ فن کی قدر کرنا کیا جانیں گے۔ چنانچہ مہاراجہ کشن پرشاد نے نانا کی ان توجہات کے باعث ستار وغیرہ بجانے میں خوب مشق بہم پہنچائی، باجوں میں انھیں سب سے زیادہ روشن چوکی پسند تھی، اور اس کے بیحد دلدادہ تھے۔ اچھے اچھے منتخب بجانے والوں کو ڈیوڑھی پر ملازم رکھا تھا۔ اور اکثر و بیشتر اس کے بجنتری انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ ہمارے شہر کے اکثر لوگ اس باجہ سے ان کی دلچسپی کا حال خوب جانتے ہیں۔

(۵) فنونِ حرب میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے، بنوٹ نشان اندازی، شمشیر زنی، تیر افگنی میں دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ میر عظمت علی مندوزئی نے انھیں بنوٹ اور تیر اندازی سکھائی تھی، ایک دفعہ کا ذکر ہے جبکہ ان کے نانا راجہ نریندر بہادر زندہ تھے اور کبوتر اڑا رہے تھے، انھوں نے اپنے چہیتے نواسے کو حکم دیا کہ نشانہ لگاؤ، حکم کا ملنا ہی تھا کہ نشست سے تیر چھوٹا، اور ایک کبوتر کے پیوست ہو گیا، جو اڑتے اڑتے زمین پر گر پڑا، راجہ نریندر بہادر بیحد خوش ہوئے استاد میر عظمت علی خاں کو دوشالہ مرحمت کیا۔

شیر کا شکار پسندِ خاطر تھا، مگر تصوف کی چاشنی، اور علم و ادب کے شغف نے انھیں اس میں انہماک سے باز رکھا تھا۔

(۶) اپنے دور کے پختہ مشق شاعر، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی فرمائی۔ کلام کا بیشتر حصہ اردو زبان میں ہے،

جس میں، مثنوی، قصیدہ، مخمس، مسدس، غزل، وغیرہ سب ہی
شامل ہیں، حضرت آصف (غفراں مکان علیہ الرحمہ) سے
شرف تلمذ حاصل فرمایا تھا۔ ایک بلند درجہ انشا پرداز و مصنف
کی حیثیت سے بھی ان کو دنیا جانتی ہے۔ ان کے مکتوبات کا ایک
مجموعہ ان کی مدار المہامی کے دور میں چھپا تھا۔ جو اب بہت کمیاب
ہوگیا ہے جو اردو زبان کی ایک گراں قدر یادگار رہے گا۔
اس کے پڑھنے سے ان کے زور قلم، اور زور بیان کا اندازہ
ہوتا ہے، جس میں غالب کے طرز پر اپنا ایک اچھوتا ڈھنگ اختیار
کیا ہے۔ ان کی تصانیف بہت سے فنون پر حاوی ہیں، جو
تصوف، فلسفہ، تاریخ، ادب، اخلاق، ناول اور سفرنامے
وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

(۷) علم نجوم میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ڈیوڑھی کے
بہت سے ملازم جب کبھی انھیں کوئی لڑکا تولد ہوتا تو ایک درخواست
گزرانتے کہ سرکار فدوی زادہ کے لئے، ستاروں کے سعد و
نحس کو دیکھ کر کوئی نام تجویز فرمائیں۔ صرف حسب درخواست
نام ہی سرفراز نہیں ہوتا بلکہ درخواست گزار کے پاس اس کے
ساتھ عطار بھی پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی تاریخی نام بھی مرحمت ہوتے
تھے۔ ملازمین پر اس کا اثر اتنا ہوتا کہ ان کے دلوں سے
بے اختیار سچی دعائیں نکلتی تھیں۔

مہاراجہ کے اس فن میں اچھی مہارت سے متعلق
ایک ایسے واقعہ کا ذکر یہاں مناسب ہوگا، جو خود راقم الحروف
پر گزرا ہے۔

احقر کے والد بزرگوار (اللہ ان کی قبر کو نور سے منور
رکھے) کو مہاراجہ کی پیشی میں حاضری کا اختصاص حاصل
تھا، اوائل عمری کا زمانہ تھا۔ ایک دن میرے، ہم عمر احباب نے
مجھ سے تفریح پر چلنے کی فرمائش کی، اور بہت مجبور کیا طے
یہ پایا کہ فلاں دوست کے گاؤں چلیں گے، جو شہر سے کافی دور
تھا۔ اس وقت میرے لئے یہ دقت تھی کہ مجھے شہر سے باہر دور
دراز مقامات پر جانے کی اجازت نہ تھی، میں نے ساتھ چلنے سے
انکار کیا، اور اپنی مجبوری ظاہر کی، سید سجاد حیدر یلدرم نے
ایک مضمون میں جس کا عنوان ہی یہ ہے کہ "مجھے میرے دوستوں
سے بچاؤ" بالکل بجا لکھا ہے۔ اسی طرح میرے تمام عذرات
پیش نہ گئے، اور کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح ساتھ چلنا ہی پڑے
گا، اور تفریحاً "عثمان ساگر" جانے کے بہانے سے اجازت
حاصل کرلی جائے۔ حضرت والد ماجد قبلہ اس روز گھر پر موجود
نہ تھے، بلکہ مہاراجہ بہادر کی پیشی میں حاضر تھے، اسی لئے میں
نے والدہ صاحبہ سے اسی حیلہ کو پیش کرکے اجازت حاصل
کرلی، اور شام تک گھر لوٹ جانے کا یقین دلایا۔ غرض یہ کہ
رفقاء کی جماعت نکلی، بجائے عثمان ساگر کے اس گاؤں
کو پہنچی، جہاں چلنا پہلے ہی سے طے کرلیا گیا تھا۔ سارا دن
لطف و مسرت سے بسر کیا، چونکہ مجھ پر پابندیاں عائد
تھیں، جب شام کی تاریکی بڑھنے لگی، تو سب سے پہلے
میں نے لوٹ جانے کا تقاضا شروع کیا، کچھ اور ساتھی بھی اس پر
آمادہ ہوگئے، مگر خدا ان دوست کا بھلا کرے، جن کا یہ گاؤں تھا،
انھوں نے یہ ضد شروع کی، اور کہنے لگے کہ "بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے
آپ حضرات میرے پاس آئیں، اور یوں ہی لوٹ جائیں، دن بھر سب
تھک چکے ہیں، اس لئے شب یہیں بسر کیجئے، اور صبح ناشتہ کے بعد
نکلئے، میں نے سارا انتظام کرلیا ہے، میں کسی صورت سے آپ لوگوں کو
جانے نہ دوں گا"۔ یہ سنتے ہی میری پریشانی کی انتہا نہ رہی، جیسے جیسے
وقت گزرتا جاتا، میرا خوف بھی بڑھتا جاتا تھا۔ ایک طرف والدہ صاحبہ کے
انتظار اور ان کی پریشانی کا خیال تھا، تو دوسری طرف والد صاحب کا
خوف لگا تھا۔ میں تنہا کیا کرسکتا، جب کہ ساری جماعت بدل گئی ہو۔

چارہ و ناچار رہنا ہی پڑا۔ اور صبح ناشتے کے بعد ہم شہر لوٹنے کے لئے نکلے۔

چونکہ میں نے والدہ صاحبہ سے عثمان ساگر جانے اور سرِ مغرب لوٹنے کی اجازت لی تھی آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں کی بڑی بوڑھی عورتیں کسقدر وسوسہ والی ہوتی ہیں۔ اسلئے میرے واپس نہ ہونیسے انکی پریشانیوں کی کوئی حد نہ رہی۔ مجھے اسوقت تک تیرنا بھی نہ آتا تھا، وہ سمجھنے لگیں کہ یہ لوگ تالاب گئے تھے، خدا جانے کیا بات پیش آئی، جواب تک نہ لوٹے۔ جب صبح تک بھی میں گھر نہ پہنچا تو انتہائی اضطراب کے عالم میں انھوں نے والد صاحب قبلہ کے پاس یہ ماجرا لکھکر آدمی کو مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی دوڑایا۔ حضرت اسوقت پیشی میں حاضر تھے، چونکہ یہ چھٹی تشویشناک تھی، اسلئے وہیں پیشی میں ان کے پاس پہنچائی گئی، جسکو پڑھ کر وہ بھی سخت پریشان ہوئے، اور مہاراجہ بہادر سے عرضِ حال کر کے جانیکی اجازت مانگی۔ تو فرمایا کہ ٹھیریے۔ کاغذ اور پنسل طلب کیا، اور دائرہ و زائچہ بنایا۔ والد صاحب سے میرا نام دریافت کیا، اور میرے گھر سے نکلنے کا وقت اور دوسرے متعلقہ سوالات فرمائے، ان کے جوابات کے بعد نتیجہ استخراج کر کے فرمایا کہ آپکا لڑکا کسی پانی کے مقام پر نہیں گیا ہے، بلکہ وہ مشرقی رُخ کے کسی ایک دیہات کیطرف گیا ہے، اپنے احباب کیساتھ بخیر و عافیت ہے۔ آپکے یہاں سے اپنے گھر پہنچنے سے قبل ہی وہ لوٹ جائیگا۔ اطمینان سے جائیے کوئی فکر کی بات نہیں۔

حضرت والد ماجد قبلہ ڈیوڑھی سے نکل کر کوئی دن کے ½۱۱ بجے گھر تشریف لائے اور میں ان سے زیادہ سے زیادہ دس منٹ قبل گھر پہنچ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خفگی کا اظہار ہوا چونکہ مرحوم مشرقی طرز کے سخت پابند تھے اسلئے اس کے بعد مجھ پر وہ گزرا، جو لڑکپن کی حرکتوں کے سدباب کیلئے ضروری تھا۔

مہاراجہ بہادر کے ان سب کمالات کے سوا، ان کے حسنِ خلق، نیک دلی، اور ہر فرد و احد کے ساتھ (جب کبھی کہ وہ ان کے آستانہ پر پہنچتا) سچی ہمدردی، و دریا دلی نے خلائق کے دلوں میں گھر پیدا کر لیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بڑھیا درخواست لیکر حاضر ہوئی کہ سرکار میرا لڑکا فلاں محکمہ میں نوکر ہے، آپ وہاں اس کی سفارش فرمادیں۔ حاکم کا نام معلوم ہونیکے بعد فرمایا کہ افسوس ہے مجھ میں اور ان میں اتفاق سے آج کل صفائی نہیں، ورنہ میں تمھارے لڑکے کی ضرور سفارش کر دیتا۔ تو بڑھیا نے مایوس ہو کر پھر اصرار کیا تو وہی جواب مرحمت ہوا، اسپر اس نے یہ عرض کیا کہ سرکار اگر سفارش نہیں فرما سکتے تو کم از کم اپنے قلم مبارک سے اسی درخواست کو لکھدیں، میں وہاں کے افسر کو دیدونگی، اور میرا کام یقیناً بنجائیگا۔ مہاراجہ بہادر یہ عجیب و غریب فرمائش کو سنکر حیران ہو گئے، دریافت فرمایا کہ بڑی بی تمھیں کس نے یہ ترکیب بتائی، اسپر بڑھیا نے کہا کہ سرکار کسی نے مجھے یہ ترکیب نہیں بتائی، بلکہ میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں سرکار کے قلم مبارک سے اس درخواست کو لکھا لوں، اتنے بڑے آدمی کے خط کو دیکھکر افسر کیسے میرا کام نہیں نکالیگا۔ یہ ایسی فرمائش تھی، جو سو سفارشوں سے بڑھ کر تھی، نیک دل راجہ نے کاغذ طلب فرمایا، اور اس کے منشا کے مطابق درخواست صاف کر کے اسیوقت مرحمت فرمادی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارے صفات انکے تصوف سے لگاؤ کی بدولت درجۂ کمال پر پہنچ گئے تھے اور بڑے بڑے صوفیا کی خدمت کر کے انھوں نے اپنے میں یہ بات پیدا کی تھی۔ متعدد بزرگوں سے تصوف کی کتابیں بھی پڑھی تھیں چنانچہ مولوی حکیم مقصود علیخاں صاحب جالل ناظم سررشتہ طبابت یونانی کے والد بزرگوار مولنا حکیم منصور علیخاں صاحب (علیہ الرحمہ) سے حضرت شیخ اکبر کا ایک رسالہ وحدت الوجود پڑھا تھا۔ اور انکی کمال عزت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بیعت تھی اور انھوں نے مہاراجہ کو ۱۳۳۲ھ میں خماری شاہ کا لقب عطا کیا تھا۔ راقم الحروف کے والد کو جو انکے فیملی سرجن تھے اکثر تحریر کے ذریعہ اور کبھی زبانی حکم ہوتا کہ آپ فلاں صوفی صاحب کو دیکھ آئیں، اور مجھے اطلاع دیں کہ انکے حالات کیا ہیں، ذکر و شغل کیسا ہے اور وہ کس رنگ میں رہتے ہیں۔ ان معلومات کے بعد وہ اکثر راتوں میں بھیس بدلکر یا یوں ہی ان فقراء کے پاس پہنچتے اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ دن میں تشریف لیجاتے ہوئے تو بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے۔ ان کی وفات سے متعلق میں نے ایک مادۂ تاریخ لکھا ہے جو شاید بلا تکلف زبانوں پر آسانی سے چڑھ جائے، اس میں ہمزہ کا ایک عدد شریک ہے۔

آہ راجۂ راجایاں کشن پرشاد

۱۳۵۹ھ

معین الدین رہبر فاروقی

خوابِ بیداری

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں مغربی اور مشرقی تعلیم و تہذیب نے مل جل کر ایک بالکل جداگانہ طرز زندگی کی بنیاد قائم کر دی تھی۔ پردے کی بے جا بندشیں ختم ہو چکی تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم عام تھی۔ مخلوط پارٹیاں کوئی عجیب بات نہ سمجھی جاتی تھیں۔ موسیقی اور ساز نوازی کو پسند کیا جاتا تھا۔ بے جا تکلف اور غیر ضروری جھجک خلافِ تہذیب و شائستگی خیال کی جاتی تھی۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کو سراہا جاتا تھا۔ لباس میں زیادہ سے زیادہ سادگی و مناسبت اور اس کی قطع و برید میں ضرورت سے زیادہ نزاکت کو دخل ہو گیا تھا۔ چال ڈھال میں ایک بے پروا سبک خرامی پیدا ہو چکی تھی۔ گفتگو میں مذاق کے لطیف پہلو اور مذاق میں سنجیدگی کے ہلکے نقوش بار بار نمایاں ہو جاتے تھے۔ طبیعتوں پر مہربانی اور ہمدردی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ برتاؤ میں خوش مزاجی جھلکتی تھی۔ قوتِ فیصلہ نے بڑھ کر کردار کو ایک انفرادی شان بخش دی تھی۔ اور اس مثالی ماحول کی مکمل تخلیق نوعمر اور خوبصورت فرزانہ تھی، جو اپنی کشتیٔ حیات میں تنہا بیٹھی موجوں سے کھیل رہی تھی۔ جو جذبہ اس کی تمام دوسری خصوصیات پر حاوی تھا وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسرت کے خزانوں پر کامل قبضہ کر لینے کا پُرجوش جذبہ تھا۔

آج اس کی بیسویں سالگرہ کا خوش آئند دن تھا۔ وہ صبح سے مسرتوں کی فراوانیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شام ہوئی تو اس کی ڈاک اس کے لئے بہت سارے دعائیے اور مسرت بخش خطوط لائی۔ اور اس وقت وہ اپنے خط پڑھنے کے بعد لباس خانے میں کھڑی اپنے طویل اور سنہرے بالوں کی آرائش میں مصروف تھی۔ اس کا سارا دن نت نئے رنگین اور خوش گوار مشاغل میں گزر گیا تھا اور اب کہ رات قریب تھی اپنے دوست احباب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ طمانیت کے دیرپا اثر سے اس کے گال تمتما رہے تھے اور آنے والی مسرتوں کا احساس اس کی آنکھوں میں شرارے بن کر تیر رہا تھا۔ اس کے حساس ہونٹوں پر ایک بے جانی بوجھی مسکراہٹ اپنا پرتو ڈال رہی تھی۔

جب وہ دیوان خانے میں پہنچی تو بہت سارے مہمان جمع ہو چکے تھے۔ جیسے ہوائیں درخت کے پتوں کو یکساں چھوتی ہوئی گزرتی ہیں، اسی طرح وہ ہر ایک سے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتی ملاتی اپنی عزیز سہیلیوں میں جا بیٹھی۔ ہر شخص نے اپنی جگہ یہی سمجھا کہ فرزانہ کو صرف اسی سے مل کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مغالطہ آمیز برتاؤ کا یکساں جادو تہذیب جدید کا وہ کارنامہ ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

کمرے میں ہر طرف غیر اہم لیکن دل خوش کن گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا۔

"فرزانہ کا اصرار ہے" شیلا نے کہا "کہ آج ایسے خوش گوار موقع پر کسی دلچسپ پکچر کا آخری شو ضرور دیکھ ڈالا جائے"۔ اور یہ کہہ کر شیلا نے مسکرا کر فرزانہ کی طرف دیکھا۔ ظاہر تھا کہ یہ تجویز فرزانہ کی نہ تھی۔

"یہ ایک نہایت ہی شاندار خیال ہے" ایک گورے چٹے لیکن ضرورت سے زیادہ دبلے پتلے نوجوان نے زور دے کر کہا۔ فرزانہ کا ابن عم شمیم بول اٹھا "آج کل ایک پکچر (Idiots' delight) چل رہا ہے۔ میرے خیال میں اس خاص موقعہ کے لئے وہ بہت زیادہ موزوں ثابت ہوگا"۔ سب مسکرا دئے۔ فرزانہ بھی مسکرائی پھر ایک دم مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس نے کہا "مگر بھائی جان آپ کو ہر ایک کی پسند کا خیال رکھنا چاہئے۔ آپ لوگ تو خیر ظاہر ہے کہ اس پکچر سے فطرتاً خوب لطف اندوز ہوں گے

لیکن ہیں اور شیلا کیا کریں گے ؟" اس سوال پر مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

کسی نے رفعت (فرزانہ کی ہم جماعت) سے کہا "کیوں رفعت یہ پوچارم تو بڑا اچھا مقام معلوم ہوتا ہے۔ چند ہی دنوں میں تمھاری صحت نکھر گئی ہے۔ آخر وہ ہے کدھر ؟

اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی کہ "سروقد کھڑے ہو جاؤ سمیع بھائی تشریف لا رہے ہیں۔" فرزانہ نے سب کے ساتھ مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف نظر ڈالی۔ دیکھا کہ واقعی سمیع بھائی اپنے خاص انداز میں بڑھے چلے آ رہے تھے۔

ان کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ اللہ میاں نے جب تمام آدمیوں کو بنا ڈالا تو ان کے پاس کچھ مٹی بچ رہی۔ مٹی کی مقدار اتنی تھی کہ اگر اس سے دو آدمی بنائے جاتے تو عام سائز سے ذرا کم ہو جاتے تھے چنانچہ اللہ میاں نے سوچا کہ لاؤ اس کا ایک ہی آدمی بنا ڈالوں بیٹھے بٹھائے لوگوں کو میری قدرت کا نمونہ بھی نظر آ جائے گا اور یہ مٹی بھی ٹھکانے لگ جائے گی۔ یہ سوچ کر اس مٹی سے اللہ میاں نے سمیع بھائی کی تخلیق کا کام شروع کر دیا۔ جب سمیع بھائی بن کر تیار ہو گئے تو اللہ میاں نے انھیں ٹھوک بجا کر زمین پر چھوڑ دیا۔ اس وقت سے سمیع بھائی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ایک مدرسے میں لڑکوں کو موسم، جگہ اور زمین کی خصوصیات سمجھایا کرتے ہیں یعنی جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ایک شور مخشر نے ان کا استقبال کیا۔ رفعت کو موقعہ ہاتھ آیا کہنے لگی "لیجئے اب تو ہمارے سمیع بھائی تشریف لے آئے۔ ان سے دریافت کر لیجئے کہ پوچارم حیدرآباد میں کس طرف واقع ہوا ہے۔" سمیع بھائی کو خیال ہوا کہ مذاق کرنے کا یہ بہترین موقع ہے، بولے "حیدرآباد کے جغرافیہ سے آپ اس قدر ناواقفیت کیوں ظاہر کر رہی ہیں۔ آپ کو تو اسے یاد کئے ہوئے کچھ زیادہ دن نہ گزرے ہوں گے، آپ ہی بتا دیجئے۔"

رفعت بولی "بتانے کو تو خیر میں بتا دوں گی مگر میں نے خیال کیا کہ آپ بھی ضرور حیدرآباد کے جغرافیہ سے واقف ہوں گے، میری غلط فہمی کو معاف فرمائیے گا۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا اور سمیع بھائی کچھ مسکرانے اور ہنسنے کی کوشش کرتے کرتے بری طرح شرما گئے۔ کسی نے کہا "سمیع بھائی سنا ہے کہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آپ بمبئی جانے والے ہیں۔ پانی کی تو وہاں کمی ہو گی نہیں۔" ایک دوسری آواز آئی "سمیع بھائی کو تمھاری طرح کوئی گھڑوں پانی کی ضرورت تھوڑی ہے انھیں تو چلو بھر ہی کافی ہو جائے گا۔ کیوں سمیع بھائی" سب بظاہر سنجیدگی کے ساتھ سمیع بھائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سمیع بھائی بولے "بھئی تم لوگوں کی زبان خوب چلتی ہے۔ اب میں کیا کہوں" فرزانہ کا بھائی ریاض بول اٹھا "جانے بھی دیجئے سمیع بھائی۔ یہ لوگ بڑے نامعقول ہیں۔ اپنے کو بڑا ہمہ دان سمجھتے ہیں حالانکہ میں کہتا ہوں کہ اگر گدھوں کے کان کاٹ کر انھیں سوٹ پہنا دیا جائے تو ان لوگوں میں اور آپ میں مطلق کوئی فرق نہ کر سکے۔" سب لوگ پھر ہنسنے لگے اور سمیع بھائی کو خیال گزرا کہ ان کی مفروضہ بزرگی اور برتری معرض خطر میں ہے اس لئے انھوں نے پہلو بدل کر کسی قدر برا مانتے ہوئے کہا "بس اب ختم کرو۔ ذرا تم لوگوں کو موقعہ دیا کہ چل نکلتے ہو۔ اسی لئے میں کسی کو منہ نہیں لگاتا۔" شمیم بولا "آپ سب حضرات کو سمیع بھائی کی بات پر کامل یقین ہونا چاہئے یہ واقعہ ہے کہ وہ کسی شخص کو کیا کسی چیز کو بھی منہ نہیں لگاتے۔ لیکن کھانے کی میز پر وہ اپنا یہ اصول بڑی شد و مد سے تبدیل کر دیتے ہیں اور یہ کہنا کہ وہ کھانے کی میز کے علاوہ بھی کہیں اپنا اصول بدلتے ہوں گے سمیع بھائی پر بہتان لگانا ہے۔" سمیع بھائی آمادۂ فساد نظر آنے لگے اس وقت ایک خدمتگار نے ایک لفافہ لا کر ریاض کو دیا۔ پڑھنے کے بعد ریاض نے تحریر فرزانہ کو دے دی۔ یہ ریاض کے ایک پرانے دوست ممتاز کی تحریر تھی۔

ڈیر ریاض :-

نہیں بتا سکتا کہ مجھے آج بہن فرزانہ کی سال گرہ میں
شریک نہ ہوسکنے کا کس قدر سخت افسوس ہے۔ بات دراصل
یہ ہے کہ میرا دوست سلیمان آج ہی دہلی سے آیا ہے اور میں
اسے چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ تم کہوگے کہ میں اسے ساتھ لا سکتا
ہوں؟ درست ہے۔ مگر وہ بھی تو چلنے پر آمادہ ہو۔ حضرت نے
عجیب دماغ پایا ہے۔ تم تو غالباً انھیں کسی قدر جانتے ہو؟
خیر۔ بہن فرزانہ کو میری طرف سے بہت بہت سلام اور
مبارک باد پہونچا دینا اور نہ آسکنے کے لئے معذرت کر دینا۔
یہ نہ سمجھنا کہ میں ان کی اور تمھاری مسرتوں میں شریک نہیں
ہوں۔ تمھارا

ممتاز

فرزانہ یہ تحریر پڑھ کر چند لمحوں کے لئے خاموش رہ گئی۔ اس نے سوچا
یہ سلیمان صاحب بھی عجیب آدمی ہے۔ نہ جانے انھیں اور کیا دلچسپ
مصروفیتیں ہیں۔ اور لوگ تو ہمارے تعارف کو باعثِ فخر خیال کرتے
ہیں۔ ان سے اصرار بھی کیا گیا تو یہاں آنے پر آمادہ نہ ہوئے، خوب
مگر وہ ہمیں جانتے بھی تو نہیں ہیں۔ نئے آدمی ہیں۔ فرزانہ نے
خط اپنے بھائی کو واپس دے دیا اور پھر گفتگو کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔
اتنے میں فرزانہ کے والدین کمرے میں داخل ہوئے۔ سب خاموش
ہوگئے اور اٹھ کر استقبال کیا۔ فرزانہ کے والدین کمرے میں داخل
ہوئے۔ سب خاموش ہوگئے اور اٹھ کر استقبال کیا۔ فرزانہ کے
والدین بے حد خوش نظر آرہے تھے اور بڑے تپاک سے مہمانوں سے ملے

کھانے کے بعد مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔
سب کے آخر میں نیلا نے اجازت چاہی۔ اور عین اس وقت جب کہ
فرزانہ اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آرہی تھی۔ ایک موٹر مکان کے
احاطے میں داخل ہوا اور اس کے سامنے ہی آکر ٹھیر گیا۔

ممتاز ہنستا ہوا موٹر سے اترا۔ "ہلو۔ فرزانہ بہن"۔ اس نے کہا
ادھر سے جاتے جاتے میں نے ضروری سمجھا کہ چند منٹ ٹھیر کر آپ کی
مسرتوں میں شرکت کا حق پیدا کروں۔ امید کہ بہت کامیاب اور
پرلطف پارٹی رہی ہوگی"۔ فرزانہ نے مسکرا کر اس کا اقرار کیا پھر وہ
ممتاز کو اپنے بھائی کے پاس اندر لے گئی۔ جاتے جاتے اس نے
دیکھا کہ ممتاز کی موٹر میں کوئی اور شخص بھی تھا جو اندر کی سیٹ
پر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ نہ تو وہ ان لوگوں کی طرف دیکھ
رہا تھا اور نہ ہی ان کی باتیں سنتا معلوم ہوتا تھا روشنی کی کمی
کی وجہ سے وہ صاف طور پر نہ دیکھ سکی کہ وہ کون تھا۔

ریاض سے ممتاز نے کہا "بھئی سلیمان بھی ساتھ آیا ہے۔
دراصل ہم لوگ اس طرف سے گزر رہے تھے اور بڑے اصرار سے
میں نے سلیمان سے یہ اجازت لی ہے کہ کھڑے کھڑے تم لوگوں سے
مل لوں۔ وہ خود اترنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا۔ عجیب شخص ہے"۔
ریاض نے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ چلو وہ نہیں اترتے تو میں
ہی ان سے مل لوں"۔ ریاض اور ممتاز باہر چلے گئے۔ فرزانہ کمرے
میں تنہا رہ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جا کر سلیمان سے ملے۔
دیکھو وہ کیسا آدمی ہے۔ لیکن وہ نہیں گئی۔ اسے اچھا نہ معلوم
ہوا کہ سلیمان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ بہت ہی متجسس اور بے باک
لڑکی ہے۔ اس نے سوچا یہ سلیمان کوئی بہت ہی شرمیلا سا نوجوان
ہوگا۔ جب ہی وہ مجھ سے ملنے ہچکچاتا ہے۔ خیر ہوگا۔ مجھے اس سے کیا
فرزانہ سونے کے لئے چلی گئی۔ سونے سے پہلے وہ پھر سوچنے لگی "میں بھی
کس قدر بے خوف ہوں۔ بھائی جان تو کہہ رہے تھے کہ ممتاز صاحب
کے دوست کئی سال تک انگلینڈ وغیرہ میں بغرض تعلیم قیام کر چکے
ہیں۔ بھلا وہ مجھ سے ملتے ہوئے ہچکچانے اور شرمانے کیوں لگے ــــ
شاید وہ کوئی مغرور آدمی ہیں اور جب تک ان سے خاص مراسم
نہ ہوں کسی سے ملنا پسند نہ کرتے ہوں۔ کچھ ہوگا۔ وہ نہیں ملنا چاہتے

تو کیا ہم ان سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے فرزانہ سو گئی۔

ایک مرتبہ فرزانہ اپنے بھائی کے ساتھ شہر کے باہر ایک پرفضا مقام پر تفریح کی غرض سے گئی ہوئی تھی۔ وہیں شام کے وقت اتفاق سے ممتاز اور سلیمان بھی پہونچ گئے۔ ریاض نے بڑھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ممتاز نے فرزانہ اور سلیمان کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ سلیمان نے مسکراتے ہوئے اس تعارف کو قبول کیا۔

سلیمان ایک خوبصورت شخص تھا صرف اس لئے نہیں کہ اس کا رنگ بہت گورا اور اس کا ناک نقشہ نہایت سجل اور موزوں تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ایک پراثر شخصیت کا کا مالک تھا۔ وہ ایک مضبوط، تندرست، طویل القامت اور شاندار نوجوان تھا، اور اس کی آواز میں ایک دلفریب بلندی و عظمت پائی جاتی تھی۔ فرزانہ نے حسب عادت بے باکی سے ہنستے ہوئے سلیمان سے باتیں کیں۔ مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلیمان فطرتاً سنجیدہ مزاج ہے اور کسی موقعہ پر بھی اپنی فطرت کو بہت زیادہ تبدیل کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت زیادہ ہنسی کی بات پر بھی صرف مسکرا دیتا تھا۔ تاہم جب وہ ایک دوسرے سے علحدہ ہوتے تو دوست کیسے جاسکتے تھے۔ فرزانہ نے ممتاز سے کہا " ممتاز صاحب کل شام کی چائے پر ہم آپ کا انتظار کریں گے اور سنئے اگر سلیمان صاحب ہمارے ہاں اترنا پسند نہ کریں تو کوئی بات نہیں میں ان کی چائے موٹر تک پہونچادوں گی۔ کیوں سلیمان صاحب آپ کو اس انتظام میں کچھ خرابی تو نظر نہیں آتی۔ ؟" سلیمان مسکرانے لگا۔ اس نے کہا " آپ کی نوازش ہے۔ سنا کرتا تھا کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں آیا کرتا۔ مگر بیسویں صدی ہے۔ بہت سے اصول تبدیل ہوچکے ہیں اور آئے دن ہو رہے ہیں۔

تعجب کی گنجائش ہی کیا ہے۔" فرزانہ اس مذاق پر غیر معمولی طور پر شرما گئی۔

سلیمان کبھی کبھی آجایا کرتا تھا۔ اور جب کبھی آتا تھا کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہہ دیتا تھا کہ فرزانہ اس کا کوئی مناسب جواب نہ دے پاتی تھی۔ سلیمان اس کے بے پروا قہقہوں کو سنجیدہ مسکراہٹوں میں تبدیل کردیتا تھا۔ فرزانہ کی سمجھ بوجھ حیران تھی۔ اس کا دل و دماغ ہچکولے لے رہا تھا۔ اور اس کی روح ناقابلِ قیاس رفعتوں پر پرواز کر رہی تھی۔

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ سلیمان کئی روز سے نہ آیا تھا۔ فرزانہ عجیب بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا یہ بارش کا موسم بھی عجیب فضول موسم ہوتا ہے۔ دن میں برس لے تو کچھ ہرج نہیں۔ یہ کم بخت پانی شام میں کیوں برستا ہے۔ کچھ نہیں تو انسان کا دل چاہتا ہی ہے کہ باغ میں گشت لگائے۔ اب کوئی تنہا اس اداس کمرے میں کب تک بیٹھا رہے، پھر وہ اپنے کمرے میں چلی۔ اور وہاں اپنے دریچے کے سامنے رات گئے تک طرح طرح کے تصورات میں کھوئی ہوئی خاموش بیٹھی رہی۔

فرزانہ تیزی سے دوڑی چلی جارہی تھی کسی نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر اسے روک لیا۔ فرزانہ اپنی کشتی آپ چلا رہی تھی۔ کسی نے اس کے ہاتھ سے چپو چھین لیا۔ اور عجیب بات تو یہ تھی کہ اسے اپنی آزادی کے چھن جانے کا مطلق غم نہ تھا۔ اپنی خود مختاریوں کے ختم ہوجانے کی ذرہ برابر پروا نہ تھی۔ وہ اپنی گرفتاری اور مجبوری ہی میں مسرت تلاش کر رہی تھی۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد جب اس نے اپنے آس پاس نظر ڈالی تو مسرت اور سکون اس کے پاس سے پرواز کرچکے تھے اور ایک دل دکھا دینے والا اندوہ اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

فرزانہ بہت کچھ بدل گئی تھی۔ یوں دیکھنے میں کچھ نہیں بدلا تھا۔ نہ ماحول، نہ زمانہ، نہ حالات۔ دوست احباب بھی تھے۔ کالج کی مصروفیتیں اور سہیلیوں کی خوش گپیاں بھی تھیں۔ دعوتیں بھی تھیں۔ تفریحی مشاغل سے بھی دل بہلایا جاتا تھا۔ خود فرزانہ ہنستی بھی تھی مذاق بھی کرتی تھی۔ بہت کم خاموش نظر آتی تھی۔ دیکھنے والوں کو اس میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ مگر دراصل فرزانہ بدل گئی تھی۔ وہ جانتی تھی اور اس کی تنہائیاں جانتی تھیں کہ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ ایک رات وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی۔ زندگی بھی کیسے کیسے دھوکے دیتی ہے بہت دن نہیں ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیات اور مسرت کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ مجھے خوشی اور طمانیت کا کبھی انتظار ہی نہ کرنا پڑتا تھا۔ ہر وقت یہ چیزیں میرے اندر موجود رہتی تھیں۔ میری دنیا کس قدر وسیع تھی۔ زمین سے لے کر آسمان تک مجھے اپنی حکومت نظر آتی تھی۔ آسمان کے اس طرف بھی میرا ہی سکہ چلتا تھا۔ کم از کم مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اب مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے بہت کم باتوں سے خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ہوتی ہی نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ مجھ میں کتنا تغیر ہو گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے عمل پر قادر ہوں۔ سب پر ظاہر کر سکتی ہوں کہ میں ویسی ہی ہوں جیسی پہلے تھی۔ انھیں کچھ پتہ نہ چلے کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ ان آئے دن کے ہنگامہ آفریں جلسوں سے میں کس قدر تنگ ہوں، پر تکلف دعوتوں کی شرکت سے میں گھبراتی ہوں۔ کسی تفریحی مشغلے میں میرا جی نہیں لگتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بالکل سطحی اور فضول چیزیں ہیں۔ زندگی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ بہت ہی اہم اور بہت ہی مقدس۔ اب تک میں نے اس کے متعلق سوچا تک نہ تھا اب سوچتی ہوں تو میری تمام دوسری مصروفیتیں میرا مذاق اڑاتی معلوم ہوتی ہیں۔ مسرتوں کے گرداب میں پھنس کر میں بھول گئی تھی کہ زندگی کی تعمیر محبت سے ہوئی ہے اور محبت کے فرائض میں ہنسنا، رونا اور سوچنا سب ہی شامل ہے۔ بھائی جان تک کو معلوم نہیں۔ امی جان کو بھی خبر نہیں۔

البتہ مجھے معلوم ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جب سلیمان آجاتا ہے تو میری مصنوعی مسکراہٹوں میں حقیقت کی جھلک کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ سلیمان کو بھی پتہ نہیں۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک نہایت ہی خوش گفتار، خوش مزاج اور خوش پوش لڑکی ہوں۔ سوچتا ہو گا کہ تہذیب جدید کی ہر ادا اور ہر انداز پر میں بری طرح مفتوں ہوں۔ میرے اندر میرا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے بس طنزیہ باتیں کرنا اور میرا دل دکھانا آتا ہے۔ میرے ساتھ اسے ذرا سی ہمدردی تک نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جس پر میرا دل گھنٹوں اداس رہتا ہے۔ وہ میری اصلیت سے ناواقف ہے۔ وہ اکثر اشارتاً مثالی لڑکیوں کے متعلق اپنی رائے دے چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے شریر اور بے باک لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ تو میں کیا کروں۔ سلیمان کو میری پروا ہوتی تو بتاتی کہ میں دراصل وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتا ہے۔ اب اگر میں ایک دم سے اپنے طور طریقوں کی بے باکیوں کو کم کر دوں تو کیا ہو گا سلیمان یہی خیال کرے گا کہ میں نے اسی کی خاطر یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کبھی نہ سمجھ سکے گا کہ میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ پھر جب وہ مجھے نہیں چاہتا تو میں کیوں ظاہر کروں کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ یہ تو میرا راز ہے۔ اس اظہار سے سوائے اس کے کہ میں اپنے آپ کو گرا دوں اور کیا مل جائے گا۔ سلیمان بڑا مغرور اور خود پسند ہے۔ میری روح اور میرا دل مغرور نہیں ہے تو کیا ہوا، تعلیم اور تربیت نے مجھے استغنا اور بے نیازی سکھائی ہے۔ محبت اور چاہت نے مجھے وقار اور سر بلندی کا سبق پڑھایا ہے۔ محبت کچھ مجبوری کا سودا تو ہے نہیں۔ وہ تو آزادی اور خود مختاری کی فضاؤں میں سانس لیتی ہے۔ اگر سلیمان کو معلوم ہو جائے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تو کیا وہ مجھ سے محبت کرنے لگا؟ محبت کچھ کرنے سے تھوڑی ہوتی ہے۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہو سکتی تھی تو اب تک ضرور ہو چکی ہوتی۔ یہ سوچتے سوچتے فرزانہ کے آنسو بہنے لگے۔ تنہا محبت کرنا بھی کس قدر دشوار ہے نہ کوئی امید نہ

کوئی صلہ ۔ کہتے ہیں کہ حقیقی محبت صرف وہی ہوتی ہے جس میں صلہ کا خیال نہ ہو۔ مگر مجھے سلیمان سے کچھ عشق حقیقی تو ہے نہیں ۔ میں اسے چاہتی اس لئے ہوں کہ اس کے خیالات اور تصورات مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اس کی شخصیت مجھے لبھاتی ہے، اس کی آواز مجھے دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتیں میرے دل میں اتر جاتی ہیں۔ اس کی نگاہیں میرے قلب کے پار ہو جاتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت میرے ساتھ رہے۔ وہ اپنے ہر ارادے اور ہر خواہش میں مجھے اپنا شریک بنائے۔ کبھی میں اس سے علٰحدہ نہ ہوں۔ اس کا فائدہ میرا فائدہ ہو جائے اور میرا نقصان اسے اپنا معلوم ہو۔ مختصر یہ کہ میں جو کچھ چاہتی ہوں اس میں خوش گفتار ادیبوں اور شعلہ بیان شاعروں کے دور از کار اقوال کا دور دور تک پتہ نہیں ہے ۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں صرف اسی وقت خوش ہو سکتی ہوں کہ وہ میرا اور میں اس کی ہو جاؤں اور جتنی محبتیں میں اسے دوں اتنی ہی مجھے واپس بھی ملیں۔ یہ نہیں ہو سکتا اس لئے یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اپنا رویہ بدل دوں۔ میری نسوانیت کے بھی تو آخر مجھ پر کچھ حقوق ہیں۔ میں اپنی خودداری اور وقار سے کیسے بے پروا ہو جاؤں میری قسمت میں تاریکی ہے تو یونہی سہی۔ میری دنیا مجھ پر تنگ ہو رہی ہے تو ہوا کرے۔ ان تاریکیوں اور تنگیوں پر ماتم کرنے کی تھوڑی سی فرصتیں تو کم از کم میری اپنی ہیں۔ شاید وہ وقت بھی آئے کہ میرا دکھ حد سے گزر جانے پر میرے لئے دوا ہو جائے ابھی تو میرے پاس رونے کے لئے آنکھیں اور دل دونوں موجود ہیں۔" فرزانہ کے رخسار جو خشک ہو گئے تھے پھر بھیگ گئے۔

عجیب دلفریب موسم تھا۔ بارش ہو چکی تھی اور اب مطلع بالکل صاف تھا۔ شام کا وقت تھا اور فرزانہ دیوان خانے میں ایک دریچے کے سامنے کھڑی باغ کے سرسبز درختوں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ اور غیر معمولی طور پر خیالات میں غرق تھی ریاض اپنے والد کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ آج کوئی ملاقاتی بھی دیوان خانے میں نظر نہ آتا تھا۔ فرزانہ تنہا کھڑی ہوئی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

"ہلو مس فرزانہ ۔ آج آپ بہت خاموش ہیں آخر بات کیا ہے؟" سلیمان نے غیر متوقع طور پر خاموشی سے داخل ہوتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دوستوں نے آج آپ کے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے۔ دیکھئے تو آپ کا دیوان خانہ کس قدر خالی پڑا ہے" اور یہ کہتے کہتے سلیمان عجیب طرح سے مسکرایا۔ فرزانہ نے اپنے غمگین تصورات کو جھٹک کر علٰحدہ کر دیا۔ بولی "ہاں دیکھئے تو ایسے لطیف موسم میں سب کے سب مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ تشریف رکھئے۔ کہئے مزاج تو اچھا ہے؟"

"بالکل ۔ شکریہ ۔" سلیمان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرزانہ دریچے ہی میں بیٹھ گئی۔ سلیمان نے کہا "کہئے آپ کی آئندہ دعوت کی فہرست میں میرا نام بھی ہے کہ نہیں ۔ ریاض کہہ رہے تھے کہ آپ موسم بہار کی آمد کے سلسلے میں ایک جشن ترتیب دے رہی ہیں۔"

"جی ہاں ۔ اور آپ کا نام کیسے نہ ہوگا۔ آپ ضرور آئیے گا کہیں پچھلی دفعہ کی طرح عین وقت پر باہر نہ چلے جائیے گا۔" سلیمان پھر مسکرانے لگا "نہیں انشاء اللہ اب کے ایسی غلطی نہ ہوگی۔ سوچتا ہوں تو یہ مجھے اپنی کمل بدقسمتی معلوم ہوتی ہے کہ میں نے ایک ایسی دعوت کا لطف کھو دیا۔ سنا ہے آپ نے اپنی خبریں آواز سے لوگوں کو بہت محظوظ کیا۔ ممتاز بے انتہا تعریف کر رہے تھے۔ مجھے اب تک نہیں معلوم تھا کہ آپ کو فن موسیقی سے بھی اس قدر لگاؤ ہے۔" فرزانہ نے محسوس کیا کہ سلیمان کے لہجے میں ایک چھپا ہوا طنز ہے۔ اس نے اس سے پہلے بھی اکثر اس کو محسوس کیا تھا لیکن اس نے کبھی

جواب دینے کی کوشش نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ سلیمان پر کبھی یہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی گفتگو کی اصلی روح کو سمجھ گئی ہے۔ لیکن آج وہ بے اختیار ہو گئی۔ اس نے کہا "فن موسیقی سے مجھے جیسا کچھ لگاؤ ہے اس کا تو خیر آپ کو کسی آئندہ موقعہ پر اندازہ ہو ہی جائے گا۔ رہ گیا یہ کہ میری شیریں آواز سے لوگوں نے بہت لطف اٹھایا تو ممکن ہے یہ بھی درست ہو۔ لوگوں کو خوش کرنا جتنا آپ سمجھتے ہیں اس سے بہت زیادہ آسان ہے۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے لہجے سے طعن آمیز سنجیدگی کے عنصر کو دور نہ کرسکی۔

"تو آپ کا خیال ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے معاملے میں میں بہت سست رفتار ہوں؟" سلیمان نے ہنستے ہوئے کہا "آپ بڑی ذہین ہیں۔ یعنی اگر آپ مجھے نہ بتاتیں تو مجھے اپنی فطرت کا یہ راز ایک طویل عرصے تک نہ معلوم ہوتا۔" فرزانہ کو غصہ آرہا تھا کہ آخر اس نے ایسی بات کیوں کہہ دی کہ سلیمان کو اپنی شخصیت سے بحث کرنے کا موقع مل گیا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے سلیمان نے کہا۔ "یہ تو بڑی بری بات ہوئی کہ آپ کو میری کمزوریوں کا پتہ لگ گیا اب تو میرے لئے آپ کو خوش کرنا اور بھی دشوار ہو جائے گا۔" اس آخری فقرے پر فرزانہ کا چہرا سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"تو کیا ہوا۔ میری طرح آپ بھی ایک ساتھ بہت سارے دلوں کو خوش کیا کیجئے۔ بہت دنوں کے تجربے کے بعد میں نے یہ بات معلوم کی ہے کہ یہ کام نسبتاً...... زیادہ آسان ہے۔"

فرزانہ نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کی آواز اس قدر خشک تھی کہ بعد میں اسے افسوس ہونے لگا۔ پھر جب کچھ دیر تک اس نے اپنی بات کا کوئی جواب نہ پایا تو نظر اٹھا کر سلیمان کی طرف دیکھا سلیمان اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرزانہ کا چہرا ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے وہ پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کے چہرے پر اس کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ کے بجائے ایک سنجیدہ تعمق چھایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک والہانہ جوش چمک رہا تھا۔ فرزانہ چونک پڑی۔ گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس نے کہا "چائے کا وقت ہو گیا ہے میں آپ کے لئے چائے لے آؤں۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھی کہ سلیمان نے اپنی باعظمت اور پر وقار آواز میں اسے مخاطب کیا "فرزانہ۔ ٹھیرو۔ ابھی نہ جاؤ۔" فرزانہ رک گئی۔ لیکن اس نے نہ کچھ کہا اور نہ سلیمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بالکل خاموش کھڑی دریچے سے باہر باغ کو دیکھتی رہی پھر اس نے محسوس کیا کہ سلیمان اس کے قریب ہی کھڑا ہے۔ "فرزانہ" سلیمان نے کہا اور اس کی آواز میں بڑا گداز اور بڑی مٹھاس تھی۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ اس جشن کا خیال ترک کر دو تو تم کیا کرو گی؟" دھیمی آواز میں فرزانہ نے کہا "میں آپ سے پوچھوں گی کہ آخر میں ایسا کیوں کروں؟"

"اور اگر میں تم سے التجا کروں کہ تم میری خاطر جشن کا خیال چھوڑ دو اس وقت تم کیا کرو گی؟"

"میں پوچھوں گی کہ آپ مجھ سے کیوں التجا کرتے ہیں؟"

"تو میں کہوں گا۔ اس لئے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں' پھر تم کیا کرو گی؟"

ایک طویل وقفے تک کوئی جواب سنائی نہیں دیا پھر طوفانِ مسرت میں کانپتی ہوئی ایک شیریں آواز بلند ہوئی۔

"پھر آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔"

رابعہ اکبر حسن

غزل

دل دیا دل کو غمِ عشق سے آباد کیا
تم سمجھتے ہو کہ تم نے مجھے برباد کیا

مہرباں! حسنِ نوازش نہ سہی جور سہی
کچھ تو ہو جس سے میں سمجھوں کہ مجھے یاد کیا

آج ہے محویتِ شوق کا عالم کچھ اور
جانے کیا شمع نے پروانے سے ارشاد کیا

دل بہلنے کے ہوئے دہر میں سامان بہت
میں نے ہر رنگ میں اے درد تجھے یاد کیا

کچھ اِس انداز سے اس شوخ نے انگڑائی لی
میں یہ سمجھا کہ مری روح کو آزاد کیا

ہر گھڑی دل میں رہا جس کا تصور کاوش
مری تقدیر کہ اس نے نہ مجھے یاد کیا

کاوش

یاسمن

آج ڈیڑھ سال بعد ــــ خواب گاہ کی کھڑکی کے نیچے یاسمن میں آج کلیاں پھوٹی تھیں۔ ہر روز صبح حسینہ ــ یادِ محبوب میں آنسوؤں کے چند قطرے یاسمن پر ٹپکا دیتی۔ اور ــــ ہر روز یاسمن کی محبت حسینہ سے بڑھتی ہی جاتی ــــ ناکام محبت وہ کلی سے پھول میں تبدیل ہو گئی ــــ نارسا محبت ــــ لیکن حسینہ نے نہ کبھی اپنی نازک انگلیوں سے اسے چھوا اور نہ ہی ایک پھول توڑ کر اپنے سینے پر آویزاں کیا ــــ آخر کار ــــ ایک دن مالی نے اپنے سخت ہاتھوں سے اسے توڑ لیا۔ وہ بازار میں جا کر نیلام ہوئی۔ عطار نے اس کی روح کشید کی ــ شاعر نے کہا "میں محبوب کی مشام جان تک پہنچنا چاہتا ہوں" عطار نے کہا "روح یاسمن سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں ــــ" شاعر نے کہا "میں محبوب کی شفاف جلد میں خوشبو بن کر سما جانا چاہتا ہوں ــــ" عطار نے کہا "روح یاسمن سے عمدہ کوئی خوشبو نہیں۔" شاعر نے کہا "میں محبوب کو بالکل مدہوش بنا دینا چاہتا ہوں۔" عطار نے کہا "روح یاسمن سے زیادہ کوئی مدہوش کن نہیں۔" عشق کارگر ہوا ــ یاسمن کی روح زندگی ایک خوبصورت اور نازک شیشے کے ملبوس میں حسینہ کے سنگھار میز پر جا پہنچی ــ مشام جان تک پہنچنے کے لئے۔ ضم ہو جانے کے لئے ــــ مدہوش کرنے کے لئے ــ اور ایک شام ــــ حسینہ نے خوشبوئے محبت سے بے تاب ہو کر کہا "میں تجھ سے محبت کرتی ہوں" یاسمن کی روح کھل کھلا کر ہوا میں بکھر گئی ــ پپیہے نے کہا ــ پیہو ــ پیہو ــــ

(ماخوذ)

شمیم

تصنیف و تالیف

پیشے کے مفہوم میں عام طور پر ایسے تمام مشاغل داخل کئے جاتے ہیں جو انسان سوچ سمجھ کر اپنی فطری مناسبت کے لحاظ سے عمر بھر کے لئے اختیار کرتا ہے ۔ اور اس سے اس کا مقصد اپنی بسر اوقات کے لئے معاش پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ پیشے میں یہ دوسرا جز اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کو خارج کر دیجئے تو کسی مشغلے کو پیشہ کہنے میں تامل ہوگا ۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے ایک ایسا پیشہ اختیار کیا ہے جس کو روپے پیسے سے کوئی تعلق نہیں اور کوئی مادی مفاد نہیں رکھتا تو شاید آپ اس کے خبط پر زہر خند کریں ۔ ایسی چیزوں کو " ہابی " یعنے دلچسپی کے مشاغل سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

یہ سچ ہے کہ تمام پیشے خواہ وہ نجاری ہو کہ لوہاری کفش دوزی ہو کہ تجارت ، معلمی ہو کہ تعلقداری یا نظامت سب کسی نہ کسی مادی فائدے کو پیش نظر رکھتے ہیں اس کے باوجود ہماری ذہنی کیفیت یہ ہے کہ جس مشغلے کا تعلق براہ راست روپیہ پیدا کرنے سے ہو اس کی اہمیت ہماری نظر میں گھٹ جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف ایسے تمام مشغلے جو علمی اور عقلی ہوتے ہیں یا جن کا مقصد براہ راست روپیہ پیدا کرنا نہیں معلوم ہوتا ، زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ایسے مشغلوں کے ساتھ " پیشہ " کی اصطلاح استعمال کرنے میں بھی اکثر تامل ہوتا ہے ۔ مثلاً کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں شخص کا پیشہ شاعری ہے ۔ یا اس نے تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے ۔ اسی طرح ہم پروفیسری ، نظامت ، معتمدی یا وزارت کا ذکر بھی پیشہ کی اصطلاح میں عام طور پر نہیں کرتے ۔ اگر کسی ماہر موسیقی مصور یا شاعر کے ساتھ آپ پیشے کے لفظ کا استعمال کریں تو اس سے آپ کا مقصد اس کے فن کی قدر کو گھٹانا ہوتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں شاعری اس کا پیشہ ہو گیا ہے یعنے وہ شاعری کے ذریعہ کچھ پیدا کرنا چاہتا ہے ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ذہنی اور علمی مشغلے جن کے متعلق کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں یہ عقیدہ قائم ہو گیا ہے کہ " مادی فائدہ کے حاصل کرنے سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہے ، پیشہ کے مفہوم سے اونچے ہیں ۔ نجاری ، لوہاری ، کفش دوزی وغیرہ جن کا کوئی علمی رشتہ نہیں انھیں ہم جرأت کے ساتھ پیشہ کہہ دیتے ہیں ۔ گویا ہماری نظر میں پیشے بھی اسی اصول کے تحت جنچتے ہیں جس اصول سے فنون لطیفہ کے مدارج طے کئے جاتے ہیں ۔ وہ اصول یہ ہے کہ " جو فن جس قدر زیادہ ٹھوس اور مادی ہوگا فنون لطیفہ میں اس کا درجہ اسی قدر ادنیٰ ہوگا " اسی طرح پیشوں کے متعلق ہم یہ اصول وضع کر سکتے ہیں کہ " جو پیشہ جس قدر زیادہ ٹھوس اور مادی ہوگا ، پیشوں میں اس کا رتبہ اسی قدر گھٹیا ہوگا " ۔

اسی طرح کا کوئی اصول ضرور ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے جس کی بنا پر ہم ایک معمار کے مشغلے پر معلم کے مشغلے کو ترجیح دیتے ہیں اور شاعر اور مصنف کے مشاغل کو ہم سب پر فضیلت دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مقصد اس کا کارنامہ ہی ہے ۔ اور اسے مادی فائدوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر زمانے میں ہمارے خیال کے مطابق کچھ نہ کچھ مصنف موجود رہے لیکن عام طور پر بڑے بڑے مصنفین کا مقصد بھی کوئی نہ کوئی مادی فائدہ رہا ہے ، شکسپیر جس کے ڈرامے مجسم الہام سمجھے جاتے ہیں ،

خاص کاروباری شخص تھا۔ ڈرامے لکھنا اور انھیں اسٹیج پر پیش کرنا اس کا پیشہ ہوگیا تھا۔ اس سے اس کی بُرائی مقصود نہیں۔ اگر مصنفین اور مولفین کے حالات ٹٹولے جائیں تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے۔ مثلاً انگریزی زبان کا مشہور شاعر اور ناول نویس سر والٹر اسکاٹ ویورلی ناولوں سے اپنے اہل و عیال کی پرورش کا سامان فراہم کرنا چاہتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے جب اسکاٹ کو کافی شہرت حاصل ہوگئی اور اس کا پہلا قصہ بھی عام طور پر مقبول ہوا تو اس نے آئندہ ناول نگاری پر ساری توجہ صرف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ معاش کے ذریعے وسیع نہ تھے اس لئے اس نے اپنے ایک سابق ہم جماعت جیمس بیلنٹائین کی مدد سے ایک چھاپہ خانہ کھولنا چاہا بعد میں اس میں اشاعت خانے اور کتب فروشی کی دکان کا بھی اضافہ ہوا۔ لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کاروبار بیٹھ گیا اور حصہ داروں پر کئی ہزار کا قرضہ عائد ہوگیا۔ اسکاٹ نے اپنے احساس فرض کی وجہ سے اس قرضے کو پائی پائی ادا کرنے کی ٹھان لی اور اپنے قصوں کی تکمیل شروع کی۔ اس زمانے میں وہ جس بے جگری کے ساتھ کام کرتا تھا اس کا نقشہ اسکاٹ کے سوانح نگار نے نہایت نفیس کھینچا ہے۔ اسکاٹ کو کھڑکی کے پاس بیٹھے اور کام کرتے دیکھ کر ایک شخص کہتا ہے "جب سے ہم یہاں بیٹھے ہیں میں غور سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہاتھ چلا ہی جا رہا ہے اور کبھی نہیں رکتا صفحہ کے بعد صفحہ ختم ہوتا ہے اور مسودوں کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے پھر بھی وہ بے تکان چلا ہی جاتا ہے۔ اور اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک چراغ روشن نہ ہولیں۔ اور اس کے بعد خدا جانے کب تک یہی حال ہر رات کا ہے۔"

اس محنت شاقہ نے اسکاٹ کو لب گور پہنچا دیا اور اور مرتے ہی کے بعد اس سے پیچھا چھوٹا۔ اردو کے اسکاٹ عبدالحلیم شرر کو بھی اس کاروبار کے تمام رازوں پر بڑا قابو حاصل تھا۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ تھا اشاعت خانہ اور کتب خانہ تھا اور رسالہ دلگداز تھا۔

عوام کی دلچسپی کو قابو میں رکھنے کے لئے وہ دلگداز میں کسی نہ کسی قصے کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اور جب وہ ختم ہو جاتے تو علٰحدہ کتاب کی شکل میں شایع کردیتے۔ ان کے جیسے کثیر تصنیف دنیا کی اور زبانوں میں بھی کم ہی ہوں گے۔

شاہ نصیر دہلوی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غزلیں لکھتے اور معاوضے پر لوگوں کو فروخت کرتے تھے۔ یہ معاوضہ روپیہ کی شکل میں ہو یا تحفے کی شکل میں شاگردوں سے بھی وہ فرمایشیں کیا کرتے تھے۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا......... اس فرمایش کا اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ روز کے آنے والے چوتھے دن غزل لاتے ہیں اس کے علاوہ انسان جس کام کو خرچ کرکے سیکھتا ہے اس کی قدر بھی ہوتی ہے اور شوق بھی پکا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے جانکاہی سے لکھتا ہے اس کا تو ادھر وہ فائدہ ہوا میرا یہ فائدہ ہوا کہ لے آیا تو چیز آگئی نہ لایا تو میرا پیچھا چھوٹا۔"

غالب نہایت فراخ حوصلہ انسان تھے ان کی آمدنی ان کی داد و دہش سے روبراہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے انھیں ہمیشہ تنگی کی شکایت رہتی۔ لیکن روپیہ آئے تو کس طرح ؟ شاعری تجارت تو نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہوجائے اور کچھ مشاہرہ مقرر ہوجائے۔ لیکن ان کی ٹیڑھی ترچھی چالوں کی شہرت ان کا تیکھا پن، خودداری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استاد ذوق سے چشمک اس میں حارج تھی۔ بہ ہزار دقت رسائی ہوئی بھی تو

دربار سے کچھ ملنے ملانے کا وہ انداز تھا جس کا نقشہ غالب نے اپنے قطعہ میں کھینچا ہے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

لیکن تنخواہ کا کیا حال ہے۔ فرماتے ہیں۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

آخر میں درخواست کرتے ہیں۔

میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ تا نہ ہو مجھ پہ زندگی دشوار

میر تقی میر سنتے آئے تھے ہر زمانے میں بادشاہ اور امرا شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے کسی امیر نے ایک شاعر کو اشرفیوں میں تلوا دیا تو کسی بادشاہ نے اپنے ملک الشعراء کا منہ موتی سے بھر دیا۔ لیکن خود ان کے کمال فن کی کیا قدر تھی۔ کوئی اس کا باعزت خریدار نظر نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

حرف وسخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
پیارے سوا ہم کو آئے نظر نفر سب!

اس لئے وہ ریختہ کو پیشہ بنا کر ہمیشہ پچھتاتے رہے چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

اسی طرح کی مثالوں نے اہل قلم اور شاعروں کے افلاس کو ضرب المثل بنا دیا ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی فن میں کمال حاصل کرے اور وہ اس کی وجہ معاش کا براہ راست ذریعہ نہ بن سکتا ہو تو اس کی زندگی بڑے عذاب میں پڑ جائے گی۔

تنگی اور عسرت کی یہ شکایت اردو یا فارسی زبان کے شاعروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ انگریزی کے بڑے بڑے شاعر اور مصنف بھی اکثر اس کا شکار رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن، گولڈ اسمتھ اور ان کے اکثر معاصرین مالی پریشانیوں کی وجہ سے زندگی بھر تکلیفوں میں رہے جانسن نہایت ضابطہ آدمی تھا تاہم لارڈ چیسٹر فیلڈ کو اس نے جو خط لکھا ہے اس سے تصنیف و تالیف کی بے قدری کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ گولڈ اسمتھ نے انگریزی ادیبوں کی کس مپرسی کا ایک نہایت نفیس خاکہ اپنے ناول "دی بیکار آف ویکفیلڈ" میں کھینچا ہے۔ دی بیکار کا بیٹا جارج جو ایک نوجوان فلسفی ہے لندن میں تصنیف و تالیف کے ذریعہ نام پیدا کرنے کا خیال خام پکاتا ہوا وہاں وارد ہوتا ہے اس کا ایک عزیز اس کو مشورہ دیتا ہے۔

"تم ہمت والے اور پڑھے لکھے نوجوان ہو میری طرح تصنیف کا پیشہ کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ بڑے بڑے ذہین لوگ اس پیشے میں قدم رکھنے کے بعد بھوکوں مر گئے۔ لیکن اس وقت میں تم کو بتا سکتا ہوں کہ شہر میں کوئی چالیس کے قریب نہایت غبی لوگ ایسے ہیں جو تاریخ اور سیاست پر لکھتے ہیں اور نہایت خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر موچی کے گھر پیدا ہوتے تو تمام عمر جوتے درست کرتے رہتے لیکن انھیں جوتا بنانا نہ آسکتا"

یہ سن کر جارج تصنیف و تالیف کی طرف ڈھل جاتا ہے اور سب سے پہلی کتاب جو وہ لکھتا ہے اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کی بے قدری کی شکایت وہ ان الفاظ میں کرتا ہے" ہر شخص اپنے دوستوں کی اور اپنی تعریف میں اور اپنے دشمنوں کی مذمت میں مصروف تھا اور چونکہ میں نہ دوست تھا اور نہ دشمن اس لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ عذاب یعنے کس مپرسی میں مبتلا ہوا" ایک ہم پسند شخص جارج سے "ایک کافی ہوز" میں

ملتا ہے اور اسے علم و فضل سے آراستہ پاکر اس سے امداد چاہتا ہے اور اپنی تجویزیں سناتا ہے کہ کس طرح وہ کتابیں لکھ کر زندگی بسر کرسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

تم شہر سے ناواقف معلوم ہوتے ہو ان تجویزوں کو سنو۔ ان کی بدولت ہیں نے اپنی عمر کے بارہ سال آرام سے بسر کئے ہیں۔ جونہی کہ کوئی نواب سفر سے واپس آیا میں چندہ کے لئے پیچھا کرتا ہوں۔ پہلے میں خوشامد سے اس کے دل کا محاصرہ کرتا ہوں اور جو رخنہ پڑتا ہے اس میں اپنی تجویزوں کو داخل کرتا ہوں۔ اگر وہ پہلی دفعہ امداد کردے تو دوسری دفعہ میں کتاب کے ڈیڈیکیشن کے نام سے کچھ اور اینٹھ لیتا ہوں۔ اگر یہ بھی مل جائے تو پھر تیسری دفعہ اس کے نشان کو سرنامے پر چھاپنے کے لئے رقم وصول کرتا ہوں۔ اس طرح مزے سے زندگی گذارتا ہوں اور ہنستا ہوں۔ ابھی ابھی اٹلی سے ایک امیر آدمی وارد ہوئے ہیں وہ میری تجویزوں سے واقف ہیں اس لئے تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ اگر ہم کامیاب ہوئے تو مال غنیمت کو آپس میں تقسیم کرلیں گے"۔

تصنیف و تالیف کی یہ کس مپرسی ڈکنز کے زمانہ تک جاری رہی۔ اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اس پیشے کا انحصار زیادہ تر دربار اور امیروں کی امداد پر تھا۔ مایحتاج زندگی فراہم کرنے کے لئے بعض وقت مصنفین کو طرح طرح کی چالیں چلنی پڑتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ بلند حوصلہ مصنف ایسی رکیک حرکتیں نہیں کرسکتا تھا اس لئے مالی حیثیت سے پریشانیوں میں گھرا رہتا تھا خواہ اس کے کارناموں کا رتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

مصنفین کی ان مشکلات میں بڑی کمی طباعت اور اشاعت کی آسانیوں کی وجہ سے پیدا ہونے لگی۔ اس کی بدولت تصنیف و تالیف کا کام اپنے بل بوتے پر جاری رکھنے کے قابل بن سکا۔ اب اس کاروبار کو نہ سلاطین کی سرپرستی کی اتنی ضرورت باقی رہی اور نہ امرا کی امداد کی۔ اس کی بڑی قوت اس کا وہ اثر ہوگیا جو وہ عوام پر پیدا کرسکتا تھا۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مصنفین کا رخ اعلیٰ طبقوں سے عوام کی طرف پھر گیا۔ وہی دراصل ان کے موضوع اور ان کے مخاطب بننے لگے۔ چنانچہ ڈکنز کے اکثر ناول اس رجحان کی ابتدا کو ظاہر کرتے ہیں۔

اردو کی ابتدائی تصنیف و تالیف کا انحصار بھی تمام تر سلاطین اور امرا کی سرپرستی پر رہا۔ متوسط دور میں جب سرپرستوں کے مواقع محدود ہونے لگے تو بڑے بڑے شاعروں نے زحمتیں اٹھائیں۔ رفتہ رفتہ تصنیف و تالیف کا رخ دربار سے پھر کر مخصوص علمی طبقوں کی طرف ہوگیا۔ اس زمانے میں مسجع اور مرصع عبارتوں کے قصے اور اخلاقی کتابیں لکھی گئیں لیکن طباعت اور اشاعت کے کاروبار کو جب سے ترقی ہونے لگی ہمارے مصنفین بھی عوام کی طرف رجوع ہونے گئے اور اپنی کامیابی کے لئے انھیں کو اپنا سہارا سمجھنے لگے۔ چنانچہ شرر، حالی نذیر احمد، شبلی، اقبال، پریم چند، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار سرور جہاں آبادی غرض موجودہ زمانے کے تمام مصنفین مولفین اور شاعروں کا بھروسہ اپنی ذات اور اپنے قلم پر رہا اور اسی کی بدولت بعضوں نے تھوڑی بہت آرام کی زندگی بسر کی۔ یورپ کے مشہور مصنفین یا خود ہندوستان کے بعض لکھنے والوں جیسے رابندرناتھ ٹیگور کی سی خوش نصیب زندگی ہمارے ہاں کم مصنفین کو حاصل ہوسکی اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے عوام میں پڑھنے کا چسکا ابھی تک پیدا نہیں ہوا یہی چیز کسی مصنف کی کامیاب زندگی کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر یہ

نہ ہو تو کوئی اور چیز نہیں جو مصنفین اور مولفین کے شوق کار کا
باعث ہو سکے۔ لامحالہ اوپری جن کی کوششیں روز بروز منظر
عام پر آتی رہتی ہیں عوام میں پڑھنے کا شوق نہ ہونے کی وجہ
سے ان کا ذوق بھی اونچا نہیں ہو سکتا ورنہ ایسے کارنامے
زیادہ سے زیادہ لکھے جانے شروع ہو جاتے جو ہر حیثیت سے
بلند پایہ ہوں اشاعت خانوں کی تنظیم نے تصنیف و تالیف
کے کام کی خاطر خواہ خدمت انجام دی۔ اس میں شک نہیں
کہ ناشر کی وجہ سے مصنف کے منافع کا ایک حصہ مارا جاتا ہے،
لیکن سچ پوچھو تو بہت سے مصنفین جو اپنی کتاب کو چھاپنے
کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے کارنامے گم نامی میں
پڑے رہنے کے خطرے سے محفوظ ہو گئے۔ بعض وقت یہ
کہا جاتا ہے کہ ناشر کے شامل ہو جانے کی وجہ سے مصنف
کی خود ارادیت متاثر ہو رہی ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔
لیکن بڑے مصنفین اور سمجھ دار ناشر ایسی چیزوں کو
تصنیف و تالیف میں داخل ہونے نہیں دیتے جن سے ان کی
عظمت میں فرق آئے۔ اس کے برخلاف بعض وقت ناشر
ہونہار مصنفین کی بڑی اچھی رہبری بھی کر سکتے ہیں۔

اردو اشاعت خانوں کی تعداد یوں بھی بہت
محدود ہے جو کچھ موجود ہیں ان کا دائرہ عمل وسیع نہیں ہے۔
بعض کے حساب کتاب اور معاملات قابل بھروسہ نہیں ہیں۔
اس لئے اہل تصنیف و تالیف کو اس تقسیم کار اور امداد
باہمی کے مفید اصول سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔
اس زمانے میں تصنیف و تالیف کے کاروبار کی اگر صحیح مدد
ہو سکتی ہے تو وہ اچھے اشاعت خانوں کی تنظیم سے۔ اسی
کی ہمارے مصنفین اور ہمارے ملک کو سخت ضرورت ہے۔
اس کے بغیر موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کے پیشے
کی کامیابی مشکل ہے۔

عبدالقادر سروری

صدائے نشور

اسرارِ عشق نے مرا ایماں بنا دیا — اللہ رے کفر، جس نے مسلماں بنا دیا
پھیلا کے ایک خرمن گل ہائے آرزو — مجھ کو اسیرِ تنگیٔ داماں بنا دیا
اللہ رے التفات کہ اندازِ شرم نے — ہر جنبشِ نگاہ کو ارماں بنا دیا
فکرِ معاملات نہ اندیشۂ حساب — اچھا ہوا کہ سوختہ ساماں بنا دیا
کیا بات ہے ترے لئے تکمیلِ آرزو — اے وہ کہ تو نے خاک سے انساں بنا دیا

تیرے تخیلات نے محفل کو اے نشور
آئینہ رکھ کے سامنے حیراں بنا دیا

نشور واحدی (گورکھپوری)

قطعات

(۱)

ولولوں کا نقیب، عہدِ شباب
اور پیری ہے، منبر و محراب
یہ جہاں ہے تغیّرات کا نام
زندگانی ہے، رعشۂ سیماب

(۲)

تجھ سے کس کو گلا ہے میرے رفیق
مدّتوں سے ہے یہ جہاں کا طریق
فاش کرکے فریبِ زندیقی
بن گیا ہوں میں کافرِ زندیق

(۳)

میرے ہونے میں کیا زیاں تیرا
روندتا ہے مجھے جہاں تیرا
مجھ سے دوری تجھے نہیں پھبتی
میں تو ہوں ایک ترجماں تیرا

(۴)

قطرہ ہوں مجھ کو بے کنار نہ کر
رہنے دے مجھ کو شرمسار نہ کر
اور اگر تو یہ کھیل کھیلے گا!
حشر میں میرا انتظار نہ کر

(۵)

دل جو اک دن تھا گرمیٔ محفل
کب کا ہے منتظر، لبِ ساحل
جب کوئی موج سر اٹھاتی ہے
آہ بھرتا ہے اک بصد مشکل

(۶)

چار جانب ہے شورِ رستا خیز
سوچ میں غرق ہے دلِ پرویز
اور افلاس کے ستائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں نوکِ خنجر تیز

(۷)

کس قدر ہے بلند میرا مقام
نقشِ پا ہے مرا یہ ماہِ تمام
عرش کے اس طرف ہے میرا وطن
میرے مذہب میں بے لبسی ہے حرام

احمد ندیم قاسمی

مُدیریات

ادارت ایک ایسا مستقل فن ہے جسے صرف مدیر ہی بہ حسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں، اگر خدا نخواستہ کوئی تاجر اس فن کو ہاتھ لگائے تو نہ صرف فن کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے بلکہ خود تاجر صاحب کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اگر کوئی کاریگر اس میں دخل دے تو سمجھئے کہ بس خیر ہی خیر ہے، کیونکہ ایک طرف تو اس کو خود منہ کی کھانی پڑے گی دوسری طرف اس کے اوزار بیکار پڑے پڑے یا تو زنگ آلود ہو جائیں گے یا کند۔ اسی طرح ہر اس شخص کا حال ہوگا جو غیر مدیر ہو کر بھی مدیر بننا چاہتا ہے، چنانچہ ایسا ہی کچھ حال ہمارا بھی ہوا کہ اس میدان کارزار میں قدم رکھتے ہی ہمیں بھی ایک رسالہ نکال کر رنگ برنگ کی آفتیں مولنی پڑیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک عرصہ پہلے ہم نے خاص کر ناظرین ہی کے مطالعہ کے لئے "چلم گزٹ" کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، مگر وہ مسلسل اس لئے نہیں چل سکا کہ جیسا کہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں، ہم مدیر نہیں ہیں، اس لئے نمونتہً ایک رسالہ نکال کے اب تک خریداروں کا انتظار کرتے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس جنگ کے زمانے میں بھی ہمارے رسالے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا ہے حالانکہ جنگ کے زمانہ میں رسالہ سے زیادہ توجہ کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے، لہٰذا توقع ہے کہ ناظرین جلد سے جلد ہم غریبوں کی مدد کر کے ہمارے دکھے ہوئے دل کی دعا لیں گے اور ثواب دارین حاصل کریں گے۔

مدد کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو رسالہ ہم نے غلطی سے نکال دیا ہے، حضرات اس کے صفحات کو "وار بانڈز" (War bonds) کے طور پر خرید لیں۔ ناظرین کی سہولت کے مدنظر ہم نے ایک صفحہ کی قیمت پچیس روپے اور ایک ورق کی قیمت پچاس روپے تجویز کی ہے۔ جو حضرات اس سے زیادہ دینا چاہیں خوشی سے دے سکتے ہیں۔ مدد کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ تنخواہ یاب حضرات آدھی تنخواہ خود رکھ لیں اور آدھی ہمارے پاس بھیج دیا کریں، اس سے دونوں کو سہولت ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ قربانی کے وقت بھی ہم غریبوں کو نہ بھولیں، گوشت، چمڑا، ہڈی، کھر جو بھی آپ روانہ فرمادیں قبول کر لیا جائے گا۔ بس اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں، یاد رکھئے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں آپ ہی کے لئے کر رہے ہیں کیونکہ رسالہ آپ ہی کے لئے تو ہوگا۔ ادھر جس معیار کا وہ رسالہ ہوگا اس کا اندازہ تو آپ دیکھ کر ہی بخوبی لگا سکیں گے۔

افسوس ہے کہ آج کل ادب کی حالت اس قدر تباہ ہو رہی ہے کہ اس کی صحیح حالت کا نقشہ کھینچنا آپ اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے، لیکن پھر بھی ایک مقدمہ کتاب کے طور پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کا نقشہ کھینچ کر ہی رہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شہروں اور ملکوں کی آب و ہوا کا اثر وہاں کی معاشرت و اخلاق شعر و ادب پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کا نقشہ کھینچنا گویا وہاں کے شعر و ادب کا بھی نقشہ کھینچنا ہے۔ پس ہم ہندستان کا ادب معلوم کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندستان کا نقشہ کھینچ دیں۔

چنانچہ ہندستان ایک وسیع جزیرہ نما ہے جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف پہاڑ ہے یعنے شمال میں کوہ ہمالیہ کا سر بہ فلک پہاڑی سلسلہ ہے، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج بنگال اور مغرب میں بحیرۂ عرب واقع ہے۔

چونکہ ہندستان خط استوا سے قریب واقع ہوا ہے، یہاں کی آب و ہوا گرم سمجھی جاتی ہے، اور جہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے وہاں کے لوگ عموماً فسادی، بدطینت اور خود غرض واقع ہوتے ہیں، لیکن یہ بات کچھ غلط سی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہندستان میں عموماً لیڈر اس کام کو انجام دیتے ہیں، اور لیڈروں کی قوم پرستی، سیاسی جوش، باہمی رواداری، معاشی ترقی، اور ابنائے وطن سے ہمدردی کے جذبات ان کی زبان کے ہر ہر لفظ سے ٹپکے پڑتے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کے جھگڑے فساد اور قتل و خون وغیرہ کو ان کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کی جائے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

حدود اربعہ، موقعہ محل اور آب و ہوا کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی پیداوار کا بھی سرسری طور پر ذکر کر دیا جائے۔

پیداوار میں یہاں کئی چیزیں قابل ذکر ہیں، مثلاً باجرہ، مکئی، جوار، چاول، گیہوں، روئی، آم، انگور، میٹھی کی بھاجی، سویا، پالک، اروی، ترئی، بھینڈی وغیرہ۔ ان میں بھی چاول، گیہوں، روئی وغیرہ بہ کثرت ہوتے ہیں اور ان سے بڑھ کر آدمیوں کی پیداوار کے لئے ہندستان خاص طور پر مشہور رہے، آدمیوں کی کثرت معاشی خوش حالی کی مانع ہے، اور معاشی بدحالی خوبیٔ دماغ میں ہارج اور قصور دماغ ارتقائے ادب میں حائل۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جتنے رسالے نکل رہے ہیں، ان سب کا معیار گرا ہوا ہے، اگرچہ رسالے والوں کو دعویٰ ہے کہ وہ ادب کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں، مگر صحیح معنے میں تو کسی کا بھی زر پرستی، سطحی شہرت، خود غرضی اور چند لچر چیزیں پیش کر کے پیسے کمانے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔

البتہ بعض ایسے بھی ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں بھی کافی حصہ لے رہے ہیں مگر ان کی حالت بھی اس معیار پر نہیں پہنچی جس پر کہ پہنچنی چاہیے۔

غرض ان ہی خامیوں کو محسوس کر کے قومی جوش اور ادبی خروش نے ہمیں مجبور کر دیا کہ علم و ادب کا ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو اپنی نظیر آپ سمجھے۔

بس ناظرین میں یہ خبر وحشت اثر مسرت سے سنی جائے گی کہ ہم بھی ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ نکال کیا رہے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ نکال چکے ہیں، لیکن صحیح معنے میں ابھی منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ پھر بھی اس کی مانگ اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف پہلی اشاعت کے متعلق دنیا کے گوشہ گوشہ سے اتنے تعریفی خطوط آ رہے ہیں کہ یہاں ان کی تشریح کو ہم خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ گنجائش اتنی کھپ جائے گی کہ مفید مضامین نہ دئے جا سکیں گے، البتہ اگر ان آنے والے خطوط کی رفتار یہی رہی تو ہم آئندہ سے ان خطوط کا بھی ایک ماہوار رسالہ نکالنا شروع کر دیں گے، اور یقین ہے کہ ایسے خطوط تو ضرور ہی آیا کریں گے کیونکہ یہ ہر مدیر کا طریقہ رہا ہے کہ جب کبھی وہ رسالہ نکالتا ہے تو فوراً پہلی ہی اشاعت سے۔ بلکہ لبا اوقات تو اشاعت کے خیال ہی سے ـــــ اس کے پاس تعریفی خطوط آنے شروع ہو جاتے ہیں، البتہ خریدار نہیں ملتے، بس، اگر ہمارے رسالہ کو بھی خطوط آئیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

غرض، ان حالات کے تحت آپ ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا رسالہ کتنی آسانی اور تیزی سے لوگوں کے دلوں پر چڑھ جائے گا۔ فی الحال تو اس کے ہاتھ، پاؤں اور کھر، پنجے پیدا ہوتے جا رہے ہیں تاکہ جو حضرات نرم دل ہیں ان کے دلوں پر ہاتھ پاؤں ہی سے چڑھنے میں آسانی رہے، اور جو سخت دل ہیں ان کے دلوں پر چڑھنے کے لئے کھر، پنجوں کا استعمال کیا جا سکے

مخفی مباد کہ یہ کُھڑ پنچوں سے چڑھنے کا تخیل ہمارے سالے نے بکری اور بلی سے لیا ہے۔

یوں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر مدیر اپنے رسالہ کے متعلق یہی لکھتا ہے کہ اس کے پاس تعریفی خطوط آرہے ہیں، لیکن جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں کے لکھنے اور ہمارے لکھنے میں کتنا بڑا فرق ہے۔

اس کے ثبوت کے لئے ہم یہاں چند مشاہیر عالم کے خطوط پیش کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو تصفیہ کرنے میں آسانی ہو، لیکن چونکہ اصلی خطوط پیش نہیں کئے جا سکتے، مجبوراً ذیل میں ان کی نقل لکھ دینے کی کوشش کی جاتی ہے:۔

غور کیجئے، کیا لکھتے ہیں، عالی جناب نواب "عماد البیگ" صاحب چیچک برار آف تعلقہ، آرمور:۔

"حضرت ایڈیٹر صاحب!

میں سن رہا ہوں کہ آج کل آپ ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ وہ رسالہ بہت اچھا ہوگا۔ براہِ کرم میرے نام پر ایک سال کے لئے جاری کر کے ممنون فرمائیے گا۔ چندہ کے متعلق آپ اطمینان رکھیں کہ جب میں وہاں آؤں گا تو آپ کو اور آپ کے بچوں کو چیچک کے ٹیکے لگا دوں گا۔ ٹیکوں کی فیس میں سے رسالہ کا چندہ نکال کر جو کچھ بچ رہے خاکسار کو دیدیجئے گا۔ خیر

آپ کے رسالہ کا منتظر

"عماد البیگ"

مولنا اشتر الدین خاں صاحب سینیٹری انسپکٹر موضع کھام گاؤں:۔

گرامی مدیرا!

پس از ادائے آداب و تسلیم، بندہ عرض پرداز ہے کہ آپ کا مکتوب گرامی پہنچا، کوائف مندرجہ سے آگاہی بخشا۔

دیگر کیفیت یہ ہے کہ بندہ یہاں بہ فضل خدا مع خورد و کلاں خیریت سے رہ کر خیریت آپ جمیع خورد و کلاں کی بہ درگاہِ کریم و کارساز سے شب و روز، ہمیشہ نیک چاہتا ہوں۔

دیگر کیفیت یہ ہے کہ آپ کے رسالے کا نمونہ پہنچا۔ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح آتا رہے گا۔

آج کل مصروفیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ میں آپ کا رسالہ نہیں دیکھ سکا۔ آپ نے مجھ ناچیز سے اس کے متعلق رائے طلب کی ہے۔ بھلا میں کیا، اور میری رائے کیا۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ اچھا ہی ہوگا، کیونکہ آپ جیسا قابل شخص نکال رہا ہے۔

شروع میں مشاہیر کی رائے اور تقریظ بھی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بہت اچھا اقدام ہے، کیونکہ اس سے ہم جیسے سیدھے سادے لوگوں پر اچھا اثر پڑنے کا امکان ہے۔ باقی خیریت۔

خیر اندیش

فدوی "اشتر الدین خاں"

مولوی اعتبار میاں صاحب ہیزم فروش، کمیلہ، قصاباں، بونڈی کرنی!

آپ کا رسالہ ملا۔ پسند آیا۔ خصوصاً اس میں لکڑی کے کرتب، تجارت اور نرخ کا جو خاص باب رکھا ہے، وہ غیر معمولی طور پر مفید ہے، نہ صرف شعر و ادب کے لحاظ سے، بلکہ فنون سپہ گری اور امور خانہ داری کے اعتبار سے بھی۔ میں آپ کو اس قابلانہ کوشش پر مبارک باد دیتا ہوں۔

آپ کی حسب خواہش ہمارے کھاتے میں ایک رسالہ ہمارے نام جاری کر کے ممنون فرمائیے۔

افسوس ہے کہ ہیمہٴ سوختنی کی بہت سی ہنڈیاں

آ ئی ہوئی ہیں اس لئے کوئی تفصیلی جواب نہیں لکھ سکتا معاف فرمائیے گا ۔

یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کا رسالہ پہلے ہفتہ وار تھا پھر نیم ماہی ہوا اور اب ماہانہ ۔ خدا کرے کہ اسی طرح ترقی کرتے کرتے سہ ماہی، ششماہی بلکہ سالانہ تک پہنچ جائے ۔

خاکسار

"اعتبار"

ان مشاہیر مقامی کے علاوہ حسب ذیل مشاہیر عالم نے بھی سنا ہے، ہمارے رسالہ کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے :۔

اقبال "رسالہ اچھا ہو تو اچھا ہے"

ٹیگور "رسالہ کافی ہے"

جناح "ادب میں رسالہ اور رسالہ میں ادب ہے" (وغیرہ)

ان آراء کے اظہار کے بعد ہم ذیل میں اس رسالہ کے چند اہم مقاصد گنا دینا چاہتے ہیں، تاکہ لوگوں پر اس کی اہمیت واضح ہو جائے :۔

(۱) ادب میں ایک غیر معمولی اضافہ کرنا (۲) بہترین معیاری نظم و نثر شایع کرنا (۳) ہندی اردو کے جھگڑے کو ہندستان کی سرحد سے بڑھانا (۴) تمام سادہ لوح حضرات سے کسی نہ کسی طرح چندہ وصول کرنا (۵) قوم اور لیڈروں کی خدمت کرنا ۔ (۶) اضلاع کے خریداروں کو ٹپہ کے ذریعہ بھیجنا ۔ (۷) ہر قسم کی دواؤں، کتب فروشوں اور کوک شاستروں کے اشتہارات شایع کرنا (۸) مضامین شایع کرنے کے لئے معاوضہ لینا ۔ (۹) ٹائیٹل پر نہایت دلکش اور جاذب نظر تصویریں کھینچنا ۔ (۱۰) ملک کے مشاہیر کی اموات کی خبریں شایع کرنا، تعزیتی قرار دادیں منظور کرنا، اور مرحوم کے لئے "صبر جمیل" اور اس کے پس ماندوں کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (۱۱) اگر کبھی بارش نہ ہو تو امساک باراں کے لئے دعا کرنا (۱۲) ہندو مسلم اتحاد کے لئے بے جا کوشش کرنا (وغیرہ)

وہ مقامات جہاں یہ رسالہ جاتا ہے :۔ امریکہ، آفریقہ آسٹریلیا، یورپ، ایشیا، بھاگل پور، جاپان، وزیرستان انگلستان، بلجیم، اٹلی، جرمنی وغیرہ ۔

اس سے بھی رسالہ کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ملکی رسالہ ہونے کے باوجود غیر ممالک میں اس کی اس قدر مانگ ہے اور ہندستان میں کوئی پوچھ کر بھی نہیں دیکھتا ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین کرام بہت جلد اس کی طرف توجہ فرمائیں گے ۔

سالانہ چندہ ممالک یگانہ سے پچیس روپے اور ممالک بیگانہ سے پچاس شلنگ ۔

اور جو حضرات بہ یک وقت دو رسالے منگائیں انھیں محصول ڈاک معاف کر دیا جائے گا، اور جو تین منگائیں انھیں رسالے کے خاص نمبروں کے علاوہ سالانہ ایک نسخہ "قیومی جنتری" اور ایک لکس (LUX) صابن کی ٹکیہ بہ طور انعام دی جائے گی، اور جو حضرات انعام کے نام سے نہیں لینا چاہتے، انھیں "مدیر کے تبرک" کے نام سے پیش کی جائے گی ۔
باقی خیریت البتہ آرڈر کا انتظار بے چینی کے ساتھ رہے گا

خاکسار

"مدیر رسالہ"

سیّد علی شاکر

عید کے دن

بندرگاہِ عدن کے مشرقی ساحل پر بنے ہوئے' دور تک ملاحوں اور ماہی گیروں کے جھونپڑے بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں طلوعِ آفتاب کے وقت کنارے پر بسنے والے ملاحوں کے لڑکے ریتی سے کھیلتے یا پانی میں ڈبکی لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' ان کے گندمی جسم پر ایک ہی قسم کا موٹا تہمد بندھا ہوتا ہے' جو ہر لحاظ سے ان کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ ان دلفریب قدرتی نظاروں کی سیر میں اپنے دوست مسعود کے ساتھ کئی دنوں تک کرتا رہا مسعود کے والد الیاس محمود نے ایک عرصے سے عدن اور اس کے نواح میں موٹریں چلانے کا ٹھیکہ حکومت سے لے رکھا تھا۔ وہاں ان کا کاروبار بہت سرگرمی اور بہترین طریقے کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب انھوں نے عدن میں ایک عالی شان جرمنی وضع کی کوٹھی بھی تیار کرلی تھی' انھیں ہندستان چھوڑے دس بارہ سال گذر گئے لیکن مسعود اپنی تعلیم کے سلسلے میں الہ آباد ہی میں اپنے چچا کے یہاں مقیم رہا۔ اب جب کہ وہ اپنی بہن کی شادی میں شرکت کی غرض سے گھر جا رہا تھا مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا' کالج کو موسمی چھٹیاں مل چکی تھیں' اس لئے مجھے اس کا ساتھ دینے میں کوئی عذر نہ تھا۔

ہم دونوں اس کے والد کی موٹر میں بہت دور دور تک ریتیلے میدانوں اور سمندری ساحل پر گھوما کرتے' یا بعض وقت چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر بیٹھ کر سمندر کی سیر کیا کرتے' اور رات گئے تک ان دلچسپ مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔

مسعود جدّہ جا رہا تھا جہاں اس کی بہن بیاہی گئی تھی' میں اپنی ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے اس کے ساتھ نہ جا سکا' دوسرے دن میں تنہا موٹر لئے گھر سے نکلا دوپہر ہوچکی تھی' لیکن سورج کی تیز روشنی میں ریت کے ذرات ابھی تک چمک رہے تھے' مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا میں ان ملاحوں کے جھونپڑوں کے قریب پہونچا' یہاں ساکن سمندر حدِ نگاہ تک تختۂ نور بنا ہوا تھا۔ سورج ساحل سمندر پر غروب ہو رہا تھا۔ اس کی زرپاش کرنوں سے ساری فضا رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس دلکش نظر فریب نظارے نے میرے جذبات کو ابھارا اور مجبور کیا کہ ایسے سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں'

ایک چھوٹی سی کشتی میں نے کرایہ پر لی' اور سیر کی ٹھانی' اف کس قدر ولولہ خیز منظر تھا وہ' ہر طرف کیف و نور کی بارش ہو رہی تھی' آبی پرندے میری کشتی کا طواف کر رہے تھے' سورج آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوب چکا تھا اک بے خودی کے عالم میں میں اپنی کشتی کو تیزی کے ساتھ کھینے لگا' تنہائی کا خیال بالکل میرے دل سے مٹ چکا تھا یہاں تک کہ میں ساحل سے ایک فرلانگ آگے نکل گیا۔ شام کی سیاہی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ پانی میں بھیگی ہوئیں خنک ہوائیں میرے دل میں ایک گدگدی سی پیدا کر رہی تھیں میں اب گا رہا تھا شاید ع

آتش شوخ سنہری موجوں سے — ہم دل کی نیا کھیویں گے

چند لمحوں کے اندر اندر ہواؤں نے اپنا رخ بدلا' اور موجوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے میری کشتی میں بھی چلبلا پن آگیا' میں گھبرا سا گیا' معاً کئی خوفناک خیالات نے میرے سکون و مسرت کی دنیا کا شیرازہ بکھیر دیا' اتنی تاریک رات ان طوفانی ہواؤں کے تھپیڑوں میں ان پیل تن موجوں کے زد میں۔ اف خدا میرا دل کانپ اٹھا۔ فوراً میں نے کشتی کا رخ ساحل کی طرف پھیر لیا اور تیز تیز چپو گھمانے لگا' ہواؤں کا زور بدستور بڑھ رہا تھا۔ اور پانی کی موجیں خود بخود درندوں کی طرح خوفناک آواز کے ساتھ میری کشتی پر حملہ کرنے کے لئے جھپٹ رہی تھیں' جتنا بھی جلد ممکن ہو سکا میں نے کنارے پر پہونچنے کی کوشش کی' سردی کی شدت سے میرا

سارا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ اور چپو چلانے والے ہاتھ کسی قدر شل
ہو گئے تھے، لیکن میں نے ہمت و استقلال کو کام میں لاکر دل کو
ڈھارس دی، اور جوں توں کرکے ساحل کے قریب تک پہونچا لیکن
تاریکی میں میری کشتی طوفانی موجوں کی زد میں آکر ساحل سے ٹکرا گئی
اور میں بے تحاشا کنارے پر آگرا، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے زبردست
گھونسے کے ساتھ نیچے گرادیا ہو میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا
اور نہ معلوم اس کے بعد کیا ہوا لیکن صبح جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو
ایک جھونپڑے میں لیٹا ہوا پایا، اس وقت میرے تمام اعضا میں
شدت کے ساتھ درد ہو رہا تھا، مری حیرت و استعجاب میں ڈوبی
ہوئی نگاہیں، جھونپڑے کے کونے کونے کا جائزہ لے رہی تھیں، میرے
قریب ایک سن رسیدہ شخص کھڑا ہوا تھا، میں یہاں کہاں ؟ مجھے
کیا ہوگیا تھا، تم کون ہو ؟ میری کار کہاں ہے ؟ بد حواسی کے عالم
میں میں نے متواتر سوالات اس سے کئے، آپ بے فکر رہیں بڈھے نے
ہمدردی کے لہجے میں کہا، آپ میرے مہمان ہیں لیکن یہ بتاؤ مجھے کیا
ہوگیا تھا، میں نے پھر اس سے سوال کیا۔

رات آپ ہمارے جھونپڑے کے قریب بے ہوش پڑے ہوئے تھے
شاید آپ کی کشتی ساحل سے ٹکرا گئی ہوگی۔ آپ مطمئن رہئے، جناب
آپ کی گاڑی بالکل محفوظ حالت میں ہے، آپ بڑے مہربان
ہیں میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا، میں آپ کا ممنون ہوں
آپ نے میری جان بچائی،

یہ ہمارا فرض ہے جناب، میں نے اپنی عمر میں کئی ڈوبنے
والوں کی جانیں بچائی ہیں، بڈھے کی دھنسی ہوئی مگر در آنکھیں
غرور و تمکنت سے چمک اٹھیں، ایک دفعہ تو ـــ خیر ان باتوں کو
چھوڑئیے آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، آرام کیجئے۔ نہیں، میں
بالکل اچھا ہوں، آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ یہ
کیسے ہوگا حضور، آپ بغیر کھائے پیئے ہمارے گھر سے نہیں جاسکتے۔
میری لڑکی ابھی کچھ دیر میں آپ کے لئے تازہ غذا لے آئے گی اور وہ
اب آتی ہی ہوگی، جناب آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گے،
وہ بہت اچھے اخلاق کی خوبصورت لڑکی ہے اس کی ماں اسے
تین سال کی عمر میں میرے سپرد کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی
بڈھے کی آنکھیں بھولی ہوئی باتوں کو دہراتے ہوئے نم آلود ہو گئیں۔

یہی لڑکی میرے اندھیرے گھر کا اجالا ہے، اس نے اپنے
سکڑے ہوئے گالوں پر ڈھلکنے والے آنسو پونچھے۔

' دیکھو! وہ آرہی ہے، بڈھے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے
قریب جاکر کہا، میں نے دیکھا، واقعی وہ آنے والی لڑکی حسین ہے
اس کی چال میں غضب کی شوخی تھی، بے پروائی کے ساتھ اس
نے اپنے بال دونوں شانوں پر بکھیر رکھے تھے، لڑکی نے دور سے
مجھے اپنے جھونپڑے میں کھڑے ہوئے دیکھا، اس کی ادھر ادھر
گھومنے والی نگاہیں زمین کے ذرات کا جائزہ لینے لگیں اس کی
رفتار میں قدرے کمی آگئی تھی" آؤ سمیہ" بڈھے باپ نے محبت
بھرے لہجہ میں کہا، ہمارے مہمان بڑے اچھے آدمی ہیں، لڑکی
اندر داخل ہوئی، اور دلربایانہ انداز کے ساتھ اپنی ٹوکری کو باپ کے
سامنے لارکھا، آپ نے فضول تکلیف کی، میں نے اخلاقاً بڈھے
سے کہا، بڈھے ماہی گیر نے شاید میرے جملے کو نہ سنا ہو، لڑکی پانی
لینے کے لئے باہر گئی ہوئی تھی، انجیر بہت زیادہ لذیذ ہوتے ہیں،
اور یہ کھجور بھی، ہاں، یہ نعمت تو صرف خدا نے آپ لوگوں کو دی ہے۔
کھائیے حضور، لیکن اتنے زیادہ میں کیسے کھا سکتا ہوں، آپ
لوگ بھی۔ میں نے لڑکی کی طرف نگاہ کی جو پانی کا برتن لئے کھڑی تھی
ہم لوگ یہ نہیں کھاتے، لڑکی نے دبی ہوئی آواز میں شوخی کے ساتھ
کہا، باپ مسکرا دیا، اس کے بے ترتیب دانت باہر نکل کر بدنما دکھائی
دینے لگے، ہاں جناب ہم غریب ہیں، ایسی چیزیں روز کہاں سے
کھائیں، یہاں امیر غریب کی بات ہی کیا ہے، بڈھے نے کچھ نہیں کہا،

اور لڑکی کی نگاہیں جھک گئیں۔ میں آپ کے بغیر ایک پھل بھی نہیں کھاؤں گا، لیکن ہم اتنے سویرے کھانے کے عادی نہیں، اور مجھ سے بھی اتنے سویرے نہ کھایا جائے گا آپ نے فضول زحمت کی، مجبوراً بڈھا اور اس کی بیٹی راضی ہوئے، ناشتہ ختم کر کے میں اپنے عزیز محسنوں کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا، میں ان کے بلند اور پاکیزہ اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ تقریباً میں ہر روز ان سے ملنے کے لئے سمندر کے کنارے آتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی پر لطف صحبت میں گذار کر واپس ہوتا،

بڈھا ابراہیم اور اس کی بیٹی سمیہ دونوں دن بھر مچھلیوں کا شکار کرتے، اور شام کو انھیں بازار میں فروخت کر کے اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرتے۔ مسعود چار دن جدہ میں گذار کر واپس آیا، میں نے اس سے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والے واقعات بیان کئے، وہ بھی ابراہیم اور اس کی بیٹی سمیہ سے ملنے کے لئے مشتاق تھا، مسعود کے گھر اس سال عید کی تیاریاں بڑے شاندار طریقے سے کی جارہی تھیں، اس کے والد نے اس سلسلے میں اپنے کئی ایک احباب کو بھی مدعو کیا تھا، جن سے میرا تعارف کرانا چاہتے تھے۔ عید کے ایک دن پہلے میں اور مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے، ہماری موٹر اس کے جھونپڑے کے قریب جا رکی، سمیہ موٹر کی ہارن کی آواز سن کر دوڑی ہوئی آئی لیکن مسعود کی موجودگی سے قدرے جھجک گئی۔ سمیہ، یہ میرے دوست مسٹر مسعود ہیں، ان کے والد یہاں کی موٹر کمپنی کے مالک ہیں، مختصر سے تعارف کے بعد سمیہ ہم دونوں کو اندر جھونپڑے میں لے گئی، اس کا باپ سو رہا تھا اس نے مسعود سے تعارف کروانے کی خاطر جگانا چاہا۔ لیکن میں نے اسے منع کیا کہ پھر کبھی وہ ان سے مل لیں گے، پھر سمیہ نے ہمارے آگے مچھلی کے بھونے ہوئے کباب اور قہوہ پیش کیا، ہم نے نہایت مسرت کے ساتھ اس کی دعوت قبول کی، کھانے سے فارغ ہو کر ہم تینوں پانی کے قریب کی چٹان پر بیٹھ گئے۔

شاید کل ہم نہ آسکیں گے سمیہ، کیوں؟ کل آپ کہاں جارہے ہیں سمیہ نے دریافت کیا، کل ہمارے یہاں عید ہے۔ اوں، کیا آپ کے یہاں عید میں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں، اس کے پیر پانی کی سنہری موجوں سے کھیل رہے تھے نہیں یہ بات نہیں مسعود نے کہا 'کل دن بھر ابا کے دوستوں سے ملنا ہوگا وہ سب ہمارے گھر بلائے گئے ہیں، اور تم نہیں آؤگی سمیہ میں نے اس سے دریافت کیا'؟ ہم آکر کیا کریں، سمیہ نے معصومانہ انداز میں کہا، مل لوگی، اور کیا؟ یہاں ابا اکیلے رہیں گے اس نے مغموم چہرہ بنا کر کہا، آپ نہیں آئیں گے کیا؟ ہمارے یہاں بھی عید ہے، کیوں نہیں ضرور آئیں گے، مسعود نے جواب دیا، ہم تین چار بجے مہمانوں سے نبٹ کر تم سے ملنے آئیں گے، ہم اس سے رخصت ہو کر موٹر میں آبیٹھے، دور تک سمیہ اپنا ہاتھ ہلاتی رہی۔

نماز کے بعد جو مہمانوں کا تانتا لگا رہا تو مشکل سے چار بجے رہائی ملی۔ مسعود کے والد الیاس محمود آج بڑے مصروف اور خوش نظر آرہے تھے، انھوں نے ہر ایک سے میرا تعارف کروایا۔ میں اور مسعود، سمیہ سے ملنے کے لئے بے چین تھے، اور موقع کے متلاشی تھے کہ کسی طرح کوئی بہانہ تراش کر رفو چکر ہو جائیں۔ آج ہم شکار کھیلنے جائیں گے، مسعود نے اپنے ابا سے ڈرتے ڈرتے کہا، دن بھر تھکنے کے بعد، اس کی والدہ نے ڈانٹ کر کہا، نہیں چچی ہم شکار نہیں کھیلیں گے۔ میں نے موقع کا لحاظ کرتے ہوئے پہلو بدل کر کہا، ویسے ہی سمندر کی سیر کرنے جائیں گے۔ ذرا جلدی چلے آنا بیٹا، ہمیں اجازت مل گئی۔ ہم خوش خوش سمیہ سے عید ملنے کے لئے روانہ ہوئے، نہ جانے سمیہ کب سے ہمارے لئے اپنے مکان کے سامنے والی چٹان پر مجسمہ انتظار بنی بیٹھی تھی، دور سے اس نے ہماری موٹر کو آتے دیکھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، دوڑی ہوئی وہ موٹر تک آئی، وہ بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی، عربی ملبوس اس کے تبسم پر کھلا جا رہا تھا،

بے ساختہ وہ مجھ سے چمٹ گئی، اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں، سمیہ عید مبارک، مسعود نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، آپ نے بہت دیر لگائی، اس نے شکایتی لہجہ میں کہا، میں نے خیال کیا شاید آج آپ نہیں آئیں گے، چلئے، ابا آپ کا کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہم تینوں جھونپڑے میں داخل ہوئے، بڈھا ماہی گیر کھجور کی چٹائی پر بیٹھا ہوا والہانہ جذبات میں عربی گیت گا رہا تھا، اس کی آواز سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی رقت آمیز تھی، اور آنکھیں نم آلود ابا جعفری آگئے، لڑکی نے اپنے باپ کے گلے میں باہیں حمائل کرتے ہوئے کہا، بڈھا فرط مسرت سے میری طرف بڑھا، قبل اس کے کہ میں اس کے سامنے سر کو خم کروں اس نے مجھے چمٹا لیا، اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ سے میں نے محسوس کیا کہ وہ سسکیاں بھر رہا ہے، سمیہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی، اس نے آنسوؤں کے چند قطرے اپنے دامن میں جذب کر لئے مسعود بھی ہماری محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

ان سے ملئے ابا، آپ جعفری صاحب کے دوست مسٹر مسعود ہیں، سمیہ نے تعارفی لہجہ میں باپ سے کہا، ابراہیم مسعود سے بغلگیر ہوا، بیٹھ جاؤ بیٹا، اس نے کہا، سمیہ آج بے انتہا خوش تھی، اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ، غیر معمولی مسرت کا اظہار کر رہی تھی، اس نے ہمارے آگے مچھلی کے کباب، روٹی اور دودھ میں بھیگے ہوئے کھجور اور کچھ تازہ پھل لا رکھے، آج آپ کی دعوت ہے، اس نے سادگی کے لہجہ میں کہا، دوشیزگی کی رعنائیاں اس پر نثار ہو رہی تھیں بے پروائی کے ساتھ اس نے اپنے بالوں کو سینے پر لا ڈالا تھا، بہت خوب، ہم ضرور کھائیں گے، بڈھا ابراہیم بھی آج ہمارے شریک طعام رہا۔ یقین مانئے ایسی پر لطف دعوت ہم نے کبھی نہیں کھائی، ایک غیر معمولی خوشی ہم اس دعوت میں محسوس کر رہے تھے، سمیہ کے باپ نے معدے کا عذر کر کے صرف دودھ ہی پر اکتفا کی کھانے کے بعد سمیہ نے کہا، ابا آج ہم سمندر کی سیر کریں گے۔

نہیں سمندر کی فضا کچھ خراب سی معلوم ہوتی ہے، کچھ ہو ہم سمندر کی سیر ضرور کریں گے۔ نادان لڑکی اس کے باپ نے ذرا تند لہجے میں کہا، تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پریشان کرنا چاہتی ہے، میں نے کہا اچھا سمیہ ہم پھر کبھی سمندر کی سیر کریں گے اب جانے دو، پھر کبھی کب؟ اس نے منہ بنا کر کہا، اور آج کیا کریں گے ہم، آج گائیں اور بجائیں گے مسعود نے کہا، بھولی سمیہ کھلکھلا اٹھی۔ کون آپ؟ نہیں آپ کے دوست جعفری: یہ شاعر ہیں اور گانے بھی خوب ہیں، لیکن انصاف کی بات اگر پوچھی جائے، بڈھے ماہی گیر نے کہا، سمیہ گانے بجانے میں آپ حضرات سے کم نہیں، اچھا تو سمیہ سناؤ پھر ہمیں، ابا جھوٹ کہتے ہیں، مجھے گانا وانا کچھ نہیں آتا، باپ نے مجبور کیا، بیٹا اب نہیں تو پھر کب؟ ان سے شرم ہی کیا ہے، آپ کہیں تو میں باہر چلا جاؤں مسعود نے طنزاً اٹھتے ہوئے کہا، نہ نہ آپ تشریف رکھئے، سمیہ ضرور آپ کو اپنا گانا سنائے گی۔ سمیہ جھونپڑے کے کونے میں رکھا ہوا گرد آلود بربط اٹھا لائی اور ہمارے مقابل بیٹھ گئی، تاروں کو آہستہ آہستہ جنبش دیتے ہوئے اس نے ایک راگ چھیڑا، اس کی آواز میں ایک قسم کا درد اور ارتعاش پنہاں تھا۔ اس نے گانا شروع کیا، کسی نظم کے چند شعر جن کا مطلب یہ تھا، عید کی صبح کیف و نور کی بارش ہو رہی ہے، بچے، جوان اور بڈھے سب کے سب بادۂ مسرت سے جھوم رہے ہیں، ان کے قیمتی رنگین ملبوسات ان کی خوشیوں میں مزید اضافہ کر رہے ہیں، اور دنیائے مسرت کا ذرہ ذرہ انھیں نغمۂ مسرت سنا رہا ہے، اور خوبصورت مقدس حوریں ان کی خدمت میں مبارکبادی کے پرمسرت تحفے پیش کر رہی ہیں۔ یہ اشعار بے حد متاثر کن اور دلچسپ پیرایہ میں گائے گئے تھے، ہم میں سے ہر ایک متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آفتاب افق مغرب سے ڈھلک چکا تھا، اور تاریکی آہستہ آہستہ روئے زمین پر مسلط ہو رہی تھی ہم دونوں سمیہ اور اس کے باپ سے رخصت ہو کر گھر چلے آئے۔

دو دن تک ہم باہر نہ نکل سکے، کیونکہ عید کے دوسرے دن سے مسعود بخار میں مبتلا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ کمزور سا ہوگیا تھا، جیسے وہ کئی دنوں کا بیمار رہا ہو' تیسرے دن مسعود کے نام ہندستان سے تار آیا کہ کالج ۶ ستمبر کو کھلنے والا ہے' فوراً چلے آؤ' ہندستان جانے سے ایک دن پہلے میں سمیہ سے ملنے کے لئے گیا' مسعود میرے ساتھ نہ آیا وہ سفر کی تیاری میں لگا رہا۔ کل ہم جا رہے ہیں سمیہ' میں نے اس کے نازک سے ہاتھوں کو تھام کر کہا' جب کہ ہم دونوں سمندر کے کنارے والی چٹان پر بیٹھ گئے تھے۔ کل کہاں ؟ ہندستان' اس نے غمگین لہجے میں کہا' ہاں اپنے وطن' دو ہفتے کے بعد ہمارا کالج کھلنے والا ہے' کاش آپ مجھ سے نہ ملے ہوتے' اس نے حسرت و یاس کے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ سمیہ تم تردد نہ کرو' ہم یقیناً پھر ملیں گے۔ شاید حشر کے دن' اس کا لہجہ مایوسی لئے ہوئے تھا' سمیہ کے یہ الفاظ مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہے' وہ مجھ سے بے اختیار چمٹ گئی' اس کی آنکھوں سے محبت کے چشمے پھوٹ نکلے' آہ کیا معلوم تھا کہ آپ اس قدر جلد جدا ہوں گے' میں نے آپ سے کیوں محبت کی' آپ پردیسی ہیں دور سمندر پار کے رہنے والے' لیکن پیارے جعفری میں مجبور تھی' تمہارے بلند اخلاق نے مجھے گرویدہ بنا لیا۔ ابا کو آپ کی جدائی شاق گذرے گی' آہ اب کیا ہوگا' مسلسل آنسو بہہ بہہ کر اسے نڈھال کر رہے تھے۔ سمیہ خدا کے لئے صبر کرو' جانتی ہو صبر کا پھل کتنا میٹھا ہوتا ہے' میرا ضمیر گواہی دے رہا ہے کہ ہم پھر ضرور ملیں گے۔ آپ نہیں جانتے جعفری! دنیا میں کیسے کیسے انقلاب ہوتے ہیں۔ لیکن سمیہ ہر حال میں خدا کی قدرت پر بھروسہ رکھو' امید بڑی چیز ہے' آہ پیارے جعفری آپ میرے دل کو ڈھارس دے کر زندہ رکھنا چاہتے ہیں' میں مجبور ہوں' میرا دل اندر ہی اندر سینے میں بیٹھا جا رہا ہے' مجھے تو یہ معلوم ہو رہا ہے' کہ ہم عمر بھر کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں' کوئی زبردست طاقت ہمیں جدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبر اور شکر سے کام لو سمیہ' تم زیادہ رو کر ہلکان نہ ہو' یقین مانو' تمہاری محبت میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتی' آہ کیا معلوم تھا کہ ہماری محبت اس قدر ادھوری رہ جائے گی۔ سمیہ اٹھو اب یہاں سے' مجھے تمہارے ابا سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ للٰہ بیٹھئے خدا معلوم آپ کب ملیں گے' آپ مجھ سے خوب باتیں کیجئے' مجھے اپنے سینے سے لگا رکھئے' اف اتنی طویل مدت عمر کا نامعلوم حصہ' یہ نہ کٹنے والی جدائی کی پہاڑ سی راتیں' میں کیسے برداشت کرسکوں گی آہ میرا ضعیف باپ مجھے اس حالت میں کیسے دیکھ سکے گا' خدا اس پر رحمت کے پھول برسائے۔ میں بڈھے ماہی گیر سے جا ملا اور اس سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ بڈھا کسی خیال کے تحت بہت زیادہ متفکر نظر آ رہا تھا۔ خدا تمہیں خوش رکھے' اس نے یاس آمیز لہجے میں کہا' لیکن بیٹا' ہمیں بھولنا نہیں میرے بعد سمیہ ۔ تمہاری ...... بڈھا آگے کہہ نہ سکا' اس پر رقت سی طاری تھی ۔ بے ساختہ میں اس سے چمٹ گیا اور بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا' زیادہ نہ رو بیٹا' خیر سے اپنے وطن سدھارو' کبھی کبھی اپنی خیریت کی چٹھی بھیجا کرنا' سمیہ تمہارے لئے پریشان رہے گی' اسے تم سے محبت ہے' آہ! غریب لڑکی' بڈھا ابراہیم مجھے وداع کرنے کے لئے دروازے تک آیا' ایک بار پھر وہ مجھ سے چمٹ گیا' جاؤ بیٹا خدا حافظ آپ بزرگ ہیں دعا کیجئے' میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا' خدا کارساز ہے' وہ بچھڑوں کو ملاتا ہے۔ سمیہ دور تک میرے ساتھ چلتی رہی' اس کی محبت نواز آنکھیں اب بھی دریا بہا رہی تھیں' اس نے ہچکیاں بھر بھر کر کہا اچھے جعفری مجھے بھولنا مت' میں تمہارا انتظار کروں گی' عید کے دن اسی چٹان پر بیٹھی ہوئی۔ میں اس سے وداع ہوکر موٹر میں بیٹھ گیا' میں نے دیکھا سمیہ موٹر کے نظروں سے اوجھل ہونے تک اپنے رومال کو جنبش دیتی رہی۔ دل پر د غم کا بار لئے ہوئے گھر پہنچا۔ اور صبح جانے والے جہاز سے میں اور مسعود ہندستان روانہ ہوگئے۔

ہندستان آکر میں نے دو خطوط سمیہ کے یہاں روانہ کئے' اور اس کے جواب میں مجھے اس کا ایک خط ملا۔ جس میں اس نے اپنی مسلسل

پریشانیوں اور اپنے باپ کی طویل علالت کا ذکر کیا تھا کہ اس کا باپ دن بھر گھر میں پڑا رہتا ہے اور وہ تمام دن محنت کر کے روزی حاصل کرتی ہے، میں نے اس کے لئے یہاں سے کچھ روپے روانہ کئے اور ہفتے میں ایک مرتبہ خط لکھنے کی تاکید کی، دو ماہ کے بعد سمیہ نے میرے پاس ایک پریشان کن خط لکھا :-

"باپ اپنی طویل علالت کے بعد مجھے اس دنیا میں اکیلی چھوڑ کر چلا گیا۔ سمندر کے اس پار سنہری ساحل کے قریب، فرشتوں کی نورانی بستی میں، آہ جعفری، مجھے اس دنیا میں تنہا مصائب کی گھڑیاں جھیلنے کے لئے زندہ درگور کر کے۔ بتاؤ جعفری اس دنیا میں میرا کون ہے، ایک تم، بہت دور جہاں سے آنے کے لئے پندرہ دن کی مدت درکار ہے بتاؤ پیارے تم کب آؤ گے؟ شاید عید کے دن میں تمہارا انتظار کروں گی یہیں سمندر کے کنارے والی چٹان پر۔"

میں نے اس کے جواب میں بہت کچھ تشفی آمیز جملے لکھے، یہ کہ مسعود ہر سال اپنے والدین سے ملنے کے لئے عید کو آیا کرتا ہے۔ میں بھی ضرور اس کے ساتھ تم سے ملنے کے لئے آؤں گا۔ مسعود گھر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، ایک ہفتہ پیشتر میں اپنی والدہ کی علالت کے سلسلے میں وطن چلا آیا تھا، اس نے مجھے لکھا، آج رمضان کی بارہ تاریخ ہے تم مجھ سے سولہ تاریخ کو بمبئی میں ڈپٹی صاحب کے گھر پر ملو۔ دن بہت کم رہ گئے ہیں، عید کے دن ہمیں عدن پہونچنا ہے۔ والدہ کا مزاج بہت زیادہ خراب تھا، ڈاکٹر نے انھیں پہاڑی مقام پر لے جانے کی رائے دی تھی، والد نے اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے یہ کام میرے ہی ذمہ رکھ چھوڑا، اور مجبوراً مجھے اس اہم فرض کو انجام دینا پڑا۔ میں نے مسعود کو اپنا حال لکھ بھیجا، اور یہ بھی لکھا کہ تم ضرور جاؤ، میری مجبوریوں سے تم اچھی طرح واقف ہو، سمیہ کو میرا پیام پہونچا دینا میں بہت جلد اس سے ملنے کی کوشش کروں گا مسعود گیا اور آیا بھی، اس نے اپنے سفر کے واقعات بیان کئے اور سمیہ کے بھی، عید کے ایک دن پہلے وہ اپنے گھر پہونچا، اس کے گھر والوں نے اب کی دفعہ میرے نہ آنے پر اظہار

افسوس کیا۔ عید کی شام مسعود سمیہ سے ملنے کے لئے گیا، دور سے اس نے سمندر کے کنارے چٹان پر ایک لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ اسے پہچان نہ سکا، وہ کچھ بیمار سی دکھائی دے رہی تھی، اس کے گلابی گال خزاں دیدہ پتوں کی طرح زرد پڑ گئے تھے، اور آنکھوں کے گرد سیاہ گہرے حلقے، قریب جا کر اس نے پہچانا وہ سمیہ ہے۔ سمیہ نے غور سے مسعود کو دیکھا، اس کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا، جعفری۔ جعفری ہندستان میں ہیں وہ نہ آسکے، ان کی والدہ بہت سخت بیمار ہیں، آہ - وہ نہ آسکے - اس عید کے دن بھی - سمیہ تم زیادہ رنج نہ کرو، وہ آئیں گے ضرور آئیں گے وہ تم سے ملنے کے لئے بہت زیادہ بے چین ہیں - ہاں آئیں گے مسعود بھیا میرے مرنے کے بعد، وہ ضرور آئیں گے، جعفری تم آؤ گے، ضرور آؤ گے۔ میری نعش پر آنسو بہانے کے لئے، وہ چپ ہو گئی - شدت غم سے اس کی عجیب حالت ہو گئی تھی، عید کے دن اس نے کوئی اچھا لباس بھی نہ پہنا تھا ہچکیوں سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا، بے تابانہ وہ ریت پر گر پڑی۔ مسعود بھیا، اس نے کراہتے ہوئے کہا - میرا آخری پیام ان تک پہونچا دو۔

سمیہ نے تمہارا انتظار کیا، اس سمندر کے کنارے چٹان پر عید کے دن وہ تمہاری محبت میں جان سے گذر گئی، تم اسے معاف کر دو گے نا اب زیادہ انتظار کی تاب اس میں باقی نہ تھی، اس کی دلی آرزو ہے کہ تم اسے بھول جاؤ، اس نے خوشی خوشی اپنی جان دی، اس لئے کہ حشر کے دن وہ تم سے ضرور ملے گی،

غم نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تھا، اس کا نازک سا دل پیہم حوادث کی تاب نہ لا سکا اور وہ .... ہمیشہ کے لئے روٹھ کر چلی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ آج تک اس شہر میں اس طرح کا شاندار جنازہ کسی کا نہیں نکلا، سمندر کے کنارے جہاں بیسیوں جہاز اس کے قریب سے گذرتے ہیں، ہر شخص کی آنکھیں اس کے مزار کے قریب کی تختی پر لکھے ہوئے حروف دیکھ کر نم آلود ہو جاتی ہیں "اس نے عید کے دن اپنی جان دی اس سمندر کے کنارے چٹان پر، اس کی پاک روح خوبصورت حوروں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہے وہ اب بہت خوش ہے کیونکہ وہ یہ جانتی ہے کہ حشر کے دن اپنے محبوب سے ضرور ملے گی"

صدا آر کہ سگہ ؟ ،

چھاپہ خانہ

ایک فرانسیسی ماہر کا قول ہے کہ کسی ملک کی دماغی پیمائش خیالات کے ارتقا اور علوم و فنون کا صحیح اندازہ لوگوں کی زرق برق پوشاکوں اور عالی شان عمارتوں سے نہیں بلکہ وہاں کی تصنیف و تالیف اعلیٰ طباعت اور دیدہ زیب تصویروں اور اشکال سے کیا جاتا ہے۔

متمدن ممالک میں روزنامے، قدیم تصویریں اور نئے علوم کے انکشافات پر روز آنہ بیسیوں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کی طباعت دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہر نقشہ ہر تصویر اور ہر شکل اپنی نوعیت اور خصوصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف کاغذ پر اور ایک دوسرے سے مختلف طریقوں پر چھپی ہوتی ہے؛ ہر ایک کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی دیکھو تو ان میں یکسانی، ہم رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

جب چھاپے خانے نہیں تھے تو کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ وہ بہت قیمتی ہوتی تھیں۔ اس لئے ان سے صرف دولت مند لوگ ہی فائدہ اٹھاتے اور بے چارے غریب محروم رہ جاتے تھے۔ ٹائپ ایجاد ہونے کے بعد ہزاروں چھاپے خانے کھل گئے، ہر جگہ طباعت ہونے لگی، گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام پانے لگا اور چھوٹا بڑا، امیر و غریب غرض یہ کہ ہر شخص علم کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ اس قسم کے چھاپے خانوں نے دوسرا بڑا احسان یہ بھی کیا کہ مصنفوں کو کاتبوں کے پنجے سے نجات دلا دی اور کتابوں کو غلطیوں سے پاک و صاف کر دیا۔

کاتبوں کی غلطیاں ضرب المثل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کاتب ہی نہیں جو غلطی ہی نہیں بلکہ فاش غلطی نہ کرے۔ ان کے بعض واقعات نے تو لطیفوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ آذری کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے اپنا دیوان، امینائے کاتب سے لکھوایا۔ مکمل ہونے کے بعد دیکھا تو ہر جگہ غلطیاں پائیں۔ یہ دیکھ کر اسے بہت رنج ہوا اور یہ قطعہ کہہ کر اپنے دیوان کے آخر میں لکھ دیا۔

دیوان بندہ را کہ امینا سواد کرد — تنہا درو نہ شعر مجدد نوشتہ است
در نظم و نثر ہر چہ بطبعش خوش آمدہ — دیوان بندہ پُر ز خوش آمد نوشتہ است
ہر جا کہ لفظ بد مثلاً دید در سخن — دست تصرفش ہمہ را بد نوشتہ است
اکنوں شریک بہتر دیوان بندہ است — زیرا کہ بیشتر سخن خود نوشتہ است

یعنی میرا دیوان امینائے کاتب نے لکھا ہے اس میں نہ صرف اس نے اپنی طرف سے اشعار گھڑ گھڑ کر لکھ دیئے ہیں بلکہ نظم و نثر میں سے جو کچھ اس کو اچھا معلوم ہوا میرے دیوان میں بے تکلف داخل کر دیا۔ مثلاً جس جگہ لفظ بد لکھا دیکھا اس کو ہر جگہ بد لکھ دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اب وہ میرے دیوان کا شریک غالب ہے کیونکہ اس میں زیادہ کلام ان کا ہی ہے۔

غرض یہ کہ کاتب اپنی دھن میں کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے۔ اگر کہیں شہر ببر ہے تو وہ شیر ببر لکھتا ہے اور اگر کہیں استغاثہ کاذبہ لکھا ہے تو وہ اسے استغاثہ کا ذبہ لکھ دیتا ہے۔ اسی طرح آلو کی جگہ "الو"، بابو کی جگہ "بابو"، "نتھو کی جگہ "نتھو" اور انڈسٹیریل کی جگہ "انبڈسٹریل" لکھنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بعض اوقات تو یہ لوگ

جوش میں آکر بڑے بڑے لوگوں کے نام بھی غلط لکھ جاتے ہیں،
چنانچہ ایک جگہ لکھا تھا "مولانا شبلی" تو کاتب صاحب نے لکھا
"مولانا ستلی" اور لطف یہ ہے کہ وہی کتاب میں بھی چھپ گیا اور
بعض حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ حقیقت میں مولانا کا
اصلی نام مولانا شبلی تھا یا "مولانا ستلی"۔ اسی طرح ایک صاحب
اپنی کتاب میں مولوی علی حیدر صاحب طبا طبائی کی اصطلاح
سازی کی خدمات کا ذکر کرنا چاہتے تھے۔ کاتب نے اصطلاح
سازی کو "اصلاح سازی" بنا دیا۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ٹائپ یا اس قسم کی دوسری طباعت
رائج ہے وہاں یہ غلطیاں ہونا ناممکن ہیں۔ اگر کوئی انگریزی
قسم کا چھاپہ خانہ دیکھو تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ
جاتی ہیں۔ اس میں بیسیوں شعبے ہیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے
کہ دنیا بھر کے مختلف چھاپے خانے لاکر یہاں جمع کر دیے ہیں۔
آرٹسٹ، ایچر، انگریور، پروف ریڈر، کمپوزیٹر سب کے
سب اپنے اپنے شعبوں میں سر جھکائے کام میں مصروف
ہیں۔ آگے چلو تو لیتھو سکشن ہے۔ اس میں فوٹو لیتھو،
زنکو گرافی، ہیلیو زنکو، وینڈا ایک سسٹم اور کولو سسٹم پر کام
ہو رہا ہے۔ دوسری طرف دیکھو تو ٹائپ کا شعبہ ہے، لائنو
ٹائپ، انٹر ٹائپ اور مونو ٹائپ پر آپریٹر کام کر رہے
ہیں۔ کہیں لائن بلاک، ہاف ٹون بلاک اور سہ رنگی بلاک
تیار ہو رہے ہیں، کہیں فوٹو گریور (Photo gravure) اور روٹو گریور (Rotogravure)
کی پلیٹیں تیار کی جا رہی ہیں، کہیں چاک پلیٹ پروسس سے
کارٹون اور نقشے تیار ہو رہے ہیں، کہیں ویکس انگریونگ
سے فوٹو کی پلیٹیں بنائی جا رہی ہیں، کہیں اسٹیریو ٹائپنگ ہو رہا
ہے تو کہیں الیکٹرو ٹائپنگ سے بلاک تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ
تمام پلیٹیں تیار ہوتی ہیں اور مشین روم میں طباعت کے لیے
بھیج دی جاتی ہیں۔

اب ذرا مشین روم کی سیر کیجئے تو ہر نمونے کی
مشینیں دیکھ لیجئے۔ پروف پریس، جابرس (Jobbers)، پلیٹن (Platin) اور ٹریڈل مشینیں
برقی قوت سے چل رہی ہیں اور ان کی آواز سے کمرہ گونج
رہا ہے۔ کہیں فلیٹ بیڈ مشین پر طباعت ہو رہی ہے تو کہیں
آفسیٹ مشینوں پر کام ہو رہا ہے۔ ایک طرف زبردست ملٹی کلر
روٹری پریس ہے جہاں وقت واحد میں پورا کا پورا رسالہ چھپ جاتا
ہے، وہیں مڑتا ہے، وہیں جزو بندی ہوتی ہے، وہیں کٹتا
ہے اور وہیں سے سل کر مکمل حالت میں نکلتا ہے یہ سب کام
مشینوں کے ذریعے انجام پاتا ہے اور کسی کو ہاتھ لگانے کی
ضرورت نہیں پڑتی۔

مختصر یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جدید ترین آلات
اور مشینوں سے بیحد تیزی اور کثرت سے طباعت ہو رہی ہے۔
کاغذ کی فراہمی کے لئے رات دن جنگل پر جنگل کٹتے چلے جا رہے
ہیں، روزانہ سیکڑوں اخبار میگزین اور رسالے کروڑوں کی
تعداد میں چھپتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹے ٹکٹ سے لے کر
بڑے سے بڑے پوسٹر ہماری نظر سے گزرتے ہیں مگر ہمیں
خیال تک نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح چھپتے ہیں۔ اس لئے طباعت
کے مختلف طریقے اور ان کی تدریجی ترقی پر ایک سرسری نظر
ڈالنی نہایت ضروری ہے جس سے چھاپے خانوں کی طباعت
اور ان کے کاروبار کا ایک دھندلا سا خاکہ ہماری آنکھوں
کے سامنے کھنچ جائے گا۔

عام طور پر طباعت تین قسم کی ہوتی ہے ایک تو ریلیف پرنٹنگ (Relief printing) یعنی ابھری ہوئی طباعت، دوسری انٹیلیو پرنٹنگ یعنی گہری طباعت اور تیسری سرفیس پرنٹنگ یعنی سطح سطح پر طباعت۔

ریلیف پرنٹنگ میں تحریر سطح سے ابھری ہوئی ہوتی ہے اور اس ابھری تحریر پر سیاہی لگا کر داب دیتے ہیں جس سے وہ تحریر چھپ جاتی ہے۔ اس میں متحرک ٹائپ، وڈ بلاک (Wood Block) لائن بلاک اور ہاف ٹون بلاک وغیرہ شامل ہیں۔ متحرک ٹائپ سے عام طور پر لوگ واقف ہیں۔ یہ چوکور ٹکڑے لکڑی کے ہوتے ہیں یا ایک خاص قسم کی دھات کے ہوتے ہیں جو سیسا، سرمہ، ٹین اور کچھ تانبا ملا کر بنائی جاتی ہے۔ ان کے سروں پر حروف یا ڈزائن ڈھال لیا جاتا ہے یا کسی نوک دار چیز سے کاٹ کر ابھار لیا جاتا ہے۔ انگریزی اور نسخ ٹائپ کے نمونے عموماً اوسط درجوں کے چھاپے خانوں میں ہوتے ہیں اور فاؤنڈریوں میں ڈھالے جاتے ہیں۔ یہی وہ ٹائپ ہے جو متحرک ٹائپ کے نام سے مشہور ہے۔

کہتے ہیں کہ متحرک ٹائپ چینیوں نے ایجاد کیا تھا اور چھٹی صدی عیسوی میں وہ لوگ عام طور پر اسی ٹائپ سے طباعت کرتے تھے مگر چند روز کے بعد اس طریقہ طباعت کو انھوں نے ترک کر دیا اور بھول گئے۔ اب حالیہ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ سنہ ۱۴۵۵ء میں جان گٹنبرگ نے بلا کسی علم و اطلاع کے از خود متحرک ٹائپ بنایا۔ یہ جرمنی کا مشہور و معروف کاریگر تھا۔ ابتدا میں اس نے لکڑی پر حروف کھود کر طباعت کی، پھر لکڑی کے ٹکڑوں پر حروف تراشے اور اس کے بعد کسی خاص دھات کا ٹائپ بنا کر پہلی مرتبہ انجیل چھاپی۔ چند روز کے بعد یہ ٹائپ عام ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کیکسٹن (Caxton) نامی شخص نے انگریزی ٹائپ بنا کر ایک چھاپہ خانہ کھولا اور پھر سیکڑوں چھاپے خانے کھل گئے اور ہر جگہ ٹائپ کے ذریعے طباعت ہونے لگی۔

دوسرا طریقہ انٹیلیو پرنٹنگ یعنی گہری طباعت کے نام سے مشہور ہے یہ ریلیف پرنٹنگ کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں تانبے یا فولاد کی سطح پر گریور کے ذریعہ تحریر یا نقش کھودتے ہیں۔ ان نقوش میں سیاہی بھر کر سطح کو بالکل صاف کر دیتے ہیں۔ پھر اس پر کاغذ رکھ کر دونوں کو لوہے کے بھاری سلنڈروں کے بیچ میں سے گزارتے ہیں۔ جب ان کھودے ہوئے مقاموں پر داب پڑتی ہے تو سیاہی اندر سے نکل کر کاغذ کی سطح پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس طریقہ سے طباعت کرنے میں وقت بہت صرف ہوتا ہے اور اخراجات بھی زیادہ بیٹھتے ہیں۔ اس لئے بعض لوگ اسے فضول خرچی میں شمار کرتے ہیں مگر واقعہ ہے کہ انٹیلیو پرنٹنگ دورِ حاضرہ کی تہذیب میں داخل ہو گئی ہے۔ جو خوبصورتی اور نزاکت اس میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور طریقے سے لاغیر ممکن ہے۔ حروف سطح سے اس طرح ابھرے رہتے ہیں کہ گویا کاغذ پر موتی جڑ دیئے ہیں۔

انٹیلیو پرنٹنگ سے صرف وزیٹنگ کارڈ اور مونوگرام ہی نہیں چھاپے جاتے بلکہ تقریباً تمام جمالیاتی طباعت فنی اور نمائشی کام آج کل اسی طریقے سے چھاپا جا رہا ہے۔ چنانچہ شادی کے رقعے، دعوتی کارڈ، شاہی فرمان، سرکاری اعلان

ایٹ ہوم کے کارڈ، بنک نوٹس، چیک، مراسلات کی پیشانیاں ٹائٹیل پیج اور کرسمس کارڈ وغیرہ کی اسی طریقے سے طباعت کی جا رہی ہے۔

ابتدا میں تصویریں وغیرہ بھی تانبے پر کھود کھود کر چھاپتے تھے مگر سنہ ۱۸۲۴ء میں اور نیفور (Neceph ore) نے میکانی طور پر پلیٹ بنانے کی کوشش کی پھر تیس سال کے بعد ٹالبیٹ (Tallbot) نے جیلٹن اور پٹاشیم بائی کرومیٹ کے خواص معلوم کر کے تصویر، راست پلیٹ پر منتقل کی اور آئرن پر کلورائڈ سے کھود کر پلیٹ تیار کر لی۔ یہ طریقہ فوٹو گر یور (Photo gravure) کے نام سے مشہور ہے اور بعض چھاپے خانوں میں اب تک بجنسہ اسی طرح رائج ہے۔

فوٹو گر یور سے چھپی ہوئی تصویروں میں حسن کارانہ اثرات اور مصورانہ شان پائی جاتی ہے۔ تصویر کے خد و خال اور ہائی لائٹ اور شیڈ کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ مندرجۂ بالا طریقہ پر پلیٹ تو بہت جلد تیار ہو جاتی تھی مگر اس کے چھاپنے میں بڑی دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں یعنی دن بھر میں تقریباً تین سو یا چار سو کاپیاں طبع ہوتی تھیں اس لئے اسے تجارتی اصول پر چلانے کے لئے ایک اور طریقہ ایجاد کیا گیا جس سے اب چار ہزار کاپیاں فی گھنٹہ طبع ہو جاتی ہیں، یہ طریقہ روٹے گر یور (Rota gravure) کے نام سے مشہور ہے۔

اسی طریقے سے اخبار، میگزین، مصور ماہ نامے، پوسٹر، فہرستیں، اشتہارات، پوسٹ کارڈ، سادے کام، رنگین کام غرض یہ کہ جو کچھ فوٹو گر یور اور ہاف ٹون وغیرہ کے ذریعہ طبع ہو سکتا ہے وہ تمام کام، نہایت حسن و خوبی کے ساتھ، جلد اور سستے داموں میں طبع کیا جا سکتا ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ ٹائپ میٹر، تصویریں اور اشکال سب کے سب ایک ہی سلنڈر پر منتقل کر کے ایک ساتھ ہی چھپ جاتی ہیں۔

تیسرا طریقہ سرفیس میتھڈ یا پلینو گرافی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں لیتھو گرافی، ہلیو ٹیپو گرافی اور کولو ٹائپ وغیرہ شامل ہیں۔

لیتھو گرافی سے مطلب پتھر پر لکھنے یا پتھر کے ذریعہ چھاپنے کے ہیں اس طریقہ طباعت کو سنہ ۱۷۹۶ء میں الائے سنفیلڈر نے معلوم کیا تھا۔ الائے سنفیلڈر بوہیما کے پایۂ تخت پراگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر علم موسیقی کے جانب تھا۔ وہ ہمیشہ اس جستجو میں رہتا تھا کہ اپنی نظموں کو کسی آسان طریقہ سے چھاپ کر پبلک میں پیش کرے۔ چنانچہ اس نے بجائے جست کے پتھر پر طباعت کا کام شروع کیا۔

پہلے اس نے تحریر کو پتھر کی سطح پر کھود دی جس طرح مہریں یا ڈائیاں کھودتے ہیں۔ پھر اس نے تیزاب کی مدد سے اس طرح کھودا جس طرح لکڑی کے چھاپوں پر نقش ابھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اور چند روز کے بعد اسے یہ پتا چل گیا کہ تحریر پتھر کی ہموار سطح پر بھی چھپ سکتی ہے نہ تو حرفوں کو کھودنے کی ضرورت ہے اور نہ انھیں ابھارنے کی حاجت۔

اب دیکھو تو پتھر کی سطح پر حرف لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ چھاپتے وقت ایک شخص پتھر کی سطح کو پانی کا پچارا دے کر تر کر دیتا ہے، دوسرا سیاہی کا بیلن پھیر دیتا ہے۔ تیسرا کاغذ جما کر پریس چلا دیتا ہے اور اس طرح کھٹا کھٹ چھپتا چلا جاتا ہے۔

جب چھاپے کی کامیابی اس نوبت پر پہنچی تو سفیلڈر نے ۱۸۰۳ء میں جرمنی، اسٹریلیا اور انگلینڈ میں اپنے حقوق محفوظ کرادئے، پھر تو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں فوٹو لیتھوگرافی کے ذریعے طباعت ہونے لگی، رنگین تصویریں چھپنے لگیں، حجری دور ختم ہوا اور چھاپے خانوں میں بجائے پتھر کے جست اور ایلیومنیم کی چادریں استعمال ہونے لگیں، لکڑی کے پریس جلا دیئے گئے، اور اسٹیم سلنڈر پرنٹنگ پریس نے طباعت کی دنیا میں ایک بجلی کی لہر دوڑا دی۔

آج کل ہر قسم کی طباعت میں یورپ کے چھاپے خانے برابر ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر کسی طریقے سے ان مختلف طباعتوں کے موجد یعنی گٹنبرگ، کیکسن، نیسی فر، البرٹ اور سنیفلڈر وغیرہ آجائیں اور کسی اچھے چھاپے خانے کا معائنہ کریں تو یقین ہے کہ وہ خود اپنی ایجادوں کو بھول جائیں گے اور جن طریقوں سے آج کل چھپائی ہو رہی ہے اس کو نئی ایجاد تصور کرنے لگیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

اقبال نمبر اس نمبر میں شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کی حیات اور کلام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کو مختلف اہل قلم نے نہایت تحقیق اور محنت سے واضح کیا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں کی نظمیں اقبال سے متعلق شایع کی گئی ہیں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے حضرت کے بیانات بھی شامل ہیں۔ حیدرآباد میں یوم اقبال کے مضامین کا اقتباس بھی دیا گیا ہے۔ اقبال کے بعض اشعار کو مصور بھی کیا گیا ہے۔ خان بہادر عبدالرحمن چغتائی نے اقبال کی ایک رباعی کو اپنے مخصوص انداز حسن کاری میں مصور کیا ہے۔ خاص کر اقبال کی ایک نایاب تصویر شایع کی گئی ہے جس میں اقبال اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ اس تصویر کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ اکثر رسائل نے سب رس سے مستعار لے کر اس کو شایع کیا ہے۔

کتابت طباعت وغیرہ نہایت نفیس اور علامہ اقبال کے شایان شان۔

تعداد صفحات (۱۶۸) تعداد تصاویر (۶) قیمت ۸ عہ/

گل بوٹے

ایک دن ہمارے ایک پڑوسی کچھ عجب صورت بنائے، منہ لٹکائے، آنکھوں میں آنسو بھرے، وحشت زدہ اِدھر اُدھر دیکھتے

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں"

گنگناتے ہوئے ہمارے گھر قدم رنجہ ہوئے اور اپنی "پریشانی خاطر" سنا کر ہم سے مشورہ مانگنے لگے۔

واقعات یہ ہیں کہ موصوف کا بیاہ ہو کر پونے نو سال ہوتے ہیں، اس مدت میں آپ کو صرف پون درجن بچے ہوئے جن میں دو لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں، یہ سب کے سب بفضلہ تعالیٰ زندہ ہیں۔ آپ کی آمدنی کی تفصیل یہ ہے کہ تنخواہ تو دو ڈھائی سو روپے سے زیادہ نہیں ہے مگر "بالائی آمدنی" معقول ہوا کرتی ہے، افسوس ہے کہ اس آمدنی میں کچھ عرصہ سے غیر معمولی کمی ہوتی جا رہی ہے، یہ غالباً ملک کی اقتصادی پستی کا سبب ہے، جہاں کسی معاملہ میں ہزاروں ملا کرتے تھے اب سیکڑوں پر نوبت آگئی ہے، اس کمی کا آپ کے بجٹ پر خاص اثر پڑا ہے اور آمد و خرچ کا توازن بگڑ گیا ہے اس سلسلہ میں آپ کی بیگم کے مزاج کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے، اور وہ بہت تلون مزاج ہوتی جا رہی ہیں، ان کے غصہ کا پارہ ایک سو دس ڈگری تک پہنچ گیا ہے، کبھی آپ کو دفتر میں دیر ہو جائے یا راستہ میں کسی دوست کے پاس ٹھیر کر دیر سے گھر آئیں تو ایسی موسلا دھار برس پڑتی ہیں کہ ساون بھادوں کا مینہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے، گرجنے کڑکنے اور برسنے کے علاوہ آپ کے آستین و گریبان کی بھی خیر نہیں!! اس تقریب میں آپ کے ایک دو قمیص ہر ہفتہ شوز صاف کرنے اور برتن پونچھنے کے کام آتے ہیں آپ کے جسم پر بعض جگہ زخموں کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو!

خیر آپ کی "تواضع" تو اسی طرح ہوتی رہے گی کیونکہ آں محترمہ کی عادت تو چھوٹنے سے رہی! مگر اب سوال موصوف کے آمد و خرچ کے توازن کو برابر کرنے کا ہے!! خرچ جو اب تک ہوتا رہا ہے وہ تو کم ہونے سے رہا! اور "وضعداری" بھی یہی ہے کہ خرچ کو گھٹا کر اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے بچے بڑے ہوں گے خرچ بھی اللہ رکھے بڑھتا جائے گا اس لئے بڑے سوچ بچار کے بعد ہم نے موصوف کی خدمت میں یہ رائے پیش کی ہے کہ آپ کسی ایسے دفتر میں اپنا تبادلہ کرائیں جہاں "بالائی آمدنی" آپ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفیل ہو سکے تاکہ آمد و خرچ کے توازن کے ساتھ آپ کی بیگم صاحبہ کے مزاج کا توازن بھی برقرار رہے، تبادلہ کی کارروائی میں دو چار ہزار صرف کرنے پڑیں تو کوئی مضایقہ نہیں، برس چھ مہینے میں اتنی رقم آپ مع سود حاصل کر سکتے ہیں۔

موصوف قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آں محترمہ کے گلے پڑنے سے پہلے "بالائی آمدنی" کو آپ حرام کی کمائی سمجھتے تھے اور اب بیگم کی نت نئی خواہشوں اور آپ کی فرماں برداریوں نے حلال و حرام میں امتیاز باقی نہیں رکھا،

اس کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ گھر کی "برکت" اور دل کا "چین" دونوں رفوچکر ہو گئے ہیں۔

بیاہ کے بعد دو چار مہینے تک آپ کا بیان ہے کہ آپ کا غریب خانہ ان کے دم قدم سے رشک ارم بنا رہا اور آپ کے گھر میں واقعی "بہار" آئی ہوئی تھی مگر بے تکلفی شروع ہوتے ہی آپ کی "شامت" آگئی اور وہ اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہو گئیں! جس طرح "لال مرچ" دیکھنے میں نہایت حسین ہوتی ہے مگر ذرا منہ لگائے تو بس خدا یاد آجاتا ہے!! بالکل اسی طرح وہ بھی نکلیں!!! دیکھنے میں نہایت بھولی بھالی، صورت دیکھ کر فرشتے یاد آتے تھے اور جی چاہتا تھا۔

اس کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں!!

مگر ضد اور ہٹ کی اس قدر پکی کہ خدا کی پناہ! موصوف کو اپنا "بچپن" جب یاد آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ سینہ پر لاکھوں سانپ لوٹ جاتے ہیں، اس وقت وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کسی دن آپ کا بھی بیاہ ہوگا اور ایسی "لال مرچ" صفت بیوی سے پالا پڑے گا! جب آپ کو اسی عہد میمنت عہد کا خیال آتا ہے تو زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے!

"وہ بھی کیا دن تھے کہ بیوی گھر میں جب آئی نہ تھی
رنج سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی"!!

باغباں

فن تقریر

ادارہ نے فن تقریر سے متعلق ایک نہایت مفید کتاب شایع کی ہے جو چھ ابواب اور تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں بھی شامل ہیں جن کی مدد سے تقریر کرتے وقت ٹھیک طور پر کھڑے ہونے اور حرکات و سکنات کے سلسلے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ طلباء کے فائدے کے لئے اس کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔

قیمت ۸ /

نئی کتابیں

۱۔ مضامین نہرو مرتبہ آنند نرائن ۲۵۴ صفحات قیمت عـاں ۔ انڈین پریس ۔ الہ آباد ۔

۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو (دوسرا ایڈیشن) مرتبہ پروفیسر اعجاز حسین ۴۰۰ صفحات قیمت عـاں انڈین پریس آلہ آباد ۔

۳۔ اسلام کا اقتصادی نظام از محمد حفیظ الرحمٰن ۲۶۴ صفحات قیمت عـہ ندوۃ المصنفین ۔ دہلی ۔

۴۔ باغ دلکش (مجموعۂ کلام) از سید مسعود حسن مسعود ۲۰۸ صفحات حشر بکڈپو ۔ ملتان

۵۔ گلبانگ آزادی (رباعیات) از نہال سیوہاروی ۷۵ صفحات قیمت ۸ر مکتبہ برہان ۔ دہلی ۔

۶۔ پیام کیف (مجموعۂ کلام) از مرزا احسان احمد احسان وکیل قیمت عـہ از مصنف ۔ اعظم گڑھ ۔

۷۔ رہنمائے تاریخ اردو (تاریخ گوئی کے اصول) از محمد عبدالقادر وکیل قیمت ۱۲ر از مصنف بنارس ۔

۸۔ تحفۂ ربیع الاول (اسلامی تعلیم) از محمد بدرالدین خاں ۱۶۰ صفحات قیمت ۸ر بیگم بدرالدین خاں سب جسٹرار ۔ دربھنگہ ۔ بہار ۔

۹۔ ہندوستانی تہذیب کی تکمیل (مجموعہ تقاریر) از کالیداس کپور قیمت ۸ر نولکشور پریس ۔ لکھنؤ ۔

۱۰۔ انمول رتن (تجارت کے اصول) از لالہ نرنجن داس قیمت ۵ر از مصنف گوجرانوالہ ۔ پنجاب

۱۱۔ آفتاب رسالت (منظوم سیرت) از راؤ بہادر حاجی عبدالحمید خاں منظر ۱۳۰ صفحات قیمت ۸ر حشر بکڈپو ۔ ملتان

۱۲۔ سنکلپ درشن (صحت کے سوال) از پروفیسر جگدیش متر ۲۰۸ صفحات قیمت عـہ سنموہنی آشرم ۔ لاہور

۱۳۔ خیابان البشیر (احوال سید البشیر) مرتبہ ہمدرد بکڈپو ۵۵۲ صفحات قیمت سے ہمدرد بکڈپو ۔ نیو مارکٹ ۔ بنگلور سٹی ۔

۱۴۔ شہنشاہیت (شہنشاہی کا آغاز اور اس کا ارتقاء) از مظفر شاہ خاں ظفر ۲۰۰ صفحات قیمت عـہ ندوۃ المصنفین دہلی ۔

۱۵۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق از حفیظ الرحمٰن ۵۴۳ صفحات قیمت للعہ ندوۃ المصنفین ۔ دہلی ۔

۱۶۔ چارٹن (کپڑوں کی دھلائی اور صفائی وغیرہ) مرتبہ راجستان ٹریڈنگ کمپنی قیمت عـہ از مرتب ۔ فرنگ ۔ لاہور ۔

۱۷۔ نازیت (نازیت کی تشریح) از شاہد حسین رزاقی قیمت عـہ ۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۔

۱۸۔ نئے افسانے از سید حسن ریاض قیمت عـہ " " "

۱۹۔ درد انبساط (مجموعۂ کلام) از عبدالودود درد بریلوی قیمت عـہ " "

۲۰۔ آسمان گھڑی (سورج اور چاند سے وقت معلوم کرنے کے طریقے) قیمت ۴ر۶ مکتبہ جامعہ دہلی ۔

۲۱۔ یورپ مہابھارت (موجودہ جنگ کے حالات) از حامد علی ایم اے ۱۰۴ صفحات قیمت عـہ از مصنف اردو کلب جامع مسجد دہلی ۔

۲۲۔ ترقی کی پہلی سیڑھی (تجارت کے اصول) از ایس اے خالق ۱۴۳ صفحات از مصنف اردو کلب ۔ دہلی

۲۳۔ تعلیمات اقبال از یوسف خاں سلیم ۱۳۶ صفحات قیمت عـہ اقبال اکیڈیمی لاہور

۲۴۔ رہنمائے وراثت از قاضی میراں بخش قیمت عـہ از مولف ۔ نائب تحصیلدار ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

۲۵۔ نئی پود (کہانیاں) از ازہر قدوائی ۔ شرکت ادبیہ ۔ دہلی ۔

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

شعبے اس اثنا میں ادارہ کے حسب ذیل شعبوں کے جلسے ہوئے۔

شعبۂ طلبہ اس شعبے کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۰ اپریل شام میں پانچ بجے ڈاکٹر زور صاحب صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے اراکین شعبہ اور کارکنان ادارہ نے ایستادہ ہوکر حضرت والدہ سلطانہ بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ کی وفات حسرت آیات کے سلسلہ میں قرارداد تعزیت منظور کی۔ جو اس صفحہ کے وسط میں درج ہے۔ اس کے بعد نئے سال کے لئے عہدہ داران و اراکین مجلس عاملہ کا انتخاب کیا گیا جو درج ذیل ہے۔

نائب صدر .... محمود علی
معتمد .... مرغوب الدین
نائب معتمد .... مظفر علی خاں
اراکین .... شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی
معین الدین احمد انصاری
مسیح الدین خاں متین
محمود علی اکبر مشیر
حشمت اللہ خاں
عبد المنعم صدیقی
عارف علی خاں

"شعبہ طلبہ ادارۂ ادبیات اردو کا یہ جلسہ اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ کی والدہ ماجدہ حضرت بڑی بیگم صاحبہ مرحومہ ومغفورہ کے انتقال پر ملال پر اپنے انتہائی رنج و الم کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ مرحومہ ومغفورہ کو خداوند تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اعلیٰ حضرت شاہِ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا ہو۔"

آمین

شعبۂ شعراء و مصنفین دکن اس شعبہ کی طرف سے اس ماہ اخبارات میں حسب ذیل اطلاع شایع کی گئی۔

مرقع سخن جلد اول و دوم میں جن شاعروں کا ذکر درج نہیں ہوسکا۔ ان کے متعلق ایک اور جلد زیر ترتیب ہے۔ اس میں جن شاعروں کا تذکرہ درج رہے گا ان میں ایسے شعراء کے نام ذیل میں لکھے جاتے ہیں جن کی نسبت معلومات درکار ہیں۔ اگر کوئی صاحب ضروری معلومات اور کلام وغیرہ سے کارکنان ادارہ کا ہاتھ بٹائیں تو ادارہ نہایت ممنون ہوگا۔

محمد ماہ محرم۔ نور الدین علی خاں رنگین۔ بخشی میر عاشق علی خاں آیا۔ میر مرتضیٰ مہدی۔ کنہیا لال مہا سنگھ تغیر۔ مہر علی مہر۔ مرزا عطا ضیا۔ شاہ فضل اللہ تفضلی۔ منور الدولہ یار۔ خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت۔ معتبر خاں عمر۔ میر حفیظ الدین واحد۔ میر فخر الدین فخر۔ میر عبد الحی خاں صمصام الملک صارم۔ شیخ احمد مظفر مظفر۔ لال چند رنگین۔ سرونجی رائے لالہ۔ الفت خاں مبتلا۔ محمدی بیگ مرزا شیخ ظہور الدین نامد۔ موہن لال مہتاب۔ عنایت اللہ فتوت۔ لالہ جے کشن بے جان محمد بیگ رضا میر علی مردان خاں یکدل۔ محمد علی نیاز۔ نیاز احمد خاں نیاز۔ میر ہاشم نقیر مرزا محمد جان نثار۔ نجف علی خاں ندرت۔ مرزا داؤد ہنر۔ میر حسین علی خاں ایا۔ بہاؤ الدین حسین خاں عروج۔ میر عباس علی خاں احسان۔ میر عباس علی خاں کافی۔ سجاد علی خاں سجاد۔ حافظ غلام محمود محمود۔ قربان علی بیگ سالک۔ افتخار علی شاہ وطن۔ محمد محسن محسن۔ بچو لال تمکین۔ سیتل پرشاد خرم۔ میر احمد علی قاضی۔ حیدر علی حیدر۔ میر قادر حسین فرق۔ میر تراب علی نور۔ محمد مظفر الدین معلیٰ۔ اقبال یار جنگ اقبال

غلام محمد عرب شوق۔ غلام علی جوش۔ میر حسین علی خاں امیر۔ سید مخدوم حسینی رفعت۔ سید احمد افسر۔ محمد وزیر الدین مہر۔ صاحبزادہ خیرات علی خاں سخی۔ میر محمد علی بخشی۔ امداد حسین حازم۔ میر عباس حسین خاں ششدر۔ میر محمود علی رنج۔ منتجب الدین تجلی۔ سید شاہ ابراہیم عفو۔ محی الدین محفوظ۔ اعظم علی شایق۔ وحید الدین عالی۔ میر وزیر علی خاں جوش۔ شہاب الدین توقیر۔ سید محمد حسینی عقیل۔ عبد الحی بازغ۔ یسین بخش تسکین۔ مجاہد الدین مجاہد۔ احتشام الدین تجلی۔ عبد الوارث خاں وارث۔ محمد علی خاں ناظم۔ صولت جنگ عابد۔ عبد الولی فروغ۔ شایق حسین صفیر۔ محب اللہ خاں عالی۔ عظمت اللہ خاں سرمد۔ اعجاز علی شہرت۔ خواجہ غلام غوث عشق۔ عبد الوہاب عندلیب۔ ریاض الدین ریاض۔ محترم شاہ امید۔ ڈاکٹر احمد علی۔ اکرام الدین خاں اکرام۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر۔ نصیر الدین اصغر۔ نواب ضیغم جنگ سرفراز۔ سید ضمیر الحسن سدرہ۔ میر عابد علی ندرت۔ حکیم میر عابد علی غیور۔ میر باسط علی تمکین۔ مرزا علی جواد جواد۔ مرزا بہادر علی صفی۔

شعبۂ نسواں

شعبہ نسواں کی مجلس عاملہ کا سترہواں اجلاس بمقام جوبلی ہلز بروز یکشنبہ ۲۰ اپریل شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا جس میں حسب ذیل خواتین موجود تھیں۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ
" سارہ بیگم صاحبہ
" جہاں بانو بیگم صاحبہ
" بشیر النساء بیگم صاحبہ
" تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
معتمد شعبہ

لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بوجہ دیگر مصروفیت کے شرکت سے معذرت چاہی۔

سابقہ اجلاس کی روئداد کی تصدیق کے بعد حسب ذیل ایجنڈا زیر غور رہا۔

۱۔ انتخاب کتب برائے مطبوعات ادارہ
۲۔ جدید مدارس بالغات کا قیام
۳۔ پچھلے اجلاس کے متعلق گفت و شنید
۴۔ دیگر امور۔

ف ۱ مطبوعات ادارہ کے سلسلہ میں جو مسودے ادارے بغرض انتخاب و رائے شعبہ کو بھجوائے گئے تھے وہ دیکھے گئے اور یہ طے پایا کہ ان کے متعلق اراکین کی رائے حاصل کرنے کے بعد جواب دیا جائے۔

ف ۲۔ جدید مدارس بالغات کے قیام کے بارے میں گفت و شنید ہوئی اور خیرت آباد اور لال ٹیکری پر مدرسے قایم کرنے کا تصفیہ ہوا۔ لیکن موسم گرما کے فوراً ہی بعد ان کا افتتاح کرنا مناسب خیال کیا گیا۔

ف ۳۔ پچھلے اجلاس میں مدرسۂ بالغات اڈکمیٹ کے متعلق یہ تصفیہ ہوا تھا کہ

(الف) جدید مدارس کے قیام کے بعد اس کو بند کر دینا چاہیے۔ اس دفعہ اتنا اور اضافہ کیا گیا کہ چونکہ دس طالبات اردو دانی کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں اور امتحان مہر میں ہوگا اس لئے مدرسہ امتحان کے بعد ہی بند کرنا ٹھیک ہوگا۔

(ب) مسز باقر علی خاں صاحب نے از راہ عنایت وقتاً فوقتاً مدرسہ کا معاینہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور مسز حسن لطیف صاحب نے بوجہ مصروفیت سوزن کاری سکھانے سے معذرت کی۔

(ج) بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بنگلور میں شعبہ کی شاخ کے قیام سے متعلق قریب قریب تمام انتظام کر لیا ہے۔

(۵) شعبہ کے بڑھتے ہوئے کاموں کے پیش نظر مجلس عاملہ کی رکنیت میں اضافہ کی رائے ہوئی۔ محترمہ بلقیس بانو صاحبہ کا نام رکنیت کے لئے تجویز ہوا اور یہ طے پایا کہ ان سے استدعا کی جائے۔

شاخ کلیانی کلیانی کی شاخ کے معتمد صاحب نے حسب ذیل روداد روانہ کی ہے۔

صدر ادارہ کے منشا کے مطابق عالیجناب نواب صاحب بہادر کلیانی کے زیر صدارت تقسیم اسناد کا جلسہ منانے کا خیال ایک عرصہ سے تھا مگر چونکہ نواب صاحب ممدوح کلیانی میں تشریف نہیں رکھتے تھے اس لئے یہ خیال جلد عمل جامہ نہ پہن سکا۔ یہ مبارک ساعت آگئی۔ شاخ کے معروضہ کو جو جلسہ کی صدارت سے متعلق تھا نواب صاحب بہادر نے شرف قبول بخشا۔ یہ جلسہ بتاریخ ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء یوم جمعہ بوقت ۵ ساعت شام بمقام مدرسہ وسطانیہ منایا گیا جس میں شرکا کا خاصہ اجتماع تھا۔ ابتدا تلاوت کلام مجید سے کی گئی اس کے بعد معتمد شاخ نے رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ گلپوشی کے بعد نظموں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مرزا، مولوی سجاد حسین صاحب جاہل، مولوی غلام معین الدین صاحب معین اور شیخ صالح صاحب صبیح نے اردو کے عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مولوی نیر الدین صاحب نے تاریخ اردو پر ایک مضمون سنایا اور حمید الدین صاحب متعلم اردو عالم نے خوش الحانی سے ایک نظم پڑھی۔ آخر میں معتمد شاخ نے بطور عقیدت عالی جناب نواب صاحب بہادر کی شان میں ایک قصیدہ سنایا۔ نواب صاحب بہادر نے بہ نفس نفیس اسناد تقسیم فرما کر کامیاب طلبہ کو سرفراز فرمایا۔ چائے نوشی کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ ادارۂ ادبیات کلیانی کا یہ جلسہ ہر طرح کامیاب رہا۔ اس کو کامیاب بنانے میں مولوی غلام معین الدین صاحب معین، مولوی نیر الدین صاحب، مولوی قاضی الدین صاحب، مولوی تمیز الدین صاحب اور مولوی محسن علی صاحب نے بطور خاص حصہ لیا۔ رپورٹ کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

محترم صدر و حاضرین جلسہ!

آج کا دن ادارۂ ادبیات اردو شاخ کلیانی کی زندگی میں ایک یادگار اور مسعود دن ہے کہ اس کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت ہمارے آقائے محترم عالیجناب نواب سید محمد جمال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہ والی اسٹیٹ کلیانی فرما رہے ہیں جن کی ذات مرکز کمالات و مصدر فیوض و برکات ہے۔

قبل اس کے کہ میں شاخ کلیانی کی کارگزاریوں کا اجمالی تذکرہ آپ کے گوش گزار کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صدر ادارہ ادبیات اردو سے بھی آپ کو متعارف کرایا جائے کہ وہ کیوں اور کب عالم وجود میں آیا اور اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور اس نے اب تک کیا کام کئے۔ اگرچہ یہ داستان طویل ہے مگر یہاں صرف اشارتاً چند اہم واقعات کا اظہار کیا جاتا ہے بمصداق ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ادارۂ ادبیات اردو سنہ ۱۹۳۱ء میں عالم وجود میں آیا اور اس کا قیام جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لندن کا رہین منت ہے آپ نے چند دردمند علم دوست اور اردو پرست حضرات کے تعاون سے اس کی طرح اندازی کی جن کے اسما درج ذیل ہیں۔

(۱) مولوی عبد المجید صدیقی ام اے۔ ال ال بی

(۲) مولوی عبد القادر صاحب سروری ام اے۔ ال۔ ال۔ بی

(۳) مولوی عبد القادر صاحب صدیقی ام اے شعبہ دینیات۔

(۴) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل۔

(۵) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی ایچ ڈی لندن معتمد اعزازی۔

یہ ادارہ بالکل غیر سیاسی اور خالص علمی و ادبی اغراض لے کر میدان عمل میں آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے سرپرستوں میں ملک کی

جلیل القدر ہستیاں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ نے صرف دس سال کی قلیل مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور وہ علمی خدمت کی ہے کہ کسی اور قومی ادارہ کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

اس کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس والا شان نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر شہزادہ برار و سپہ سالار افواج آصفی ولیعہد سلطنت آصفیہ ہیں۔ دیگر سرپرستوں میں حسب ذیل مقتدر ہستیوں کے اسمار شامل ہیں۔

(۱) رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت۔

(۲) عالیجناب نواب میر یوسف علیخاں بہادر سالار جنگ ثالث سابق صدر المہام سلطنت آصفیہ۔

(۳) عالیجناب نواب معین الدین خاں اعانت جنگ معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ۔

(۴) عالیجناب راجہ شام راج راجونت بہادر سابق صدر المہام تعمیرات دولت آصفیہ۔

ادارہ کی مجلس انتظامی، معاونین ورفقار وغیرہ میں ایسے ایسے صاحبان علم وفضل شریک ہیں جن سے ادارہ کا دامن ادبی دولت سے مالا مال ہو رہا ہے ان کے اسمار کی فہرست باعث تطویل ہے اس لئے نظر انداز کی جاتی ہے۔

ادارہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) اردو زبان اور ادب کی توسیع و حفاظت۔

(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔

(۳) نوجوانان ملک میں انشا پردازی اور شاعری کا صحیح ذوق پیدا کر کے تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لئے ضروری وسایل اختیار کرنا۔

(۵) اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی و ادبی آثار کی حفاظت۔

(۷) ایک ایسا مکمل کتب خانہ قایم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں۔

ادارہ نے اپنے کام کو بہ نظر سہولت مختلف شعبہ جات میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر شعبہ ایک معتمد اور چند اراکین پر مشتمل ہے۔ فی الوقت ۱۱ شعبے قایم ہیں اور ہر شعبہ برابر مصروف عمل ہے اور اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی سے انجام دیتے ہوئے ٹھوس اور علمی سرمایہ فراہم کرتا جا رہا ہے۔

میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا صرف شعبۂ امتحانات کی حد تک مختصراً بحث کروں گا۔ کیونکہ آج کا جلسہ انہی امتحانات کے نتائج کے سلسلہ میں انعقاد پذیر ہوا ہے۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت، بقا اور ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو مطالعہ کا ذوق عام کیا جائے اور ان مسن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں"

اسی مقصد کے تحت ادارہ ادبیات نے دیگر شعبوں کے ساتھ امتحانات کا شعبہ بھی قایم کر رکھا ہے جو بلا تفریق مذہب و ملت امیدواروں کا امتحان لیتا اور کامیابوں کو اسناد عطا کرتا ہے۔ اس شعبہ کے تحت فی الحال حسب ذیل امتحانات قایم کیے گئے ہیں۔

(۱) اردو دانی (۲) اردو عالم (۳) اردو فاضل (۴) خوشنویسی (۵) خطاطی و کتابت۔

ادارہ کی جانب سے جب امتحانات کا اعلان ہوا تو ملک نے اس کا پرجوش خیرمقدم کیا۔ طلبا نے اس میں شرکت کی اخبارات نے اس پر حوصلہ افزا مقالات سپرد قلم کئے اور دیگر اکابرین ملک نے اس کی افادی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے زرین آرا کا اظہار کیا۔

صدر ادارہ کی اس مختصر روداد کے بعد اب شاخ کلیانی کی مجملاً آپ بیتی بیان کی جاتی ہے۔ اس شاخ کی اساس کا سہرا مولوی عبدالکریم صاحب مدرس کے سر ہے جنھوں نے اپنے رفقائے کار مولوی غلام معین الدین صاحب معین اور مولوی تاج الدین صاحب مدرس انجمن اور مولوی خیرالدین صاحب وغیرہ کی معیت میں اس کی داغ بیل ماہ دے ۱۳۴۹ف میں ڈالی یہ حضرات حتی المقدور شاخ کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کی ترقی کا بے پناہ جذبہ اپنے سینہ میں موجزن پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی جذبۂ عمل اور اردو پرستی تھی کہ یہاں آج ایک مدرسہ شبینہ اور ایک دارالمطالعہ شاخ کی جانب سے قایم ہے۔

الغرض امیدواروں کو امتحانات ۱۳۴۹ف میں شریک کیا گیا اور انھیں مفت تعلیم دی گئی چنانچہ امتحان اردو عالم میں (۹) شریک اور (۵) امیدوار کامیاب ہوئے امتحان اردو دانی میں (۳۲) شریک اور (۲۷) کامیاب ہوئے۔

چونکہ امیدواروں کو کافی تعداد میں شریک امتحان کیا گیا تھا اس لئے کلیانی کو ہی مرکز امتحان قرار دیا گیا جس کی وجہ سے امیدوار سفر حیدرآباد کے مصارف سے بچ گئے سال حال بھی یہی سلسلہ بدستور جاری ہے علم دوست حضرات سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو اس میں شریک کرا کر اردو کی توسیع و ترقی میں تعاون کریں اور ملک سے بے علمی کی جہالت کو دور کرتے ہوئے خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کا موجب بنیں۔

یہ امر شاخ ہذا کے لئے موجب طمانیت ہے کہ اس کے انتظام پر پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے جو بہ حیثیت صدر نگران امتحانات کلیانی تشریف لائے تھے اظہار استحسان فرمایا ہے چنانچہ موصوف کی سفارش پر صدر ادارہ نے شاخ کے مطالعہ گھر کے لئے اپنی مطبوعات کی ایک کثیر تعداد بلاقیمت مرحمت فرمائی یہ کتب دارالمطالعہ میں رکھی گئی ہیں۔

آخر میں میں شاخ ہذا کی جانب سے حضرت سرکار فیض آثار نواب صاحب بہادر کی بارگاہ علم پرور میں صدارت کی قبولیت اور کارکنان شاخ کی عزت افزائی کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ورود مسعود سے یہ جلسہ بہ ہمہ وجوہ کامیاب ثابت ہوا جناب مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار صدر شاخ ہذا اور جناب مولوی سید سبط نبی صاحب منصف عدالت دار و دیگر عہدہ دار بھی مستحق تشکر ہیں جن کی نگاہ الطاف سے شاخ بہرہ مند ہو رہی ہے۔

رپورٹ کے اختتام سے قبل میں پھر باشندگان کلیانی کی خدمت میں التماس کروں گا کہ وہ اس شاخ کی امداد و تعاون سے دریغ نہ فرمائیں گے کیونکہ یہ انہی کے فلاح و بہبود کے لئے قایم کی گئی ہے۔

شاخ پربھنی | پربھنی کی شاخ کے معتمد صاحب نے حسب ذیل روئداد روانہ کی ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی کا ایک جلسہ زیر صدارت مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری ضلع پربھنی مارکٹ پولیس ہال میں منعقد ہوا۔

حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی نے ایک دلچسپ تقریر کے بعد یہ تحریک پیش کی کہ ادارہ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے جلیہ طلبا و اراکین اپنے لئے ایک خاص قسم کا یونیفارم بشکل

شیروانی تیار کرالیں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب فاروقی نے اس کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہا کہ اس کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔ جس کی تائید مولوی وجاہت علی صاحب نے فرمائی۔ اور کہا کہ اگر ہماری شاخ سے اس کی بنا ر ہو گی تو اس کا سہرا شاخ پربھنی کے سر ہوگا۔ آخر میں جناب صدر مولوی عارف الدین حسن صاحب نے طلبا کے جذبات اور جوش کی ستائش کرتے ہوئے اس تحریک کو منظور فرمایا۔ اور کہا کہ اس تحریک کو صدر ادارہ میں روانہ کیا جائے۔ تاکہ وہ ایک ایسا نمونہ تجویز کرے کہ جس کو ہر شاخ کے طلبہ اختیار کریں۔ اس کے بعد جناب صدر نے نصیحت کی کہ عملی کام میں زیادہ حصہ لو اور طلبہ کو زیادہ تعداد میں شریک کرو۔ ساڑھے نو بجے شب جلسہ برخواست ہوا۔

شاخ کشتگی کا جلسہ تقسیم اسناد

ادارہ ادبیات اردو شاخ کشتگی کا ایک غیر معمولی جلسہ تقسیم اسناد بہ صدارت عالیجناب پنڈت بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے ایل ایل بی منصف تعلقہ کشتگی بتاریخ ۱۰ خورداد ۱۳۵۰ف بمقام جوبلی ہال منعقد ہوا۔ ۵ بجے سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ تقریباً تمام عہدہ داران مقامی نے شرکت کی جن میں سے جناب تحصیلدار صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب صدر مدرس صاحب و منتظم صاحب پولیس بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ نیز جملہ وکلا صاحبان و مقامی خوش باش ساہوکاروں کا کثیر مجمع شریک جلسہ رہا۔ ان کے علاوہ تعلقہ ہذا کے قصبات مثلاً نادرگیرہ، دوئی ہال، چلگیرہ دیگر واضعات سے باوجود سخت گرمی و دوری مسافت کے حصول اسناد کے شوق میں کامیاب طلبہ کی کئی جماعتیں آئیں۔ جو سب کی سب جوبلی ہال کے میدان میں جمع ہوئیں میدان میں بینچوں اور کرسیوں کا کافی انتظام کرنے کے باوجود بیشتر شرکائے جلسہ کھڑے ہی رہے۔ ان کامیاب طلبا میں سب کی نظریں ایک سن رسیدہ طالب علم پر بطور خاص پڑ رہی تھیں۔ جو ہر شخص کا مرکز نظر بنا ہوا تھا۔ یہ وہ تشنۂ علم تھا جس نے اپنی زندگی کی تقریباً ۶۰-۶۵ منزلیں طے کرنے کے باوجود اس کے ذوق علم نے اس کو امتحان اردو دانی میں شریک ہونے پر مجبور کیا تھا۔ آفریں اور صد آفریں ہے۔ اس کی ہمت اور ذوق علمی پر کہ اس نے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اور آج وہ سند لینے کے لئے ۶۵ سالہ ضعیف کو دس میل اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ اس ضعیف اور کامیاب طالب علم کو جلسہ کا ہر شخص بڑی حیرت اور حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

غرض ٹھیک ۵½ بجے سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے تحریک صدارت پر ایک قرارداد تعزیتی منظور کی گئی جس میں علیا حضرت بڑی بیگم صاحبہ کے سانحہ ارتحال پر صدمۂ جانکاہ پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ اور دعا کی گئی کہ خدائے قدوس مرحومہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ نیز اعلیٰ حضرت بندگان عالی و خانوادۂ آصفی کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

حاضرین نے قرارداد کو ایستادہ ہو کر سنا اور منظور کیا۔

اس کے بعد جلسہ کا آغاز جناب محمد اکبر صاحب ڈرائنگ ماسٹر کی نظم سے ہوا۔ نظم نہایت سلیس سادہ و برمحل تھی جس میں زبان اردو کی تعریف اور اس کی ہمہ گیر وسعت کا تذکرہ تھا۔ حاضرین نے اس نظم کو بے حد پسند کیا۔ مسٹر بھیم سین آچاری صاحب وکیل نے مولوی سید علی اکبر صاحب صدر شعبہ امتحانات اردو کا پر مغز خطبہ پڑھ کر سنایا۔ قابل صدر نے اس خطبہ میں اردو امتحانات کی ابتدائی زندگی اور اس کے ترقی منازل کا مفصل حال بیان فرمایا ہے۔ بعد ازاں معتمد ادارہ نے اپنی سالانہ رپورٹ سنائی جس میں

صدر ادارہ حیدر آباد کی بنیاد کا حال اور بانیٔ ادارہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی بار آور کوشش اور اہل ذوق اصحاب کا ادارہ کے ساتھ تعاون عمل اور اس قلیل عرصہ میں ادارہ کے درخشاں کارناموں کا مفصل ذکر درج تھا۔ نیز شاخ گنگی کے قیام اور اس کی سرگرمیوں میں جن علم دوست اور ادب نواز حضرات نے اپنی قیمتی امداد و اعانت سے معتمد کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ان سب کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اختتام رپورٹ پر جناب صدر نے تالیوں کی گونج میں کامیاب طلبا کو انعامات و اسناد تقسیم فرمائے۔

اس کے بعد جناب مولوی واجد علی صاحب وجد سب رجسٹرار مولوی خواجہ قمرالدین صاحب، مولوی نوراللہ بیگ صاحب، مولوی محمد حسین صاحب منشی فاضل نے علم و ادب پر بڑی دلچسپ تقریریں کیں۔

آخر میں جناب صدر نے اپنا معلومات آفریں خطبۂ صدارت پڑھا۔ جس کے ہر ہر جملہ میں موصوف کے علمی و ادبی خدمت کے جذبات موجزن تھے۔ صاحب ممدوح نے تعلیم بالغاں کی اہلیت اور اس کی ابتدائی عملی دشواریوں پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے حاضرین جلسہ پر اس امر کی سخت ضرورت کا اظہار فرمایا کہ ہر پڑھے لکھے کا یہ فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرصتی اوقات بجائے لغویات اور فضولیات میں گزارنے کے صرف پڑھنے یا پڑھانے میں گزارے۔ نیز علم و فن کی برکتوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اور اس کے حصول کے کئی مختلف اور آسان ذرایع بتلائے۔ اور ریاست ابد مدت میں علم و ہنر کی دن دونی رات چوگنی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے سلطان العلوم کی عدیم النظیر علم نوازی اور علم و ہنر پر شاہانہ بذل و نوال و توجہات کو خاص انداز میں پیش فرمایا۔ اس طرح اپنے بصیرت افروز خطبۂ صدارت کو حضرت سلطان العلوم و خانوادۂ آصفی کی صحت و سلامتی کی دعا پر ختم فرمایا۔ حاضرین جلسہ نے خطبہ بڑی گرمجوشی سے سنا۔ اس موقع پر ہر فرد یہ محسوس کر رہا تھا کہ تعلقہ گنگی کی تاریخ میں یہ پہلا جلسہ ہے جو خالص علمی و ادبی مقاصد کا حامل ہونے کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہے۔ تعلقہ گنگی زمانہ ماضی میں ایسی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ جلسہ بیحد کامیاب رہا۔ یہاں کی عام پبلک اور عام عہدہ داران نے کارکنان جلسہ کی دل کھول کر داد دی۔ آخر میں جناب صدر مدرس صاحب نے اپنی تقریر کے بعد حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ و خانوادۂ آصفی کے لئے دعائے صحت و سلامتی پر جلسہ برخاست ہوا۔

بسٹپا
معتمد ادارہ ادبیات اردو شاخ گنگی

اردو انسائیکلوپیڈیا

معتمد صاحب اردو انسائیکلوپیڈیا نے حسب ذیل اطلاع اشاعت کے لئے روانہ کی ہے۔

ادارہ ادبیات اردو جس کو ملک کے ذی علم حضرات کی قلمی اعانت اور ذی مرتبہ امرا کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے کم و بیش دس سال سے زبان و ملک کی مسلسل خدمت کر رہا ہے اس کا کام مختلف علوم و فنون کے بارہ شعبوں میں پھیلا ہوا ہے جس کے زیر نگرانی اب تک بہتر (۷۲) سے زیادہ کتابیں شایع ہو کر مقبول ہوئیں۔

بہت غور اور متعدد صاحبان علم و فضل سے تبادلہ خیال کے بعد اس نے گزشتہ اردو انسائیکلوپیڈیا شایع کرنے کا تصفیہ کیا۔

چونکہ اس کی ترتیب و تالیف کے لئے متعدد علوم و فنون کے ماہرین کے اشتراک عمل کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے متعدد ماہرین علوم و فنون کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا۔

انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تالیف میں اس کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے الفاظ ماہرین ہی سے لکھوائے جائیں اس سلسلہ میں ساری انسائیکلو پیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر شعبہ کی نگرانی ایک ماہر کے تفویض کر دی گئی ہے جو معاونین کی مدد اور مجلس انتظامی کی عام نگرانی میں شعبے کے جملہ الفاظ پر نوٹ مرتب کر رہا ہے۔ فی الوقت حسب ذیل ماہرین اور علماء اپنی نگرانی میں مضامین متعلقہ کا کام شروع کر چکے ہیں۔

معاشیات۔ ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔ تاریخ۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے آکسن بار ایٹ لا صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ تہذیب و ثقافت۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر انڈین کلچر جامعہ عثمانیہ۔ ریاضی۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ۔ ڈی۔

سائنس۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین ایم ایس سی پی ایچ، ڈی۔ پروفیسر نظام کالج و ڈاکٹر رام لال ایم ایس سی پی ایچ، ڈی۔ السنہ قدیم و جدید ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے، ڈی فل مہتمم کتب خانہ آصفیہ۔ فلسفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ، ڈی۔

تعلیمات و تدریسات مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج۔ طب ڈاکٹر منور علی صاحب ایف آر سی ایس، ڈاکٹر قاسم حسین صاحب صدیقی ایم آر سی ایس ایل آر سی پی (لندن) کارو نر بلدہ۔

نسائیات مس جیسی نندی بی اے آنرز آکسن۔ کھیل۔ ایس ایم ہادی بی اے کیمبرج۔ اردو زبان و ادب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ، ڈی (لندن) و پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ ہندی ادب اور دیوالا پنڈت ونشی دہر ودیا النکار۔ کنڑی و مرہٹی وغیرہ۔ رگھوناتھ راؤ بھاری ایم اے، و ڈی کے بھیم سین راؤ ایم اے، انڈکس کی ترتیب اور مقالے لکھوائے جانے کا انتظام تیزی کے ساتھ جاری ہے ان کے علاوہ بہت سے مشاہیر علماء و فضلاء ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے دوسرے علوم و فنون کے ضمن میں قلمی اعانت فرما رہے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی لاہور۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے، لکھنؤ۔ احمد شاہ بخاری پطرس ایم اے، دہلی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی پونا اور پروفیسر رودرا الہ آباد وغیرہ۔ ترتیب و تالیف کی نوعیت اور معیار کا صحیح اندازہ پیش کرنے کے لئے زیر اشاعت انسائیکلو پیڈیا کے چند اوراق بطور نمونہ الگ شایع کر کے ہفتہ عشرہ میں صاحبان ذوق و نظر کی خدمت میں بغرض تبصرہ بھیجے جائیں گے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا جیسی علوم و فنون کی ضخیم کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے ہمیں بیسیوں ماہرین کی قلمی اعانت درکار ہے اس لئے ہم بے حد ممنون ہوں گے اگر وہ علماء و فضلاء جن کا اب تک ہمیں تعاون حاصل نہیں رہا اور جو ازراہ علم دوستی ہمارا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں مطلع فرمائیں کہ انھیں کن خاص علوم و فنون سے دلچسپی ہے تاکہ ہم ان کی قابلیتوں سے استفادہ کر سکیں۔"

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
جون ۱۹۴۱ء

سب رس

جلد ۴	بابت جون ۱۹۴۱ء	شمارہ ۶

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارہ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۴۸) صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کریگا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لیئے جوابی پوسٹ کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا دی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر خیرت آباد سے شایع ہوا۔

وفا مجھ سے ہوگی!؟

نہیں مجھ سے ہوگی —— وفا اس جہاں میں!!

افق کی طرف تک رہی ہو ابھی تک		پریشان و حیراں کھڑی ہو ابھی تک
سراراستہ دیکھتی ہو ابھی تک		نم اشکوں کی یکسر لڑی ہو ابھی تک

نگاہوں میں برق و شرارِ محبت
سراپائے صد انتظارِ محبت

گماں بھی نہیں ہے خطا مجھ سے ہوگی!		وفا مجھ سے ہوگی؟ نہیں مجھ سے ہوگی

وفا اس جہاں میں!؟

(۲)

جہاں خیر و شر میں نہاں ہے مشیت		جہاں خود مناظر ہیں اذنِ بغاوت
جہاں گھات میں خود ہے صیادِ فطرت		جہاں دام بردوش بیٹھی ہے قدرت

وہاں مجھ سے عہدِ وفا چاہتی ہے
یہ کیا کہہ رہی ہے، یہ کیا چاہتی ہے

تمنا کی تکمیل کیا مجھ سے ہوگی!؟		وفا مجھ سے ہوگی؟ نہیں مجھ سے ہوگی

وفا اس جہاں میں!؟

(۳)

یہ پھولوں میں جگنو فلک پر ستارے		یہ دہکے ہوئے آرزو کے شرارے
یہ ہر کو بہارے یہ ہر سو نگارے		یہ بہکی جوانی کے مبہم اشارے

گناہوں کے سیلاب، مستی کے طوفاں
یہ ہر اک نفس میں تباہی کے ارماں

بتا و برائے خدا مجھ سے ہوگی!؟		وفا مجھ سے ہوگی؟ نہیں مجھ سے ہوگی

وفا اس جہاں میں!!

یہ ہر موڑ پر حسن کی مسکراہٹ		یہ ہر گام اک مستقل جگمگاہٹ
یہ ہر آن احساس کی کسمساہٹ		نئی اک قیامت کے آنے کی آہٹ

تمہارے تصور پہ ہنستی ہوئی سی
محبت پہ آوازہ کستی ہوئی سی
یہ فطرت کی توہین کیا مجھ سے ہوگی　　وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۴)

یہ گلشن، یہ بھونرے، یہ کلیاں　　یہ کانٹوں کی مٹھی میں آلن کا داماں
یہ ڈھلکا سا آنچل کھلا سا گریباں　　گجر دم ہوا، جیسے بابِ خمستاں
نفس در نفس یہ گلابی تقاضے
مری تشنگی اور شرابی تقاضے
یہ پینے کی عادت فنا مجھ سے ہوگی　　وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۵)

یہ دنیا، یہ دنیا کی جہدِ مسلسل　　دل و جاں ہیں کیفِ ورودِ وپاگل
یہ سر پر فلاکت کے گھنگور بادل　　یہ تپتا کا صحرا، تباہی کا جنگل
یہ بھوکی محبت، یہ پیاسی جوانی
مٹا دے مجھے اے غمِ زندگانی!!
اس افلاس و غم میں بھلا مجھ سے ہوگی　　وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۶)

جہاں اب بھی جاری ہے بردہ فروشی　　بنامِ ترقی، بہ طرزِ غلامی
جہاں مفلسوں کی محبت ہے تلتی　　بر اندازۂ ذوقِ سرمایہ داری
یہ گونگی تمنا، یہ ارمان بہرے
محبت پہ بیٹھے ہیں سکوں کے پہرے
محبت کی قیمت ادا مجھ سے ہوگی　　وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۷)

درختوں پہ یہ چاندنی کا مچلنا   اندھیرے میں یہ روشنی کا مچلنا
خودی کی تڑپ، بے خودی کا مچلنا   یہ ہر موڑ پر زندگی کا مچلنا
یہ گنگا کی گودی، یہ جمنا کے دھارے
ہجومِ حسیناں، کنارے کنارے
نہ دیکھوں انھیں یہ خطا مجھ سے ہوگی   وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۸)

میں خود بھی تو ہوں نیکی و شر کی دنیا   معاصی کا گھر، وعظ و منبر کی دنیا
تمنا کا بت خانہ، آذر کی دنیا   مئے و جام و مینا و ساغر کی دنیا
بزرگوں کی ہدیوں نے پالا ہے مجھ کو
تو نیکی کے سانچے میں ڈھالا ہے مجھ کو
یہ خلقی صفت کیا جدا مجھ سے ہوگی   وفا مجھ سے ہوگی، نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(۹)

جہاں شمع روشن ہے بجھنے کی خاطر   جہاں کے نواسی ہیں مٹنے میں ماہر
جہاں زندگی جبر ہے موت جابر   جہاں بے وفائی ہے اک امرِ ظاہر
جہاں موت عہدِ وفا توڑتی ہے
محبت کو بے آسرا چھوڑتی ہے
یہ سنگیں حقیقت جدا مجھ سے ہوگی   وفا مجھ سے ہوگی نہیں مجھ سے ہوگی
وفا اس جہاں میں!؟

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)   ساغر (نظامی)

بھابی جان کی سہیلیاں

دوست احباب کس کے نہیں ہوتے. آپ کی بھی سہیلیاں ہوں گی. مگر گستاخی معاف ـــ ایسی بے تکی نہ ہوں گی ـــ ان کی سہیلیوں کا تو کچھ باوا آدم ہی نرالا ہے. ان میں سے کوئی بھی تو سلیقہ کی نہیں. یعنی ایسی کہ جن کے ہم مرید ہو جائیں. کونسا وقت کسی سے ملنے کا ہوتا ہے. کب کسی کو ملنے لانے میں سہولت ہوتی ہے، آداب محفل میں کون کون سی باتیں شریک ہیں، آمد و رفت کا مفہوم کیا ہے، غرض یہ اور ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کو ان کی بے ڈھنگی سہیلیوں نے کہیں سیکھا ہی نہیں. وقت بے وقت آندھی کے آموں کی طرح نازل ہو جاتی ہیں. جی جل کر خاک ہو جاتا ہے. ہمارے جی کا کیا ہے. یہ تو آئے دن جلتا رہتا ہے. اس کی کسی کو کیا پروا ـ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مزے لے لے کر گفتگو کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں اور آفت ہم غریبوں پر آتی ہے. میں اور نجمہ ان کی بے جا ناز برداریوں اور خاطر داریوں میں لگ جاتے ہیں. پھر ذرا اگر چونے سے پان کھسک جائے تو پھوہڑ بدسلیقہ، بے گتے ہونے کی صلواتیں تو ہمارے گلے کا ہار بنے رکھی ہوئی ہیں. کچھ نہ کرو. کسی بات میں دخل نہ دو. تو پھر اس کا صلہ اور طریقے سے ملتا ہے "ہماری قدر ہوتی تو ہماری سہیلیوں کی بھی خاطر کی جاتی. آج ہماری اپنی بہنیں ہوتیں تو تم دیکھتیں. پھر نجمہ بہتر! فریدہ تو اکھل کھری جگ میں بری. آدم بیزار. اس کو تو انسان کی صحبت سے جیسے ڈر لگتا ہے. کس نے غزالوں کے طرز سیکھے ہیں. کسی کا اپنے گھر آنا اسے پسند ہی نہیں. یہ اپنے ملنے والوں سے کب ملتی ہے. فریدہ جو نام ہے!"

بھابی جان ذاتیات پر خوب حملے کرتی ہیں. یہ ان کی فطری کمزوری ہے. اور یوں بھی ان کا دماغی توازن ذرا کے ذرا میں خراب ہو جاتا ہے. کسی کی ذرا سی بات ان سے نہیں اٹھتی. بلا کی نازک مزاج ہیں. ہیں نا بڑے اللّون تللّوں کی. ماں باپ کی اکلوتی ایک ہیں. مگر اس درِ یتیم کو یہ بھی تو سزاوار نہیں کہ وہ اوروں کے دل اس طرح توڑے. ناز نخروں میں پلنے والے بچے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے. وہ ہر جگہ اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی بیجا ناز برداریاں ہی جائیں. اور جب ان کی یہ امید بر نہیں آتی تو پھر انسانیت کے جامے سے باہر ہو جاتے ہیں. یہ وہ دن ہمیشہ کہاں رہیں گے کہ وہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں. زمانہ ایک روش پر نہیں رہتا. یوں بھی ان کی سب ہی ہر ممکنہ خاطر کرتے ہیں جن کو وہ ظاہر داریوں پر محمول کرتی ہیں. ان کو کسی کے خلوص پر بھروسہ ہی نہیں. سوائے اپنی چہیتی سہیلیوں کے. جن میں ایک بھی ڈھنگ کی نہیں!!

ان کی ایک سہیلی ہیں صفیہ. ان کے آنے کا تو کوئی وقت ہی معین نہیں. خصوصاً دوپہر کے وقت یہ آئیں گی ہمارے گھر کے آرام و اطمینان کو درہم برہم کرنے. بارہ سے چار بجے تک. یہ گرمیوں کی طویل دوپہر، جب کہ سناہرن بھی کالا ہو جاتا ہے. ایسے شیطانی وقت میں ان کا پھیرا ہوتا ہے. پھر بچوں کی بھی خیر سے، ساتھ خاصی پلٹن رہتی ہے جو اودھم مچا کر ناک میں دم کر دیتے ہیں. بہن کے بچے، بھائی کے بچے

محلے کے بچے ان کے دم چھلے بنے رہتے ہیں۔ موٹر خاصی مرغیوں کا ڈربہ بن جاتی ہے۔ کوئی اپنا بچہ ہو تو بھی یہ وقت ساتھ لانے کا نہیں ـــــ دوسرے سہیلی ہیں غزالہ ـــــ بڑی روشن خیال۔ نئی روشنی کی زد میں آئی ہوئی جس چراغ کے نیچے اندھیرا نہیں ایسی فضا میں پلی ہوئی۔ یہ بڑی فیشن پرست ہیں۔ جدید فیشن کی ہر اچھی چیز کا ایک جیتا جاگتا اشتہار۔ موٹر خود چلاتی ہیں۔ ۱۱ بجے رات تفریح کو نکلتی ہوئی آجاتی ہیں۔ پھاٹک عموماً ۱۰ بجے کے بعد بند رہتی ہے تو اس کو خوب زور زور سے پیٹا جاتا ہے۔ اس وقت عام طور پر گھر کے لوگ سوتے یا سونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور یہ رحمانی فرشتہ نازل ہو کر چین و آرام میں خلل انداز ہوتا ہے۔ نیند جو بڑی خوشامدوں سے آرہی تھی وہ ایسی غائب ہو جاتی ہے کہ پھر ہزار کچھ کرو ـــــ نہیں آتی ـــــ ان کی تفریح ہو جاتی ہے اور ہم کو اذیت ـــــ

تیسری جو ہیں محمودہ ـــــ ان کو تو ٹپکنے کا مرض ہے۔ جب کبھی گھر پر سے کہیں جائیں گی ضرور ٹپک جائیں گی۔ آتے ہوئے بھی اور جاتے ہوئے بھی۔

بھابی جان سے میں نے ایک روز کہا "اتنی ہر دل عزیزی وبال جان نہیں ہو جاتی؟" تو وہ منہ چڑا کر کہتی ہیں "نہیں تو شاید تیرے جیسے سنیاسی۔ خدا نہ کرے کوئی ہو۔ ملنے کے نام سے بھاگتی ہے۔ جیسے ملک الموت روح قبض کرنے آتے ہیں۔" میں بھی اکڑ کر کہنے لگی "ہم میں فرشتوں کی ارواح ہے ہم انسانوں میں نہیں مل سکتے ـــــ۔" "بس بہت آپ اپنے کو سمجھنے لگی ہیں۔ افوہ ـــ اب تو فرشتوں سے ساز باز ہے۔ خدا خیر کرے۔"

مگر نوج میں ڈھائی ایسی دوست نوازی سے میرا تو ناطقہ بند ہو گیا۔ نیند اور چین تو جب سے یہ گھر آئی ہیں مفقود ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہی نہیں اطمینان قلب کس چڑیا کا نام ہے۔ بھائی جان کے بھی اتنے دوست نہ ہوں گے جتنی ان کی سہیلیاں ہیں۔ وہ تو بچارے کلب کی حد تک ان کی دوڑ ہے۔ ان سے پیچھا کون چھڑا۔ ذرا آپ ہی کوئی حل بتائیے ؎

فلک ہم تو تیرا بھی شکوہ نہ کرتے
مگر تجھ کو ڈھب ہی نہ آیا جفا کا

ایک دن ان کے پاس کوئی خاص پارٹی تھی۔ بہت سی سہیلیاں شہد کی مکھیوں کی طرح بھن بھنا رہی تھیں۔ سینما کے گیت اور نقرئی قہقہوں سے ان کا خوبصورت، جرمن اسٹائل سجا ہوا برآمدہ معمور تھا۔ خوبصورت رنگین خوش وضع ساڑیوں سے اس کی رونق بڑھ گئی تھی۔ بھابی جان ایک پھول تھیں جن کے اطراف اتنی تتلیاں گھوم رہی تھیں۔ ایک ہڑبھونگ مچی ہوئی تھی۔ جیسے دس دس برس کی لڑکیاں۔ ذرا سنجیدگی، متانت، حلم و بردباری نہیں۔ بالکل کچھ عجیب و غریب طبیعتیں۔ واللہ ادھر کسی کام پر آنکلیں تو نہ ان کا ادب نہ قاعدہ۔

ایک ایسا سلام جیسے کوئی منہ پر سے مکھی اڑا دے۔ اور پھر بیٹھ جانا۔ ان کے بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں۔ نہ ان کو بیٹھنے کے لئے کہنا۔ یہ ہے ادھوری تعلیم کا اثر۔ انسانی فطرت پر ماحول کے جو اثرات پڑتے ہیں وہ تو رہے الگ۔

اماں تو تھوڑی دیر ٹھہر کر وہاں سے چلی گئیں۔ میں اور نجمہ گانے کی آواز سن کر بے چین ہو گئے اور وہاں جانے کی ہمیں سوجھی۔ مگر میری تو صورت سے ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ فوراً بھابی جان کے رخسار مجھے دیکھ کر تمتمانے لگے۔ خفگی سے ان کا چہرہ پھول گیا۔ صرف نجمہ ہوتی تو وہ اتنی برہم نہ ہوتیں۔ کیونکہ اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں۔ لیکن ـــ میں جو وہاں موجود تھی۔ آنکھوں کا ٹھیکرا ـــ!

جہاں بانو بیگم

محسوساتِ ماہر

جگر میں درد پایا جا رہا ہے ۔۔۔ مجھے شاید بلایا جا رہا ہے

نقابِ رُخ اٹھایا جا رہا ہے ۔۔۔ وہ نکلی دھوپ سایا[1] جا رہا ہے

مریضِ غم کو آکر دیکھ جاؤ ۔۔۔ کہ تم پر حرف آیا جا رہا ہے

یہ روز و شب، یہ برق و ماہ و انجم! ۔۔۔ تماشا سا دکھایا جا رہا ہے

الٰہی خیر! میری حسرتوں کی ۔۔۔ نشیمن پھر بنایا جا رہا ہے

وہ آئے موت کا پیغام بن کر ۔۔۔ کشاکش سے چھڑایا جا رہا ہے

نگاہیں بھی ہیں کچھ بہکی ہوئی سی ۔۔۔ قدم بھی لڑکھڑایا جا رہا ہے

وہ خاکِ دل سے بچ کر چل رہے ہیں ۔۔۔ ابھی تک آزمایا جا رہا ہے

اجل ہے زندگی کا دورِ ثانی ۔۔۔ قدم آگے بڑھایا جا رہا ہے

ستارے سسکیاں سی لے رہے ہیں ۔۔۔ کسی کا دل دکھایا جا رہا ہے

سناتے ہو گئے روداد ماہر
وہاں تو مسکرایا جا رہا ہے

ماہر القادری

[1] سایہ

مہاراجہ بہادر کی یاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کو انتقال کئے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ وہ اردو کے ایک بہت بڑے سرپرست اور دلدادہ تھے اس لئے یہہ مضمون سب رس میں خاص طور پر شریک کیا جارہا ہے۔ ذیل کا مضمون مولوی غلام علمبردار صاحب کا ہے جو مہاراجہ کے معتمد علیہ تھے ان کو مہاراجہ سے جو تعلق اور عقیدت تھی اس کا اندازہ اس مضمون سے ہو سکتا ہے۔

مہاراجہ بہادر کی پیشی میں بارہ سال سے زیادہ رہنے کی بدولت مجھے مرحوم کی شخصیت و کردار کے مطالعہ کا جو موقع ملا ہے اسی کی بناء پر میں چند واقعات کا ذکر مہاراجہ کے بے شمار دوستوں میں ان کی یاد تازہ کرنے کے لئے بسپرد قلم کرتا ہوں۔

راجہ راجایاں راجہ سرکشن پرشاد مہاراجہ آنجہانی یمین السلطنۃ اس ریاست ابدمدت کے نہ صرف ایک بڑے امیر، بڑے مدبر اور عالی مرتبت شخصیت تھے، بلکہ انھوں نے جو وقار خانوادہ آصفیہ کے سایہ عاطفت میں حاصل کیا وہ ان کے خاندان میں تو کیا سلطنت آصفیہ میں بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ ملک و مالک کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری و جان نثاری مہاراجہ آنجہانی کا شعار تھا۔ انھوں نے رفاہ عام کے نمایاں کام انجام دئے، جن کے صلے میں حکومت نے ان کو متعدد اعزاز اور بڑے بڑے خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ اگر ایک طرف مالک مجازی نے ان کی عزت کو انتہائی عروج پر پہنچایا تو دوسری طرف سرکار عظمت مدار سے بھی وہ اپنی کارگزاری کے اعتراف میں برابر خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں کے سی آئی ای۔ اور ۱۹۱۱ء میں جی سی آئی ای۔ کے خطابات حاصل کئے۔ آخرالذکر خطاب عام طور پر ہندستان کے حکمران رئیسوں کو عطا کیا جاتا ہے۔

مہاراجہ آنجہانی کی سخاوت، ہردلعزیزی، اخلاق، فقیر دوستی، مذہبی مساوات، مروت، نیک نفسی، علم نوازی اور انسانی ہمدردی کے پورے واقعات تحریر میں لانا ممکن نہیں لیکن ان کی ہمہ جہتی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لئے چند سبق آموز واقعات کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔

مہاراجہ بہادر چند سال قبل دہلی سے براہ بمبئی حیدرآباد تشریف لارہے تھے یورپ کے ایک اسلامی شاہی خاندان کے رکن جو گردش زمانہ کے ہاتھوں مصیبتوں کا شکار تھے، مہاراجہ بہادر سے بمبئی میں ملاقات کے لئے آئے اور اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے مہاراجہ نے اپنی پیشی کا صندوق طلب فرمایا۔ طویل سفر کے اخراجات کے بعد صندوق میں سو سو کے گیارہ نوٹ باقی رہ گئے تھے۔ مہاراجہ نے پوری رقم لفافے میں بند کرکے شاہزادے کے حوالے کردی اور پھر مجھے تحریر فرمایا کہ

"آپ لوگ جو کچھ چاہیں خیال کریں مگر میں ایک شاہی
خاندان کے فرد کی آنکھوں میں آنسوؤں کی تاب
نہ لاسکتا تھا اس لئے جو میرے پاس تھا میں نے
ان کو دے دیا حیدرآباد واپس جانے کا انتظام
کسی طرح کر لیجئے۔"

اسی روز حیدرآباد سے ذریعہ تار رقم طلب کی گئی اور رقم وصول ہونے پر جب مہاراجہ سے عرض کیا گیا تو ارشاد فرمایا کہ

"قربان میرے مالک کے کہ اس نے حاجت مندوں
کی حاجت روائی کے لئے کبھی میرے ہاتھ کو نہ
روکا اور جو جس کے نصیب کا ہے اس کو ان
ہاتھوں سے پہونچتا ہے۔"

مہاراجہ ممدوح کی سخاوت کی ایک اور دل فریب مثال ان کا یہ قول تھا کہ

"جب کبھی میرے صندوق میں کافی روپیہ ہوجاتا
ہے تو مجھے چین سے نیند نہیں آتی۔"

ملک والوں کے دلوں میں مہاراجہ کی جو محبت تھی اور وہ جس قدر ہردلعزیز تھے اس کا ثبوت ایک معمولی واقعہ سے پایا جاسکتا ہے۔ جب صدارت عظمیٰ پر تقرر کے بعد مہاراجہ آنجہانی پہلی مرتبہ محبوب نگر کے دورہ پر تشریف لے گئے تو وہاں پبلک کی جانب سے عبدالحفیظ صاحب وکیل نے یہ رباعی سنائی جو پبلک جذبات کی صحیح ترجمان تھی۔

> مہاراجہ مسرت سے یہاں پھر شاد شاد آئے
> پھر اپنوں کا خیال آیا انھیں پھر اپنے یاد آئے
> یمین السلطنۃ اب صدر اعظم ہوکے آئے ہیں
> مبارک ہو یہ آنا با حکومت با مراد آئے

اسی طرح اخلاق کی ایک معمولی مثال ہے کہ سرکاری مصروفیت کے باوجود وہ تقریباً روزآنہ متعدد دعوتیں قبول فرمالیتے تھے اور ہر ایک سے یہی کہتے تھے۔

"جب آپ اس قدر محبت سے مجھے بلاتے ہیں
تو میرا فرض ہے کہ میں بھی آپ کی خوشی میں
شریک ہوں۔"

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ مہاراجہ بہادر باوجود کبرسنی جوانوں سے زیادہ ہمت و استقلال رکھتے تھے اور محض لوگوں کا دل رکھنے کی خاطر بعض اوقات پانچ پانچ چھ چھ جگہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے تشریف لیجاتے تھے۔

اکثر فرصت کے اوقات میں برگزیدہ اور خدارسیدہ فقیروں اور درویشوں کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ اور ارشاد ہوتا کہ

"گو نئی روشنی والے فقرا کی پروانہ کریں
لیکن مجھے بعض ایسے ایسے کامل فقیروں کی
صحبت کا نیاز حاصل رہا ہے جن کی دعاؤں
نے فقیر شاد کی پریشانیوں کے وقت اپنا
پورا پورا اثر دکھایا۔"

فقیروں کی عزت و وقعت کا ہمیشہ خیال فرماتے اور یہی وجہ تھی کہ ہر بزرگ اور فقیر کی دعائیں ہمیشہ مہاراجہ بہادر کے ساتھ تھیں۔

ہر مذہب و ملت کی عزت و احترام کرنا مہاراجہ کا شعار تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں نہ صرف ہولی اور دسہرہ اعلیٰ پیمانہ پر منایا جاتا تھا بلکہ ہر عید کے موقع پر بھی تزک و احتشام کے ساتھ خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ ممدوح ہر مذہب کے ہر تہوار کا پورا احترام فرماتے تھے اور ایک سچے صوفی کی طرح انھیں

ہر مذہب سے مخلصانہ عقیدت تھی" پریم درپن" کے نام سے مہاراجہ نے جو مثنوی لکھی ہے اس میں کیا خوب فرمایا ہے۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں
ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے
آزادی آزاد ہی جانے

مروت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک معمولی تھیٹر کے منیجر کی استدعا و اصرار پر ایک تماشے کی سرپرستی قبول فرمائی اور شب میں جب چند احباب اور اسٹاف کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے تو یہ دیکھا گیا کہ تھیٹر کا ساز و سامان نہایت بوسیدہ اور ایکٹر بھی بالکل معمولی تھے۔ وقفہ میں بعض ساتھیوں سے تماشے کے متعلق دریافت فرمایا تو ہر شخص نے یہی عرض کیا کہ ڈریس اور تماشا دونوں بیکار ہے اگرچہ مہاراجہ کا بھی یہی خیال تھا لیکن مروت کا پاس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"میرے آنے سے منیجر کو جس قدر مسرت ہوئی ہے وہ میرے چلے جانے سے رنج میں مبدل ہو جائے گی"۔

چنانچہ تماشے کے ختم ہونے تک قیام فرمایا۔

مہاراجہ کے ایک دوست نے ولایت سے واپسی کے وقت ایک معمولی تحفہ لا کر پیش کیا جس کو مہاراجہ نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول فرمایا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد ہی ایک صاحب نے عرض کیا

"آپ کی پوزیشن کے لحاظ سے انہیں تحفہ لا کر پیش کرنا چاہیئے تھا۔"

جس پر برجستہ ارشاد ہوا کہ

"ہر چہ از دوست می رسد نکوست!"

چند سال قبل مولوی عبدالحق صاحب کے ہمراہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ملنے آئے تھے۔ مولوی صاحب نے مہاراجہ بہادر سے درخواست کی کہ وہ ایک مشاعرہ کی صدارت فرمائیں اور مصرعہ طرح تجویز کریں۔ ایک مہمان شاعر اور ممتاز ادیب کا لحاظ کرتے ہوئے مہاراجہ نے فرمایا کہ

"مصرعہ طرح کیفی صاحب تجویز کریں"

چنانچہ اصرار کے بعد کیفی صاحب نے مہاراجہ بہادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ

"اگر مجھ پر مصرعہ طرح چھوڑا گیا ہے تو میں غالب کا یہ مصرعہ تجویز کرتا ہوں:-

"ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے"

یہ سنتے ہی مہاراجہ بہادر نے فی البدیہہ فرمایا۔

"کہتا ہے شاد بھی یہی کیفی سے با خلوص
ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے"

ایک مرتبہ بنگلور سے حیدرآباد کی واپسی کے وقت گدوال اسٹیشن سے چند میل گزرنے کے بعد جب کہ ریل تیز رفتار سے جارہی تھی ایک ملازمہ کی لڑکی جو کھڑکی سے جھانک رہی تھی اتفاق سے گر پڑی ایک ہمراہی نے فوراً زنجیر کھینچی اور تھوڑی دیر بعد ریل ٹھیر گئی مہاراجہ بہادر بھی سیلون سے اتر کر تشریف لائے اور اس خون آلود بچی کو اٹھالیا اپنے سیلون تک لے آئے اور مرہم پٹی کروائی۔ مہاراجہ بہادر کی نیک نفسی اور خدا ترسی کا مزید ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ خود مہاراجہ اس بچی کی بیوہ ماں کو تسکین اور تشفی دیتے رہے۔ سالہا سال بعد بھی یہ غریب ماں مہاراجہ کی مہربانی کو یاد کرتی تھی اور ان کے حق میں دل سے دعائیں دیتی تھی۔

مہاراجہ آنجہانی ہمیشہ اس اصول پر مضبوطی سے کاربند تھے کہ خواہ کوئی شخص کتنی ہی برائی اور دشمنی کرے لیکن اس کے ساتھ ہمیشہ اس قدر نیکی کرو کہ وہ آخرش شرمندہ ہو جائے۔

مہاراجہ بہادر ایسی خوبیاں رکھتے تھے کہ ان کی یاد اہلِ ملک کے دلوں میں عرصہ تک برقرار رہے گی اور ان کا ذکر ہمیشہ عزت و محبت سے کیا جائے گا۔

غلام علمبردار

شالامار

سیاہ ابر سے تھم تھم کے پڑ رہی ہے پھوار
چمن کی خاک سے رنگینیاں ہویدا ہیں
برس رہے ہیں ہواؤں سے نغمۂ عشرت
نگاہِ شوق کو درسِ سرور دیتا ہے
فضا میں بادۂ سرجوش کی ہیں تاثیریں
خزاں کا نام بھی مفقود ہے گلستاں سے
ضیا فروش ہے ہر سمت جلوۂ فطرت
بجا ہے کہیے اگر اس کو جنتِ ارضی
یہ ایک خوابِ جناں تھا کہ خوابِ شاہجہاں
مگر ہیں دیدۂ عبرت میں اشکِ مایوسی

سرور و کیف کا منبع ہے صحنِ شالامار
ہر ایک ذرے کے رخ پر جھلک رہی ہے بہار
ہجومِ کیف میں رقصاں ہے نرگسِ بیمار
مچل رہا ہے جو سبزے پہ سایۂ اشجار
جنوں کی زد پہ سنبھلنا ہے عقل کو دشوار
پیامِ عشرت و راحت سنا رہی ہے بہار
جہاں تہاں ہیں گل و برگ و غنچہ کے انبار
نظر پہ نشہ سا طاری ہے قلب ہے بیدار
کہ ہو سکی نہ کہیں اس کمال کی تکرار
کہ بزمِ دہر میں ممکن نہیں کسی کو قرار

نویدِ زیست میں پنہاں ہے مرگ کی تلخی
نہ شاہجہاں ہے نہ اک دن رہے گا شالامار

اختر ہوشیارپوری

تعطیل کا دن

تعطیل کا دن تھا، میں کمرہ میں بیٹھی اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھی..... شام کو ایک جگہ دعوت میں بھی جانا تھا، اور پھر ایک زمانہ سے الماری بند کی بند پڑی تھی۔ پہلی ہی ساڑی کو دیکھتی ہوں تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا..... کیڑوں نے اچھا خاصا سوراخ بنا دیا تھا..... میں دوسرے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ غنیمت ہوا کہ دوسرے کپڑے محفوظ تھے۔ سب سے نیچے میری شادی کا جوڑا رکھا ہوا تھا..... اسے اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے دیکھتی رہی، وزنی..... چمک دار، پسینہ پسینہ ہو گئی تھی اسے پہن کر..... پلٹ کر آئینہ میں دیکھتی ہوں تو میری نظریں خود بخود جھک گئیں..... دن گزر جاتے ہیں اور باتیں یاد رہ جاتی ہیں..... اسی طرح آئینہ میں خود کو دیکھتی کھڑی تھی کہ..... آتے ہی کہنے لگے..... "کیا اندر سبھا، کو جانے کی تیاریاں ہیں"..... میں نے پوچھا تھا..... اندر سبھا، کو..... میں..... بھلا کیوں؟" "پریاں نہیں تو پھر کون جاتا ہے"..... اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہوا کے جھونکو کے سہارے آسمان پر اڑی چلی جا رہی ہوں..... مجھے اس آواز کی گونج میں ہزاروں ساز چھڑتے سنائی دے رہے ہیں..... اور میں بادل کی طرح بہتی چلی جا رہی ہوں..... اس دن کو یاد کرتی ہوں تو آج بھی زندگی جھوم جاتی ہے..... اور مسرت لہرانے لگتی ہے..... صحن میں سے کونڈے کے ٹوٹنے کی آواز آئی تو میرے تصورات کی رنگین دنیا دھندلی پڑ گئی..... میں نے اس جوڑے کو تہہ کرتے ہوئے پوچھا "آخر یہ ہو کیا رہا ہے"؟

"تکلیف نہ ہو تو یہیں آ کر دیکھ لیجئے نا"...

"جی ابھی آئی"....

میں نے الماری بند کر دی، اور تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے کے باہر نکل گئی..... کہاں ہیں آپ" میں نے صحن میں چوطرف نگاہ دوڑاتے ہوئے پکارا.. "جی یہاں اس پودے کے پیچھے" میں نے دیکھا پودوں کی دیکھ بھال ہو رہی ہے، سوکھی پتیاں توڑی جا رہی ہیں... کونڈوں کو قرینے سے جمایا جا رہا ہے۔ اور اس توجہ سے کام ہو رہا ہے کہ بالوں میں جالے الجھ گئے ہیں۔ اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے ٹھہر گئے ہیں.... میں نے ہنستے ہوئے کہا "آج ان بیچاروں کی شامت آئی ہے جو آپ کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی.... کیوں مالی سے یہ کام نہیں ہو گا کیا؟" "جی مالی کو باہر بھیجا گیا ہے"...." تو اس کے آنے تک کیا یہ پودے سوکھ جائیں گے؟".... "مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے" "اور یہ دھوپ جو ہے"....

اتنے میں مالی بھی آ گیا.... اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا.... میں نے بڑھ کر لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا.... دیکھتی کیا ہوں کہ میرے نام کا ہے.... "کس کا خط ہے" "جی میرے نام کا ہے...." "نام تو اس پر میرا بھی ہو گا"... .... ہے... اور ضرور ہے... لیکن آپ اٹھئے یہاں سے" "اور پھر کہاں چلئے".... میں نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے.... "وہاں".... ان پودوں کے کونڈوں کو جمائیے چلئے....."

میں اپنے کمرے میں چلی آئی..... اور وہ ان چھوٹے چھوٹے پودوں کو پانی ڈالنے، اور ان کی جڑوں کو کریدنے میں مصروف ہو گئے.... میں نے لفافہ چاک کیا....

تھوڑی دیر بعد آواز آئی "کس کا خط ہے؟" — میں نے
جواب دیا — "میری سہیلی کا۔" .... "کون سہیلی" ... "بڑی
مشکل ہے آپ سے کون سہیلی؟ .... کیسی سہیلی؟ .... کہہ دیا کہ
ایک ہے سہیلی، اور بس اسی کا خط ہے" پھر پوچھا جاتا ہے۔
نہیں بھئی آخر کون؟ میں نے دیکھا ہے اسے؟ ..." "خواب
میں بھی تو نہ دیکھے ہوں" میں نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔
"تو آپ نہیں کہیں گی یہ سہیلی آخر ہے کون بلا ... کوئی خوبصورت
بلا ہے کیا ..." "جی ہاں ہے تو پھر ..." میں نے بناوٹی غصہ
سے کہا ... اس پر وہ خاموش ہو رہے .... اور میں نے
پورا خط پڑھ ڈالا دھیمے لہجہ میں کہنے لگے "اگر اس کونڈے
کو اور ذرا آگے بڑھا دیا جائے تو ...." "میرے سر پر ہی
رکھ دیجئے نا ...." "اچھا اب کو آپ تکلیف نہ ہو تو اندر تشریف
لائیے ..." میں نے بڑی متانت سے کہا ... وہ اندر آئے
تو میں نے خط ان کے آگے بڑھا دیا ..... "لیجئے ذرا پڑھئے
اسے" انھوں نے خط کو اٹھا لیا اور پڑھنے لگے .....
"پیاری بہن" "اچھا آپ عورتیں بھی ایک دوسرے کو
پیاری کہہ لیتی ہیں ..." "آپ نہیں پڑھیں گے میں جانتی
ہوں" کہہ کر میں نے خط ان کے ہاتھ سے لے لیا ....
"ہاں تو" "ہاں تو کیا۔ آپ بڑے وہ ہیں ..." ... "
اچھا لائیے خط" "نہیں دیتے اب ...." "تو ہم چلے
اپنے پیارے کونڈوں کے پاس" "جائیے روکا کس
نے ہے" .... اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے ... اور
پھر شروع ہو گئی کھٹ پٹ ..... تھوڑی دیر بعد میں بھی
قریب ہی جا بیٹھی .... "تو وہ تصویر دیکھی تھی نا آپ نے"
"کونسی" انھوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا .... "وہی
میری ایک سہیلی کی ہے؟" .... "بھئی آخر کیسی ہے وہ" .. "مغل
شہزادی کے لباس میں جو ہے" "اچھا وہ مگر وہ تو عجب
گاؤدم ہے۔" "رہنے دیجئے گاؤدم .... تو اس نے
یہ خط بھیجا ہے۔ لکھا ہے کہ اب اس کی شادی ہونے والی
ہے۔" "چلئے مبارک۔ ایک دعوت تو یقینی ہوگی ....."
"آپ سے میں نے کہا نہیں شاید ..... بڑی اچھی لکھنے
والی ہے ..." "تو پھر سنائیے .... دیکھیں کتنے پانی میں ہے۔"
"سنئے، لکھتی ہے .... میری زندگی میں کچھ عجب انقلاب
محسوس کر رہی ہوں، دل کا یہ حال ہے کہ ارمانوں کے ہجوم
سے اُمڈا اُمڈا پڑتا ہے .... لیکن ساتھ ہی ایک نئی اور انوکھی
دنیا میں قدم رکھتے ہوئے جھجک رہی ہوں ... اندیشوں اور
دہشتوں کے بھیانک سائے بھی بڑھے چلے آ رہے ہیں ...
لیکن ... تم سے چھپاؤں گی نہیں ... آنے والی زندگی کے
خیال نے میری کائنات ہی بدل ڈالی ... ایسا محسوس کرتی ہوں
.... جیسے ... جذبات مسرت کے ہیجان سے گھٹ
کے رہ جاؤں گی ... پرسوں وہ لوگ مجھے دیکھنے آئے تھے۔ کون
لوگ؟ یہ نہ پوچھو .... ان کے آنے سے پہلے اماں نے مجھ سے
کہا" ذرا کپڑے تو بدل ڈالو ..." میں ان کا مطلب سمجھ گئی"
اسی طرح آنکھیں نیچی کئے کہنے لگی .... "نہیں میں نہیں" اور
دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی .... اندر سے زنجیر بھی
چڑھا لی ... "کیا بہنوں" میں سوچنے لگی ... اتنے میں
دروازہ پر کھٹکا ہوا ... "کون ہے" "میری آپا آئی تھی۔ میں نے
کمرہ کا دروازہ کھول دیا .... "کیا ہے؟" میں نے بسورتے ہوئے
پوچھا ... "کیا ہے کچھ نہیں ..." اس نے اندر داخل ہو کر کہا ...
اور مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہنے لگی .... "ارے آپ تو

ابھی..." "میں نہیں پہنتی کپڑے وپڑے.... بس جیسی اب ہوں ویسی ہی دیکھ لیں" مگر وہ تو ایک زمانہ کی باتونی کہنے لگی" میری بیگم ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو.... چلو ذرا مجھے اپنے کپڑے دکھاؤ"..." نہیں دکھاتی" میں نے بناوٹی غصہ سے کہا....
"ارے وہ لوگ کیا کہیں گے..." "کیا کہیں وہ لوگ" "یہی کہیں گے کہ بچی کے پاس کپڑے ہی نہیں..." میں بھولی بھالی ...اس کے اس جملے کو سن کر اپنے سارے کپڑے اس کے سامنے پھیلا دیئے...."لے دیکھ"...." ہاں" اس نے اطمینان سے کہا..." تو اس میں سے کونسی ساڑی" " جو بھی تجھے پسند ہو..." "یہ دھانی رنگ کی ساڑی کیسی رہے گی؟" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا" مجھے پسند ہے...." "تو پھر تیار ہو جاؤ، وہ لوگ بھی اب آتے ہی ہوں گے...." میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔" سچ کہنا یہ لوگ مجھے دیکھ کر کیا کریں گے. ان کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ کمبخت میرے دل کی بات تاڑ گئی.... "دیکھنا تو انھیں چاہیئے... کیوں"....
اس کے اس جملہ پر میں کٹ کے رہ گئی...." ہاں اور نہیں تو کیا دیکھنا تو ہم دونوں کو چاہیئے..." "ہم دونوں کون؟"
"چل چپ بڑی آئی ہے بکواس کرنے" یکایک "ادھر آؤ" "اُدھر لے جاؤ" کی گڑبڑ شروع ہو گئی "ارے" میرے منہ سے نکلا...."آ گئے" آپا بولی.... اور بڑی پھرتی سے مجھے سنوارنے لگی۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔ پوچھی" کون ہیں یہ جو ...." "اپنے محلے میں رہتے ہیں" "تو نے دیکھا ہے انھیں"۔
"ہوں"... تھوڑی دیر چپ رہ کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیسے ہیں...." "بس ہیں..." "مگر کیسے ہیں"...." مجھے کیا معلوم؟" "بول تجھے میری قسم ہے" "تم نے دیکھا مجھے کیسا ستا رہی تھی...." اچھے ہیں...." ..... اچھے کیسے" "اب یہ مجھے نہیں معلوم...." .... دالان میں عورتوں کی گفتگو کی آواز آ رہی تھی اماں نے آپا کو پکارا.... وہ گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئی.... آنکھوں کے اشارے سے کہنے لگی" چلیئے"....جس کو دیکھتی تھی، مجھے ستانے اور چھیڑنے کے درپے تھا... اور یہ آپا تو سب سے زیادہ دق کر رہی تھی... تم دیکھتی رہنا... ایک دن انہیں کے ہاتھ سے نہ پٹوادوں تو کہنا میرا حال بھی سنو... کھڑے ہونا چاہتی ہوں لیکن تو پاؤں لرز رہے تھے.... پیشانی پر پسینہ کی موج بھی بہہ رہی تھی.... اور سارے جسم میں کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔ خدا جانے ان عورتوں کو پسند بھی آتی ہوں یا نہیں.... کیا کیا باتیں کریں گی.... کیسی درگت بنتی ہے۔ دیکھئے تم پر بھی یہ آفت گزر چکی ہے... تمھارا حال بھی یہی ہوا ہوگا....
بڑی مشکل سے دالان تک پہنچی.... مجھ کو دیکھتے ہی سب چپ ہو گئیں... ایک بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے قریب بٹھایا... ایک عورت نے اپنے بازو بیٹھنے والی عورت سے کہا "لڑکی کا قد برا نہیں..." اس عورت نے جواب دیا..." اور ناک نقشہ کی بھی ٹھیک ہے...." اس بوڑھی عورت نے میرے چہرے سے آنچل ہٹایا...اور بڑے غور سے میرے چہرہ کو دیکھنے لگی... لاکھ کوشش کر رہی تھی کہ آنکھیں اٹھاؤں.... لیکن جیسے کسی نے ان پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو...." اچھا بیٹی اب تم جاؤ" اماں نے مجھ سے کہا.... میں سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی... تم وہاں ہوتیں تو دیکھتیں کہ اچھی خاصی "جاترا" سی جمی ہوئی تھی.... میں مورتی کی طرح بیچ میں... اور میرے اطراف مجھے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والی عورتیں.... اور ہاں

تم سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے ... ڈیڑھ مہینے کے بعد شادی ہونے والی ہے ... آؤ گی نا!! اور تم یہ خط اپنے "چہیتے خاوند" کو نہ دکھاؤ ..... تم تو جب سے بیاہی گئی ہو بس سب کو بھول بیٹھی ہو ..... ایسا کونسا جادو انھوں نے تم پر کر دیا ہے ؟ مجھے تو ان پر غصہ آتا ہے ... میری سہیلی کو مجھ سے چھین لے گئے ..... یہ مرد بھی عجیب ہوتے ہیں ... کسی کو اپنا کر لیا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ... مگر میں تم سے بھی شکایت کروں گی .... شادی سے پہلے کس "زور وشور سے کہتی تھیں کہ" ایسا کروں گی ... ویسا کروں گی ... کبھی سیدھے منہ بات نہیں کروں گی ... خوب ستاؤں گی" .... ساری شیخی کرکری ہو گئی نا ... اب تو بس انہیں کا کلمہ پڑھتی پھر رہی ہو .... میں تو .... ہاں میں تو .... ایسا نہ کروں گی ... ان کے دوست ہیں تو میری بھی سہیلیاں ہیں ... میں روز ان سے ملا کروں گی .... تم ایک دو دن کے لئے میرے ہاں آ جاؤ تو بہت سی باتیں کہنی ہیں تم سے ... اور اپنے میاں سے کہہ دو کہ میں بہت غصیلی ہوں .... ذری بھی شکایت سنوں گی تو ایسی خبر لوں گی کہ ..... مگر تم بیچ میں نہ آنا ...."

"لیجئے ختم ہو گیا خط" میں نے ہنستے ہوئے کہا ...

"تو اسی لئے آپ ہنس رہی تھیں ..... یہ تو آپ سے بھی زیادہ شریر نکلی" .... "اب دیکھنا یہ ہے اس کے بیچارے دولھے میاں کیسے نکلتے ہیں ؟ ...."

"مرد سب شریف اور نیک ہوتے ہیں" .... "جی" .... "مگر یہ لڑکی مجھ سے کیوں اللہ واسطے کی دشمنی رکھتی ہے ... ارے صاحب میں نے تو آج تک اس کی صورت بھی نہیں دیکھی .... کبھی یہاں بلا لیجئے اسے میں بھی خبر لیتا ہوں اس کی .... " .... "بلاتی ہوں ... دیکھیں گے کون کس کی خبر لیتا ہے ..... آپ کی ساری باتیں اس سے کہہ دوں گی۔ ..." ... "ساری باتیں کیا ؟" ... "یہی کہ آپ میری بات نہیں سنتے ... فقط زبان سے کہتے رہتے ہیں کہ "محبت کرتا ہوں" اور ...." "اور یہ کہ محبت آپ کو دوسروں سے ہے ... " "مثلاً ان جھاڑوں سے" میں نے ہنستے ہوئے کہا ... "تو جل جائیں یہ جھاڑ ... میری بلا سے" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، میں اندر چلی آئی ... "اچھا بس رہنے دیجئے آپ کی محبت ... دیکھئے وہ مالی آ رہا ہے ...." ــــــ

رشید قریشی

میر محمد مومن کا ذوقِ تعمیر

میر محمد مومن چاہتے تھے کہ دکن کے اندرونی حصوں میں بھی ثقافتی ترقی ہو اور دیہات کے باشندے بھی اسلام سے روشناس ہوسکیں۔ اس لئے انھوں نے شہر حیدرآباد سے باہر کئی زمینات اور گاؤں خریدے اور ان میں تالاب، مسجدیں عاشورخانے، سرائیں اور دیگر عمارتیں بنوائیں جن کے اطراف ثمرہ دار[1] درختوں کے باغ لگائے اور طرح طرح کی ترغیب و تحریص سے[2] لوگوں کو آباد کیا۔

جیساکہ ابھی کہا گیا دیہات بسانے اور ان میں عالی شان مسجدیں اور عاشورخانے بنانے میں میر صاحب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سرزمین دکن میں دور دور تک اسلام کی روشنی پھیل جائے۔ اور شہر کے علاوہ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے رہنے بسنے والے بھی اسلام کی شان و شوکت اور اسلامی رسوم و تمدن سے واقف ہوسکیں۔ چنانچہ ان کی مسجدیں اور عاشورخانے اندرون ملک کے پہاڑوں، چٹیل میدانوں اور سنسان جنگلوں میں دیہاتی زندگی بسر کرنے والوں میں اب تک ایک خاص عظمت و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں سے زیادہ ہندو ان مسجدوں اور عاشورخانوں کا احترام کرتے ہیں جس کا تفصیلی حال میر صاحب کے تصرفات کے بیان میں درج ہے۔ غیر مسلموں کے علاوہ میر صاحب خود عام مسلمانوں کے دلوں میں بھی حُبِ اہل بیت نبی اور ائمۂ معصومین و سادات کے احترام و اہتمام کا خیال غیر ارادی طور پر پیدا کردینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کا ذکر انھوں نے اس خط میں کیا ہے جو شاہ عباس صفوی والی ایران کے فرمان کے جواب میں سلطان محمد قطب شاہ کے ابتدائی عہد حکومت میں حیدرآباد سے روانہ کیا گیا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

"و تسلی خاطر باین ست کہ درین حدود و کشور مساجد و منبر بعد از تزئین بذکر اسامی مبارکۂ حضرات عالیات چہاردہ معصومؑ مزین و مشرف بنام نامی و القاب گرامی آں شہنشاہ والاگہر دین پناہ عدالت گستر و آبا و کرام قدسی مقام آں نور بخش ہفت کشور است[1]"

اس حقیقت حال سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علموں اور تعزیوں کے رائج کرنے میں مذہبی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کا سیاسی مسلک بھی کام کر رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دکن کے عام مسلمانوں کے علاوہ یہاں کی بت پرست اقوام کو علموں اور تعزیوں کے ذریعہ سے اسلام سے مانوس کریں تاکہ وہ رفتہ رفتہ اپنے بتوں اور رتھوں کو چھوڑ کر علموں اور تعزیوں اور تابوتوں کی طرف مائل ہوجائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ میر صاحب نے اپنے گاؤں میر پیٹھ میں جو عاشورخانہ بنایا تھا اس کے منہدمہ آثار میں اب بھی ہر سال ہندو ہی بڑے اعتقاد کے ساتھ علم بٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اطراف و اکناف کے

---

[1] عبداللہ قطب شاہ نے بھی اپنے فرمان میں میر صاحب کے ناریل اور ثمر دار درختوں کے باغوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرمان میر صاحب کی اولاد کے بیان میں نقل کیا گیا ہے۔

[2] چنانچہ طالبیسی کو پچیس بیگے زمین بطور انعام دے کر سید آباد میں آباد کرنے کا ذکر آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہو۔

[1] حدائق السلاطین ورق ۱۹۳

اکثر دیہات میں بھی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم لوگ ہی ایام عاشورہ کا احترام کرتے ہیں۔

سید آباد

میر صاحب کی بسائی ہوئی آبادیوں میں سب سے پہلے موضع سید آباد کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ شہر سے قریب تر واقع ہے۔ یہ گاؤں میر صاحب نے حیدرآباد کی جانب شرق خود اپنے دولت خانے سے صرف تین چار میل کے فاصلہ پر بسایا تھا۔ اس کا نام مرور ایام کی وجہ سے مسخ ہوتے ہوتے اب سعدا باغ پڑ گیا ہے۔ میر صاحب کے مکان سے اس آبادی تک سیدھی سڑک بنائی گئی تھی اور اس سڑک پر اور چند میل آگے بعد کو سلطان محمد قطب شاہ نے قلعہ سلطان نگر اور اس کی ملکہ حیات بخشی بیگم نے شہر حیات نگر بنایا تھا۔ اول الذکر تو نامکمل رہا لیکن موخر الذکر اب تک آباد ہے۔

سید آباد کی مسجد اور سرائے

سید آباد میں میر صاحب نے ایک پختہ اور بلند مسجد اور اس کے اطراف ایک عالی شان سرائے بھی بنائی تھی۔ مسجد تو ایک حد تک اب بھی محفوظ ہے لیکن سرائے بہت شکستہ ہو گئی ہے اور اب صرف اس کا وہ حصہ باقی ہے جو مسجد کے عقب میں واقع ہے۔ پہلوؤں کی طرف کی عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ البتہ شمالی سمت کے چند کمرے بچ گئے ہیں۔ اگرچہ بعد کو قدیمی راستے وغیرہ باقی نہ رہے لیکن اب بھی مسجد تک موٹر جا سکتی ہے۔ یعنے نواب سر امین جنگ کے مکان کے مقابل جو راستہ جنوب کی طرف جاتا ہے اس پر تھوڑی دور جانے کے بعد اگر جانب مشرق مڑیں تو پہلے میر صاحب کی سرائے اور پھر مسجد نظر آجاتی ہے۔ یہ مسجد اب بھی آباد ہے اور اس میں متعدد نل ہیں جن سے دن بھر آبادی کی ہندو مسلم مستورات پانی لے جاتی رہتی ہیں۔

میر صاحب نے مسجد اور سرائے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت اور خدمت وغیرہ کے لئے اخراجات کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ انھوں نے اس مسجد کی نگرانی کی خدمت ملا تمیمی کے سپرد کی تھی جو غالباً ایک بڑے عالم یا شاعر تھے کیونکہ قطب شاہی عہد میں صرف ممتاز لوگوں کے نام کے ساتھ ملا کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً ملا وجہی اور ملا غواصی وغیرہ۔ یہ دونوں بھی حضرت میر مومن کے ہم عصر اور بڑے شاعر تھے۔ غرض ملا تمیمی کو مسجد و سرائے کی خدمت سپرد کر کے اسی موضع سید آباد میں پچیس بیگھے زمین انعام میں دی گئی تھی تاکہ وہ اور ان کی اولاد اس معاش کی وجہ سے ہمیشہ وہاں قیام پذیر رہیں اور مسجد اور خانقاہ کی خدمت کرتے رہیں۔ چنانچہ میر صاحب کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد کی ایک تحریر راقم کی نظر سے گزری جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملا تمیمی کی اولاد اس وقت تک برابر یہ خدمت انجام دے رہی تھی۔ اس میں لکھا ہے:-

"من کہ سید حسین ولد سید جلال داماد سید محمد بن
سید لار محمد بن شاہ محمد بن ملا تمیمی انعام دار
تعلقہ سعدا باغ سیوار موضع انوارم[1] پرگنہ حویلی
فرخندہ بنیاد سرکار محمد نگر اقرار معتبر می کنم و نوین
می دہم برین وجہ کہ موازی بست و پنج بیگہ خارج
جمع بہ شرط خدمت و صرف ضروریات مسجد پختہ
و مکانین بنا ساختۂ میر محمد مومن صاحب
مغفور واقع تعلقہ سعدا باغ مذکور سیوار مذبور

---

[1] اس کو اب گڈی انارم کہتے ہیں۔

بموجب اسناد قدیم و جدید و پروانہ جات ناظمان
ودیوانیان، وصدور صوبہ، مقرر بہ نام من و
بزرگان من تا الی الآن از اراضی مذکور قابض
ومتصرف بودہ خدمت مسجد مذکور بجامی آرم
........" الی آخرہ[1]

یہ تحریر غرہ جمادی الاول ۱۱۸۷ھ کو لکھی گئی تھی اور اس پر حسب ذیل حضرات کے دستخط اور مہریں بھی ثبت ہیں۔

محمد علی	سید حسین ولد سید جلال
حاجت روا محمد مشکل کشا علی	۱۱۷۸ھ

محمد شاکر بیگ ۱۱۱۶ھ	محمد باقر	سید مرتضیٰ
۱۱۸۳ھ	۱۱۶۲ھ	۱۱۸۳ھ

معانی حسین خواجہ محمد عظیم حسینی سید یوسف علی خاں میر ابو طالب اور کاغذ کے سرلوح پر حکیم محمد معصوم خاں فدوی نظام الملک آصفجاہ ۱۱۴۵ھ کی مہر بھی ثبت ہے۔

اس اقرار نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک موضع سید آباد یا سعد آباد باغ خود میر محمد مومن کے ورثا کے قبضہ سے نکل چکا تھا۔ اور اب وہ (یعنی "میر محمد حسین و میر کاظم علی ابنان میر سید محمد مرحوم و مسماۃ خدیجہ بیگم ورثۂ میر محمد مومن") کم از کم اس مسجد سرائے اور اس سے متعلقہ مکانوں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ گاؤں کس وقت اور کیوں حضرت میر مومن کی اولاد سے لے لیا گیا تھا ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا البتہ ۱۱۶۰ھ کے ایک محضر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خود قطب شاہی دور میں میر مومن صاحب کی جملہ جاگیرات اور زمینات ان کی اولاد سے چھین لی گئی تھیں اور یہ ابوالحسن تاناشاہ کے آخری زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ مادنا اور اکنا کی عملداری تھی۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر اس وقت ایک قدیم محضر ہے جس میں لکھا ہے:۔

سوال می کنند و استدعائے ادائے شہادت
می نماید اقل العباد اللہ سید محمد و مسماۃ شاہ بیگم
و مسماۃ زہرا شاہ و مسماۃ فخر النسا بیگم و مسماۃ
خیر النسا وغیرہ نبیرہائے جنت مکانی فردوس
آشیانی میر محمد مومن پیشوائے قطب الملک ....
بعد از پدرم ماہائے مفقرین طفلان دختیاں
بیوہائے بے کس و بے وسیلہ دیدہ مادنو زنار
دار از راہ تعدی ظلم صریح نمودہ ہمہ دیہات
انعام را متعلق بت خانۂ خود کردہ و مساجد
آں جد بزرگوار مطلق بے چراغ نمودہ ....
جمع کثیر سادات بیوہائے ذریہ طیبۂ طاہرہ
میر محمد مومن از قوت لایموت محتاج اند۔ حق
ایں سادات مستحقین دستبند تا لاہا و محصول
اشجار از راہ تعدی کافراں می خورند چنانچہ
اسناد قدیم و حال بدست داریم حق بحقدار
نمی رسد۔ مساجداں جدم بزرگوار را بے چراغ کردند"

یہ محضر ۵ رمضان ۱۱۶۰ھ کو لکھا گیا تھا اور اس پر متعدد اصحاب کے دستخط اور مہریں ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

---

[1] یہ اقرار نامہ مولوی میر عباس علی صاحب نبیرہ حضرت میر محمد مومن کے یہاں اب بھی محفوظ ہے۔

---

[2] یہ محضر بھی مولوی میر عباس علی صاحب کے یہاں محفوظ ہے۔ اور اس میں مادنو زنار دار سے مراد یقیناً دیوان مادنا ہے۔

سید احمد بن سید رحمت اللہ	بندہ درگاہ یوسف بن ایتوں
۱۰۹۹ھ	۱۰۹۷ھ
عبداللطیف بن محمود	صدرالدین سید محمد محمود
۱۱۱۲ھ	۱۱۱۰ھ
رفیع الدین منشی عالمگیر شاہ	علی بیگ ولد حسین بیگ
ہدایت اللہ ولد نعمت اللہ	خان زماں بندہ عالمگیر بادشاہ
۱۱۱۷ھ	۱۰۷۳ھ

غرض اس محضر نے ظاہر کر دیا کہ میر صاحب کی وفات کے صرف اٹھاون سال بعد ہی ان کے بسائے ہوئے گاؤں اور خریدی ہوئی زمینات دوسروں کے قبضے میں چلی گئیں۔ یہ واقعہ ۱۰۹۲ھ کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس سنہ میں ان کے پوتے میر محمد جعفر ابن میر مجدالدین محمد زندہ تھے جن کی نسبت علی ابن طیفور بسطامی نے اپنی تاریخ حدائق السلاطین (مولفہ ۱۰۹۲ھ) میں لکھا ہے :۔

"پسراو (یعنے مجد دین محمد) سید حمیدہ سید فضیلت گستر سید جعفر[1]"

اوران سید جعفر کے نام اس تاریخ کی ترتیب سے صرف ۲۸ سال قبل میر محمد مومن کی جملہ جاگیرات اور زمینات کی بحالی کا فرمان سلطان عبداللہ قطب شاہ نے ان الفاظ میں جاری کیا تھا:۔

"سال بسال دروجہ انعام باولاد واحفاد
میر مرحوم الی ماتوالد وتناسل مرحمت فرمودیم۔
دبارز مواضع مذبور را دروجہ انعام نبیرہائے
میر مذکور مجری دانستہ ملک ومیراث ومواضع
مسطور بتصرف میر محمد جعفر وغیرہ نبیرہائے میر مرحوم
واگذارند۔ واز کل تکلیفات دیوانی وکل قانون
قدیمی وجدیدی اسمی ورسمی معاف دانستہ متعرض
ومزاحم حال نگردند۔ وہرکس از راہ طمع بخلاف
مضمون ایں فرمان عنایت عنوان تبدیل و
تحریف جائز دانستہ بمواضع مذبورہ انعام
میر سابق الذکر مزاحم شود بغضب وسخط آفریدگار
گرفتار آید .... الی آخرہ[2]

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے یہ آخری الفاظ بالکل صحیح ثابت ہوئے اور مادنا دیوان پر غضب الہٰی نازل ہوا کیونکہ اس نے صریح فرمان کے خلاف سید محمد جعفر کی وفات کے بعد ہی میر صاحب کی تمام جاگیرات اور زمینات چھین لیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر طرح کے انقلابات اور گردش ایام کے باوجود سید آباد میں میر صاحب کی بنائی ہوئی مسجد اب تک سربلند ہے اور اپنے بنانے والے کی اولوالعزمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس کی شاندار محراب سنگ موسیٰ سے بنائی گئی ہے جس پر ایک اعلیٰ درجہ کا کتبہ بھی نصب ہے۔ یہ نفیس اور خوش نما خط ثلث میں لکھا گیا ہے اور سرزمین دکن کے بہترین کتبوں میں شمار پا سکتا ہے۔

میر صاحب کا کتبہ

اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے یہ مسجد اور سرائے ۱۰۱۷ھ میں بنائی تھی۔ یہ ان کے پہلے دور پیشوائی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس کی تعمیر سے دو تین سال قبل ہی انھوں نے مرزا محمد امین کو میر جملگی دلائی تھی جس کی دلچسپی اور مستعدی کی وجہ سے میر صاحب کو مہمات سلطنت سے کچھ فرصت مل گئی تھی۔ اور وہ اب شہر سے باہر اسلامی یادگاروں کی تعمیر کے لئے وقت نکال سکتے تھے۔

---

[1] ورق ۱۹۱ ا۔

[2] یہ فرمان بھی موجود ہے اور اس کا فوٹو اس کتاب میں شریک کیا گیا ہے۔

اس مسجد کا مسقف حصہ ۳۰ فیٹ طویل اور ۲۱ فیٹ عریض ہے۔ اس میں تین کمانیں ہیں۔ اور اس کی محراب پر جو سنگ موسیٰ میں بنائی گئی ہے مولانا حسین ابن محمود شیرازی کا ایک نفیس کتبہ درج ہے جس کی تفصیل یہ ہے[1]۔

محراب کی انتہائی بلندی پر قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالیٰ اور اس کے نیچے ایک سیدھی سطر میں قرآن شریف کے سترہویں سورہ الاسریٰ کی بیسویں آیتہ یعنے

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا کندہ کیا گیا ہے۔ اور اس کتبے کے درمیان میں اوپر کی طرف اٹھا کر وھو مومن لکھا گیا ہے جس سے شاید مسجد کے بانی کا نام ظاہر کرنا بھی مقصود تھا۔ میر مومن صاحب نے محراب میں اپنا نام و نشان صریحی طور پر کندہ کرانا مناسب خیال نہ کیا کیونکہ ایک تو وہ غالباً نام و نمود نہیں چاہتے تھے اور دوسرے یہ کہ ایسی جگہ جس کی طرف تمام مصلیوں کو نماز کے وقت رخ کرنا پڑتا تھا کسی شخص کا نام مندرج ہونا احترام مسجد اور آداب نماز کے خلاف بھی تھا۔

اس آیتہ کے نیچے محراب کے بالکل اوپری حصہ کو تین حصوں یا تختیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی تختی میں لکھا ہے۔ عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت

درمیانی تختی میں لکھا ہے۔ ربنا تقبل منا بآل النبی

تیسری تختی میں لکھا ہے۔ وعجلوا بالتوبۃ قبل الموت

محراب کے دونوں پہلوؤں میں درود شریف کندہ کیا گیا ہے[2]

درمیانی کمان کی دائیں طرف نیچے سے اوپر لکھا ہے :۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَی الْمُصْطَفٰی مُحَمَّدٍ وَالْمُرْتَضٰی عَلِیٍّ وَالْبَتُوْلِ فَاطِمَۃَ وَالسِّبْطَیْنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ وَصَلِّ عَلٰی زَیْنِ الْعِبَادِ عَلِیٍّ وَالْبَاقِرِ مُحَمَّدٍ وَالصَّادِقِ جَعْفَرٍ وَالْکَاظِمِ مُوْسٰی وَالرِّضَا عَلِیٍّ وَالتَّقِیِّ مُحَمَّدٍ وَالنَّقِیِّ عَلِیٍّ وَالزَّکِیِّ الْعَسْکَرِیِّ الْحَسَنِ۔

کمان کی بائیں طرف اوپر سے نیچے :۔

وَصَلِّ عَلَی الْحُجَّۃِ الْقَائِمِ الْخَلَفِ الصَّالِحِ الْاِمَامِ الْھُمَامِ وَالْمُنْتَظَرِ الْمُظَفَّرِ مُحَمَّدٍ الْمَھْدِیِّ الْھَادِیِّ صَاحِبِ الْعَصْرِ وَالزَّمَانِ وَخَلِیْفَۃِ الرَّحْمٰنِ سَیِّدِ الْاِنْسِ وَالْجَانِّ وَالْمُظْھِرِ لِلْاِیْمَانِ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ نمقہ عبدہ حسین شیرازی۔

سید محی الدین قادری زور

(نوٹ۔ یہ مضمون حیات میر محمد مومن کا ایک حصہ ہے)

---

[1] اس کتبے کے صحیح پڑھنے میں مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری ناظم تعلیمات نے مولف کی خاص مدد فرمائی۔

[2] اس درود اور سلطان قلی قطب شاہ والی سلطنت گولکنڈہ کی قبر کے مندرجہ درود کے الفاظ تقریباً ایک ہی ہیں لیکن سلطان محمد قلی قطب شاہ کے سنگ مزار پر جو درود کندہ کرایا گیا ہے اس کے آخری حصے کے الفاظ میں کچھ تبدیلی کردی گئی ہے یعنے اس پر لکھا ہے :۔

"الامام الھمام المنتظر المرتضیٰ محمد بن الحسن صاحب الزمان وقاطع البرہان ومظھر الایمان وسید الانس والجان صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیھم اجمعین"

مرہٹی زبان میں افسانوی لٹریچر

ماڈکھولکر۔ گجانن ترمبک ماڈکھولکر مہاراشٹر کے مشہور و معروف ناول نگار اور افسانہ نویس ہیں، ان کے ناولوں میں مکتا تما، کانتا، نیا سنسار، دوہرا جیون اور ڈاک بنگلہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ ماڈکھولکر کے افسانے ابتداءً میں منورنجن میں شائع ہوتے تھے، پہلا مجموعہ "شکراچے چاندنے" شائع ہوتے ہی ملک میں ان کی افسانہ نگاری کی دھاک بیٹھ گئی۔ دوسرے مجموعے کا نام "رات رانی کے پھول" ہے ان میں کشش، آخری آرزو، پیپل کا درخت، اس کا سفر، قصور کس کا؟ رات رانی کے پھول، صحن رقص اور ڈاکٹر اجیت پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصور کس کا، میں ماڈکھولکر نے یہ دکھایا ہے کہ ہمارا سماج ہم پر کس طرح ظلم وستم کرتا ہے، صحنِ رقص میں ایک طوائف کی درد بھری زندگی کے واقعات ہیں۔ رات رانی کے پھول اور ڈاکٹر اجیت ماڈکھولکر کے شاہکار ہیں، اس میں انھوں نے ڈاکٹر اجیت کے کردار کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے اور عورت کی محبت کی بدحواسیوں کی تصویر نہایت عمدگی سے کھینچی ہے۔ ماڈکھولکر کی زبان کھانڈے کر اور پھڑکے سے کسی قدر زیادہ مشکل ہوتی ہے، تشبیہات اور استعارے کم ہوتے ہیں، ان کا آرٹ ان بلندیوں تک نہیں پہونچتا جہاں کھانڈے کر اور پھڑکے کی نظریں پہنچتی ہیں۔

کوٹھے کر۔ رگوناتھ کوٹھے کر مرہٹی زبان کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ناول بھی عمدہ لکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں انتناز محبت نقش جذبات، اور بادل کے قریب، بہت مشہور ہیں۔ کوٹھے کر کے افسانے بہت دلکش ہوتے ہیں، پلاٹ نہایت دلچسپ ہوتا ہے، عوام کی توجہ کو اپنی جانب خوب مبذول رکھتے ہیں۔

(بسلسلۂ پیوستہ)

ان کے افسانوں کے مجموعہ "نادوینا د" گلاب کی پتیاں" "روشنی میں تاریکی" اور "چاندنی" بہت مشہور ہیں، ان میں سے اکثر افسانوں میں سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا ہے، تاریکی میں بیواؤں کی سسکیوں اور ان کی تڑپ کو دکھلایا ہے۔ "تو دیوانہ یا میں" سماج کے جور وتعدی کی ایک نہایت دردناک تصویر ہے، دیگر افسانوں میں بوسہ، مہارا، اور اگرماتا جی ہوتیں خاص طور سے پڑھنے کے قابل ہیں، طرز بیان نہایت شگفتہ اور دلآویز ہے۔

ماما وریرکر۔ ماما وریرکر مرہٹی کے مشہور ڈراما نگار ہیں، ڈراما نگاری کا جو تخم کھاڈیلکر نے بویا تھا اس کی نشو ونما ماما وریرکر نے ہی کی، اب تک آپ کے انیس ۱۹ ڈرامے، آٹھ ناول اور دو افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ڈراموں میں "کنج بہاری" اور "دل چاہے سو کرے گا" "حکومت کے غلام" اور "سونے کا کلس" بہت مشہور ہیں، دل چاہے سو کرے گا' تاریخی ڈراما ہے اور حکومت کے غلام اور سونے کا کلس سماجک ناٹک ہیں۔

ناولوں میں "ودھوا کماری" "نہ لوچاہوا دیوتا" اور "لہریں اٹھا ہوا ساگر" بہت مشہور ہیں۔ وریرکر کے افسانے نفسیاتی ہوتے ہیں اور وہ افسانوی ادب سے سماج کو درست کرنا چاہتے ہیں، انسان یا خدا اور متفکر فقیر اس کی عمدہ مثالیں ہیں فی الحال آپ پورنیما ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہیں۔

۱۹۳۰ء سے مرہٹی افسانوی ادب میں ایک انقلاب شروع ہوا کئی ماہ نامے مثلاً چترمے جگت، جیوتسنا، منوہر، استری سہیا دری وغیرہ اور ستیہ کتھا وغیرہ جاری ہوئے جن میں عمدہ افسانے اور دیگر زبانوں کے چیدہ چیدہ افسانوں کے

تراجم شائع ہوتے ہیں، سیتہ کنتھا، کہانیوں کا ماہ نامہ ہے۔
اس عرصے میں کئی جدید افسانہ نگاروں نے میدانِ ادب میں قدم رکھا جن میں سہجانند، بھاگوت، ودوانس، ڈھگے، دیدھے الشونت گوپال جوشی، گوکھلے اور بھاوے بہت مشہور ہیں۔

پروفیسر گورے اور کارنک نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے اور مرہٹی افسانہ نگاری کے میدان میں اپنے لئے خاص مقام پیدا کرلیا ہے۔ کارنک کے افسانوں میں زینت کسن کی ہوئی اور جامن پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر گورے کا فتح کا جھولا نہایت دلچسپ افسانہ ہے۔

مزاحیہ نگاری ۔ مرہٹی افسانے کے دوش بدوش مزاحی افسانوں نے بھی کافی ترقی کی، جن میں ممتاز لکھنے والے پروفیسر چنتامن ونائک جوشی، پروفیسر انترے، تامھن کر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

چنتامن ونایک جوشی ۔ پروفیسر جوشی مرہٹی کے مشہور مزاحیہ نگار ہیں، مزاحیہ نقشہ بہت کامیابی سے کھینچتے ہیں، ان کی کتاب چمن راد چے چرہاٹ اور سمشا چین جالیس وانز گوشٹی ان کی مزاحیہ نگاری کے شاہکار ہیں، پلاٹ عظیم بیگ چغتائی کی طرح بہت اچھا ہوتا ہے، عام واقعات کو مزاحی پیرایہ میں اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، ان کے قصوں میں بہرے محترم بزرگ، اس نے شادی کیوں نہیں کی، لڑکا ہو یا لڑکی اور گوپال چپاٹرے مزے دار ہیں، طرز بیان نہایت شگفتہ اور زبان بہت فصیح ہوتی ہے، ان کے افسانے پڑھتے وقت فرحت اللہ بیگ یاد آجاتے ہیں۔

پرلھاد راکُو انترے ۔ پروفیسر انترے کا شمار مرہٹی زبان کے چوٹی کے ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ بہت بڑے ڈراماٹسٹ ہیں مہاراشٹر میں سرسوتی کمار اور گڈکری کے بعد سے اتنا بڑا ڈراماٹسٹ کوئی پیدا نہیں ہوا ان کے ڈرامے اور افسانے سب مزاحی ہیں، ان کا مزاح محض تفریح کی خاطر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسی لطیف طنز کا حامل ہوتا ہے جو ہماری اندرونی خامیوں کو اجاگر کرکے ہم کو اصلاح پر مجبور کردیتا ہے، چنانچہ اردھانگی میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا نہایت عمدگی سے مزاحیہ پیرایہ میں مقابلہ کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ مشرقی تہذیب مغربی تہذیب پر فائق ہے، انترے بہت بڑا نقاد ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر تنقید کرتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں "بھرم کا کدو" "نمسکار" "وندے ماترم" اور "بیاہ کی زنجیر" ان کے شاہکار کہلائے جانے کے مستحق ہیں، نرسہون چنتامن کیڑکرنے جو اِس وقت مرہٹی کے سب سے بڑے ادیب اور نقاد خیال کئے جاتے ہیں: ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ مزاحیہ نگاری کے شاہکار ہیں، انترے کے افسانوں کا ایک مجموعہ برانڈی کی بوتل اور دیگر کہانیاں، کے نام سے شائع ہوا ہے: جن میں برانڈی کی بوتل اور پونے کا ٹانگہ والا بہت عمدہ ہیں۔
انترے آج کل نویگ، ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہیں۔

کینٹن ملئے بھی مرہٹی کے مشہور مزاحیہ نگار ہیں ان کے مزاحی افسانوں کا ایک مجموعہ سکو کا بھائی، بہت مشہور ہے۔ تامھن کرکی، داجی کو مہاراشٹر میں وہی مقبولیت حاصل ہے جو شوکت تھانوی کی سودیشی ریل کو ہوئی، ان کے افسانوں کو پڑھتے ہی بے اختیار ہنسی آنے لگتی ہے۔ پروفیسر وامن ملھار جوشی کی، لوپشپ کرڈک، نہایت عمدہ کتاب ہے، پوشیدہ حملے، اننت انترکر کے مزاحیہ افسانوں کا عمدہ مجموعہ ہے۔ پٹوردھن نے، جیتی رہو جیوا کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ان کے علاوہ مسز دیبائی، کھانول کر اور پروفیسر کرد سے بھی

اپنی مزاحیہ نگاری کی وجہ سے مہاراشٹر میں کافی مقبول ہیں۔

خواتین کا حصہ ۔ گذشتہ پچیس تیس برس سے کئی خواتین نے افسانوی ادب کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے، اور نہایت مسرت کا مقام ہے کہ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے، چنانچہ ان کا ماہ نامہ "استری" ان کے ذوق و شوق کا مرقع ہے ۔ قدیم افسانہ نگاروں میں کاشی بائی کانٹیکر اور گیریج بائی کیٹرکر وغیرہ بہت ممتاز ہیں ۔ کانٹیکر کی کہانیاں "چاندنی" اور "شلو پیاجاگی" کے نام سے مشہور ہیں ۔ ان میں زبان بول چال کی ہے پلاٹ دلچسپ اور منظر نگاری دلکش ہے، ان کی تحریر میں ہری بھاؤ آپٹے آنجہانی کے طرز تحریر کی جھلک ہے ۔

گیریج بائی کیٹرکر نے خواتین کی ترقی میں بہت حصہ لیا اور خواتین کے مطالبات کی پرزور تائید کی ۔ چنانچہ پنشپ ہار نامی کتاب میں آپ نے عورتوں کو ابھارنے کے لئے مختلف مضامین لکھے ۔ ان کی افسانہ نگاری میں انہی باتوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ ان میں سماج کی خرابیاں، خواتین کے مطالبات اور تعلیم نسواں وغیرہ پر زور دیا گیا ہے ۔ ان کے دو مجموعے سماج کی تصویریں اور کیول وشوانتی، ان کے خیالات کا مرقع ہیں، اس کے بعد کے لکھنے والیوں میں کشما بائی، آنندی بائی شرکے، شانتا بائی ناسکر، کملا بائی بمبئی والی اور مس کمودنی پربھا لکر کے نام قابل ذکر ہیں ۔

آنندی بائی شرکے مرہٹی کی مشہور و معروف افسانہ نگار خیال کی جاتی ہیں عورت کے جذبات و احساسات کی تصویر کھینچنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتیں، چنانچہ "تلاطم جذبات"، بیگم دل آرا، قسمت کا کھیل اس کے شاہد ہیں، ان کا ایک مجموعہ "جوہی کی پتیاں" بہت مشہور ہے جس میں "بہت دیر کی" اور "سانپ" بہت عمدہ ہیں ۔

شانتا بائی ناسک کر مہاراشٹر کی ایک دوسری مشہور افسانہ اور ناول لکھنے لگالی ہیں ان کی ناولوں میں میری کوری اولی اور کیچڑ میں کا کنول بہت مشہور ہیں ۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "دلربا" کے نام سے شائع ہوا ہے ۔ افسانوں کی زبان شستہ اور زوردار ہے۔

جدید لکھنے والیوں میں انندی بائی گرلوسکر، مالتی بائی دانڈے کر، سوشیلا شندے اور کماری پیروج آنندکر کے نام قابل ذکر ہیں، آنندی بائی سماج کی دردناک تصویر کھینچنے میں یکتا ہیں ۔ مالتی بائی گھریلو زندگی کے متعلق کہانیاں لکھتی ہیں، سوشیلا شندے رومانی افسانے لکھتی ہیں، ان کی طرز تحریر ہندی کی مشہور افسانہ نگارہ "کماری تیج ہو کو" سے بہت ملتی جلتی ہے، تشبیہات کثرت سے استعمال کرتی ہیں، منظر نگاری حد درجہ دلکش ہوتی ہے ۔ کماری پیروج آنندکر کا ایک مجموعہ "رشتا" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔

مرہٹی افسانہ نگاری کا مستقبل نہایت روشن ہے ۔ افسانوں میں عام طور پر سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جاتا ہے، سرمایہ داروں کو برا بھلا کہا جاتا ہے مزدوروں اور غریبوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے، پرانے رسم و رواج کے قلع قمع کی کوششیں کی جاتی ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اشتراکی اثر غالب ہے اور ان میں سب سے پیش پیش کھانڈے کر ہے وہ جہالت، مفلسی اور سماج کے مظالم کو دور کردینا چاہتا ہے، اس کا خیال ہے کہ دنیا میں حقیقی سپاہی، مزدور ہیں اور آئندہ مزدور ہی حکومت کریں گے ۔ چنانچہ اس کا ایک افسانہ "نئی دنیا" اسی تخیل کی پیداوار ہے ۔ دربرکر سماج کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

اثر سے مزاح بغرضِ اصلاح کے قائل ہیں، گو کھلے دیہاتی افسانے لکھتے ہیں ان کی طرزِ معاشرت، ان کے تہذیب و تمدن کا صحیح عکس پیش کرتے ہیں، ایشورا کی تیا اور چڑیا کا گھونسلا اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ہندستان کی زبانوں میں زیادہ تر بنگالی اور گجراتی اثر غالب معلوم ہوتا ہے شارت چندر چٹوپادھیا اور ٹیگور کا مرہٹی افسانہ نگاری پر گہرا اثر دکھائی دیتا ہے گجراتی کے مشہور و معروف افسانہ نگار دھرم کیتو اور کنہیالال سے بھی یہ بہت حد تک متاثر ہے، ہندی کے افسانہ نگاروں میں صرف منشی پریم چند کا کچھ اثر معلوم ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک اردو افسانوں سے مرہٹی اب تک بالکل ناآشنا ہے۔ بہرحال مرہٹی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ہری نارائن آپٹے آنجہانی اور پھڑکے جیسے ناول نگار اور کھانڈے کر جیسا افسانہ نویس ملا جن کو ہندستان کی کسی زبان کے بڑے ناول نگار اور افسانہ نویس کے بالمقابل کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

امجد علی خان یوسف زئی

"۔۔۔۔۔۔ کے نام"

میں تیرے واسطے دیوانہ وار آیا تھا
متاعِ عشق و جوانی نثار کرنے کو!
ہر ایک ذرّے کو مستِ شباب کرنے کو
بہار و کیف کے دریا میں غرق ہونے کو

ترے حضور بہت بے قرار آیا تھا
کمالِ ذوقِ نظر، استوار کرنے کو
کلی کلی کو تبسم مآب کرنے کو
شباب و شعر کی سرمستیوں میں کھونے کو

میں بدنصیب ہوں شاید کہ تجھ کو پا نہ سکا
نثار ہو نہ سکا، تیرے حسنِ رنگیں پر
اٹھا سکا نہ سجودِ نیاز کے الطاف
جو آرزوئیں مرے دل میں تھیں دبی ہی رہیں

میں اپنے درد کی بے تابیاں دکھا نہ سکا
عطا ہوا نہ ترا زانوئے سکوں پرور
ترے تبسمِ رنگینِ ناز کے الطاف
نگاہِ شوق و تجسس کی سوزشیں نہ گئیں

یہ التجا ہے مری جانِ آرزو تجھ سے
خدا کے واسطے یوں مجھ کو بے قرار نہ کر
مری حیات کو یوں مرکزِ الم نہ بنا
میں بے قرار ہوں تجھ پر نثار ہونے کو

کہ پست ہوں نہ کہیں حوصلے مرے دل کے
مری نگاہ کو یوں وقفِ انتظار نہ کر
قسم ہے تجھ کو ترے حسن کی کہ یوں نہ ستا

تحسین سروری

حیدرآباد کے نوخیز شاعر

آپ غالباً بھولے نہ ہوں گے کہ آج سے بچیس تیس سال قبل حیدرآباد میں شعر و سخن کی وہی فضا تھی جو عام طور پر ہندستان کے دوسرے حصوں میں پائی جاتی تھی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اس وقت شاعری چند مخصوص اور مرتب اصولوں کو سامنے رکھکر گنے چنے الفاظ کو قافیہ دے دینے کا نام تھا۔ شاعری کے دو اسکول سارے ہندستان پر چھائے ہوئے تھے۔ ایک وہ جس کا سلسلہ شیخ امام بخش ناسخ سے ملتا تھا۔ اور دوسرا آتش اور شیخ ابراہیم ذوق کے واسطہ سے مصحفی پر ختم ہوتا تھا۔ ہر شاعر کے لئے ضرورت تھی کہ وہ ان اسکولوں میں سے کسی اسکول کا متبع ہو اور جو اساتذۂ فن اس عہد میں موجود تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ نسبتِ شاگردی پیدا کرے۔

شاعر کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے مکتبِ شاعری اور اپنے استاد کی پیروی میں گم ہو کر رہ جائے۔ اپنے نام کے ساتھ متبع میر و غالب، یادگارِ ذوق و نصیر کی قسم کے جملے لکھنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ شاعروں میں جب کسی نئے شاعر کے تعارف کی ضرورت ہوتی تو یہ کہہ دینا کافی خیال کیا جاتا تھا کہ "آپ مولنا حالی کے شاگرد ہیں" یا "آپ نے جناب اشک کا فیض صحبت حاصل کیا ہے۔" مقصد یہ ہے کہ کسی بڑے اور مشہور استاد کا شاگرد ہونا شاعر کے کمالِ فن کی ضمانت ہوتا تھا۔ استادوں کا یہ حال تھا کہ خداوند نعمت کی طرح مسندِ علم و کمال پر جلوہ افروز ہوتے۔ اور شاگرد خدامِ ادب کی نمائش کے ساتھ دست بستہ ان کے سامنے بیٹھتے۔ غزلیں ادب سے پیش کی جاتیں اور جو ایک آدھ لفظ یا اکا دکا مصرع بنا دیا جاتا اس پر عمر بھر ناز کرتے۔ اور آنکھوں سے لگاتے تھے۔ کسی کو یہ مجال نہ تھی کہ وہ استاد کے بنائے ہوئے یا بنائے ہوئے الفاظ پر اشارتاً بھی کسی اختلاف کی جرأت کرے۔ غرض یہ عالم تھا اور شاعری کا وہ مقدس فن جس نے حیاتِ انسانی پر اپنے عمیق اثرات ہر زمانے میں چھوڑے ہیں اک رازِ سینہ بہ سینہ بن کر رہ گیا تھا یا پھر مذاق عام کے اتباع میں شاعرانہ لطافتیں اور فطرتِ انسانی کے گہرے راز بولی ٹھولی اور عامیانہ زبان و محاورات میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے تھے کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ زندگی کے وہ حقائق بھی جنھیں کبھی عرفانیات اور سریات کا مرتبہ حاصل تھا۔ عہد حاضر کی علمی اور عقلی کاوشوں نے بے نقاب کر کے رکھ دئیے ہیں اور شاعر لپند عام کی سطح سے بہت بلند ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو تھکی تھکائی زندگی کی مرجھائی اور سمٹی ہوئی نبضوں میں چمکیلے، تازہ اور سریع السیر خون کی لہریں دوڑا سکتا ہے، جو بیداری کے اس خواب میں ان حقائق کو چلتی پھرتی صورتیں دے کر پیش کرتا ہے جن کے سامنے علم اور حکمت کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور جن سے ہماری روحوں میں زندگی کے احساس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

اِس بے کسی کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اربابِ علم و عقل نے شاعری کی جانب سے آنکھیں بند کر لیں اور شاعر سوسائٹی کا ایک غیر ضروری بلکہ مضر عنصر سمجھا جانے لگا۔ اب بھی کبھی کبھی شاعری اور شاعر کے خلاف ایک آدھ آواز بلند ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اِس بدگمانی کا مآل ہے جس کی بنیاد خود اہلِ شعر نے رکھی تھی۔ بہر حال حیدرآباد بھی اس وبائے عام سے اپنا دامن نہ بچا سکا اور باوجود اِس کے کہ یہاں علم و ادب کی ایک خاص فضاء ہمیشہ مرتب رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط

نہ ہوگا کہ بعض مشہور شعرا اور اہل کمال کی ذہنی تربیت یہیں ہوئی۔ یہیں ان کی فطرت کے پنہاں جوہر چمکے اور یہیں ان کے ذوق کو وہ مقام حاصل ہوا جو آگے چل کر ان کی ادبی زندگی اور کامیابی کا راز بن گیا۔ بایں ہم شاعری کا مقام تبدیل نہ ہوسکا۔ کیونکر ہوتا یہ فخر تو قدرت نے پنجاب کے لئے رکھا تھا۔ دہلی اور لکھنو کے وہ اسکول بھی جنھیں اپنی زبان وادب پر بڑا ناز سے لفظ پرستی کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر منہ دیکھتے رہ گئے۔ اور خاک پنجاب نے صدیوں کی گردش کے بعد ایک ایسے صاحب کمال کی تخلیق کر ہی لی جس نے ایک ہلکی سی جنبش میں شعر وادب کی اس بساط کو جو بڑے اہتمام اور احتیاط سے بچھائی گئی تھی الٹ کر رکھ دیا۔ اور جس کے نفس کی آگ نے اس ویرانہ میں نئی زندگی کے آثار پیدا کردئے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس سے میری مراد ڈاکٹر اقبال مرحوم ومغفور ہیں جنھوں نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ شاعری بازیچۂ اطفال اور بولی ٹھولی کا نام نہیں ہے یہ مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ جزو پیغمبری ہے۔ انھوں نے شاعری کو تفریح کے لئے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے لئے من حیث الفن اختیار کیا۔ اور مستقبل بتائے گا کہ عہد حاضر کی قومی تعمیر میں ان کی فکر وعمل کا کس قدر حصہ تھا۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ حالی اور آزاد کی کوششوں نے شاعری کی راہوں کے پیچ وخم کو بڑی حد تک درست کیا۔ اور اقبال سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ نادر کاکوروی، پنڈت چکبست وغیرہ ایسے شاعر ہندستان کی بساط ادب پر نظر آنے لگے تھے جن کی نظر حقائق کی جستجو میں مصروف تھی۔ لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی فکر اتنی بلند، جس کی نظر اتنی وسیع ہو کہ وہ مشرق کی ادبی لطافتوں اور مغرب کی فطرت پرستیوں کو ایک نقطہ پر سمیٹ کر شاعری کا ایک پیکر تیار کرلے۔ جس میں پھولوں کی شگفتگی بھی ہو اور آگ کی تیزی بھی۔ جس میں موجوں کی سبک سیری بھی ہو اور طوفان کا جلال بھی۔ یہ کام اقبال ہی کا تھا۔ اور انھوں نے اپنے اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا کہ جب تک کوئی جدید تہذیب دنیا کے موجودہ حقائق و آثار کو مٹا نہ دے نہ اقبال مٹ سکتے ہیں نہ ان کی آواز کی گونج دب سکتی ہے۔

پنجاب نے ان کی سرپرستی کی۔ انھیں اپنی آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے کاندھوں پر چڑھا کر نعرے لگائے کہ دیکھو صاحب کمال ایسے ہوتے ہیں اور یوں ان کے جوہروں کو چمکایا جاتا ہے۔ کاش ہندستان کا ہر حصہ اپنے اہل فن کو پہچاننے میں پنجاب کی نظر پیدا کرے۔

غرض اقبال کی آواز زبان وادب کے اجارہ داروں کی نکتہ چینی کے باوجود بڑھتی گئی وہ پہلے کالج کی دیواروں سے ٹکرائی اور پھر سارے ہندستان کی بسیط فضا پر چھاگئی اور اب وہ زمانہ آگیا کہ شاعری کی صحیح حدود متعین کی جاسکیں اور شاعر کا امتیاز یہ نہ ہو کہ وہ کیا کہتا ہے بلکہ یہ ہو کہ اس کے بیان کی شاعرانہ لطافتیں دلوں کی گہرائیوں میں کن تاثرات اور ارادات کو پیدا اور بیدار کرتی ہیں۔

حیدرآباد میں بھی بہ سلسلہ برکات عہد عثمانی یونیورسٹی کی بنیاد پڑچکی تھی اور نوجوانوں کی نئی جماعتیں دل و دماغ کی تازگی اور فکر ونظر کی گہرائی کے ساتھ بیدار ہوتی چلی جارہی تھیں۔ ان کے سینوں میں تازہ امنگیں تھیں اور نئے نئے دلولوں کا ایک طوفان امڈ رہا تھا اور ان کے بلند ذوق کی وسعتوں کو کسی وسیع تر میدان عمل کی جستجو تھی۔ اس لئے

انھوں نے یہاں اور علوم و فنون میں کمالات حاصل کئے وہاں ادب و شعر میں ایک جدید اسکول کی بنیاد رکھ دی اور اپنے شیریں نغموں سے سارے ہندستان کو مسحور کر کے چھوڑا۔
اِن جدید شعرا میں وہ بھی ہیں جنھوں نے قومی تعمیر کو جدید نقطۂ نظر کے لحاظ سے اپنا نصب العین قرار دیا ہے اور وہ بھی جو حیاتِ انسانی کی نفسیاتی تنقید اور استعار کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ غزل سرا بھی ہیں جن کی لطافتِ نغمہ روحوں کو تازگی اور بیداری عطا کرتی ہے اور نظم گو بھی جن کی عمیق نظر فطرت کے چہرے کی رعنائیوں کو دیکھ سکتی ہے۔

مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد نے بہت تھوڑی مدت میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جو برسوں کی کاوشوں کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور باوجود ان قدر ناشناسیوں کے جو اُن کے راستے میں حائل ہیں یہاں کے شاعر اپنا فرض ادا کرنے میں ہندستان کے کسی حصے سے پیچھے نہیں ہیں۔ جدید شعرا جن مشکلوں میں گھرے ہوئے ہیں ان میں یہ دو بہت صبر آزما ہیں ایک تو اُن کا کوئی مقام ابھی تک تسلیم نہیں کیا جاتا وہ پرانے سلسلے کی مختلف کڑیاں سمجھ لئے گئے ہیں اور اس لئے اس سرپرستی سے محروم ہیں جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔
دوسرے قدیم اسکولوں کے وہ شاعر جو اگرچہ خود کوئی شاعرانہ بصیرت نہیں رکھتے، شعر کہتے ہیں لیکن تفریح کے لئے ان کے سامنے شاعری کا کوئی مقصد نہیں ہوتا اور نہ انھیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے ادب و شعر کا مطالعہ کریں اور یہ سمجھیں کہ سوسائٹی کا طبعی رجحان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ادب و شعر میں بھی تغیر لازم ہے۔ اس لئے وہ ان شعراء کو شاعر سمجھنا بھی مشکل سے گوارا کرتے ہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آج سے سو برس قبل کے انداز میں فکر کی جائے۔ وہی الفاظ ہوں اور وہی سوچنے کا طریقہ۔
اور عام بول چال کے چند محاورات نظم کر لئے جائیں۔
ان کے نزدیک کوئی شعر مستند نہیں اگر کسی قدیم استاد کی سند اس کے لئے موجود نہ ہو۔ اور کوئی شاعر شاعر نہیں اگر مقررہ زبان و بیان سے تجاوز کرے۔ ان حالات میں عہد جدید کا وہ شاعر جو ان "رسوم و قیود" کو توڑنے کا عزم لے کر اٹھا ہے اور جس نے ایک غیر فانی نظم کی بنیاد رکھی ہے اور جسے اپنی بصیرت اور اپنے ذوق کی سلامتی پر اعتماد ہے کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔
بہر حال وقت آرہا ہے کہ یہ حجاب ٹوٹ جائیں گے اور ہندستان کے دوسرے اقطاع کی طرح یہاں بھی عہد جدید کے شاعرانہ اور حکیمانہ کمال کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑے گا۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ ہمارے جدید شعرا اسے خوب جانتے ہیں کہ کام کا صلہ خود کام ہے اور انھیں اس کا خیال بھی نہ ہوگا کہ زمانہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آرہا ہے۔
غرض حیدرآباد کی شاعری کا عہد جدید اپنے اندر علم و ادب کی ان تمام رعنائیوں کو لئے ہوئے ہے، جن پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ اور میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ اب وہ زمانہ قریب تر ہوتا جا رہا ہے جب حیدرآباد کے افق سے کوئی ایسا آفتاب طلوع ہوگا جس کے سامنے ہندستانی ادب کے موجودہ ستارے ماند ہو کر رہ جائیں گے۔
اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے اگر آپ حیدرآبادی نوجوان کا

قریب سے مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس کی بنضوں میں ترقی اور تعمیر کی بجلیاں رقص کر رہی ہیں۔ میں نے اس قدر عمیق ذوقِ علمی ایسی ان تھک محنت اور اس قدر غور و فکر کسی خطہ کے نوجوان میں نہیں دیکھی جو یہاں نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی فطرت کی سادگی اس کا حسن ظن اور بے اندازہ رواداریاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

میرے نزدیک بدرؔ، وفا فانیؔ، باقیؔ، مخدومؔ، سازؔ، میکشؔ وجدؔ، نظرؔ، خسروؔ، کاوشؔ اور ظفرؔ ایسے شاعر ہیں جن کی منزل متعین ہوچکی ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ ادبی برادری زمان و مکان کی ساری قیدوں سے آزاد ہے تو آج بھی حیدرآباد کیا سارے ہندستان کے لئے یہ نوجوان شعراء مایۂ ناز ہیں۔ اور ان کے مستقبل کا تو کیا پوچھنا۔

علی اختر

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

قطعات

(۱)

ارادہ تیرا میری زندگی ہے
مرا مجبور رہونا ——— بندگی ہے
غلامی اور مجبوری کا جینا
ظفرؔ اپنی بھی کوئی زندگی ہے

(۲)

فلک والوں کی کوئی زندگی ہے
فرشتوں کی بھی کوئی بندگی ہے
مری ہر سرکشی گویا اطاعت
عبادت کیا فقط شرمندگی ہے

(۳)

یہ اک احساس ہے شرمندگی ہے
مرا احساسِ پستی ——— بندگی ہے
مری ہستی ہے شرحِ کبریائی
مجھ ہی سے خیر و شر ہیں زندگی ہے

(۴)

یہ کوئی زندگی ہے بے کسی کی
یہ کوئی بندگی ہے بے بسی کی
ترا عکسِ صحیح اور اتنا مجبور
بنا کر مجھ کو خود اپنی ہنسی کی

منظفر الدین ظفرؔ

ایک خط کا جواب

تو تم نے خط یہ منصوری کے کہساروں سے بھیجا ہے
اتر کر طرب افروز نظاروں سے بھیجا ہے
بہت ہی کیف ساماں ہیں
پہاڑوں کے وہ نظّارے
ہر اک جانب خراماں ہیں
وہاں رقصندہ مہ پارے
ہواؤں ہی میں رقصاں ہیں
وہاں کیوپڈ کے گہوارے ——— ؟؟؟ (CUPID)
"ڈیر منظر!" میں اس حسنِ نظر کی داد دیتا ہوں (DEAR)
تمہاری خوش نصیبی پر مبارک باد دیتا ہوں
بہاروں میں چمن کی طرح　　سب انسان پلتے ہیں
حسینوں کے بدن کی طرح　　واں سکے بھی ڈھلتے ہیں
پہاڑوں میں دلہن کی طرح　　موٹر کار چلتے ہیں
تو تم یہ دیکھ کر کس درجہ شاداں ہو رہے ہوگے
مسوری میں خود اپنے پر بھی نازاں ہو رہے ہوگے!
یہاں میں لکھنؤ میں گھر سے کچھ اکتا کے آیا ہوں
تمہارے خط کو پڑھ کر زندگی پر تلملایا ہوں
اسی دم جب کہ تم کھوئے ہو کیف افزا نظاروں میں
مسوری کی بہاروں، آبشاروں، جوئے باروں میں
میں تم کو لکھ رہا ہوں اور پسینے آئے جاتے ہیں
فسردہ اور خشک احساس دل میں پائے جاتے ہیں
مگر نیچے سڑک کو دیکھ کر　　لکھتا ہی جاتا ہوں
اٹھاتا ہوں یونہی اپنی نظر　　اور گنگناتا ہوں

یہ جو انسان ہی کے روپ میں سڑکوں پہ پھرتے ہیں
جہنم سے بھی بڑھ کر دھوپ میں سڑکوں پہ پھرتے ہیں
اگر احساس والے ہیں
اگر دنیا کے پالے ہیں
تو ننگ حوصلہ ہے بے کس و مجبور ہو جانا
تو جرم زندگی ہے آپ ہی مسرور ہو جانا ——— !!!
نہ جانے آج کیا کیا خط میں تم کو لکھ رہا ہوں میں
تمہاری غیر دلچسپی کا ساماں ہو گیا ہوں میں
مگر تم کو ہماروں میں
ہوا کھاتے رہو اب بھی
مسوری کی بہاروں میں
یونہی گاتے رہو اب بھی
حسینوں، ماہ پاروں میں
سکوں پاتے رہو اب بھی
کبھی فرصت جو مل جائے، کبھی جب "موڈ" میں آنا (MOOD)
ذرا تم خاص منصوری سے تھوڑی دور بھی جانا
مسوری سے کہیں ٹھنڈے مگر اجڑے دیہاتوں میں
کسانوں اور مزدوروں کی سونی کائناتوں میں
وہاں وادی بھی ہوگی اور کیف افزا نظارے بھی
وہاں کلیاں بھی ہوں گی اور رنگیں چاند تارے بھی
غریبوں کی زمینوں میں بھی یہ حسن آفریں ہوں گے
انھیں وہ دیکھتے ہوں گے ولیکن خوش نہیں ہوں گے ——— !!!
زمانے کے نظامِ کہنہ کو برباد ہونے دو ! ——— !
سنورنے دو جہاں کو زندگی کو شاد ہونے دو !
تو پھر خوشیاں منائیں گے
مسرت کی بہاروں میں

تو پھر ہم گیت گائیں گے
طرب افزا نظاروں میں
تو پھر ہم جھوم جائیں گے
حسینوں، ماہ پاروں میں
تو پھر ہم سکھ بھی پائیں گے
پہاڑوں، کوہساروں میں ——— !!!
تو تم نے خط یہ منصوری کے کہساروں سے بھیجا ہے !!

سلام مچھلی شہری

دیری کا سبب

کلرک نے دبے پاؤں کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ افسر اس پر ٹوٹ پڑا "آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ آپ ایک ہفتہ سے برابر دیر سے آرہے ہیں۔ کبھی آدھ گھنٹہ کبھی گھنٹہ۔ میں ان حرکات کو برداشت نہیں کرسکتا۔ نوکری کرنی ہے تو وقت پر آنا ہوگا ورنہ استعفیٰ دے کر گھر چلے جائیے۔"

کلرک نے مودبانہ عرض کیا۔ "سرکار! کئی دنوں سے میری بیوی بیمار ہے، گھر پر میرے سوا اور کوئی نہیں۔ دوا وغیرہ کے انتظام میں دیر ہو جاتی ہے۔ ——— اور آج تو اس کی حالت بہت زیادہ خراب ہے۔ میں آپ سے ادباً درخواست کرتا ہوں کہ آج ایک یوم کی رخصت عطا فرمائیے۔

"کیا؟ رخصت! رخصت!! نوکری نہ ہوئی مذاق ہوا۔ ہر دوسرے دن آپ کو رخصت چاہئیے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بہانہ موجود۔ کبھی خود بیمار ہیں کبھی بیوی بیمار........"

اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا "نہیں سرکار۔ بہانہ نہیں وہ حقیقتاً بیمار ہے۔

"غلط۔ بالکل غلط۔ سراسر جھوٹ۔ میں ایک نہیں سن سکتا۔ آپ کو رخصت نہیں ملے گی۔

اس نے ایک دفعہ افسر کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر آکر اپنے متعلقہ کام میں مشغول ہوگیا۔

دوسرے دن کامل تین گھنٹے دیر سے وہ دفتر پہونچا۔ افسر اسے دیکھتے ہی آگ بگولہ ہوگیا۔

اس نے معذرت کے لہجہ میں عرض کیا "سرکار۔ کل گھر پہونچنے پر بیمار بیوی کی جگہ اس کی لاش ملی۔ ابھی ابھی قبرستان سے لوٹا ہوں۔ معاف فرمائیے۔ اب آئندہ دیر نہ ہوگی" اور کمرے سے باہر آکر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

(نوٹ۔ یہ سطریں شائع تو ہو رہی ہیں لیکن ان کا لکھنے والا اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی روح شاید اس سے مسرور ہو۔ ادارہ)

کرشنا نارائن واگھرے ضمیر

"تیج" کی حویلی میں ہولی

دلّی کا اخبار "تیج" اپنی جدت طرازیوں اور نت نئی اعجوبہ زا اداؤں میں ایک خاص شہرت حاصل کر چکا ہے۔ خلاف واقعہ مضحکہ خیز ریویو اس کے یہاں کے تیج تہوار سمجھے جاتے ہیں۔ مفروضات کی ہولی کھیلنے میں یہ اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ عصبیت اور حرف گیری کی تاریک عینک کبھی اس کی آنکھوں سے الگ نہیں ہوتی جس سے تابناکیاں بھی ڈراؤنی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ابھی حال میں صحافت کی شاہراہ پر ہولی سے پہلے ڈنکے کی چوٹ اس نے نقد و تبصرہ کی ہولی مناکر دور از کار باتوں کا جو' ابیر گلال اڑایا اور اپنے رنگ تحقیق کی جس نرالے ڈھنگ سے پچکاریاں چھوڑیں یہ پورا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

حیرت خیز بات یہ ہے کہ نئی ہندی کے متوالوں کے منہ سے شکشا' رکچھا' سمبندھ' کلپور' سمپنی' کلاہل' پرارتھنا' تتھا' ٹھودے جیسے ان گھڑ اور نامانوس لفظوں کی پوری کتھا سن کر تو تیج کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور رگِ احساس کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ لیکن وہ طرزِ تحریر جو ہندی نوازوں کو بہلانے' منانے اور سمجھانے کے لئے بہ مجبوری اختیار کیا گیا تھا' اور جو ہندی کے کٹھن اشلوکوں کے مقابلے میں کہیں اچھا تھا' مدت دراز کے بعد اس نہج تحریر کو دیکھ کر اردو کی ماننا کے جوش نے ایسا آپے سے باہر کر دیا کہ تیج بے پٹے ہنکارنے لگا۔ پھر تعجب بالائے تعجب اس امر پر کہ جس روش تحریر سے برافروختہ ہو کر غیظ و غضب کا سیلاب امنڈ آیا یہ آج کی بات نہیں اسے کئی سال ہو چکے۔ بڑی مدت تک چپ سادھے رہنا اور کافی عرصہ گزر جانے پر ایکا ایکی باسی کڑھی میں اُبال آجانا ایک نیا ٹوٹکا اور انوکھا شعبدہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں اس آڑ میں کوئی اور پیکر فضائل ضمیر مستتر کی طرح پوشیدہ ہو۔ خیر' کسے باشد۔ چونکہ:-

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اس لئے اصل واقعے کی تفصیل سے پہلے اظہار واقعہ کے طور پر چند ضروری باتوں کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ صحیح واقعے کے خط و خال ارباب نظر کے پیش نظر ہو سکیں۔ کئی سال ادھر جب ہندی نوازی کی لے رہ رہ کے آگے بڑھنے لگی اور یہ دھن اردو میں عربی' فارسی کے شیر و شکر الفاظ کی جگہ سنسکرت کے بوجھل اور نامانوس لفظوں کی لگاتار بھرمار کرنے پر تل گئی تو اس ناروا جھگڑے کو دبانے اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کا خیال پیدا ہوا۔ مذاق عام کے لحاظ سے اس کی رسمی' سطحی اور معمولی ہی دو صورتیں ہو سکتی تھیں کہ یا بحث زبان کی تو تو میں میں سن کے کان میں تیل ڈال کر بیٹھ جانا اور یا متعارف طرزِ تحریر میں اس کی تردید کر کے دل کی بھڑاس نکالی جاتی۔ پہلی صورت تو تقریباً ناممکن سی تھی اس لئے کہ بے حس بھی اپنی مادری زبان کی تخریب کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ زبان کا مسئلہ نہایت پیچیدہ اور اہم معاملہ ہے۔

جسٹس محمود مرحوم کا یہ واقعہ غالباً ارباب ہوش کے گوش زد ہوا ہوگا کہ صوبہ یو' پی کے سابق گورنر سر انتھونی میکڈانلڈ نے جب ہندی نوازی پر کمر باندھی تو اسے عروج و ترقی دینے کے لئے یہ جا بجا کمیٹیوں پہ کمیٹیاں کر کے رائے عامہ کی جانچ پرتال کرتے پھرے۔ اسی سلسلے میں علی گڑھ بھی پہنچے اور مغفور سرسیّد کے یہاں خاص مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے۔

یہیں ایک کمیٹی معین کی گئی اور عین وقت پر اُن کے اصرار سے جسٹس محمود کو بھی بحیثیت نسخر بیب اردو کی کمیٹی میں شریک ہونا پڑا۔ گو زبرہادر نے بھرے جلسے میں نہایت بے باکی سے اردو کی بے بضاعتی و بے مایگی پر زہر اگلا اور ہندی کی بلندی و برتری پر اپنا زور تقریر ختم کر کے دم لیا۔

یہ سنتے ہی جسٹس محمود مرحوم خشمگیں انداز سے اٹھے اور تیز و تند لہجے میں کہنے لگے:۔ سرانتھونی! چونکہ تم میرے والد کے مہمان ہو اس بناء پر اخلاقاً مجبور ہوں۔ ورنہ ابھی معلوم ہو جاتا کہ رُو در رُو کسی کی مادری زبان کی تحقیر و توہین کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ بپھرے ہوئے شیر کو دیکھ کر ہاں ہاں کر کے سر سید بیچ میں نہ آجاتے تو نہیں معلوم بحثِ لسان میں جنبش زبان اور کیا گل کھلاتی۔

رہی دوسری صورت تو وہ نہایت مایوس کن تھی اور اس میں تضیع اوقات کے سوا اور کوئی فائدہ ہی نہ تھا اس لئے کہ عربی، فارسی الفاظ سے لاگ اور نفرت کی وجہ سے متعارف روشِ تحریر دیکھنے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی بناء پر کافی غور خوص کی زحمت برداشت کی گئی اور مسلسل صعوبت جستجو کے بعد اس وقت ایک نئی کارگر تدبیر یہی نظر آئی کہ نئی ہندی کے جوشیلے پجاریوں سے جو کچھ کہنا ہے عربی، فارسی کو چھوڑ کر دہ اس ڈھب سے کہا جائے جسے یہ لوگ کم سے کم سن تو لیں۔

کسی بڑھتے ہوئے ہنگامے میں ٹھیر یئے تو سنئے تو دیکھئے تو سے کام نہیں چلتا۔ ایسے محل پر تھوڑی دیر کے لئے ہاں میں ہاں ملانا ہی چلتا ہوا جادو سمجھا جاتا ہے۔ یہی سوچ کر الہ آباد اکیڈیمی کے صدر ڈاکٹر تارا چند صاحب، گاندھی صاحب پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو چھوٹی بڑی سب چھپے چھپیاں

اس طرز سے لکھیں جن کا دامن تحریر عربی، فارسی لفظوں کے شگفتہ پھولوں سے بالکل خالی رہا۔ جس طرح متاعِ عرب و عجم سے یہ روش تہی دست رہی اسی طرح برج بھاشا کی نئی نئی سوغات سے بھی۔ پھر، اسی آڑ میں اردو کے شیر و شکر عربی، فارسی الفاظ کی حقیقی منزلت اور صحیح اہمیت، گھلے ملے اور ملے جلے لفظوں کی کاٹ چھانٹ کے نقائص، زبان کی ساخت اور اس کا تدریجی نشو و نما دیہات اور شہروں کی زبان، بول چال اور بات چیت میں فرق شیر و شکر الفاظ کی اصلی قدر و قیمت اور سچی جانچ پرتال کا صحیح معیار، نئے نئے الفاظ بنانے کے مقامات، زبان کے خالص بنانے کے معنے اور ترقی پذیر زبان کے خالص نہ ہوسکنے کی اہم اور دلچسپ بحث، مذہب اور زبان کی جداگانہ سرحدیں، ان دونوں کے ڈانڈے ملانے اور انھیں گڈ مڈ کرنے کے نقصانات، بوجھل، ثقیل، فصیح اور شستہ الفاظ میں باہمی حد امتیاز، نیز تاریخی، مذہبی، سیاسی اور ادبی بحثیں چھیڑ کر نہایت محدود اور تنگ دائرے میں جتنی گنجائش نکل سکتی تھی ان اہم بحثوں کے لئے جگہ نکالی گئی اور ابتدا سے لے کر آخر تک استدلال کی استواری و استحکام "اردوئے معلّٰی" کی حمایت کا پورا فرض ادا کرتا ہوا چلا گیا۔

گویا:۔ شمع ہمانست لگن دیگر است۔ لگن ضرور بدلی لیکن شمع ذوق افروز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، مذاق بزم سے شیشہ و ساغر بدل دینا پڑے مگر پُر کیف آتشِ سیال وہی رہی، بھیس بدلا ہو اسہی لیکن اندازِ قامت نہ بدلا، گلہائے تحریر کا رنگ پھیکا تو پڑا مگر ان کی نکہت انگیزیاں بدستور ہیں۔ محفل کے بے مغزوں کو رجھانے کے لئے "چوبولے" گانا پڑے لیکن سُر اور لے تال کا معیار وہی برقرار رہا۔ اس پر بھی اگر کچھ نہ دکھائی دے:۔

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

زیر تذکرہ نہج تحریر میں عربی، فارسی کے ثقیل و شکر لفظوں
کو اردو میں سے نکالنے اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھولے بسرے
بولوں کی ٹھونس ٹھانس پر جا بجا اظہار افسوس و نفرت سے کیا یہ
نہیں ظاہر ہوتا کہ یہ طرز ملک کی تقلید کے لئے نہیں بلکہ بے وجہ روٹھے
ہوؤں کو منانے اور ان کا دھیان بٹانے کے لئے مجبوراً اختیار
کرنا پڑا۔

اس طرز کو پورے ملک کے لئے صلائے عام اور معیار
تقلید سمجھ لینا نہایت فاحش غلطی ہے۔ حقیقت اس کے سوا اور
کچھ نہیں کہ میرا خطاب نہ مسلمانوں سے تھا اور نہ ان مسالمت
پسند ہندوؤں سے جو اس ہنگامہ آرائی پر بھی اپنے اسلاف
کی طرح بدستور "اردوئے معلیٰ" کو عینک کے مثل آنکھوں سے
لگائے ہوئے ہیں۔ اُردو کے مربی و سر پرست ہندو مسلمانوں کو
الگ کر دینے کے بعد اب صرف وہی "شبد ساگر" میں ڈبکی
لگانے والا جتھا رہ گیا جسے نئی ہندی کا متوالا کہا جاتا ہے۔

بس اسی کی طرف میرا روئے سخن تھا اور صرف اسی سے میری بات
چیت تھی۔ میں نے جو کچھ کہا وہ اسی مجمع کے تیور دیکھ کر اور جتنا
لکھا وہ اسی جماعت کی ذہنیت پہچان کر۔

ہندی نوازوں کو نیا رنگ دکھانے سے مقصد یہی تھا کہ
کسی طرح سنسکرت کی کھلی ہوئی نئی نئی ڈکشنریاں بند ہوں اور
بنتے نئے نامانوس الفاظ کا جوش جستجو رک رکا کے رہ جائے۔ ذوق
تجسس کا ٹھیراؤ دھیان بٹنے ہی سے ہو سکتا تھا اور دھیان
بٹتے ہی بازی جیت لینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ کیونکہ اس نہج
تحریر میں معمولی بات چیت سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔
اس لئے کسی علم و فن کے چھڑ جانے پر بھلا یہ کیا ساتھ دے سکتی۔
ایسی صورت میں عربی، فارسی لفظوں کا استعمال خود بخود لازمی
قرار پاتا۔ اس روش کے اختیار کرنے میں یہی سب باتیں پیش نظر
تھیں جن پر پانچ چھ برس کے بعد آج ناواقفیت آوازے کسنے
اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کے تردید کرنے کے لئے اٹھی ہے۔

جن چٹھیوں کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ان میں سے
پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کی موسومہ چٹھی کے سوا اور سب
چٹھیاں یکے بعد دیگرے دلّی، لاہور کے مختلف ماہ ناموں میں
شائع ہوئیں۔ اِن سب کے چھپ چکنے پر بھی جب فضا بدستور
گرد آلود رہی تو اِس طرز کو بے سود سمجھ کے خاموشی اختیار کی گئی
گر ذہن اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ اب کونسی ایسی کارگر تدبیر
کی جائے جن سے یہ ہاہی کا ادھم تھمے اور تیرہ خیالی کا جھگڑا
رکے۔ اسی فکر میں تھا کہ اسی کار بے سود کی بلا سے پھر مدبھیڑ ہوئی۔

یہاں کے ایک بزرگ منش خلیق و متواضع مولوی
سید خورشید علی صاحب نے شائع شدہ خطوط کو کتابی صورت
میں لانے کی اس شرط کے ساتھ فرمائش کی کہ طبع شدہ
خطوط کے لئے اسی رنگ میں ایک ابتدا مقدمہ لکھا جائے جس
میں چٹھیوں کی ادھوری بحثیں پوری ہو سکیں۔ چونکہ دل بجھ
چکا تھا اس لئے اس فرمائش کو بہت ٹالنا چاہا مگر نہ ٹل
سکی اور موصوف ہی کی شعاع التفات کے اجالے میں "سوجھ
بوجھ کے ڈھائی انچھر" کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ لکھنا
ہی پڑا جو تقریباً سال بھر تک دلی کے ماہ نامہ "ساقی" میں
بہ اقساط شائع ہوتا رہا۔ اسی مقدمے کے آخر میں "ٹھیٹ اردو"
کی نسبت جو اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آنے والی باتوں کے لئے
قبل از قبل درج ذیل عبارت لائق ملاحظہ ہے:۔

میری بھول

اس ڈھب سے لکھنے لکھانے
میں مجھ سے بھی یونہی سی ایک
اک چوک ہو گئی۔ یہاں تک کی لکھت میں نہیں۔ پھر کہاں؟
اسی ڈھیر کی چٹھیوں میں جو کئی برس ادھر دلّی کے

"ساقی" اور "جامعہ" لاہور کے "شاہکار" "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں چھپ چھپا کے نہ جانے کہاں کہاں پہنچیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے وہ ڈگر جو بیروں تلے دبی نہ ہو پہلے پہل اس نئی ڈگر پر چلنے میں ادھر ادھر نہیں دیکھا جاتا اور ناک کی سیدھ ہی پر چلنا پڑتا ہے۔ دھیان کی ٹکٹکی ادھر بندھ جانے سے دوسری سائڈ کی چھوٹی بڑی کوئی بات بھی دکھائی نہیں دیتی۔ نئے ڈھنگ سے اردو، ہندی جھگڑا چکانے میں ایسا لگا اور ایسا دھیان بٹا جو نہ لکھنا چاہئے تھا وہی لکھ گیا۔ ایک آدھ پر نہیں سب چٹھیوں پر بے دھیانی ہی لکھوانی چلی گئی جیسے:۔ گاندھی جی سے بات چیت، ٹھیٹ اردو میں، پنڈت جواہر لال نہرو سے دو ڈھائی باتیں ٹھیٹ اردو میں، تارا چند جی سے دو دو باتیں ٹھیٹ اردو میں۔

یہ جو بھی لکھا وہ چھپ چھپا گیا اور چھپنا چاہئے تھا۔ چھاپے کے سانچے میں ڈھل ڈھلا کے اپنا کیا دھرا جب سامنے آیا تو ایسا اچنبھا ہوا جیسے کسی دوسرے نے یہ بول بڑھا دیئے ہیں۔ چھپ چکنے پر بھلا کاٹ چھانٹ کی جگہ کہاں؟ جو ہونا تھا ہو چکا یہ سوچ کے چپ ہو گیا۔ پر جی کی پھانس نہ نکلی اور یہ کھٹک نہ گئی۔ اس پر کچھ الگ لکھنا چاہتا تھا پر ادھر ادھر کے جھمیلوں نے نہ چھوڑا اور اس میں پھنس کے ایک بول بھی نہ لکھا جا سکا۔

اب جو پھر بات چھڑی تو وہ دبی ہوئی جھٹ ابھر آئی۔ نہ جاننے والے کہیں ٹھوکر نہ کھائیں اور لکھنے کے اس ڈھب کو ٹھیٹ اردو نہ سمجھنے لگیں۔ اس ڈر سے یہ لکھنا اور جتنا پڑا۔ وہ چٹھیاں جو "ٹھیٹ اردو" کے نام سے چھپ چکیں ان کے لکھنے کا ڈھب اردو تو ہے۔ پر، ٹھیٹ اردو نہیں۔ پھر، ٹھیٹ اردو کسے کہتے ہیں اور اس کی پہچان کیا ہے؟ اس کی ہندی کی چندی آگے آتی ہے۔

اب تک کی لکھت کئی برس ادھر کی چھپی ہوئی چٹھیوں کا وہ پہلا ٹکڑا ہے جسے فارسی میں "دیباچہ" کہتے ہیں۔ اس ٹکڑے اور اس کے پیچھے والی چٹھیوں کے لکھنے کا ڈھچر بھی ایسا ایک سا ہے جس میں نہ کہیں ال بل ہے اور نہ کہیں یونہی سی بھی کوئی گھٹ بڑھ۔ جو ڈول اس کا ہے وہی ڈھنگ ان کا۔

وہی "ٹھیٹ اردو" تو اس کا ڈھب اس ڈھچر سے پورا الگ ہے۔ اس میں عربی، فارسی کا ایک آدھ بول ڈھونڈے سے بھی کہیں آپ کو نہیں مل سکتا اور ٹھیٹ اردو میں سب بولیوں کے ملے جلے اور گھلے ملے بول دھڑلے سے برتے جاتے ہیں۔ ٹھیٹ اردو کے سامنے لکھنے کا یہ ڈھنگ ایسا ہی ہے جیسے کسی ہری بھری لہکتی ہوئی بڑی پھلواری کے سامنے کچھ مرجھائی ہوئی ٹہنیاں۔ ٹھیٹ اردو کی بانگیاں دکھانے کے لئے اب کون ڈھونڈ ڈھانڈ کے جنجال میں پھنسے اور دوڑ دھوپ کرکے ادھر ادھر سے مانگے تانگے کی لکھتیں اکھٹی کرتا پھرے۔ اس دیس کے مانے ہوئے بڑے بوڑھوں کی چار پانچ لکھتیں جو اپنے پاس ہیں انہی میں سے کچھ ٹکڑے لکھنے سے پہلے سر سید کی سبھا میں آپ کو لئے چلتے ہیں"

(ساقی۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

اس عبارت کی خط کشیدہ سطریں اور اسی طرح کی آگے آنے والی خط زدہ عبارتیں ملحوظ خاطر رہیں اس لئے کہ آئندہ کی بساط استدلال

یہی سب قومی ٹھروں کا کام دیں گی۔ ڈاکٹر تارا چند صاحب
کی موسومہ چٹھی جس صنعت میں لکھی گئی۔ اس کی
وقعت و منزلت خود میری نظر میں کیا تھی؟ اس کے
تفصیلی جواب کے لئے اسی چٹھی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"میرے لکھنے کا یہ ڈھنگ نہیں جو آپ نے دیکھا۔ آپ کی
انوکھی لکھت دیکھ کر یہ دھیان آیا۔ آپ سے اردو ہی
میں بات چیت کروں اور ہو سکے تو عربی فارسی کو ہاتھ نہ
لگاؤں اور دکھا دوں:۔ کلا حل 'سمیتی' ابھیاس'
ننیتیجے جیسے بھولے بسرے کڈھب بولوں کو چھوڑ کے اردو
یوں لکھی جا سکتی ہے۔ اس میں عربی، فارسی کے بول
جن سے آپ کو چڑ ہے اتنے بھی نہیں جتنا نون آٹے
میں۔ عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگانے سے دیکھئے ساری لکھت
کیسی روکھی پھیکی ہو کر رہ گئی۔ جس تھوڑی سی جگہ میں دب
دبا کے اور سمٹ سمٹا کے بھی بیٹھنا دوبھر ہو۔ وہاں پھیل کے
بیٹھنے کی جگہ کہاں؟ گنتی کے کچھ بولوں کی الٹ پلٹ
اور ہیر پھیر سے جو ہو سکتا تھا وہ کیا۔

کوئی ان پڑھ، سمجھ کا میٹھا ہی ایسا ہوگا جو ہندی
کی گھلاوٹ اور مٹھاس کو نہ مانے۔ پر نری مٹھاس ہی
مٹھاس کھائی بھی تو نہیں جا سکتی۔ اس کا جوڑ چٹ
پٹا پن ہے۔ چٹ پٹے پن کے ساتھ مٹھاس بھی ہو تو پھر
اس کا کیا کہنا۔ سونے پہ سہاگا ہے۔ جیسے ہندی کی
مٹھاس مانی ہوئی ہے۔ ایسے ہی عربی، فارسی کا چٹ پٹا
پن بھی۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو پھر ان کا کیا پوچھنا
اسی لکھت میں کہیں کہیں بھی عربی، فارسی کا جوڑ لگا دیا
جاتا تو ان پھولوں کی مہک اور ان کا روپ دیکھنے
کا ہوتا۔ پر یہ بھی سمجھ لیجئے یہ ڈھب ایسا نہیں ہے
جو سب جگہ نبھ سکے۔

سرکس کا گھوڑا تھوڑی سی جگہ میں لیٹ کے
بیٹھ کے، کھڑے ہو کر نت نئے کرتب دکھاتا ہے۔ پر
جب کوئی بھاری بوجھ لاد کے کسی لمبی چوڑی سڑک پر
اسے دوڑایا جائے تو وہ گھڑی گھڑی اڑتا اور بدکتا ہے
مارنے پیٹنے چمکارنے کسی ڈھب سے بھی وہ نہیں سدھرتا
اور گھڑی بھر بھی وہ اس سڑک پر نہیں چل سکتا۔

اس لکھت کا بھی یہی رنگ ہے۔ یوں تو کچھ
کانا پھوسی اور کچھ کھلی ڈلی باتیں بنا سکتی ہے۔ پر جب
کٹھن باتیں بچھڑ جائیں اور ان کا گہرا پن جوں کا توں
دکھانا ہو تو پھر اپاہج بن جاتی ہے اور اپاہج بھی ایسی
جیسے ان تلوں تیل ہی نہیں تھا کبھی اس کے اپاہج
ہونے سے عربی، فارسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اور
یہ دونوں مل ملا کے کیسی ہی الجھی ہوئی گتھیاں کیوں
نہ ہوں گھڑی بھر میں انھیں پورا سلجھا دیتی ہیں اور پھر
کوئی الجھاؤ ہی نہیں رہتا۔ کٹھن سے کٹھن بھید کھل کھل
کر ایسے دکھائی دینے لگتے ہیں جیسے ہاتھوں کی لکیریں"

(جامعہ۔ دہلی۔ اگست ۱۹۳۶ء)

گاندھی صاحب کی موسومہ چٹھی کے یہ اختتامی فقرے بھی ملاحظہ ہوں:۔

"آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے
چڑ، تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا؟ عربی
فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھنا جیسا لکھا کرتا ہوں
تو اس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے"

(الہ آباد اکیڈمی کا تماہی "ہندستانی" ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر تارا چند صاحب کی آخری موسومہ چٹھی کا درج ذیل اختتامی
حصہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں:۔

"اب تک یہ جھگڑا چکانے اور روٹھے ہوئے ہندوؤں کو منانے کے لئے اس ڈھب پر لکھتا رہا اور اس ڈھب کے کواڑ ہیں نے ہی کھولے تھے اور اب میں ہی انھیں بھیڑے دیتا ہوں۔ انھیں کیوں کھولا تھا اور کس لئے بھیڑا جارہا ہے؟ یہ کوئی بھید نہیں جو آپ سے چھپا ہوا ہو۔ تو اب جو لکھنا لکھانا ہوگا عربی، فارسی، ہندی ان سب کو ملا جلا کے اسی ڈھنگ سے لکھوں گا جیسے اس سے پہلے لکھا کرتا تھا"
(ادبی دنیا۔ لاہور ۱۹۳۷ء)

سلسلۂ واقعات کی یہ چھوٹی بڑی کڑیاں گویا نیچی اونچی ایسی سنگین سیڑھیاں ہیں جو بام نتائج تک پہنچا دیتی ہیں۔ زیر بحث صنعت میں جیتھیلیا سے لے کر "سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر" تک جتنی خامہ فرسائی کی گئی اس کے لفظ لفظ اور نقطے نقطے سے "اردوئے معلیٰ" کی تائید وحمایت کا آب حیات ٹپک رہا ہے اور اس کی کسی عبارت، کسی جملے اور کسی فقرے سے اس کے خلاف ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس باب میں تحریر جدید کی نوعیت استدلال اور اس کی استواری واستحکام ہی وہ قوی شہادت ہے جسے ارباب خرد کی ناقدانہ نگاہیں ہی پرتال سکتی ہیں۔ یہاں تک مسلسل واقعات کے خط وخال کا جو مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد اب "تبیج" کا نہج کرم گستری "ہماری زبان" کے توسط سے لائق دید ہے "ہندستانی کا نمونہ ٹھیٹ اردو" اس عنوان کے تحت ڈاکٹر تاراچند صاحب کی موسومہ چٹھی کا درج ذیل حصہ نقل کرکے داد نکتہ سنجی دی گئی ہے:۔

"اردو کو نیچ میل مٹھائی سمجھئے۔ کئی مٹھائیوں میں سے ایک مٹھائی کو الگ کرلینے سے مٹھاس بڑھے گی کیا۔ گھٹ گھٹا کے رہ جائے گی۔ ایک چینی ہوئی مٹھائی میں اور کئی مٹھائیوں کی مٹھاس نہیں آسکتی۔ کسی ہرے بھرے پودے کی جڑ کھود کے کسی سوکھے ہوئے پیڑ کے لئے جگہ نکالنے سے یہ ٹھنٹھ تو بھلا کیا پھلے پھولے گا وہ ہرا بھرا پودا ہی مرجھا کے رہ جائے گا۔ جیتی جاگتی بھاشا میں مٹی ہوئی بولی کے ٹھونسنے سے مری ہوئی بولی تو جی اٹھنے سے رہی۔ جیتی جاگتی بھاشا ہی اس کے ملنے سے ادھ موئی ہو جائے گی۔

اردو کی نیو ڈالنے والوں میں کوئی ایک آدھ جتھا تو نہ تھا۔ دیس والے سبھی تھے۔ سب نے مل کر اس کی جیسی نیو ڈالی ویسا ہی اس کا آشرم بن بنا گیا۔ اب آپ کیا پورے آشرم کو ڈھا کے پھر اس کی نئی نیو رکھنا چاہتے ہیں۔ نئی نیو کوئی پودا تو نہیں جو آج لگایا کل پھل لے آیا۔ برسوں کی دوڑ دھوپ سے اب کہیں جاکر اردو ایسی نکھر چلی ہے جسے آج ہم آپ ہی نہیں اونچے اونچے گھرانے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں اور جب اس کا یہ نکھار ہی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ نیا کنواں کھود کے پانی پینا ایک دو دن کی تو بات نہیں، پھر جب تک کیا کیجئے گا؟ کیا چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی ٹھانی ہے۔ اردو اب تک جس سانچے میں ڈھل چکی ہے اسے یونہی رہنے دیجئے۔ اب رہیں اس کی اور بناؤ سنگار کی باتیں تو وہ کچھ ایسی کٹھن نہیں۔ اسے بے ٹھیس لگے ایک ایک کرکے وہ سب کی سب ہوسکتی ہیں۔ اردو کا پیار، پریم جو چاہے کہئے وہ اب بھی ہے۔

پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے والی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجے اس میں آپس کے میل جول، ساتھ رہنے سہنے، راج کا دباؤ اور ایسے ہی اور اور سہاروں سے پہلے پہل ایک بھاشا کے بول دوسری بولی میں کچھ کچھ آتے ہیں۔

باہر والی اور یہاں کی بھاشا میں لوچ اور لچک ہوئی، ملنے
چلنے میں کوئی رکاوٹ نہ دکھائی دی اور نئی بھاشا کے
بول یہاں کی بات چیت میں پھیلنے لگے تو پھر ان کا تانتا
بندھ جاتا ہے اور ان کی کھپت پہ کھپت ہوتی چلی جاتی
ہے۔ پر۔ کہیں کی بولی راج واج کا دباؤ دباؤ کچھ مانتی
ہی نہیں۔ جیسے تاتاریوں اور ترکوں کی راج دھانی برسوں
ایران رہا۔ پر فارسی نے راج واج کی بھاشا کو منہ بھی نہ
لگایا۔

ہلاکو سے سلطان حسین میرزا تک برسوں راج
کے ساتھ ساتھ رہنے پر بھی ترکی بول فارسی میں آگے بڑھ
کے جگہ نہ لے سکے۔ انھیں گنا جائے تو سیکڑے میں بہت
سے بہت دس بول نکلیں تو نکلیں۔ اسی ایران میں کبھی
عربوں کا بھی راج پاٹ پھیلا ہوا تھا جو بہت نہ رہا۔ پر۔
جب تک بھی رہا کچہریوں کی لکھت پڑھت فارسی ہی میں رہی۔
اس پر بھی دیکھتے ہی دیکھتے عربی ایسی بڑھی اور پھیلی جیسے
بن میں آگ لگے۔ اس کا گر یہی ہے:۔ ترکی بھاشا کی
بناوٹ فارسی سے میل نہیں کھا سکتی تھی۔ اس لئے
ملنے پر بھی یہ دونوں آپس میں رکی رکی رہیں۔ عربوں کا
لوچ اور فارسی کی لچک، ان دونوں کے ملنے میں کوئی
رکاوٹ ہی نہ تھی۔ اس لئے عربی، فارسی دونوں کی
دونوں آپس میں مل جل گئیں۔

کوئی باہر والا کسی کے یہاں آکے ٹھہرے اور
گھر والوں کی آؤ بھگت، آنکھیں بچھانے سے وہ اسی
گھر میں رہ پڑے۔ آپس کے میل ملاپ سے وہ اور گھر والے
مل ملا کے ایک ہو جائیں تو پھر وہ باہر والا نہیں رہتا۔
گھر ہی کا کہلاتا ہے۔ پر۔ جب اس کھوج لگانے کی دھن ہو:۔
یہ کہاں کا تھا؟ یہاں کب آیا؟ تو گھڑی بھر کے لئے اس کے
باہر والا ہونے کا دھیان آئے تو آئے نہیں تو پھر کبھی نہیں آتا۔

عربی، فارسی کو ایسا ہی سمجھئے ان دونوں کے بولوں
کی اردو میں کیسی ریل پیل ہے۔ جسے دیکھئے بے سوچے سمجھے
انھیں بولتا ہے۔ تو اب یہ کہنا ہی ٹھیک نہیں:۔ یہ عربی کے
بول ہیں اور یہ فارسی کے۔ عربی، فارسی اب کہاں رہے۔
اب تو اردو میں یہ ایسے سما گئے ہیں جو اس سے الگ نہیں
ہو سکتے۔ وہ اور یہ دونوں کے دونوں ایک ہو کے رہ گئے
ہیں جب دونوں ایک ہو گئے تو پھر انھیں عربی، فارسی
آپ کیوں کہتے ہیں؟ انھیں اردو کے گھر کی پونجی کہئے نا
اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا ایسے جتن
کئے جاتے جن سے پرائے بھی اپنے بن سکتے۔ پر یہاں تو
اپنوں کو بھی پرایا بنانے کا ڈول ڈالا جا رہا ہے"

("ہماری زبان" ۱۶ فروری ۱۹۴۱ء)

یہ اس چٹھی کا ابتدائی کچھ حصہ ہے جو الہ آباد اکیڈیمی کے "تماہی ہندستانی"
میں ڈاکٹر تاراچند صاحب کے جواب کے ساتھ کئی برس ادھر چھپ چکی ہے۔
واقعہ نگاری کا فرض اتنا ہی ہے کہ جو کچھ ہو چکا اسے جوں کا توں دہرا دیا
جائے۔ اس بناء پر ڈاکٹر صاحب کے جواب کی یہ آخری سطریں یہاں
نقل کر دینا ضروری ہیں:۔

"اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا آپ کیا
نام رکھیں گے۔ میں تو اسے اردو، ہندی یا ہندستانی
کسی بھی نام سے پکارنے کو تیار ہوں۔ یہی وہ بولی ہے جس
کا نکھار رنگ مولوی سید ابوالقاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا ہے"

(ہندستانی، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر صاحب نے یہ فرمایا اور نتیجے نے جو گہر ریزی فرمائی وہ
آگے آتی ہے۔ میں اس باب میں اپنی کوئی رائے پیش کرنے کا اس لئے

استحقاق نہیں رکھتا کہ درونِ خانہ کا راز اہل خانہ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کتاب یہ کتاب عذاب نہ ثواب کے لحاظ سے الہ آباد اکیڈیمی کے صدر اور مسٹر تبیج اب آپس میں سمجھ لیں۔ اس کے معانی کے بعد تبیح کی یہ گل افشانی دید نی ہے:۔

"ہندستانی یا ٹھیٹ اردو کا یہ نمونہ آپ نے دیکھ لیا۔ گر سوال یہ ہے کہ کیا یہ پٹنے تلے اور پھونک پھونک کے رکھے ہوئے شبد روزمرہ کی بول چال اور آئے دن کے واقعات کے بیان کے لئے کافی ہو سکتے ہیں؟ کیا کاغذ کی یہ ناؤ سائنس کی نئی تحقیقاتوں اور سیاسیات و معاشیات کی نئی نئی اصطلاحوں کا بوجھ اٹھا سکے گی؟ ہمیں تو اس میں بھی شبہہ ہے کہ لفظ کی جگہ ہر موقع پر "شبد" اور "بول" اور زبان کے لئے ہر جگہ بھاشا کا استعمال ہندستانی یا ٹھیٹ اردو کی اس قسم کو زندہ بھی رہنے دے گا یا نہیں! اردو میں عموماً "بول" گیت کے ٹکڑے کو اور "بھاشا" "برج بھاشا" کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو ایسی دو غلی کوششوں کے لئے ایک نیا قومی "عجائب خانہ" اس بھاشا کے علم برداروں کو تعمیر کرانا پڑے گا اور ہمیں یقین ہے تعمیر کے اخراجات پر قوم میں پھر اختلاف واقع ہو گا کہ چندے کا تناسب کیا رہے اور یہ جھگڑا اتنا طول پکڑے گا کہ بھاشا کے یہ نمونے دریا برد ہو جائیں گے۔ ایڈیٹر

("ہماری زبان" ۶ ار فروری ۱۹۴۱ء)

تبیح کی یہ کرم فرمائی کسی کے اس شعر کی پوری مصداق ہے:۔

تغافل سے جو باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

تقریباً پانچ، چھے سال کے خواب تغافل سے چونکا بھی تو اس شان کا:۔

لڑنا ہے اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شاید ابھی نیند بھری نہ تھی اور کسی نے جھنجوڑ کے کچی نیند سے اسے جگا دیا۔

جب ہی تو بے سوچے سمجھے جو منہ میں آیا وہ کہہ گزرا۔ اپنے ذوق بیداد کے لحاظ سے تبیج کی یہ خدنگ افگنی اور ناوک اندازی محض مشق ناز کے لئے ہے۔ تو بسم اللہ:۔

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اور اگر کسی کے کہنے سننے اور پٹی پڑھانے سے آنکھیں بند کر لی گئی ہیں تو کچھ تھوڑا بہت دماغ سے بھی کام لے کر آنکھیں کھول کے دیکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ چشم نظارہ طلب کی ودیعت اسی لئے ہے۔ یوں تو جس کے منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم ہے وہ جو منہ میں آئے کہے اور جو چاہے لکھے کوئی رد کرنے والا نہیں۔ لیکن صرف کہنے اور لکھ دینے کو اعتراض نہیں کہتے۔ . . . . حقیقی اعتراض وہی ہے جس میں کہنے والے کی باتوں اور لکھنے والے کی تحریر سے دقت نظر ایسی متناقض باتیں نکالے اور ان کی ایسی نمایاں حد بندی کرے کہ فریق مخالف کے لئے کوئی جائے گریز نہ رہے۔ مگر اس طرح کا اعتراض کہ بغیر کسی دلیل کے جو چاہا وہ کہہ دیا۔ اہل نظر اسے سوفیانہ روش کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

سید ابوالقاسم سرور

خطابیات

فن تقریر پر شیخ رحیم الدین صاحب کمال ظہیر آبادی نے یہ کتاب لکھی ہے جس کو ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔ سلیس اور عام فہم انداز میں تقریر کی تقریباً تمام اصناف پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۱۲ر سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد سے مل سکتی ہے۔

تلاشِ سکون

وہ اسی دھن میں لگا ہوا تھا کہ کہیں سکونِ قلب مل جائے۔ ایسا سکون جو اس کو دنیائے ہنگامہ کے اضطراب پیہم سے متاثر نہ ہونے دے۔ وہ چاہتا تھا کہ جب وہ اپنی زمین بوس جھونپڑی کے مٹی کے چراغ کا مقابلہ فلک بوس قصر کے جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے سے کرلے، تو وہ ایک نامعلوم ضرب اپنے دل پر محسوس نہ کرے۔

تلاشِ سکون اس کو ایک فاقہ کش کسان کی جھونپڑی میں لے گئی۔ وہ سمجھا کہ شائد سکونِ قلب غریب کی پھونس کی کٹیا میں میسر آجائے۔ لیکن اسے ناامیدی ہوئی۔ جب اس نے کسان کا دھوپ سے جھلسا ہوا چہرہ پیلا پڑتے دیکھا۔ کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ہرا بھرا کھیت بھی شدید دھوپ کی تاب نہ لاکر پیلا پڑ رہا تھا...... وہ اور زیادہ ناامید ہوا جب اس نے کسان کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھے۔ کیونکہ ساہوکار اپنی واجب الادا رقم کے عوض میں اس کے مویشی کھونٹے سے کھول رہا تھا۔ سکونِ قلب کا یہاں بھی نشان نہ پاکر وہ واپس ہوا۔ وہ ایک نامعلوم سمت کی طرف چل دیا۔

وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا تیز قدم جا رہا تھا۔ پژمردگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ سورج پہاڑ کے عقب میں دم توڑ رہا تھا۔ اور چاروں طرف اداسی حکمران تھی۔ دور بیری پر ایک پرند زمزمہ آرائی میں مصروف تھا۔ شاید اپنی تمام دن کی کامیاب پرواز پر خوشی کے گیت گا رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ شاید اس معصوم آواز میں اطمینان پنہاں ہو، بیری کے نیچے پہنچا۔ اور لگا اس سے آنکھیں لڑانے ...... پرند نے اپنا زمزمہ ختم کیا۔ اس کی طرف بغور اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھا۔ فضا میں اپنے بازو کھولے۔ اور سکون کو پھاڑ کر اڑ گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نظروں نے پرند کی پرواز کا ساتھ دیا۔ لیکن ...... وہ دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔

اب وہ جھیل کے کنارے جا رہا تھا۔ جھیل کی موجیں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ چاند اوپر سے نور برسا رہا تھا۔ اور ہر سمت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس دلفریب منظر نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اس کی رفتار سست ہوگئی اور بالآخر وہ ٹھیر گیا۔ اس کی نظریں سطح قمر پر جم گئیں۔ اور وہ اس کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا...... اس کی محویت ختم ہوگئی۔ جب اس کی متجسس نگاہوں نے ایک بدنما سیاہ داغ کے وجود کا پتہ قمر کے گورے گورے سینہ پر لگالیا...... چاند نے اب اپنی کشش کھودی اس کی نظریں اس مقام سے ہٹیں اور سطح آب پر مجنونانہ انداز سے رقص کرنے لگیں۔ جہاں چاند سیماب کے مانند تڑپ رہا تھا۔ اس نے سیاہ داغ اور تڑپ کا کچھ مفہوم پیدا کیا۔ اور کچھ سمجھ کر آگے چلنے لگا...... پیچھے مضطرب موجیں ساحل کی آغوش میں اس متلاشی انسان پر قہقہہ لگا رہی تھیں۔ اس نے اپنے قدم جلد جلد اٹھانے شروع کئے تاکہ قہقہوں کی گونج کے احاطہ سے باہر ہو جائے۔

وہ جس کے قفسِ خاکی میں طائرِ روح مضطرب تھا۔ اس شدت اضطراب سے تنگ آکر اس شے کے حصول کی کوشش کر رہا تھا، جو اس اضطراب کو سکون میں تبدیل کردے۔ یہی تلاش اس کو ایک بڑی آبادی میں لے گئی۔ جہاں اس کی

نظر ایک خوش نما محل پر پڑی۔ جس کے اطراف اس نے ایک چمن دیکھا۔ چمن میں فرش سبز دیکھا۔ فرش سبز پر روشیں لیٹی دیکھیں۔ جا بجا دائری اشکال میں سرو کھڑے دیکھے۔ ہر دائرہ کے مرکز پر فوارہ اچھلتا دیکھا...... آگے بڑھا تو خوش نما موٹر کھڑی دیکھی۔ سفید پوش انسان دست بستہ کھڑے دیکھے سامنے کمرہ کے اندرونی حصہ پر نظر پڑی۔ تو چھت سے جھاڑ فانوس لٹکے دیکھے۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے دیکھے اس پر مخملی صوفے رکھے دیکھے۔ الغرض اس نے دولت کو مختلف بھیس بدلتے دیکھا...... طلسم زر نے اس پر اپنا کام کیا۔ اور وہ سمجھا کہ سکون ضرور امراء کے عیش و آرام میں پوشیدہ ہے۔ اس کو روحانی اضطراب کی دوا دولت میں نظر آنے لگی۔ اس نے اس شہر میں قیام کیا تاکہ عشرت کدہ میں عیش منانے والے کی ذات کا مطالعہ کر کے اپنے خیال کی تصدیق کرے چند ایام کے دقیق مطالعہ نے اسکو بتایا۔ کہ وہ امیرانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرنے والا جب اپنے سے زیادہ حیثیت کے انسان پر نظر ڈالتا ہے تو حسد کی آگ میں جل اٹھتا ہے...... جب اس کی نظر فاقہ کش خرقہ پوش پر پڑتی ہے تو اس پر غرور اور تکبر کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ پہلی صورت میں وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہے۔ کڑھنے والا کبھی اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی برق رفتار موٹریں، اور چمن میں شام کے وقت کی تازگی اس کو درس قناعت نہیں دے سکیں۔ اس کا قلب فواروں کی طرح مضطرب رہتا ہے۔ دوسری صورت میں تکبر اس کو دائرہ انسانیت سے خارج کر دیتا ہے۔ حدود انسانیت سے باہر ایک شخص کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتا۔ یہ مقام جانوروں کے لئے موزوں ہے...... اس نے روحانی اضطراب کو اس عشرت کدہ میں سابقہ مشاہدات سے زیادہ پھلتے دیکھا۔

سورج اپنی اعظم بلندی سے ساکنان ارض پر اپنی پوری قوت سے آتشیں تیر برسا رہا تھا۔ جن کی تاب نہ لا کر درخت اپنی چھوٹی چھوٹی ڈھالوں سے دست بردار ہو چکے تھے۔ تالاب پیاس کی تاب نہ لا کر منہ کھولے ہوئے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے خاموش تک رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ پرند چرند نہ معلوم کہاں چھپے پڑے تھے۔

وہ تپتی ہوئی زمین پر آہستہ آہستہ گردن جھکائے ہوئے جا رہا تھا۔ امید کامل طور پر اس کو نفی میں جواب دے چکی تھی۔ اور یقین دلا چکی کہ انسان اس دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ اس کے دل میں مضطرب سمندر کی طرح ہر وقت طمع حسد اور بے صبری کی موجیں اٹھتی رہیں اور بس۔

وہ جا رہا تھا کہ قدموں کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک جنازہ آ رہا ہے۔ آدمیوں کی ایک بڑی تعداد اس کے پیچھے ہے۔ وہ سب خاموش ہیں۔ ان میں سے چند اپنے لبوں کو بے آواز جنبش دے رہے ہیں...... وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا...... وہ قدم اٹھا رہا تھا اور نظر اس مجبور خاکی پتلے پر جمی ہوئی تھی۔ جو چار کندھوں پر سوار ہو کر خاک میں ملنے جا رہا تھا...... شاید اس کے خیالات مرحوم کی دنیا میں پرواز کر رہے تھے...... وہ سب منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ آخری بستر استراحت دراز تھا۔ اس نے سب کو واپس جاتے دیکھا اور آنسو آنکھوں سے ڈھلکتے دیکھے۔ وہ قبر کے قریب آیا۔ کتبہ پر نظر پڑی "تاریخ پیدائش سنہ ۱۳۱۱ھ تاریخ وفات ۱۳۵۵ھ"...... اس نے مرنے والے کے متعلق ابتدا اور انتہا کے دو حوالے دیکھے اور درمیان میں صرف تاریکی...... اس تاریکی سے اس نے وہ چیز حاصل کی جس کی کہ اس کو ضرورت تھی۔ اس نے خود کو چپکے سے کہا "سکون قلب ہر جگہ موجود ہے۔ جھونپڑی میں بھی اور ایوان میں بھی، بشرطیکہ

خواہش مند انجام حیات کی یاد دہانی کرتا رہے۔ یادِ انجام روح کی غذا ہے، یہ نہ ملنے پر اس کا بے چین ہونا یقینی ہے۔ چل اپنی کٹیا کو، اور اپنے چراغ کو صاف کر۔ اس پر گرد جم گئی ہو گی۔"

عبدالباقی کیرانوی

بادۂ شباب

ہوش و خرد شکار کئے جا رہا ہوں میں　　　دل کو گنہگار کئے جا رہا ہوں میں

اُن کی نظر میں اشک کی قیمت نہیں تو ہو　　　شرحِ دلِ فگار کئے جا رہا ہوں میں

کتنا لطیف جرم ہے، ساقی خطا معاف!　　　نظروں کو بادہ خوار کئے جا رہا ہوں میں

کیا اہلِ بزم! جوشِ جنوں کو خدا رکھے　　　خود ان کو بیقرار کئے جا رہا ہوں میں

اپنے گناہِ عشق کا دے دے کے واسطہ　　　رحمت کو سازگار کئے جا رہا ہوں میں

مجھ سا زمانہ ساز بھی دنیا میں کم ہوا　　　ان کو امیدوار کئے جا رہا ہوں میں

ایسی بہار حشر تک آئے نہ اے خدا　　　دامن کو تار تار کئے جا رہا ہوں میں

بربادیوں میں ان کی رضا کا بھی دخل ہے　　　ہر عہد استوار کئے جا رہا ہوں میں

اے جورِ دوست! چھین لے اب قوتِ بیان　　　دنیا کو ہوشیار کئے جا رہا ہوں میں

تکمیلِ ضبطِ درد تو نورِ سحر نے کی　　　تفسیرِ انتظار کئے جا رہا ہوں میں

سوچو تو تم نے ہائے مجھے کیا بنا دیا　　　دشمن پہ اعتبار کئے جا رہا ہوں میں

ساتھی تو خیر! دنگ ہیں منزل نشینِ شوق　　　وہ راہ اختیار کئے جا رہا ہوں میں

پھر ان کے جور حد سے سوا ہو گئے نظر
پھر شکرِ کردگار کئے جا رہا ہوں میں

نظر

مولی والی!

جھونپڑی سے باہر نکلتے وقت اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں لیکن وہ بیحد مجبور تھی! اسے جانا ضروری تھا۔ ورنہ اس کے چاند کو روٹی اور دوا کہاں سے مل ہوتی؟ کون لا دیا ہوتا؟ اپنی میلی ساری کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی اس نے ایک دفعہ اپنے لکڑی کی طرح سوکھے ہوئے بچے کو دیکھا اور جھونپڑی سے باہر نکل گئی ـــــــ

گزرے ہوئے دنوں کے خیالات اس کے دماغ میں آندھی کی طرح اٹھ رہے تھے، جمو سے شادی ہونے کے بعد ہی سے اس کی زندگی کے سکھ کی کمان چڑھنی شروع ہوئی۔ چندو سے تو اس کے مندر کا کلس چڑھایا گیا تھا۔ لیکن! ـــــــ

سکھ کا کلس زیادہ دن قایم نہ رہ سکا۔ آرام و آسایش گیا سکھ اور اطمینان کی کمان چڑھی نہ رہ سکی۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ـــــــ پلیگ کی منحوس وبا آئی اور اس غریب کے مندر کے دیا کو بجھا لے گئی۔!

اس کی تمناؤں کے پھول ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہ پائے تھے ـــــــ مرجھا بھی گئے!

لیکن اس کے دکھ کی کمائی ـــــــ اس کے سکھ کا باعث، دل کا ٹکڑا! چاند ـــــــ

شوہر کے انتقال کے بعد اس نے اپنے شوہر کی اس تصویر میں رنگ بھرنا شروع کیا تھا ـــــــ

پہلے جمو اور وہ مل کر کام کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے تکلیف کا احساس نہ تھا، لیکن اب تو اس کی حالت مشین کی سی ہوگئی تھی۔ اس کا پروگرام بالکل مقررہ تھا۔ اس کا سارا وقت جنگل میں لکڑی کاٹنے میں صرف ہوتا تھا!

شام کے وقت مولی بیچ کر گھر آنے پر اپنے لعل کو دیکھنے سے اس کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا ـــــــ

لیکن پرسوں سے اس پر ایک نئی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

اس کا چاند بیمار تھا ـــــــ

روزانہ کی طرح اس دن بھی وہ گھر آئی ـــــــ لیکن صحن میں چاند دکھائی نہ دیا ـــــــ اس نے کچھ گھبرا کر آواز دی ـــــــ "چاند! ارے چندوا!" جھونپڑی سے کمزور آواز سنائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی جھونپڑی میں گئی ـــــــ

اس کا چاند بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کے چاند کا چہرہ سرما کے چاند کی طرح زرد اور چمپا کی طرح اداس تھا ـــــــ!

اس کا کلیجہ چرمرا گیا ـــــــ

کام میں دل نہ لگتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ چاند کی دوا ـــــــ دوا کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی اس لئے اس نے معمول سے زیادہ بڑا گٹھا باندھا تھا ـــــــ

شام سے پہلے اپنے گھر لوٹنا نہایت ضروری تھا۔ اسے توقع تھی کہ اس کا جگر گوشہ اس کی راہ میں آنکھیں لگائے بیٹھا ہوگا۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی وہ گاؤں کے راستہ پر آگئی۔ سر پر مولی کا بوجھ تو تھا ہی!

پانچ بجے کے انداز میں وہ گاؤں میں آئی۔

جتنا جلد ہو سکے مولی بیچ کر اسے اپنے گھر جانا تھا ـــــــ

لیکن، دوسروں کو اس کے دل کا حال کیا معلوم؟

مولی معمول سے ڈیڑھ گنی زیادہ ہونے پر بھی ہر شخص اسے روزانہ کی قیمت دینا چاہتا تھا۔

اور اسے تو چاند کی دوا کے لئے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔

بازار میں بالکل اس کے سامنے ہی ایک نجومی بیٹھا تھا۔
پانچ آنے میں پوری —— قسمت کا حال وہ کہہ رہا تھا۔
صرف پانچ آنے —— پانچ آنے میں اپنی قسمت معلوم کرو۔
اس کے آس پاس لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے!
—— اور بہت سے خوش قسمت اپنی قسمت کی جانچ کروا رہے تھے!
تھوڑے سے وقت میں، اوٹ پٹانگ باتوں سے نجومی پانچ آنے کما لیتا تھا —— لیکن دن بھر خون پسینہ ایک کر کے جنگل جنگل چھان مار کر کاٹی ہوئی لکڑیوں کے ایک بھاری گٹھے کے عوض اسے کوئی آٹھ آنے سے ایک پیسہ بھی زیادہ دینے تیار نہ تھا!
اس نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔
نجومی فرفر تقدیر کے نوشتے بیان کر رہا تھا۔
اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی اپنے بچے کی قسمت کا نوشتہ معلوم کرالے ——
لیکن پیسہ!
وہ پھر مولی کی طرف دیکھنے لگی۔
لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور بڑی دیر کے بعد اس کی مولی دس آنے میں بک گئی۔
کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بھی اس بھیڑ میں گھس گئی۔ پانچ آنے نجومی کے سامنے رکھتے ہوئے سوال کیا۔
تھوڑی دیر سر کھجانے کے بعد وہ بولا "بیماری بہت سخت ہے"۔
اس کا کلیجہ دہل گیا۔

لیکن نجومی کے سامنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وہ پھر بولی۔
"حکیم صاحب کے علاج سے کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں؟"۔
نجومی نے کہا۔ ارے ہٹا حکیم کو میرا تعویذ کافی ہے۔
اس نے یہ سب بڑے ہی غور سے سنا!۔
اس نے سوچا۔ بچے کے لئے تعویذ لے لوں گی، پانچ آنے تو موجود ہیں! خیر میں بھوکی رہوں گی! ——
"پھر کیا چاہئے"؟ بڈھے نجومی نے لاپروائی سے پوچھا۔
اس نے باقی پیسے بھی بڈھے کو دیدیئے۔ بڈھے نے صندوق سے ایک تعویذ نکال کر اسے دیا اور کہا "سیدھے بازو باندھ دو!" وہ تعویذ لے کر فوراً گھر گئی ——
جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی —— کراہ سنائی دیتی تھی —— فوراً اس نے چاند کو چھاتی سے لگالیا۔ وہ بے حد طول تھا، اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا!
اس کے دل کو ٹٹول کر اس نے ایک دفعہ "ہاں" کہہ کر آواز دی۔
اور دوسرے لمحہ۔ تعویذ اس کے بازو پر باندھے جانے سے پہلے ہی اس پر موت کی دیوی نے اپنا آنچل ڈال دیا ——
وہ دھڑ سے نیچے بیٹھ گئی!
اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے!!
اس کی روح کی لطیف کلیاں مرجھا گئیں ——!!!
باہر رات کی دیوی کی عملداری تھی، ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس کے دل کی دنیا میں بھی مسرتوں اور تمناؤں کے چراغ کے گل ہو جانے سے باہر کے اندھیارے کی طرح بھیانک تاریکی پھیل گئی تھی ——

عبدالقادر فاروقی

گل بوٹے

ایک بزرگوار نے اپنے صاحبزادے کو انٹرنس پاس کرتے ہی بیرسٹری کی ڈگری لانے یورپ بھیجا، دس بارہ سال کے بعد صاحبزادے "بیرسٹر" ہوکر وطن لوٹے، بمبئی سے پدر بزرگوار کو گھر پہنچنے کے دن اور وقت کی ذریعہ تار اطلاع دی، بڑے میاں خوش خوش بیٹے کو لینے اپنے عزیز اور احباب کے ساتھ اسٹیشن پہنچے، ٹرین آئی مگر بیرسٹر صاحب کا پتہ نہیں! ایک ایک کرکے سارے ڈبوں کی تلاشی لی مگر صاحبزادے نہ ملنا تھا نہ ملے!! ابا جان کے دوستوں اور عزیزوں کی یہ "برات" بغیر "نوشہ میاں" کو لئے بیرنگ واپس ہوئی۔ بڑے میاں ہر روز بیٹے کی تلاش میں اسٹیشن جاتے، ریل کے ڈبوں میں جھانکتے، عینک کے اندر سے ہر مسافر کو غور سے دیکھتے اور بیٹے کے دیدار کو ترس ترس کر واپس ہوتے۔

اس طرح کوئی دو ہفتے گزر گئے، ایک دن آپ کے ایک دوست نے بیرسٹر صاحب کو منہ میں چرٹ دبائے، کتاب بغل میں لئے میم صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی "پارک" میں چہل قدمی کرتے دیکھا اور آپ سے ذکر کیا، بڑے میاں ابھی یہ گتھی سلجھا ہی رہے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے یہ خبر لائی کہ آپ کے صاحبزادے کو وطن پہنچ کر کوئی دو ہفتے ہوتے ہیں اور وہ کسی ہوٹل میں مقیم ہیں ان کو یہ شکایت ہے کہ تار بھیجنے کے باوجود نہ آپ اسٹیشن آئے نہ بیرسٹر صاحب کو لینے کسی کو بھیجا۔

واقعہ یہ ہوا کہ بیرسٹر صاحب نے اپنے آنے کی جو تاریخ تار میں بتائی تھی اسی دن وہ تشریف لائے۔ ٹرین سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا کوئی آپ کے استقبال کو آتا نظر نہ آیا، ٹیکسی لی اور ایک ہوٹل میں اتر پڑے۔ اب جو بڑے میاں نے یہ خبر سنی تو بےچارے اگلے وقتوں کے بھولے بھالے آدمی پریشان ہوئے کہ آخر یہ کونسی خفگی کی بات تھی کہ پندرہ دن ہو گئے ماں باپ کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کیا! اولاد کی محبت بری ہوتی ہے، فوراً ہوٹل پہنچے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کے صاحبزادے کے نام کے ایک صاحب سامنے کے کمرے میں کئی دن سے ٹھیرے ہوئے ہیں کمرے کے اندر جانا چاہا تو خانساماں نے کارڈ مانگا۔ یہ پرانی وضع کے آدمی کارڈ کیا جانیں! پریشان ہوکر پوچھا

"بھائی تم کیا مانگتے ہو؟"

خانساماں سمجھ گیا کہ بڑے میاں آج کل کی تہذیب سے بالکل کورے ہیں! وہ خود ہی ایک سادہ کارڈ اٹھا لایا اور اس پر نام لکھنے کو کہا اور بولا "یہ کارڈ ہم صاحب کو دیں گے اگر وہ آپ کو بلائیں تو آپ کمرے میں جا سکتے ہیں!"

انھوں نے کہا "بھائی میں کسی صاحب بہادر سے ملنے نہیں آیا ہوں میں تو اپنے بیٹے سے ملنے آیا ہوں جو ولایت سے بیرسٹر ہوکر آیا ہے"

خانساماں نے کہا "جی ہاں! آپ نے جو نام بتایا ہے اس نام کے ایک صاحب اس کمرے میں ٹھیرے ہوئے ہیں، خواہ وہ آپ کے بیٹے ہوں یا کوئی اور یہاں کا یہی قاعدہ ہے"

بڑے میاں نے کانپتے ہاتھوں سے کارڈ پر اپنا نام لکھ کر خانساماں کو دیا وہ لے کر کمرے کے اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکر کہا اس وقت صاحب تاش کھیل رہے ہیں آپ کچھ دیر انتظار کریں!

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد گھنٹی بجی اور آپ کی طلبی ہوئی۔

پدر بزرگوار کو دیکھ کر صاحبزادے نے بیٹھے بیٹھے "گڈ مارننگ" کہہ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بڑے میاں مصافحہ کرکے بیٹھ تو گئے مگر گئے صاحبزادے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کہ وہ ان کا پیارا بیٹا ہی ہے یا کوئی "صاحب بہادر" ہیں۔

اس پریشانی میں سامنے تپائی پر جو نظر پڑی تو ایک شیشہ ارغوانی رنگ کے شربت سے آدھا بھرا رکھا دیکھا' شیشہ کے آس پاس کانچ کے دو چار خوبصورت جام دھرے تھے' ایک تپائی پر تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے اور وہیں کچھ ریزگاری بھی موجود تھی۔ بڑے میاں ان چیزوں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور بیرسٹر صاحب "تین پتوں" کے کھیل میں مشغول تھے۔ بڑے میاں نے آخر تنگ آکر کہا "بیٹا گھر کیوں نہیں آئے! یہاں ٹھیرنے کی کیا ضرورت تھی"؟

بیرسٹر صاحب کے ایک دوست نے بڑے میاں کی طرف غور سے دیکھ کر پوچھا "آپ کی تعریف"؟

برخوردار صاحبزادے نے انگریزی میں جواب دیا "یہ ہمارے قدیم پڑوسی اور والد کے دوست ہیں"!

اتنے میں بڑے میاں نے ان ہی صاحب سے کہا "دیکھئے جناب یہ میرا لڑکا تعلیم کے لئے ولایت گیا تھا خدا جانے کیا ہو گیا کہ ہم سب کو بھول بھال کر یہاں ہوٹل میں آبیٹھا ہے' ماں اُدھر انتظار میں مری جارہی ہے' خدا کے لئے آپ اسے کچھ سمجھائیے"۔

یہ سن کر انھوں نے بیرسٹر صاحب کو خوب لتاڑا آخر خدا خدا کرکے ماں سے ملنے آپ گھر آئے۔

ماں بیچاری ماما کی ماری بیٹے کے دیدار کو ترس رہی تھی' جب آپ اندر آئے ماں کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے اندھی ہو رہی تھیں اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بلائیں لینی چاہیں' بڑی بی کے دونوں ہاتھ اپنے منہ کی طرف آتے دیکھ کر بیرسٹر صاحب گھبرائے کہ بڈھیا منہ نوچنا چاہتی ہے' جھٹ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر روکنا چاہا۔ جب ماں بیٹے کے ہاتھ چار ہوئے تو بڑی بی کا توازن قایم نہ رہ سکا اور وہ بیچاری چاروں خانے چت ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا گیا تو بیرسٹر صاحب قریب آئے اور پوچھا "ول امما! تم کیا ہے"!

ماں مزاج پرسی کے "یہ مہذب بول" سن کر بہت پریشان ہوئی آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ایک صاحب بہادر کھڑے ہیں سر پر تنکوں کی ٹوکری الٹی رکھی ہوئی ہے' ایک بے ڈھنگا شلوکہ زیب بدن ہے جس میں نیچے اوپر کئی تھیلیاں لگی ہیں' منہ میں موٹی سی اگربتی سلگ رہی ہے' چھلے دار دھواں نکل رہا ہے مگر اگر کی سی خوشبو نہیں' ایک سرخ دھجی نیچی اونچی گرہ دی ہوئی بل کھائی ہوئی گلے میں لپٹی ہے۔ جلدی سے بڑی بی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا۔

"ارے یہ موا کہاں سے گھس آیا' اے صاحب کیا میں ایسی بیمار ہو گئی تھی کہ بڑے ڈاکٹر کو بلوایا اور مجھ کو بے پردہ کر دیا میرا بچہ کہاں ہے"! بڑے میاں نے کہا "یہی تو تمہارا لڑکا ہے ولایت جاکر بڑا صاحب بن گیا ہے"!! ماں کی محبت کو جوش ہوا بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ ماں پوچھتی کچھ ہے اور بیرسٹر صاحب جواب کچھ دیتے ہیں! چند ہی سال میں اپنی زبان بھول گئے!! آپکے رگ و ریشہ میں مغربیت کچھ ایسی بس گئی کہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی۔ خوراک' لباس' مکان غرضکہ ہر چیز میں مغربیت رچ گئی تو کہے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے مغرب کا کلمہ پڑھنے لگے۔ دماغ میں کچھ ایسی فرعونیت سما گئی کہ ہندوستانیوں سے سیدھے منہ بات کرنا کسر شان سمجھنے لگے۔ آپ کچھ ایسے "صاحب بہادر" بن گئے کہ پانی کی جگہ کبھی "شربت ارغوانی" اور کبھی کا خذ "ٹائیلیٹ پیپر" استعمال ہونے لگا باوجود اس حد تک "یوروپین" ہونے کے سخت تعجب اور سراسر افسوس ہے کہ جاہل ہندوستانیوں نے آپکی کچھ قدر نہیں کی کیونکہ آپکی آمدنی صرف اسقدر ہوتی ہے کہ آپکے "آفس" کا کرایہ نکل جاتا ہے' دوسرے اخراجات وہی آپکے "قدیم پڑوسی" کے شرمندۂ منت ہیں۔

"باغبان"

چلی گئی

دم بھر کو وہ جو آنکھ ملاتی چلی گئی
بیتاب اور مجھ کو بناتی چلی گئی

میں ہر ادا پہ ہوش لٹاتا چلا گیا
وہ ہر قدم پہ گیت سناتی چلی گئی

دیکھا مجھے تو نیچی نگاہیں کئے ہوئے
یعنی بقدرِ ظرف پلاتی چلی گئی

میں سلسلہ سکوں کا جماتا چلا گیا
وہ کیف بن کے زیست پہ چھاتی چلی گئی

زلفوں کے بادلوں کو ہوا میں بکھیرتی
ہونٹوں سے جیسے برق گراتی چلی گئی

میں اس کو چھیڑ چھیڑ کے گاتا چلا گیا
وہ میرے سازِ دل کو بجاتی چلی گئی

آنچل کی دھاریوں کو نمایاں کئے ہوئے
طوفان رنگ و بو کا اٹھاتی چلی گئی

کھلتے گئے رموز شباب و حیات کے
یعنی وہ ہر حجاب اٹھاتی چلی گئی

میں ہوش کھو کے ہوش میں آتا چلا گیا
وہ رقص کرتی، جھومتی، گاتی چلی گئی

علی احمد

حدیثِ امروز

پھر اس کی یاد قلب کو تڑپا رہی ہے آج
پھر کائناتِ صبر لٹی جا رہی ہے آج

پھر ہو رہا ہے درہم و برہم نظامِ ہوش
پھر بےخودی سی دل پہ مرے چھا رہی ہے آج

پھر ہو رہا ہوں بزمِ جنوں میں میں باریاب!!
پھر عقل میرے سامنے تھرا رہی ہے آج

پھر ہو رہی ہے قلب میں تجدیدِ آرزو
ہر آرزو دراز ہوئی جا رہی ہے آج

وحشت نے پھر جلائے ہیں دل میں نئے چراغ
"لو" شمعِ اختیار کی تھرا رہی ہے آج

پھر نغمہ ہائے شوق چھڑے بزمِ عشق میں
ہر سانس دل کے ساز سے ٹکرا رہی ہے آج

مضطر دھڑک رہا ہے پھر اس طرح میرا دل
پہلو سے گویا اس کی صدا آ رہی ہے آج

سید خورشید حسین مضطر رضوی

سلطان محمد قلی قطب شاہ

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں
کہا جائے اما کیا جائے نا
قطب شہ نہ دو مجھ دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

یہ اشعار ایک ایسی شخصیت کے ہیں جس کا نام ہندستان کے بادشاہوں، عاشقوں اور شاعروں میں بہت عرصے تک زندہ رہے گا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اور دکن کے موجودہ دارالسلطنت حیدرآباد کا بانی تھا اور قطب شاہیہ خاندان کا پانچواں حکمراں تھا۔ اس کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ صرف اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ اس نے صرف اُردو میں تقریباً پچاس ہزار اشعار کہے اور ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی بلکہ اُردو کے علاوہ فارسی اور تلنگی میں بھی شاعری کی۔ شعر وادب میں عاشقانہ مضامین اس کی نمایاں خصوصیات ہیں اور اس کا خاص میدان، اور اس کی وجہ زیادہ تر اس کی ذاتی زندگی ہے۔ اس کے حالات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانہ اقتدار وحکومت میں حیدرآباد برندابن اور رود موسیٰ، جمنا کا کنارہ بن گیا تھا۔ جس میں اس کی حرمیں گوپیاں اور اس کی مشہور رقاصہ بھاگ متی عرف حیدر محل، رادھا کا عکس نظر آتی تھی۔ لیکن قدیم ہند کی اس مشہور روایت اور محمد قلی کی حکایت میں ایک ہی فرق تھا۔ برندابن کے شام کی بنسی پر تو رادھا اور گوپیاں موہت ہوا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں یہ رسیا راجہ پریم کی بنسی کا متوالا تھا۔ اور عشق وعاشقی کے سلسلے میں بھی اس کی طبیعت کی ہمہ گیری اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے مطابقت رکھتی تھی۔ موجودہ تالیف بھی جس میں دکن کے اس جوہر خداداد کے سوانح حیات اور اُردو اور فارسی کے نمونے شامل ہیں اس ہمہ گیر زندگی کا صحیح عکس ہے۔ قابل مرتب کا ذوق وجستجوئے علمی اس ایک بات سے ظاہر ہے کہ اس نے ہر اس کتاب کو دیکھا ہے جس میں سلطانِ مذکور کا ذرا سا بھی تذکرہ موجود تھا۔ اور ان تاریخ اور تذکرے کی بے شمار کتابوں کے علاوہ خود محمد قلی کا کلام بھی ایک خزانہ تھا جس سے اس کے ذاتی حالات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے مرتب نے تمام کتاب کے دس حصے کئے ہیں۔ پہلے حصے میں خاندانی حالات، اجداد کا تذکرہ، جشن ولادت، جشن آغاز شباب اور اوائل شباب کی صحبتوں کا بیان ہے۔ جس کے بعد تخت نشینی کا ذکر کر کے محمد قلی قطب شاہ کے طبعی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں اس کی بارہ پیاریوں کے علاوہ بھاگ متی یعنی اس مشہور رقاصہ کا ذکر بھی ہے، جس کے نام پر اس ذی شان حکمران نے حیدرآباد جیسے شہر کی بنیاد رکھی۔ اس حصے سے جہاں محمد قلی کی ابتدائی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ وہاں اس زمانے کے دکنی ہندستان کا بھی ایک لفظنہ سا آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔

دوسرے حصے میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل محمد قلی کے مذہبی میلانات اور ان کی وجہ سے اس کی جو

مخالفتیں ہوئیں ان کا تذکرہ ہے اور دوسری فصل حیدرآباد (بھاگ نگر) کے تاریخی اور جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔

تیسرے حصے میں اس زمانے کے تہواروں میں شاہی مزاج کو کہاں تک دخل تھا اور کہاں تک شاہی سرپرستی سے ان مختلف مواقع کی رونق میں اضافہ ہوتا تھا۔ ان سب باتوں کا بیان ہے۔

چوتھا حصہ ایک طرح سے تیسرے حصے سے ملحق ہے۔ اور اس کی مزید تفصیل۔ لیکن اس میں زیادہ تر مذہبی کی بجائے دوسری قسم کے تہواروں اور اجتماعات کا تذکرہ ہے نیز وقت کے رسوم اور بادشاہ کی دیگر مصروفیات کا ذکر بھی وضاحت سے کیا گیا ہے۔ جو لوگ پرانے بادشاہوں کے متعلق یہی تصور رکھتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت یا جنگ و جدال ہی تک اپنی کارفرمائیوں کو محدود رکھتے تھے، ان کے لئے کتاب کے اس حصے میں غور کا مواد موجود ہے۔ اس حصے کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ملک کی حکومت جن مختلف کارگذاریوں کی بنا پر اپنے زمانے کو پہلے زمانے سے بہتر تعبیر کرتی ہے، وہی باتیں قدیم زمانے میں بھی اپنے وقتی رنگ میں ہوا کرتی تھیں۔

پانچواں حصہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک جس قدر حالات بیان ہوئے تھے ان کا ماخذ اکثر کلام محمد قلی قطب شاہ تھا۔ لیکن اس حصے میں ان معرکہ آرائیوں کا تذکرہ ہے جن سے محمد قلی کو اپنے دور حکومت میں روبرو ہونا پڑا۔ اس حصے کے مطالعے سے ہم سلطان مذکور کی ذہنی وسعت کے بھی معترف ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ بادشاہ جو ذاتی زندگی میں ایک عاشق اور شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہے، نظم و نسق سلطنت کے سلسلے میں بھی کس قدر مختلف صورتوں سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

چھٹا حصہ بھی حکومت ہی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس بیرونی تعلقات کے علاوہ ہند و رعایا کی سرپرستی کے عنوان سے جو باتیں تحریر میں آئی ہیں وہ پرانے زمانے کی مفاہمت پسندی اور انصاف پروری کے ناقابل تردید دلائل ہیں۔ یہ وسیع القلب بادشاہ نہ صرف اپنی رعایا کے ہر فرقہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا۔ بلکہ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں کی آسایش اور آرام کا خیال بھی اپنا فرض گردانتا تھا۔

ساتویں حصے میں محمد قلی کی بیگمات اور اولاد کا تذکرہ ہے اور اسی سلسلے میں اس کی دوسری رشتہ داریوں کا بیان بھی آگیا ہے۔ اور آخر میں اس کی علالت اور وفات کا ذکر ہے۔

آٹھویں حصے میں اس کے اردو کلام کے مختلف موجودہ نسخوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے کلام کی خصوصیات کا ذکر ہے اور پھر انتخاب کلام اردو اور اسی طرح نویں حصے میں فارسی شاعری کا تذکرہ اور منتخب کلام۔

دسویں حصے میں محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کی اہم تاریخیں۔ ماخذ اور حوالے اور اشاریہ، کتاب کی ترتیب کے سلیقے کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور قاری کی آسانی اور حوالے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس کتاب کی دلچسپی میں انیس ۱۹ عکسی تصاویر ایک دلکش اضافہ ہیں۔

قابل مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مبارک و تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسی جامع

کتاب تالیف کر کے بہت عرصے تک محمد قلی کی زندگی کے محققوں کو بے کار ثابت کر دیا ہے۔ نیز کلیات محمد قلی کے لئے بھی ایک مناسب اور بیش قیمت ابتدائی مطالعہ ہمارے لئے مہیا کیا ہے جس سے کلام محمد قلی کے سمجھنے اور اسے سراہنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

امید ہے کہ ادب و شعر اور تاریخ کے شائقین اس کتاب کی پوری قدر کریں گے کیونکہ یہ ایک ایسی خیال افروز چیز ہے کہ اسے جب کبھی بھی اٹھا کر دیکھا جائے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی دکھائی دے جائے گی۔

میراجی (ادبی دنیا)

نئی کتابیں

۱۔ شمس المعارف (شاہ سلیمان مرحوم کے مکتوبات کا چوتھا حصہ) مرتبہ منظور الحق حکیم ۲۴۲ صفحات از مرتب گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہان پور

۲۔ تفہیمات حصۂ اول (مجموعہ مضامین) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۳۵۰ صفحات قیمت عہ۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور

۳۔ روسی ادب حصہ اول و دوم۔ از پروفیسر محمد مجیب ۲۰۷ صفحات قیمت للعہ۔ انجمن ترقی اُردو۔ دہلی

۴۔ فہم قرآن (قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت) مرتبہ سعید احمد۔ ۱۹۴ صفحات۔ قیمت عہ۔ ندوۃ المصنفین دہلی

۵۔ بت تراش (ڈراما) از ڈاکٹر اشتیاق حسین۔ ۴۲ صفحات قیمت ۴ر۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی

۶۔ سائنس کی روشنی میں ہندوستانی جڑی بوٹیاں از صوفی لچھمن پرشاد۔ ۲۵۰ صفحات۔ قیمت (تے) مینیجر رسالہ مستانہ جوگی۔ شاہی محلہ۔ لاہور

۷۔ رہنمائے عقاقیر (رسالہ الحکم کا خاص نمبر) جڑی بوٹیوں کے اوصاف و خواص) از حکیم غلام محی الدین چغتائی۔ صفحات ۵۸۴۔ قیمت (صہ) مینیجر رسالہ الحکم موچی دروازہ۔ لاہور

۸۔ شمیم کے نو شعر۔ از مظفر حسن شمیم۔ ۴۰ صفحات قیمت ۴ر عثمانیہ بک ڈپو۔ محمد علی بلڈنگ۔ بمبئی۔

۹۔ الہامات سلیمانی (مجموعۂ کلام سید شاہ سلیمان مرحوم) مرتبہ منظور الحق حکیم ۱۵۰ صفحات از مرتب۔ گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہاں پور

۱۰۔ ادبی تاثرات۔ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ۲۴۴ صفحات قیمت (عہ) سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد

۱۱۔ نقش ناتمام (مجموعۂ کلام) از سحر رام پوری۔ ۷ صفحات۔ قیمت (۲/۱) مرزا عباس علی بیگ۔ باغیچہ مظفر خاں۔ رام پور۔

۱۲۔ تبویب حیدری (جدید اصولوں پر کتابوں کی ترتیب) از فضل اللہ احمد بی اے۔ ۴۰ صفحات۔ قیمت ۔ حیدری گشتی کتب خانہ۔ حیدرآباد

۱۳۔ اسلامی ممالک کی سیاست۔ از عشرت حسین صدیقی۔ قیمت عہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

۱۴۔ پیام شوق۔ از پنڈت جگ موہن ناتھ ۱۸۴ صفحات۔ قیمت ۱۲ر نظامی پریس۔ بدایوں

۱۵۔ بادۂ سرجوش (مجموعۂ کلام) از پنڈت لبھو رام جوش۔ ۱۲۰ صفحات قیمت عہ۔ مرکز تصنیف و تالیف نکودر۔ جالندھر

۱۶۔ اسلامی نظام تعلیم (فن تعلیم کے متعلق علماء کے نظریے) از سید ریاست علی ندوی ۱۵۶ صفحات دار المصنفین اعظم گڑھ

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

تعلیمیاتی نفسیات

از ملک سردار علی صاحب بی اے۔ بی ٹی ریڈر جامعہ عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد

اُردو زبان میں تعلیم و تدریس کے اصولوں سے متعلق کتابوں کی بے حد کمی ہے اور ضرورت ہے کہ اس فن کے ماہرین دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب سے مستفید ہوکر اردو میں اس قسم کی کتابیں پیش کریں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نے اس کمی کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ چنانچہ ان کی تحریک سے اس کالج کے اساتذہ میں ایک طرح کی سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی انہی کی تحریک اور مشوروں سے عالم وجود میں آئی ہے۔ اس میں پچیس باب ہیں اور ہر باب میں تعلیم و تدریس کے کسی نفسیاتی پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ پڑھانے والے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ پڑھنے والوں کی نفسی خصوصیتیں کیا ہیں اور جب تک کوئی استاد اپنے طلبہ کی نفسیات سے واقف نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی تعلیم جیسا چاہیئے فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔ یہ کتاب چھ سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی ترتیب و تالیف میں مصنف نے اس فن کے ماہرین اور اساتذہ کی اکثر و بیشتر تصنیفوں سے استفادہ کیا ہے، ہر باب کے خاتمہ پر حوالے درج کر دئے گئے ہیں۔ اور جگہ جگہ ذاتی تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ زبان اور اسلوب بھی ایسا سلیس اور سادہ استعمال کیا گیا ہے کہ اکثر مدرسین اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات نے قلمبند کیا ہے اور انھوں نے اپنے اس دیباچہ میں بالکل سچ لکھا ہے کہ:۔

> معلمی کا پیشہ دوسرے پیشوں سے اشرف و اعلیٰ ہے کیونکہ معلم کا کام ملک کی نو خیز نسل کی تعلیم و تربیت ہے۔ یہ گویا ان کو ایک عمدہ قالب میں ڈھالتا ہے۔

جن اصحاب کو فن تعلیم سے کوئی تعلق ہے انھیں چاہیئے کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس کتاب میں تصویروں اور نقشوں کی کمی نظر آتی ہے اگر اس کا خیال رکھا جاتا تو پڑھنے والوں کے لئے اور بھی دلچسپی پیدا ہو سکتی تھی۔

سوگ وار شباب

از مجنوں گورکھپوری ایوان اشاعت گورکھپور۔

مجنوں گورکھپوری اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے افسانوں کے تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں انھوں نے گزشتہ آٹھ دس سال سے افسانہ نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ہے لیکن اس سے قبل ہی انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی وجہ سے وہ اردو کے اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں ان کے اکثر و بیشتر افسانے مغربی قصوں اور ناولوں سے ماخوذ ہیں اور زیر نظر افسانہ بھی مشہور انگریز ناول نگار ٹامس ہارڈی کے ایک ناول "ٹو اِن اے ٹاور" سے ماخوذ ہے۔ مجنوں صاحب ہارڈی کے خاص معتقد ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے دو ناول "ٹس آف ڈربرویل" اور "جیوڈ دی اںسکیور" انگریزی کے مشہور اور مقبول ناولوں میں سے ہیں۔

زیر نظر افسانے میں اگرچہ پلاٹ ہارڈی سے لیا گیا ہے

لیکن واقعات مقامات اور ماحول سب مجنوں صاحب نے اپنے گردوپیش کی دنیا سے لئے ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ جو اصحاب اردو میں انگریزی طرز کی کتابیں اور ترقی یافتہ ادب کے نمونے دیکھنا چاہتے ہوں وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد عال غیر مجلد عہ

یاد اقبال حصہ اوّل۔ یہ کتاب اقبال اکیڈیمی تاج پورہ لاہور کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں ہندستان کے مقتدر شعراء کی ان چالیس عقیدت مندانہ نظموں کو ایک جا کردیا گیا ہے جو علامہ سر اقبال کی وفات پر لکھی گئی تھیں۔ حسرت موہانی اور حفیظ جالندھری کی نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مجموعہ میں وہ نظمیں موجود نہیں ہیں جو علامہ اقبال کی وفات پر حیدرآباد میں مختلف جلسوں میں سنائی گئیں اور جن میں سے علی اختر، ماہر القادری، وجد میکش اور نظر کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر بعد کو مختلف رسائل میں شایع بھی ہوچکی ہیں۔ توقع ہے کہ اگر اقبال اکیڈیمی کی طرف سے یاد اقبال کا دوسرا حصہ شایع ہو تو ان نظموں کو ضرور شریک کیا جائے گا۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

تعلیمات اقبال از پروفیسر یوسف خاں سلیم چشتی بی اے (آنرز)

یہ کتاب سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈیمی کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی تعلیمات کا نچوڑ اور ان کی اسلامی خدمات کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن کتاب کا زیادہ حصہ اقبال کے کلام کے نمونوں سے معمور ہے۔ یہ کتاب بھی دیدہ زیب ہے اور تصنیفات اقبال کی وضع قطع رکھتی ہے۔ قیمت عہ

پیام حق مرتبہ سید محمد شاہ ایم اے و غلام سرور فگار اقبال اکیڈیمی کی طرف سے ایک ماہنامہ شایع ہوا کرتا ہے جس کا ایک شمارہ بابت مارچ ۱۹۴۱ء اس وقت پیش نظر ہے۔ اس میں ماہر القادری اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے مضامین اقبال کے "شاعرانہ تصورات" اور "موت اور حیات اقبال کے کلام میں" بہت اچھے مضمون ہیں۔ رسالہ کاغذ اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب اور مقاصد کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ قیمت سالانہ عال فی پرچہ ۴ر

دیر و حرم چودھری منظور احمد منظور بی اے۔ ایل ایل بی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا دیباچہ پنڈت کیفی نے لکھا ہے۔ منظور پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ہیں جن کی یہ کوشش مستحسن ہے کہ وہ اپنے جذبات اور تخیلات کو سادہ اور سلیس اردو کا جامہ پہناتے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں وہ بعض دفعہ اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کی نظمیں اردو سے زیادہ ہندی کہلانے کی مستحق ہوگئی ہیں۔ ہر کام اور ہر بات میں اعتدال کی ضرورت ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی نوجوانوں میں کمی نظر آتی ہے۔ قیمت مجلد عال غیر مجلد عہ

آفتاب رسالت یعنی آنحضرت سرور کائنات کی منظوم سیرت جس کے مصنف راؤ بہادر حاجی محمد عبد الحمید خاں صاحب منظر باغپتی ہیں حضور سرور کائنات کی زندگی کے حالات اردو نثر میں تو کئی اصحاب نے لکھے ہیں لیکن نظم میں سوائے حفیظ جالندھری کے کسی اور نے کماحقہ توجہ نہیں کی۔ اور پھر حفیظ نے بھی

صرف غزوات کا حصہ نظم کیا ہے۔ اس کے برخلاف منظر صاحب نے ولادت سے وفات تک جملہ حالات کو سلیس اور سادہ نظم کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ پوری کتاب میں نظم اور شاعری کی شان باقی ہے۔ قیمت ۸ء

رہنمائے تاریخ اردو مولفہ حاجی محمد عبدالقادر۔ اس کتاب کے عنوان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ لیکن دراصل اس کا مقصد یہ ہے کہ اُردو شعرا نے جو قطعات تاریخی لکھے یا مصرعوں میں تاریخیں نکالیں ان کا ایک مختصر سا تذکرہ پیش کردیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے۔ مصنف نے تاریخ نکالنے کے متفرق طریقوں اور اصولوں پر بڑے سلیقہ اور محنت سے روشنی ڈالی ہے۔ اور ساتھ ہی اردو کے اکثر شاعروں کی نکالی ہوئی تاریخیں اور خود شاعروں کے مختصر سے حالات بھی درج کردئے گئے ہیں۔ تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ قیمت ۱۲

تحفۂ ربیع الاوّل مولفہ ابوظفر محمد بدرالدین خاں بی اے اس کتاب میں حضور سرور کائنات کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب گیارہ حصوں میں منقسم ہے۔ اور محنت سے لکھی گئی ہے لیکن کتابت وطباعت موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔ قیمت (۸ء)

غم احباب شاد راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی دکن کے ایک مشہور کایستھ خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہونے کے علاوہ اُردو، فارسی شعر کے بڑے دلدادہ ہیں۔ زیر نظر کتاب انہی کی ان رباعیوں قطعوں اور مرثیہ کا مجموعہ ہے جو مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی وفات سے متاثر ہوکر لکھے گئے ہیں۔ عالی کو شاد سے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مرثیہ دل سے نکلا ہے اور دلوں تک پہنچتا ہے۔

بلّی حج کو چلی حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے بچوں کے مطالعہ کے لئے جو چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ کتاب ہے جس میں حکیم اللہ صدیقی بی اے نے بلّی کے حج کو جانے کا مشہور پرانا قصہ دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت ۲

فسانۂ عجائب یہ کتاب بھی حالی پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے چھپی ہے۔ یہ اصل میں رجب علی بیگ سرور کی مشہور کتاب کا خلاصہ ہے جس کو بشیر احمد انصاری صاحب بی اے نے قلمبند کیا ہے اب یہ کتاب بچوں اور طلبہ کے مطالعہ کے قابل ہوگئی ہے۔ قیمت ۳

حبشہ کا تفصیلی نقشہ حبش کی سلطنت دنیا کی ان قدیم بادشاہتوں میں سے ہے۔ جن میں سے اکثر قانون فطرت کے مطابق آج نیست و نابود ہوگئی ہیں۔ اور یہ سلطنت بھی چند سال قبل اطالیہ کے ہاتھوں ختم ہوچکی تھی۔ لیکن چند روز سے برطانیہ کی مدد سے اس کو پھر آزادی ملنے کی توقع پیدا ہوتی جارہی ہے۔ اس طرح یہ نقشہ وقت کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس کے دیکھنے سے حبشہ کے اکثر چھوٹے چھوٹے گاؤں اور پہاڑیاں اور دوسری خصوصیتیں صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنا تفصیلی نقشہ اب تک شایع نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بھی جو عبدالقادر صاحب کا مرتبہ اور خالد کمپنی دہلی کا مطبوعہ ہے۔ انگریزی ہی میں چھپایا گیا ہے۔ قیمت ۱۲

روسی ادب

حصہ اول و دوم ۔ یہ ضخیم کتاب پروفیسر محمد مجیب بی اے استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تالیف ہے جس کے بعض حصے آج سے دس سال قبل رسالہ اُردو میں شایع ہوئے تھے ۔ اس میں انقلاب سے قبل کے روسی ادب کی تاریخ پختہ کارانہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ پہلا حصہ روسی شاعری اور روسی ڈرامے پر مشتمل ہے اور دوسرے میں روسی ناول پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

بہتر ہوتا کہ مجیب صاحب اس کتاب کا ایک اور حصہ لکھ کر جدید روسی ادب کی تاریخ بھی اردو میں پیش کردیتے۔

اردو میں کچھ عرصے سے روسی ادب اور خیالات کو شوق کے ساتھ دیکھا جارہا ہے ۔ اور جو لوگ اسی اشتیاق کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے، انھیں بڑی مایوسی ہوگی کیونکہ وہ جس روسی ادب کے دلدادہ ہیں اس کا اس کتاب میں ذکر ہی نہیں ہے ۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجیب صاحب انقلابی خیالات اور تصورات کے مخالف ہیں بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

> اس کا سبب صرف میری معذوری ہے ۔ میں اس زبان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جو روس میں اچانک انقلابی تحریک کے ساتھ رائج ہوگئی اور اس زمانے کی تصانیف اصل زبان میں حاصل کرنا خاصا دشوار بھی تھا۔

لیکن بغیر جدید روسی ادب کے تذکرہ کے یہ کتاب تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتی ہے، ہمیں یقین ہے کہ مجیب صاحب وقت نکال کر اس کا تیسرا حصہ ضرور تحریر فرمادیں گے۔ ورنہ بقول ان کے جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا مایوس ہوگا۔ انھوں نے لکھا ہے :-

> سب سے زیادہ اندیشہ مجھے ان دوستوں سے ہے جنھیں روس کی قدر کرنا انقلاب کی تعلیم نے سکھایا ہے اور جنھیں صرف روسی ادب کے اس حصے سے مطلب ہے جو انقلاب کی طرح تازہ اور انقلاب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے یہ حضرت شاید اس کتاب کو ایک صریحی دھوکا سمجھیں اس لئے کہ انقلاب کے زمانہ کے نئے مصنفوں کا اس میں ذکر ہی نہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اہل ذوق کو دعوت تو دی لیکن کھانا بے نمک کھلایا ۔ ہمیں توقع ہے کہ مجیب صاحب عہد انقلاب کے روسی ادب کی تاریخ لکھ کر اس کتاب کو مکمل کردیں گے (دونوں حصوں پر قیمت درج نہیں صفحات حصہ اول ۳۸۱ حصہ دوم ۳۵۹)

ابوالحسن تاناشاہ

یہ ان مطبوعات کی ایک کڑی ہے جو خدیجہ بیگم معلمہ ماڈل پرائمری اسکول بچوں کے لئے ڈراموں کی شکل میں شایع کررہی ہیں۔ اس میں گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن قطب شاہ کی زندگی کی جھلکیں بڑی شائستگی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں ۔ اس کا مطالعہ بچوں اور بوڑھوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگا (۵۲ صفحات قیمت ۸/)

شاہ جہاں

یہ بھی ابوالحسن تاناشاہ کی طرز کا ایک ڈراما ہے جس میں جہانگیر، نور جہاں، شاہ جہاں، ممتاز محل اور آصف خاں جیسی ہستیوں کے کردار افسانوی رنگ میں پیش کئے گئے ہیں ۔ زبان اور اسلوب بھی دلچسپ ہے ۔ تاریخی مضامین کو افسانوں کی شکل میں پیش کرنے کی وجہ سے عوام میں تاریخ کا جتنا وسیع ذوق پیدا

ہوسکتا ہے کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں ۔ اور جب تک کسی علم کا ذوق پیدا نہ ہو اس سے متعلقہ بڑی بڑی محققانہ کتابیں بھی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔

خدیجہ بیگم صاحبہ کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ وہ اس طرح تاریخی ڈرامے قلمبند کرتی رہیں گی تا کہ ملک کے نونہال ان کے ذریعہ سے بچپن ہی سے اپنی قدیم تاریخ سے واقف ہوسکیں (۲۳ صفحات قیمت ۳ ر)

مسافر کی ڈائری یہ دیدہ زیب کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے چھپی ہے اس میں خواجہ عباس صاحب کے صرف پانچ مہینوں کے اس سفر کے حالات درج ہیں جو دنیا کے گرد سترہ ملکوں میں پچیس ہزار میل کی مسافت میں کیا گیا ۔

یہ کتاب اگرچہ نہ کوئی تفصیلی سفرنامہ ہے اور نہ سیاح کی ڈائری ۔ لیکن احمد عباس صاحب کو صحافت اور انشا پردازی کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل ہے ۔ انھوں نے ایک آزاد خیال سوشلسٹ نوجوان کی نظر سے تمام دنیا کا رروائی میں مطالعہ کیا اور ہر جگہ غریب مزدور اور کسان کی ہمدردی کے جذبات ان کے ساتھ رہے ۔

آزادی کے دلدادہ اور ترقی پسند نقطۂ نظر سے دنیا کی تاریخ اور حالات کو دیکھنے والے اس کتاب کو شوق سے پڑھیں گے ۔ سیاح نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا ہے اور ہر شہر اور ہر ملک کو دیکھنے کے بعد اس نے جو اثر لیا ہے اسی کو انشاء پردازانہ انداز میں قلمبند کرتا گیا ہے ۔ اس طرح سے یہ کتاب بہت دلچسپ اور اچھی ہوگئی ہے ۔ اور مصنف بھی سفرنامہ نگاری کی بہت سی ذمہ داریوں سے بچ گیا ۔ کتاب میں بعض دلچسپ تصویریں بھی ہیں ۔

(۱۹۲ صفحات قیمت عہ)

بزم مہدویہ حیدرآباد میں مہدوی اعتقاد رکھنے والے ہزاروں مسلمان آباد ہیں ۔ جن میں بڑے بڑے علماء و شعراء اور مشہور بزرگ بھی گذرے ہیں ۔ یہ مجموعہ مضامین اسی فرقہ کا ترجمان معلوم ہوتا ہے جس کو کاوش صاحب نے بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے ۔ اس میں نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بھی ایک نظم چھپی ہے ۔ دیگر مضامین نظم و نثر بھی اپنی اپنی جگہ مفید اور قابل مطالعہ ہیں۔ کاوش صاحب کو تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق حاصل ہے اور وہ اس بزم مہدویہ کی اشاعت پر قابل مبارک باد ہیں ۔ (۸۰ صفحات قیمت درج نہیں)

مقدمۂ تاریخ دکن یہ کتاب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس ۲۵ حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی ہیں اس طرح مختلف خاندانوں کے سات سو افراد اِس کتاب کے ذریعہ سے روشناس ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک بسوط اشاریہ بھی ہے ۔

کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں قدیم دور کے دکنی حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں۔ دوسرے حصے میں دور وسطیٰ کے آٹھ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے ۔ تیسرے میں دور حالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابان کرناٹک، سدھوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے ۔ ابتداء میں ایک مقدمہ ہے جو بجائے خود دکن کی ایک مختصر سی تاریخ ہے ۔ یہ کتاب پروفیسر مرزا حسین علی خاں صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے متوسط تقطیع ۴۴ صفحات قیمت (عہ)

ادارہ کی خبریں

شعبۂ سائنس

شعبہ سائنس کا ایک جلسہ ۱۲ مارچ ۴۶ء شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین:۔ ڈاکٹر حاجی غلام محمد صاحب ایم ایس سی ڈی ایس سی۔ مولوی میر حسن صاحب ایم اے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم ایس سی پی ایچ ڈی۔ معتمد

پروفیسر محمد سعید الدین صاحب ایم ایس سی نے بوجہ علالت شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

طے پایا کہ شعبہ کی جدید تنظیم کی جائے تاکہ یہ شعبہ بھی ادارہ کے دوسرے شعبوں کی طرح سرگرمی کے ساتھ مصروف رہے۔ اس سلسلہ میں شعبہ کے لئے ایک صدر کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔

(۲) آئندہ اجلاس میں جن اصحاب کو مدعو کیا جائے گا ان کی ایک فہرست مرتب کی گئی۔

(۳) طے پایا کہ مجلہ عثمانیہ کے گزشتہ شماروں میں سے ایسے مضامین کا انتخاب کیا جائے جو عام فہم سائنس سے متعلق ہوں اور جن کے مجموعے عوام کے فائدے کے لئے اس شعبے کی طرف سے مرتب کرکے شایع کئے جائیں۔ یہ کام معتمد صاحب شعبہ انجام دیں گے۔

(۴) ادارہ کی طرف سے جو اردو انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جارہا ہے۔ اس کے لئے سائنس سے متعلق موضوعوں پر اس شعبے کے ارکان سے مضامین لکھنے کی درخواست کی جائے۔

(۵) ڈاکٹر حاجی غلام محمد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ شعبے کو ایک کتاب "مسائل طبیعیات" لکھ کر بغرض اشاعت دیں گے۔

شعبۂ طلبہ

اپریل میں شعبہ طلبہ (بلدہ) کے دو جلسے ایک تعزیتی جلسہ اور دوسرا انتخابات کا جلسہ ہوا تھا جس کی روئداد گزشتہ مہینہ کے سب رس میں شایع ہوگئی اس شعبہ کی طرف سے ایک تحریری مقابلہ بہت جلد ہونے والا ہے جس کی اطلاع سب رس میں اور مقامی اخباروں میں چھپ جائے گی۔ گزشتہ بھی اس شعبہ کی جانب سے تحریری اور تقریری مقابلے ہوئے تھے جن میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ سب رس بھائیوں اور بہنوں اور اراکین اور شعبہ طلبہ کے رفقاء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس مقابلہ میں ضرور شرکت کرکے اسے کامیاب بنائیں گے۔

اس مرتبہ شعبہ کے اراکین میں کافی اضافہ ہوا۔ اس مہینہ ہمارے پاس جو درخواستیں وصول ہوئیں ان کے چند نام یہاں درج ہیں۔

محمد قطب الدین، محمد عبد الوحید، قاضی حمید الدین، عبد الصمد، سید خواجہ معین الدین ارشد، محمد عبد الباری، عمر خیام، وی۔ یم ریڈی، محمود احمد انصاری، سید خواجہ معین الدین فائز، نور الحسن انور شاہ آبادی وغیرہ۔

اس عرصہ میں شعبہ طلبہ کا قیام بعض اضلاع میں بھی ہوگیا۔ مثلاً کلیانی، گلبرگہ وغیرہ۔ گلبرگہ کی شاخ کا افتتاحی جلسہ ۲۶ خورداد ۱۳۵۵ف کو ہوا جس میں انور شاہ آبادی صاحب نے ایک تقریر کی جس میں طلبہ کو ادارہ کے کاموں اور شعبہ طلبہ کے قیام کی ضرورت کو بتلایا اور پھر سال رواں کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں اور اراکین شعبۂ طلبہ گلبرگہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ محمد نیاز علی خاں، نائب صدر محمود احمد انصاری، معتمد سید محمد نور الحسن شاہ آبادی، نائب معتمد محمد عبد المجید خاں۔

اراکین:۔ محمد اعظم خاں، عبد الرشید سہروردی، خواجہ معین الدین فائز، منظور احمد، عبد الرشید، معین الدین، عبد الحمید، خواجہ معین الدین۔

امید ہے کہ یہ شعبہ گلبرگہ میں بہت کام کرے گا اور یہ ثابت کر دکھائے گا کہ اضلاع پر بھی طلبہ ایسا ہی کام کرسکتے ہیں جیسا کہ یہاں کے طلبہ کرتے ہیں۔ انور شاہ آبادی قابل مبارکباد ہیں کہ کامیابی سے چلا رہے ہیں

کوشش کررہے ہیں۔ اس جلسہ میں اراکین شعبہ کے علاوہ اور طلبہ نے
بھی شرکت کی اور حصہ لیا۔

بہرحال ہم کو دوسرے اضلاع کے طلبہ سے امید ہے کہ وہ
بھی اپنے پاس شعبہ کے قیام کی کوشش کریں گے۔ شعبہ طلبہ (بلدہ) کے
نئے عہدہ داروں اور اراکین کو ہم مبارکباد دیتے ہوئے ان سے
یہ توقع رکھتے ہیں کہ گزشتہ کی طرح یہ بھی اپنے اس شعبہ کو
کامیابی سے چلانے کی کوشش کریں گے۔

معین الدین احمد انصاری

تحریری مقابلہ | اس مقابلہ میں اضلاع اور بلدہ
کے طلبہ حصہ لے سکتے ہیں۔ مضامین کا ۱۵ رجون ۱۹۴۱ء م
۱۰ امرداد ۱۳۵۰ف تک وصول ہوجانا ضروری ہے۔ مضمون صفحہ
کے ایک ہی جانب خوش خط لکھا ہوا ہو۔ نتیجہ کا اعلان مقامی اخبار
و سب رس میں کیا جائے گا۔ انعام میں کتابیں دی جائیں گی۔
ضروری مراسلت حسب ذیل پتہ پر معتمد شعبہ طلبہ کے نام کی جاسکتی ہے۔
عنوانات :- (۱) سائنس اور دنیا کا مستقبل (۲) ضرورت ایجاد کی
ماں ہے (۳) میرا مستقبل (۴) میرا محبوب مشغلہ۔

مرغوب الدین
معتمد شعبہ طلبہ ادارہ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد

شعبہ طلبہ (شاخ گلبرگہ) | **پہلا جلسہ** :- ۴ رمئی ۱۹۴۱ء
۴ ۱/۲ ساعت شام ایک معمولی جلسہ صدر صاحب شاخ کی صدارت میں منعقد
ہوا۔ تقریر کا عنوان "جنگ امن کے لئے ضروری ہے" تھا۔ عمر خاں
صاحب خیام محرک تھے۔ جنھوں نے اپنے موضوع سے متعلق نہایت اچھی
تقریر کی اور یہ کہا کہ بغیر جنگ کی دنیا میں امن کا تصور نہیں ہوسکتا
اور بتایا کہ جنگ و امن کا ساتھ فطری ہے۔ اس کی مخالفت منظور احمد
صاحب نے کی جنھوں نے یہ ثابت کیا کہ جنگ ایک وحشیانہ حرکت
ہے۔ ان کے علاوہ اور چند مقررین مثلاً حسرت انصاری، قطب الدین محمد،
عبدالوحید، پاٹھا سارتھی، اور عبدالقادر صاحبان نے بھی موافقت اور
مخالفت میں اچھی تقریریں کیں۔ اس کے بعد سید محمد نورالحسن معتمد
شاخ نے بھی مخالف پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور بغلبہ آراء
یہ طے پایا کہ جنگ امن کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اس طرح اس
شعبہ کا پہلا تقریری جلسہ ۶ ۱/۲ بجے شام ختم ہوا۔

دوسرا جلسہ :- ۹ رمئی ۱۹۴۱ء دوسرا جلسہ
ٹھیک ۴ ۱/۲ بجے نیاز علی خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں
افسانے، نظمیں اور مقالے سنائے گئے۔ عبدالقادر صاحب نے ایک
محققانہ مقالہ سنایا۔ جس کا عنوان "جنگ کے عالمگیر اثرات" تھا
اور چند خود ساختہ لطائف بھی سنائے۔ جن سے حاضرین بہت
لطف اندوز ہوئے۔ مہدی صاحب نے ایک معاشرتی افسانہ معتمد
صاحب نے دو نظمیں اور چند رباعیات اور معین الدین صاحب نے
چند مزاحیہ اشعار سنائے۔ صدارتی تقریر کے بعد جناب صدر نے ایک غزل
سنائی جو پسند کی گئی۔

شاخ کلیانی | محمد عطاء اللہ صاحب عطا معتمد شاخ کلیانی
نے اطلاع دی ہے کہ شاخ کا کام عمدگی سے چل رہا ہے۔ دارالمطالعہ
بازار میں شارع عام پر کھولا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر اصحاب
کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ سے استفادہ کر رہے ہیں۔ مولوی
غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر اور مولوی عبدالکریم صاحب شریک
معتمد امتحانات کے لئے امیدواروں کو تعلیم دے رہے ہیں۔
مدرسہ شبینہ میں پابندی سے تعلیم ہو رہی ہے۔ عالیجناب مولوی احمد حسین
صاحب تعلقدار و صدر شاخ کلیانی بطور خاص شاخ کی سرگرمیوں
میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

اردو کی اشاعت کے لئے چار اصحاب کی ایک ذیلی کمیٹی
تشکیل دی گئی ہے جو مواضعات کا دورہ کرکے اہل دیہات کو
اردو زبان کی اہمیت سے واقف کرانے اور امتحانات کے لئے

امیدوار فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سال حال امتحان اردو دانی میں خواتین زیادہ تعداد میں شریک ہو رہی ہیں۔

مجلس داعیان شعبہ جات

ادارۂ ادبیات اردو کے داعیان شعبہ جات کا تیسرا اجلاس پنجشنبہ ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء شام کے ساڑھے چار بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین:- ۱۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۲۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ۳۔ مولوی سید محمد صاحب ۴۔ عبدالقادر صاحب سروری ۵۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب ۶۔ مولوی معین الدین احمد انصاری۔ ۷۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ۸۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔

(۱) طے پایا کہ شعبہ طلبہ کی مجلس انتظامی کا نیا انتخاب ماہ امرداذ تک کرلیا جائے۔

(۲) شعبہ تالیف و ترجمہ و شعبہ شعرا و مصنفین کے حدود کار کے تعین سے متعلق تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اور اس تصفیہ کی توثیق کی گئی کہ شعبہ شعرا و مصنفین دکن میں صرف دکن کے شاعروں اور ادیبوں کی طبع زاد کتابوں اور دکنی ادب کی تاریخ و تحقیق سے متعلق کام انجام پائے گا۔

(۳) شعبہ سائنس اور شعبہ اطفال سے متعلق معتمد عمومی نے بتایا کہ کام کی رفتار دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں سست ہے۔ اس بارے میں تصفیہ پایا کہ معتمد عمومی شعبوں کے معتمدین اور اراکین سے تبادلۂ خیال کرکے اس کے اعضا میں ضروری تبدیلی کا مشورہ دے۔

(۴) طے پایا کہ اس مجلس کے جلسے سال میں دو بار ہوں تو مناسب ہے۔

(۵) پروفیسر سروری صاحب نے شعبہ تنقید کی معتمدی سے معذرت چاہی کیونکہ وہ شعبہ امتحانات کی معتمدی میں زیادہ مصروف ہیں۔ اس لئے اس مجلس نے سفارش کی کہ یہ کام نواب میر سعادت علی صاحب رضوی کے سپرد کیا جائے۔ اور صاحب موصوف نے اس خدمت کو قبول کرلیا۔ پروفیسر سروری صاحب اس شعبہ کے رکن رہیں گے۔

مجلس رفقاء

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس رفقاء کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۴۱ء دفتر ادارہ میں شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا۔

حاضرین:- ۱۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۲۔ مولوی سید محمد صاحب۔ ۳۔ نواب میر سعادت علی صاحب ۴۔ مولوی میر حسن صاحب ۵۔ مولوی مخدوم محی الدین صاحب ۶۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ۷۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ۸۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ۹۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب۔ نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر، بیرسٹر، مہندر راج صاحب سکسینہ۔ صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب میکش نے شرکت سے معذرت کی اطلاع دی اور مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری نے وقت سے کچھ قبل تشریف لاکر بوجہ مصروفیت خانگی شرکت سے معافی چاہی۔

حسب ذیل امور طے پائے۔

(۱) ایسے اصحاب ادارہ کے رفیق باقی نہیں رہیں گے جو۔

الف۔ ادارے کی نیک نامی اور اس کے اغراض و مقاصد کے خلاف عمل پیرا ہوں اور جس کی بنا پر مجلس رفقاء ان کی علحدگی کی تحریک کرے گی۔

ب۔ خود اس سے دست بردار ہونا چاہیں۔

(۲) ادارہ کے معتمد عمومی نے اس اجلاس کے انعقاد کے مقاصد

بیان کئے کہ

الف۔ رفقاء کے آپس میں تبادلۂ خیال اور تعاون عمل پیدا ہو۔

ب۔ رفقاء ادارے کے علمی و ادبی کاموں میں مشورہ دیں۔

ج۔ انسائیکلوپیڈیا کے کام میں رفقاء سے اعانت کی استدعا کی جائے۔

(۳) محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی یہ تحریک باتفاق آراء منظور کی گئی۔

"میں تحریک کرتی ہوں کہ بشیر النساء بیگم صاحبہ و رابعہ بیگم صاحبہ کے نام مجلس رفقاء کی رکنیت کے لئے مجلس موسسین میں پیش کئے جائیں کیونکہ ہر دو کو ادارہ اور ادارے کے کاموں سے بیحد دلچسپی ہے۔"

(۴) مولوی مخدوم محی الدین صاحب کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کو جن موضوعات پر کتابیں لکھوانی یا مرتب کروانی ہوں یا وہ جن کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ ان کے متعلق اگر رفقاء سے بھی فہرست طلب کرے تو مناسب ہے۔

(۵) طے پایا کہ مجلس رفقاء سال میں کم از کم دو مرتبہ منعقد ہو۔

(۶) مولوی مخدوم محی الدین صاحب کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ رسالہ سب رس کے مضامین کے معیار میں اضافہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور اس بارے میں رفقاء سے مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

(۷) انسائیکلوپیڈیا کے لئے رفقاء نے ہر طرح کی امداد کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔

(۸) طے پایا کہ اس مجلس کی رائے میں ادارے کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے اگر سال بھر کی بہترین اردو نظموں اور افسانوں کے مجموعے منتخب کرا کے شایع کئے جائیں تو بہتر ہے۔

مجلس موسسین

ادارہ کی مجلس موسسین کا ایک جلسہ ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین :- پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

گزشتہ جلسہ کی روئداد کی توثیق کے بعد ادارہ کے دستور کے بقیہ کی آخری خواندگی عمل میں آئی اور اس کو چند اضافوں کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

(۲) طے پایا کہ مجلس رفقاء و مجلس و اعیان شعبہ جات کے جلسے آیندہ ہفتے میں منعقد کئے جائیں۔

(۳) پروفیسر صدیقی صاحب نے تحریک کی کہ ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب اور مولوی فیض محمد صاحب صدیقی چونکہ ادارے کے شعبوں کے معتمدین کی حیثیت سے خاص طور پر ادارے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس لئے ان کو ادارے کا رفیق منتخب کرنے کی مجلس انتظامی میں سفارش کی جائے۔ پروفیسر سروری صاحب کی تائید سے یہ تحریک منظور کی گئی۔

مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۱ء شام کے ساڑھے چار بجے منعقد ہوا۔ مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس نے صدارت اور حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔ مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے بی ایس سی آنرز۔ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور (معتمد)

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری ایچ سی ایس اور مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے نے بذریعہ ٹیلیفون اور مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے نے بذریعہ تحریر شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

(۱) معتمد نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی جس کی توثیق کی گئی۔ اس روئداد سے متعلق اس اثنا میں جو کام ہوئے ان سے مجلس کو مطلع کیا گیا۔

(۲) جلسہ کے آغاز سے قبل جناب صدر کی تحریک سے سر شاہ محمد سلیمان کی وفات پر حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

> ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی ہندوستان کی مایہ ناز شخصیت اور اردو کے صاحب ذوق محسن سر شاہ محمد سلیمان کی وفات پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے۔ اور ان کی بے وقت موت کو اردو زبان و ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتی ہے۔

(۳) نائب صدر کی منظورہ اور گشتی کارروائیوں کی توثیق کی گئی۔

(۴) ادارہ کے شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا، شعبۂ تالیف و ترجمہ شعبۂ سائنس اور شعبۂ شعراء و مصنفین دکن اور مجلس موسسین رفقاء اور مجلس داعیان شعبہ جات کی تجویزیں برائے توثیق و تصفیہ پیش ہوئیں اور ان کے متعلق بعد غور و فکر ضروری تصفیے کئے گئے۔

(۵) طے پایا کہ مولوی سید محمد اعظم صاحب سے شعبۂ سائنس کی صدارت اور مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ایم اے سے شعبۂ تنقید کی معتمدی قبول کرنے کی استدعا کی جائے۔

(۶) طے پایا کہ جلال الدین توفیق اور لقمان الدولہ دل کی قبروں کے علاوہ غلام مصطفیٰ ذہین کی قبر پر بھی شعبۂ شعراء و مصنفین دکن کی طرف سے کتبہ لگایا جائے۔

(۷) مجلس موسسین و مجلس شعبۂ نسواں کی تحریک پر ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب معتمد شعبۂ زبان۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی معتمد شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا۔ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں۔ اور محترمہ بشیرالنساء بیگم صاحبہ کو ادارہ کا رفیق منتخب کیا گیا۔

(۸) جناب صدر کی یہ تحریک منظور کی گئی کہ محترمہ سروجنی نائیڈو کو بھی ادارہ کا رفیق بننے کی دعوت دی جائے

(۹) بلارم۔ کلپاک اور کپل میں ادارہ کی شاخوں کے قیام سے متعلق جو کارروائی کی جا رہی ہے اس کی توثیق کی گئی۔

(۱۰) ادارہ کے دستور کی خواندگی عمل میں آئی اور اس کو بعد ترمیم منظور کیا گیا۔

اردو امتحانات کے مرکز اور روانگی فیس و درخواست شرکت امتحان کی تاریخ

سالحال ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات

(اردو عالم، اردو فاضل، اردو دانی، خوشنویسی، اور خطاطی و کتابت) کے مرکز (زنانہ و مردانہ) بلدہ حیدرآباد کے علاوہ گلبرگہ۔ پربھنی۔ کلیانی۔ کشتگی۔ کاماریڈی۔ نرسی تعلقہ ہنگولی۔ خانہ پور گدوال۔ اور کپل وغیرہ مقامات پر مقرر ہو رہے ہیں۔ دوسرے مقامات مثلاً اورنگ آباد۔ بیدر۔ ورنگل۔ محبوب نگر۔ میدک اور عثمان آباد میں جو اصحاب ان امتحانات کا کام کر رہے ہیں، وہ جلد دفتر ادارہ کو مطلع کریں تاکہ وہاں بھی مرکز قایم کرنے کے

مکانات پر غور کیا جائے۔

یہ امتحانات ۱۵-۱۶ اور ۱۷ مہر ۱۳۵۰ف کو ہوں گے اور شرکت امتحان کی درخواستیں اور فیس ۱۰ امرداد ۱۳۵۰ف تک وصول ہونی چاہئیں۔

(معتمد اردو امتحانات)

امتحانات کی تقریریں

ادارے کے امتحانات کے سلسلے میں امیدواروں کے استفادے کے لئے ادارہ کی طرف سے کوہ پریٹو ہال توپ کا سانچہ میں ہر جمعہ کو شام میں ۶ بجے ایک ایک ماہر فن سے تقریر کرائی جاتی ہے چنانچہ اب تک حسب ذیل اصحاب نے تقریریں کی ہیں۔

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور۔ اردو ادب کا قدیم دور
(۲) مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ اردو ادب کا درمیانی دور
(۳) مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ جدید اردو ادب
(۴) مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔ اردو کے ڈرامے
(۵) مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ اجتماعی زندگی
(۶) مولوی میرزا سرعلی صاحب ایم اے۔ معاشیات کے ابتدائی مسائل
(۷) مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ۔ روزمرہ کی سائنس
(۸) مولوی صلاح الدین صاحب ایم اے۔ جذبات و حسیات
(۹) مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے۔ ادبی تنقید

آیندہ حسب تفصیل ذیل تقریریں ہوں گی۔ امید ہے کہ اہل ذوق اصحاب شرکت فرمائیں گے۔

(۱) اردو کے عناصر اربعہ۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔ ۳۰ مئی م ۲۵ ارتیر
(۲) فن شعر۔ مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے۔ ۶ جون م یکم امرداد
(۳) " " " " " " " ۱۳ جون م ۸ " "
(۴) " " " " " " " ۲۰ جون م ۱۵ " "
(۵) آج کل کے ادبی رجحانات۔ مولوی میر حسن صاحب ایم اے۔ ۲۷ جون م ۲۲ امرداد
(۶) اردو کے ناول اور افسانے۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ ۴ جولائی م ۲۹ امرداد

اردو انسائیکلوپیڈیا

کام کی رفتار

سہولت کار کی خاطر اردو انسائیکلوپیڈیا کو مختلف علوم و فنون کے شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے علماء و فضلاء کی نگرانی اور مختلف انسائیکلوپیڈیا اور دیگر حوالہ کی مستند کتابوں کی مدد سے اشاریہ مرتب کرنے کا کام جو کئی مہینوں سے جاری تھا اب بفضلہ مکمل ہوا۔ فی الحال مختلف علوم و فنون کے تیس اور چالیس ہزار کے درمیان الفاظ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کے پورے کارڈ بھی لکھے جا چکے ہیں اور ان پر نظر ثانی بھی ہو رہی ہے۔

معاونین کی ایک مختصر سی فہرست گزشتہ ماہ سب رس کے علاوہ بہت سے ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکی ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہم نے علماء و فضلاء سے قلمی اعانت کی جو درخواست اس اعلان کے ذریعہ سے کی تھی وہ رائیگاں نہ گئی اور متعدد اہل علم حضرات نے اشتراک عمل کی فوراً ہی خواہش کی۔

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

دہلی کا مشہور رسالہ "ساقی" مئی کے اداریہ میں لکھتا ہے۔

"ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن اردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔۔۔۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کئی جلدوں میں شائع کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ ملک کے مشہور ماہرین فن اور باکمال اساتذہ کی مستقل خدمات حاصل کی جا چکی ہیں۔۔۔"

لکھنؤ کا موقر جریدہ "صدق" لکھتا ہے :۔

"اردو انسائیکلوپیڈیا کا ذکر ایک بار قبل بھی ان صفحات میں آچکا ہے۔ اب تجویز محض تجویز نہیں رہی بلکہ ادارہ ادبیات کے باہمت و مستعد کارکنوں کی سرگرمیاں اپنا کام شروع کر چکی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدیر "معارف" جو اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ اسلامیات پر کام کر رہے ہیں اپنے ایک تازہ خط میں لکھتے ہیں :۔

"مجھے آپ کی اس تجویز سے اس لئے بھی مسرت ہے کہ ۱۹۱۶ء میں سب سے پہلی دفعہ یہ تجویز ہم ہی نے پیش کی تھی۔۔۔۔۔ اس اہم کام کے لئے حیدر آباد اصلی مقام ہے جہاں امراء کی سرپرستی اور علم کی دولت دونوں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کی توجہ اور آپ صاحبان کی ہمت سے یہ کام بآسانی انجام پاسکتا ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے جو مدد ممکن ہو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔۔۔۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ، ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی ایم ایس سی، پی ایچ ڈی کی مرتب کردہ معاشی مضامین کی فہرست پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"میں نے ڈاکٹر اقبال صاحب کی مرتب کی ہوئی فہرست مضامین کو دیکھا بہت اچھی ہے۔ ان عنوانات پر اردو انسائیکلوپیڈیا میں اچھے مستند مضامین شامل ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ معاشیات کے اہم مضامین آگئے۔"

مولوی مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے پروفیسر اردو لکھنؤ یونیورسٹی اردو ادب کے بعض شعبوں میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اردو انسائیکلوپیڈیا کے سلسلہ میں جو خدمت آپ نے میرے متعلق کی ہے اس کو انجام دینے کے لئے میں بخوشی تیار ہوں۔۔۔۔۔"

بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر معاشیات ڈاکٹر احمد مختار اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ معاشیات کی قلمی اعانت کا وعدہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"آپ نے ڈاکٹر انور اقبال صاحب کی مرتب کی ہوئی معاشیات کی فہرست میرے ہاں بھیجی وصول ہوئی۔ میرا تبادلہ احمد آباد سے اندھیری کالج ہوگیا ہے اس لئے میں ذرا عجلت میں ہوں جب میں بمبئی میں قدم جما سکوں گا تو یقیناً آپ کی اعانت کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔"

پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد باقر صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ انسائیکلوپیڈیا کی کامیابی کے متعلق امید ظاہر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو اس میں ضرور کامیاب ہوں گے اور اس کوشش میں میں کسی طرح خدمت کر سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

پنجاب کے مشہور اخبار "نوائے وقت" لاہور کے ایڈیٹر مولوی حمید نظامی صاحب ایم اے تحریر فرماتے ہیں۔

"اگر آپ مجھے رفیق کی حیثیت سے خدمت کا موقع دیں تو جو خدمت مجھ سے ہو سکے خوشی سے بجا لاؤں گا۔۔۔۔"

ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی (کیمبرج) پرنسپل ایم اے او کالج، امرتسر ادبیات اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں اشتراک عمل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"...آپ کا ارادہ بہت مبارک ہے۔ آپ
لوگوں سے اردو داں ایک خاص طرح کی توقع
رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ عمل
ان توقعات میں اضافہ کرے گا......"

اخبار و رسائل کے تبصرے اور مشاہیر علماء کے آراء جو اوپر شایع کئے گئے ان کو مشتی نمونہ از خروارے سمجھنا چاہیے کیونکہ دفتر میں اس قسم کے تبصرے اور آراء کافی سے زیادہ وصول ہو چکے ہیں اور آئے دن وصول ہوتے ہی جا رہے ہیں جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان بھر کے علم دوست اصحاب ہماری اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بطیب خاطر آمادہ ہیں اور انشاء اللہ اشتراک عمل اور جوش تعاون کا یہی حال رہا تو کل کا ہوتا کام آج ہی مکمل ہو جائے گا۔

انوار | ادارہ کی ایک کتاب انوار پر رائیں

مولوی علی اختر صاحب کی غزلوں اور مختصر نظموں کا یہ مجموعہ ایک نظر نواز صورت میں شایع ہوا ہے۔ اختر ایک جانے پہچانے شاعر ہیں اور محفل سخن میں ان کا مرتبہ پیشہ ور شعرائے کرام سے بہت زیادہ بلند ہے۔ وہ سوچتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ چونکہ زندگی کے کوائف سے آشنا ہیں اور طبیعت شاعر پائی ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں اثر ہے۔ چونکہ وہ زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں اس لئے ان کے تغزل سے عام طور پر لوگ آشنا نہیں ہیں۔ لیکن ہم جو رائج الوقت شاعری سے بہت دور بھاگنے والے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ہم اب بھی غزل ہی کو شاعری کی روح سمجھتے ہیں اور اس لئے شاعر کے معیار فکر کو اس کے تغزل ہی سے جانچتے ہیں۔ جدید ادبیات اور شاعری کی جو بد نظمی تمام ملک میں رونما ہے اس نے شاعر ملک اور دیوان کو کے اندر خیالات کی بلندی کو شاندار الفاظ اور ترکیبات کی نشست میں کچھ اس طرح فنا کر دیا ہے کہ آج کل کا شاعر بھی اخبار نویس کی طرح سوچتا کم اور لکھتا زیادہ ہے۔ حضرت علی اختر کا کلام اس عیب سے پاک ہے اور وہ ہر رنگ میں جو کچھ لکھتے ہیں صرف اپنے دیوان کی ضخامت میں اضافہ کرنے کے لئے نہیں لکھتے۔ ان کی زندگی اس لحاظ سے بھی شاعرانہ ہے کہ وہ فکر معاش سے فارغ نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری پر تفریح طبع کا گمان بیجا ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں تو اپنی طبیعت کے تقاضہ سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں۔ یہی چیز عین شاعری ہے۔ اس مجموعے کی بعض غزلوں میں نظموں کا رنگ پیدا ہو گیا ہے اور بعض مقامات پر الفاظ کی روانی محاورات سے بے پروا ہو گئی ہے لیکن نظر کی گہرائی اور زبان کا لطف ہر صفحہ پر موجود ہے۔ ہم شاعر کی شاعری کو صرف عروض کے قاعدوں اور محاوروں اور استعارات کی بندشوں سے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ شاعری کا یہ صرف لباس ہے روح نہیں ہے اصل چیز شاعر کی فکر اور اس کا جذبۂ بے اختیار ہے۔ اس لئے یہ ظلم ہے اگر شاعر کے ہر شعر کو اس کانٹے اور ترازو میں تولا جائے۔ حضرت اختر اپنے رنگ میں بہت پختہ کار ہیں۔ اور ان کے کلام کی اشاعت ہماری ادبیات میں اچھا اور نظر نواز اضافہ ہے۔"

پیام
۲ر مئی ۱۹۴۱ء

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

نشان ڈاک آصفیہ ۱۵۴
نشان ڈاک برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد (۴) | جولائی سنہ ۱۹۴۱ء | شمارہ (۷)

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

یہ خبر علمی حلقوں میں نہایت مسرت سے سنی جائے گی کہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں اردو کا پہلا دیوان یعنی کلیات محمد قلی قطب شاہ شایع ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

یہ ایک نہایت ضخیم مجلد اور باتصویر کتاب ہے جو تقریباً ایک ہزار ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے دس سال کی مسلسل سعی و تلاش اور اعلیٰ تحقیق و ترتیب کے بعد اشاعت کے قابل بنایا ہے۔

اس میں ہر صنف سخن یعنی غزل، قصیدہ، رُباعی، مرثیہ، ریختی، مثنوی وغیرہ کے وافر نمونے ہیں جن میں غزلوں کیلئے تین سو اور مختلف نظموں کے لئے سوا تین سو صفحات وقف ہیں۔ اردو کے کسی شاعر کا دیوان اس اہتمام اور شان سے نہیں شایع ہوا تھا۔ جو لوگ اردو ادب کی تاریخ اور شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

ہز اکسلنسی رائٹ انریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر، صدر اعظم و سرپرست ادارۂ ادبیات اردو
ادارہ کے مختلف شعبوں کا معاینہ فرما رہے ہیں

(تصویر نمبر ۱) ادارہ کی گذشتہ دس سال کی (۵۰) مطبوعات جو نواب مرزا سیف علی خان صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ کے اجلاس میں آراستہ ہیں ۔

(۲)
تاریخی و ادبی اہمیت کی تصاویر کی نمایش گاہ میں صدر اعظم بہادر تاریخی تصویروں اور گروپوں کا شوق سے ملاحظہ کر رہے ہیں ۔

(۳)
ادارہ کے مرتبہ ان نقشوں کا معاینہ جن میں حیدرآباد میں اردو بولنے والوں کا تناسب، دنیا کی جملہ زبانوں سے اردو کا تعلق، اور ادارے کے شعبوں کی تقسیم کار وغیرہ درج ہے ۔

(۱)

(۲)

(۴)

ادارے کے شعبۂ نسوان کے کمرے میں ہندستان کے اس نقشے کا معائنہ جس میں اردو کے آغاز و ارتقا اور مختلف مرکزوں کو تاریخی اندراج کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

(۵)

ادارے کے ہال میں زیر ترتیب اردو انسائیکلوپیڈیا کے کام اور قدیم قلمی نسخوں اور مرقعوں کا معائنہ۔

(۵)

(۴)

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

سرپناتھ کا کتبہ

اکثر مقامات کے جغرافیائی حالات کے معلوم کرنے کا مجھ کو شوق رہا ہے اور اس تجسس میں سروے آف انڈیا کے نقشہ جات عموماً میرے نصب العین رہتے ہیں۔ مستقر تعلقہ کنٹر ضلع اورنگ آباد کے اطراف بہت سے پہاڑی سلسلے ہیں مگر ان میں سے ایک پہاڑ سرپناتھ نامی کنٹر سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جس کی بلندی سطح سمندر سے (۳۱۴۴) فیٹ ہے۔ چونکہ یہ پہاڑ ہماری ریاست ابدمدت کے پہاڑی مقامات میں سب سے بلندترین ہے اس لئے مجھ کو اس کے دیکھنے کا شوق ہوا بتقریب دورہ مستقر کنٹر گیا ہوا تھا۔ ۳ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء کی صبح کو میں نے اس کا ارادہ کیا۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا قریہ "ریل" کنٹر کے رخ میں ہے اور ایک دوسرا قریہ "ناوڑی" کنٹر چالیس گاؤں کی سڑک کے جانب واقع ہے۔

اس پہاڑ کے دو حصے بیضوی شکل میں ایک متصل خط کے ذریعے ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں جنوبی پہاڑ وہ ہے جس کے اوپر ٹرگنامیٹیکل سروے اسٹیشن (۳۱۴۴) فیٹ قایم ہے۔ دوسرا پہاڑ جو شمال میں واقع ہے اس کی بلندی تقریباً (۲۹۰۰) فیٹ ہے۔ ان پہاڑوں کے اوپر جانے کے لئے کوئی ٹھیک راستہ نہیں ہے۔ چرائی کے لئے جانوروں کے چڑھنے اترنے کے کچھ نشانات ملتے ہیں اور ان کے ذریعہ موضع ناوڑی کے رخ سے میں پہلے چھوٹے پہاڑی حصہ پر چڑھا اس پہاڑ کی چوٹی سے ۳۰۔۴۰ فیٹ نیچے چٹان میں کاٹی ہوئی ایک ٹاکی ملی جو اس وقت خشک تھی اور معلوم ہوا کہ بارش اور جاڑے میں اس میں پانی کا کافی ذخیرہ رہتا ہے۔ اس پہاڑ کی عین چوٹی پر جانے کے بعد ایک تعمیر ۶×۶ فیٹ اور ۸ فیٹ بلند ملی جس کے شمال اور جنوب کی دیواروں پر ایک کمانی چھت قایم ہے۔ مشرقی رخ بالکل کھلا ہوا ہے اور مغرب کی جانب کی دیوار جو کسی زمانہ میں پوری بند ہوگی اس کا بالائی حصہ گر چکا ہے اور صرف ڈیڑھ دو فیٹ دیوار نیچے باقی رہ گئی ہے یہ تعمیر چونے اور پتھر کی ہے۔ میں اس تعمیر کی نوعیت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ اس میں ایک پتھر ڈیڑھ فیٹ طویل اور چھ فیٹ عریض پڑا ہوا نظر آیا جس پر سرخ گیرو کے دل جمے ہوئے تھے اور اس کے اطراف ناریل کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اطراف کے مواضعات کے بھیل اس پتھر کی نسبت حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور اس پر گیرو چڑھاتے اور ناریل پھوڑتے ہیں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ یہ پتھر اب تک محفوظ رہ سکا۔ غور سے دیکھنے پر اس پتھر پر ابھرے ہوئے عربی حروف میں ایک تحریر نظر آئی۔ گیرو کے رنگ کو صاف کر کے اس عبارت کو پڑھا گیا تو پارۂ تبارک (۲۹) کے سورۂ جن کی آیت ذیل برآمد ہوئی۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝

اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں سو مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو۔

چونکہ اس آیت میں مساجد کا ذکر ہے اس لئے میں قیاس کرتا ہوں کہ یہ چھوٹی سی عمارت ایک مسجد کی ہے جس کا یہ کتبہ ہے۔ اور اس عمارت سے قریب نیچے جو پانی کی ٹاکی ہے وہ بھی مسجد کے مصلیوں کی سہولت کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں میں نے اس آیت کے حروف کے ہندسے بھی جمع کئے تو ان کی میزان (۱۰۴۳) برآمد ہوئی اور بلحاظ سنہ ہجری نبوی تین سو سال قبل کی یہ تعمیر قرار پاتی ہے۔

اس پہاڑ سے ملا ہوا دوسرا پہاڑ ہے اور دونوں کے درمیان تقریباً دو فرلانگ کا پتلا راستہ سڑک کی طرح چلا گیا ہے۔ اور اس دوسرے پہاڑ کی بلندی پر ایک مختصر مرتفع سطح سو گز قطر کی ہوگی۔ اور اس کے وسط میں ٹرگنا میٹیکل اسٹیشن کا بنایا ہوا پتھروں کا چبوترہ ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے (۳۱۴۴) بتائی گئی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور دلچسپ تاریخی واقعہ ظاہر ہوا۔ اس پہاڑ کا نام سرپناتھ ہے اور تاریخ دکن مولفہ نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی و نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے صفحہ (۲۹) کا اقتباس یہ ہے کہ :-

"جب اجودھیا سے جلاوطن ہونیکے بعد رام اور ان کی پیاری بیوی سیتا ڈنڈا کے جنگل میں پہنچے اور کچھ مدت تک یہاں پھرنے کے بعد ان کا قیام پنچوٹی (ناسک) میں ہوا تو رام پر ایک راکش عورت جس کا نام سرپانکا تھا دل و جان سے عاشق ہوگئی اور اس نے سیتا کو اپنے سوتیا جلاپے سے ہلاک کرنا چاہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سرپانکا کی سکونت سرپاناتھ پہاڑ پر تھی جو کنڑ ضلع اورنگ آباد کے قریب ہے۔"

ایک تاریخی واقعہ کے ساتھ ساتھ اتفاقاً میں نے ایک خبر بھی سنی کہ اس بڑے پہاڑ کے کسی سمت میں ایک غار ایلورہ وغیرہ کی طرح دیکھا گیا ہے۔ اطراف کے بھیلوں اور رعایا سے اس غار کے متعلق دریافت کرنے میں دو روز نہایت دلچسپ گزرے۔ ایک دوکان دار نے اولاً اس غار کو دیکھنے کا اقبال کیا لیکن جب تحقیق شروع ہوئی تو مختلف طرح سے پہلو تہی کرنے لگا اور بالآخر اس کی صداقت مشتبہ پائی گئی۔ بھیلوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اس تاریخی واقعہ اور اس مقامی روایت نے ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا مگر اصلیت کے متعلق اطمینان نہ ہونیکی وجہ سے میں نے دوبارہ زحمت گوارا نہیں کی۔

تلوار کا نغمہ

نغمے مستور جو تلوار کی جھنکار میں ہیں
وہ نہ بربط، نہ مرے دکھ بھرے اشعار میں ہیں

لب ساحل کا سکوں موت ہے دیوانوں کی
وہی اچھے ہیں جو الجھے ہوئے منجدھار میں ہیں

جن کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر کی باگ
بے خطر سوئے ہوئے قصر طلاکار میں ہیں

جن ارادوں پہ ہے جمہور کی قوت کا مدار
وہ اناالحق میں نہ پنہاں رسن و دار میں ہیں

پھونک ڈالیں گے یہ باطل کی صفیں اک پل میں
مضطرب ایسے شرارے مری للکار میں ہیں

دیکھنے والے نہیں ہیں، ترے جلوے ورنہ
وسعت دشت میں ہیں، رفعت کہسار میں ہیں

یہی قانون ازل سے ہے جہاں میں جاری
ساتھ پھولوں کے اگر خار بھی گلزار میں ہیں

ان کی جھنکار سے بے کار ہے سارا گلشن
چند اژدر تہ رے سینچے ہوئے اشجار میں ہیں

اک ذرا ان کو بھڑکنے کا اشارا کر دے
کچھ شرر زندہ ابھی راکھ کے انبار میں ہیں

احمد ندیم قاسمی

فریسہ کے نام

اچھی فریسہ

یہ باتیں تم سمجھ نہ سکوگی ـــ ابھی تمھیں سمجھنا بھی نہیں چاہیئے ـــ زندگی کی یہ پہلی فرصت جس کو بچپن کہتے ہیں تلخ بنانے کے لئے نہیں ہے۔ تم ابھی فرشتوں کا تبسم ہو۔ انسان کے مجروح قہقہوں کو نہ سنو ـــ لیکن جب تمھیں معلوم ہوگا کہ دنیا صرف "ہنسنے کھیلنے" کی جگہ نہیں تو تم میری ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔

ایک بچہ کا حال کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے مستقبل ہے۔ میں حال کے لئے "کھلونا" نہیں دیتا مستقبل کیلئے ایک تحفہ دیتا ہوں اور اس تحفہ کا نام ہے:۔

"آوازِ حیات"

یہ نہ سن کب تک تبسم آفریں ہے کائنات
یہ نہ سن کس تلخ مستقبل کو کہتے ہیں حیات

تو ابھی معصوم امیدوں کے گہوارے میں ہے ... ایک نامعلوم سی دنیا کے نظارے میں ہے
یہ تبسم یہ اشارے یہ ادھوری گفتگو ... تیری دنیا آب و گل میں بھی ہے بزمِ رنگ و بو
تیرے رخ پر ہے خزاں ناآشنا پھولوں کا رنگ ... کھیل ہے تیرے لئے اب تک یہ خیر و شر کی جنگ

ہنستے ہنستے جانے پھر کس بات پر روتی ہے تو
کیا نظر آتا ہے جو بے تاب سی ہوتی ہے تو
میں سمجھتا ہوں کہ تو سنتی ہے آوازِ حیات
تجھ پہ کھل جاتے ہیں دم بھر کے لئے رازِ حیات
رات کی پرچھائیاں بہتی ہیں دن کی دھوپ میں
تجھ کو یہ دنیا نظر آتی ہے اصلی روپ میں

تیری دنیا رات میں جیسے ستاروں کی چمک ... میری دنیا خار و خس پر جیسے شعلہ کی چمک
تیری دنیا رقصِ انجم چاند کی کرنوں کا راگ ... میری دنیا سوزِ ہستی میری دنیا دل کی آگ

ے مولوی میر حسن صاحب کی ایک سالہ دختر کا نام جس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر صاحبزادہ میکش نے یہ نظم لکھی ہے۔

تیری دنیا فکر سے محروم دنیا کا شباب
میری دنیا سرگرانی میری دنیا اضطراب

تیری دنیا شمعِ روشن تیری دنیا مہر و ماہ
میری دنیا کی جبیں پر ہر شکن داغِ سیاہ

تیری دنیا ایک فردوسِ مکمل کی جھلک
میری دنیا میں اسی دنیا کے کانٹوں کی کھٹک

تیری دنیا اک تجلی تیری دنیا اک نمود
میری دنیا قطرۂ شبنم میں عکسِ ہست و بود

تو مگر مجبور ہیں پامالِ جبر و اختیار
تیری دنیا اک قدم اور میری دنیا رہ گزار
تیری کلیوں کی دبی آواز پابندِ بہار
میرے طوفانوں کی دھڑکن گردشِ لیل و نہار
تیری آنکھوں کی چمک ناآشنائے بیش و کم
میری آنکھیں آنسوؤں کی شعلہ دامانی سے نم

تیری دنیا اک سکون اور میری دنیا ناشکیب
تیری دنیا اک کھلونا میری دنیا اک فریب

تیری یہ دنیا مگر کھو جائے گی کھو جائے گی
تیری دنیا اک نئی دنیا میں گم ہو جائے گی
ہر قدم پر اک نئی دنیا بنانا ہے تجھے
اپنی دنیا سے مری دنیا میں آنا ہے تجھے
زندگی بچپن کو ٹھکراتی ہے جینے کے لئے
دم بہ دم طوفان اٹھتے ہیں سفینے کے لئے
اس جہنم کو اگر جنت بنا سکتی ہے تو
زندگی کے ہر قدم پر مسکرا سکتی ہے تو

میکش

تنقید و تبصرہ

ہفت اورنگ یہ کتاب اقبال انصاری صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی کے ان سات مقالوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بی اے آنرز کی تعلیم کے دوران میں فارسی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر لکھے تھے۔ یہ اصل میں ان کے اکیس مقالوں کی پہلی قسط ہے۔ اس میں زردشت۔ فردوسی۔ طوسی۔ جہار مقالۂ نظامی۔ لسان الغیب۔ شیخ علی حزیں کے علاوہ ایران میں ادب و شاعری اور صوفیانہ لٹریچر جیسے موضوعوں پر تحقیقی اور تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ فارسی ادبیات کی نسبت اردو میں عرصہ سے اس قسم کے مضامین کی کمی محسوس ہو رہی تھی توقع ہے کہ اقبال انصاری صاحب کی کوشش سے پھر اہل اردو فارسی ادب کے سمجھنے کی طرف متوجہ ہوں گے۔

الہاماتِ سلیمانی یہ کتاب قاری شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی کے فارسی، عربی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے جس کو منظور الحق صاحب کلیم نے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ ابتداء میں شاہ سلیمان مرحوم کے حالاتِ زندگی درج ہیں جن کے مرتب شاہ محمد عاقل صاحب ہیں۔ شاہ سلیمان صاحب کوئی مشاق یا پیشہ ور شاعر نہ تھے البتہ طبیعت کی موزونی کے باعث کبھی کبھی عربی۔ فارسی یا اردو میں نظمیں غزلیں یا قطعات تاریخی قلم بند کردیا کرتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں ایک مشہور عالم اور بزرگ کے یہ نتائج طبع ضایع نہ ہوجائیں ان کو اس مجموعہ کی شکل میں شایع کردیا ہے اس کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ اس میں صوفیانہ اور اصلاحی مضامین بیان کئے گئے ہیں جن کا مطالعہ موصوف کے معتقدین کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔

لاسلکی ترسیل و تحصیل یہ کتاب سید محمد محمود صاحب جعفری بی ایس سی عثمانیہ کی ان معلومات اور تجربوں کا نتیجہ ہے جو ان کو نشر گاہ لاسلکی میں کام کرنے اور موضوع سے دلچسپی رکھنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ ان کی پہلی کوشش ہے اور اس میں انھوں نے لاسلکی کے تحصیلی آلات استعمال کرنے والوں کے استفادہ کے لئے ضروری معلومات کو قلمبند کردیا ہے۔

کتاب کی زبان سلیس ترتیب علمی اور کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے سائنسی اور فنی مضامین کو سمجھانے کے لئے نقشوں کی بیحد ضرورت ہے اور خوشی کی بات ہے کہ جعفری صاحب نے اس کتاب میں بیسیوں مفید نقشے بھی شامل کردیئے ہیں۔

شعر العرب یہ کتاب ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد دکن کی چوتھی کڑی ہے اس کے مصنف مولوی فاضل حکیم ہبتہ اللہ صاحب استاد نظامیہ طبی کالج ایک مشہور علم دوست ہیں۔ جن کو شاعری اور تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق ہے۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے عربی شاعری سے اہلِ اردو کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ایک عرصہ قبل وحید الدین سلیم مرحوم نے بھی عربی شعراء و مصنفین کے تخیلات و رجحانات سے اہلِ اردو کو مانوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہبتہ اللہ صاحب نے عربی شاعری کے مختلف دوروں کی تاریخی

اہمیت اور خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ اچھے شعراء کے کلام کے نمونے اور ان کے ترجمے بھی پیش کئے ہیں۔ یہ ایک مستحسن کوشش ہے اور ضرورت ہے کہ اس موضوع پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھا جائے۔

درس قرآن مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کی طرف سے ایک پرچہ ایمان شائع ہوتا ہے۔ جس میں صرف درس قرآن کی ضرورتیں پوری کیجاتی ہیں اور قرآن کا مقصد اور پیغام کی تشہیر کے لیے ان رسالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رسالے چھوٹی کتابی تختی پر شائع کئے جاتے ہیں تاکہ جو لوگ جلد بنانا چاہیں ان کو کتابی صورت میں منتقل کرسکیں۔

ایضاح سخن از تمنا عمادی پھلواروی یہ کتاب احمد علی شوق سندیلوی کی مشہور کتاب اصلاح سخن کی شرح ہے۔ اصلاح سخن میں وہ سولہ غزلیں (اور ان کے متعلق چالیس اساتذہ کی اصلاحیں اور خانگی تحریریں) شائع کی گئی تھیں جو جناب شوق نے مختلف اصحاب کے یہاں بغرض اصلاح روانہ کی تھیں اور ہر شخص یہی سمجھتا رہا کہ یہ غزل صرف میرے ہی پاس آئی ہے۔ اس طرح اس مجموعہ سے مختلف اساتذہ کی طبیعتوں کی افتاد اور انداز غور و فکر کی نسبت اہم معلومات شائع ہوگئیں۔ اور جب وہ مجموعہ شائع ہوا تو ادبی دنیا میں ایک دھوم مچ گئی چنانچہ سر علی امام مرحوم نے تمنا صاحب عمادی سے خواہش کی کہ وہ اس مجموعہ کی ایک مکمل شرح لکھ ڈالیں یہی شرح اب ایضاح سخن کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اور ان لوگوں کے لئے قابل مطالعہ ہے جو شعر و سخن کا ناقدانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

تبویب حیدری جدید اصولوں پر کتابوں کی ترتیب اور فہرست سازی کے لئے اردو میں علوم و فنون کو تقسیم کرنے کی خاطر مولوی فضل اللہ احمد صاحب بی اے نے یہ رسالہ شائع کیا ہے۔ وہ حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد کے بانی و مہتمم ہیں اور یہ تبویب ان کے دیرینہ تجربات کا نتیجہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ناظم سررشتۂ معلومات عامہ نے لکھا ہے کہ "یہ تبویب اتنی مفصل اور جامع معلوم ہوتی ہے کہ اردو زبان اور اس کا روزافزوں اور وسیع ذخیرہ اس میں بآسانی سما سکتا ہے۔"

توقع ہے کہ فضل اللہ صاحب کی اس کوشش سے اردو کے جملہ کتب خانے فائدہ اٹھائیں گے۔

ملّا عبد القیوم یہ مجلۂ نظامیہ کا خصوصی شمارہ ہے جو مشہور عالم و فاضل اور قومی مصلح ملّا عبد القیوم کی یادگار کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی اٹھارہ مضامین نظم و نثر میں سے اکثر اس قابل ہیں کہ ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور ان کے توسط سے حیدرآباد کی علمی و ادبی تاریخ کے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ملّا عبد القیوم کے مفصل سوانح حیات کی ترتیب میں یہ یادگار نمبر بڑے اچھے مواد کا کام دیگا۔ اس کے مرتب مولوی ابوالخیر صاحب کنج نشین حیدرآباد کے ایک اچھے ادیب اور ذوق عمل کے متوالے ہیں توقع ہے کہ وہ اسیطرح علم کی ٹھوس خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ مضامین کے انتخاب میں ہمیشہ احتیاط اور پختگی ذوق سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا آخری مضمون کئی وجوہات سے اس قابل نہ تھا کہ ملّا عبد القیوم جیسے فخر قوم بزرگ کے یادگار نمبر میں شائع کیا جاتا۔ یہ مضمون نگار کی انانیت اور پریشان دماغی کا بدترین نمونہ ہے۔ "ادارہ"

"تمیج" کی حویلی میں ہولی (بسلسلہ گزشتہ)

میں نے اردو کے لئے جو کچھ بھی کیا اسے بھگل گا نٹھنے اور علمبردار بننے سے تمیج نے تعبیر کیا۔ اچھا یونہی سہی۔ مگر اس بھگل گا نٹھنے اور علمبردار بننے کی کوئی دلیل بھی ہے یا یونہی۔ زیر بحث خامہ فرسائی کے جس حصے سے ذہن ادھر منتقل ہوا اصولاً اس کا حوالہ دینا تو لازمی تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا تھا اس واسطے کہ اس سرمائے میں کہیں اس کا شائبہ تک نہیں۔ تو اعتراض کیا ہوا علت و معلول کا ایک من گھڑت سلسلہ بن کے رہ گیا۔ ایسے ہی محل کے لئے کوئی سر پھرا شاعر کہہ گیا ہے:۔

جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

لیکن وہاں جسارت سوال پر لبِ لعلیں کی سرکار سے تلخی جواب کا جواعزاز نصیب ہوا تھا۔ یہاں بیٹھے بٹھائے زحمت سوال کے بغیر ہی وہ دولتِ بے پایاں ہاتھ آگئی۔ زہے نصیب۔

یہ دوڑ دھوپ اگر علمبرداری کے لئے کی جاتی تو نوعیت تحریر اور طرز استدلال یہ نہ ہوتا بلکہ علمبرداری کے بلند آہنگ رجز سے میدان سخن گونج اٹھتا۔ جا بجا اسی پندار کی برتری دکھائی جاتی اور جگہ جگہ اسی جذبۂ خود نمائی کی توضیح کی جاتی۔ دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ جس کام میں تھوڑی بہت محنت اٹھانا پڑتی ہے انسان اسے بہت عزیز رکھتا ہے اور موقع بے موقع اس کی تحسین و ستائش سے کبھی نہیں چوکتا۔ نئے نئے ڈھب سے اس کی خوبیاں ذہن نشین کرانے کی سعی کرتا اور کبھی بھول کر بھی اپنے ہی منہ سے اپنے اس کار دشوار کی برتری و خوبی کے خلاف ایک لفظ تک نہیں نکالتا۔ لیکن جہاں کافی عرق ریزی پر بھی کار محنت طلب کی خامیاں اور اس کے نقائص کا بار بار اعلان کیا جا چکا ہو۔ کھلم کھلا اس طرز کی ناکارگی، بے بضاعتی اور بے چمیرزی کی تفصیلی داستان گوش زد کی جا چکی ہو۔ اس پر بھی کوئی ناسمجھی سے محولہ روش تحریر کو علمبرداری اور مستقبل میں کسی جلب منفعت کی خود ساختہ علت قرار دے کر لفاظی اور حرف گیری کی ہولی کھیلنے لگے تو یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے:۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بھلا اس ناتواں بینی کا کیا ٹھکانا ہے کہ پوری سعی و کوشش سے کوئی تمام ملک کے لئے ایک طرز جدید کا سرمایۂ تقلید منظر عام پر پیش بھی کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی فرسودگی اور ناکارگی کا افسانہ بھی۔ متوسط تو متوسط کوئی معمولی سے معمولی دماغ بھی اسے کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ طرز جدید کی خامیوں کا اظہار ہی اس بات کی نمایاں دلیل ہے کہ اسے تقلید ملک سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ اس آڑ میں کچھ اور ہی لم ہے جس کی توجہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ملک کو اسی راستے پر چلانا اگر مدنظر ہوتا تو اس کا دراک راہ کے سنسان اور بھیانک مناظر کو قوت بیان اور زور استدلال سے فردوس نظر بنا کے پیش کیا جاتا۔ حالانکہ معاملہ بالعکس ہے۔

زیر تذکرہ تحریر کے متعلق مختلف ماہناموں کے مدیران خوش ذوق اور احباب کرم گستر نے کئی سال ادھر جس طرح اظہار خیال کیا بخوف طوالت اس پوری بضاعت ستائش کا قلم انداز کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ناقدین اردو میں سے دو بڑے نقادوں کی رائیں یہاں نقل کئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس سے دیدہ ور مابہ النزاع تحریر کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ بزم علم و ادب کے ممتاز رکن ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی) ۲۵ مارچ ۳۸ء کے اپنے گرامی نامہ میں اسی روش جدید کی نسبت جسے تمیج "دو غلی کوشش"

سے تعبیر کرتا ہے، اس طرح رقمطراز ہیں:-

۲۲ (الف) میور روڈ الہ آباد ۲۵ مارچ ۴۳ء

"جناب والا تسلیم .... شعر میں آرزو لکھنوی نے اپنی "خالص اردو" میں یہ التزام کیا ہے، نثر میں مولوی فدا علیخاں رام پوری نے ایک بنگالی قصے کے ترجمے "رس کا روکھ" میں اور آپ نے اپنی چٹھیوں میں کہ عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے اور سنسکرت یا کسی اور زبان کے بھی نامانوس لفظ نہ آئیں۔ یہ ایک خاص صنف اردو ادب میں ہو گئی۔ اگرچہ تکلف سے خالی نہیں، پھر بھی بہت مفید ہے اور لکھنے والوں کے کمال اور زبان پر قدرت کا پورا ثبوت ہے۔ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر اردو لکھنے والوں کو ترغیب ہوگی کہ وہ عام فہم لفظوں اور سہل ترکیبوں کو زیادہ کام میں لائیں، پڑھنے والوں کو دکھائی دے گا کہ ہماری زبان کیسی وسیع ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے جس بات کی توضیح فرمائی، سچ تو یہ ہے کہ محولہ خطوط ناچیز لکھتے وقت رفع نزاع کے سوا اور کوئی چیز چشم خیال کے سامنے رہی نہ تھی۔

جناب محترم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب دہلوی (سابق ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ، حیدرآباد دکن) جن کی ذات گرامی ایوان علم و ادب کی منزلت صدارت پر فائز ہے اور تربیت و فروغ اردو کے لحاظ سے موصوف کی:-

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ان سے بڑھ کر زبان و بیان کا نبض شناس اور کون ہو سکتا ہے۔ ۱۴ مارچ ۴۳ء کے ایک الطاف نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

نیمی روڈ، ڈیرادون ۱۴ مارچ ۴۳ء

"جناب مکرمی تسلیم ....

....

مارچ کے "ساقی" میں آپ کا مضمون دراصل ساقی کی جان تھا۔ چونکہ آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا تخلص سرور نہ تحریر کیا تھا اس لئے ذہن آپ تک منتقل نہ ہو سکا۔ گو کہیں کہیں نکہت حیدرآباد محسوس ہوئی۔

آپ کا مضمون بالخصوص الفاظ کی وہ فہرستیں جو اپنے دعووں کے ثبوت میں پیش کی ہیں ایک مدت کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ایسے سرائے کہیں لکھے لکھائے یکجا نہیں ملا کرتے۔ مضمون میں آورد کی شان کہیں کہیں معلوم ہوئی۔ مگر خود میرے کان ترجمے کرتے کرتے اور پڑھتے پڑھتے ایسے نہ رہے کہ میں مانوس اور غیر مانوس کو مانوس سمجھنے میں صحیح صحیح تمیز کر سکوں۔ مضمون آپ کا ہر لحاظ سے بے مثل ہے۔ اگر اس کو ہندی میں لکھوا کر اور چھپوا کر شایع کریں تو ممکن ہے ہندوؤں کی نظر اس پر پڑے اور گاندھی مہاراج تک اس کی نوبت آئے۔ ورنہ یہ بزرگ کب متوجہ ہوتے ہیں۔

میرے ایک دوست سید سجاد حیدر صاحب جو مجھ سے کہیں زیادہ اردو زبان کے پرکھنے والے ہیں وہ بھی آپ کے اس مضمون کی بہت تعریف کرتے تھے۔"

پھر ۱۹؍جنوری ۳۸ء کے ایک نوازش نامہ میں یہ تحریر فرمایا:-

"مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو ترک کر کے کچھ لکھنا اردو والوں کے لئے ایک مصیبت ہے۔ آپ نے اپنی تحریر کا زور اسی طرح دکھایا ہے۔ اور ثابت کر دیا کہ اردو میں اتنی طاقت ہے کہ وہ عربی، فارسی الفاظ سے اور غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بچ کر بھی اپنا مطلب ہر قسم کا ادا کر سکتی ہے۔ آپ کی محنت اور مہارت اور قدرت کلام پر جو معترض ہو وہ کافر رہے وہ لوگ جن کو آپ نے اپنا مخاطب بنایا ہے ان سے اس وقت بحث نہیں۔ کیونکہ وہ ان چیزوں کو محض اپنے سیاسی خیالات کی ترویج کا ایک آلہ سمجھتے ہیں۔ جیسے اردو زبان کی بحث سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

مجھے تو آپ کی محنت پر حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے چیدہ الفاظ لائے ہیں اور پھر بھی مطلب کے ادا کرنے میں فرق نہیں ہونے دیا۔ اردو کی اس طاقت کا ثابت کرنا ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ سوائے آپ کے دوسرے کے لئے ناممکن تھا۔"

اس کے بعد کے ایک اور التفات نامہ میں تحریر فرمایا کہ:-

"ساقی میں میں نے آپ کا مضمون از اول تا آخر پڑھا۔ بغیر آپ کا نام دیکھے مضمون پڑھنا شروع کر دیا کہ دفعتاً خیال آیا کہ مضمون آپ کا ہے۔ نام دیکھا تو خیال صحیح نکلا۔ نہایت خوب مضمون لکھا ہے اور بڑی تحقیق سے لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر نئی معلومات پیدا ہوئیں ارادہ تھا کہ پھر ایک مرتبہ پڑھوں گا۔ لیکن کوئی صاحب میز پر سے پرچا اٹھا لے گئے اور محروم رہا۔

آپ کا جدید طرز تحریر ایسا ہے کہ اس کی تقلید کسی دوسرے سے قطعی ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں لوگوں میں اس طرز تحریر کی نقل اتارنے کا شوق نہ پیدا ہو جائے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں اگر ایسا ہوا تو اردو کو نقصان پہنچے گا۔ گو اس کی قوت ادا مسلّم ہے۔ مگر وہ عام پسندیدہ طرز جو دل کو بھاتا ہے، اس میں فرق آجائے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اردو نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر اس خیال کو غلط سمجھتا ہوں۔ اردو ہے اور لاکھ میں اردو ہے۔ مگر انوکھے طریقے کی ہے۔

میں نے آپ کا مضمون ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ پڑھا اور ہر مرتبہ تعجب کیا کہ اردو میں ایسی وسعت، پھر دلائل میں اتنی مضبوطی ایسی زبان میں کیونکر پیدا کر لی۔"

ایسے ہی کئی اشفاق نامے اور بھی ہیں جن کے اقتباسات کی اس مختصر مضمون میں گنجایش نہیں۔ اس امر کی تصریح بھی نہیں مناسب معلوم ہوتی ہے کہ "ٹھیٹ اردو" کی نسبت پہلے پہل جناب موصوف ہی کے ٹوکنے سے مجھے اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی۔ بہر طور مسلسل کئی برس تک میری سابقہ خامہ فرسائی کے خلاف ملک کے کسی گوشے سے کبھی کوئی صدا گوش زد نہ ہوئی۔ لیکن آج کافی مدت گزر جانے کے بعد ایک نئی بھنک کان میں پڑی اور اس لئے وہ عجیب تر معلوم ہوئی کہ جو کچھ کہا اسے ثابت نہ کیا جا سکا۔ علمی اور ادبی بحثیں مذہبی احکام خداوندی تو نہیں ہیں کہ انہیں ماننے بغیر

کوئی چارہ ہی نہ ہو اور ان کے خلاف یونہی سی لب کشائی بھی کفر و الحاد کے مماثل قرار دی جائے۔ اس بزم میں بے روک ٹوک ہر ایک آزادی سے اظہار خیال کر سکتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کوچۂ استدلال سے نابلد نہ ہو۔ برہان و دلیل کے معیار پر زر سخن کے کسنے اور پرکھنے کی مہارت رکھتا ہو۔ جو بات زبان سے نکلے وہ جچی تلی اور جو کہے اسے ثابت کر کے چھوڑے۔

نکتہ رس لوگ کوئی بات ایسی نہیں کہتے جس کے مطالبۂ ثبوت پر وہ دم بخود ہو کے رہ جائیں اور بروقت کوئی دلنشیں توجیہ نہ کر سکیں۔ کسی بحث کے لئے اس وقت تک لب کشائی زیبا نہیں، جب تک اس سے عہدہ برآ ہونے کی قوت و قدرت نہ ہو۔ اس راہ میں قدم قدم پر دلیل و برہان سے کام پڑتا ہے۔ استواری استدلال کی بضاعت اگر پاس ہو تو گھڑی بھر میں خارزار کی پرپیچ راہیں بھی بہ سہولت طے ہو جاتی ہیں اور اگر یہی سرمایہ پورا نہیں تو پھر دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ بحث کے معیار برتری کی نسبت استفسار کرنے پر کسی حکیم نے کہا تھا کہ صحیح استدلال کا استحکام ہی اس کی اصلی کسوٹی ہے۔ آداب بحث کے اصول معین کرنے والوں نے اس باب میں بڑی موشگافی اور کافی نکتہ آفرینی سے کام لیا۔ یہاں تک کہ راست بازی کی کم گوئی و کم سخنی کے سامنے چرب زبانی اور طلاقت لسانی کا زور بے بس ہو کے رہ گیا اور حساس طبیعتیں خصم سے غلط بات منوا کر بھی اطمینان حاصل نہ کر سکیں۔ عرفی شیرازی کی ندرت تخیل کا نتیجہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے :-

رستم ز مدعی بقبول غلط ولے　　　در تابم از شکنجۂ طبع سلیم خویش

یعنی چرب زبانی کی بدولت غلط بات منوا کے حریف سے پیچھا چھڑا تو لیا لیکن طبع سلیم کے شکنجے کی وجہ سے طرفہ پیچ و تاب میں پھنس گیا۔ گویا ایک بلا سے بڑھ کر دوسری جان پر نازل ہو گئی۔ بحث کی مدت گھڑی بھر سے زیادہ نہ تھی مگر طبع سلیم کا شکنجہ قیام احساس تک عذاب جان بن کے رہ گیا۔ زیر بحث سرمایۂ تحریر کوئی راز محفل نہیں۔ یہ سب کا سب کب کا منظر عام پر آچکا۔ از سر نو اسے پھر وقت نظر کی عینک سے دیکھ لیا جائے اس لئے کہ نوعیت اعتراض سے سراسر لاعلمی اور ناواقفیت ہویدا ہے۔

جس طرح تکمیل تصویر کے لئے اس کے دونوں رخ ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح تقریر و تحریر کے واسطے بھی اس کے لفظی اور معنوی دونوں رخ نہایت اہم تسلیم کئے گئے ہیں۔ صحت الفاظ اور ان کی محل شناسی وغیرہ کی رنگ آمیزی تصویر تحریر کا پہلا رخ ہے اور دوسرا استدلال کی استواری و معنی خیزی۔ مگر جہاں ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی نشان تک نہ ہو تو اسے تحریر کہنا ہی کسی طرح درست نہیں۔ شیخ نے گنتی کی چند سطریں لکھیں لیکن تھوڑی سی جگہ میں بھی قدم قدم پر نقص محاورہ اور سقم لفظی کی ٹھوکریں کھائیں۔

ماہرین لسان بہ خوبی واقف ہیں کہ شاہ راہ زبان ہمیشہ تقلید کے قدموں سے طے کی جاتی ہے اور اس راستے پر اگلوں ہی کے نقش قدم دلیل راہ کا کام دیتے ہیں۔ قیاس اور استدلال کے اوزار یہاں کچھ کارآمد نہیں۔ روزمرہ ہو یا محاورات اہل زبان انھیں استعمال کے سانچوں میں جس طرح ڈھال چکے اس سے اب سر مو تجاوز نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر "محاورات" ہی کو دیکھئے۔ جن کی بنیاد اکثر و بیشتر استعارے کی سرزمین پر رکھی جاتی اور الفاظ کے مجازی معنوں سے یہ جادو جگایا جاتا ہے۔ جیسے :-

قسم کھانا، پچھاڑیں کھانا، جی اچٹنا، جی ٹلنا، تین پانچ کرنا، کان ہلانا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا وغیرہ یہ سب محاورے

ہیں اور ان میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا جا سکتا۔

اصول زبان سے ناواقف قیاس کو دخل دے کر قسم کھانا کے محل پر قسم چبانا، پچھاڑیں کھانا کے موقع پر پچھاڑیں نگلنا، جی اٹھنا کی جگہ جی پھیلنا، جی ٹوٹنا کے مقام پر جی پھیلنا، تین پانچ کرنا کے بجائے دس بارہ کرنا، کان نہ ہلانا کے محل پر کان نہ چھیڑنا، پھونک پھونک کے قدم رکھنا کی جگہ پھونک پھونک کے پنڈلی رکھنا لکھنے لگے تو اس ناواقفیت پر جاننے والے کیا کہیں گے؟ تو یہ امر مسلم ہے کہ محاورات میں کسی طرح کی تبدیلی اہل ادب کو پسند نہیں۔ "پھونک پھونک کے قدم رکھنا" بندھا ہوا محاورہ ہے جس میں کسی ترمیم کی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ مگر تیبج کی ناشناسی، محاورے کو مسخ کر کے "پھونک پھونک کے رکھے ہوئے شبد" لکھوا رہی ہے۔

اردو میں جمع کے عربی اوزان یا اس کی خود بنائی ہوئی جمعیں روزمرہ کی بات چیت اور لکھنے لکھانے میں برابر استعمال کی جاتی ہیں۔ تحقیق سے "تحقیقات" "مسلمات کے وزن پر عربی جمع ہے۔ اسی لفظ کی اردو جمعیں جیسے تحقیقوں، تحقیقیں بھی عام طور پر اردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن عربی جمع پر اردو جمع کے واؤ، نون کا اضافہ کرکے جمع الجمع بنانا نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔ تیبج کی جدت پسندی اور اس کی تحقیق کی اعجوبہ زائی عربی جمع میں اردو جمع کا واؤ، نون بڑھا کر صحیح لفظ "تحقیقات" کو "تحقیقاتوں" بنانے سے بھی نہیں چوکتی۔ اس معیار سے تو سیکڑوں، ہزاروں الفاظ بن کر حشرات الارض کی طرح پھیل سکتے ہیں جیسے واقعات سے واقعاتوں، حادثات سے حادثاتوں، اصطلاحات سے اصطلاحاتوں، حالات سے حالاتوں اور سیاسیات سے سیاسیاتوں وغیرہ۔

اس ہمہ دانی پر پندار تحقیق کا یہ عالم ہے کہ سبحان اللہ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"اردو میں عموماً "بول" گیت کے ٹکڑے اور "بھاشا" برج بھاشا کو کہتے ہیں۔"

دیکھیے ایک سانس میں دو باتیں کہیں مگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اصلیت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اردوئے معلیٰ نے اس لفظ کو ایک ہی معنیٰ میں محدود نہیں کیا بلکہ اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو بہت آگے بڑھایا۔ ناواقفیت سے اس کی وسعت لفظی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ اہل زبان کے نزدیک "بول" کے معنے ہیں :-

۱- بات، قول، کلمہ، کلام ۲- گیت کا ٹکڑا، ۳- طعن وطنز وغیرہ کہ اب یہ لفظ اور اس کے مشتقات ملاحظہ طلب ہیں۔

بول، بول اٹھنا، بول جانا، بول نہ سکنا، بول پڑھنا، بول بول کے تھکنا، بول چال، بول بالا ہونا، بول بالا رہنا، بولنے پر آنا، بولنا چالنا، بڑا بول، بڑا بول بولنا، دعا و بولنا، ایک ایک بول نقش ہونا، دو بول پڑھانا، دو بول آنا، دو بول دینا، طبلے کے بول، ستار کے بول وغیرہ وغیرہ۔

بول :- (رشک) باتیں وہ کر رہا ہے کہ سارنگیوں کے بول
یہ ساز میں صدا ہے نہ یہ لطف راگ میں

بول اٹھنا :- (امیر) امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا
نگاہیں بول اٹھیں وہ لے گیا دل

بول جانا :- (صبا) بحث گریہ میں ابر بول گیا
دیدۂ اشکبار کیا کہنا

بول نکلنا :- (ناسخ) اس طرح بول نکلتے نہ سنے تھے ہم نے
کرتی ہے صاف صنم تیری ستاری باتیں

بول نہ سکنا :- خوف یا لحاظ سے کچھ کہہ نہ سکنا۔ جیسے یوں تو خوب باتیں بناتے ہو مگر وہاں کچھ بول نہ سکے۔

بول پڑھنا :- تمہاری تحریر کا تو ایک بول بھی پڑھا نہیں جاتا۔

بول بول کے تھکنا :- ہم بول بول کے تھک گئے مگر اسے خبر بھی نہیں۔
بول چال :- اس کی بول چال کا کیا کہنا۔
بول بالا رہنا :- بول بالا رہا سدا اپنا۔
بولنے پر آنا :- لحاظ اٹھا دینا، بیباکی سے گفتگو کرنا۔ جیسے
دیکھو اسے نہ چھیڑو، وہ بولنے پر آیا تو قیامت
برپا کردے گا۔
بولنا چالنا :- تم نے تو بولنا چالنا بھی چھوڑ دیا۔
بڑا بول :- شیخی، غرور کا کلمہ، نخوت و تکبر۔ جیسے بڑا بول نہ بول۔
بڑا بول بولنا :- جیسے بڑا نوالہ کھائے اور بڑا بول نہ بولے۔
دھاوا بولنا :- اس نے اچانک دھاوا بول دیا۔
ایک ایک بول نقش ہونا :- تمھاری باتوں کا ایک ایک بول
دل پر نقش ہے۔
دو بول پڑھانا :- اس نے شربت کے پیالے پر دو بول پڑھ دیے ہیں۔
دو بول آنا :- تمھیں دو بول کیا آ گئے کہ اب کوئی تمھاری ٹکر
ہی کا نہیں۔
دو بول دینا :- بڑا بد شوق ہے۔ آج کا سبق کیا؟ کل گنتی کے
فقط دو بول دیے تھے وہ بھی ابھی تک یاد نہیں۔
طبلے کے بول :- تمھارے ہاتھ سے ابھی طبلے کے بول صاف
نہیں نکلتے۔

آپ نے دیکھ لیا ایک بول میں سے کتنے بول نکلتے چلے آئے۔
کیا اب بھی "بول" کے معنی گیت کے ٹکڑے ہی میں محدود رہیں گے؟

سچ تو یہ ہے کہ تبیح کی بولی کا ایک ایک بول زعفران
زار کشمیر سے کسی طرح کم نہیں۔ "بول" کی ناپ تول کے بعد اب
"بھاشا" کی باری ہے۔ ارشاد ہو چکا ہے کہ :- "بھاشا برج
بھاشا کو کہتے ہیں" بھلا کہاں بھاشا اور کہاں برج بھاشا۔
دونوں میں عام خاص کی نسبت نے امتیاز تمام کی حد کھینچ دی
ہے۔ "برج" کا لفظ خود اسی حد بندی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔
"برج بھاشا" کہتے ہی صرف برج کی بولی، متھرا، گوکل اور
بندرابن وغیرہ ہی کی زبان مراد لی جاتی ہے۔ مگر بادۂ اعتراض
کے نشے میں اس حد بندی کو دیکھنے اور اصل بات کی تحقیق
کا ہوش کسے۔ اسی بے ہوشی میں بھاشا کو برج بھاشا سمجھ
لیا گیا۔ حالانکہ بھاشا عام ہے جہاں کی بھی ہو اور برج بھاشا
خاص اور مخصوص ہے برج ہی کے لئے۔ سنسکرت سے نکلی
ہوئی ہندی، بھاشا کہلائی جاتی ہے اور عام طور پر بھاشا
کے معنی مطلق زبان اور عام بولی کے لئے جاتے ہیں۔

برج کی قید لگانے سے بھاشا عام نہیں رہتی بلکہ متھرا
کے اس ضلع میں (جو ایک سو اڑسٹھ میل کے گھیرے میں گوکل،
بندرابن وغیرہ کو گھیرے ہوئے کرشن جی کے جنم بھوم ہونے کا
شرف رکھتا ہے اور جہاں کی سلاست و فصاحت زبان تمام
ملک میں امتیازی درجہ رکھتی تھی) مقید ہو کے رہ جاتی ہے اور
یہ قید کچھ اسی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ابتدا سے ہر ایک متمدن
ملک کی زبان اپنی لطافت و شیرینی، سلاست و فصاحت کی
شہرت کے لئے سارے ملک میں سے کسی ایک مقام کو منتخب
کرتی رہی ہے۔ تو اس مختصر توضیح کو پیش نظر رکھنے سے بھاشا،
برج بھاشا نہیں ہو سکتی۔ بھاشا عام رہے گی اور برج
بھاشا خاص۔ ناواقفیت عام، خاص کو ملا کر ایک کر دینا چاہتی
ہے۔ مگر اس کے چاہنے سے باہمی امتیاز کی حد بندی کیسے
ٹوٹ سکتی ہے۔

ابھی اسی تبیح کی کرم فرمائی کا کچھ ضمیمہ بھی باقی ہے۔
جسے چاہیے :- سعدی از دست خویشتن فریاد، کی
روداد تصور فرمایئے یا اونچی دکان اور پھیکا پکوان۔ چونکہ
یہ بحث ایک دلچسپ حیثیت رکھتی ہے اس بناء پر نظر انداز نہیں کی

جاسکتی۔ چمن زار اردو کی بالیدگی و نکہت انگیزی کے لئے تمام ملک میں انفرادی و اجتماعی جتنی بھی کوششیں ہوئیں۔ ان میں "انجمن ترقی اردو" سب سے پیش پیش ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء اس لئے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اسی سال انجمن کی داغ بیل پڑی اور اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ پہلے پہل اس نوخیز انجمن کے فرائض معتمدی کا قرعۂ فال شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے نام پر نکلا۔ ان کے مستعفی ہو جانے سے کچھ دنوں تک مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی اس کے نگران کار رہے۔ پھر اعتبار معتمدی کی باگ مولوی عزیز مرزا صاحب کے ہاتھ آئی۔ اور ان کے بعد حالیہ دور معتمدی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے نواب عماد الملک نے اس بزم کی کرسئ صدارت کو زینت دی۔ پھر نواب مسعود جنگ مرحوم تا قید حیات نہایت انہماک سے فرائض صدر نشینی ادا کرتے رہے اور اب اس صدارت کی زیب و زینت ملک کے مایۂ ناز فرزند سر تیج بہادر سپرو کی ذات خجستہ صفات سے وابستہ ہے۔ گویا یہ ایوان علم و ادب نئے نئے رنگ کی سات قدآدم تصویروں سے رشک نگارخانۂ چین بن گیا ہے اور مختلف تصاویر کے خط و خال سے شاہد اردو کا ارتقائی رنگ رعنائی و زیبائی ٹپکا پڑتا ہے۔

اگرچہ نکتہ چین طبیعتیں موجودہ دور معتمدی کو انفرادی اغراض کی ریشہ دوانیوں اور شخصی پندار کی آلودگیوں سے پاک و صاف نہیں سمجھتیں۔ لیکن بایں ہمہ اس ادارے کی عمومی حیثیت بلحاظ نوعیت کار کافی اہمیت رکھتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ موجودہ دور معتمدی میں جو سرمایۂ فروغ اسے نصیب ہوا۔ اس سے پہلے انجمن ترقی اردو نے کبھی اس کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ بہر نہج اس ترقی پذیر انجمن کی آغوش تربیت میں اس کے چھوٹے بڑے جتنے کچھ بچے کھیل کود رہے ہیں ان میں "اخبار زبان" بلحاظ سن و سال سب سے چھوٹا اور نہایت خرد سال شمار کیا جاتا ہے۔ مہینے میں یہ دو مرتبہ ذوق کی کلیاں چھانتا ہوا ادھر سے اُدھر جگہ جگہ بہانٹے لگاتا پڑا پھرتا ہے۔

نہ جانے پہلے ہی سے آپس میں کچھ ملی بھگت ہو گئی تھی۔ یا جیسے شوخ اور شریر بچوں کو نقل اتارنے کی لت پڑ جاتی ہے۔ اس نے بھی وہی تیج کی بولی بولی اور اسی کی دیکھا دیکھی پانچ چھ برس ادھر کی روش تحریر پر جو محض نئی ہندی بنانے والوں کی روک تھام کے لئے عارضی طور پر اختیار کی گئی تھی۔ تتلا تتلا کے وہی راگ الاپا اور توتے کی سی آنکھیں پھیر کر ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ ڈالا:۔

> "مولانا ابوالقاسم کی زبان سے ہندستانی کے جو نمونے ہمارا معاصر پیش کر رہا ہے وہ نہایت عجیب غریب ہیں۔ ان کی لے عنوانیوں کا کچھ تذکرہ "ہماری زبان" (۱۶ فروری سنہ ۱۹۴۱ء) میں ملاحظہ ہوا ہوگا جو غرض اس کس کے اندر چھپی ہوئی ہے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا موصوف ایسی زبان کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر یا وقتی ضرورت سے لکھا کرتے ہیں۔"
>
> (ہماری زبان یکم مارچ سنہ ۱۹۴۱ء)

دیکھئے وہی تیج کے سے ہتھکنڈے ہیں اور وہی انداز کہ نہ کوئی دعویٰ اور نہ دلیل بے سوچے سمجھے جو جی چاہا کہہ دیا۔ حداثت سن سے یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ اس طرح کی خامہ فرسائی سے بات آگے بڑھ کر کہاں تک پہنچے گی؟ سچ ہے لڑکپن میں ایسی اونچ نیچ دیکھنے کا ہوش کہاں! اس کی پیدائش سے بہت پہلے اسی کے مربی و خداوند مجازی کا نتیجۂ دست و قلم جو منظر عام کے کتب خانے میں کب کا محفوظ ہو چکا ہے، شاید ابھی اس کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر تک نہیں۔ "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان" کی

داستان چھپے ہوئے مدت ہوچکی، اسی داستان کے دیباچے میں سید انشا کی ذہانت و ذکاوت کی روداد لکھتے لکھتے انجمن ترقی اردو کے "قائد اعظم" اس کہانی کی روش تحریر کی نسبت اس طرح داد سخن سنجی دے چکے ہیں:۔

"یہ کہانی بھی ان کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ اس میں یہ التزام کیا ہے کہ فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ جو دعویٰ انھوں نے کیا وہ پورا کر دکھایا۔ عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہیں آیا اور پھر لطف یہ ہے کہ آج کل کی سی ایسی ہندی نہیں کہ نہ لکھنے والا سمجھے اور نہ پڑھنے والا۔ اردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں اسی کا نام ہندستانی ہے۔"

(دیباچہ "رانی کیتکی" مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

انحیار زبان کو اپنے خانوادۂ اردو کی اس مربی و محترم ہستی کے ملاحظہ میں یہی ناقدانہ تحریر پیش کر کے فوراً دریافت کر لینا لازم ہے کہ اس رائے میں مرور ایام کی وجہ سے کسی ترمیم یا حک و اصلاح کی گنجایش تو باقی نہیں۔ اگر ہے تو ممکنہ عجلت سے رائے سابق میں تبدیلی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ بھولے بھٹکے ہوئے راہ راست پر آسکیں اور اگر اگلی رائے میں ضرورت ترمیم نہیں تو پھر سید انشا کے ایجادی طرز پر عقیدت و احترام کے سہرے چڑھانا اور اسی طرز اختیار کرنے کے جرم میں کسی متبع کو مورد لعن و طعن قرار دینا کیا آئین دانشوری کا ماحصل یہی ہے۔ جب ایک ہی رنگ میں دونوں رنگے ہوئے ہوں تو پھر اس یک رنگی میں دو رنگی کیسی۔

سید انشا نے اپنی شمشیر زبان و بیان کے جوہر دکھانے کے لئے موچھوں کو تاؤ دے کر نئے ڈھب سے رانی کیتکی کی داستان لکھ لکھا ڈالی۔ جسے حسن قبول نے سر پر رکھا اور عقیدت نے آنکھوں سے لگایا اور میں نے اردو، ہندی جھگڑے کے شور و غل سے عاجز آکر ہندی کے صرف ادبیلے پجاریوں کا دھیان بٹانے اور انھیں باتوں میں لگانے کے لئے وہی شاہراہ بہ مجبوری اختیار کی جس کی داغ بیل تقریباً سوا سو برس ادھر ڈالی جا چکی تھی۔ پھر، قدم قدم پر اس راہ کے نشیب و فراز، پیچ و خم حد بندی و ناکارگی وغیرہ کی کھینچ سے بھی کہیں زبان نہ رکی۔ اور اس بارے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ حیرت ہے کہ اس پر بھی بے شعوری کی تیوری چڑھی رہی اور ناواقفیت کی پیشانی کا بل نہ گیا۔

اصولاً تو موجد اور متبع دونوں پر یکساں فرد جرم لگانا چاہیے کیونکہ نوعیت کار کی یکسانی دونوں کو برابر کا مجرم بنا چکی۔ مگر یہ برابری بھی اس لئے درست نہیں ہو سکتی کہ موجد کے مرتبے سے متبع کا درجہ ہمیشہ پست و فروتر مانا جاتا ہے۔ عظمت ایجاد کی برتری موجد کا وہ مخصوص کارنامہ ہے جس میں مقلد اور متبع کا کوئی حصہ نہیں۔ البادی اظلم کا صحیح مصداق ذات موجد ہی قرار پا سکتی ہے اور جدت طرازی کی بدعت کا سہرا اسی کے سر زیب دے سکتا ہے۔ اور اگر کارنامۂ قدامت بدستور لائق پرستش و احترام ہے تو پھر کیا "جرم ہمعصری" کی یہی سزا ہے؟ اور کیا شریعت دانشوری میں اس گناہ کبیرہ کی یہی پاداش رکھی گئی ہے؟

مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اس مصرع نے شاہ جہاں آباد کا ایک عبرت خیز واقعہ یاد دلا دیا۔ تمدن دہلی کا جاں بلب بیمار جب سنبھالا لے رہا تھا تو وہاں کی رونق اور چہل پہل ایسی ہی روز افزوں ہو چلی تھی جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑک اٹھتا ہے۔ جا بجا ارباب خرد کی نورانی صحبتیں، جگہ جگہ اہل کمال کی پر لطف

ہم بزمی، ان کی بذلہ سنجی و دقیقہ رسی، خودداری و وضعداری آپ اپنی نظیر تھی۔ بزم کملا میں سے ایک ایک فرد ندرتِ تخیل، لطافت و پاکیزہ خیالی کا سرچشمہ، دانش و فرہنگ کا مجسمہ، تہذیب و شائستگی سے گل بداماں، خوش طبعی و زندہ دلی میں بہارِ رنگ و بو کا کارواں، اور لٹتی ہوئی دلی کا دورِ آخر مٹتی ہوئی عظمتِ تیموری کا دمِ واپسیں ایک ایسا بے نظیر سلسلہ تھا جس کے انمول جواہر کی چھوٹ آج تک کاشانۂ عقل و فرہنگ کے بام و در پر پڑ رہی ہے۔

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، مولنا فضلِ حق خیرآبادی، مولنا مفتی محمد صدر الدین خاں آزردہ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، شیخ ابراہیم ذوق، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہ وغیرہ یہی وہ لوگ تھے جن سے دلی دلی تھی اور انہی کی موشگافی، رنگیں نوائی اور سحر طرازی سے عروسِ دہلی کا سہاگ اور سنگار تھا۔ انہی کے دم تک یہ سہاگن رہی اور ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کا سہاگ اجڑ گیا اور رنڈاپے کی مصیبتیں اور نئی نئی آفتیں سر پر آ پڑیں۔

بزم تحقیق کی زیب و زینت جن باکمالوں کے دم سے وابستہ تھی۔ اُن میں مولنا آزردہ بڑے پائے کے لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ ان کی سخن سنجی و سخن گستری مسلم تھی۔ لیکن پابندیِ وضع کا خیال جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ایک دفعہ جو زبان سے کہہ دیا وہ کہہ دیا اب اس سے ہٹنا وضع داری اور خودداری کے منافی جانتے تھے۔ غالب مرحوم کا رنگِ سخن ابتدا سے انھیں پسند نہ تھا۔ اس وضع داری کی یہ ادا دیکھنے کی ہے کہ مرتے دم تک کبھی عمداً مرزا صاحب کے نتیجۂ تخیل کی توصیف سے ان کی زبان آشنا نہ ہوئی۔ حالانکہ اکثر نادانستگی میں مولنا کو مرحوم کے کیفِ سخن نے خود رفتہ و بسمل بنا دیا۔ لیکن جب ہوش آیا تو روئے سخن بدل کر کہہ دیا کہ "اس میں مرزا کا کیا کمال ہے یہ تو ہماری پسند کے شعر ہیں"۔ مرزا صاحب کی سحر طرازی ناواقفیت میں انہیں مسحور کر کے جب خراجِ تحسین وصول کر چکی اس وقت الفاظ بالا مولنا کے منہ سے نکلتے نہیں تو غالب مرحوم کی جادو بیانی چپکے بیٹھے سنتے رہتے تھے۔ اگر اہلِ بزم میں سے کسی نے اظہارِ خیال کے لئے مجبور کیا تو یہ کہہ کے پھر خاموش ہو جاتے، "کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا معلوم ہوتا ہے"۔ پھر اس سخن شناس کا یہ سکوت کسی عناد پر مبنی نہ تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ آئے دن مولنا کا اٹھنا بیٹھنا ہنسنا بولنا رہتا ہی تھا۔ باہمی مراسم کی استواری کا اندازہ اس واقعہ سے ہو گا کہ مرزا صاحب نے ان کی تعریف و توصیف میں ایک فارسی قصیدہ سپردِ قرطاس کر دیا۔

ایک دن کسی تقریب میں نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کا آستانہ سخن سنج باکمالوں سے معمور تھا۔ مرزا صاحب اور مولنا آزردہ بھی شریکِ بزم تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنے فارسی دیوان کے چند اوراق پر کہیں غالب مرحوم کی نظر پڑ گئی۔ یہ تو بہتے دریا تھے ہی اوراق اٹھا کر مولنا آزردہ کی طرف دیکھا اور انھیں چھیڑنے کے لئے سنجیدہ لہجے میں مولنا سے کہنے لگے۔ "دیکھئے، کسی ایرانی سخن طراز نے کیا زبردست غزل کہی ہے"۔ مولنا اس وقت اس چال کو نہ سمجھ سکے اور نئی غزل سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مرزا صاحب نے خاص انداز میں یہ مطلع پڑھا۔ "نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست، فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست"۔ اس غزل کے ابتدائی کئی شعر دیکھ کر مولنا نے بہت تعریف کی۔ مگر پھر بعض قرائن سے تاڑ گئے کہ یہ متاعِ سخن مرزا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے فوراً اپنا رنگ بدل دیا اور مسکرا کر فرمانے لگے "کلام مربوط ہے مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" ابھی توصیف اور ابھی منقصت، اہلِ بزم اس دو رنگی پر بے اختیار ہنس پڑے۔ مرزا صاحب نے رنگِ محفل دیکھا اور مولنا سے خطاب کر کے دردناک آواز میں یہ مقطع پڑھا

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس درد و فریاد سے بھری بزم تڑپ گئی اور مولنا آزردہ شرما کے دم بخود ہو کر رہ گئے۔

سید ابوالقاسم سرور

سب رس کے دکن نمبر کو دیکھنے کے بعد

پندارِ حقیقت ہے جن کو دھوکے میں ہیں یا دیوانے ہیں
ہستی سے عدم کی منزل تک کچھ خواب ہیں کچھ افسانے ہیں

ماضی کی زباں سے سن ناداں، روداد حیاتِ فانی کی
یہ شہر یہ ایواں اور یہ چمن، آباد نہیں ویرانے ہیں

اگلے سے نہ اب آئینِ جنوں، پہلے سے نہ اب اندازِ کہن
وہ بزم نہ وہ احساسِ دروں، وہ شمع نہ وہ پروانے ہیں

میخانہ کا در ہے آج بھی وا، اب بھی ہے چمن میں رقص ہوا
وہ پھول نہ وہ مستانہ ادا، ساقی ہے نہ وہ پیمانے ہیں

گردش میں ہے اب بھی ساغرِ مے، بیدار ہیں اب بھی نغمۂ نے
وہ مطربِ خوش گل ہے نہ وہ لے، وہ رند نہ وہ میخانے ہیں

قانونِ تغیر جاری ہے ہر پست و بلندِ دنیا پر
تعمیرِ حیاتِ فانی ہے مبنی متلون اجزا پر
موجوں میں نمایاں ہے جنبش اک جوش ہے سیل برپا میں
کچھ لوگ کھڑے ہیں ساحل پر، کچھ ڈوب رہے ہیں دریا میں

اب جن پہ اداسی چھائی ہے ان کے بھی کبھی افسانے تھے
چلتے تھے طرب کے جام یہاں، آباد یہی ویرانے تھے

دنیا نے انھیں سناٹوں کو سرگرمِ تکلم دیکھا ہے
ان سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ کبھی اک نورِ تبسم دیکھا ہے

اک عمر یہیں، ہُن برساتی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں
گایا ہے پپیہوں نے ساون، کوئل کی صدائیں آئی ہیں

خاشاک کے ان ڈھیروں میں کبھی کھلتی ہوئی کلیاں ہنستی تھیں
نغموں سے بھری راتیں تجھ پر! اے گردشِ دوراں ہنستی تھیں

اس خاکِ پریشاں سے برسوں خورشید و قمر شرمائے ہیں
کچھ یاد ہے ان ویرانوں پر ایسے بھی زمانے آئے ہیں

اٹھی ہیں صدائیں نغموں کی، دن رات انھیں ایوانوں سے
آباد رہے ہیں یہ صدیوں عشرت کی رسیلی تانوں سے

موتی کی دمک تھی ذروں میں، پھولوں کی لچک تھی خاروں میں
انساں کے تصور کی جنت ملتی تھی یہاں گلزاروں میں

صدیوں سے ابھی تک دہرائے جاتے ہیں اسی کے افسانے!
جو خوابِ سکوں دیکھا تھا یہاں اس عبرتِ غم کی دنیا نے

اک نور سا تھا پیمانوں میں، اک حسن سا تھا میخانوں پر
لہراتے تھے عشرت کے پرچم ان اجڑے ہوئے ایوانوں پر

معمار وہ قصرِ ہستی کے سوتے ہیں جو ان ویرانوں میں
اب جن کی حقیقت شامل ہے بھولے ہوئے کچھ افسانوں میں

للکار سے ان ساونتوں کی گردوں کا جگر تھرّاتا تھا
یہ بڑھ کے قدم رکھتے تھے جہاں طوفانوں کا دل ہل جاتا تھا

اربابِ نظر بھی تھے ان میں، سرآمدِ عز و جاہ بھی تھے
ہاتھوں میں کھنچی تلواریں بھی، سینوں میں دلِ آگاہ بھی تھے

اٹھتی تھیں گھٹائیں باطل کی گھر گھر کے گر چھٹ جاتی تھیں　　اشرار کی ٹڈی دل فوجیں کائی کی طرح پھٹ جاتی تھیں
جب انکی نگاہیں اٹھتی تھیں دنیا کی جبیں جھک جاتی تھی　　پڑتی تھی اگر ابرو پہ شکن ہر فوجِ دواں رک جاتی تھی

ان کو بھی نہ چھوڑا گردش نے پیشانی ماہی بن کے رہے
جو لوگ طرازِ ہستی تھے وہ عبرت ہستی بن کے رہے

ہستی کا یہی آئین مگر خود رنگِ رخ ایام بھی ہے!　　اس سعی و عمل کی دنیا میں فطرت کا یہی انعام بھی ہے
گردش کے سہارے پر ملتی ہے ہر عہد کی شرح بے خبری　　تکمیل کی جانب بڑھ جاتی ہے چند قدم، عقلِ بشری
اقوام میں جب ہوتا ہے بپا، ہنگامۂ جہل و نادانی　　ہوتی ہے تغیر کے ہاتھوں، تعمیرِ حیاتِ انسانی

خود بینوں کے افسانے ہوں یا تذکرہ ہو فیاضی کا
اک درس ہے، اک ٹکڑا لیکن روداد حیاتِ ماضی کا

علی اختر

سوز و ساز

تکمیل سوز و ساز کئے جا رہا ہوں میں　　دنیا کو درسِ شوق دئیے جا رہا ہوں میں
یوں عشق میں کسی کے جئے جا رہا ہوں میں　　ہر اک نفس اک آہ کئے جا رہا ہوں میں
اللہ رے پردہ داریٔ وحشت کا اہتمام　　دامن بہ قدر ہوش لئے جا رہا ہوں میں
تم بزم سے اٹھا تو رہے ہو مجھے مگر　　تم کو بھی اپنے دل میں لئے جا رہا ہوں میں
دنیا اسیر وہم ہے اور زندگی فریب　　حیران ہوں کہ پھر بھی جئے جا رہا ہوں میں
یہ ہے مآلِ شوق کہ دنیا سے اے ظفر　　کچھ داغ، چند زخم لئے جا رہا ہوں میں

محمد مظفر الدین ظفر

حُب کا عمل

کہتے ہیں اثر اور ہر دل عزیزی خداداد یا خدا ساز ہوتی ہے اور یہ ہے بھی سچ۔ اس کی زندہ مثال میری زندگی ہے۔ بعض مرتبہ میں پہروں سوچتی ہوں لیکن یہ بھید سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر عزیزوں اور ملنے جلنے والیوں کے ساتھ میرے برتاؤ میں وہ کیا خاص بات کہ جس کو دیکھو میری صلاح کا متمنی اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند۔ میری سہیلیوں کا یہ حال کہ شام ہوئی اور جمع ہوگئیں۔ ذرا کچھ مشکل پیش آئی اور صلاح لینے کے لئے آن موجود ہوئیں۔ میرا سینہ سیکڑوں رازوں کا گنجینہ تھا۔ یہ سب کچھ میرے لئے تو دفع الوقتی اور دلچسپی کا بڑا ذریعہ تھا۔ رہا صائب الرائے ہونا تو حالت یہ تھی کہ کوئی صلاح پوچھے بلا سوچے سمجھے ایک رائے دیدیتی اب یہ کہ میری رائے کیوں ٹھیک ہوتی اور کس لئے صائب سمجھی جاتی تھی یہ مجھے خود نہیں معلوم اس کا فیصلہ تو وہی کریں جنھوں نے زبردستی مجھے ناصح مشفق بنا ڈالا۔

اس سلسلے میں ایک بڑا لطیف واقعہ یاد آگیا۔ اسے سن کر آپ کے لبوں پر اگر خفیف سی مسکراہٹ بھی آگئی تو میں سمجھوں گی کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ جن سہیلی کا تعلق اس واقعہ سے ہے وہ تو اپنی حماقت کی داستان کا یوں دہرایا جانا ہرگز پسند نہ کریں گی۔ بہت جلیں گی۔ خوب گالیاں دیں گی۔ خیر تو ہوا یہ کہ والد صاحب مرحوم کو میلاد شریف سننے اور منعقد کرانے کا بڑا شوق تھا۔ ہر سال ربیع الاول میں تو خاص اہتمام ہوتا تھا۔ میں بھی اس موقع پر بلائی جاتی تھی۔ اس سال بھی میلاد شریف دھوم دھام سے ہوا۔ نزہت نے اپنے خاص طرز میں پڑھا بھی کچھ اس طرح کہ سننے والے تڑپ اٹھے۔ نزہت کی آواز کیا ایک جادو تھی جو دلوں کو مسحور کرلیا کرتی تھی۔ آہ اس کی ظاہری صورت۔ بس پڑھتے وقت بالکل جادوگرنی معلوم ہوتی تھی۔

بزم میلاد میں بہت سی نئی بیبیاں تھیں ان سب کے سامنے میری سہیلیوں نے میرا اتنا ذکر کر رکھا تھا کہ مزید تعارف کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ انھیں بیبیوں میں ایک جو بہت ہی کم سن تھیں اور حسین بھی، بڑے ہی غور سے بار بار میری طرف دیکھ رہی تھیں محفل کے ختم ہوتے ہی وہ میرے نزدیک آئیں بڑے تپاک سے ملیں گویا برسوں کی ملاقات تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک نئے ڈپٹی کلکٹر آئے ہیں یہ ان کی بیوی ہیں جنھیں مجھ سے ملنے کا غائبانہ بڑا اشتیاق تھا۔ چلو اس طرح ہماری اور عذرا کی دوستی ہوگئی۔ بہت ہی جلد گھل مل گئیں۔ اکثر اپنے گھر بلا بھیجتی خود بھی بار بار ملنے آتیں اور کہا کرتیں کہ "آپ کی باتوں سے میرا غم غلط ہوتا ہے۔" یہ غم غلط ہونے کے فقرے پر میں بہت چونکتی۔ یہ صورت، یہ سن اور "غم" خدا کی پناہ۔ بھلا کوئی بھی یقین کرے گا۔ بعد میں نزہت، ثروت اور شکیلہ نے بتایا کہ بے چاری کی خانگی زندگی اچھی نہیں ـــــ مجھ سے صلاح لینے کی متمنی ہیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں سوچ میں پڑ گئی اور اپنی سہیلیوں سے کہا کہ خدا کے لئے تم ہی انصاف کرو۔ میاں بیوی کا جھگڑا اور صلاح۔ بھلا میں کیا صلاح بتاؤں گی مگر یہ تینوں ایسی شیطان۔ بھلا کب ماننے والی تھیں۔ ان کو تو ہنسنے ہنسانے کے لئے ایک نیا مشغلہ روز چاہیئے تھا۔ بھولی عذرا سے کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھتیں اور پہروں ہنستیں۔ اب جو قریب ایک سال بعد مجھ سے ملی تھیں تو شرارت اور زوروں پر تھی۔ روز کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں۔ ایسی شرارت کہ شیطان کو بھی نہ سوجھے۔

الغرض ہوا یہ کہ ایک روز اپنی مصیبتوں کا حال عذرا نے رو رو کر سنا ہی ڈالا اور بڑی مسکین صورت بنا کر صلاح پوچھی۔ سب الکرش اصلاح اور وہ بھی ایسے نازک معاملے میں۔ نہ کبھی پہلے کی ملاقات نہ طبیعتوں سے واقف نہ حالات سے آگاہ۔ الٰہی میں کیا صلاح بتاؤں اور کیسے صلح کراؤں۔

"بہن راستہ چلتوں سے ایسے نازک معاملات میں صلاح نہیں لیا کرتے" تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا۔

"نہیں عذرا۔ یہ ضرور صلاح دیں گی۔ ان کی تو عادت پہلے ذرا خوشامد کرانے کی ہے ہی" نزہت نے شرارت سے کہا۔ شکیلہ بولی "عذرا تم ہمت نہ ہارو صلاح تو ان کو بتانا ہی پڑے گی۔" "بہت دنوں کے بعد آئی ہیں تو ذرا غمزے کرنے لگی ہیں" ثروت نے ایک اور پیر کا دیا۔

ان تیر و نشتر جیسے فقروں کی تاب نہ لا کر میں نے آخر آٹھ روز کی مہلت مانگی لیکن کثرتِ رائے سے تین روز غور کرنے کے لئے ملے۔ بھلا جس کے سر پر نزہت، ثروت اور شکیلہ جیسے تین جن پریوں کی صورت میں مسلط ہوں اسے کہاں نجات مل سکتی ہے۔ کم سے کم تمام دن تو ان سے نجات نہ تھی۔ صبح ہوئی اور ان ا اپنے گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہو وارد ہو جاتیں۔ یا تو میرے ہی پاس تمام دن کے لئے جم جاتیں یا پھر کہیں پک نک، ٹی پارٹی کے لئے نکل کھڑی ہوتیں اور مجھے بھی پکڑ لے جاتیں۔ اس طرح یہ تینوں جب شرارت پر اتر آتیں تو شوہر سے بچوں سے گھر سے بلکہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتیں اور اب تو شرارت یوں بھی زوروں پر تھی کہ انھوں نے بے وقوف بنانے کے لئے اپنے ساتھ بھولی عذرا کو بھی لگا لیا تھا۔ یادش بخیر! وہ بھی کیا زمانہ تھا، کیا دن تھے۔ کیا راتیں ——

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

کہنے کو تین دن تھے۔ اتنے عرصے میں اگر انسان کا دماغ صحیح ہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اتفاق کہ ہر چند دماغ پر زور ڈالا۔ رات دن سوچتی رہی مگر کوئی تدبیر سمجھ ہی میں نہ آئی۔

واقعہ یہ تھا کہ عذرا اور اس کا شوہر دونوں بیجا ضد اور ہٹ دھرمی کی بدولت ایک دوسرے کو تباہ کر رہے تھے۔ دونوں تکلیف میں تھے اور اس تکلیف کا ازالہ "اس مشکل کا حل" خود کردہ را علاجے نیست" کے مصداق ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ تھا۔ ثریا ہٹ کے ساتھ مرد ہٹ بھی مل گئی تھی۔ ڈپٹی صاحب کو غرور تھا شوہر ہونے کا، خدائے مجازی ہونے کا، اپنی اعلیٰ ملازمت کا، دولت کا۔ عذرا کو ناز تھا اپنے حسن پر، مذہبی تعلیم پر، اپنے حافظ قرآنی ہونے پر دونوں کی ضد جہالت کی ضد تھی اور اس وقت مجھے سابقہ کرنا تھا ہٹ دھرمی سے ضد سے پڑھی لکھی جہالت سے۔ صورت حالات میرے لئے سخت تھی اور بہت سخت تین شبانہ روز کی کاوشوں کا نتیجہ یہ الفاظ تھے جو میں نے عذرا سے کہے۔ "عذرا میں تمہارے لئے کچھ بھی رائے قائم نہ کر سکی۔"

بیچاری عذرا بڑی امیدوں سے آئی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ بیخ بستہ انسان جگنو کو شرارہ سمجھنے لگتا ہے اور اسی امید موہوم سے اپنے قلب حزیں کو تسکین دے لیتا ہے —— مگر —— جب اس کی یہ موہوم سی امید بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے، جب اس پر جگنو کی اصلیت آشکار ہو جائے۔ اُف! قلب مضطر کے لئے اس سے برا وقت کوئی بھی نہ ہوگا۔

عذرا کی مایوسی کی انتہا نہ تھی ——

" آپا تم میرے لئے حبّ کا عمل کسی عامل سے کرا دو۔"
اس نے انتہائی بے تکے پن سے بمنت مجھ سے کہا۔

" ہاں! حبّ کا عمل " میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ
اس متبرک سہ لفظی فقرے کی تکرار کی۔

اب میرا دماغ روشن تھا۔ میری نظروں میں ہر چیز
صاف تھی۔ "حبّ کا عمل، واقعی یہ عمل مجھے بہت اچھا آتا ہے"
میں نے عذرا کو اطمینان دلایا لیکن عذرا۔ یہ ہے بہت مشکل
کام تمھیں میرے کہنے پر حرف بہ حرف عمل اور میری ہدایتوں
پر قدم بہ قدم چلنا پڑے گا۔ تم سے یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔

" آپا غم گھن کی طرح مجھے لگ چکا ہے۔ زندگی بے کیف
ہو گئی، دنیا اور دنیا کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں بدنصیب
اس وقت بھی آپ کا کہنا نہ سنوں گی تو پھر کب سنوں گی" عذرا
نے بسورتے ہوئے کہا۔

عذرا اپنی بربادیوں کی داستان رو رو کر سنا رہی تھی
اور میرا دماغ اس کے لئے شاہ راہ عمل یا اسکیم بنانے میں
مصروف تھا۔ بار بار وہ میرے خیالات کے دلچسپ سلسلہ کو
اپنی باتوں سے توڑ توڑ دیتی تھی جس سے میرے دماغ پر بڑا
بار پڑ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی اس وقت کی باتوں میں سوائے
حماقتوں کے دھرا ہی کیا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اس
وقت رخصت کر دوں۔

" عذرا دیکھو تمھیں میرے پاس آئے خاصی دیر ہو گئی۔
ڈپٹی صاحب کے کچہری سے آنے کا وقت ہے۔ اب سدھارو۔
جا کر ان کے ناشتہ چاء وغیرہ کا بندوبست کرو" میں نے اس
سے کہا۔

" اے آپا۔ میں کیا خاک " ان کے " لئے کچھ کروں۔ " وہ "
میری صورت دیکھنے کے تو روادار نہیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی
سرکاری کاموں کی جھنجلاہٹ۔ سارے دن کی تھکن کا غصہ اتارنے
کو غریب بیوی کی جان ہے۔ کوئی بات خاطر ہی میں نہیں لاتے۔
میری تو ہر ایک بات "انھیں" بُری لگتی ہے۔ میرے لباس سے
نفرت بات بات پر نکتہ چینی، گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے، بچے
بُرے لگتے ہیں، نوکر تو ان کی صورت سے ڈرتے ہیں۔
کبھی ہنسنا بولنا تو جانتے ہی نہیں۔ بس صُمٌّ بُکمٌ کا مضمون ہے۔

" بس کرو عذرا " میں نے اکتا کر کہا۔ " اسی پر کہتی تھیں
کہ کہنے پر عمل کروں گی "

" نہیں آپا۔ میں نے تو صرف واقعات کا اظہار کیا اور
آپ کا کہنا تو میرے سر آنکھوں پر۔ آپ جیسا کہیں گی کروں
گی۔ للہ بتائیے بھی کہ گھر جا کر کیا کروں " عذرا نے شرمندہ
ہو کر کہا۔

" دیکھو عذرا۔ کل سے میرا عمل شروع ہوگا" میں نے
جواب دیا۔ " اور کل ہی سے تمھیں میری ہدایات پر عمل بھی کرنا
پڑے گا۔ آج کا دن تو خیر کسی طرح گزار لو۔ کل صبح اٹھ کر غسل کر کے
صاف کپڑے پہننا خوشبو لگانا گھر صاف رکھنا۔ ایک دو کام
ڈپٹی صاحب کے تم اپنے ہاتھ سے کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ
ان کی نظر تم پر پڑے اور وہ دیکھ لیں اور ہاں اگر تکلیف نہ ہو تو
ایک آدھ چیز اپنے ہاتھ سے تم ان کے لئے پکا بھی لیا کرو اور جہاں تک ممکن
ہو ہر وقت بشاش اور خاموش رہو۔

اتنے سخت احکامات سننے کے لئے عذرا بالکل تیار نہ تھی۔
اس کے غرور کو ٹھیس لگی اور اس نے اس طرح منہ کھولا جیسے کہ
وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن میں نے فوراً یہ کہہ کر اس کی زبان
بند کر دی۔

" سنو عذرا۔ یہ سب ہدایتیں اس لئے ہیں کہ عمل کے زمانہ

میں تم صاف ستھری رہو تاکہ موکل کو آسانی ہو۔ کھانا پکانے کی
ہدایت یوں کی ہے کہ اگر اس طرح کام نہ چلا تو شاید ڈپٹی صاحب
کی غذا میں کچھ ملانا پڑے۔ اگر تم خود پکاؤ گی تو پڑھا ہوا نمک
یا شکر با آسانی ملا سکو گی اور نوکروں تک کو خبر نہ ہو گی۔ تم بڑی
واہیات ہو۔ تم نے تو میرا دماغ چاٹ لیا۔ اگر یہی حالت رہی
تو عمل کے ختم ہونے کے قبل ہی میرا خاتمہ ہو جائے گا۔"
"اے خدا نہ کرے آپا نصیب دشمناں" کہتی ہوئی
نئی امیدیں اور ذمہ داریوں کا بوجھ لئے ہوئے عذرا کچھ ہنستی
ہوئی کچھ گھبرائی ہوئی رخصت ہوئی ــــــ

عذرا کے سر سے باپ کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھ چکا تھا۔
دادا کو ابا جان کہتی تھی۔ دادا ہی نے پرورش، تعلیم و تربیت
کی اور اس طرح کی جیسی کہ سو برس پہلے کے بچوں کی ہوا کرتی
تھی۔ شوہر لباس میں، گفتار میں، رہائش میں طرز جدید کے
دلدادہ۔ بیوی ان سے ایک صدی پیچھے۔ دونوں میں
بعد المشرقین بھلا زندگی خوش گوار کیسے ہوتی۔ پھر اس پر
ضد اور ہٹ دونوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ ڈپٹی
صاحب کی بڑی تمنا تھی کہ بیوی نئے طرز کے لباس میں ملبوس
نظر آئے لیکن تربیت کا اثر اور ابا جان (دادا) کا خوف،
عذرا اپنی پرانی وضع کو اب تک نباہ رہی تھی۔ شوہر کی تمناؤں
کا، آرزوؤں کا خون اس کے لئے پرکس سے زیادہ اہمیت
نہیں رکھتا تھا۔ ابا جان کو ناراض کر دینا البتہ ایسا گناہ عظیم
تھا جو اس کے نزدیک خدا کے حضور میں قابلِ معافی نہیں
ہو سکتا تھا۔ قیمتی لباس ہفتہ میں ایک بار بدل لیا۔ اس بات
سے شاید اس کے دل کو تسکین رہتی تھی کہ لباس خواہ کتنا ہی
میلا کیوں نہ ہو، ہے تو ریشمی اور قابلِ قدر۔ اس پر طرّہ،
سردی کے موسم میں وہ کمخواب کی روئی کی صدری، جو نہ
دھل سکے نہ صاف ہو سکے۔ بدستور شبانہ روز ہمدم و دم ساز
خواہ وہ کتنی ہی میلی ہو جائے۔ گرگٹ کی طرح کتنے ہی رنگ
بدل ڈالے۔ ہے تو کمخواب کی۔ چوٹی کا نشان اس پر۔ گلے کے
میل کی تہ اس پر۔ کہیں جانے کے وقت اور کپڑے بدل لئے
لیکن یہ صدری اس وقت بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ بہت
کیا اوپر سے ایک قیمتی کرتہ اور پہن لیا۔ ابا جان کے خوف سے
نہ تو وہ ساڑی پہن سکتی تھی نہ سوٹر۔ ڈپٹی صاحب کو ان
باتوں سے سخت نفرت تھی۔ قصور وار وہ بھی ہیں۔ حکومت کے
زعم میں بیوی کو وہ راہ راست پر نہ لا سکے۔ بیوی میں اصلاح
کرنے کے متمنی ضرور تھے لیکن سختی کے ساتھ نفرت و حقارت کے
ساتھ۔ عذرا تو ایک حد تک بری الذمہ تھی کیونکہ وہ خوب سمجھتی تھی کہ
شوہر تو بفضل خدا عرصے تک دنیا میں رہیں گے لیکن ابا جان
جو کہ عنقریب اللہ میاں کے پاس جانے والے ہیں اور عزم سفر
بھی کر چکے ہیں۔ کہیں جا کر اس کی شکایت نہ کر دیں اور کہیں
ایسا نہ ہو کہ دوزخیوں کی فہرست میں اس کا نام درج ہو جائے
ــــ "وہ" بعد میں جا کر حضور خداوندی میں صفائی پیش
بھی کرتے رہے تو کیا۔ دوزخیوں کے رجسٹر میں ایک بار نام
داخل ہونا ہی انسان کے داخلِ جہنم کرنے کو کافی تھا۔ نہ اس
کی کوئی تلافی ممکن تھی نہ اپیل۔

چونکہ یہ معاملہ بے حد لطیف تھا اور انتہائی دلچسپ۔ بستر پر
لیٹی تو خود بخود ہنسی آنے لگی۔ رات کے دو بجے تھے۔ خیالات کا سلسلہ
کہیں سے کہیں پہنچ رہا تھا۔ عذرا کی دکھتی ہوئی رگ میں نے پہچان
لی تھی۔ مذہبی پہلو کے سوا اس کی اصلاح کا اور کوئی طریقہ ممکن
ہی نہیں تھا۔ زاہد خشک عذرا کی اصلاح مذہبی پہلو سے کرنی مقصود
تھی۔ بس! یہ تھی میرے حُب کے عمل کی اصلیت۔ میرے اللہ!!
یہ سب کیسے ہو گا؟ کیا یہ ضدی لڑکی میرے کہنے پر چلے گی؟

رب العزت! تو ہی میری مدد کرنا۔

اگلے روز میں نے عذرا کی بالکل خبر نہ لی۔ دوسرے روز نزہت، ثروت اور شکیلہ کو لے کر میں اس سے ملنے گئی۔ وہ کچھ سراسیمہ اور افسردہ تھی۔ اور میری تمام ہدایات پر نہایت سختی سے عمل کر رہی تھی۔ اس نے اپنی کاوشوں کی روئداد یوں بیان کی کہ شبِ گزشتہ جب وہ ڈپٹی صاحب کا بستر ٹھیک کرنے لگی تو جلالت مآب ڈپٹی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ سے چادر چھین کر خود بچھا لی۔ صبح کے ناشتہ کے بعد جب عذرا نے ان کا پائپ کمرۂ خواب سے لا کر دیا تو اسے انھوں نے لے کر زمین پر پھینک دیا۔ صداقت کے طور پر عذرا نے پائپ کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا جو کمرے میں جابجا منتشر تھے۔

ناشتہ کے بعد دوپہر کے کھانے کی مہم یوں سر ہوئی کہ جب عذرا نے قورمہ کی ڈش یہ کہہ کر پیش کی کہ "یہ میں نے خاص طور پر آپ کے لئے پکایا ہے" تو ڈپٹی صاحب نے جوش میں آ کر اسے اس زور سے ہٹایا کہ گرم قورمہ خود ان کے اوپر چھلک پڑا۔ دل بھی جلا اور جسم بھی۔ کپڑے تو بھلا خراب ہونے ہی تھے۔ بکتے جھکتے آفس میں چلے گئے۔

عذرا کے پاس آنے کے قبل نزہت، ثروت اور شکیلہ کو صورت حالات سمجھا کر خاموش رہنے کی تاکید کر دی تھی لیکن سنجیدگی ان شرارت کی پتلیوں میں کہاں۔ ہنستے ہنستے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں اور میرا دل الجھ رہا تھا۔ آئی عقل گم ہوئی جا رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو عذرا کو ثابت قدم رہنے کی تاکید کر کے میں تو چلی آئی۔

مجھے اب عذرا سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ ہر روز اس کے حالات دریافت کر لینا اور اسے مناسب ہدایات دینا اب میرا محبوب ترین شغلہ تھا۔ وہ میرے احکامات پر نہایت سختی سے عمل کر رہی تھی۔ تمام کام ڈپٹی صاحب کے اس نے اپنے ذمہ لے لئے تھے حتیٰ کہ ان کے کپڑے تہ کر کے رکھنا۔ دھلے کپڑے الماری سے نکال کر رکھنا، جوتہ صاف کرنا، ایسے بیسیوں کام تھے جن میں وہ تمام دن مصروف رہتی۔ نتیجہ صاف تھا پہلے روز جو وحشت ڈپٹی صاحب کے مزاج میں تھی دوسرے روز نہ رہی اور تیسرے چوتھے روز تو انھیں یقین ہو گیا کہ بیوی جو کچھ کر رہی ہے خدمت کرنے کی نیت سے کر رہی ہے۔ چڑانے یا دل جلانے کے لئے نہیں۔

اس احساس کے ساتھ جوں جوں ان کی وحشت کم ہوتی گئی صلح کی کڑی منزلیں طے ہوتی گئیں۔ عذرا اب خوش تھی۔ "بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے"۔ یہ میں نے اس وقت اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ لیکن بھولی عذرا اب تک یہی سمجھے ہوئے تھی کہ یہ میرے خاص حُب کے عمل کا اثر ہے۔

میں مطمئن تھی۔ عذرا کے معاملات بتدریج سلجھ رہے تھے۔ یا یوں کہو کہ قریب قریب سلجھ چکے تھے صرف ضرورت تھی استحکام کی۔ میرا والد صاحب کے پاس کا زمانہ قیام اختتام پر تھا۔ مجھے اب گھر واپس جانا تھا۔ اپنی سہیلیوں کو لے کر عذرا سے رخصت ہونے جو گئی تو وہاں تو معاملہ ہی دگرگوں پایا۔ عذرا رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں سارا چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے جو دیکھا تو اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جوشش گریہ اگر خفیف ہو تو محبت و ہمدردی آنسوؤں کو جذب کر لیتی ہے لیکن جب سیلاب گریہ زوروں پر ہو تو محبت کا

ذرا سا سہارا اس طوفان کو اور بھی تند و تیز کر دیتا ہے۔

عذرا آنسوؤں کے تلاطم میں بھی جاری تھی ہم اس اضطراب کا سبب دریافت کرنے کے لئے مضطرب تھے لیکن کثرت گریہ نے اس کی قوت گفتار سلب کر لی تھی۔

"تف ہے تمہارے او پر اور تمہارے رونے پر" میں نے تھوڑے سے انتظار کے بعد ترشی سے کہا۔

میرا عقیدہ ہے کہ جہاں آنسو گرے اور اپنے ساتھ مصیبتوں کا پہاڑ لائے۔ آنسو نحوستوں کا پیش خیمہ ہیں۔ نیستی کا پیغام ہیں۔ جو لوگ کہ ذرا سی تکلیف سے گھبرا کر رونے بیٹھ جاتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ اس طرح دماغ کو رو رو کر خراب کرنے کے بجائے اگر یہی دماغی قوت غور کرنے اپنی تکالیف کا چارہ کار اور نجات کا راستہ تلاش کرنے میں صرف کی جائے تو مصیبت کے دور ہونے کا امکان بھی ہے۔ گریہ و زاری سے کبھی بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہنسنے والے کا ساتھ سب دیتے ہیں۔ رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔

میں اس کو اس بے ڈھنگے پن سے روتا دیکھ کر بجائے متاثر ہونے کے بہت برافروختہ ہوئی۔ دراصل اس وقت مجھے غصہ آ بھی گیا تھا۔ میری ترش کلامی سے عذرا کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے آنسو رک گئے۔ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ سے منہ صاف کر کے کہنے لگی۔

"آپا جب سے آپ نے دعا شروع کی" ان کی "مہربانیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ سوائے پہلے دو چار روز کے" "انھوں" نے اس کے بعد تو کبھی غصہ سے بات بھی نہیں کی۔ لڑنا تو دوسری چیز ہے۔ اب تو یہاں تک خوش تھے کہ جب بازار جاتے کوئی چیز میرے لئے ضرور خرید لاتے۔ کل ایک اونچی ایڑی کا جوتا اٹھا لائے۔ بھلا یہ میرے کس کام کا۔ ابا جان

کو اگر ذرا بھی اس کی خبر ہو گئی تو میری "خسر الدنیا والآخرۃ" کی مثل ہو جائے گی۔ اور آج تو کمبخت یہ ساڑی میرے لئے مصیبتوں کا پیش خیمہ بن کر آ گئی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت ساڑی بے ترتیبی سے قالین پر پڑی ہے۔

"ساڑی اور جوتے کا تحفہ! واقعی ہے بھی یہ رونے کی بات" میں نے طنزاً کہا۔ "نہیں آپا۔ پہلے آپ سن تو لیں" عذرا نے نہایت پست لہجہ میں بولنا شروع کیا۔ "جب وہ "ساڑی لائے تو مجھ سے اس کے پہننے پر بہت اصرار کیا میں نے صرف اتنا کہا کہ بھلا میں اسے کیسے پہنوں۔ ابا جان خفا ہوں گے بس آپا اتنا سننا تھا کہ آپے سے باہر ہو گئے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ" اباجان ہی سے تم نے کیوں نہ شادی کر لی" عذرا نے رونے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"یہ ایسی کونسی رونے کی بات تھی جس پر تم نے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے اس سے تو الٹا ان کی حماقتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ تم نہایت تحمل سے جواب یہ دیتیں کہ آپ کی نیک صلاح کا شکریہ لیکن اب تو یہ صلاح بعد از وقت ہے۔ شادی تو آپ سے ہو چکی ہے۔" میں نے ہمدردی کے لہجہ میں سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ ذرا آئینہ لے کر تو دیکھو۔ کتنی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ بس اب اٹھو۔ منہ ہاتھ دھو کر انسان کی سی صورت بناؤ۔ ورنہ میں اب تم سے ہرگز بات نہ کروں گی۔"

عذرا کو حمام خانہ میں بھیج کر میں اس کی نئی ساڑی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس میں سے بلاؤز کا ٹکڑا نکال کر قطع کیا۔

"لو اب بہت ہنس چکی۔ اس کو تینوں مل کر ذرا جلدی سے سی تو ڈالو" میں نے کہا۔ شکیلہ کو سلائی کا بہت

شوق تھا۔

اپنی آیا کو موٹر پر بھیج کر قاسم سیٹھ کی دوکان سے ساڑی کا ہم رنگ سوئٹر منگایا۔ بلاؤز سل کر تیار تھا۔ عذرا منہ دھوکر آ گئی تھی۔ اس پر ایک عجیب سکوت طاری تھا۔ سکوت! ایک معنی خیز سکوت!!۔

ہم نے اس کے بال بطرز جدید سنوارے، ساڑی اور بلاؤز کے ساتھ اونچی ایڑی کا جوتا بھی اسے پہنا دیا۔ اور وہ فاصلہ جسے ڈپٹی صاحب "بعد المشرقین" کہا کرتے تھے ہم نے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں عذرا سے طے کرا دیا۔ ہم چاروں بلائے آسمانی بن کر اس پر چھا گئے تھے۔ رب الکعبہ کیا حب کا عمل اسی طرح کیا جاتا ہے؟ اس عمل کے موکل ایسے تو نہیں ہوتے!

نئے لباس کے ساتھ عذرا کے خیالات بھی بدل چکے تھے۔ اس کا غرور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اس کی ضد پر میں نے فتح پائی تھی۔ یہ فتح میری نہ تھی بلکہ اس احترام اور محبت کی فتح تھی جو عذرا کے دل میں میری طرف سے قایم ہو چکی تھی۔

عذرا کی اصلاح کرنا بہ ظاہر پتھر کو جونک لگانا تھا۔ اس کی خشک اور مغموم طبیعت میں تبدیلی پیدا کرنا سنگلاخ زمین میں گل کاری کرنا تھا مگر محبت! پاک اور بے لوث محبت اور خلوص سے پتھر موم ہو چکا تھا۔ بنجر زمین میں سدا بہار پھولوں کے پودے لہلہا رہے تھے۔ کاش کہ ڈپٹی صاحب نے اس پر غور کیا ہوتا۔

عذرا نیا جوڑا پہنے آسمانی حور بنی بالکل ساکت و بے حس بیٹھی تھی۔ ڈپٹی صاحب کے کچہری سے آنے کا وقت نزدیک تھا۔ میں اسے الوداع کہنے کو اٹھی۔

"پیاری عذرا۔ میرا عمل کامیابی سے ختم ہو چکا خدا تمھیں نت نئی خوشیاں دیکھنی نصیب کرے" عذرا سے گلے ملتے ہوئے میں نے کہنا شروع کیا۔ "اور ہاں عذرا۔ یہ روئی کی صدری تم مجھے دیدو۔ تمھاری حماقتوں کی اس یادگار کو بطور تبرک میں اپنے پاس رکھوں گی۔ تمھاری بدولت میرا یہ سفر نہایت کامیاب رہا۔ بڑی دلچسپی سے وقت گزرا۔ اس کے عوض میں یہ سوئٹر تمھاری نذر کرتی ہوں"۔ میں نے اسے سوئٹر پہناتے ہوئے کہا۔

عذرا اب بھی خاموش تھی۔ وہ اس طرح سر جھکائے کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم اقبال جرم کے بعد جج کے سامنے کھڑا ہو۔ اس کو اپنے جرم کا احساس پورے طور پر ہو گیا تھا۔ یا شاید اب بھی وہ منتظر تھی کہ میں اسے کوئی نیا عمل سکھاؤں گی۔

اس واقعے کے چار سال بعد عذرا سے پھر ملاقات ہوئی۔ وہ خوش تھی اور بہت خوش۔ میرا حب کا عمل بہت ہی پر تاثیر تھا۔ اس نے اور ساتھ ہی اس کے شوہر نے اسے سیکھ لیا تھا۔ یہ راز بھی ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ انسان یا تو کسی کو اپنا کر لے یا کسی کا ہو رہے۔ بغیر اس کے نہ تو دنیا میں اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے نہ مسرت۔

خیر گزری کہ عمل کرتے وقت میں نے عذرا سے وعدہ لے لیا تھا کہ میرے عامل ہونے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ خدا کا شکر ہے!۔ ورنہ آج مجھے "حب کا عمل" کرنے سے کسی سے بات تک کرنے کی فرصت نہ ملتی۔

واقعی بڑی خیر گزری!!!

بلقیس بانو

(اردو فاضل)

میر محمد مومن کا ذوقِ تعمیر (سلسلہ گزشتہ)

مولانا حسین شیرازی

میر محمد مومن صاحب کی مسجد میں جو کتبہ ہے وہ حسین شیرازی کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ میر صاحب کی دوسری مسجدوں کے کاتب بھی یہی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ کتبہ کے سلسلے میں ان کا کچھ حال درج کیا جائے۔ اس کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے کتبے اور کہیں اب تک نظر سے نہیں گزرے اور دوسرے اس لئے کہ یہ میر صاحب کے خاص دست گرفتہ تھے اور انھوں نے اپنے اس محسن کی مہربانی اور سرپرستی کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک بہت اچھا مرتبہ حاصل کیا تھا۔

سیدآباد کی مسجد کے کتبے میں انھوں نے اپنا نام صرف حسین شیرازی لکھا ہے لیکن میر پیٹھ کے کتبہ میں

"عبدہ حسین بن محمود الشیرازی ۱۰۲۰ھ"

درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ ان کے والد کا نام محمود شیرازی تھا۔ ان کے حالات اور کتبوں کی تلاش کے سلسلے میں حدیقۃ السلاطین اور حدیقۃ العالم میں منتشر سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جن کو تسلسل کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مولانا حسین تقریباً سنہ ۹۵۵ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ سنہ ۱۰۳۵ھ کے اوائل میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ حدیقۃ العالم میں لکھا ہے:-

"مشارٌالیہ کہ ہشتاد مرحلہ از مراحل زندگانی طے نمودہ بود رخت اقامت ازیں سرائے فانی بربست[۱]"

یہ تقریباً پینتالیس[۱] سال کی عمر میں حیدرآباد آئے اور اُن ایرانیوں میں سے ہیں جو میر صاحب کے توسط سے محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے۔ ایسی ہی مثالوں کو پیش نظر رکھ کر مصنف عالم آرائے عباسی نے سنہ ۱۰۱۵ھ میں میر صاحب کے متعلق لکھا تھا:-

"مستحقین ہر دیار بوسیلۂ جناب میراز سلسلۂ علیہ انتفاع می یابند[۲]"

غرض میر محمد مومن بڑے جوہر شناس تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس جوہر قابل کو بھی پرکھ لیا اور محمد قلی قطب شاہ کے دار الانشا اور کتب خانہ میں مامور کرا دیا۔ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے۔

"در سلک کتاب این دولت خانۂ عالیہ منتظم بود[۳]"

یہ خدمت اور میر صاحب کی مسجدوں کے خوبصورت کتبے ظاہر کرتے ہیں کہ مولانا حسین اعلیٰ درجہ کے خطاط اور خوشنویس تھے۔ لیکن تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض خوشنویس ہی نہ تھے بلکہ نہایت متقی، پرہیزگار، سلیم الطبع اور نیک خو بھی تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

"بصلاح جبلی و سلامت نفس اتصاف داشت[۴]"

یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے دوسرے مشہور خطاطوں مثلاً محمد اصفہانی، اسمٰعیل بن عرب شیرازی، تقی الدین، محمد صالح البحرینی اور کلب علی بن محمد صادق وغیرہ کو چھوڑ کر میر صاحب نے اپنے کتبوں کے لئے ان کو منتخب کیا تھا۔

مولانا حسین عہد محمد قلی میں حیدرآباد ہی میں رہے اور

---

[۱] دیکھو حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۶

---

[۲] دیکھو مطبوعہ صفحہ ۱۵۹۔ لیکن اس کے ایک قلمی نسخے میں جو مولوی قاسم علی بیگ صاحب انگر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس عبارت میں کچھ اختلاف ہے۔ اس میں لکھا ہے: "مستحقین ہر دیار بوسیلۂ او از سلسلۂ قطب شاہیہ تمتع می یابند" [۳] حدیقہ صفحہ ۱۰۔ [۴] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰ و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۶۔

اس کی وفات سے متاثر ہو کر نوجوان شہزادہ محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد جیسے اور بہت سے ایرانی علماء و امراء مثلاً شیخ محمد ابن خاتون اور مرزا محمد امین میر جملہ وغیرہ حج و زیارت کی رخصت لیکر یا کوئی اور ضرورت پیش کر کے یا ہمیشہ کے لئے حیدرآباد سے ایران وغیرہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ مولانا حسین نے بھی حج اور زیارتوں کی غرض سے سفر کی اجازت حاصل کی۔ اور سنہ ۱۰۳۰ھ کے قریب اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے[1] جب میر مومن صاحب عبداللہ قطب شاہ کی تعلیم اور اتالیقی کے لئے کسی لائق اور بزرگ سیرت عالم کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ان کے واپس ہوتے ہی میر صاحب نے ان کو سلطان محمد کی بارگاہ میں پیش کر کے شہزادہ کی تعلیم پر مامور کرا دیا۔ نظام الدین احمد شیرازی نے لکھا ہے :-

"رخصت رفتن بہ مکہ معظمہ حاصل نمودہ بشرف طواف بیت اللہ الحرام و سعادت زیارت مرقد مطہر خیر الانام و سایر عتبات طاہرات ائمہ کرام علیہم الصلوات اللہ الملک العلام مشرف و مستعد گردیدہ درین وقت مراجعت نمودہ بود بعلم و صلاح جبلی و سلامت نفس موصوف بود. نواب مرتضی ممالک اسلام میر محمد مومن مولوی را بجہت این خدمت پسندیدہ مجدداً بشرف ملاقات خاقان زمان مشرف ساختہ خلعت این خدمت عالی بہ قامت قابلیت مولوی مرتب داشتند[2]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب حسین شیرازی پر کتنے مہربان تھے جس وقت (یعنے سنہ ۱۰۳۱ھ میں) حسین نے میر صاحب کی

[1] حسین شیرازی کی واپسی کی تاریخ کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ شہزادہ عبداللہ مرزا کی تعلیم کے لئے اسی سنہ میں ایک قابل اتالیق کی تلاش کی گئی۔ [2] حدیقہ صفحہ ۱۰۔

مسجد کا کتبہ لکھا تھا اس وقت ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ ہوگا کہ ایک روز ان خدمات کے صلہ میں میر صاحب ان کو اتنا بڑا اعزاز دلوائیں گے۔ غرض حسین شیرازی نے مبارک ساعت دیکھ کر اس خدمت جلیلہ کے کام کا آغاز کیا۔ اور شاہزادہ عبداللہ مرزا کے یہاں حاضر ہونے لگے۔

مولانا حسین کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی شاہزادہ کو پڑھنے لکھنے کی طرف راغب دیکھتے تو قرآن مجید کی تلاوت کراتے اور مذہبی مسائل و احکام سے آگاہ کرتے رہتے[3]۔ اس طرح دو سال کے عرصہ میں مولانا نے عبداللہ قطب شاہ کو قرآن مجید اور مذہب اسلام کا کافی مطالعہ کرا دیا۔

جب یہ شہزادہ دس سال کی عمر کو پہنچا تو اس کے اتالیق خواجہ مظفر علی تبریزی کا بھی انتقال ہوگیا۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک جو شخص بھی شہزادہ عبداللہ کی خدمت لگی یعنے نگرانی و اتالیقی وغیرہ کے لئے مقرر کیا گیا وہ بہت جلد انتقال کر گیا۔ اس طرح کئی اچھے اچھے لوگ مثلاً میر قطب الدین نعمت اللہ شیرازی، مرزا شریف شہرستانی، اور میر محمد مومن اسی شہزادہ کی قربت، تعلق، اور خدمت میں راہی جادۂ فنا ہو گئے۔ اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا خواجہ مظفر علی کے بعد خود مولانا حسین شیرازی کا بھی یہی حال ہوا۔

غرض خواجہ مظفر علی کے انتقال کے بعد شہزادہ عبداللہ کو بالکلیہ طور پر مولانا حسین شیرازی کی نگرانی میں دیدیا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ کیونکہ ماہرین نجوم کی پیشین گوئی کے مطابق ولیعہد سلطنت اپنے باپ سلطان محمد کی نظروں سے اوجھل غیروں کے گھروں میں پرورش پا رہا تھا جو اس کی موت و زیست اور

[3] حدیقہ صفحہ ۱۰۔

اچھی اور بری نشو و نما کے بالکلیہ ذمہ دار تھے اسی لئے شروع ہی سے جن جن لوگوں کے یہاں شہزادہ کو رکھا گیا وہ بادشاہ کے خاص معتمد علیہ اور دربار کے معتبر اراکین میں سے تھے۔ اور چونکہ ان میں سے اکثر حضرت میر محمد مومن کی سفارش پر منتخب کئے گئے تھے اسلئے ان کا تذکرہ اور اس خدمت کی اہمیت کا حال آئندہ فصل میں جو عہد محمد قطب شاہ کے لئے وقف ہے درج رہے گا۔

خواجہ مظفر علی کی وفات کے بعد مولنا حسین اپنا مکان چھوڑ کر مظفر علی ہی کے مکان میں آرہے تاکہ رات اور دن ہمہ وقت شہزادہ کے قریب رہیں۔ خواجہ کے مکان میں شہزادہ کے لئے ایک رفیع الشان قصر بنایا گیا تھا جس کو تکلفات گوناگوں اور تصرفات موزوں سے سجایا گیا تھا[1]۔ اور خود خواجہ نے شہزادہ کی تشریف آوری کے وقت اس قصر میں زربفت اور ابریشم کو پائے انداز کرکے زر و جواہر نثار کیا تھا۔ اور شہزادہ کو خوش رکھنے اور اس کا دل بہلانے کی خاطر اپنے محل کو نگار خانۂ چین بنا دیا تھا۔

مولنا حسین شیرازی جیسے متقی بزرگ کے مکان میں یہ تکلفات کہاں۔ اس لئے وہ خود اس محفل میں آرہے۔ اور شبانہ روز ایسی خدمت کی کہ سایہ کی طرح شہزادہ سے کبھی جدا نہ ہوتے تھے۔ ان کی اس توجہ اور شفقت کی وجہ سے شہزادہ عبد اللہ مرزا بھی ان کا اتنا دلدادہ ہو گیا کہ ایک لمحہ کے لئے ان سے جدا نہ ہونا چاہتا تھا۔ تاریخ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ازیں جہت شاہزادۂ عالم را کمال لطف و شفقت
بحال مولوی بہم رسیدہ نمی خواستند کہ مولوی یک
لحظہ از قدوم بہجت لزوم دوری نماید۔ وعلی الدوام
مولوی بمراسم بندگی و خدمت قیام داشت[2]"۔

اسی اثناء میں شہزادہ نے گیارھواں سال ختم کرکے بارھویں میں قدم رکھا اور غالباً ذیقعدہ یا ذالحجہ سنہ ۱۰۳۴ھ میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ دروازوں میں سے گزر کر ایک عظیم الشان باغ میں داخل ہوا ہے جس کی سیر سے وہ محظوظ ہی ہو رہا تھا کہ یکایک تمام درخت اس کو سجدہ کرنے لگے۔ اس کے بعد جدہر وہ جاتا اس طرف کے درخت اس کے آگے سر بہ سجود ہو جاتے۔

جب صبح کو شاہزادہ بیدار ہوا اور حسین شیرازی نماز صبح کے فرائض و نوافل اور اوراد و وظائف سے فارغ ہوتے ہی حسب عادت اس کے بستر پر آکر دعا و ثناء میں مشغول ہوا تو شہزادہ نے اپنے بوڑھے دوست سے رات کے خواب کا واقعہ بیان کیا۔ بوڑھا شفیق فوراً خواب کی تعبیر سمجھ گیا۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس نے عرض کیا کہ یہ خواب شہزادہ کی بادشاہت و سلطنت کی بشارت دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی تاکید کر دی کہ یہ خواب اور اس کی تعبیر کسی سے بیان نہ کی جائے۔ مولنا حسین شیرازی نے جس پُر خلوص انداز میں شہزادہ کو نصیحت کی تھی ذیل کے جملوں سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"ایں پیر حقیر خدمتگار متوقع است کہ با حدے از
ملازمان ایں خواب را اظہار نہ فرمایند۔ و ایں معنی
را در ضمیر اقدس مستور دارند تا جمال حقیقت ایں رویا
از نقاب حجاب نہاں و تجلیات ایں صورت زیبا در
مرات شہود عیاں جلوہ گر شدہ منظور انظار عامیاں
گردد[3]"۔

---

[1] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۹۔

[2] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰۔ [3] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۲۔ و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۷۷

شہزادہ کو بھی اپنے اس مخلص استاد اور مشفق اتالیق کی بات کا اتنا خیال تھا کہ اس نے کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کو چند ماہ گزر گئے اور خود مولانا حسین شیرازی کو بھی دنیا سے کوچ کرنا پڑا۔

حسین شیرازی کی صحیح تاریخ و روز وفات تو معلوم نہ ہو سکا لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے میر مومن کے چند ہی ماہ بعد یعنے اوائل ۱۰۳۵ھ میں (قبل ماہ جمادی الاول) وفات پائی۔ کیونکہ ان کی وفات کے دو تین مہینوں کے بعد ہی ۱۳ جمادی الاول ۱۰۳۵ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کا بھی انتقال ہوا تھا۔

مولانا حسین کی وفات کا ان کے شاگرد اور معتقد شہزادہ عبداللہ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ تنہائی سے گھبرا گیا اور اپنے نادیدہ باپ سلطان محمد قطب شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بار بار کہلا بھیجنا شروع کیا چنانچہ مورخین لکھتے ہیں :-

"بعد ازیں قضیہ (یعنے وفات حسین شیرازی) شہزادہ یوسف طلعت سکندر خصلت را تاب تنہائی نماند۔ و منتظر بودند کہ کلفت بعد و ہجر بالفت قرب و وصل مبدل و جمال باکمال والد ماجد فرشتہ خصال را بزودی مشاہدہ فرمایند[1]......"

سلطان محمد قطب شاہ بھی بارہ سال سے اپنے فرزند کے دیدار کا مشتاق تھا۔ وہ نجومیوں کے کہنے پر محض اس لئے عمل پیرا تھا کہ میر مومن صاحب نے بھی اپنے علم کے زور پر اس کی تصدیق کی تھی[2]۔

لیکن اب تو میر صاحب بھی باقی نہ رہے تھے۔ اس نے ہمت کر کے دن تاریخ مقرر کر لی اور بیٹے کو غالباً ماہ ربیع الاول میں اپنے یہاں بلا لیا۔ حالانکہ اس وقت تک پورے بارہ سال گزرنے نہ پائے تھے کیونکہ شہزادہ عبداللہ بروز دوشنبہ ۲۰ شوال ۱۰۲۳ھ کو پیدا ہوا تھا اور ۲۰ شوال ۱۰۳۵ھ کو قمری مہینوں کے حساب سے بارہ سال پورے ہوتے تھے[3]۔

اس ملاقات کا مہینہ ربیع الاول اس لئے قرار پاتا ہے کہ ملاقات کے چند ماہ بعد تک سلطان محمد زندہ رہا کیونکہ مورخین لکھتے ہیں کہ باپ بیٹے چند مہینے ایک ساتھ رہے اور باپ نے اپنے ولی عہد سلطنت کو بہت سے امور سلطنت سکھائے۔ مورخ کے الفاظ ہیں :-

"(۱) چند ماہے از تاثیر قران نیرین آسمان سلطنت و شہریاری شادمانی و عالمیان عام و خوشحالی کہ جنس نایاب است فراواں گردید[4]"

(۲) ہمگی اوقات بتر تیب شاہزادہ ہوشمند و دانا دل پرداختہ در تعلیم قواعد جہانداری و معدلت و آداب گیتی آرائی و نصفت و قانون مجلس و دیوان داری و مراسم پادشاہی و شہریاری و اہتمام عساکر و رعایت رعایا و مرحمت بر سائر خلائق و کافۂ برایا عمر عزیز را صرف می نمودند۔ و ہمیشہ گوش ہوش شاہزادہ عالیاں را بہ دُرر نصائح و لآلی مواعظ کہ مشتمل بر آداب سلطنت و رسوم خلافت بود مزین ساختند۔

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۔ [2] نجومیوں نے کہا تھا کہ "چوں دوازدہ مرحلہ از مراحل عمر شہزادہ عالمیان طے شود باید کہ شہنشاہ دوران دیدۂ بدیدار جمال شاہزادہ جہانیاں منور سازند و اتفاق قران نیرین بعد از انقضائے سنوات مذکور بوقوع پذیرد" حدیقۃ السلاطین

[3] عجیب بات یہ ہے کہ نظام الدین احمد شیرازی نے اس قبل از وقت ملاقات کی نسبت لکھا ہے کہ "بعد از انقضائے سنوات موعود و مرور ایام معہود" لیکن حساب کے لحاظ سے یہ بیان بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ [4] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۹۔

وخزانۂ حافظہ اش را از جواہر و آلالی تواریخ و اخبار و
سیر سلاطین، و وقایع روزگار، و تجارب خواقین عالی
مقدار از منہ و اعصار کہ ہر یک بوقت خود در کارات
مملو و مشمول می داشتند۔ و چندا ہے بایں نوع می
گزرانیدند[1]۔"

یہ ہم جانتے ہیں کہ سلطان محمد ۱۳ رجمادی الاول کو انتقال کر گیا تو اس سے چند ماہ پیشتر ماہ ربیع الاول ہی کا مہینہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ نے ملاقات کے لئے

"روز مبارک و ساعت مسعود اختیار فرمودہ[2]"

اور ربیع الاول کی ۱۲ یا ۱۷ سے بہتر کونسا مبارک و مسعود دن ہو سکتا تھا۔

یہ ملاقات ربیع الاول سے پہلے ممکن نہ تھی کیونکہ شہزادہ نے ذلیقعدہ یا ذالحجہ ۱۰۲۴ھ میں (یعنے بارہویں سال میں قدم رکھنے کے بعد) خواب دیکھا تھا اور اپنے بوڑھے استاد کو سنایا تھا جس کے کچھ ماہ بعد یہ استاد فوت ہوا۔ کیونکہ لکھا ہے:۔

"وچوں چندا ہے براین بگذشت مولوی کہ نہایت سن در یافتہ و ضعف شیخوخیت کمال قوت بہم رسانیدہ بود مزاجش کاستہ وگداختہ بیش ازیں در ساحت حیات و فضائے کائنات استقامت و استدامت نتوانست نمود بر فراش ناتوانی متقاعد گردیدہ عزم ارتحال ازاین دار پر ملال جزم نمود۔ بالفرقۂ وداع ملازمان و بندگان شاہزادۂ دوراں و قطع تعلقات از حیات جسم و جان فرمودہ بہ بہشت السرور جاوداں رواں گردید[3]۔"

اس طرح مولٰنا حسین شیرازی کی وفات (۱۰۲۵ھ کے) صفر کے مہینے میں کسی تاریخ قرار پاتی ہے۔ یعنے میر محمد مومن کے نو ماہ بعد اور سلطان محمد قطب شاہ سے تین ماہ قبل حسین شیرازی نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا عبداللہ قطب شاہ پر جو اثر ہوا اور اس کے دل میں اپنے اس بوڑھے استاد کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ مورخ کے ان مندرجۂ بالا الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے حسین شیرازی کی وفات کے متعلق استعمال کئے ہیں۔

سید محی الدین قادری زور

باقی آئندہ

حیات محمد قلی قطب شاہ

حضرت مولٰنا عبد الماجد صدیق "میں تحریر کرتے ہیں" قدرت نے اس کام کے لئے ڈاکٹر زور کو چن لیا۔ اور انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ خادم زبان و ادب ہونا تو ان کا پہلے ہی سے مسلم تھا۔ مورخ وہ اب نکلے۔ کتاب قابل دید ہے۔ مفصل بھی، جامع بھی، اور بہ قدر امکان مستند بھی۔ مورخانہ شان، ادبی آن، دونوں موجود۔ ہر عبارت سلجھی ہوئی اور شستہ، ہر بحث سنجیدہ اور شائستہ۔"

مولٰنا نیاز فتحپوری نے نگار میں لکھا ہے۔ "پروفیسر زور کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے یہ تصنیف فن سیرت و انتقاد کے موجودہ اصول کو سامنے رکھکر مرتب کیگئی ہے۔ ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے۔ جس محنت و سلیقہ سے کام کیا ہے اسکی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔"

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۰۔ [2] دیکھو صفحہ ۱۴۔

[3] دیکھو حدیقۃ السلاطین صفحہ ۱۳۔

بادۂ شباب

کچھ ہم سے شکرِ لطفِ بہاراں نہ ہو سکا
اس فصل میں بھی چاک گریباں نہ ہو سکا

یا شامِ غم نے چھین لیں اندازِ جرأتیں
یا اہتمامِ صبحِ بہاراں نہ ہو سکا

خوش ہوں کہ اس ہجومِ کشاکش کے باوجود
میں شکوہ سنجِ تلخیٔ دوراں نہ ہو سکا

اس ایک دل پہ نعمتِ کون و مکاں نثار
جو انتہائے غم میں پریشاں نہ ہو سکا

ساحل کی زندگی میں نہیں لطفِ زندگی
انسان پھر بھی نغمۂ طوفاں نہ ہو سکا

ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعائیں نہ لیں کبھی
جن سے کسی کے درد کا درماں نہ ہو سکا

تاروں کے ڈوبتے ہی دو آنسو ٹپک پڑے
داغِ فراق اور نمایاں نہ ہو سکا

خوش ہوں کہ ان کے دل میں بہرحال اے نظر
میرا خیال سلسلہ جنباں نہ ہو سکا

نظر

شاہدِ حیات سے

سحر کے تاروں کی انجمن میں ربابِ فطرت بجا رہے ہو
فضا کی رعنائیوں میں چھپ کر فضا کو رنگیں بنا رہے ہو

بھٹک رہے تھے جو ظلمتوں میں تمہارے آوارگانِ الفت
تو بھر کے یہ روپ چاندنی کا انہیں کو مشعل دکھا رہے ہو

تمہیں بہاروں کا رنگ بھی ہو تمہیں چمن کی امنگ بھی ہو
بس ایک تم ہو جو نور بن کر ضمیرِ ہستی پہ چھا رہے ہو

تمہاری یہ مست مست آنکھیں تمہارے یہ مۓ فروش جلوے
الٹ رہے ہو بساطِ دانش جہاں کو بیخود بنا رہے ہو

کبھی سرِ خاک جلوہ آرا کبھی فلک پر ضیا فشاں ہو
تمہیں ستاروں میں ہنس رہے ہو گلوں میں تم مسکرا رہے ہو

جوہر فریادی

حادثہ

جاڑے کا ابتدائی موسم تھا۔ چاندنی راتوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ سورج کبھی افق سے نیچے اتر چکا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ نور اپار کا اسٹیشن چھوڑتے چھوڑتے ہر طرف ایک پُر اسرار اندھیرا چھا گیا۔ دو رویہ ساکھو کے جنگل تھے اس سے سماں کچھ اور بھیانک ہو گیا تھا۔ مگر ریل اس بڑھتے ہوئے اندھیرے اور سناٹے میں اس سہولت اور بے تکلفی کے ساتھ "زن زن" چلی جارہی تھی گویا یہ اس کی اپنی قلمرو تھی جس کے ایک ایک پیچ و خم، ایک ایک کھنڈ اور تمام حدوں اور سمتوں سے نہ جانے کب کی مانوس تھی۔ ڈبوں کے اندر بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دہکتی ہوئی آگ یا کوندتی ہوئی بجلی کی کوئی ناگن ہے جو پھنکارتی بَل کھاتی اور لامحدود تاریکی کو چیرتی ہوئی دشمن کا پیچھا کئے چلی جارہی ہے۔

مسافروں پر سماں اور موسم کا اثر ہونے لگا تھا۔ اونچے درجوں میں کمبل اور دوشالے نکل آئے تھے۔ اور ہر شخص اپنے کو کچھ سمیٹتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اگرچہ گفتگوئیں، بحث و تکرار، اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ، سگریٹ اور پان، نئی شناسائیاں اور اسی قسم کے دوسرے سفری مشغلے ابھی اسی طرح جاری تھے۔ تیسرے درجوں میں جو کچھ حیثیت والے تھے انھوں نے اونی چادریں اوڑھ لی تھیں لیکن اکثر اکہری سوتی چادر لپیٹے ہوئے تھے۔ ایسوں کی بھی تعداد کم نہ تھی جو صرف اپنے بدن سمیٹے ہوئے تھے اور رہ رہ کر جھرجھریاں لے رہے تھے۔ ایک ڈبے میں اور ڈبوں سے زیادہ بھیڑ تھی۔ اس لئے کہ نوراپار کے میلے سے جو مسافر واپس آرہے تھے وہ سب کے سب بھیڑوں کی طرح اسی میں گھس پڑے تھے۔ ایک پر ایک لدے ہوئے تھے۔ چکٹے ہوئے کپڑوں کی مہک، بیڑی اور سلفہ کی مہک کے ساتھ مل کر ایک ناقابل برداشت عفونت پیدا کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک مسافر نے اپنی جھولی سے ایک لمبی سی چلم نکالی۔ اس کے اندر کچھ رکھا اور ایک چنگاری آگ رکھ کر ایک ایسا دم لگایا کہ اس کی مہک کے آگے ہر مہک تلے پڑ گئی بہتیرے نازک دماغوں نے ناک پر کپڑے رکھ لئے۔ اس گانجے کے رسیا کے سامنے ایک نوجوان مسافر ایک سستی اونی چادر لپیٹے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس سے نہ رہا گیا اور اس نے منہ بنا کر کہا "چھی چھی سارے ڈبے میں سراند پھیلادی۔ یہ بھی کوئی بھلمنساہت ہے۔ بڑا سواد تھا تو منہ کھڑکی کے باہر کر کے پیتے" گنجیڑی کو اس کی تاب کہاں تھی۔ تن کر اور آنکھیں نکال کر بولا "تو کیا ڈبہ کوئی تم نے خرید لیا ہے جو ایسا مزاج دکھاتے ہو؟" نوجوان مسافر کو جس کا نام انور تھا غصہ آگیا۔ لیکن کچھ تو بعض امن پسند مسافروں کے بیچ میں آجانے سے اور کچھ اس لئے کہ خود وہ بہت خوش، مگن تھا اور اپنے کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنے غصے کو روک لیا اور بات بڑھنے نہیں پائی۔

انور سے ڈبے کے تمام مسافر واقف ہو چکے تھے اور اس کو اشتیاق اور دلچسپی کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ ذات کا دھنیاں تھا۔ کلکتہ سے آرہا تھا اور اب جو اسٹیشن آرہا تھا اس پر اترنے والا تھا۔ وہاں سے دو میل ادھر ایک گاؤں تھا جو ماہ نگر کہلاتا تھا۔ انور وہیں کا رہنے والا تھا۔ روزگار سے تنگ ہو کر وہ بیوی اور ایک بچے کو چھوڑ کر کمانے کی غرض سے کلکتہ چلا گیا تھا۔ اور اب تین سال کے بعد گھر واپس آرہا تھا۔ وہ اپنی چہیتی بیوی اور اپنے پیارے بیٹے سے اتنی مدت بعد ملنے کے خیال سے اس قدر خوش تھا کہ اس نے اپنے گنجیڑی ہم سفر کی بدزبانیوں کو بھی معاف کر دیا۔ وہ کلکتہ سے مصمم ارادہ کر کے چلا تھا کہ اب کے بیوی بچے کو اپنے ساتھ کلکتہ لے جائے گا۔ مزدوری کر کے ہی پیٹ پالنا ہے تو میاں بیوی ایک ہی جگہ رہ کر ساتھ مزدوری کریں گے، اور ایک دوسرے کے

سچے، ہمدرد اور رفیق رہیں گے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ نہ جانے کس پر کیا وقت آ پڑے اور کب! ۔ اگر دونوں ساتھ رہیں گے تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کا دکھ نہ رہے گا۔ رفاقت اور پھر ایسی وفادار اور جاں نثار بیوی کی رفاقت بڑے سے بڑے دکھ کی شدت کو کم کردے گی۔

رحیم آباد کا اسٹیشن قریب تھا۔ کوئی تین چار میل کا اور سفر تھا۔ جن لوگوں کو رحیم آباد اترنا تھا وہ اپنی گٹھڑیاں سنبھال رہے تھے۔ بعض گنواروں نے لاٹھیاں تک کندھے پر رکھ لیں تاکہ تیاری میں کوئی کسر رہ نہ جائے اور اسٹیشن پر اترنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہ ہو۔ انور نے بھی اپنے اسباب کو سنبھال کر سامنے رکھ لیا تھا اور جس چھوٹے سے بکس میں بیوی اور بچے کے لئے نئے کپڑے وغیرہ تھے اس کو بڑی جتن کے ساتھ سب سے اوپر رکھا تھا۔

ملنے کی گھڑی قریب آرہی تھی۔ انور کے دل میں شوق اور محبت کی آگ بھرپور بھڑک چکی تھی اور اب وہ بے چین ہو رہا تھا۔ اتنے میں انجن نے ایک نہایت لمبی سیٹی دی۔ مسافروں نے سمجھا کہ اسٹیشن سے دور جو سگنل ہوتا ہے وہ شاید گرا نہیں ہے۔ سب کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے۔ لیکن اس وقت کا صرف اندھیرا سہما دینے کے لئے کافی تھا۔ کہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور انجن جی چھوڑ کر چلا رہا تھا۔ ہر شخص کے دل میں ایک نامعلوم خطرہ کا ایک مبہم احساس پیدا ہونے لگا۔ اتنے میں کچھ ایسا معلوم ہوا کہ ایک ہی جگہ دو چیخیں اٹھ رہی ہیں۔ سب نے بے اختیار پھر گردنیں کھڑکیوں سے باہر نکال دیں۔ اور اتنا دیکھ سکے کہ پچھم کے موڑ سے ایک تیز اور پھیلتی ہوئی روشنی نمودار ہوئی اور پوری گاڑی کو نگل گئی۔ ابھی لوگ اچھی طرح سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ اور پھر ایک اور دھماکا جو قیامت کی گھڑی کی طرح طویل اور بے پایاں تھا۔ معلوم ہوتا تھا زمین اور آسمان ٹکرا رہے ہیں اور کائنات کے پرخچے اڑے جا رہے ہیں......

(۲)

رحیم آباد ایک چھوٹا سا قصبہ تھا مگر گرد و نواح میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ آس پاس کے اکثر بڑے زمیندار اور بیوپاری اپنی مستقل سکونت یہیں رکھتے تھے۔ رحیم آباد ایک تجارتی مرکز سا بن گیا تھا۔ یہاں سے اوتر اور دکھن کی سمتوں میں ریلوے کی شاخیں بھی نکلی تھیں جو بعض اہم اور مشہور مضافاتی مقاموں تک جاتی تھیں۔

گزشتہ تین چار سال سے شکر کا ایک کارخانہ بھی کھل گیا تھا۔ اس سے رحیم آباد کی رونق اور اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کارخانہ اسٹیشن سے کوئی چار پانچ فرلانگ کے فاصلہ پر تھا لیکن وہاں کی آٹھوں پہر کی چہل پہل اور دوڑ دھوپ خاص کر شکر کے موسم میں اسٹیشن کو بھی ہر وقت آباد اور شگفتہ رکھتی تھی۔

آج شام کو سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے کارخانہ کے مزدوروں کو جب چھٹی ملی تو سکینہ نے سوچا کہ آخر پھر مغرب بعد انور کو لینے اسٹیشن آنا ہی ہے۔ پھر کیوں نہ وہ سیدھی اسٹیشن ہی چلی جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی ایک سہیلی سے جو ماہ نگر ہی کی رہنے والی تھی اور اس کے ساتھ رحیم آباد کارخانہ میں کام کرتی تھی گھر کہلا بھیجا کہ وہ اسٹیشن پر رک گئی ہے اور انور کے ساتھ آئے گی۔

پورب کی سواری گاڑی آنے میں ابھی کوئی سوا گھنٹے کی دیر تھی۔ مگر رحیم آباد کا پلیٹ فارم مسافروں سے بھر گیا تھا۔ سکینہ اتنی بڑی بھیڑ میں کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ لیکن اس کی لو اس گاڑی سے لگی ہوئی تھی جو اس کے شوہر کو اتنی مدت کے بعد لاکر اس سے ملانے والی تھی۔ اس کی رگ رگ میں ایک

بے صبری تھی اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ گھڑیاں خلاف معمول طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اتنے میں ایک پیٹ مین اسٹیشن کے اندر سے نکلا اور جلد جلد گھنٹی بجائی اور پچھم کی طرف تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا۔ سکینہ کے دل کی حرکت کچھ تیز ہو گئی۔ اس نے سمجھا کہ یہ اس کی قسمت ہے جو آج گاڑی اتنا سویرے آ رہی ہے۔

اس کو یقین تھا کہ یہ اسی گاڑی کے لئے گھنٹی بجائی گئی ہے جس کا اس کو انتظار تھا۔ مگر اپنے اطمینان کے لئے اس نے ایک قلی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو پچھم سے مال گاڑی آ رہی تھی۔ "تو بابو پورب کی گاڑی کتنی دیر میں آئے گی؟" سکینہ نے کچھ مایوس ہو کر پوچھا۔ "یہ مال گاڑی کچھ دیر یہاں ٹھیرے گی اور پھر چھوٹ جائے گی۔ جب یہ بنوار پار پہنچ جائے گی تب سواری گاڑی بنوار پار سے چھوٹے گی۔ ابھی بڑی دیر ہے۔" قلی نے جواب دیا اور سکینہ کے حسن و شباب پر اپنی نگاہوں کا خزانہ لٹاتا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ سکینہ خاموش ہو کر بیٹھ رہی۔ مگر اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اور آئے گا ہی۔ پھر یہ بے چینی کیوں ہے؟

(۳)

پنڈت رام اوتار شرما بڑے کامیاب اور نیک نام اسٹیشن ماسٹروں میں سے تھے۔ افسر اور ماتحت دونوں ان کی دل سے قدر کرتے تھے۔ کمانے کا ڈھنگ تو اپنے اکثر رفیقوں کی طرح ان کو معلوم ہی تھا لیکن ہر شخص کو راضی رکھنا بھی وہ خوب جانتے تھے۔ پھر اپنے دھرم کے بھی بڑے پکے تھے۔ اتنی عمر ہو گئی تھی مگر صبح کی پوجا کبھی ناغہ نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ کوئی جاترا خالی گیا تھا۔ غرض کہ دین اور دنیا دونوں بنا رہے تھے۔ آج کل میلے کا زمانہ تھا اس لئے شام کو بھی جب کہ اسٹیشن عموماً اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے سپرد کر دیا جاتا ہے خود ہی آ کر گاڑیاں نکال جاتے تھے، مال گاڑی جس وقت رحیم آباد کے پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہوئی اس وقت بنوار پار کے آگے ایک اسٹیشن تک پورب کی سواری گاڑی کا پتہ نہیں تھا۔ پنڈت رام اوتار شرما کو یقین تھا کہ وہ مال گاڑی کو نکال سکیں گے۔ لیکن آج رحیم آباد میں مال کے کئی ڈبے کٹ رہے تھے جس میں خاصی دیر ہو گئی۔ خدا خدا کر کے انجن گاڑی میں آ کر لگا اور پنڈت شرما نے اطمینان کی سانس لے کر جلدی سے پروانہ (لائن کلیر) بنایا اور دستخط کر کے اس کو کتاب سے پھاڑنے ہی جا رہے تھے کہ تار سے معلوم ہوا کہ سواری گاڑی بنوار پار پہنچنے والی ہے اور مال گاڑی رحیم آباد روک لی جائے۔ پنڈت شرما کچھ جھلا کر رہ گئے۔ اور لائن کلیر کتاب ہی میں رہنے دیا۔ اتفاق کی بات اسی وقت پنڈت شرما کے پیٹ میں کچھ مروڑ سی شروع ہوئی اور وہ جنگل پر جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ فارغ ہونے میں کچھ دیر لگی۔ ابھی وہ مٹی سے مل مل کر ہاتھ دھو ہی رہے تھے کہ ان کو احساس ہوا کہ پلیٹ فارم پر گاڑی نہیں فوراً جلدی سے کوٹ اوپر ڈالی اور ویسے ہی کان میں جنیو لپیٹے بھاگتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ معلوم ہوا کہ گارڈ صاحب اسٹیشن کے اندر آئے اور دستخط کیا ہوا پروانہ لے کر چلے گئے۔ وہ یہ سمجھے کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب ان کے لئے لائن کلیر لکھ کر رکھ گئے ہیں۔ پنڈت رام اوتار شرما کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ بے اختیار ہو کر چیخنے لگے۔ "ہائے اب کیا کروں بڑا غضب ہو گیا۔" عین اسی وقت تار بولنے لگا۔ اسسٹنٹ ماسٹر نے سنا تو معلوم ہوا کہ بنوار پار سے سواری گاڑی چھوٹ چکی ہے۔ پنڈت شرما باؤلوں کی طرح باہر آئے۔ اور خود خطرہ کی گھنٹی بجانے لگے۔ سامنے ایک پیٹ مین تھا اس کو دو ہنٹر مار کر کہا "کم بخت دوڑ گارڈ صاحب سے پکار کر کہہ گاڑی روک لیں۔" پیٹ مین جی چھوڑ کر

پکار لگاتا ہوا دوڑا۔ بہت دور ایک سرخ دہکتا ہوا انگارہ نظر آرہا تھا جو آگے کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ ہیٹ مین چلاتا اور سرخ لالٹین دکھاتا چلا جارہا تھا۔ پنڈت شرما نے فوراً پورب کی طرف کا دور کا سگنل گرادیا تاکہ مال گاڑی کو معلوم ہوجائے کہ دوسری طرف سے گاڑی آرہی ہے مگر مال گاڑی سگنل سے کافی آگے نکل چکی تھی۔

اب خود پنڈت شرما پورے عملے کے ساتھ چیختے اور سرخ لالٹین دکھاتے دوڑے۔ سارے اسٹیشن میں ہل چل مچ گئی۔ سکینہ ایک ایک کا منہ تک رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ کچھ مسافر اسٹیشن والوں کے پیچھے بھاگے چلے جارہے تھے۔ کچھ ڈر کر اپنے اپنے گھر بھاگے جارہے تھے۔ سکینہ ایک ایک سے پوچھ رہی تھی اور اگر کوئی اس کو صحیح جواب بھی دے رہا تھا تو اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

پنڈت شرما اپنے ساتھیوں کو لئے ہوئے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے اور گرگر کر اٹھتے ہوئے کافی دور تک نکل آئے تھے۔ ان کو اب بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید ان کی زندگی کے اوراق اس حادثہ سے خالی رہ جائیں۔ لیکن دور ایک اس زور کا دھماکا ہوا کہ معلوم ہوا زمین اور آسمان لرز اٹھے اور پھر سلسلہ وار دھماکے!۔ جیسے بے شمار بادل ایک ساتھ گرج رہے ہوں۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ زمین کی میخیں ہل گئی ہیں اور چاروں سمتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔

پنڈت رام اوتار شرما کے ہاتھ، پاؤں ڈھیلے ہوگئے اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہاتھ پاؤں کے ساتھ آنکھ اور کان نے بھی جواب دے دیا ہے۔

(۴)

بات کی بات میں یہ خبر بجلی کی طرح چاروں طرف گئی کہ رحیم آباد اور ہنوار پار کے درمیان گاڑیاں لڑ گئی ہیں۔ کارخانہ سے بھی لوگ دوڑ پڑے۔ موقع واردات پر قیامت کا سماں تھا۔ کارخانے سے بے شمار لالٹینیں اور گیس کی روشنیاں پہنچ گئی تھیں۔

سکینہ کو اس تمام ہلچل کا مطلب سمجھنے میں دیر لگی کچھ دیر کے لئے تو اس کو سکتہ سا ہوگیا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کے دماغ نے کام شروع کیا اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔

ابھی چند آدمیوں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا اور شور کرتا ہوا پورب کی طرف جارہا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ دوڑی۔ سب شور اور واویلا مچارہے تھے اور سکینہ چپ چاپ دوڑتی ہوئی چلی جارہی تھی۔

گاڑیاں جھوم جھوم کر لڑی تھیں۔ ایک انجن دوسرے انجن پر چڑھ گیا تھا اور اس کے اندر پیوست ہوگیا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ ریل گاڑیاں ہیں۔ ڈبے ایک دوسرے کے اندر سما گئے تھے اور اس طرح پچک کر مسخ ہوگئے تھے جیسے ٹین کے کھلونے ہوں جن کو کسی بچے نے کھیلتے کھیلتے کوچ کر رکھ دیا ہو۔ مسافر اور ان کے سامان ایک ساتھ پس اٹھے تھے۔

صرف دونوں گارڈ اور ڈرائیور بچ گئے تھے جو تصادم سے پہلے ہی کود پڑے تھے۔ یا پھر سب سے پیچھے دو ایک ڈبے کے مسافر شدید چوٹیں کھاکر رہ گئے تھے اور زندگی کی امیدیں لئے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کے دروازے اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ کسی طرح کھلتے نہ تھے اور زخمیوں اور لاشوں کو نکالنا دشوار ہورہا تھا۔

جس وقت سکینہ پہنچی ہے تو ڈبے خالی کئے جاچکے تھے اور ریل کی پٹری کے دونوں طرف زخمیوں اور لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ہر طرف سے عجیب بھیانک کراہیں سنائی دے رہی تھیں سکینہ بلبلا بلبلا کر کہنے لگی "بابوجی اسی میں ہمارا آدمی بھی تھا"

کسی نے ہنگامے میں اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آخرکار سکینہ نے دل کڑا کیا اور خود جھک جھک کر لاشوں اور گھائلوں کو دیکھنے لگی۔ جتنوں کی صورتیں پہچانی جا سکتی تھیں ان میں انور نہیں ملا۔ باقی جتنی لاشیں تھیں وہ اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں کہ سب ایک سی معلوم ہوتی تھیں۔ سکینہ کی نظر جس پر پڑتی وہ اس کو انور معلوم ہوتا تھا اور وہ اس سے لپٹ جاتی تھی۔ مگر پھر یکایک اجنبیت کے احساس کے ساتھ اس سے الگ ہو جاتی تھی۔

آدھی رات جاتے جاتے پچھم سے ایک انجن چند ڈبوں کے ساتھ اور کئی ٹھیلے پہنچ گئے اور کئی لاشوں اور مجروحوں کو بھرا جانے لگا۔ سب سے پہلے اونچے درجوں کے مسافروں کی طرف توجہ کی گئی اور ان کو آرام اور احتیاط کے ساتھ رکھا گیا باقی گھاس بھوسے کی طرح ڈبوں کے اندر ٹھوسے جانے لگے۔

پو پھٹ چلی تھی۔ میدان صاف ہو گیا تھا۔ صرف دو لاشیں پڑی رہ گئی تھیں جن کے پاس سکینہ بیٹھی بلک رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ریلوے کا ٹھیلہ آیا اور ان لاشوں کو بھی اٹھا لے گیا۔

(۵)

سکینہ کا چیتا ٹل گیا ہے اور وہ اسی جگہ جا جا کر بیٹھی ہے جیسے اس کی روح وہاں بندھ گئی ہو۔ لوگ اس کو پکڑ کر گھر لے آتے ہیں، مگر وہ آنکھ بچا کر پھر وہیں پہنچ جاتی ہے اور چپ چاپ وہاں بیٹھی رہتی ہے یا آہستہ آہستہ روتی ہے۔

ریلوے سے جواب طلب کئے جا رہے ہیں۔ وہ جو رُوداد بتا رہے ہیں اور لاشوں اور مجروحوں کی جو تعداد دے رہے ہیں عوام کا خیال ہے کہ وہ غلط ہے۔ مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

پنڈت رام اوتار شرما اور مال گاڑی کے گارڈ پر مقدمے چل رہے ہیں اور یقین ہے دونوں کو سخت سزائیں ملیں گی۔ دونوں نے پہلے تو مل کر بڑی سازشیں کیں اور بہت چاہا کہ کسی پیٹ مین یا کسی اور ادنیٰ ملازم کے سر بلا جائے لیکن معاملہ بہت صاف تھا اور کوئی سازش کارگر نہیں ہوئی۔ آخر میں ایک دوسرے کے سر الزام تھوپنے لگے ہیں۔ پنڈت رام اوتار شرما نے اپنی گزشتہ خدمات کا بہت واسطہ دلایا لیکن ان کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اب وہ ایسی ملازمت کو صلواتیں سنا رہے ہیں جس میں آدمی پیخانہ پیشاب بھی نہ جا سکے اور سب سے کہتے پھرتے ہیں "بھیا سب نوکری کرے ریلوے کی نوکری کرے"۔

(منثور افسانہ) **مجنوں گورکھپوری**

انوار جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں ان کا کلام ہندستان کے بلند معیاری رسالوں مثلاً نگار، ہمایوں ادبی دنیا اور شاہکار وغیرہ میں شایع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ قیمت مجلد (عہ) صفحات (۱۶۸)

غزل

دور ہم تم سے بھلا محفل میں کیونکر بیٹھتے
جس کے دل میں تھی جگہ اس کے برابر بیٹھتے

آپ ہی انصاف کیجیے آپ ہی فرمائیے
غیر کی محفل میں ہم خاموش کیونکر بیٹھتے

یوں رہے برباد ہم تو کاروانِ عشق میں
اکثر اٹھتے گرد کے مانند اکثر بیٹھتے

دیدۂ و دل خلوت و جلوت ہیں ان کے واسطے
خواہ اندر بیٹھتے وہ خواہ باہر بیٹھتے

بیٹھے بیٹھے آگیا پھر تم کو یہ کس کا خیال
آئے تھے ملنے تو میرے پاس دم بھر بیٹھتے

چھوڑتے ساقی کا دامن حشر میں کیونکر بھلا؟
خلد میں ہم تو قریبِ حوضِ کوثر بیٹھتے

خیر گذری ذکرِ دشمن پر وہ قایل ہو گئے
ورنہ ہم بھی من چلے تھے کچھ نہ کچھ کر بیٹھتے

کس کی پروا کس سے پردہ شرم کیسی کس کا خوف
کیا پڑی تھی ان کو ایسی کیوں وہ چھپ کر بیٹھتے

پھر صفائی سی صفائی اُن کے میرے ہو گئی
کیوں مکدّر اب وہ رہتے کیوں مکدّر بیٹھتے

آئے تھے بہرِ عیادت وہ اگر اے ہمدمو!
دم نکلتا دیکھتے بالیں پہ دم بھر بیٹھتے

تیر تھے نالے مرے تیرِ ہوائی یہ نہ تھے
بیٹھتے بے شک نشانے پر مقرر بیٹھتے

بہتے بہتے تھم گئے آنسو خدا کا شکر ہے
ورنہ اس طوفان میں تو سیکڑوں گھر بیٹھتے

شوخیٔ مضمون و بندش ختم ہے تجھ پر عزیز
لفظ کیا کیا ایک سے ہیں ایک بہتر بیٹھتے

نواب عزیز یار جنگ بہادر

افلاطون اور اُس کا فلسفہ

اس سے پیشتر کہ میں افلاطون کے متعلق کچھ لکھوں سرسری طور پر حکیم سقراط کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں جس کو "فلسفہ کا باوا آدم" کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ "اس نے راست آسمان سے فلسفہ لایا تھا" ــــ غالباً یہی پہلا شخص ہے جس نے اس رنج بھری دنیا پر غور کیا اور مختلف نظریے قائم کئے ــــ فلسفے کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو کسی چیز کے "یقین" کے متعلق سوالات کرتا ہے اور دوسرا وہ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف دور میں کسی چیز کے متعلق فلسفیوں کا خیال کیوں اور کس طرح بدلتا رہا ہے ـ لیکن سقراط کا تعلق پہلے حصے سے تھا ـ اس کے دل میں سوالات کا ایک طوفان اُٹھتا تھا اور ایک زبردست آندھی کی طرح یہ سوالات اس کے منہ سے باہر نکلتے تھے ـ ان نہ ختم ہونے والے سوالات نے لوگوں کو تنگ کر دیا ــــ وہ ہر ایک بات کے متعلق سوال کرتا "کیوں ؟ ــــ یہ کس لئے ہے ــــ اس کا کیا مطلب ہے ؟" وغیرہ ــــ غرض اس کا دل مختلف شکوک اور سوالات سے بھرا ہوا تھا ــــ اس کے زمانے کے لوگوں میں ابھی سوچنے کا مادہ نہیں پیدا ہوا تھا اور اس لئے ان کی زندگیاں خالی تھیں ! اور یہی وجہ تھی کہ لوگ سقراط کے ان مختلف سوالات سے بیزار آکر اس کی موت کا باعث ہوئے ــــ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اپنے "خیال" کے متعلق خیال کریں ــــ وہ ہمیشہ یہی سوال کرتا کہ "آخر تم ان باتوں سے کس طرح زندگی اور موت کے مسئلہ کو حل کرتے ہو ؟ ــــ تمہارے نزدیک "عزت" ــــ پاک دامنی ــــ قومیت اور سچائی کے کیا معنی ہیں ؟ ــــ"

غرض وہ اس قسم کے سوالات بغیر تھکے ہوئے کرتا چلا جاتا تھا ـ حکومت اس سے بیزار ہو کر آخر کار اس کی موت کا باعث ہوئی ــــ

فلسفے کے اس دوسرے رخ کے متعلق ہیگل اور مارکس نے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے ـ ان کا خیال ہے کہ "فلسفہ مختلف دور میں مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے" ــــ بیسویں صدی میں جس چیز کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اچھی ہے اور اس سے کوئی نقصان نہیں وہ آئندہ چل کر غلط ثابت ہوتا ہے "ہر چیز ایک خاص دور کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے اس کے بعد اغلب ہے کہ وہ ضرر رساں ثابت ہو ــــ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کا فلسفہ بھی بدلتا جاتا ہے ـ

یونان فلسفیوں کے لئے مشہور ہے ـ فلسفیوں میں سقراط ، افلاطون اور ارسطو وغیرہ بہت مشہور ہیں ـ یونانیوں نے ہی سب سے پہلے قدرت اور اس کے قانون کے متعلق سوچ بچار کیا ــــ مگر قدیم یونانی یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے کوئی اصلاح ناممکن ہے ـ قدرت جیسی ہے ویسی ہی رہے گی ـ اس میں ذرہ برابر رد و بدل نہیں کر سکتے ــــ وہ جانتے تھے کہ بہت سے نقائص ہیں لیکن وہ ان کو دور کرنے سے قاصر تھے ـ برخلاف اس کے ان کا خیال تھا کہ ــــ ایک اور دنیا ہے جہاں ہر چیز اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں لیکن یہ دنیا ــــ خیالی دنیا ہے !

سقراط کے بعد افلاطون کا درجہ ہے ـ وہ ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جس میں ایک خاص جماعت غور و خوض کے لئے مقرر تھی لیکن اس جماعت کے افراد کے خیالات ابھی پختہ نہیں تھے اور ہنوز بہت سے مسائل کے حل ان کے پاس موجود نہ تھے ــــ اور ان کے زمانے میں بعض سیاسی خامیاں ایسی تھیں کہ جن سے ان کے امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا

افلاطون اور بدھا میں کوئی فرق نہیں اس لئے کہ دونوں کے خیالات بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ افلاطون کو بھی "MYSTIC" کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ راست خدا سے باتیں کرتا تھا ـــــ یہاں پر خدا سے باتیں کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اپنی دھن میں بہت دیر تک دنیا کے متعلق خیال کرتے ہوئے بیٹھ جاتا تھا ـــــ اس لئے اس کا فلسفہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور چنانچہ اس کا ثبوت رافیل (RAPHAEL) کے مشہور کارٹون کے ذریعے ملتا ہے۔ اس میں افلاطون کو آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے اور اس کے جانشین ارسطو کو زمین کی طرف۔ افلاطون نہ صرف ایک فلسفی تھا بلکہ ایک کامیاب سیاست داں بھی۔ چنانچہ جماعتی حکومت کے متعلق اس نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

" میں نے خیال کیا تھا کہ یہ نئی حکومت (ایتھنز میں اسی کے زمانے میں جماعتی حکومت وجود میں آئی) ناانصافی کو دور کر کے انصاف کو عام کرے گی اس لئے میں نے اس کی حرکات کا بغور مطالعہ کرنا شروع کیا ـــــ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں نے چند ہی دنوں میں اپنے اس دور کو سنہرا دور بنا دیا! ـــــ انھوں نے میرے ضعیف دوست (جس کے متعلق میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے زمانے کا مشہور فلسفی اور نیک طبیعت انسان ہے) کو حکم دیا کہ وہ ایک شہری کی گرفتاری میں حصہ لیں جس کو وہ ختم کر دینا چاہتے تھے ـــ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ آیا سقراط ان کی طرفداری میں ہے یا نہیں۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اور اسی لئے اس کو موت کے منہ میں جانے کی تیاریاں کرنی پڑیں۔

" جب میں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مجھے سخت افسوس اور بے حد رنج ہوا ـــ اور میں نے طے کر لیا کہ اب اس طریق حکومت سے بالکل علحدہ ہو جاؤں گا۔

" جیسے جیسے میں ان واقعات پر غور کرنے لگتا ہوں ویسے ہی میرے رنج میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک اچھی حکومت کے قیام کا خیال مہمل سا نظر آتا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اس حکومت کے خلاف بغیر دوستوں کی مدد کے آواز بلند کروں ـــــ ایسے دوستوں کا ملنا بھی جو میرا ساتھ دے سکیں دشوار تھا۔ مگر آئے دن پیش آنے والے واقعات کا خیال کرتے ہوئے سیاسیات میں حصہ لینا میرے لئے ضروری تھا ـــــ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کام میں بہت سی رکاوٹیں درپیش ہو رہی ہیں ـــــ میں اسی خیال میں گم رہنے لگا کہ کس طرح کوئی اصلاح اس حکومت میں ممکن ہے۔ لیکن اب میں حکومت کے راستے میں روڑے اٹکانے کے لئے موقع ڈھونڈنے لگا ـــــ لیکن پایان کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر ایک ملک کی حکومت میں سوائے مستثنیات کے خرابیاں ہیں اور ہر حکومت میں کچھ ایسے قوانین ہیں کہ بغیر کسی زبردست انقلاب کے ان میں اصلاح ممکن نہیں۔ اور ساتھ ہی قسمت کا ساتھ دینا بھی ضروری ہے اور اسی لئے مجھے مجبور ہونا پڑا کہ میں فلسفے کی تعریف کروں اور یہ اعلان کروں کہ حقیقی انصاف صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انسان فلسفے سے کام لینا شروع کر دے۔ انسان اس وقت تک خرابیوں اور آفتوں سے نہیں بچ سکتا جب تک کہ فلسفیوں کے ہاتھوں میں حکومت نہ آجائے یا حکومت کرنے والے فلسفی نہ بن جاسکیں ـــــ "

افلاطون کے اس بیان کے آخری الفاظ قابل لحاظ ہیں۔ یہ خیال اس کا اپنا ہے کہ فلسفی ہی حکومت اچھی طرح کر سکتا ہے۔ کیونکہ فلسفیوں کا دل بہت حساس اور نازک ہوتا ہے اور وہ بدی اور اچھائی میں آسانی سے تمیز کر لیتے ہیں۔

حق و انصاف کے قدرداں اور ظلم و تشدد کے دشمن ہوتے ہیں۔
ہر وہ شخص جس کے پاس انسان کا سا دل ہے اور اس دل میں درد ہو تو وہ فلسفی بن سکتا ہے۔ فلسفی بننے کے لئے خاص شرائط نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک فلسفی کا خیال ہے کہ "ایک تین سالہ بچہ بھی فلسفی بن سکتا ہے!" فلسفے سے مراد غور و خوض ہے اور جس میں غور و خوض کا مادہ ہو فلسفی بن سکتا ہے۔ افلاطون کے فلسفیانہ اور سیاسی خیالات کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے لئے "The Republic" پڑھنا کافی ہے۔
یہ کتاب اس فلسفی کے پورے خیالات کا نچوڑ ہے۔ امیر غریب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے — امیر اپنی زندگی انہی غریبوں کی مدد سے خوش حال بناتے ہیں اس لئے غریبوں کا خیال رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنی زندگی کا — "ٹھیرو! — تم بھائی بھائی ہو۔ اگرچہ خدا نے تم کو مختلف بنایا ہے۔ تم میں سے بعض حکومت کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور یہ سونے کے بنائے گئے ہیں اور دوسرے چاندی کے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات سونے کے بنائے ہوئے باپ سے چاندی کا بچہ پیدا ہو سکتا ہے! اور اسی طرح چاندی کا بنایا ہوا شخص اپنی محنت سے تونگر یا سونے کا بن سکتا ہے! —" مگر وہی سونے کا باپ اپنے چاندی کے بچے کو نہیں دھتکارتا! — اس لئے کہ وہ اس کا بیٹا ہے لیکن برخلاف اس کے دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ اس کو دور کرنا چاہیے۔ ایسا انسان حقیقی معنوں میں انسان نہیں کہا جا سکتا۔ انسانیت کے لئے اخلاق کی ضرورت ہے اور یہ اخلاق صائب ہونے چاہئیں — ایک دولتمند شخص اتنی آسانی سے دوسروں کے دلوں کو موہ نہیں سکتا جتنا کہ ایک غریب شخص اپنی نیک دلی اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے موہ لیتا ہے۔ یہ کہنا کہ دنیا صرف دولت مندوں کے لئے ہے غلط ہے۔ دنیا میں رہنے کا ہر شخص کو حق ہے خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔ افلاطون کا یہ نظریہ کہ حکمران فلسفی ہونا چاہیے بالکل درست ہے اس لئے کہ ایک جابر اور ناعاقبت اندیش بادشاہ صرف ہمارے جسم پر حکومت کر سکتا ہے۔ مگر برخلاف اس کے ایک فلسفی ہمارے دلوں پر حکمراں ہوتا ہے۔ چنانچہ راجہ اور پرجا کے متعلق ٹالسٹائی کے خیالات قابل قدر ہیں۔

افلاطون ایک ایسے دور میں گزرا ہے جب کہ ہر طرف بدامنی پھیلی تھی اور ظلم و ستم کا راج تھا۔ اس کا یہ خیال کہ جماعتی حکومت سے فائدہ ہوگا۔ غلط ثابت ہونے کی وجہ سے اسے بیحد رنج پہنچا۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار ایک مصلح قوم و ملک کی حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے، جو ملک و قوم اور گھربار سے بے نیاز ہو کر امن اور شانتی کی تلاش میں ہو۔ اس کی انقلاب پسند طبیعت ہی کی وجہ سے لوگ اس کے دشمن ہو گئے — حکومت کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگا — اور آخر کار اس زبردست فلسفی کا بھی وہی انجام ہوا جو سقراط کا ہوا تھا۔

جگناتھ راؤ دیبائی

اوٹی کا سفر

(یہ مضمون غوثیہ بیگم مرحومہ نے لکھا تھا جس کو ان کے شوہر پروفیسر رحیم اللہ قریشی صاحب نے سب رس میں بطور یادگار شائع کرنے کے لئے بھیجا ہے)

۴ر فروری سنہ ۱۹۶۱ء کو شام کی گاڑی سے اپنے شوہر کے ہمراہ مدراس سے اوٹی کے لیئے روانہ ہوئی۔ یہ گاڑی بلو ماؤنٹین اکسپرس کہلاتی ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اوٹی کو جاتی ہے اور یہاں کے پہاڑ یوکلپٹس کے درختوں کی وجہ سے اودے نظر آتے ہیں۔ صبح کے وقت ریل بدل کر نیلگری ماؤنٹین میں بیٹھے۔ تھوڑی دور تک معمولی گاڑیوں کی طرح یہ گاڑی چلی صرف فرق اتنا تھا کہ انجن بجائے سامنے کے پیچھے کی جانب سے ڈھکیلتا ہوا اسے پہاڑ پر لے جاتا ہے۔ دو اسٹیشن جانے کے بعد دونوں پٹریوں کے بیچ میں ایک زنجیر نظر آئی اور ہر ڈبہ کے سامنے ایک ایک آدمی متعین تھا وہ اس لئے کہ اگر گاڑی پیچھے کی جانب پھسلنے لگے تو یہ بریک لگادیں۔ گاڑی کی رفتار کم تھی اور ہر اسٹیشن کے قریب سیٹی دیتی اور بعض اوقات ٹھیر جاتی تھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پہاڑ شروع ہوگئے اور کچھ خنکی بھی ہونے لگی۔ دونوں جانب آبشار نظر آتے تھے۔ یوکلپٹس کے درخت اور چھالیا کے رختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ جوں جوں آگے بڑھے کھیتوں میں ایسے پودے نظر آئے جو پہاڑوں کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے بعد میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ چاء کے کھیت ہیں۔ ایک اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی ہوئی تو ہم نے پہاڑی موز خریدے یہ نہایت لذیذ تھے اور نہایت سستے ملتے ہیں۔ جائیفل بھی خریدے اور چونکہ پہلی مرتبہ یہ پھل خریدنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے میرے شوہر نے لاعلمی کی وجہ سے ایک پھل کو دانتوں سے چھیلنا شروع کیا دوسرے صاحب نے جو ساتھ بیٹھے ہوئے تھے انہیں منع کیا اور کہا کہ منہ کا مزہ خراب ہوجائے گا۔ دو تین روز رکھنے پر یہ خود بخود پھٹ گئے اور اندر جوتری اور اس کے نیچے جائیفل نظر آیا۔

جیسے جیسے گاڑی اوپر جاری تھی خنکی زیادہ ہوتی گئی۔ گیارہ بجے صبح اوٹی اسٹیشن پہونچ گئے۔ اسٹیشن دیکھ کر تعجب ہوا اس لئے کہ یہ بالکل معمولی ہے اور باوجود اس کے کہ بڑے بڑے آدمی اور گورنر یہاں اترتے ہیں یہ بالکل ہی خراب حالت میں رکھا گیا ہے۔ اسٹیشن سے فوراً ڈاک بنگلہ کو گئے جو تقریباً دو میل ہوگا۔ یہ بنگلہ (Westmere) کہلاتا ہے اور اوٹی جھیل کے کنارے واقع ہے جگہ نہایت پُرفضا ہے۔ اس جھیل میں کشتیاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک کلب بھی ہے جو موسم گرما میں کھلتا ہے۔ شام کو تھوڑی دیر کے لئے ٹہلتے ہوئے بازار تک گئے جو موسم نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سنسان تھا صرف چند دوکانیں ضروریات کی موجود تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ موسم میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ شام کو یوکلپٹس کی چند بوتلیں لوگوں کو تحفہ دینے کی غرض سے خریدیں اور واپس ہوئے۔ رات کا کھانا نہایت عمدہ تھا ایسا اچھا گوشت حیدرآباد یا کسی اور جگہ نصیب نہیں ہوا یہ غالباً یہاں کے انتظام کی خوبی ہے کہ کوئی خراب چیز نہیں رکھی جاتی۔

دوسرے دن صبح دس بجے اولپنج کے لئے روانہ ہوئے جو اوٹی سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں

مچھلیوں کے انڈوں میں سے بچے نکالے جاتے اور پھر بڑے کرکے ندی میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے مختصراً اس کو بیان کرتی ہوں۔ کرتی جھیل جو اس جگہ سے تقریباً ۵۰ میل ہے وہاں نر اور مادہ دونوں کو پکڑتے ہیں پہلے مادہ کے انڈے اس کا پیٹ دبا کر نکالے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ نر کا مادہ ملایا جاتا ہے۔ باروری کے بعد انڈوں کو اس جگہ برف کے اندر رکھ کر لایا جاتا ہے اور یہ بڑے بڑے حوضوں میں رکھے جاتے ہیں۔ پانی ان کے اوپر سے بہتا ہے اور رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے بچے انڈوں سے نکلتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب یہ غذا حاصل کرنے لگتے ہیں تو نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی نگہداشت ہوتی ہے اور ان کو باہر حوض میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مختلف حوض بنے ہوئے ہیں جن میں جسامت کے لحاظ سے ان کو رکھتے ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد یہ مچھلیاں ندی میں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ ان مچھلیوں کو ٹراؤٹ کہتے ہیں اور شروع میں یہ نیوزیلینڈ سے منگوائی گئی تھیں۔ ہر سال ان کو پکڑنے کے لیے شوقین لوگ آتے ہیں اور فیس دے کر ان کا شکار کرتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کا ایک کلب ہے جسے سرکاری امداد بھی ملتی ہے اور ممبروں کے چندے کی وجہ سے یہ نہایت اچھی حالت میں ہے۔ اوٹی لیچ ایک وادی میں ہے جسے ہرا بھرا ہونے کی وجہ سے وادیٔ زمردیں (Emerald valley) کہتے ہیں۔ واپسی شام کو ہوئی۔ رات کو سردی کی وجہ سے آگ جلانی پڑی لیکن پھر بھی سردی معلوم ہوتی رہی۔

اوٹی ۷۶۰۰ فیٹ مدراس کے مقابلہ میں بلند ہے اور اسی وجہ سے سردی بہت ہوتی ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناقابل برداشت۔ صبح کا منظر نہایت خوشنما ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کہر جھیل سے کھیلتی ہوئی جاتی ہے اور پہاڑوں پر سے بھی گزرتی ہے۔ سڑکیں نہایت عمدہ ہیں اور ہر جگہ موٹر جاسکتی ہے۔ یہاں کے موٹر والے بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں اور پرانے قصے ہمیشہ سناتے رہتے ہیں۔ ولیعہد بہادر اور شہزادی دُرِّ شہوار کے نہایت مداح ہیں اس لئے کہ ہمیشہ ان سے خوب انعام اکرام پاتے رہتے ہیں۔

شام کو اوٹی کے باغ میں گئے اور وہاں سے پہاڑی باشندوں (ٹوڈاز) کی قیام گاہوں کو جاکر ان لوگوں کے فوٹو لئے۔ ان کی عورتوں کے بال بنانے کا فیشن ایسا ہے جس کی نقل آج کل یورپ اور امریکہ کی عورتیں کر رہی ہیں ان کی جھوپڑیاں بھی عجیب قسم کی بنی ہوئی ہیں۔ اوٹی کا باغ نہایت خوش نما ہے اور نہایت اچھی حالت میں رکھا گیا ہے۔ واپسی میں مارکٹ وغیرہ دیکھی معمولی ہے اور جگہ کے لحاظ سے زیادہ قابل ذکر نہیں۔

دوران قیام میں چائے کے کھیت دیکھنے کا اتفاق ہوا جو پہاڑوں کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں سے پتیاں توڑنے کے بعد کو ٹیمپٹور یا میٹوپلیم بھیجی جاتی ہیں اور یہاں خشک کرنے اور تیار کرنے کے بعد مختلف حصوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ دوسری خاص پیداوار یوکلپٹس کے تیل کی ہے جو یہاں سے تیار کرنے کے بعد بوتلوں میں بند کیا جاتا اور باہر بھیجا جاتا ہے۔

اوٹی سے واپس ہوتے ہوئے کونور میں بھی چند گھنٹے قیام رہا یہاں کی آبادی زیادہ ہے اور یہاں لوگ سال تمام قیام کرتے ہیں لیکن یہ اوٹی کی طرح خوبصورت

نہیں ہے۔ اوٹی میں حضور نظام کا محل ہے اور ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ عمارت معمولی ہے اور سنا گیا ہے کہ شہزادگان بلند اقبال کا یہاں قیام نہیں رہتا۔ دوسرے دو بڑے محل بڑودہ اور میسور کے ہیں۔ بڑودہ کا محل بند تھا اس دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میسور کے محل میں باغ نہایت خوبصورتی کے ساتھ لگایا گیا ہے اور غالباً یہ اوٹی میں سب سے بہتر ہے۔ جے پور اور جودھپور کے محلات بھی دیکھے لیکن یہ معمولی تھے۔

اوٹی سے واپسی ۴ر فروری کو ہوئی اور مدراس دوسرے روز صبح میں پہونچ گئے۔ سرد جگہ سے یہاں آنے کے بعد کئی روز تک گرمی ہوتی رہی اس لئے کہ سرد مقام سے گرم مقام میں منتقل ہوئے تھے۔ آئندہ مضمون میں انشاء اللہ ملابار وغیرہ کے حالات قلمبند کروں گی۔

غوثیہ رحیم اللہ قریشی

روٹی

یہ خوں آلود آنسو اور آہیں
یہ غم کی اوس میں بھیگی نگاہیں
یہ زنجیروں کی زد میں سخت باہیں
امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

یہ چوراہوں میں سڑنے والی لاشیں
یہ مزدوروں کے دل کی زرد قاشیں
یہ رخساروں پہ بل کھاتی خراشیں
امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

یہ تقریریں جو خوں کھولا رہی ہیں
یہ تحریریں جو خوں کھولا رہی ہیں
یہ شمشیریں جو خوں کھولا رہی ہیں
امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

یہ سینوں میں ابھرتی سی بغاوت
دبانے سے ابھرنے والی فطرت
جو بازاروں میں بکتی ہے وہ عصمت
امیرو! تم سے روٹی مانگتی ہیں

(ناتمام)

الطاف مشہدی

ریزرو بنک

ہندوستان میں ۱۸۹۳ء سے قبل عوام سرکاری ٹکسال میں اجرت دے کر اپنا روپیہ مسکوک کراتے تھے۔ لیکن ذریعہ ایکٹ بابتہ ۱۸۹۳ء جو ہرشل کمیشن کی رپورٹ پر نافذ ہوا تھا حکومت نے ٹکسال کو عوام کے لئے بند کر دیا۔ اور روپیہ سرکاری دار الضرب میں تیار ہونے لگا۔ چونکہ روپیہ میں ۱۶ آنے کی پوری چاندی نہیں ہوتی۔ اس لئے سرکار کو روپیہ مسکوک کرنے میں فائدہ ہوتا ہے۔ جب ۱۸۹۹ء میں سکہ کی مزید تحقیقات کے لئے فاؤلر کمیشن کا تقرر ہوا تو اس کمیشن نے اپنی سفارشات میں منجملہ دیگر امور کے ٹکسال کے منافع کا علٰحدہ خزانہ قایم کرنے کی بھی سفارش کی۔ "تاکہ شرح تبادلہ قایم رکھنے میں اس خزانہ سے مدد لی جاسکے۔" معیار طلاء قایم رکھنے کا یہ خزانہ گولڈ اسٹانڈرڈ ریزرو کہلاتا ہے۔ وزیر ہند نے اس کی منظوری ۱۹۰۰ء میں دیدی تھی لیکن طے یہ ہوا کہ یہ خزانہ لندن میں رکھا جائے۔ ہندوستان کے اعتراض پر یہ حکم ہوا کہ خزانہ کے زر نقد کا نصف حصہ ہندوستان میں رکھا جائے اور نصف انگلستان میں۔ البتہ سود پر رقم صرف انگلستان میں چلائی جائے لیکن بصورت نقد کبھی رقم خزانہ میں جمع نہیں رہی۔ اس لئے ہندوستان میں یہ خزانہ جمع نہ ہوا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد محکمہ مالیات علٰحدہ قایم کیا گیا۔ اور مسٹر ولسن کو جو ماہر مالیات تھے ولایت سے ہندوستان بلوایا گیا۔ جنھوں نے مالیات کی تحقیقات کے بعد کاروبار کی سہولت کے مد نظر کرنسی نوٹ جاری کرنے کی رائے دی جس کو حکومت نے ۱۸۶۱ء میں منظور کر لیا۔ اس وقت سے ہندوستان میں سرکاری نوٹ کا چلن شروع ہوا۔ اجرائی نوٹ کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جتنی رقم کے نوٹ جاری ہوں اتنا روپیہ خزانہ میں رکھا جائے۔ یا بصورت چاندی ۹۷۹ روپیہ کے مقابلہ میں ۱۰۰۰ تولہ چاندی رکھی جائے۔ نیز سونے کے سکے یا سونا خزانے میں جمع ہو جانے کی صورت میں اس کی قیمت کے نوٹ جاری کئے جائیں۔ اس خزانہ سے اولاً بقدر ۱۴ کروڑ روپیہ گورنمنٹ سکیوریٹیز میں سود پر چلانے کی اجازت تھی۔ یہ خزانہ ۱۸۹۸ء تک ہندوستان ہی میں تھا۔ گولڈ نوٹ ایکٹ کے تحت بعد میں اس خزانہ کی ایک شاخ انگلستان میں بھی قایم کر دی گئی تھی۔ اس خزانہ کے قانون میں وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہی۔ ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء میں جو کمیشن موسومہ ہلٹن ینگ کرنسی کمیشن' بغرض تحقیقات مقرر ہوا تھا اس نے ۱۹۲۶ء میں اپنی رائے حکومت کے سامنے پیش کی کہ کرنسی نوٹ کے خزانہ اور معیار کے خزانہ کو ملا دیا جائے اور اس مشترک خزانہ کو وزیر ہند اور حکومت ہند کی بجائے ایک علٰحدہ مرکزی بنک کے سپرد کر دیا جائے جس کا نام ریزرو بنک ہے۔ اس کمیشن کے چار ہندوستانی اور چھ انگریز ارکان تھے۔ دونوں خزانوں کو مشترک کر دینے کے متعلق کمیشن نے یہ وجہ بیان کی کہ نوٹوں کے خزانہ کی غرض نوٹوں کی قیمت کا قائم رکھنا ہے اور طلائی خزانہ کی غرض روپیہ کی قیمت کا قایم رکھنا ہے۔ چونکہ نوٹ اور روپیہ آپس میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے دونوں خزانوں کا مقصد ایک ہی ہو جاتا ہے۔ لہذا دونوں خزانوں کو ایک کر دینا زیادہ مناسب ہے۔

ریزرو بنک کی یہ تجویز کوئی نئی نہ تھی۔ تاہم اس کمیشن نے اس مسئلہ پر پوری صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ سکہ اور شرح تبادلہ اور لین دین کی پالیسی کی مستحکم بنیاد اسی طرح قایم ہو سکتی ہے کہ یہ سب امور ایک ہی

بنک کے سپرد کر دیئے جائیں۔ چونکہ اس کمیشن کے فرائض میں شرح تبادلہ کی تحقیقات بھی شامل تھی، کمیشن نے ۱۸ پنس فی روپیہ شرح تبادلہ قایم کرنے کی رائے دی۔ ۱۸ پنس شرح تبادلہ قایم ہونے سے قبل پہلی مرتبہ ۱۶ پنس فی روپیہ من بعد ۲۴ پنس فی روپیہ شرح تبادلہ قایم کی گئی تھی۔ شرح تبادلہ کی حد تک ۲۳ اگست ۱۹۲۶ء میں بل اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ جو دوسرے اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اور اس اثنا میں حکومت نے ایک نیا بل ریزرو بنک کے متعلق تیار کیا جس میں کمیشن مذکور کی قریب قریب جملہ سفارشات کے مطابق دفعات رکھی گئی تھیں۔ اس بل کو جنوری ۱۹۲۷ء کے اجلاس اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ جس پر کافی غور و خوض کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ بل بغرض رپورٹ ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ کمیٹی اسمبلی اور مجلس مملکت (کونسل آف اسٹیٹ) کے ۲۸ مشترک ارکان پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی نے بعد تحقیقات اپنی رپورٹ اور بل ۲۹ اگست ۱۹۲۷ء کو اسمبلی میں پیش کی۔ سرکاری طور پر ریزرو بنک کے متعلق جو بل تیار کیا گیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) ہندوستان میں معیار طلا قایم کیا جانا مقصود تھا۔ گر سونے کا سکہ رائج کرنے کی تجویز نہ تھی۔

(۲) ریزرو بنک کی جماعت انتظامی (گورننگ بورڈ) کے پندرہ رکن مقرر کرنے کی تجویز تھی جن میں ایک سرکاری ملازم ہونا درج تھا جس کو معاملات بنک پر ووٹ دینے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔

باقی چودہ ممبر ڈائرکٹر ہونا طے ہوا تھا جن میں سے پانچ تو حکومت نامزد کرے گی۔ بورڈ کے ممبر جو ڈائرکٹر ہوں گے ان کی حسب ذیل تفصیل تھی

(۱) ملازم سرکار جس کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا........ ۱

(۲) گورنر ۱

(۳) ڈپٹی گورنر ۱

(۴) دوسرے ممبر ۳

} حکومت کے نامزد کردہ

(۵) ممبر حصہ داروں کے منتخب کردہ ۹

بنک کا سرمایہ پندرہ کروڑ روپے مقرر کیا گیا تھا۔ جس کو عام حصہ داروں کی خرید سے پورے کئے جانے کی تجویز تھی۔ اور حکومت بھی اس میں ایک حصہ دار تھی۔ اور یہی حصہ دار ممبروں کو منتخب کرنے والے ہوں گے۔ کمیٹی متذکرۂ بالا نے اکثریت کے ساتھ دو ترمیمیں اس بل میں پیش کیں۔ پہلی ہندوستان میں سونے کا سکہ جاری ہونے کے متعلق دوسری یہ کہ بنک سرکاری ہو۔ خانگی یعنی حصہ داروں کا نہ ہو۔ اور ڈائرکٹر حسب تفصیل ذیل مقرر کئے جائیں۔

۱۔ گورنر	۱	ڈپٹی گورنر۔ گورنر کا نامزد کردہ ہے۔ اور گورنر یا ڈپٹی گورنر میں سے ایک لازمی طور سے ہندوستانی ہو اور دونوں ڈائرکٹر بھی ہندوستانی ہوں۔
۲۔ ڈپٹی گورنر	۱	
۳۔ ڈائرکٹر	۲	

صوبجاتی مجالس مقننہ کے منتخب رکن (۳) جن کو غیر سرکاری رکن منتخب کریں گے۔

مرکزی حکومت کے منتخب رکن (۳) جن کو غیر سرکاری رکن منتخب کریں گے۔

ہندوستانی ایوان تجارت کی مقننہ جماعت کے منتخب رکن (۳)

چمبر آف کامرس کے منتخب رکن (۲)

صوبجاتی کوآپریٹیو بنکوں کا منتخب رکن (۱)

ملازم سرکار (۱) جسے ووٹ دینے کا حق نہ ہوگا۔

یہ رپورٹ جب اسمبلی میں پیش ہوئی تو اس پر ممبر مالیات سے کافی بحث ہوئی اور بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ بنک سرکاری ہوگا۔ اور ہندوستانی ممبر نے یہ تسلیم کر لیا کہ ڈائرکٹروں کے انتخاب کے لئے

حلقہائے انتخاب بنائے جائیں گے۔ اور ابتدائی مرحلہ طے ہونے کے بعد بل پر دفعہ وار غور ہوتا شروع ہوا۔ دفعہ وار غور کے سلسلہ میں پھر اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس لئے رکن مالیات نے کارروائی روک دی۔ یکم فروری ۱۹۲۸ء کو دہلی میں جب اسمبلی کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ تو رکن مالیات نے منجانب سرکار سابقہ بل کی بجائے دوسرا بل پیش کرنا چاہا۔ جس کے متعلق اعتراض ہوا کہ جب تک پہلے بل کا تصفیہ نہ ہو جائے قانوناً دوسرا بل پیش نہیں ہو سکتا۔ صدر اسمبلی مسٹر پٹیل نے اعتراض کو تسلیم کرکے بل کو پیش کرنے سے روک دیا۔ اس طرح ریزرو بنک کے قیام کا مسئلہ اس نوبت پر ختم ہو گیا۔ ہندوستان کو جدید اصلاحات دینے کے سلسلہ میں جو آئینی کمیشن (سائمن کمیشن) مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے ریزرو بنک کے مسئلہ پر بھی اپنی رائے دی۔ نیز ۱۹۳۴ء میں انڈین لیجسلیچر نے ریزرو بنک قایم کرنے کے لئے ایک ایکٹ منظور کر لیا تھا۔ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے ریزرو بنک پر بحث کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "اس وقت کرنسی اور تبادلہ براہِ راست حکومتِ ہند کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اس کے اختیارات سنٹرل بنک کے سپرد کر دیئے جائیں جو اس کے ساتھ ساتھ ملک کے قرضہ جات کی بھی نگرانی اور نگہداشت کرے گا۔ اس تعبیر کا جواز اس وقت اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے جب کہ مرکزی حکومت میں دستوری تغیرات رونما ہو رہے ہوں۔ ہم اس رائے سے جو ملک معظم کی حکومت کے پیش نظر ہمیشہ سے رہی ہے۔ متفق ہیں کہ مرکز میں آئینی تغیرات کے رونما ہونے کے پیش نظر ایک ریزرو بنک کے قیام کی ضرورت ہے جو سیاسی اثرات سے محفوظ رہ کر مستحکم بنیادوں پر قایم ہو۔"

البتہ جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے آئینی کمیشن کی اس سفارش میں جو اس نے کرنسی اور تبادلہ کے نظم و نسق کے سلسلہ میں بنک کے فرائض و اختیارات کے متعلق پیش کی تھی، قدرے ترمیم کرنے کی رائے دی تھی۔ ان تمام انقلابات و مباحث کے بعد جدید قانونِ ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے ریزرو بنک ہندوستان میں قایم ہو گیا۔ اور موجودہ قانون کے لحاظ سے ریزرو بنک کا سرمایہ پانچ کروڑ روپے ہے اور ایک حصہ سو روپے کا ہے۔ بنک کی شاخیں۔ بمبئی، دہلی، کلکتہ مدراس اور رنگون میں قایم ہیں۔ بنک کی نگرانی اور انتظام کا کام ڈائرکٹروں کی ایک مرکزی مجلس کے سپرد ہے۔ اس میں ایک گورنر اور دو ڈپٹی گورنر ہوتے ہیں۔ انھیں گورنر جنرل کے کونسل کے مشورے سے مقرر کرتا ہے۔ چار ڈائرکٹر بھی گورنر جنرل مع کونسل کی طرف سے نامزد کئے جاتے ہیں۔ آٹھ ڈائرکٹر حصہ داروں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں اور گورنر جنرل مع کونسل ایک سرکاری افسر مقرر کرتا ہے۔ گورنر جنرل سے اجازت لئے بغیر کوئی ایسا مسودہ یا مسودہ کی ترمیم وفاقی جماعت قانون ساز میں پیش نہیں ہو سکتی۔ جس کا سکہ سازی یا کرنسی یا بنک کے فرائض پر اثر پڑتا ہو گورنر جنرل، گورنر اور ڈپٹی گورنروں کے تقرر و علحدگی ان کی تنخواہوں، الاؤنس اور مدت ملازمت کی منظوری اور ڈائرکٹروں کی نامزدگی و موقوفی وغیرہ کے معاملات میں اختیار خصوصی سے کام لے گا۔ وہ مرکزی بورڈ کو توڑ بھی سکتا ہے۔ اور بنک کو دیوالیہ بھی قرار دے سکتا ہے۔

محمد عیسیٰ خاں

نئی کتابیں

۱۔ مشرق و مغرب (افسانہ) از حمیدہ سلطان ۱۰۵ صفحات قیمت عہ انیس نسواں دہلی۔

۲۔ معمار اعظم (ڈراما) مترجمہ عزیز احمد قیمت ۱۲؍ انجمن ترقی اردو۔ دہلی۔

۳۔ اضافیت از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی قیمت ۱۲؍ انجمن ترقی اردو دہلی

۴۔ تاریخ یوسفِ دکن (سوانح نواب مختار الملک مرحوم) از مصطفائی بیگم لیڈی کمشنر خزانہ عامرہ قیمت للعہ از مؤلفہ نمبر مکان ۳۱۵۹۔ کاچی گوڑہ

۵۔ خطابیات (فنِ تقریر) از شیخ رحیم الدین ۱۱۲ صفحات قیمت ۱۲؍ سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد

۶۔ انوار (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از علی اختر ۱۶۸ صفحات قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد

۷۔ مبادی سیاسیات (دوسرا ایڈیشن) از ہارون خاں شروانی ۶۰۸ صفحات قیمت صہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۸۔ خطوط محمد علی مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۳۲۰ صفحات قیمت عالہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۹ ظالم محبت (ناول) از محترمہ حجاب امتیاز علی ۲۴۴ صفحات قیمت عالہ ساقی بکڈپو۔ دہلی

۱۰۔ سوگوار شباب (المیہ ناول) از پروفیسر مجنون گورکھپوری قیمت عہ ایوان اشاعت گورکھپور۔

۱۱۔ آپ بیتیاں (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروزپوری قیمت عہ دائرۂ ادبیہ۔ رام گلی۔ لاہور

۱۲۔ گناہ غربت (ناول) از لیوٹالسٹائی قیمت عہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد۔

۱۳۔ شمع زندگی (ناول) از سرت چندر چٹرجی قیمت ۱۲؍ " " "

۱۴۔ آزمائش (افسانے) از منشی سدرشن قیمت عہ " " "

۱۵۔ ٹالسٹائی کے افسانے مترجمہ شاکر میرٹھی قیمت ۱۲؍ " " "

۱۶۔ پاکیزہ افسانے از ٹیگور وغیرہ قیمت ۱۲؍ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدر آباد۔

۱۷۔ درد کی تصویریں (افسانے) از تڑپ قیمت عہ " " "

۱۸۔ آدھے گھنٹہ میں ہندی (ہندی سیکھنے کے آسان طریقے) از عظیم بیگ چغتائی قیمت ۴؍ دفتر کتابت۔ جودھپور۔

۱۹۔ پس پردہ (مجموعہ کلام) از اختر بریلوی ۴۸ صفحات قیمت ۱۲؍ میزان الادب۔ ذخیرہ اسٹریٹ۔ بریلی۔

۲۰۔ صنعت و حرفت کے قیمتی راز از مہانند ۲۰۸ صفحات قیمت عہ سیوا بک ڈپو۔ لاہور۔

۲۱۔ ۲۰ عورتیں (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروزپوری قیمت عہ دائرۂ ادبیہ۔ رام گلی۔ لاہور

۲۲ قفس زریں (ناول) مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری قیمت (ستے) دائرۂ ادبیہ۔ رام گلی۔ لاہور۔

۲۳۔ کہکشاں (افسانے) از رفیعی اجمیری ۲۸۴ صفحات قیمت عالہ۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی

۲۴۔ بیوی اور بیسوا (ڈراما) از کشن چند زیبا قیمت ۱۲؍ لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور۔

۲۵۔ مرلی منوہر (ڈراما) " " " "

۲۶۔ حسین اور انقلاب (مسدس) از جوش ملیح آبادی ۴۰ صفحات قیمت سرفراز بکڈپو لکھنؤ

۲۷۔ ارشاد رسالت (احادیث کا منظوم ترجمہ) از محمد رمضان ۹۶ صفحات قیمت ۱۵؍ اسلامی دارالاشاعت۔ اقبال گنج۔ گجرات۔

۲۸۔ شہر خموشاں (افسانے) از سید محمود مورخ قیمت عہ گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

۲۹۔ غلاموں کی بغاوت (انقلابی افسانے) از مرزا ادیب قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل لاہور

۳۰۔ صبح نشاط (مجموعہ کلام) از اصغر حسین خان نظیر۔ ۴۰ صفحات قیمت ۳؍ صغیر اینڈ برادرز۔ لدھیانہ۔

۳۱ زبان دانی (اردو کی اصلاح) از فضل الٰہی عارف ۳۰۰ صفحات عہ اردو اکیڈمی پنجاب لاہور

۳۲۔ گنج پنہاں (مسدس) از اکبر الٰہ آبادی قیمت عہ۔ رضا کمال بکڈپو لاہور۔

۳۳۔ اردو انسائیکلوپیڈیا (نمونہ) مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن (چار آنے کے اسٹامپ بھیجکر منگوا سکتے ہیں)

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

شعبہ اردو انسائیکلوپیڈیا

تقسیم کار اردو انسائیکلوپیڈیا چونکہ ماہرین علوم وفنون کی نگرانی میں مرتب ہو رہا ہے اس لئے تقسیم کار کے لئے متعدد ماہرین کی الگ الگ کمیٹیاں علوم وفنون کے لحاظ سے بنائی گئی ہیں جن کی خاص ہدایات کے تحت الفاظ پر مقالات مرتب کئے جا رہے ہیں۔ علم انجنیری کی کمیٹی مولوی سید عارف الدین صاحب چیف انجنیر کی زیر نگرانی حسب ذیل انجنیروں کے تعاون سے سرگرم کار ہے۔

(۱) سول انجنیری..... داعی ۔ مولوی ولدار حسین صاحب و مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر

شرکاء

الف　عمارتیں..... ۱۔ مولوی صادق علی خاں صاحب
　　۲۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب
ب　سڑکیں اور پل..... ۳۔ مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر
ج　آبپاشی..... ۴۔ مولوی خواجہ عظیم الدین صاحب
د　آبرسانی..... ۵۔ مولوی رحمت اللہ صاحب
　　۶۔ مولوی مہدی علی صاحب
ہ　حفظانی انجنیرنگ　۷۔ مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر
و　اشیائے تعمیر..... ۸۔ مولوی عبدالصمد صاحب سوداگر
ز　محکمہ کنکریٹ..... ۹۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب
ح　پیمایش..... ۱۰۔ مولوی محسن الدین صاحب حقانی

(۲) میکانی انجنیری..... داعی ۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری

شرکاء

الف　انجن..... ۱۔ مولوی عابد علی صاحب
ب　مشینیں..... ۲۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری
ج　فلزیات اور ایندھن ۳۔ مولوی عبداللہ حسن صاحب
د　مشینوں اور انجنوں کے پرزے ۴۔ مولوی عبدالقادر صاحب
ہ　ہوائی جہاز　۵۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری
　　۶۔ مسٹر پنگل مدھو سدھن صاحب ریڈی

(۳) برقی انجنیری..... داعی ۔ مولوی افضل علی خاں صاحب

شرکاء

۱۔ مولوی مصطفیٰ بیگ صاحب
۲۔ مولوی مخدوم حسینی صاحب
۳۔ مولوی حبیب عثمان صاحب
۴۔ مولوی خطیب حیدر حسین صاحب

(۴) فن عمارت اور ٹاؤن پلاننگ..... داعی ۔ مولوی عزیز علی صاحب

شرکاء

۱۔ مولوی فیاض الدین صاحب
۲۔ مولوی حشمت رضا صاحب

(۵) معدنیات..... داعی ۔ مولوی سید کاظم صاحب
(۶) نقشہ کشی..... داعی ۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب
(۷) ریلوے..... داعی ۔ مولوی یٰسین علی خاں صاحب

اسی طرح جغرافیہ کی کمیٹی مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے نائب ناظم تعلیمات کی نگرانی میں حسب ذیل اصحاب کے تعاون سے متعلقہ الفاظ پر مقالات مرتب کروا رہی ہے۔

— طے پایا کہ ہر شعبہ حسب سہولت اپنے اراکین میں اضافہ کر سکے گا۔

— طے پایا کہ جملہ اصحاب کے یہاں متعلقہ فہرستیں روانہ کی جائیں تاکہ آیندہ اجلاس تک وہ اپنے اپنے موضوعوں سے متعلق الفاظ کا اضافہ کریں۔

— طے پایا کہ آیندہ اجلاس جمعہ ۸ شہریور سنہ ۱۳۵۰ف کو صبح میں ساڑھے نو بجے منعقد کیا جائے۔

	موضوع	اصحاب
۱	ممالک شمالی (یورپ، ایشیا، شمالی امریکہ وغیرہ۔	قاسم علی سجن لال صاحب ایم اے ڈپٹی ہیڈ مددگار چادرگھاٹ ہائی اسکول؛ عشرت علی خاں صاحب ایم اے ڈپٹی ہیڈ مددگار چادرگھاٹ ہائی اسکول
۲	ممالک جنوبی (افریقہ، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ، نیوزیلینڈ، جزائر شرق الہند و غرب الہند وغیرہ)	محمد یوسف صاحب بی اے بی ٹی، صدر مدرس کاچی گوڑہ؛ گنیش چند صاحب بی اے بی ٹی مددگار دارالعلوم
۳	دنیا کی خطہ واری تقسیم	غلام قادر صاحب بی اے وائس پرنسپل سٹی کالج۔ عبدالغفور صاحب بی اے بی ٹی مددگار مدرسہ نام پلی۔
۴	ریاضیاتی جغرافیہ......	عبدالوکیل صاحب ایم اے ڈپٹی ہیڈ صدر مدرس مدرسہ عالم پور
۵	سمندر اور اس کے متعلقات	عبدالجبار صاحب سبحانی بی اے بی ٹی ناظر تعلیمات ورنگل۔
۶	جغرافیہ اور اس کی تاریخ واہمیت واثرات وغیرہ	سید احمد صاحب ایم اے۔ ایف آر جی ایس
۷	کمرشیل اور اکنامک جغرافیہ	ظہیر احسن صاحب صدر شعبۂ جغرافیہ جامعہ پٹنہ۔
۸	ہندستان	جی ایس بھان صاحب بی اے۔
۹	ہوا اور اس کے متعلقات	مولوی عبدالجبار صاحب سبحانی بی اے، بی ٹی۔

اسی طرح دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی الگ الگ کمیٹیاں بنائی جا چکی ہیں جن کا تفصیلی ذکر سب رس کی آیندہ اشاعت میں شریک رہے گا۔

مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے اپنی نگرانی میں تعلیمات سے متعلق کام شروع کرا دیا ہے اور کام کا ایک عمدہ خاکہ تیار کر لیا ہے۔

مختلف سرکاری محکمے مثلاً آبکاری، جنگلات، مالگزاری اور ٹپہ وغیرہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں اور اس کام کے اہل اصحاب کو متعین کر دیا ہے۔

تعاون عمل | حسب ذیل اصحاب بھی ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

(۱) ظفر الاحسن صاحب آئی، سی، ایس۔ مسٹر ظفر الاحسن بی اے (آنرز) آئی سی ایس ڈیرہ غازی خاں سے تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے سیاسیات میں اور خاص کر کے سیاسیات کے اس شعبہ سے جس کا تعلق سیاسی اور شہری نظام سے ہے بہت دلچسپی ہے اور ہندستان میں اور یورپ میں اس کے مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں میری خدمات کام آسکیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

(۲) ڈاکٹر بذل الرحمٰن۔ اسمٰعیل کالج بمبئی کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اس دفعہ کے حیدرآباد کے مختصر قیام کے دوران میں

آپ کے لطف و کرم سے ادارہ کو تفصیلی طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ دکن از سر نو اردو کا مرکز بن گیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت بہت بڑا کام ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ آپ حضرات کر چکے ہیں اس کو دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ میں انشاءاللہ اپنے وعدے پر قایم رہوں گا۔ جو خدمت میں کر سکوں گا اس سے ہرگز گریز نہ ہوگا۔"

(۳) پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"اس سلسلہ میں جو کام بھی میرے سپرد ہوگا اس کو باعث عزت و افتخار سمجھ کر انشاءاللہ ضرور انجام دوں گا۔ گجراتی لٹریچر سے متعلق آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں تحریر فرمائیے یہاں وہ کام بہت اچھی طرح ہو جائیگا۔"

(۴) پروفیسر سراج حسین صاحب نقوی اسمٰعیل کالج تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھ سے جو کچھ بھی خدمت ہو سکے گی میں کرنے کو تیار ہوں سائنس کے شعبہ طبیعات سے مجھے خاص طور پر دلچسپی ہے اس شعبہ میں آپ مجھ سے بلا تکلف کام لے سکتے ہیں۔"

(۵) اردو کے مشہور ادیب مجنوں گورکھپوری تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے جو مسرت ہوئی ہے وہ حد دو اظہار سے باہر ہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا جو قصدہ ا سال سے پورا نہیں ہو رہا تھا یکایک اسکی تکمیل ہو گئی ہے۔ شکر ہے آپ لوگ اسکی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور اس کام کو پورا کر رہے ہیں۔ میں اس کام میں آپ لوگوں کی مدد کرنے کیلئے تیار ہوں۔ مندرجہ عنوانات کے تحت اس انسائیکلو پیڈیا میں حصہ لے سکتا ہوں۔ یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں زندگی بھر مجھے دلچسپی رہی ہے اور جن کا میں مطالعہ کرتا رہا ہوں۔"

نمونہ کی اشاعت حسب عدہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی مجلس انتظامی نے چند روز پہلے ابتدائی نمونہ شایع کیا تاکہ اسکے ذریعہ ایک طرف تو عوام کو اس عظیم الشان کام کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور دوسری طرف اردو انسائیکلو پیڈیا کے قلمی معاونین کے پیش نظر نمونہ کے چند مقالات رہیں تاکہ وہ زبان انداز بیان اور مواد کے متعلق معینہ معیار کی پیروی کر سکیں۔

حیدرآباد میں اور بیرون حیدرآباد سیکڑوں اہل علم و فضل اصحاب اور مدیران رسائل و اخبارات کے ہاں اس کی کاپیاں بھیجی گئیں۔ چونکہ یہ خواہش بھی کی گئی تھی کہ وہ اپنی آزادانہ رائے سے مطلع کریں اس لئے ہر ڈاک سے بیسیوں خطوط برابر آرہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر علماء اور صاحبانِ نظر نے اس نمونہ کو بڑی اچھی نظر سے تفصیل کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس سلسلہ میں منتظمین اردو انسائیکلو پیڈیا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسے سب اہل علم و کمال اصحاب کا "سب رس" کے ذریعے شکریہ ادا کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے ہی حضرات کی ہمت افزائی سے اتنا بڑا کام تکمیل کو پہنچ سکے گا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کیا جاتا لیکن ہمارے سیکڑوں مخلص دوستوں کو الگ الگ لکھنا موجودہ مصروفیتوں کی وجہ سے بڑی حد تک ناممکن سا تھا اس لئے "سب رس" کو ترجمان بنایا گیا۔

نمونہ کے متعلق ہمیں جو خطوط وصول ہوئے ان میں سے چند کے اقتباس یہ ہیں۔

پرنسپل محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ اردو انسائیکلو پیڈیا کے ابتدائی نمونہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"اردو زبان میں ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے جو تعلیم یافتہ عوام کو دَورِ حاضر کی تیز رفتار ترقی کے لحاظ سے مختلف شعبہ جات علوم و فنون کے روزمرہ مسائل کی نسبت صحیح اور قابل اعتماد معلومات بہم پہنچا سکے۔ ادارہ ادبیات اردو کی یہ کوشش قابل مبارک باد ہے۔ مجھے امید ہے کہ محققین اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اور اپنے مساعیٔ جمیلہ سے اس کو کامیاب بنائیں گے۔"

مولنا عبد الماجد صاحب۔ مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی ایڈیٹر صدق اردو انسائیکلو پیڈیا کے نمونہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :۔

"انسائیکلو پیڈیا کا نمونہ پہنچا۔ سبحان اللہ ماشاء اللہ اتنے بہتر کام کی کم از کم مجھے تو توقع نہ تھی خواب ہم لوگوں (یعنی حضرت سلیمان اور اس مور ضعیف) نے ۱۹۱۶ء میں دیکھا تھا۔ تعبیر ۲۵ سال بعد آپ لوگوں کے ہاتھوں پوری ہوئی۔ این سعادت بہ زور بازو نیست" نمونہ کے اوراق میں مجھے تو کہیں بھی حرف گیری کی گنجایش نظر نہیں آتی"

مولوی قاضی زین العابدین صاحب ایچ۔ سی۔ ایس ناظم آبکاری تحریر فرماتے ہیں :۔

"... اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب اور اشاعت کا کام آغاز کرکے اردو ادب کی ایک بیش بہا خدمت کی ذمہ داری ادارہ نے قبول فرمائی ہے۔ خدا آپ کی مدد فرمائے اور اس کو انجام تک پہنچائے۔ ملک کے ہر فرد کا یہ فریضہ ہے کہ اس کار ستر گ میں ادارہ کی مدد کرے۔

"..... نمونہ میں سمجھتا ہوں کہ فی الجملہ بہت کامیاب ہے.... کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کی طباعت دار الطبع سرکار عالی کے جدید ٹائپ پر ہو جس کی وجہ اس کی صفائی اور شان دوبالا ہو جائے گی...."

ڈاکٹر محمد باقر صاحب ایم اے پی ایچ ڈی اورنٹیل کالج لاہور تحریر فرماتے ہیں :۔

"....اردو انسائیکلو پیڈیا کا نمونہ ملا۔ آپ کی محنت اور کاوش کی داد دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ یہ کام جلد از جلد سرانجام پاشے۔"

شاخ کلیانی اس ماہ میں اس شاخ کو مولوی عبد الکریم صاحب شریک معتمد اور غلام معین الدین صاحب معین رکن تشہیر نے حسب ذیل کتب مرحمت کی ہیں۔

ورڈسورتھ اور اسکی شاعری۔ بغداد عہد عباسیہ میں۔ افصح الکلام۔ سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ اشک ندامت کی حقیقت۔ فتح عظیم روح تنقید۔ خطبۂ صدارت صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب۔ ہم اور ہمارے اعمال۔ کلام اکبر۔ بحری سانٹ۔ مسیح کی انجیل۔

کتب معطیہ مولوی غلام معین الدین صاحب۔ پھولوں گلدستہ عاشقوں کا۔ چٹکیاں و گدگدیاں۔ افسانہ۔ سبز گنبد کے مکین۔ نصاب اردو۔ اس وقت تک دار المطالعہ کی کتب کی جملہ تعداد (۱۳۰) ہے۔ اس سے قبل کے عطیوں کی تفصیل یہ ہے۔

مولوی عبد الکریم صاحب مدرس و شریک معتمد شاخ ہذا۔ اسلامی عملی زندگی۔ مجلۂ عثمانیہ۔ تاریخ ہند۔ زمزمۂ محبت۔ گلدستہ عزیز۔ انوار الاخلاق۔ ریلوے کا مختصر خاکہ۔ مختصر سرگذشت سررشتۂ ٹپہ۔ رپورٹ مجلس اتحاد المسلمین معہ خطبۂ صدارت۔ مصباح القواعد۔ جذبات فاضل۔ دیوان غالب۔ جیبی اٹلس دنیا۔

مولوی خیر الدین صاحب منتظم دار المطالعہ۔ نغمۂ الہام۔ چار یار۔ سپاس جناب امیر۔

مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر۔ سی پارۂ دل بدالنسا کی مصیبت۔ فن تقریر۔ علاج بذریعہ پانی بھاپ۔ دیہی صنعتیں۔

مولوی شیخ محبوب صاحب بھونگے سوداگر۔ تاریخ مسلم لیگ۔

مولوی تاج الدین صاحب مدرس رکن مراسلات۔ فضائل و احکام نماز۔ شمع توحید۔ فلسفۂ ارکان اسلام۔

مسٹر دتو سنگھ صاحب وارہ وغیرہ باغات۔ ہندوستان کا دیہی قرض

مولوی محبوب حسن صاحب جگر ۔ سو شلزم ۔

محمد عطاء اللہ عطا معتمد شاخ ہذا ۔ سلسلۂ دینیات حصہ اول، سوم و ششم ۔ ٹیروس کے سترہ باجی ۔ بھکنی اور دست پناہ ۔ معیار الاخلاق ۔ محفل خواجہ ۔ ذخیرۂ حکمت ۔ تذکرۂ پاک حصۂ اول ۔ کلام فصیح ۔ سحر سامری ۔ انسان ۔ چمن زار اردو ۔ جیبی رہنما سرشتہ ٹپہ سرکار عالی ۔ ہندوستان کی تاریخی کہانیاں ۔ داستان سوختہ ناظم ۔ تارا گڑھ کی لڑائی ۔ عروس جنت ۔ تقاریر مولانا محمد علی جوہر ۔ منتخب الحکایات ۔ نورنامہ وغیرہ ۔ اسلامی رسول ۔ کریمہ ۔ رسایل نظام المشائخ ۔ اردو کی چوتھی ۔ سرمایۂ نجات ۔ نغمۂ ذاکر ۔ دکن کی تاریخی کہانیاں ۔ بزم اردو ۔ کلید تصوف ۔ رفعات عنایت علی ۔ چار آئینہ اردو ۔

دار المطالعہ اوقات مقررہ پر برابر کھولا جارہا ہے اس کے لئے ایک لڑکا مواجبی عالی ماہانہ کا مقرر کیا گیا ہے اور دو کان سے ماہانہ کرایہ کی حاصل کیگئی ہے ادارہ کی معطیہ کتب کے علاوہ دیگر کتب بھی جو مختلف حضرات نے مرحمت فرمائی ہیں مطالعہ کے لئے رکھی گئی ہیں ۔

حسب ذیل اشخاص نے مندرجہ ذیل اخبارات ادارہ کو مرحمت فرمائے ہیں ۔

۱ ۔ عالیجناب مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار اسٹنٹ کلیانی ۔ روزنامہ پیام حیدرآباد
۲ ۔ مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر شاخ ہذا ۔ ہفتہ وار پیسہ اخبار لاہور
۳ ۔ اسحاق علی صاحب سوداگر ۔ ہفتہ وار دین و دنیا ۔ دہلی
۴ ۔ معتمد شاخ ہذا ہفتہ وار خیام لاہور
۵ ۔ مولوی شیخ حضرت سوداگر اقبال بمبئی ۔

مزید اخبار و رسایل و کتب کی ضرورت ہے چونکہ ہنوز آمدنی کافی نہیں اس لئے جیسی جیسی آمدنی میں زیادتی ہوگی بنظر حالات اخبارات وغیرہ میں اضافہ کیا جائے گا ۔

چونکہ ادارہ میں ایک شعبۂ تاریخ دکن بھی قایم ہے اس لئے شاخ ہذا نے بھی مقامی تاریخی تحقیقات کو اپنے پروگرام میں شامل کرلیا ہے چنانچہ اس بات کو سن کر آپ ضرور خوش ہوں گے کہ میں نے کلیانی کی تاریخ لکھنی شروع کردی ہے جو ایک قدیم تاریخی مقام ہے یہاں ایک مستحکم قدیم قلعہ موجود ہے قلعہ سے متعلق میں نے ایک مضمون مرتب کرلیا ہے جس میں حوالہ جات کے ساتھ ساتھ میری ذاتی تحقیقات بھی شامل ہے ۔ یہ مضمون قلعہ کے کتبات فصیل و بروج اور محلات کے حالات پر مشتمل ہے جو نہایت غور و خوض اور فکر و تحقیق سے مرتب کیا گیا ہے ۔

محمد عطاء اللہ عطاء (معتمد شاخ کلیانی)

شعبۂ طلبہ گلبرگہ کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۴ امرداد ۱۳۵۰ف زیر صدارت مولوی احمد عبد العزیز صاحب لکچرار منعقد ہوا ۔

پہلے عبد الرشید نے فائز کی ایک نظم جس کا عنوان نغمۂ آزادی تھا سنائی پھر قاضی حمید الدین نے ایک تقریر (مقصد زندگی) پر کی ۔ جس میں انھوں نے زندگی کے تقریباً جملہ مقاصد کو واضح طور پر بتایا بعد ازاں حامد بن احمد نے انور شاہ آبادی کی ایک نظم (استاد) سنائی جو پسند کی گئی ۔ اس میں استاد کی عظمت کا نہایت اچھے الفاظ میں اظہار کیا گیا تھا ۔ پھر معین الدین ارشد نے سائنس کی اچھائیاں اور برائیاں بیان کیں ۔ اس کے بعد نیاز علی خاں نے اردو کی تخلیق پر عمدہ تقریر کی انھوں نے تفصیلی طور پر بتایا کہ اردو ایک مقدس یادگار ہے ہندو مسلم اتحاد کی ۔ اور اردو کی خصوصیات بھی بیان کیں ۔ اس کے بعد سید محمد نور الحسن نے ادارۂ ادبیات کا تعارف کراتے ہوئے کہا "چونکہ ادارہ ایک نہایت اہم مقصد رکھتا ہے جو ہندو مسلم دونوں کے لئے فائدہ مند ہے لہذا ہم سب کو اسکی اعانت کرنی چاہیئے" ساتھ ہی ساتھ شعبۂ طلبہ کا بھی ذکر کیا اور اس شعبہ میں طلبہ کو شریک

ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل طلبہ نے نہایت خوشی کے ساتھ اپنا نام رکنیت میں لکھوا دیا۔

۱۔ عبدالغنی ۲۔ حبیب الرحمن ۳۔ سید حسن سجاد رزاقی ۴۔ حامد بن احمد ۵۔ محمد فاروق حسین ۶۔ بدیع الدین ۷۔ محمد یوسف حسین ۸۔ محمد حسین مسعود ۹۔ محمد اسمٰعیل خاں ۱۰۔ منہاج الدین مجاہد۔

اس کے بعد عالیجناب صدر صاحب نے ایک عالمانہ تقریر "فن خطابت" پر کی۔ تقریر کے اصول کو نہایت سلیس طریقہ سے واضح کیا اور ایک اچھے مقرر بننے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں بتلائیں۔ آپ نے بڑے بڑے مقرروں کی مثالیں دیں اور فرمایا کہ یہ سب پہلے تم ہی جیسے تھے۔ مگر بچپن ہی سے انھوں نے مشق کی اور ان اصول کے ذریعہ یہ رتبہ حاصل کیا۔ آپ نے فرمایا کہ طالب علموں کو تقریر کی مشق کرنی چاہیئے۔

معتمد شعبۂ طلبہ گلبرگہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا جو دور دور محلوں سے اس جلسہ میں شرکت کیلئے تشریف لائے تھے۔ اور کہا واقعی ان حوصلہ مند نوجوانوں کی وجہ سے ہمارا مستقبل شاندار ہوگا۔ بعد میں عالیجناب صدر صاحب جلسہ کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اس جلسہ کیلئے دیا اور طالب علموں کو اپنی تقریر سے مستفید فرمایا۔

اس جلسہ میں اراکین شعبۂ طلبہ کے علاوہ اور کئی طالب علم شریک تھے۔ بہر حال جلسہ کامل دو گھنٹہ کے بعد کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔

اس ماہ مندرجہ بالا طلبہ کے علاوہ ان طلبہ نے بھی رکنیت قبول کی۔ محمد مسعود انصاری۔ محمد منور حسین۔ عبدالحمید۔ عبدالقادر۔

جلسۂ انتظامی شعبۂ طلبہ گلبرگہ کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ ۱۴ / امرداد ۱۳۵۰ف جناب نیاز علی خاں صاحب نیاز کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تقریباً جملہ ارکان نے شرکت کی۔

۱۔ معتمد نے عبدالمجید خاں صاحب نائب معتمد کا روانہ کردہ استعفا پیش کیا اور وہ منظور کیا گیا۔

۲۔ طے پایا کہ نائب معتمد کی جگہ فی الحال خالی رہے۔ آیندہ اس کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

۳۔ سید محمد نور الحسن (معتمد) نے یہ تحریک پیش کی کہ دیہات سدھار کے تحت گلبرگہ کے قریب کے دیہاتوں کو پہنچکر اردو دانوں میں اضافہ کرنے کے لئے وہاں کے کسی اردو داں شخص کو منتخب کیا جائے اور اسے ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے دیہاتی بھائیوں کو کچھ نہ کچھ اردو سکھائے اور اس کام کی اہمیت سمجھائی جائے۔ اس تحریک کو منظور کیا گیا۔ اور آیندہ کسی تعطیلات میں بشرطیکہ کوئی تعلیمی حرج نہ ہو ضرور کسی قریبی دیہات کو ارکان اس کام کے سلسلہ میں جائیں گے۔

سید محمد نور الحسن (معتمد شعبۂ طلبہ گلبرگہ)

شعبۂ طلبہ کلیانی بتاریخ ۵ / جون ۱۹۴۱ء شعبۂ طلبہ کی جانب سے ایک جلسہ بہ مقام رحمت منزل قرار پایا تھا جس میں منظور احمد صاحب معتمد شعبۂ طلبہ اور شہاب الدین صاحب اور سید قادر صاحب اراکین شعبہ نے حب وطن پر تقاریر کیں آخر میں معتمد شاخ کلیانی نے اپنی تقریر میں شعبہ کی ترقی کے لئے حاضرین کو بطور خاص توجہ دلائی۔

اردو امتحانات جن امیدواروں کی درخواستیں اور فیس وصول ہوچکی ہے ان کے ہال ٹکٹ امتحان سے پندرہ روز قبل روانہ کر دیئے جائیں گے۔ اس بارے میں مزید مراسلت کی ضرورت نہیں۔ البتہ امیدوار حسب ذیل مرکزوں میں سے اپنی سہولت کے

مطابق کوئی ایک پسند کرکے اطلاع دیں۔

حیدرآباد، پربھنی، گلبرگہ، کلیانی، نرسی، کیل پریندہ، خانہ پور، پرلی، کامارپڈی، کشتگی۔

اردو امتحانات کے لئے مفت تعلیم کا انتظام ادارے کے دفتر واقع خیرت آباد کے علاوہ درسگاہ علوم شرقیہ بیرون یاقوت پورہ میں بھی کیا گیا ہے۔

چونکہ تاریخ داخلہ گزرنے کے بعد بھی بعض دور دراز کے دیہات اور اضلاع سے شرکت امتحانات کی درخواستیں اس عذر کے ساتھ وصول ہو رہی تھیں کہ ان کے پاس شرکت کی آخری تاریخ کی اطلاع بروقت نہ پہنچ سکی کیونکہ بعض مقام طاعون اور ہیضے کی وجہ سے متاثر تھے اسلئے اس مسئلہ پر غور کرنے کی خاطر اردو امتحانات کی ذیلی مجلس زیر صدارت مولوی سجاد مرزا صاحب، ٹرینگ کالج میں منعقد ہوئی اور طے کیا کہ ایسی درخواستیں حسب شرح ذیل دیرانہ کے ساتھ ۵ رشہر یور تک قبول کرلی جائیں۔

اردو دانی چار آنے۔ اردو عالم ایک روپیہ۔ اردو فاضل ایک روپیہ آٹھ آنے اور خوش نویسی آٹھ آنے۔ لہذا پانچ شہریور تک شرکت کی درخواستیں دیرانہ کے ساتھ روانہ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد کوئی درخواست قبول نہیں کیجائیگی۔

اردو انسائیکلو پیڈیا ایک عظیم الشان ادبی کارنامہ کی بناء

"ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی زندگی کی تھوڑی سی مدت میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی زیر صدارت اردو زبان کی جو خدمت مختلف زاویوں سے کی ہے وہ ایسی ہے کہ اس کو اسی قسم کے معمر اداروں کی صف میں بے چون وچرا کھڑا کرسکتی ہے۔ اب اس نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و اشاعت کا اتنا بڑا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے کہ اس کی تکمیل کے بعد وہ سارے ہندوستان میں یقیناً عدیم النظیر ہوجائے گا۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و اشاعت کوئی آسان کام ہے اور نہ دو چار دس پانچ مخلصوں ہی کے اشتراک عمل سے انجام پاسکتا ہے۔ اس کے لئے ہر علم و فن کے متعدد قابل افراد کا نہایت ہی مخلصانہ تعامل ناگزیر ہے اور ہمیں "اردو انسائیکلو پیڈیا" کے اس نمونے سے جو دفتر پر وصول ہوا ہے اور جو مصور بھی ہے اور جو بڑی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر خوشخط "حرف الف کے چند مختلف الفاظ" پر نمونہ کے مضامین کے ساتھ شایع ہوا ہے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی مجلس انتظامی نے جس کے صدر ڈاکٹر زور صاحب اور معتمدین مولوی فیض محمد صدیقی صاحب اور مولوی سید بادشاہ حسین صاحب ہیں۔ ملک کے اندر اور باہر کے ان تمام علماء و فضلاء کی قلمی مخلصانہ اعانت حاصل کرلی ہے جو اس عظیم الشان کارنامہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اس کا ابتدائی خاکہ بھی تیار کرلیا ہے جس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کام کم ازکم بارہ جلدوں میں ختم ہوسکے گا اور ہر جلد ۵۰۰ صفحات سے کم پر مشتمل نہ ہوگی۔

مختلف ماہرین علوم و فنون کا انتخاب بڑی وسعت نظر سے کیا گیا ہے۔ ان میں ہر فرقہ اور ہندوستان کے ہر خطہ کے فضلاء شامل ہیں۔

جس وسیع تخیل اور ہمہ گیری کے ساتھ اس کام کو شروع کیا گیا ہے اس میں ہمارے لئے کسی اضافہ کی فرمایش کی گنجایش نہیں چھوڑی گئی ہے۔

اتنا عظیم الشان کام، ہم حیران ہیں کہ ادارہ ادبیات اردو بغیر ایک معتدبہ رقم کے کیسے انجام کو پہنچائے گا۔ بلاشبہ

اس نے ملک کے اندر اور باہر کے بڑے علماء اور ماہرینِ فن کی بلے مزد خدمات حاصل کر لی ہیں مگر اتنی بڑی تالیف کی طباعت بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اس نے ہماری علم پرور حکومت سے اپنے اس کارنامہ کے لئے جو مولوی عبدالحق صاحب کے "لغت اردو" سے بھی زیادہ اہم ہے کوئی امداد نہیں طلب کی۔ ہمیں امید ہے کہ اگر وہ اس خصوص میں حکومت سے درخواست کرے تو اس کی علم پروری ضرور اس کی امداد کو آگے بڑھے گی۔ وہ اس کام کے لئے نہ صرف ہماری بلکہ ساری دنیا کی مبارکباد کا مستحق ہے۔"

اداریہ رہبر دکن ۲۳ جون ۱۹۴۱ء

اردو کی ایک اہم ضرورت

"اردو انسائیکلو پیڈیا کا ذکر کرتے ہوئے ان صفحات میں آچکا ہے۔ پچھلے ہفتہ نمونہ کے چند اوراق چھپے ہوئے مع متفرق معلومات کے وصول ہو گئے۔ یہ نمونہ بڑی اور چوڑی تقطیع کے ۱۵ صفحوں پر چھپا ہے۔ ہر صفحہ میں تین گنجان کالم ہیں، لیکن کتابت و طباعت صاف اور اتنی ضخامت میں چھوٹے بڑے ملا کر ۱۹ مقالے درج ہیں۔ زبان صاف، بیان واضح مضامین سب کے سب سنجیدہ، پُر معلومات مستند ایک انسائیکلو پیڈیا کے شایان شان۔

مجلس ادارت کے صدر، اردو کے مشہور خادم و کارکن ڈاکٹر زور ہیں، دو معتمد ہیں، اور چھ ارکان ("ارکان" کا لفظ ترمیم طلب ہے) کی کمیٹی ان کے علاوہ کل فہرست مباحث ۲۶ ابواب میں تقسیم ہے۔

ہر شعبہ مستند ماہرین فن کے ہاتھوں میں ہے۔ مثلاً شعبۂ اسلامیات میں مولانا سلیمان ندوی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالقدیر صدیقی حیدرآبادی وغیرہم ہیں۔ کم از کم یہ نمونہ جس معیار کو پیش کر رہا ہے، وہ ہماری توقعات سے بلند تر ہے۔ اندازہ ہے کہ پوری کتاب ۱۲ جلدوں میں تمام ہوگی، اور ہر جلد کم از کم پانچ سو صفحہ کی ضخامت کی ہوگی۔ اردو زبان کی ٹھوس، سنجیدہ اور قابل قدر خدمت اردو کے ہر ہوا خواہ کی تائید اور عملی ہمدردی کی مستحق ہے۔ نمونہ کے یہ اوراق، دفتر اردو انسائیکلو پیڈیا، خیرت آباد، حیدرآباد دکن کے پتہ سے ۲ کے ٹکٹ میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء یوں بھی سالہا سال سے اپنے کو خدمت اردو کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا یہ کارنامہ حقیقتاً ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور نسلوں بعد تک ان کی یادگار رہ جانے والا ہے۔"

اداریہ "صدق" ۲۳ جون ۱۹۴۱ء

رسالہ "سہیل" گیا۔ بابتہ جون ۱۹۴۱ء کے اداریہ میں لکھا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کی خدمت و اشاعت کا تعلق ہے حیدرآباد اور ادارہ ادبیات اردو کی خدمتیں رہتی دنیا تک یادگار رہیں گی اب تک اس ادارہ سے مختلف علوم و فنون کی مستند اور جامع کتابیں شائع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکی ہیں اور آئے دن اسمیں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اردو انسائیکلوپیڈیا فنی اور معلوماتی لحاظ سے اردو میں نئی چیز ہوگی اور اس کی اولین اشاعت کا سہرا ادارہ ادبیات اردو کے ہی سر ہوگا اس کی ترتیب کیلئے ملک کے مستند ادبا اور ماہرینِ فن کی خدمات حاصل کر لیگئی ہیں اور سب سے زیادہ اطمینان و خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب حیدرآباد کے مشہور محقق اور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔ ....

اس کو ظاہری حیثیت سے بھی مکمل اور جاذب نظر بنانے کی حتی الامکان کوشش کیجا رہی ہے چنانچہ سرورق کیلئے مشہور حسن کار خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کی خدمتیں حاصل کر لی گئی ہیں .... حامیان اردو سے ہماری پُرزور اپیل ہے کہ وہ انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور ادارہ ادبیات اردو کو موقع دیں کہ وہ اردو کی اس سے بھی زیادہ قیمتی خدمتیں انجام دے سکے۔

ہندی نوجوان کی فریاد

خدا کے حضور میں

جانے کس بات کا ہیجان ہے میرے دل میں
ایک بے نام سا طوفان ہے میرے دل میں

سوچتا ہوں تو دھندلکے سے نظر آتے ہیں
گھرے بادل مرے احساس پہ چھا جاتے ہیں

دوپہر پر بھی مجھے ظلمتِ شب کا ہے گماں
ہر طرف بکھرے ہیں بہتے ہوئے لمحوں کے نشاں

میری نظروں میں تو ویران ہے عالم سارا
ضبط کا پردۂ نمناک ہے پارا پارا

جی میں آتی ہے کہ نوحہ کروں، فریاد کروں
قفسِ روح سے اک چیخ کو آزاد کروں

سر اٹھاؤں تو لرز جائے دو عالم کی اساس
قلبِ گیتی پہ مری آہ سے پڑ جائے خراش

آندھیاں آئیں، زمیں ایک ہیولیٰ بن جائے
زلزلے آئیں، یہ دنیا تری جھولا بن جائے

تند طوفاں سے چھلک جائیں سمندر تیرے
چیختا جھاگ دو عالم کو لپک کر گھیرے

اس قیامت میں مرے پاؤں میں زنجیر نہ ہو
میں جدھر جاؤں، جلو میں مرے تقدیر نہ ہو

لوگ چیخیں تو میں ہنستا ہوا گاتا جاؤں
وسعتِ دہر میں طوفان اٹھاتا جاؤں

پھر کوئی لہر اٹھے اور بہالے جائے
ایک ویران جزیرے پہ مجھے پھینک آئے

خلوتِ شب میں جب افلاک پہ تارے چمکیں
اس جزیرے پہ وہ بیتے ہوئے دن آ دھمکیں

گہری سوچوں میں تصور مرا مدہوش رہے
اس قدر سوچوں کہ خود دل مرا خاموش رہے

اور کسی رات کو جب مست ہو دنیا ساری
روح اجڑی ہوئی، اڑ جائے کہیں بیچاری

اپنی اس ہرزہ سرائی پہ بہت دنگ ہوں میں
لیکن اللہ! — ترے دہر سے دل تنگ ہوں میں

احمد ندیم قاسمی

حالاتِ حاضرہ

ترکی اور اس کا موقف

جب اطالیہ نے یونان پر حملہ کیا تو دنیا یہ سمجھنے لگی کہ اب جنگ ترکی کی سرحد تک آ پہنچی۔ اور مولوٹوف برلن گئے تو انقرہ میں بھی کچھ ہل چل سی نظر آنے لگی۔ لیکن یونان کی لڑائی میں جب اطالوی پیچھے ہٹتے گئے تو بظاہر ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب ترکی کو خطرہ نہیں رہا۔ مگر اس سرزمین کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ دنیا کی نظریں اس کے خارجی مسلک پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ ملک آخر کب تک اپنی غیر جانبداری کو سلامتی کے ساتھ قائم رکھ سکے گا۔ یہ ایک عجیب بات ہے اور اسے ترکی کی غیر معمولی اور کامیاب سیاست سمجھنا چاہیے کہ ۱۹۴۱ء کی پہلی ششماہی تک وہ برابر غیر جانب دار رہا۔ اپنے جغرافی موقف کے لحاظ سے ترکی کو مشرقی بحرِ روم میں مرکزی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اسی موقف کا اثر تھا کہ محوری فوجوں کیلئے مشرق قریب کا راستہ عرصۂ دراز سے بند ہے۔ دنیا کی اہم ترین آبنائے یعنی درۂ دانیال ترکی کے قبضہ میں ہے اور یہ ترکی قوم کی شہ رگ ہے جس کی حفاظت کو ترک اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ جدید اسلحہ سے لیس طاقتور فوجیں ترکی کی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں اور ترکی کا ہوائیہ اپنے ملک کو ہر بیرونی طاقت سے بچانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ پوری دنیائے اسلام ترکی کو اپنا رہنما سمجھتی ہے۔ اور ترکی جس طرف بھی قدم اٹھائے، اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے۔ کچھ اسی غیر معمولی موقف کا اثر تھا کہ اتحادی اور محوری دونوں طاقتیں ترکی کو ہموار کرنے کی ایک عرصے سے کوشش کرتی رہیں۔ چنانچہ ایک طرف برطانیہ اور فرانس نے جمہوریہ ترکیہ کے ساتھ بہت پہلے سے رشتۂ اتحاد قائم کرلیا تھا تو دوسری طرف محوری حکومتیں بھی ترکوں کو فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ ایک طرف مسٹر ایڈن بلقان کا دورہ کرکے ترکی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف جرمنی کے ہوشیار سفیر فان پاپن انقرہ میں رہ کر ایک عرصے سے اس بات کی کوشش میں تھے کہ ترکی کو کسی طرح جرمن معاشی نظام کے دائرے میں داخل کرلیں۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود ترکی کی نظریں روس پر لگی ہوئی تھیں اور وہ روس کو ناخوش کرکے کسی ایک فریق کے ساتھ رشتۂ اتحاد قائم نہیں کرسکتا تھا اور ظاہر ہے کہ روس، جرمنی اور برطانیہ تین طاقتور حکومتوں کے ساتھ بہ یک وقت خوش گوار تعلقات قائم رکھنا ترکی کے لئے آسان نہیں تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں ترکی کو دنیا کی موجودہ سیاست میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی اور دنیا یہ دیکھ رہی تھی کہ ترکی سیاست کا پلڑا کس طرف جھک جائے گا۔ بالآخر ایک طویل غیر جانب داری کے بعد ترکی نے اپنے خارجی مسلک کو واضح کردیا اور ۱۸ جون ۱۹۴۱ء کو "ترک جرمن" دوستی کا اعلان ہوگیا۔

ترکی قومیت

موجودہ ترکی زندگی اور ترکی سیاست کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے ترکی کی کیا حالت رہی اور اس کی قومی زندگی میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اس سرزمین میں قدرت نے اتاترک جیسا مرد مومن پیدا کیا تھا جس نے یورپ کے "مرد بیمار" کو ایک نئی زندگی بخشی اور اس کو آن کی آن میں دنیا کے تندرست مرد میدان کے مقابلے میں لاکر کھڑا کردیا۔ اتاترک کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ترکی صرف ترکوں کے لئے ہے۔ اتاترک نے ترکوں میں

احساس قومیت کا بیج بویا اور اس کی ایسے اہتمام سے آبیاری کی کہ یہ رفتہ رفتہ ایک شاداب پودا بن گیا۔ اتاترک نے ترکی سماج کی کشتی کو ایک نئے ڈگر پر ڈال دیا اور انھوں نے سب سے بڑی کوشش اس بات کی کی کہ ترکی کو بیرونی اثرات سے پوری طرح آزاد کردیں۔ چنانچہ یونانی، بلغاری اور سلاوی جو صدیوں سے ترکی کی تجارت پر قابض تھے، بے دخل کئے گئے اور ملک کے معاشی نظام کو استوار بنیادوں پر قایم کیا گیا۔ تعلیم، زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت کو ترقی دی گئی اور آزاد ترکی جمہوریت کو ایک منظم اور باضابطہ نظام کے تحت قایم کیا گیا۔ غرض اتاترک نے ترکی کو ایک نیا قالب اور ایک نئی روح عطا کی اور اس کا اثر یہ ہے کہ ترکی نے آج وہ مقام حاصل کرلیا جہاں پہنچنے کی ہر بیمار اور رو بہ شکست ویا شکستہ قوم کو آرزو ہوسکتی ہے۔

ترکی سیاست

ترکی کا دستور عمومی ہے اور اکتوبر ۱۹۲۳ء سے جب کہ بڑی قومی اسمبلی نے اپنا مشہور اعلان شایع کیا، ترکی میں جمہوریت قایم ہوگئی۔ ترکی جمہوریت کے پہلے صدر مصطفیٰ کمال منتخب ہوئے اور بڑی قومی اسمبلی جو ایک ایوانی مقننہ ہے، جمہوری انداز پر کام کرنے لگی۔ لیکن اس عمومی دستور اور بڑی قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ اتاترک کی آمرانہ رہنمائی بھی ترکی کو میسر آئی جو ترکوں کو عمومیت کی بے راہ روی سے بچاتی رہی۔ اس عمومی طرز حکومت اور اتاترک کی باکمال قیادت کے خوش گوار امتزاج سے ترکی کو بڑا فائدہ پہنچا چنانچہ اسی کا اثر ہے کہ آج ترکی اپنی کامیاب سیاست کی بدولت اپنی ناؤ کو طوفانوں اور ناگہانی حادثات سے بچاتا ہوا سلامتی کے ساتھ لئے جا رہا ہے۔

ترکی کا خارجی مسلک

ترکی کی اس انوکھی سیاست کو جس میں جمہوری شان اور صحیح قیادت کے عناصر شامل ہیں، اس کے خارجی مسلک کے مطالعہ میں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ترکی کے تجارتی تعلقات بہت سے غیر ملکوں کے ساتھ قایم ہیں مثلاً جرمنی، اطالیہ، انگلستان، فرانس، ممالک متحدہ، شام اور روس سے ترکی کو تجارت کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ ملک کی معاشی حالت کو اچھی بنیادوں پر استوار رکھنے کے لئے اسے ان تمام ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم رکھنا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی نے ہمیشہ ان تمام ملکوں سے دوستی قایم رکھی اور خصوصاً اپنے طاقتور پڑوسی یعنی روس کو بہت ہموار رکھنے کی کوشش کی۔ ترکی کا یہ مسلک عصمت انونو کے موجودہ دور میں بھی قایم رہا اور اس یورپی جنگ کے نازک زمانے میں بھی ترکی نے ایک عرصے تک دونوں فریقین جنگ کو برابر اپنا دوست بنائے رکھا جسے ترکی کی غیر معمولی کامیابی سمجھنا چاہیے۔ لیکن سب کو ملاکر رکھنے کا یہ مسلک آخر کب تک نبھ سکتا تھا۔ ترکی کو بالآخر ایک قطعی فیصلہ کرنا پڑا کہ اسے کس فریق کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اب رہا یہ سوال کہ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیوں کیا اور وہ کیا عوامل تھے جن کی وجہ سے ترکی کو اس نئی راہ کے اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اپنے اندر غور و فکر کا کافی سرمایہ رکھتا ہے۔

ترکی اور جرمنی کا معاہدہ

جب بلغاریہ نازی استبداد کا شکار ہوا تو ترکی کی یورپی سرحدوں تک محوری طاقت پھیل گئی۔ پھر یونان پر جرمن

افواج نے قبضہ جمالیا تو انقرہ میں نازیسی خطرے کا احساس ناگزیر ہوگیا۔ اس کے علاوہ جرمنی کی مزید کامیابیوں سے ترکی کا موقف بہت نازک ہوگیا۔ ساموتھریس اور لمناس پر جو درۂ دانیال کے قریب بہت اہم مرکز ہیں، جرمنی کا قبضہ ہوگیا جس سے درۂ دانیال خطرے میں نظر آنے لگا۔ نیز پورے ایجین جزائر پر جن میں کریٹ اور رہوڈس بھی شامل ہیں، جرمن فوجیں چھاگئیں تو مغربی اناطولیہ کی طرف سے ہوائی حملے کے امکانات پیدا ہوگئے۔ اس رفتار حوادث کے ساتھ بڑی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بلغان کے تمام ساتھی ایک ایک کرکے نازیسیوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ترکی تنہا میدان میں رہ گیا۔ ان حالات میں ترکی کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ برلن کی دوستی کا سہارا ڈھونڈے کیونکہ حالات کے لحاظ سے اتحادیوں کا ساتھ دینے میں ترکی کو سوائے نقصان کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر یہ عجیب و غریب بات ہے کہ برلن کے ساتھ ایک نیا معاہدہ طے کرنے کے باوجود ترکوں نے انگریزوں کی دوستی سے بھی منہ نہیں موڑا۔

۱۹۳۹ء سے جب کہ فان پاپن ترکی کے سفیر مقرر ہوئے، جرمنوں کی یہ کوشش رہی کہ ترکی کو برطانیہ کا مخالف بنادے۔ لیکن لندن کی خبروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کو اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ترکی اور جرمنی کے اس معاہدے کی رو سے اتنا ضرور ہوا کہ ترکی انگریزی معاہدے پر کوئی اثر نہیں پڑا اور نہ اس سے ترکی کے اس پیمان پر کسی قسم کا اثر پڑسکا جو اس نے روس کے ساتھ پہلے سے طے کرلیا تھا کہ اس کے خلاف کسی جنگ میں ترکی شریک نہ ہوسکے گا۔ اس معاہدے کی رو سے ترکی اور جرمنی نے ایک دوسرے کی قومی سرحدوں کا تعین اور اس کا احترام کرنے کی پابندی اپنے پر عائد کرلی ہے اور ایسے مسائل میں جو دونوں کے لئے مشترک دلچسپی رکھتے ہوں ترکی اور جرمنی نے آپس میں مشورہ کرنے کا تصفیہ کیا ہے۔ اور اس معاہدے کی مدت دس سال بتائی گئی ہے۔ اگرچہ یہ معاہدہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم اور بڑے دوررس نتائج کا حامل ہے لیکن چونکہ ترکی نے روس اور برطانیہ سے بگاڑ نہیں لیا اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے برطانیہ کا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اب یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ آیندہ ترکی کا رویہ کیا رہے گا اور وہ نازیسیوں کے ساتھ ملکر اتحادیوں کے خلاف میدان میں کھڑا ہوجائے گا یا اپنی موجودہ حالت کو برقرار رکھے گا۔ اگر ترکی کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ترکی کے دشمن کے خلاف ساری اسلامی دنیا متحدہ طور پر کھڑی ہوجائے گی۔ لیکن موجودہ حالات میں کسی ایک معین نتیجہ پر پہنچنا بہت مشکل ہے، ترکی اور اس کے ساتھ دنیائے اسلام کے آیندہ مسلک کے مطالعہ کے لئے آیندہ رفتار واقعات کو دیکھنا چاہیئے۔

حفیظ صدیقی

زُلفِ چلیپا

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام

آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات ہیں
اب تو بوئے آتش و باروت ہے ہر بات میں

موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت، جل رہی ہے کائنات

جس زمیں سے، ارتقا کے انبیاء پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمدؐ کی زمیں وہ ابنِ مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اسکی نظر میں موت ہے

مندروں میں، معبدوں میں، اور کلیساؤں میں موت
خلوتوں میں موت ہے، شاہی شبستانوں میں موت

زرگری کا رقص ہے، سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے

اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں

برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمایہ کا نام
موت کا لبریز ساغر عصرِ حاضر کے غلام

مخدوم

سوز و ساز

غزل :-

وہ نظر اٹھی، جھجک کر رہ گئی
پھانس سی دل میں کھٹک کر رہ گئی

میری جانب بڑھتے بڑھتے رک گئے
پھول کی ڈالی لچک کر رہ گئی

مسکرا کر اس نے پوچھا حالِ دل
بوند آنسو کی ڈھلک کر رہ گئی

کون دیتا ساتھ غم کی رات کا
شمع بھی آخر بھڑک کر رہ گئی

زندگی پر بار تھا احساسِ مرگ
زندگی دامن جھٹک کر رہ گئی

کتنی کیف آور تھی ساغر کی کھنک
آنکھ ساقی کی جھپک کر رہ گئی

حسن کی راہوں کے پیچ و خم نہ پوچھ!
خود محبت بھی بھٹک کر رہ گئی

کیا کہوں ماہر فسانہ دید کا
ایک بجلی سی چمک کر رہ گئی

قطعات :-

پھولوں کی ہنسی، ہنسی نہیں ہے
یہ موت ہے زندگی نہیں ہے
یہ رات! یہ غم کی رات، توبہ!
تاروں میں بھی روشنی نہیں ہے

ساغر میں شراب انڈیلتا ہوں
میں آگ سے روز کھیلتا ہوں
سچ یہ ہے کہ درد و غم کو ماہر
اک فرض سمجھ کے جھیلتا ہوں

لالہ کا جگر کہاں سے لاؤں
نرگس کی نظر کہاں سے لاؤں
شاید کہ درِ قبول ہے بند
آہوں میں اثر کہاں سے لاؤں
بستر سے اٹھے وہ آنکھ ملتے!
ماہر وہ سحر کہاں سے لاؤں

ماہر القادری

یہ مدراس ہے

زگ، زگ، زگا، زگ چھک، چھک، چھکا چھک کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی اور خلاف عادت میں نے اپنے آپ کو بارہ فٹ بلند کمرے میں مسہری پر پڑا ہوا پایا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں حیدرآباد میں نہیں بلکہ مدراس میں ہوں اور یہ الورسٹ ہوٹل کا ایک کمرہ ہے۔ کمرے سے بالکل متصل سفید برقی ٹرین صبا رفتاری سے جارہی تھی اور اسی نے مجھے ساڑھے چار بجے جگا دیا۔ "اونہہ، لاحول ولا" میری زبان سے نکلا اور میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔ پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ "گھر گھر گھر گھر رر گھر گھر رر" کی آواز پر پھر آنکھیں کھول دینی پڑیں۔ میں نے نیند کا خیال چھوڑ دیا اور ہوٹل کے ورانڈے میں آکھڑا ہوا تاکہ اس نئے شہر کی مصروف زندگی کا مطالعہ کروں جہاں انسان دن نکلنے سے بھی دو گھنٹے پیشتر اپنی دوزخ کی آگ فراہم کرنے میں لگ جاتا ہے۔

ہوٹل کے سامنے تارکول کی کالی سڑک بل کھاتی اینڈتی اکڑتی دور تک چلی گئی ہے اس کالی سڑک کے بیچوں بیچ برقی ستون اور ان کے دائیں بائیں ٹرام کی پٹڑیوں کے گڑھے ہیں بالکل ایسے جیسے کوئی اژدہام ریت پر سے ہوکر نکل گیا ہو۔ دور کیوں جائیے، ہمارے ہندوستانی فاقہ زدوں کی پیٹھ کی طویل گہری لکیران سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

جرمن ڈزائن زرد رنگ کی عمارت، چوتھی منزل کا ورانڈہ، مدراس کا منظر اور میں، مفلس و قلاش بے آب وگیاہ میدان میں مسافر کی طرح، جھونپڑی میں ... کر محلول کے خواب کی تعبیر پوری ہو رہی تھی۔

تو میں "یورسٹ" کے ورانڈے میں کھڑا ہوا نیچے کالی سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ دور ٹرام جارہی تھی اور سامنے واگنوں یا لمبی گاڑیوں کا ایک مربوط سلسلہ دودھیا کے صندوقوں سے لدا ہوا جارہا تھا گویا یہ گھاس یا کڑبی کی غلطاں گریاں ہی تھیں۔ غلطاں اس لئے کہ ابتدا میں مجھے وہ قوت نظر آئی جو گاڑیوں کو کھینچ یا چلا رہی تھی اس لئے میں نے سمجھا کہ ٹرام کی پٹڑیوں پر یہ سال کی واگنیں لیجا رہی ہیں۔ نیند کا خمار بھی عجیب ہوتا ہے۔ نہ ٹھیک سوجھے نہ سمجھ میں آئے اور نہ آنکھیں ہی قابل اعتبار خدمت انجام دیں۔ واگنوں کی سست اور ہنگامی رفتار نے مجھے جلد سمجھا دیا کہ یہ بنڈیاں تو ہیں لیکن اس میں بجائے حیوان مطلق کے حیوان ناطق جوتا گیا ہے۔ دو آدمی آگے اور دو پیچھے۔ یہ مجھے پہلے نظر نہ آئے شاید اس لئے کہ میں ان کے اور تارکول کے رنگ میں تمیز نہ کرسکا۔ کوئی تمیز کر ہی نہیں سکتا۔ چار چھ انچ چوڑے اور چار سے پانچ فٹ لانبے سڑک کا اور ان کا رنگ ایک، خطرے کی جھنڈی دو انچ کی لنگوٹی تاگے کا سہارا لئے کہیں چھپی ہوئی، چالیس پچاس فٹ کی بلندی سے دھند لکے میں کوئی کیا خاک تمیز کرے۔ میں نے چاہا کہ انھیں قریب سے دیکھوں اس لئے تین منزلیں طے کرکے نیچے اترا۔ میرے پیر میں چپل تھی اور اس کی "چپک چپک" نے ہوٹل کے دروازے پر سونے والے رکشا والوں کو بیدار کردیا۔ وہ فوراً اپنی ننگی پیٹھ جھاڑتے ہوئے اٹھ گئے اور رکشا کے دونوں ڈنڈے سنبھال کر "ایجمان، ایجمان" کہتے ہوئے رکوع میں آگئے میں ان حرکتوں کو دیکھ کر بوکھلا سا گیا اور بنڈیوں اور رکشاؤں کا صرف تصور ذہن میں لئے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرہ پر آکر دم لیا۔ یہ بھی کوئی انسانوں کی بستی ہے جہاں انسان جانوروں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

کیا یہ بھی اسی خدا کی مخلوق ہے جس نے رکشا میں بیٹھنے والوں کو پیدا کیا۔ یا ان گریاں کھینچ لے جانے والوں اور رکشا کشوں سے خدائے قدوس کو کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے کوئی تعلق نہ بھی ہو، کیونکہ ان غریبوں میں قدیت کا نقدان ہی نقدان ہے لیکن ان کی روزی کتنی قدیت کی حامل ہے کیا ان پر کوئی حرف رکھ سکتا ہے۔ انھیں دنیا میں صرف ایک ہی بات معلوم ہے اور وہ یہ کہ تارکول کی ٹھنڈی یا تپتی ہوئی سڑک پر بوجھ کھینچنا خواہ کسی بڑی توند کا ہو یا اس کے سامان کا جفاکش بے چارے۔

اس ادھیڑبن میں ہم کرسی پر لیٹ گیا۔ تاریکی گھٹتی جارہی تھی اور شور وغل میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ کوے ادھر ادھر کائیں کائیں کرتے ہوئے اڑ رہے تھے اور بے باکانہ کمرے میں بھی در آرہے تھے۔ تارکول کی طرح کالے، بد وضع، بد شکل، ژولیدہ، پروں والے جیسے کسی نے مسل کر چھوڑ دیا ہو یا چڑیمار کے پاس زیادہ دن تک قید میں رہنے کے بعد رہائی پائے ہوں۔ مدراسیوں کے نزدیک کوے کی اتنی ہی وقعت ہے جتنی کہ ہندوؤں میں گائے کی۔ یہ نکتہ مجھے کیسے معلوم ہوا اس کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ کمرہ میں توشہ دان کھلا پڑا ہوا تھا۔ ایک کوا آیا اور اس میں منہ ڈال کر روٹی وغیرہ کے ٹکڑے کھانے لگا میں نے "ہشت" ہائیں "ہشت" اور نہ جانے کیا کہا لیکن وہ یوں بھی ڈھیٹ ہوتا ہے اڑا نہیں میں نے پیر سے چپل نکالی اور مارنے ہی کو تھا کہ فراش جو کمرہ جھاڑنے میں محو تھا مجھے غصہ کی نظر سے دیکھنے اور کچھ "ترکی" بکنے لگا اور اس تفصیل میں یہ عقدہ کھل گیا کہ گاؤ ماتا کی طرح مدراس میں کوا بھی مقدس مانا جاتا ہے۔

صبح ہو چکی تھی۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر دن بھر گھوما کئے اور سر مغرب ساحل سمندر دیکھنے کی غرض سے ٹریپلی کین اسٹانڈ پر اتر پڑے اور ساحل کی طرف چلے۔ دس ہی قدم گئے تھے کہ سیدھی جانب ایک چھوٹے سے دروازے پر ایک تختی آویزاں نظر آئی۔ اس پر "بکنگھم لاج" لکھا تھا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور" یہ ایک مختصر سی سو ڈیڑھ سو فٹ لانبی اور بیس پچیس فٹ چوڑی عمارت ہے۔ اس کا رخ سمندر کی طرف ہے اور سمندر اور عمارت کے درمیان وہ نالہ ہے جو سارے مدراس کی غلاظت لئے عفونت پھیلاتا ہوا بہتا ہے۔ شاید اس تختی پر گورنر مدراس کی نظر نہیں پڑی۔ خیر ہم نام رکھنے والے کی داد دیتے ہوئے ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ حصہ بیچ کے نام سے مشہور ہے اور شام کے وقت یہاں خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ بلدیہ کا ریڈیو کبھی تامل اور کبھی ملیالم میں بولتا رہتا ہے ریت کا سارا میدان سفید نظر آتا ہے لوگ سفید دھوتی اور سفید کرتے پہنے جوتی اور ٹوپی سے بے نیاز ریت پر دھونی رمائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ٹوپی کی تو شاید اس لئے بھی ضرورت نہیں کہ بالوں کا جوڑا ہی سر ڈھانکنے کے لئے کافی ہوجاتا ہے مگر معلوم نہیں کہ جوتے سے بے نیازی کس راز کی حامل ہے۔

موجوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ان کا ساحل سے ٹکراتا اور پانی کا بکھر کر قطروں میں منتشر ہونا اور پھر بلندی سے سمندر میں گر جانا۔ مدراس میں ہمیں یہی ایک حسن نظر آیا۔ باقی کسی اور شئے میں دلکشی نہ تھی اور پانی کی دلکشی تو ہر جگہ موہ لیتی ہے۔ انسانوں میں کرشن کے رنگ روپ کے تو سب ہی نظر آئے لیکن گوپیوں کے رنگ روپ والوں کا پتہ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ خدا جب ہمالیہ پر بیٹھے ہوئے دنیا کے تمام ملکوں کو حسن تقسیم کر رہا تھا اس وقت سطح مرتفع دکن مدراس کے آڑے آگئی تھی۔

اکبر صدیقی

اردو مرثیے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عربی کی طرح اردو میں بھی شعر غالباً مرثیہ سے شروع ہوا ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا کہ زبان اردو کی ابتداء کہاں ہوئی دکن پنجاب ممالک متحدہ اور کسی حد تک بہار بھی اس نزاع میں شامل ہیں اور اپنے اپنے دعوے پیش کر رہے ہیں۔ ہاں ہم یہ متعین نہ کیا جا سکا کہ اس زبان نے زندگی کی پہلی سانس کہاں لی۔ بظاہر جہاں تک غور و تحقیق کا تعلق ہے دکن ہی کا دعویٰ قرین قیاس اور دل لگتی بات معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اگر دکن کو اردو کا مولد اول مان لیا جائے تو پھر اس میں بہت کم شبہ رہتا ہے کہ اردو کی شاعری مرثیہ سے شروع ہوئی۔

قدیم دکنی زبان میں پہلے پہل مرثیے یا نعت و منقبت ہی نظم کہی جاتی تھی۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس زبان میں شاعری کو صرف انہی اصناف کی حد تک دخل تھا۔

مرثیہ بھی اصل میں مدح کی ایک صورت ہے۔ قصیدہ اور مرثیہ میں فرق یہ ہے کہ قصیدہ زندگی میں اور مرثیہ مرنے کے بعد لکھا جاتا ہے۔ عربی میں مرثیے بالعموم کسی عزیز کی موت پر بربنائے محبت نظم کئے جاتے تھے۔ اور ان میں وہی فطری سادگی اور سوز و اثر ہوتا تھا جو عرب قدیم کی شاعری کا امتیاز ہے۔ ہماری زبان میں اس نوع کے مرثیے بہت کم لکھے گئے ہیں اور جو لکھے گئے ہیں ان میں بہت کم قابل ذکر ہیں۔ مرزا غالب نے عارف کی موت پر جو مرثیہ لکھا ہے میرے نزدیک اردو میں اس سے بہتر مختصر اور دردانگیز مرثیہ شاید اب تک نہیں لکھا گیا۔ چند شعر سنئے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ "مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلاؓ اور خاص کر جناب سید الشہداءؓ کے مرثیے پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثیہ کی ابتداء اول اسی اصول پر ہوئی تھی جو کہ قدرت نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر تعلیم کیا ہے۔ یعنی میت کو یاد کر کے حزن و غم کا اظہار کرنا اور اپنے بیان سے دوسروں کو محزون و مغموم کرنا"۔

مولانا کا یہ بیان اردو مرثیوں کے بارے میں حرف بحرف صحیح ہے۔ ہماری زبان میں مرثیہ گوئی ایک مستقل فن کی حیثیت میں اختیار کی گئی۔ اور شعراء کا ایک خاص طبقہ واقعات کربلا کو طرح طرح سے نظم کرتا رہا۔ آخر آخر میں میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ کی لے کو اس قدر بڑھا دیا کہ عہد قدیم کی مرثیہ گوئی بالکل آڑ میں آگئی۔ ورنہ ان حضرات سے بہت قبل بلکہ اس وقت جب اردو کو ایک مستقل زبان کی حیثیت بھی حاصل نہ تھی۔ مرثیہ گو شعراء موجود تھے۔ جن کی شاعری صرف مرثیہ تک محدود تھی۔

چنانچہ نواب نصیر حسین خاں خیال نے اپنے ایک خطبے میں ابتدائی عہد کے بعض مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہاشم و کاظم وغیرہ کے مرثیوں کے بعض شعر بھی نقل کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان حضرات کے مراثی ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

ان کے بعد میر و سودا کے زمانے میں میاں مسکین اور ان کے معاصرین سعد اللہ سکندر شاگرد شاگر ناجی اور گدا وغیرہ موجود تھے۔ تفضلی میرامانی اور محمد علی صبر بھی اسی صنف کے شاعر تھے۔

لیکن اس عہد کے تمام مرثیہ گو شعراء سیدھے سادے انداز میں کربلا کے مصائب کا ذکر کرتے تھے۔ جس سے رونے رلانے کا فرض ادا ہو جاتا تھا۔ اس کے سوا مرثیہ میں کوئی قابلِ ذکر خوبی نہ تھی۔ اسی لئے شعراء میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ سودا اور ان کے بعض معاصرین نے اس میں کچھ جدتیں کیں لیکن وہ بھی بین کے مقام سے آگے نہ بڑھ سکے۔ زمانہ اسی حال پر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میر ضمیر اور میر خلیق شاعری کی اس بساط پر نمودار ہوئے۔ اور وہ وقت آیا کہ اس عہد کی شاعری میں مرثیہ کا پلہ ہر صنفِ سخن سے گراں ہوگیا۔ اس وقت تک شاعری غزل گوئی یا قصیدہ نگاری کا نام تھا۔ غزل اہلِ زبان کی بول چال اور محاورے تک محدود تھی اور قصائد میں دور از کار باتوں کا ایک انبار ہوتا تھا۔ بلکہ وہی قصیدہ زیادہ کامیاب سمجھا جاتا تھا جس میں خلافِ قیاس امور حد سے زیادہ مبالغہ اور صنعت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ مثنوی کا بھی یہی حال تھا۔ اول تو مثنویاں صرف عشقیہ ہوتی تھیں دوسرے ان میں بھی زیادہ تر جنات اور دیو پری کے قصے نظم کئے جاتے تھے اور اصولِ نظم بھی تکلف اور آورد سے خالی نہ تھا۔ یہ حقیقت میں ان مرثیہ گویوں کا احسان ہے کہ انھوں نے مرثیے میں ایک ایسا انداز اختیار کیا جس سے اردو میں نظم کی نئی نئی راہیں کھلیں اور حیاتِ انسانی کے تمام داخلی اور خارجی مقامات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ہوگیا۔

شعرائے اردو کے تقریباً تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ کے معمولی انداز کو اتنا بلند کیا اور رزم و بزم اور واقعہ نگاری کو مرثیے میں داخل کیا۔ مولوی شبلی صاحب کا خیال ہے کہ اگر ان کے مرثیوں کا انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا۔ آپ بھی چند شعر سن لیجئے۔

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے
یہ تو کہئے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے
چیر کر فوج کو اس پار سے اس پار گئے
میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے

گھوڑے کی تعریف میں ان کے مرثیے کا ایک بند ہے:۔

گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار
اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو راہوار
دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار
آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار
کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

غرض مرثیے میں مختلف مضامین بندش کی صفائی اور چستی پہلے پہل میر ضمیر نے متعارف کی۔ اور مسدس میں اظہارِ خیال مرثیہ کے لئے مخصوص کر دیا۔ اسی زمانہ میں میر خلیق جو میر انیس کے والد ہیں۔ اس فن کی اصلاح اور تعمیر میں لگے ہوئے تھے اور اگر وہ مرثیے جوان کے نام سے شایع ہوئے ہیں انہیں کے نتائج فکر تسلیم کر لئے جائیں تو بقول مولانا شبلی بیٹے کو باپ پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ دو ایک بند سنئے۔

مرتا ہے باپ اے علی اکبر ابھی نہ جا
دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لعل سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا
ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آئے یہ آتا نہیں مجھے
رونے میں منہ ترا نظر آتا نہیں مجھے

اصل یہ ہے کہ اس فن کے امام اول و آخر میر انیس ہیں۔ مولوی حالی صاحب فرماتے ہیں۔

"اگرچہ سوسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلے نے میر انیس کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم نہیں رہنے دیا بلکہ اس دھرتیئے کی طرح جیسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لئے کبھی کبھی بارہ ماسہ اور چوبولے بھی الاپنے پڑتے ہیں۔ اکثر مبالغہ اور اغراق کی آندھیوں کے طوفان اٹھانے پڑے۔ لیکن اس قسم کی بے اعتدالیاں ان فوائد کے مقابلہ میں جو ان کی شاعری سے اردو زبان کو پہنچے نہایت بے حقیقت اور کم وزن ہیں۔"

میر انیس کی شاعری پر اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ انھوں نے بعض جگہ محض الفاظ کا طلسم باندھا ہے لیکن جیسا کہ مولانا نے فرمایا ان کے کلام میں ایسے مقامات بکثرت ہیں جنھوں نے اردو زبان کی شاعری کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ان کے مرثیوں کا انتخاب کیا جائے تو ان میں ایسی لاتعداد نظمیں دستیاب ہوں گی جن کے آگے عہد جدید کے کھوکھلے دعوے سر جھکا دیں گے۔ اور اخلاق و سیرت کے لحاظ سے اس شان کی نظمیں فارسی اور عربی میں بھی نہ مل سکیں گی۔ اب میں مختلف عنوانوں کے تحت ان کے مرثیوں کے چند بند سناتا ہوں جس سے آپ میرے اس بیان کی تصدیق فرما سکیں گے۔

جذبات نگاری شاعری کا ایک نہایت مشکل مقام ہے۔ امام علیہ السلام مدینہ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اپنی صاحبزادی جناب صغرا کو بیمار ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں لیجا سکتے وہ اصرار کرتی ہیں۔ حضرت کا جواب سنیئے۔

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار
ہیں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحب آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لئے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

قدرتی مناظر کی تصویر کھینچتے ہیں۔

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بار ور درخت وہ صحرا و سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

واقعہ نگاری دیکھیئے۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

ایک مقام پر فوج کی آمد اور کثرت کے متعلق فرمایا ہے۔

گرمی، ہجوم فوج سے دوچند ہوگئی ہر خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہوگئی

ہمراہیان شاہ کی جرأت اور شوقِ جنگ ملاحظہ ہو۔

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضے کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
نکلا کوئی سمند کو زانوں میں داب کے
غصہ سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے
پاسِ ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی
پٹری ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

جنگ کے جو مناظر آداب جنگ اور فنونِ جنگ کے لحاظ سے میر انیس نے پیش کئے ہیں فردوسی کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انیس اردو کا شاعر ہے اور فردوسی فارسی کا۔ انیس کو شاعر سے بڑھ کر ایک ذاکر کی حیثیت حاصل ہے اور فردوسی فارسی کا خدائے سخن تسلیم کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کی اپنے جواہر سے بے اعتنائی اور غیروں کے سامنے گردن جھکا دینے کی اس سے زیادہ واضع مثال شاید ہی مل سکے۔ ہندوستان بھی اگر اپنے جواہر کو پرکھنے کا اہل ہوتا تو اب تک نہ جانے انیس کے کتنے انتخاب ہوتے اور کس کس شان سے شایع کئے جاتے۔

علی اختر

(یہ مضمون لاسلکی نشر گاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا۔)

افکار کاوش

ستم کش ہوں مگر یہ جور اب بھی سہہ نہیں سکتا
بچھڑ کر آپ سے دو دن بھی زندہ رہ نہیں سکتا

نہ جانے ان دنوں کیا ہوگیا رگ رگ میں نشتر ہے
میں جو محسوس کرتا ہوں وہ تم سے کہہ نہیں سکتا

کوئی کیا شرح کر سکتا ہے آدابِ محبت کی!؟
کہ اک طوفاں ہے دل میں لیکن آنسو بہہ نہیں سکتا

وہ کہتے ہیں کہ ضبطِ غم، محبت میں ضروری ہے
ادھر کمبخت دل ترچھی نظر بھی سہہ نہیں سکتا

دلِ بیتاب کے ہوتے ہوئے راحت کہاں کاوش!
یہ وہ کمبخت ہے جو دو گھڑی خوش رہ نہیں سکتا

کاوش

باغ کا وہی جھونپڑا

دور ـــ وہ امرود کے باغ کی پرچھائیاں!
دیکھتی تو ہو گی تم
کتنے فسانے ہیں گم
کتنے ہی ارمان ہیں
کتنے ہی رومان ہیں
آڑ میں پیڑوں کی ہیں کتنی ہیں رعنائیاں!
وہ جو بہت چھوٹا سا
اس میں ہے اک "جھونپڑا"
آکے بسا ہے وہیں　　ایک "کسان" آج کل
جیسے بنا ہے وہیں　　ایک مکان آج کل
یاد ہے تم کو بھی کیا
یہ ہے وہی جھونپڑا
جس میں سناتے تھے ہم　　روز نئی سی غزل
اپنی بناتے تھے ہم　　لے کے کسی کی غزل
شعر سمجھ پا گئیں
کوئی تو شرما گئیں
اور مجھے روک کر　　خوب بناتی تھیں تم
پھر مرے احساس پر　　خود ہی مناتی تھیں تم
اور بہت سی ہے بات
یاد نہیں ہے مگر
جھونپڑے میں کائنات
آ گئی تھی ہم کو نظر

چھوٹا سا اک جھونپڑا　　عالمِ الفت بدوش
اجڑا سا اک جھونپڑا　　منظرِ جنت بدوش
پھیکا سا اک جھونپڑا　　حسنِ مسرت بدوش
صرف ہمارے لئے
اور تمہارے لئے
عہد محبت میں تھا
دورِ مسرت میں تھا
عشرت و راحت میں تھا
سایۂ دولت میں تھا
آج وہی جھونپڑا　　واقعی ویران ہے
آکے اسی میں بسا　　آج اک انسان ہے
میلا کچیلا غریب
فاقہ کش و بدنصیب
کس کی نظر ہے بھلا
کس کو خبر ہے بھلا
کتنی تمنائیں گم　　اجڑی فضاؤں میں ہیں
کتنی ہی دنیائیں گم　　پیڑوں کی چھاؤں میں ہیں
زندگئ پر بہار
حوصلۂ نغمہ بار
اور خوشی کی پکار
کیا یہ نہ ہوں گی ابھی　　اس کے لئے رونما
کیا نہ بنے گا کبھی　　پہلا سا یہ جھونپڑا
ویسا جب ہم اور تم
ہوتے تھے راحت میں گم
دور ـــ وہ امرود کے باغ کی پرچھائیاں
دیکھتی تو ہو گی تم؟!!

سلام (مچھلی شہری)

رُومان ــــ شخصیت

حُسن اس کے پُراسرار طلسم کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ اس خوبی کے بغیر جس کو ہم شخصیت سے موسوم کرتے ہیں، حسن بے اثر و بے فیض رہ جاتا ہے۔

پتھر کے مجسمہ میں بھی حسن موجود ہے، لیکن اس میں رنگینیت، زندگی اور ولولۂ حیات کا فقدان! ایسے حسین بھی نظر آتے ہیں، جن میں کشش و دلچسپی نام کو نہیں ہوتی اور لطیف ذہانت سے عاری ہوتے ہیں۔

حسین شکل و صورت متناسب الاعضا، بجائے خود مرغوب خاطر ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اگر حُسن، ذہین شعور و معاملہ فہم شخصیت کا بھی حامل ہو تو، خصوصاً نسوانی حسن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔

اگر کسی لڑکی کو حسین عورت بننے کی آرزو ہو ــــ لیکن خشک و تنگ ــــ یا مقابلتہً سیدھی سادی شکل اور جمیل شخصیت کی خواہاں ہو، تو اس کو آخر الذکر حیثیت حاصل کرنے میں مطلق تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔

حسن خود اپنے میں جادو کا بے پناہ اثر رکھتا ہے، اور کبھی کبھی تو یہ کسی کی خواب کی دنیا کو آن کی آن میں شاندار طور سے آباد کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں "محبت بیک نظر" ایک حقیقت بن جاتی ہے، ایسے رومان میں شخصیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

آج کل عہد گزشتہ کے برخلاف، نسوانی ظاہرہ حسن و خوب صورتی و نمود و نمائش ہی دیکھ کر محبت میں گرفتار ہوجانے کا عام رجحان نہیں پایا جاتا ہے۔ مزید برآں جسمانی خوشنمائی، خود نسوانیت کا افسوس بھی تو ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جن کو ذرا سی کوشش سے حاصل کرنا، قایم رکھنا، ہر لڑکی کے قبضہ و قدرت میں ہے۔

صحت و حسن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے، عمدہ صحت کے بغیر حسن اپنی کشش کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ نسوانی سادگی، خوب صورتی کے عام تخیل سے خواہ عاری سہی، شوخ زندہ دلی کے امتزاج سے ایک ناقابل نظر انداز خوبی پیدا کر لیتی ہے۔

ہر انسانی روح میں پوشیدہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ عموماً دیکھا گیا کہ یہ ساری عمر خوابیدہ پڑی رہتی ہیں۔ ان شخصی قوتوں کو بیدار اور ان کی نشوونما کرنا نہایت ضروری ہے۔

تم اپنے میں سے "تم" کو جگا دو۔

جس قدر بھی ہو سکے علم و حکمت حاصل کئے جاؤ۔ تم اپنے باطن کی ساری گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے چھپے ہوئے جواہرات کو اوپر لے آؤ، کسی کی طعن و طنز کی کوئی پروا نہ کرو، تم اپنی خامیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لو، اور ان کی تعمیر و اصلاح کی سعی کرو۔

کسی کی تقلید کرنے کی کبھی کوشش نہ کرو، یہ تمہاری زندگی میں انتہائی خطرناک غلطی ہوگی۔ آخر دم تک اپنی شخصی خصوصیات ہاتھ سے بچائے دو۔

یہی وہ لائحہ عمل ہے، جس کے ذریعہ تم اپنی انفرادیت کو نمایاں اور شخصیت کو درخشاں کر سکتے ہو۔ اس پر اگر جسمانی خوشنمائی کا اضافہ ہوتا ہے اور بالکل تندرست رہو، تو تمہاری جذباتی طینت مزید حساس ہو جائیگی تمہارے خدوخال زندہ دلی کو ظاہر کریں گے، ایسی حالت میں تمہارا ذرا سا تبسم، روح کی اس پُراسرار جاذبیت کو عیاں کر دے گا، جو خود دار شخصیت و مطمئن انفرادیت کا اقتضا ہے۔

(مکفدن)

یس، بی انتا

جدید ادب نسواں

(ہمارا موضوع صرف قلم و آصفی تک محدود ہے)

اُردو زبان اور ادب پر گزشتہ پانچ سو سال سے مختلف دور گزر چکے ہیں، اور آج وہ معراج کمال پر پہونچنے کے سامان کر رہی ہے، علوم و فنون اور ادب کا گراں مایہ ذخیرہ فراہم ہوتا جا رہا ہے جو نہ صرف غیر زبانوں کے ترجموں پر مشتمل ہے، بلکہ مستقل تصانیف پر بھی۔ دوسرے ملکوں کی ترقی اور ان کے ادبیات کے مطالعہ سے ہمارے خیالات میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی ہے، نیا ادب اِس کا نتیجہ ہے جس کی ابتدا و گزشتہ دس بارہ سال سے ہوئی ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ "جدید ادب" کی خصوصیات یا اس کے رجحانات کو تفصیل سے بیان کیا جائے، اس کے لئے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت ہے، ہمارا موضوع اس وقت قلم و آصفی کا "جدید ادب نسواں" ہے، اِس لئے مختصر طور پر اس کی صراحت کی جاتی ہے۔

ادب کی تقسیم اولاً نظم اور نثر پر کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہم ہر ایک پر علحدہ علحدہ اظہار خیال کریں گے۔

یہ صحیح ہے کہ زمانہ دراز سے خواتین دکن اُردو نظم کی خدمت کر رہی ہیں، لیکن ان کا تمام تر سرمایہ قدیم طرز کی شاعری پر مشتمل ہے جس میں وہی گل و بلبل اور شاہد و ساقی کی فرسودہ داستانیں، ہجر و وصال کے افسانے، معشوق کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا رونا پیٹنا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اس میں بہت کچھ تغیر ہو چکا ہے، عصر حاضر سے وہ پوری طرح متاثر ہوئی ہیں، اور نظم گوئی کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے ثبوت میں کئی نظائر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

موج تخیل ۔ یہ نوشابہ خاتون بی اے (عثمانیہ) کے کلام کا مجموعہ ہے اس کی نظموں کے بعض عنوان یہ ہیں 'زندانِ مسلم، قومی گیت، خرد خادر، زندگی کیا ہے، مرقع حسرت، جانِ زندگی، نغمۂ حیات ترانۂ عمل، مرقع بسمل، مرثیہ غم، فریاد مسلم، دہلی کی گرمی، فغانِ مظلوم اشک حسرت، پولس کی لاٹھی وغیرہ ان سے واضح ہو سکتا ہے کہ "موج تخیل" میں تخیل کی موج کن کن موضوعات پر سے گذری ہے ان کی شاعری ایک ہمدرد قوم کے دل کی پکار ہے۔ جو ہمیں اپنی قوم کی پستی کا احساس کراتی ہے اور قوتِ عمل کو ابھارتی ہے۔ نوشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے جامعہ اناث کے قائم ہونے کے قبل بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

نوشابہ خاتون کے بعد بشیر النساء بیگم بشیر کا نمبر آتا ہے، حیدرآباد کا کوئی زنانہ علمی، اور معاشرتی جلسہ ایسا نہ ہوگا جس میں بشیر النساء بیگم نے اپنی نظمیں سنا کر خراج تحسین حاصل نہ کیا ہو، ان کی نظمیں خواتین میں جوش اور عمل پیدا کرنے کا اچھا ذریعہ ثابت ہو رہی ہیں۔ اگرچہ اب تک بشیر النساء بیگم کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے، لیکن رسالوں کے علاوہ متفرق طور پر بھی ان کی نظمیں شائع ہوتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری میں قومیت، اخلاق اور جدت موجود ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ اقبال کے رنگ میں اتنا کامیاب لکھ جاتی ہیں کہ اقبال کے کلام کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

لطیف النساء بیگم ایم اے (عثمانیہ) بچوں کی نظموں کے لئے مشہور ہیں۔ اور بچوں کی نظمیں لکھنا جتنا مشکل ہے ظاہر ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کے سوا ہم کسی ایسے شاعر کو پیش نہیں کر سکتے: جو بچوں کا شاعر کہلا سکے۔ اس کی طرف ہمارے شاعروں کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہئے اور خوشی کی بات ہے لطیف النساء بیگم نے اپنے لئے یہی میدان منتخب کیا ہے۔

اس سلسلے میں سیدہ اختر، رضیہ بیگم قمر، انیسہ بیگم شروانی، رابعہ بیگم

ف بیگم آدا، رحمت بیگم اسیر، اور مسز برکت رائے کے نام بھی لینا ضروری ہے جن کی نظموں سے جدید ادب نسواں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

نثر میں جو قدیم ذخیرہ ہمیں ملتا ہے وہ صرف چند افسانوں ناولوں اور سفرناموں پر مشتمل ہے، اور اس کی فہرست زیادہ سے زیادہ ایک دو درجن تک پہونچ سکتی ہے۔ لیکن گزشتہ چار پانچ سال کے عرصے میں جو ذخیرہ خواتین دکن نے مرتب کیا ہے وہ گزشتہ نصف صدی کے ذخیرہ سے بہت زیادہ ہے اور پھر فنون کی نوعیت کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ہے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ اب اس امر کی ضرورت نہیں رہی ہے کہ مولانا نذیر احمد اور راشد الخیری کی طرح عورتوں کی اصلاح معاشرت اور ان کی زندگی کے سدھار پر مرد خامہ فرسائی کریں۔ اور قاضی عبد الغفار کی طرح "لیلیٰ" کے فرضی خطوط لکھ کر عورتوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کی جائے، کیونکہ عورتیں خود بیدار ہو گئی ہیں اور ان کے قلم میں اتنا زور پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو مردوں کی امداد کی پروا نہیں۔ ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں حسب ذیل کتابیں پیش کر سکتے ہیں۔

نذر ولی - تنقید جس قدر اہم ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہمارے یہاں تنقید کا فن بہت کچھ تشنہ ہے، اور اردو ادب میں اِس فن کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے "نذر ولی" فن تنقید کی بہترین کتاب ہے اِس میں ولی کی شاعری پر مختلف پہلوؤں سے تنقید کی گئی ہے وہ ہمارے ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ نذر ولی جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل خواتین کی تصنیف ہے۔ جس کو پڑھ کر بڑے بڑے نقادوں نے تعریف کی ہے۔

محمد حسین آزاد - یہ جہاں بانو بیگم ایم اے (عثمانیہ) کی قابل قدر کتاب ہے۔ دراصل یہ ان کا وہ مقالہ ہے، جس پر اُن کو ایم اے کی ڈگری ملی ہے۔ آج تک اردو زبان میں مولانا آزاد پر اِس سے بہتر اور اس سے مبسوط کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی سوانح عمری کے علاوہ ان کی نظم اور نثر پر بہ وضاحت روشنی ڈالی گئی ہے اور بے لاگ تنقید کی گئی ہے۔ مولانا آزاد، ان شخصوں میں ہیں جن پر زبان اُردو کو ناز ہے۔ لیکن افسوس کہ زبان اُردو میں اپنے محسن پر کوئی مستقل تصنیف نہیں تھی۔ فاضل مصنفہ نے اِس کمی کو پورا کر دیا ہے

رمز حیات - اقبال کے کلام اور پیغام پر بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اب تک صرف مردوں نے اس کام کو انجام دیا ہے اب "رمز حیات" نے ثابت کر دیا ہے کہ اقبال کے کلام پر عورتیں بھی بہتر سے بہتر تنقید کر سکتی ہیں، بلقیس بانو بیگم نے رمز حیات میں اقبال کے کلام خصوصاً "فلسفہ خواں" کی جو تفسیر کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قدر ہے، فلسفہ ایک ادق اور خشک مضمون ہے، عورتوں کو اس سے زیادہ رغبت نہیں ہو سکتی اس کے باوجود بلقیس بانو بیگم نے جس دلچسپ اور آسان طریقے پر اقبال کے فلسفہ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

تنقیدی مضامین کے سلسلے میں بعض اور کتابوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مثلاً نعیم النساء بیگم کا مقالہ مولانا شبلی۔ تسنیم ربانی صاحبہ کا ظفر اور اس کی شاعری، لطیف النساء بیگم کا مقالہ "اردو شاعری میں تصوف" اگرچہ یہ کتابیں شائع نہیں ہوئی ہیں، مگر جن لوگوں نے ان کے مسودوں کو دیکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ مقالے اُردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

بر لطف ناہید - جدید ادب نسواں میں اِس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ناہید کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ راقم نے لکھا ہے۔ اس لئے یہاں پر اپنی رائے کے بجائے ڈاکٹر زور کی تنقید کا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے

معلوم ہو سکے گا کہ "بربط ناہید" کیا ہے۔

"اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ اب مردوں کو صنف نازک کی ترجمانی کی ضرورت نہیں یا یوں کہئے کہ عورتیں اب مرد ترجمان سے بے نیاز ہو چکی ہیں، نسوانی سینے میں جذبات کا جو اتار چڑھاؤ رہتا ہے، اس کی آئینہ داری مرد سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ جس پر اپنی جنس کی کثافت کا رنگ چڑھا رہتا ہے اس کے لئے تو کسی نسوانی قلم ہی کی ضرورت ہے، اور بربط ناہید کی مصنفہ نے اپنے خطوط کی رعنائی اور رنگینی کے ذریعے سے ثابت کر دیا کہ واقعی صنف نازک کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنا اور عہد حاضر کے تعلیم یافتہ بتانِ طناز کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔"

نذر دکن ۔ ہمارے جدید ادب نسوان میں، نذر دکن کو بھی شامل کرنا چاہئے، اگرچہ بعض اصحاب نے اس کو "تنقید کی آگ" میں جلا کر ناقص اور ناکارہ قرار دیا ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ نذر دکن ایک قابل قدر کتاب ہے، جو تنقید کی آگ میں جل کر بھی راکھ نہ ہو سکی۔ اس میں دکن کی تاریخ، طرز معاشرت اور علم و ادب پر معیاری مضامین ہیں۔ جن کو سکینہ بیگم صاحبہ نے مرتب کیا ہے۔

من کی بپتا، رموز خانہ داری اور علم خانہ داری ۔ یہ تینوں کتابیں علی الترتیب لطیف النساء بیگم، جہاں بانو بیگم اور محمودہ صدیقی کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور من کی بپتا میں ہمارے متوسط طبقے کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے زندگی کی تلخیوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ تقلید اور مغرب زدگی کو چھوڑ کر کس طرح زندگی کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ تفکرات اور پریشانیوں کے اسباب پر غور کر کے کس طرح ان کی روک تھام کی جا سکتی ہے، متوسط طبقے کے لئے، یہ کتاب شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

"رموز خانہ داری" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے منزلی زندگی کے بہترین طریقے اور گھر کے انتظام کی باتیں بتائی گئی ہیں، "جو لڑکیاں شادی کے بعد کتابوں کے مطالعے میں اتنی سرگرم رہتی ہیں کہ ان کو امور خانہ داری سے کوئی واسطہ نہیں رہتا، وہ گھر کے انتظام کے قابل نہیں رہتی ہیں پھر ان سے نہ بچوں کی پرورش ہو سکتی ہے اور نہ جیسی کہ ہونی چاہئے میاں کی خدمت ہو سکتی ہے ایسی لڑکیوں کی زندگی میں ایک طرح کی بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے، اور ان کا اصلی معنوں میں خوش رہنا بہت مشکل ہے"۔ رموز خانہ داری میں اسی مسئلہ کا حل موجود ہے اور اس علم پر عمل کے طریقے واضح کئے گئے ہیں۔ آخری کتاب علم خانہ داری ڈومسٹک سائنس کے متعلق پہلی اور کامیاب کتاب قرار دی جا سکتی ہے۔

"سوتیلی ماں" یہ رابعہ بیگم کے قلم کی رہین منت ہے "ماں" کا لفظ جس طرح بے پایاں محبت و شفقت کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح ایک لفظ "سوتیلی" کے اضافے سے وہ ظلم و جور کا تصور پیش کر دیتا ہے، لیکن "سوتیلی ماں" میں رابعہ بیگم نے بتایا ہے کہ کس طرح سوتیلی ماں بھی ویسی ہی محبت و شفقت کر سکتی ہے، ایک جگہ کتنی عمدہ بات لکھی ہے "دنیا میں فسادات کی جڑ حق تلفی ہے، اگر سب مستحق ہستیاں ایک دوسرے کے حقوق پر نظر رکھیں تو ناخوش گوار واقعات پیش ہی نہیں آ سکتے۔"

رفتارِ خیال ۔ رفتار خیال میں جہاں بانو بیگم کے مختصر افسانے اور ادب لطیف کے مضامین شامل ہیں، افسانوں میں طبع زاد اور ترجمے دونوں شریک ہیں، رفتار خیال کے مختصر افسانے واقعیت نگاری کے لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ افسانے نہیں، بلکہ کسی کی آپ بیتی کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔

نسوانی کوششوں میں خدیجہ بیگم کے بچوں کے ڈرامے، نور جہاں، گوتم، دسرتھ، شاہ جہاں اور ابو الحسن بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے

یہ پانچوں ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں اور پسند کئے جا چکے ہیں اور یوں تو ہر ڈرامہ قابلِ قدر ہے، لیکن "ابوالحسن" کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اس میں ابوالحسن تانا شاہ کی سیرت کو ابتداء سے انتہا تک بچوں کی سمجھ کے مطابق جس حسن وخوبی سے پیش کیا گیا ہے وہ گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے برابر ہے۔ اِن ڈراموں سے بچوں کو نہ صرف اَسلاف کے کردار کا صحیح علم ہو سکتا ہے بلکہ مذہبی پہلو کو نمایاں کرنے کی جو کامیاب کوشش کی گئی ہے، اس سے چھوٹے بچوں کو مذہب پر مائل کرنے اور مذہب کی اچھی باتوں پر عمل کرنے کی ترغیب بھی ہوتی ہے

گل خنداں ۔ یہ آصف جہاں بیگم کی تصنیف ہے، جو اُن کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، اُردو زبان میں اخبار اودھ پنچ میں ۱۸۷۷ء سے مزاحیہ نگاری کا آغاز ہوا۔ منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ اس کے بانی تھے، اس کے بعد گزشتہ دس پندرہ سال سے اس میں بڑی ترقی ہوئی ہے، جو مغربی ادب کا اثر ہے۔ صنف قوی کے کئی اصحاب مزاحیہ مضمون اور افسانے لکھا کرتے ہیں، جنس نازک میں ایک آدھ خاتون ہی نے اِس میدان میں قدم رکھا ہے، مسز حجاب امتیاز علی کے افسانے "تحفے" مزاحیہ نگاری کی پہلی کتاب ہے۔

گلِ خنداں دوسری تصنیف ہے جو مزاحیہ نگاری پر مشتمل ہے، اس کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی حسب ذیل رائے ملاحظہ ہو۔

"ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضمون لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ صنف نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہے، بلکہ یوں کہو کہ صنف نازک بننے سے قبل ہی بعض لڑکیوں نے ہمارے مال پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے...... ہم مزاح کے معنی کسی ہنسی کی بات پر ہنسنا لیتے ہیں، مگر یہاں ہر فقرہ پر چٹکیاں لی گئیں ہیں۔ اور مزا یہ کہ ہر چٹکی پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے"۔

اس صراحت سے واضح ہو سکتا ہے کہ گل خنداں کس پایہ اور کس مرتبہ کی تصنیف ہے۔ معلوم ہوتا ہے آصف جہاں بیگم فطری طور پر مزاحیہ نگاری کرتی ہیں ان کے مضامین کی شوخی، شگفتگی، بے ساختگی خاص طور پر قابل داد ہے۔ آصف جہاں بیگم کے متعلق ایک یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان کو ادبی میدان میں آکر ہنوز کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ اگر کہنہ مشق ہوتیں تو نہ معلوم کیا گل کھلاتیں۔

جدید ادب نسواں میں جن خواتین کے نام خصوصیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں اِن میں سے بعض یہ ہیں۔

بادشاہ بیگم، انیسہ بیگم، معتصمہ بیگم، انور جہاں بیگم قریشی، آصف جہاں بیگم صدیقی بلگرامی، رابعہ بیگم (عثمانیہ) رضیہ بیگم (عثمانیہ) محمدی بیگم بی اے (عثمانیہ) افسرالنساء بیگم بی اے (عثمانیہ) ممتاز جہاں بیگم صوفی، تصدق فاطمہ، سعیدہ بیگم ضمیرالدین، سیدہ احمدالنساء بیگم، ثریا جبیں بی اے (عثمانیہ) وغیرہ۔

ان خواتین کے افسانے اور کہانیاں تاریخی تنقیدی اور ادبی مقالے، مزاحیہ، اصلاحی اور معاشرتی مضامین سفرنامے وغیرہ اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان سے کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ اور سب کے سب "ہمارے جدید ادب نسواں" کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافے تصور کئے جا سکتے ہیں۔

سطور بالا میں مختصر طور پر ہم نے جدید ادب نسواں کی صراحت کر دی ہے، اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ جس طرح جنس قوی اقتضائے زمانہ کے تحت جدید ادب تیار کرنے میں مصروف ہے، جنس نازک بھی اس کوشش میں ان سے پیچھے نہیں ہے۔ اور ان کے کارنامے ایک تابناک مستقبل کا پتہ دے رہے ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی

آنسو

حمید کو رضیہ سے بے حد محبت تھی۔ وہ رضیہ کو صرف چاہتا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ مگر لطف کی بات یہ تھی کہ اس راز سے سوائے میرے اور رضیہ کے کوئی اور واقف نہ تھا۔ حمید اکثر یہ گنگنایا کرتا ہے

نغمۂ عشق نہیں دہر میں گانے کے لئے یہ فسانہ نہیں دنیا کو سنانے کے لئے
نہ جلانے کے لئے ہے نہ بجھانے کے لئے عشق کی آگ ہے سینے میں دبانے کے لئے

حمید کو مجھ سے بہت خلوص تھا۔ گو ابتداء سے مجھے شکایت رہی ہے کہ کوئی صحیح قسم کا دوست مجھے اب تک نہیں مل سکا لیکن حمید میں مجھے ایسے انسان کی جھلک نظر آتی تھی جو میرے تخیل میں برسوں سے پرورش پا رہا تھا۔ اس میں محبت، ایثار، خلوص اور سچائی سب موجود تھی اور شاید وہ سب کچھ تھا جسے میں چاہتا تھا۔ حمید کو اور لوگ جو بھی سمجھیں مگر میرے لئے وہ ایک "دوست" تھا۔ وہ میرا سب کچھ تھا۔

حمید کوئی پانچ سال میرے ساتھ کالج میں رہا اور اس اثنا میں مجھے بھی اس سے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ اس نے اپنے دل کی بات مجھ سے تک چھپا رکھی۔ یوں اس کا کوئی کام یا کوئی بات ایسی نہ تھی جو میری رائے یا علم کے بغیر ہو سکے مگر اس کا ایک راز جو اس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا میرے علم میں اب تک نہ آیا تھا۔ ایک روز کی بات ہے کہ حمید میرے گھر آیا اور آتے ہی خواہش کی کہ اس کے ساتھ عثمان ساگر چلوں۔ میری طبیعت کچھ تفریح کی طرف مائل نہ تھی مگر حمید کے اصرار پر مجھے جانا پڑا۔ جس وقت ہم عثمان ساگر کے چمن میں پہنچے نو سات بج چکے تھے۔ ہم دونوں چمن میں گھوم گھام کر اس کے مغربی گوشے کی طرف چلے۔ یہاں ایک پارسی خاندان ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک نازنین کسی مرد کے ساتھ جو غالباً اس کا شوہر تھا، بیٹھی ہوئی تھی۔ دو خوبصورت بچے وہیں قریب کھیل رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہم وہاں سے پلٹ گئے اور اس طرف چلے جہاں جھولے وغیرہ پڑے تھے۔ یہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ چاند درختوں کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ پتوں میں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور اسی سمے میں اداس طبیعت بھی شگفتہ ہو رہی تھی۔ میں نے کہا "چلو حمید آج جھولا ہی سہی۔ دیکھیں کون سب سے بڑی پینگیں لیتا ہے۔" مگر اس کی طبیعت اس طرف مائل نہ تھی۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا "نہیں طبیعت نہیں چاہتی"۔ میں نے حمید کے چہرے کی طرف دیکھا مگر روشنی اتنی نہ تھی کہ چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا پتہ لگا سکتا۔ پھر بھی جس طرز سے اس نے گفتگو کی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ میں اس کے حال پر غور کرنے لگا۔ ہم جب سے مکان سے چلے تھے اس میں بہت سے تغیر نمایاں ہو رہے تھے۔ کبھی وہ مذاق کی کوئی بات کہہ جاتا اور کبھی کسی سوچ میں پڑ جاتا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ کبھی کبھی سوچ میں پڑ جانا تو حمید کی عادت ہی ہے۔ مگر پھر شبہ ہونے لگا کہ وہ کسی قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے اندرونی جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرح اپنا جی بہلانے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ حمید کی ایسی بات کونسی ہو سکتی ہے جو مجھ سے چھپائی جائے۔ اگر کچھ ایسی بات ہوتی تو وہ خود مجھ سے کہہ دیتا۔ اس خیال سے میں نے سکوت اختیار کر لیا اور اپنے دل کو یوں بہلا لیا کہ کبھی کبھی حمید گم ہو جایا کرتا ہے۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد ہم پھر اسی جگہ آئے جہاں وہ پارسی جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس جگہ کوئی نہ تھا۔ حمید نے کہا چلو یہیں ریت پر بیٹھ جائیں۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا "ہاں ہاں کیوں! وہ بھی تو یہیں بیٹھی ہوئی تھیں"۔ مگر حمید نے

اس کا لطف نہ اٹھایا۔ اس وقت میں حمید کا چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتا تھا کیونکہ چاند ہمارے اوپر تھا اور حمید نے جس وقت میرے جواب میں میری طرف خاموشی سے دیکھا اس پر کافی روشنی پڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ حمید کسی ذہنی تکلیف میں مبتلا ہے۔ مجھے اب یقین ہوگیا کہ کوئی خاص بات ہے جسے وہ چھپانا چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے خاموشی ہی بھلی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دونوں ساکت تھے۔ ہمارے ساتھ تالاب کا پانی بھی ساکت تھا۔ اور ہمارے سروں پر ساکت چاند بھی شاید حیرت سے ہم دو دیوانوں کو گھور رہا تھا۔ میں نے سہگل کی ایک چیز شروع کی گردھیمے سُروں میں:۔

"نہ کوئی پریم کا روگ لگائے ......"

کچھ وقت کا سہانا پن اور کچھ سہگل کی طرز۔ اس وقت گانا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ میں اپنے گانے میں محو تھا کہ حمید میرے زانو پر سر رکھ کر زمین پر لیٹ گیا اور شاید چاند کو گھورنے لگا۔ فضا کچھ ایسی تھی کہ میں اپنی پوری محویت کے ساتھ گانے میں مصروف تھا لیکن ایک بات ایسی ہوئی کہ مجھے یکایک رک جانا پڑا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ حمید کے سر کے نیچے دے رکھا تھا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ پر گرم پانی کی بوندیں گر رہی ہیں۔ میں گاتے گاتے یکایک رک گیا۔ حمید یہ شعر پڑھ رہا تھا:۔

زاری نالم دکس نیست کہ گوید حالم
پیش آں ماہ کہ از دوری او می نالم

میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے گھبراہٹ میں پکارا "حمید" اس سے اب نہ رہا گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں ادھر پریشان کہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھتا ہوں تو اور رونے لگتا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں نے بڑی پریشانی سے گزاری۔ جب وہ خوب رو چکا تو کہنے لگا "بھیا! اب سمجھو کہ میں مرچکا" یہ کہہ کر اس نے مجھے بولنے کا موقع دیا۔

آخر کہو تو سہی بات کیا ہے۔ تم تو اپنی کوئی بات مجھ سے چھپاتے نہ تھے۔ ایسی کیا بات ہے کہ تم ہلکان ہو رہے ہو اور مجھے کان وکان خبر نہیں"!

"تم سے چھپانا ہی کیا ہے۔ تم ہی تو میرے ایک دوست ہو۔ مگر خیال تھا کہ تم سے کیا کہوں میری قسمت کی بات ہے"

"تم دیوانے ہوگئے ہو۔ کہو بھی کیا بات ہے؟"

"بھیا! بات یہ ہے کہ..... تم جانتے ہو اس کو ......"

حمید نے کچھ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کہنا شروع کیا۔ میں نے جواب دیا "ہاں ہاں! بتاؤ!"

اس نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہارا ایک دور کا رشتہ دار احمد۔ کوئی چار سال ہوئے کہ تم نے اس سے ملایا تھا"

"ہاں اور وہ اس کی بہن رضیہ جو تمہاری پرستیدہ ہے ....."

حمید نے بات کاٹ کر کہا "یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ مگر مجھے کہنا یہ ہے کہ میری قسمت نے پلٹا کھایا ہے۔ رضیہ کی نسبت ایک خوش بخت سے ہوگئی ہے اور رضیہ کے والدین نے تمام کاروائی راز میں کرڈالی ہے۔ دو روز ہوئے کہ مجھے اس کی خبر ہوئی۔ میں اپنے والد سے تو کہہ نہیں سکتا تھا والدہ سے بڑی منت سماجت کی کہ میری مدد کریں مگر وہ کہنے لگیں "بیٹا! تمہاری نسبت تو تمہاری چچازاد بہن سے قرار پائی ہے۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اور ویسے بھی وہ لوگ ہم سے زیادہ مال دار ہیں۔ ان کے اونچے اونچے خیالات ہیں۔ وہ بہت فیشن ایبل ہیں۔ اپنی بیٹی ہم کو کیوں دینے لگے"! جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا "نا ماں! میں تو جاکر کچھ نہ کہوں گی۔ مجھے منہ کی کھانی پڑے گی اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ عمر بھر میں نے کسی کے سامنے نیچا نہیں دیکھا......"

" وہ کیا کیا کہہ گئیں نہیں معلوم۔ مگر میری تمام کوششیں بے کار ہوئیں رضیہ کے والد نے بات پکی کر لی اور اب کوئی کسر باقی نہیں ۔
"اس کی مجھے تو کان وکان بھی خبر نہ ہوئی"
میں نے جواب دیا" بڑے تعجب کی بات ہے ۔ یہ قصہ تو خود مجھے نہیں معلوم ۔ خیر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ۔ میں جا کر کوشش کرتا ہوں ۔ تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا"
" نہیں نہیں اب تم جا کر کیا کروگے ۔ وہاں تو شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور ہاں شادی کے بعد ہی دولہا دولہن تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجے جارہے ہیں "
" یہ بھی خوب ۔ یہ سب کچھ طے ہو گیا اور ہمیں خبر نہ ہوئی "

میں نے جاکر رضیہ کی ماں سے گفتگو کی ۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی ۔ انھوں نے کہا بیٹا ! بات پکی ہوگئی ہے اس کو اب کیسے توڑا جا سکتا ہے ۔ احمد بھی بالکل خاموش تھا ۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا ۔ معلوم نہیں وہ بھی اس معاملے میں مجبور تھا یا میری تجویز سے اس کو اتفاق نہ تھا ۔ چار و ناچار ہمت کر کے رضیہ کے باپ سے ملا ۔ بڈھے میاں نے تو خوب صلواتیں سنانی شروع کیں ۔ انھوں نے کہا " تم لونڈوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے ۔ شادی بیاہ کے معاملات میں بچوں کی مرضی پر کام چلتا ہے ؟ ہم جو مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں ۔ یہی گن سن کر تو میں نے بات پکی کر لی ہے ۔ اس چھوکرے سے کہہ دو کہ منہ دھو رکھے ...."
ممکن ہے میں یہ پوچھ بیٹھتا کہ آخر اس چھوکرے میں آپ کو کیا خرابی نظر آئی ۔ لیکن ان کی بزرگی کا پاس تھا ۔ وہ بڑبڑا رہے تھے کہ میں اٹھ کر چلا آیا ۔ حمید سے سارا حال بیان کیا وہ آزردہ تھا ۔ کہنے لگا " تم نے غلطی کی جو بات گنوائی ۔ یہ تو میں پہلے سے سمجھا ہوا تھا ۔ بات قسمت کی ہے بھیا ! اس میں کسی کا گلہ کیا ۔ اچھا تم نے رضیہ کو دیکھا ...."
" ہاں دیکھا تو مگر مل نہ سکا ۔ ویسے وہ مغموم تو معلوم ہوتی تھی مگر مگر اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملا "
حمید نے یہ شعر پڑھ دیا :۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

رضیہ کی شادی ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے ۔ اور نئے جوڑے کو انگلستان بھجوانے کی تیاریاں بھی شروع ہوگئیں ۔ مگر اب حمید مطمئن معلوم ہوتا تھا ۔ اس نے مجھ سے کہا " اب مجھے پریشانی کی کوئی بات نہیں ۔ بڑی فکر مجھے رضیہ کی تھی کہ اگر وہ بھی میری طرح بے قرار ہے تو اسے اس شادی سے تکلیف ہوگی ۔ اب قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش ہے ۔ یہی میرے لئے بڑی چیز ہے ، وہ خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں ۔ مگر میری دعا یہی رہے گی کہ وہ ہمیشہ خوش رہے ۔ اسے میں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا "
میں نے یہ سنا تو بڑا تعجب ہوا کہ یہ عجیب و غریب آدمی ہے ۔ میں غیر ارادی طور پر اس سے لپٹ گیا ۔ معلوم نہیں کیوں اس کے بعد سے میرے دل میں حمید کی عزت دو بالا ہوگئی ۔ پہلے میرا خیال تھا کہ حمید مجبور ہے اور مجبوری ہی کو صبر کا دوسرا نام سمجھتا ہے ۔ مگر حمید کے خیالات جب مجھے معلوم ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس میں کامل انسان کی کچھ جھلک ہے ۔ وہ ایک تخیلی زندگی گزارنے لگا ۔

کوئی دو سال گزر گئے ۔ اس اثنا میں حمید کا کام صرف اتنا تھا کہ یا تو مجھ سے ملا کرے یا مکان جا کر کمرے میں بیٹھ رہے ۔ اس کو اب دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی ۔ اس کے

والدین نے کتنا مجبور کیا کہ وہ اپنی چچا زاد بہن سے شادی کرے یہاں تک کہ حمید کے والد نے شادی کی تیاریاں بھی شروع کردیں۔ مگر حمید نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شادی نہیں کرے گا اور اگر اتنا مجبور کیا جائے تو شادی کے روز خودکشی کرلے گا۔

میں اس راز اور حمید کی طبیعت سے خوب واقف تھا۔ جاکر حمید کے والد کو سمجھایا۔ وہ خودکشی کی دھمکی سے ڈرے ہوئے بھی تھے۔ حمید اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کی زندگی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دن پورے کر رہا ہے۔ اسے میں سینما لے جاتا۔ کبھی باغ عام چلا جاتا۔ اسے لے کر کبھی تالاب کے کٹے پر ٹہلتا اور کبھی ریڈیو کے سامنے بٹھا دیتا۔ مگر اسے کسی چیز سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مجھ سے ملتا تو خاموش رہتا اور اپنے کمرے میں تو کسی سے بھی بات نہیں کرتا۔ اس کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ ایک دن حمید کے والد خود میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ حمید کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ اسے کہیں باہر تفریح کے لئے لے جائیں تو اچھا ہے۔ میں نے حمید سے کہا بھی کہ کہیں چلے چلیں۔ مگر وہ اس کے لئے تیار نہ تھا۔ ایک روز کی بات ہے کہ حمید مجھ سے کہنے لگا۔

"بھیا! رضیہ اور اس کے شوہر انگلستان سے واپس آرہے ہیں۔ تم کہتے تھے کہ کہیں باہر چلیں۔ چلو ہم بمبئی ہو آئیں"

میں فوراً تیار ہوگیا اور ہم لوگ بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں وہ بظاہر خوش معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ بمبئی کی دلچسپیوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ روزانہ شام کو اپالو بندر جاتا اور گھنٹوں سمندر کا لطف اٹھاتا۔ معلوم نہیں وہ پانی کو دیکھتا تھا یا کسی جہاز کے آنے کی توقع رکھتا تھا۔

اس طرح کوئی ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز حمید بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا "کل وائسرائے آف انڈیا" آرہا ہے میری رضیہ بھی اسی سے آئے گی"۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کو میری رضیہ کہتے سنا۔ بہرحال مجھے بھی خوشی ہوئی کہ اب حمید مغموم نہ رہے گا۔

دوسرے روز وہ بہت بے چین تھا۔ ہم لوگ وقت مقررہ پر رضیہ کے استقبال کے لئے جہاز پر گئے۔ رضیہ اور اس کا شوہر جہاز سے اتر رہے تھے۔ ہم لوگوں نے ان دونوں کو دیکھا۔ رضیہ کی گود میں ایک بچی بھی تھی۔ حمید نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی مجھے پھولوں کے ہار دے دئیے جو اس نے خرید رکھے تھے۔ اس نے کہا کہ میں وہ ہار ان دونوں کو پہنا دوں۔ اس نے مجھ سے منت کی کہ اس کی آمد کی اطلاع رضیہ کو نہ دوں۔ میں یک دم ششدر ہوگیا۔ میں پوچھ ہی رہا تھا کہ کیوں تم کیوں نہیں چلتے مگر اس نے مجھے ڈھکیلتے ہوئے کہا "یہ تم کو بعد میں معلوم ہوگا۔ دیکھو وہ آرہے ہیں۔ تم جلدی آگے بڑھو"۔ میری سمجھ اس وقت بے کار ہوگئی تھی۔ میں ہار لے کر آگے بڑھا اور دونوں کو پہنا دیا۔ رضیہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اپنے تمام لوگوں کی خیریت پوچھنے لگی۔ میں ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ باہر موٹر کے پاس آئے تو مجھے حمید کا خیال آیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ میں پریشان ہوگیا۔ رضیہ کے شوہر سے میں نے کہا "میں ریلوے ہوٹل چارنی روڈ میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ آپ کے لئے بھی وہیں انتظام کیا ہے۔ آپ اسی ہوٹل کو چلے جائیے۔ میں ابھی آتا ہوں"

رضیہ وغیرہ تو چلے گئے اور میں حمید کو ڈھونڈتا رہا۔ بندر پر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دو تین گھنٹے میں نے تلاش کی مگر اس کا پتہ نہ تھا۔ مجھے میری بے وقوفی پر غصہ آرہا تھا کہ حمید کو تنہا کیوں جانے دیا۔ مجبوراً ہوٹل واپس آیا۔ رضیہ پوچھنے لگی "اتنی دیر کہاں رہے؟" میری زبان سے یہ جواب نکل گیا کہ "حمید بھی میرے ساتھ تم لوگوں کے استقبال کے لئے آیا تھا۔ وہ معلوم نہیں

کدھر غائب ہوگیا۔ رضیہ کے شوہر بھی سامنے تھے۔ وہ تعجب کرنے لگے۔ رضیہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو پہلے تو وہ بے ساختہ چلّا اٹھی "ہائیں"۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کو سنبھالا۔ پھر اس نے مسکرا کر کہا "وہ بچے تو ہیں نہیں کہ کوئی اٹھالے جائے۔ شام تک آہی جائیں گے"۔ شام ہوگئی رات کے آٹھ بج گئے مگر وہ نہ آیا میں بہت پریشان تھا۔ میرا دماغ اس وقت کچھ کام نہ کرسکا۔ میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ رضیہ آئی اور پوچھنے لگی۔

"بھیا! حمید صاحب نے جہاز پر آپ سے کیا کہا تھا؟"

"پھول کے ہار انھوں نے ہی خریدے تھے۔ مجھے ہار دے کر انھوں نے کہا کہ تم دونوں کو پہنادو۔ میں نے جب پوچھا کہ کیوں تم کیوں نہیں آتے۔ وہ کہنے لگا نہیں یہ بعد کو بتاؤں گا تم جلدی جاؤ۔ وہ لوگ آرہے ہیں"۔

رضیہ خاموش کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا "اور بھی کچھ کہا؟"

"ہاں یہ بھی کہا کہ میرے آنے کی اطلاع رضیہ کو نہ دینا"

رضیہ اب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اس نے کہا "بھیا آپ نے غلطی کی جو اُن کو تنہا چھوڑ دیا۔ آپ اُن کے دوست ہو کر بھی ان کو نہ سمجھ سکے..." رضیہ نے اِن الفاظ کو کچھ اِس طرز میں ادا کیا کہ مجھ پر رقت سی طاری ہوگئی۔ وہ میرے لئے تازیانے تھے۔ غیر ارادی طور پر میری آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔ تھوڑی دیر رضیہ خاموش رہی۔ پھر اس نے زبان کھولی۔ "بھیا! اب کسی طرح حمید کو ڈھونڈھ نکالنا چاہیے!!"

میں نے رات میں چوپاٹی، اپالو، ملابار ہل غرض ہر جگہ اس کو ڈھونڈ ڈالا۔ حمید کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دوسرے روز اخبار میں انعامی اشتہار بھی دیے۔ تین دن گزر گئے مگر اس کی خبر نہ ملنی تھی نہ ملی۔ رضیہ کے شوہر حیدر آباد چلنے بے تاب تھے مگر رضیہ نے انہیں روک رکھا۔ اس نے اپنی طرف سے پانچ ہزار روپے کا اعلان کیا کہ کوئی حمید کا پتہ لادے۔ لیکن حمید کا کہیں پتہ نہ تھا۔

میرے لئے رضیہ کا طرز عمل بھی بہت حیرت انگیز تھا۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے تو خوش رہتی لیکن تنہائی میں میں نے اسے روتے دیکھا ہے کوئی پندرہ روز کی ناکام تلاش کے بعد ہم لوگ حیدر آباد آئے۔ اب رضیہ کی فطرت کا مطالعہ میرے لئے دلچسپ تھا۔ اس کے شوہر کا خیال تھا کہ رضیہ میں پہلی سی خوش مزاجی اور خوش طبعی نہیں رہی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا زخم ہماری محدود نظر سے دور ہے۔ اس کے تبسم میں درد ہے۔ مسکراہٹ میں کرب ہے جس نے اس کی زندگی کی ساری عمارت کو ہلا دیا ہے۔

ایک شام کو رضیہ کے شوہر میرے پاس آکر کہنے لگے "مجھے آج ایک ضروری کام پر جانا ہے۔ رضیہ سے عثمان ساگر چلنے کا وعدہ تھا۔ میں نہیں آسکوں گا۔ تم رضیہ کو لے جاؤ اس کی طبیعت بہل جائے گی"۔

ہم لوگ عثمان ساگر پہنچے۔ ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے کہ چاند نکل آیا۔ ہم لوگ اسی مقام پر جاکر بیٹھ گئے جہاں حمید نے اپنے انمول آنسو میرے دامن پر گرائے تھے............ مجھے وہ بے ساختہ یاد آگیا .... رضیہ کی بچی کھیل رہی تھی............ رضیہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

"بھیا! میری بچی کو دیکھو" تھوڑی دیر وہ خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی "میں نے اس کا نام حمیدہ رکھا ہے بھیا!!" اس نے یہ کہا اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر میری طرف جُھکی اور میری گود میں گر پڑی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رضیہ پر رقت طاری ہے۔ چند گرم گرم آنسو میری گود میں گرے......

شاید حمید اور رضیہ کا ملاپ انہی آنسوؤں سے ہوا۔

حفیظ صدیقی

صحتِ عامّہ اور پبلک کے فرائض

"روک تھام علاج سے بہتر ہے۔ خدا پرستی کے بعد پاکی اور صفائی کا درجہ ہے"، یہ اور اس قسم کی کہاوتیں دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہیں لیکن آج ایک جاپان کو چھوڑ کر تمام ایشیا، قابلِ انسداد بیماریوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ ہندستان جو اکثر معاملات میں دوسروں سے پیچھے ہے، اس سے یہ توقع کب کی جاسکتی ہے کہ بیماریوں کی روک تھام کے معاملے میں اوروں سے آگے رہے گا۔ ان حالات میں ریاست حیدرآباد جہاں چھوٹے پیمانے پر ہندستان ہی کا نقشہ نظر آتا ہے بیماریوں کی زد سے نہ تو بچ سکتی ہے اور نہ ان کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوسکتی ہے۔ میرے نزدیک اس صورتِ حال کے دو اہم اسباب ہیں ایک تو یہاں کے باشندوں کا اعتقاد کہ بیماری مِن جانبِ اللہ ہوتی ہے، اس لئے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں میں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت ایک سرے سے گم ہے۔ اس لئے انھیں سمجھانے کی ضرورت ہے کہ عام طور پر بیماریاں کس طرح پھیلتی اور گھر کرلیتی ہیں۔ مثلاً زید بیماری اور موت کے خطرے سے بچ نہیں سکتا جب تک کہ اس کے پڑوسی بیمار بکر کی دیکھ بھال نہ ہو۔ اور اس کے مرض کا ازالہ نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور اس کی وسعت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوگا جب کہ ہم یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کرلیں کہ پڑوس کے جدید تصور میں محض وہ شخص ہی نہیں آتا جس کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا ہو بلکہ اس ہمسائگی یا پڑوس کی تعریف میں ایسے تمام لوگ آجاتے ہیں جو ہم سے ہزاروں میل دور ہیں۔ آمد و رفت اور دیگر وسائل کی بڑھتی ہوئی ترقی اور تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ نہ صرف بیماریوں کی خبریں بلکہ خود بیماریاں بھی آن کی آن میں دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیر کے قائل اور "بڑی بوڑھیوں" کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ ان کے زمانے میں بیماریاں اس قدر عام نہیں تھیں۔

اس تمہید کے بعد میں ان بیماریوں کی کچھ حقیقت بیان کروں گا۔ جن میں ہم اکثر مبتلا ہوا کرتے ہیں۔ بیماریوں کے تین بڑے اور بنیادی سبب ہیں۔ ہمارے آبا، خود ہم۔ اور ہمارا پڑوس۔ آبائی بیماریوں کا ازالہ بن بیخ ہوسکتا ہے اور یہ ہمارے بس کی بات ہے بشرطیکہ شادی بیاہ کے معاملے میں ہم سوچ سمجھ کر اپنی مرضی سے کام لیں۔ یا ایک صورت اور بھی ہوسکتی ہے کہ شادی بیاہ کرنے والوں کو ازروئے قانون مجبور کیا جائے کہ فریقین بیاہ سے پہلے طبی معائنہ اور اپنی ازدواجی اہلیت اور موزونیت کی تصدیق کرالیں۔

دوسری بیماریاں وہ ہیں جو خطاکار فریقین کی ذات سے وابستہ اور مخصوص ہوتی ہیں۔ یہ تمام روگ گندگی یا کھانے پینے اور جنسی بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ بیماریاں میری اس نشری تقریر کے موضوع سے خارج ہوں گی۔ اس لئے کہ ان کی روک تھام ان لوگوں کے اپنے بس کی بات ہے جو اپنی زندگی میں صفائی، سرگرمی اور اعتدال کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

اب میں ان بیماریوں کا ذکر کروں گا جو میری اس تقریر کے موضوع کے اندر آتی ہیں یہ وہ بیماریاں ہیں جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوسکتی ہیں۔ اور ہوتی بھی ہیں۔ اور صحت عامّہ کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ انسانی جسم کے مختلف حصوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ اور مختلف طریقوں پر مختلف وسیلوں سے پھیلتی ہیں۔ ان میں ایک تو وہ بیماریاں ہیں جو نظامِ تنفس (یعنی ہوا کی نالیوں اور پھیپھڑوں) سے متعلق ہیں۔ ان میں سب سے عام انفلوئنزا یا معمولی زکام ہے۔ دیکھنے کو یہ ایک ادنیٰ سی شکایت ہے لیکن اس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو بڑھ کر نہ صرف ایک خاندان بلکہ تمام محلے اور بعض اوقات دنیا کے ایک بڑے حصے کو مصیبت میں ڈال سکتی ہیں۔ جیسا کہ ۱۹۱۸ء کی وبا کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے۔ ان پیچیدگیوں سے بعض اوقات نہایت قبیح اور مہلک روگ بھی لگ سکتا ہے۔ مثلاً نمونیا۔ اور دل کے امراض جن کے عام طور پر بوڑھے اور ادھیڑ لوگ شکار

ہوتے ہیں۔ پھیپھڑے کی بیماریوں میں سب سے زیادہ موذی دق کی بیماری ہے۔
حیدرآباد اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اس مرض کی اشاعت
کے خطرناک امکانات نظر آرہے ہیں۔ اس بیماری کے پیدا ہونے اور پھیلنے
کے بہتیرے عوامل ہیں جس میں خاص کر گرد و غبار، جہالت اور ناداری
قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو کافی اور اچھی غذا نہیں ملتی۔ ان کے
جسم کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی سکت
باقی نہیں رہتی۔ انگلستان میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء کے درمیانی سالوں میں
مختلف اسباب سے مرنے والوں کا فی صد نکالا گیا، تو اس کی رو سے
۵۲ دِق میں مبتلا پائے گئے۔ لیکن رہنے بسنے کے طریقوں، پاس پڑوس
اور معیارِ زندگی کی سدھار کے بعد سنہ ۳۶ و ۳۷ عیسوی کے اعداد
شمار میں دق سے مرنے والوں کا فی صد گھٹ کر اٹھارہ ہو گیا۔

دوسری قسم میں وہ بیماریاں ہیں جن سے آنتیں متاثر ہوتی
ہیں مثلاً محض ہیین قسم کے کیڑوں کی پرورش جنھیں عام طور پر کیچوے
کدو دانے اور کرم کہتے ہیں یا ہیضہ، پیچش، میعادی بخار وغیرہ۔ شکر کا
مقام ہے کہ حیدرآباد میں صاف پانی کے عام انتظام کی بدولت پورا
شہر کرمی امراض اور کالرا سے بڑی حد تک محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن پیچش
اور معیادی بخار سے ابھی پیچھا نہیں چھوٹا۔ اس لئے کہ بول و براز کو
حفظانی اصول پر ٹھکانے لگانے، مکھیوں کو ہلاک کرنے، پاس پڑوس
کو صاف رکھنے اور افراد خاندان میں ان مہلک امراض سے بچنے
کا کافی احساس ہم میں پیدا نہیں ہوا۔ اب بھی ہمارے ہاں دوکانوں
اور بازاروں میں کھانے پینے کی چیزیں جس طرح عام طور پر بکا کرتی
ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ یہ موذی بیماریاں زیادہ شدت کے ساتھ عام
کیوں نہیں ہوتیں۔

تیسری قسم میں وہ بیماریاں ہیں جن کا دورانِ خون سے
تعلق ہے مثلاً چیچک، خسرہ، کنکر پتھر، ملیریا اور پلیگ، جذام کا
مرض بھی اسی ذیل میں آتا ہے ٹیکے کے عام رواج کی وجہ چیچک میں
بڑی حد تک گھٹاؤ پیدا ہو گیا ہے لیکن خسرے اور کنکر پتھر میں (گویہ اتنی
موذی بیماریاں نہیں ہیں) کوئی قابلِ لحاظ کمی ابھی تک نہیں ہوئی۔ جذام
کی طرف بھی خاص طریقوں سے اور مختلف تنظیموں کے ذریعے توجہ جاری ہے۔
لیکن کچھ تو اس مرض کی عام صورتِ حال اور ابتدائی مراحل میں
بروقت تشخیص کی مشکلات اور پھر اس مرض کے لاعلاج ہونے کے بارے
میں ایک عام مگر غلط اعتقاد کی وجہ سے اس مرض کے استیصال میں ابھی
دشواریاں لاحق ہیں۔ موش کشی کی مہم میں عوام کے تعاون اور مشتبہ اور
متاثرہ مکانوں کی صفائی اور "ڈس انفکشن" کی وجہ سے پلیگ کا خطرہ
آہستہ آہستہ دور ہوتا جارہا ہے۔ البتہ اس ذیل کی بیماریوں میں صرف
ملیریا ہی ایسا مرض ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کا دوامی ٹھیکہ لے
لیا ہے۔ ہر سال ہندوستان میں کوئی دس لاکھ آدمی اس کا شکار
ہوتے ہیں۔ اور کوئی بیس لاکھ سدا روگی رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ
اتنی ہی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کی پیشہ ورانہ کارکردگی متاثر
ہوتی ہے۔ طاعون کے سلسلے میں چوہے اور اس کے پسوؤں کو اور ملیریا
کی حد تک اس کے مچھر اور متاثر مریض کی جانب بھی پوری توجہ کام میں
لانے اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

ان عام بظاہر معمولی امراض کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے کے
بعد میں اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح اس ریاست کے باشندوں
کا ایک جائز حق یہ ہے کہ وہ حکومت سے ہر چیز کا مطالبہ کریں جو بیماری سے
بچنے اور صحت کو قائم رکھنے میں ان کی معاون ہو، اسی طرح حکومت کو
بھی بجا طور پر حق حاصل ہوگا کہ عوام سے صحت عامہ کی پالیسی کی تفصیلات
کو بروئے کار لانے میں ضروری تعاون اور اشتراکِ عمل کی توقع رکھے اس لئے
کہ اس قسم کے تعاون اور باہمی مدد کے بغیر صحت عامہ سے متعلق کوئی
تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ عوام اس قسم کی مدد اس وقت تک مفید اور دانشمندانہ
طریقے پر نہیں دے سکتے جب تک وہ اس امر کا کوئی احساس نہ کریں
کہ ایک شخص کی خرابی صحت کئی ایک افراد کی خرابی صحت کا

باعث بن سکتی ہے۔ اور یہ کہ جب تک ایک بیماری کو شروع ہی میں بڑھنے سے روکا نہ جائے تو ہزاروں انسان مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہوں گے لہٰذا ہمیں صرف اپنی ذات یا اپنے گھر کی صحت اور سلامتی پر نظر نہ رکھنی چاہئے بلکہ اس محلہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے جہاں ہم رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ معمولی سمجھ کے انسان کے لئے بھی یہ تصور کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اس قسم کا احساس بنیاد ہے "ریاستی صحت عامہ" کی اس استدلال کے بموجب دوسرا امر قومی صحت کا ہوگا جو بہ آسانی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ حاصل ہوگیا تو پھر مانع امراض طب یا انسدادی تدابیر اور پھر قومی صحت یا حفظان صحت کا تصور ایک آسان مسئلہ بن جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایک کم سواد اور تنگ نظر شخص ہی طب اور خصوصاً انسدادی طب کو قومیت سے غلط طور پر خلط ملط کرے گا۔ مہذب ممالک میں حکومت اور عوام انسدادی طب کو پروان چڑھانے اور دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ تعاون کر کے بیماریوں کا سدباب کرنے میں کوشاں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوالے اور خصوصاً اس ریاست کے باشندے صحت عامہ کے اس ہمہ گیر تصور سے کوسوں دور ہیں۔ یہ صورت حال اس لئے ہے کہ انسدادی طب اور مانع امراض تدابیر سے یہاں کی آبادی کی بہت کی بڑی تعداد ان پڑھ اور جاہل ہے آشنا کرانے کے ذرائع ہمارے پاس مفقود ہیں۔

اب آخر میں ان امور کا ذکر کرتا ہوں جن کا بجا طور پر حکومت سے مطالبہ کرنے کا پبلک کو حق حاصل ہے۔

۱ - دواؤں، ٹیکوں، ڈس انفکشن کے سامان اور قرنطینوں کے ذریعے بعض امراض کے پھوٹ پڑنے اور پھیلنے کا مناسب انسداد۔

۲ - ایسے ذرائع اور وسائل کا اختیار کرنا جن سے حادثات اور بیماریوں کے امکانات بہت کم ہو جائیں اور بصورت علالت تکالیف اور (تا بہ امکان) اموات کا سدباب ہو جائے۔

۳ - کافی مقدار میں صاف پانی پینے اور برتنے کے لئے مہیا کرنا۔

۴ - مخصوص اداروں اور محکمہ جات کے ذریعہ کھانے پینے کے تمام اشیاء اور خصوصاً دودھ، ترکاریوں اور میوؤں پر پوری پوری نگرانی۔

۵ - جدید طریقوں پر بول و براز کے فوری اور مناسب طور پر ٹھکانے لگانے کے سامان مہیا کئے جائیں۔

۶ - غیر حفظانی حالات کے دفعیئے کے لئے جدید اصولوں پر تعمیر امکنہ اور بدررو کے انتظامات۔

۷ - طلبہ کے لئے ذاتی اور عمومی حفظ صحت کے اصول کی تعلیم و تربیت۔

۸ - خرابی صحت اور اموات کے باقاعدہ رجسٹر اور اعداد شمار کی ترتیب اور پبلک کے استفادہ کی غرض سے ان کے تجزیہ کی وقتاً فوقتاً اشاعت

معمولی سی معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ متذکرہ بالا امور کی ترتیب اور فراہمی میں کسی حکومت کو عوام کے تعاون کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان امور کا بھی ذکر ضروری ہے جن کی حکومت کو آپ سے توقع رکھنی چاہئے۔ اور جن پر آپ کی ذاتی اور عمومی فلاح کا انحصار ہے۔

۱ - یاد رکھئے کہ تازہ ہوا اور دھوپ بیماریوں سے محفوظ رہنے کے معاملے میں آپ کی بہترین ضامن ہے۔ پھر یہ کہ قدرت کے یہ عطیے آپ کو مفت ملتے ہیں۔

۲ - اس حقیقت کو نہ بھولئے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے بہترین غذا ہے۔ اگر اس کے اتنا دودھ ہے کہ بچے کو کافی ہو جائے تو اسے شکر کرنا چاہئے۔ جلدی سے یہ نہ فرض کر لینا چاہئے کہ اس کا دودھ کافی نہیں۔

۳ - کسی صورت میں یہ گوارا نہ کیجئے کہ کسی مقام پر غلاظت یا فضلہ پڑا رہے۔

۴ - حکومت کے قریب ترین ادارے کو کسی بیماری کی فوری رپورٹ کیجئے۔ خصوصاً ایسی بیماری کی جس کے پھیلنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کا امکان ہو اور جو مشورے دئے جائیں ان سے پورا فائدہ اٹھائیے اس کے ساتھ ساتھ ترغیب اور مشورے سے اپنے احباب اور عزیزوں کو جو بظاہر بچ جاتے ہوں دباؤ ڈال کر کاربند ہونے پر مجبور کیجئے۔ اس ضمن میں اسپتالوں، تیمارخانوں اور بہبودی کے

مراکز سے پورا پورا فائدہ اٹھائیے۔

۵۔ پانی کو ضائع نہ کیجئے اور پانی کی صفائی کو اس کے سوتے سے لے کر صراحی اور گلاس تک کسی قسم کی آلائش سے مکدر ہونے نہ دیجئے۔

۶۔ پھیری والوں سے جو کھانے پینے کی مشتبہ اور کھلی ہوئی چیزیں بیچتے ہوئے نظر آئیں، کبھی کوئی چیز نہ خریدئے۔

۷۔ پرانی وضع کے بیت الخلاء یا کھلے ہوئے مقامات میں رفع حاجت کے بعد فضلہ کو مٹی، ریت یا راکھ سے ڈھک دیا کرو۔ اس سے مکھیوں کے ذریعہ بیماری کے پھیلنے کا انسداد ہو جائے گا۔

میری اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ آپ اپنی صحت کے مسئلے سے دلچسپی پیدا کریں جو شخص زندگی اچھی طرح بسر کرتا ہے، اسے موت کا دھڑکا نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کے لئے موت جب کبھی آتی ہے تو وہ بقول ٹیگور "موت کا استقبال کرتا ہے اس لئے کہ موت اس کے سامنے ایک مہمان عزیز کی طرح آتی ہے ایک فاتح بن کر اس کے گھر میں نہیں گھستی"

لطیف سعید (لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

پانی کی کہانی

اس میں پانی ہی سے اس کی کہانی کہلوائی گئی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رکھتی ہے۔ پانی کے فائدے نقصانات، استعمال کے طریقے، اس کی بناوٹ اور شکلیں غرض ہر پہلو پر تفصیلی معلومات اور تصاویر درج ہیں۔

از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ڈپ ایڈ صفحات (۵۲) قیمت صرف ۶ ر

جنون و شوق

آزاد ہیں جنون خرد کے اثر سے ہم
یعنی کہ بے نیاز ہیں شام و سحر سے ہم

وارفتگیٔ شوق کے قربان جائیے
آگے نکل چکے ہیں بہت راہبر سے ہم

رکھتے ہیں آشیاں کی بنا دیکھ اے فلک
پھر کھیلتے ہیں شوخیٔ برق و شرر سے ہم

پھر بھی اسیرِ دامِ تصور ہیں اے ندیم
واقف ہیں گرچہ زندگیٔ مختصر سے ہم

کنجِ قفس میں تیری تسلی کا شکریہ
پہلے سے آشنا ہیں غمِ رہ گذر سے ہم

اے چرخ اہلِ شوق کی پرواز دیکھنا
آگے بہت ہیں منزلِ شمس و قمر سے ہم

اب ہم پہ رازِ ہستیٔ فانی کھلا ظفر
آزاد جب کہ ہوگئے قیدِ نظر سے ہم

ظفر (عثمانیہ)

کنول

مشکل سے میں نے چھ دن اپنے وطن میں بسر کئے گاؤں کی غیر مانوس فضا میرے لئے کوئی دلچسپی کا سامان مہیا نہ کر سکی اور میں سوچنے لگا کہ بقیہ چوبیس دن یہاں کس طرح اور کن دلچسپیوں میں بسر کر سکتا ہوں، جب کہ یہاں میرا کوئی ساتھی ہے اور نہ ہم خیال، والد دن بھر اپنے زراعتی کاروبار میں لگے رہتے، میرا اکثر وقت اپنے باغ والے کمرے میں بیٹھے ہوئے مطالعہ کرتے میں کٹ جاتا یا کبھی افسانہ لکھنے میں صرف ہو جاتا، البتہ شام کے فرحت افزا لمحات میں میں ندی کے کنارے ٹہلنے کے لئے نکل جاتا، جہاں ہمارے کھیت واقع ہیں، کئی مزدور یہاں کام کرتے ہوئے نظر آتے، یہ لوگ کتنے محنتی جفاکش اور تنومند ہوتے ہیں، ان کی زندگی کتنی پُرسکون معلوم ہوتی ہے یہ مجھے شہر کی ہنگامہ خیزیوں سے دور دیہات میں آکر ہی معلوم ہوا۔ اور ایک حد تک ان سے ہمدردی بھی پیدا ہو گئی۔

ایک خوبصورت مختصر سا باغ ہمارے مکان کا احاطہ کئے ہوئے تھا، جس کا تنہا نگراں کار ہمارا قدیم بڈھا ملازم موتی تھا یہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں باغ کے ایک گوشے میں مقیم تھا۔ جب سے میں یہاں مقیم ہوں، موتی ہر روز ایک خوبصورت گلدستہ بنا کر میرے لکھنے کی میز پر رکھ دیا کرتا، میں نے اسے انعام کی صورت میں اپنا ایک کوٹ دے دیا تھا، جس کو وہ شکریہ کے ساتھ خاص موقعوں پر پہننے کے لئے رکھ لیا تھا ـــــــ

ایک دن جب میں سو کر اپنے بستر سے اٹھا تو غیر معمولی اپنی میز پر گلدستہ نہ پا کر مجھے تشویش سی ہوئی لیکن ناشتے پر مجھے والدہ کی زبانی موتی کی علالت کی کیفیت معلوم ہو کر یہ تشویش دور ہو گئی ناشتے سے فارغ ہو کر میں اس کے جھونپڑے کی طرف گیا، مالی بستر پر پڑا کراہ رہا تھا کنول، میں نے اس کی لڑکی کو مخاطب کیا، جو چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی روٹی پکا رہی تھی، بخار کب سے آیا ہے ـــــــ

"سرکار"۔ اس نے کہا "رات کے کھانے کے بعد سے بخار چڑھا ہے"۔

"پھر دوا" میں نے موتی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا، حرارت تو اس وقت بھی ہے" بڑے سرکار نے حکیم جی کو بلایا ہے، اب آتے ہی ہوں گے" "کچھ کھایا بھی ہے اس نے"۔ "ایک کھیل بھی کل سے منہ میں نہیں گئی"۔

"ارے، غذا کے بغیر، توانائی کیسے آئے گی، تم ابھی اسے اٹھا کر دودھ اور نرم پکے ہوئے چاول کھلا دینا" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور کوئی کتاب دیکھنے لگا، مشکل سے چند لمحے گزرے ہوں گے، کنول میرے کمرے کے باہر کھڑی ہوئی نظر آئی "کیوں؟ کیا بات ہے کنول" "سرکار! بابو کھانا نہیں کھا رہے ہیں"۔ "تو چل، میں ابھی آتا ہوں" کتاب کو میز پر رکھ کر میں اس کے پیچھے چلا۔ موتی! تم کھانے کے لئے کیوں ضد کر رہے ہو"۔ "سرکار" اس نے منہ بنا کر کہا، جیسے اسے کوئی تکلیف ہے، کھایا نہیں جاتا" "پھر بیماری کیسے جائے گی، تھوڑا سا کھا لو، خدانے چاہا تو دو روز میں تمہارا بخار اتر جائے گا"۔ "بابو، اس کی لڑکی نے منت کے ساتھ کہا" سرکار کے کہنے پر تو دو نوالے کھا لو"۔

بڈھا مالی طوعاً و کرہاً میرے کہنے پر کچھ کھایا پیا اور میں اسے اپنے پاس کی کونین کی گولی کھلا کر وہاں سے لوٹا۔ دو تین دن میں موتی کا بخار اتر گیا، مگر نقاہت کچھ کچھ باقی رہی، والد نے اسے ایک ہفتے کی چھٹی دے دی، اور اس کی جگہ ہمارا دوسرا ملازم کام کرنے لگا

ایک دن شام کی تفریح کے لئے گھر سے نکلا، موتی کے جھونپڑے کے قریب سے گزر رہا تھا، اس نے آواز دی، میں اس کے پاس پہنچا۔ کیا حالت ہے تمہاری۔ سرکار کی مہربانی ہے ـــ ارے تم شرمندہ کر رہے ہو، خدا سب پر مہربان ہے، ہاں مالک، خیر تم اب اچھے ہو جاؤ اور ہمارے لئے ویسے ہی خوبصورت گلدستے بنایا کرو، اس کے بغیر ہمارا کمرہ بے رونق سا معلوم ہوتا ہے، سرکار! اس نے شرمندگی سے کہا، مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ نہیں کوئی بات نہیں تم جو بیمار تھے۔

اس عرصے میں کنول سر پر پانی کا گھڑا لے آئی، اس نے مجھے دیکھا، اور نظریں نیچے جھک گئیں، میں وہاں سے نکل کر تفریح کے لئے ندی پر پہونچا، اور وہاں بہت دیر گئے گھر پہونچا۔ دوسرے دن صبح میں بیدار ہوا، پھولوں کی خوشبو سے میرا دماغ مہک اٹھا۔ ارے میری زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا۔ یہ گلدستہ یہاں کس نے رکھا، شاید۔ موتی نے۔ لیکن اتنا اچھا جاذب نظر۔ شاید اس کی لڑکی کنول نے بنایا ہو۔ یہ گلدستہ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ کا غذ اور قلم لے کر میز پر بیٹھ گیا، اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد میں نے ان پھولوں کو کاغذ میں جذب کر لیا پھر اسے ایک معمولی فریم میں جڑ کر اپنے کمرے میں آویزاں کر دیا، آج کا تمام دن میں نے یہ دلچسپ مشغلہ جاری رکھا، مجھے ایسا کرنے میں ایک خاص قسم کی مسرت محسوس ہونے لگی،

دوسرے دن میں علی الصباح اپنے کمرے سے باہر نکلا، میرے کمرے کے قریب گلاب کے جھنڈ کے پاس مجھے کنول کھڑی ہوئی ملی۔ اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہو رہی تھی، اس کا ملیح حسن، اور اٹھتی ہوئی جوانی نے حد درجہ اسے دلکش بنا دیا تھا" کنول تم یہاں کیا کر رہی ہو"۔ "آپ کے گلدستے کے لئے پھول" اس نے لجائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، اوہ۔ میرے لئے۔ کل کا گلدستہ تم نے بنایا تھا۔ آپ کو پسند آیا۔ کیوں نہیں، تم نے جو بنایا، وہ چپ ہو گئی۔ کتنے پیارے پھول ہیں، اور اس سے زیادہ حسین تمہارے نازک ہاتھ، کنول شرما گئی۔ وہ گلاب کے پھول توڑنے میں مصروف ہو گئی۔ اور میں وہاں سے نکل کر تفریح کے لئے روانہ ہوا۔ واپسی پر والد میرے منتظر تھے کوئی انگریزی لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا، کل ڈپٹی صاحب، یہاں آ رہے ہیں میں نے انگریزی لفافہ کا مفہوم بیان کیا، کس لئے" والد نے ذرا متفکرانہ انداز میں دریافت کیا، وہی، ہمارے مقدمہ کے سلسلے میں، جو نمبر دار اور ہمارے مابین چل رہا ہے، والد کچھ پریشان سے نظر آنے لگے، میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ سارے معاملات نبٹ لوں گا، دوسرے دن ڈپٹی صاحب پہونچ گئے، ان کے ہمراہ ان کی لڑکی اور چھوٹا لڑکا تھا، ان کا پڑاؤ ہمارے ہی باغ میں ڈالا گیا تھا، والد کے ہمراہ میں بھی ان سے ملنے گیا، آدمی خوش اخلاق، اور وضع دار تھے۔

دوسرے دن ندی کے پاس مجھ سے اتفاقیہ طور پر ڈپٹی صاحب کی لڑکی سے ملاقات ہوئی یہ بھی اپنے باپ کی طرح بلند و پاکیزہ جذبات کی مالک، اور حسین و جمیل لڑکی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے عرصے میں ہم کافی متعارف ہو چکے، واپس وہ میرے ساتھ کمرے تک آئی یہاں کنول میرے کمرے میں گلدستہ میں پھول لگا رہی تھی۔ یہ کون لڑکی ہے ؟ ڈپٹی صاحب کی لڑکی نے دریافت کیا، یہ ہمارے مالی کی لڑکی کنول ہے۔ اوہ اس نے مسکرا کر کہا، تب تو آپ کو ہر روز تازہ تازہ خوبصورت پھول ملتے ہیں، جی ہاں۔ گاؤں کی فضا میں اور کیا رکھا ہے، چپراسی کے ذریعے اطلاع ملنے پر کہ والد ہمارے کھانے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں، ہم دونوں وہاں پہونچ گئے۔ دوسرے دن ہمارے مقدمے کی کاروائی کا آغاز کیا گیا تھا، زمینات کا معائنہ ہوا۔ گواہوں کے بیانات لئے گئے، اور بالآخر ایک طرفہ کاروائی کی گئی۔ اب وہ اپنے مستقر لوٹ رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی لڑکی نے، جس کا نام مجھے بعد کو معلوم ہوا، طلعت سلطانہ ہے۔ خواہش ظاہر کی کہ میرے کمرے میں جو گلدستہ بنا رکھا ہے، ویسا ہی خوش نما گلدستہ باغبان کی بیٹی سے بنوا کر دیا جائے۔ میں نے فوراً لڑکی کو طلب کیا، وہ آئی، کنول تم ہمارا ایک کام کر دو گی۔ خاتون! تعلقدار صاحب کی لڑکی ہیں، ہاں سرکار۔ اس نے کچھ متانت کے لہجے میں کہا، اب یہ اپنے شہر جا رہی ہیں، تم ان کی خدمت میں ایک اچھا گلدستہ بنا کر پیش کرو، لیکن سرکار۔ اس نے کہا، اس وقت تازہ پھول کہاں سے میسر آئیں گے، کہیں سے لے آؤ۔ وہ بغیر کچھ کہے چلی گئی۔ آج یہ لڑکی کچھ اداس سی معلوم ہوتی ہے، ڈپٹی صاحب کی لڑکی نے اس کے جانے کے بعد کہا، شاید۔ مگر ہے تو بڑی اچھی لڑکی۔ میں بھی پسند کرتی ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، مگر آپ کی

رقیب نہیں۔ شکریہ! میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا' اس اثنا میں کنول آگئی۔ کیا بنا لائی؟ سرکار! باغ میں کوئی پھول نہیں' خیر کوئی بات نہیں' بانو صاحبہ میں نے کہا' آپ شوق سے میرا گلدستہ لے جا سکتی ہیں۔ اگر کوئی خیال نہ فرمائیں۔ لیکن کنول درمیان میں بولی' آپ کے لئے'۔ تم دوسرا بنا دینا۔ طلعت نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا' اوں۔ وہ سر ہلا کر چلتی بنی۔ ملازم کو میں نے گلدستہ لانے کے لئے بھیجا۔ وہ واپس آکر کہنے لگا۔ حضور وہاں کوئی گلدستہ نہیں۔ نہیں کیسے؟۔ میں طلعت کے ساتھ کمرے میں پہونچا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ واقعی گلدستہ میں ایک بھی پھول نہ تھا۔ آخر یہ پھول کہاں غائب ہوگئے۔ میں نے ملازم سے دریافت کیا" وہ رہے پھول"! طلعت نے انگلی کے اشارے سے دریچے کے باہر دکھا کر کہا" ارے یہاں کیسے؟۔ آپ کی مالن نے ڈال دئے ہوں گے۔ اُف۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے طلعت سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کبھی بہترین گلدستہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی جائے گی' اور جب میں باپ بیٹی کو وداع کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ کیا دیکھتا ہوں' گلدستہ میں تازہ تازہ پھول چن دئے گئے ہیں۔ واہ۔ یہ کنول بھی عجیب لڑکی ہے۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا کیوں اس نے ڈپٹی صاحب کی لڑکی کے لئے پھول فراہم نہیں کئے۔ میں نے فوراً کنول کو طلب کیا۔ یہ تمہاری کیا حرکت ہے کنول — وہ خاموشی کے ساتھ کھڑی تھی۔ تم نے کیوں میرے حکم کی تعمیل نہیں کی میں نے دوبارہ اس سے دریافت کیا۔ پھر بھی وہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ارے تم رو رہی ہو۔ میں نے کچھ ہمدردی کے ملے جلے لفظوں میں کہا۔ گویا دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ آخر بات کیا ہے اس کے ہونٹ کپکپائے۔ سرکار' اس نے کہا' تم کسی کو اپنے پھول دینا نہیں چاہتیں۔ میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی' ہاں۔ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ بولی' میں تو صرف آپ کے لئے۔ میرے لئے کیوں؟۔ میں نے اس سے عجیب سوال کیا۔ آپ ہمارے سب کچھ ہیں۔ اوہ۔ یہ بات' آج دل کی بات ہونٹوں پر آگئی۔ اب تو ہر روز۔ میرے لئے' اچھے اچھے تازہ پھول آئیں گے" لیکن ڈپٹی صاحب کی لڑکی کے لئے نہیں" اس نے شوخ لہجے میں کہا —

دن گزرتے گئے۔ کنول کی شادی ہو چکی۔ اور اب وہ ایک بچے کی ماں ہے' اس کا شوہر موتی کی جگہ کام کرتا ہے۔ اب بھی ہر روز کنول میرے لئے پھولوں کا گلدستہ بنا کر لاتی ہے' اگر اتفاق سے کوئی دوسرا اسے حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو وہ بری طرح بگڑ جاتی ہے بلکہ گلدستہ کے پھول چورا چورا کر کے بکھیر دیتی ہے۔ آہ۔ کنول بھی عجیب لڑکی ہے۔ خدا ہر کسی کو ایسی ہی مالن عطا کرے (آمین)

صابر کوسگوی

انوار

جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف اک کہنہ مشق اور پُر گو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔

صفحات (۱۲۸) قیمت عہ

میر محمد مومنؒ کا ذوقِ تعمیر (بسلسلہ پیوستہ)

سیدآباد کی مسجد کی وضع قطع

سیدآباد کی مسجد کے کتبے اور اس کے کاتب کا حال بیان کرنے کے بعد اس کی وضع قطع سے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی بڑی مسجد نہیں ہے اور نہ اس کے منارے ہی بلند ہیں جیسا کہ اس کی تصویر سے ظاہر ہوگا۔ تاہم اس کی تعمیر میں تناسب اور نفاست کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کی تینوں کمانیں خوش وضع ہیں اور چھجے کے اوپر جو منڈیر بنائی گئی ہے اس پر پہلے اکیس ۲۱ چھوٹی چھوٹی کمانیں اور پھر علموں کی شکل کا حاشیہ دے کر عمارت کی رونق میں دیدہ زیبی پیدا کی گئی۔

درمیانی کمان کے آگے تھوڑے فاصلہ پر ایک لمبوترا حوض بنایا گیا تھا جس میں اب مٹی بھری ہوئی ہے اور اسی پر سے گذر کر اس وقت دروازہ سے مسجد تک پہنچتے ہیں۔

مسجد کے چبوترے کے اطراف دیوار کھینچدی گئی ہے لیکن یہ دیوار بعد کی ہے۔ اصل میں میر صاحب نے مسجد کے اطراف سرائے بنائی تھی۔ اور اس سرائے کے عین وسط میں ایک اونچے چبوترے پر مسجد قایم کی گئی تھی۔ سرائے کا عقبی حصہ تو اب بھی باقی ہے لیکن سامنے اور دونوں پہلوؤں کی عمارت بعد کو منہدم ہوگئی۔ اور اس جگہ مختلف چھوٹے چھوٹے بے ترتیب مکان بن گئے ہیں۔ اور انہی مکانوں کی وجہ سے مسجد کے چبوترے پر چہار دیواری اٹھادی گئی ہے۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی مسجد کا اصلی صحن ہے۔ حالانکہ یہ درمیانی چبوترہ تھا مسجد کا اصلی صحن چبوترے کے نیچے دور تک ہوگا اور مسجد اور سرائے کا باب الداخلہ اس مقام پر ہوگا جہاں اب ایک جاگیردار صاحب کا نئی وضع کا بنگلہ بن گیا ہے۔

مسجد کا مسقف حصہ دس گز طویل اور ۷ گز عریض ہے۔ درمیانی محراب میں سنگ موسیٰ کا عالی شان کتبہ ہے جس کے حروف پر طلائی کام کیا گیا تھا لیکن مرور ایام اور آب پاشی کی وجہ سے اب یہ باقی نہیں ہے البتہ لفظوں پر جگہ جگہ سنہرا رنگ اب بھی جھلکتا ہے۔

یہ مسجد اور سرائے سنہ ۱۱۸۰ھ تک ملا تمیمی کی اولاد کے قبضہ میں رہی۔ اس وقت سید حسین ولد سید جلال داماد سید لاڑ محمد بن شاہ محمد بن ملا تمیمی اس پر اور اس سے متعلقہ معاش پر قابض تھے۔ اور ان کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے قبل ان کے مذکورۂ صدر اجداد جن کے نام انھوں نے اپنی ولدیت کے سلسلہ میں لکھے ہیں اس مسجد کی خدمت بجالاتے رہے اور اس سے متعلقہ معاش پر قابض تھے۔

جب مذکورہ سنہ میں حضرت میر محمد مومنؒ کے ورثاء نے اس مسجد اور سرائے کو اپنے قبضہ میں کرلینا چاہا تو سید حسین نے اپنے قدیمی حقوق پیش کئے اور خدمت گذاری کا وعدہ کیا جس کی بنا پر میر مومن صاحب کے نبیرہ میر سید محمد کے فرزندوں (میر محمد حسین اور میر کاظم علی) نے اس معاش پر سید حسین ولد سید جلال کا قبضہ اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ وہ سال بسال ماہ شعبان میں پانچ روپیہ ماہانہ میر صاحب کے فاتحہ اور چراغاں کے لئے دیا کریں۔ چنانچہ سید حسین نے اپنے اقرارنامہ میں لکھا ہے کہ:-

"آنہا یعنی ورثائے میر صاحب (نظر بر قدامت من و شرط خدمت مسجد نمودہ مبلغ پنج روپیہ برائے چراغان عرس والد میر محمد مومن صاحب مغفور از من قبول کنانیدہ اند

تقاضا دست برداشتند. و خود ہم بہ رضا و رغبت خود راضی شدم کہ سال بسال در ماہ شعبان پنج روپیہ برائے چراغان عرس و فاتحہ سالیانہ می دادہ باشم۔ بعد من قائم مقام من سال بسال می دادہ باشند احیاناً کسے ازاں قرار برگردد یا تفاوت دیا تجاوز کند مجرم شرع شریف خواہد بود۔ وکان ذالک تحریراً فی التاریخ غرہ جمادی الاول ۱۰۸۱ھ۔"

لیکن میر صاحب کے موجودہ وارث اور سجادہ مولوی میر عباس علی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ موعودہ رقم نہ اس وقت داخل ہوتی ہے اور نہ شاید ان کے والد میر حیدر علی مرحوم کے زمانہ میں داخل کی جاتی تھی۔ خود مسجد کی خدمت کے لئے بھی اب محکمہ امور مذہبی کی طرف سے ایک موذن ملازم ہے جس کا بیان ہے کہ وہ تیس چالیس سال سے یہ کام انجام دیتا ہے اور مسجد کا کوئی متولی وغیرہ نہیں ہے اور نہ یہ معلوم کہ سید حسین ولد سید جلال کی کوئی اولاد بھی اب باقی ہے یا نہیں۔ بہرحال مسجد تو آباد ہے اور اب تک اس میں پنج وقتہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ موذن کا بیان ہے کہ چالیس پچاس سال قبل مسجد ہی میں ایام عاشورہ میں علم بٹھائے جاتے تھے لیکن اب عرصہ سے یہ طریقہ مسدود ہے اور خود علم بھی شاید بلدہ حیدر آباد کے کسی صاحب کے یہاں ہیں۔

عاشور خانہ

یہ امر یقینی ہے کہ سید آباد میں میر صاحب نے مسجد کے ساتھ عاشور خانہ بھی بنایا ہو گا۔ لیکن اس کی عمارت اب ناپید ہے اور شاید اسی عاشور خانہ کے علم بعد کو مسجد میں ایستاد کئے جاتے تھے۔ اس سال یعنی ۱۳۶۰ھ کے محرم میں مولف کتاب ہذا اور پروفیسر سید محمد صاحب نے دوبار سید آباد (موجودہ سیدا باغ) کی بستی کا معائنہ کیا تو وہاں [illegible] مکانات کے دیوان خانہ میں علم نظر آئے جو بالکل جدید ہیں اور یہ عاشور خانہ بھی حال ہی میں کسی خاتون کا بنایا ہوا ہے۔

سید آباد کی سرائے

مسجد کے بعد میر صاحب کی سرائے کا بھی کچھ تذکرہ ضروری ہے۔ یہ سرائے کسی زمانہ میں بڑی آباد ہوگی۔ کیونکہ یہ شاہی راستہ پر واقع تھی۔ اب بھی اس کے کچھ بچے کھچے کمرے غریبوں کے مکان بن گئے ہیں اور اس طرح سے یہ سرائے آباد ہے۔

مسجد کے عقبی حصے کی طرف اس سرائے کی پوری کمانیں اب تک محفوظ ہیں ان کی تعداد سترہ ہے جن میں سے محراب کے عین مقابل والی تین کمانیں چھوٹی ہیں اور باقی کی چودہ کمانیں ایک ہی وضع قطع اور وسعت کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرائے مسجد حیات بخشی بیگم (واقع حیات نگر) اور مسجد کاروان قدیم کی سراؤں کی طرح عالی شان بنائی گئی تھی۔ اس میں جملہ ۵۶ کمرے تھے۔ عقبی حصہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں پہلوؤں کے وسط میں دروازے تھے۔ اور ان دروازوں کی دونوں طرف سات سات کمانیں بنائی گئی تھیں۔ اس سرائے کے شمالی گوشہ کی تصویر جو مسجد کی چھت پر سے لی گئی ہے اس کتاب میں شریک ہے۔

سرائے کے عقبی حصہ میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں چھت سے باہر نکال کر جو خوبصورت چھجا بنایا گیا ہے اس کے اہتمام اور مضبوطی کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سرائے کس عمدہ پیمانہ پر تیار کی گئی تھی۔

میر پیٹھ

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے فرمان مورخہ ۱۰۵۱ھ میں میر صاحب کے دوسرے گاؤں کے ساتھ میر پیٹھ کا ذکر ان الفاظ میں درج ہے:۔

"در مستقر آباد عرف میر پیٹھ دو قطعہ تالاب بستہ و باغ

---

[1] سوانح میر محمد مومن۔

نارجیل و درختان مثمرہ نشانمہ (کذا) دو مسجد کلاں احداث فرمودہ "

متن کے علاوہ فرمان کے نیچے تلنگی عبارت سے قبل جہاں میر صاحب کی جاگیرات کی فہرست لکھی گئی ہے وہاں بھی "موضع مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ" کا نام دوسرے نمبر پر درج ہے۔

اس شاہی فرمان کے علاوہ میر پیٹھ کا ذکر ایک سو دس سال بعد کے ایک محضر میں ملتا ہے جو میر صاحب کے ورثا، سید محمد، شاہ بیگم، زہرا شاہ، فخر النساء بیگم اور خیر النساء وغیرہ نے ۱۱۶۰ھ میں لکھا ہے۔ اس میں میر پیٹھ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"در موضع مصطفےٰ آباد عرف میر پیٹھ پرگنہ حویلی حیدرآباد
ساختہ دو مسجد کلان احداث فرمودہ و دو تالاب بستہ دیناہا
کندہ باغ نارجیل و اشجار ثمرہ جمیع اقسام کاشتہ"[1]

ان حوالوں کی بنا پر راقم الحروف نے شہر حیدرآباد کے اطراف و اکناف کے دیہات کی فہرستوں میں تلاش کرنا شروع کیا تو حسن اتفاق سے دو مختلف جگہوں پر میر پیٹھ نام کے دو دیہات کا پتہ چلا۔ جن میں سے ایک ضلع میدک کے متعلقہ باغات میں واقع ہے اور اب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی جاگیر ہے۔ اس میں ۲۴۲ مکانات ہیں جن میں جملہ ۰۲، نفوس (۳۴۹ مرد اور ۳۵۳ عورتیں) آباد ہیں۔[2]

دوسرا میر پیٹھ ضلع اطراف بلدہ کے شمالی تعلقہ میں نواب قدیر جنگ بہادر کی جاگیر ہے اس میں کل ۳۱ مکان ہیں جن میں ۱۲۶ نفوس ۱۴۶ مرد اور ۶۲ عورتیں بستے ہیں۔[3]

ان معلومات کے بعد مصنف کتاب نے ان دونوں مقامات تک پہنچنے کے راستے اور دیگر حالات کی تلاش کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تین دفعہ تاریخی معائنہ کے انتظامات کئے گئے۔

پہلی بار ۲ فروری ۱۹۴۱ء کو مولوی سید محمد صاحب ایم اے کی رہبری میں راستہ دیکھنے اور تیقن کے لئے کہ یہ میر مومن ہی کا بنایا ہوا میر پیٹھ ہے ظل اللہ گوڑہ اور میر پیٹھ کا سفر کیا گیا۔ اور جب تالاب، مسجد اور کتبہ وغیرہ دیکھنے کے بعد یقین ہو گیا کہ یہ میر محمد مومن ہی کا بنایا ہوا گاؤں اور مسجد ہے تو ۵ فروری کو ادارہ کی طرف سے تاریخی معائنہ کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ پروفیسر محمد عبد الحمید صدیقی، پروفیسر سید محمد، مولوی عبد الرحمن شریف، مولوی صدیق علی ماہر حریہ اور بھلوان صاحب فوٹو گرافر کی معیت میں اس روز کئی گھنٹے میر پیٹھ میں گزرے۔ اور مسجد کی تصویریں اور کتبوں کے چربے لئے گئے میر پیٹھ کے دونوں معائنوں میں مولوی عبد الرشید صاحب بی اے نے (جو حسن اتفاق سے اسی باغ میں رہتے ہیں جو میر صاحب کا لگایا ہوا ہے) بڑی زحمت اٹھا کر ہماری معلومات میں اضافہ کا انتظام کیا، اور ہر طرح کی سہولتیں ہم پہنچائیں۔ چنانچہ مسجد کو درختوں وغیرہ سے صاف کیا، دھلوایا، کتبوں میں سے چونا اور گرد و غبار نکلوایا اور ہماری پر تکلف ضیافت بھی کی۔

یہ میر پیٹھ شہر حیدرآباد سے تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ اور اس کا راستہ چمپا پیٹھ کرمن گھاٹ، اور ظل اللہ گوڑہ پر سے گزرتا ہے۔ لیکن چمپا پیٹھ کے بعد سے کچی سڑک ہے جس پر سے موٹر قدرے زحمت کے ساتھ میر پیٹھ تک پہنچتی ہے۔

سید محی الدین قادری زور

---

[1] اس محضر کی آئندہ صفحات میں نقل درج ہے۔

[2] دیکھو فہرست دیہات ضلع میدک (انگریزی) مطبوعہ دفتر اعداد و شمار حیدرآباد بابت ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۰۔

[3] دیکھو فہرست دیہات ضلع اطراف بلدہ (انگریزی) مطبوعہ دفتر اعداد و شمار حیدرآباد بابت ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۱

دوسری شادی

اس کی دوسری شادی کے دن قریب آرہے تھے ایک چلبلی لڑکی کا تصور ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ اسے پچکے ہوئے گالوں، اور جھریوں بھرے چہرے سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی کو اپنے پہلو میں دیکھنے کا آرزو مند تھا، جس کی آنکھوں میں نشہ اور ہونٹوں میں رس ہو۔ جوانی جسکے روئیں روئیں سے چشموں کی صورت میں اُبل رہی ہو۔ جو ہنسے گنگنائے اور بات بات پر روٹھ جائے جس کے اعضا میں لوچ اور باتوں میں شعریت ہو۔ اور اسی لئے اس نے اپنی پہلی بیوی کو مار پیٹ کرا سے اس کے میکے بھیج دیا تھا۔ اور قریب کے گاؤں میں ایک غریب کسان کی مٹھی گرم کرکے اسے رشتہ دینے پر آمادہ کرلیا تھا۔ اور اب اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے۔

اس نے ان برتنوں کو پچھلی کوٹھڑی میں مقفل کردیا تھا، جو اس کی پہلی بیوی جہیز میں لائی تھی۔ اور جس پر ان کے چرائے جانے کے ڈر سے اس کے والدین نے اپنی بیٹی کا نام کھدوا دیا تھا۔ اور ان چار پائیوں کو نئے سرے سے بنوایا تھا، جن پر بچوں کے پیشاب سے بڑے بڑے داغ پڑے ہوئے تھے۔ اور کچھ ایسے کپڑوں کو رضائیوں والے بھاری بھرکم صندوق کے پیچھے پھینک دیا تھا، جو اس کی بیوی جلدی میں اپنے ساتھ لیجانے بھول گئی تھی۔ اور جن کی موجودگی میں اس کی نئی بیوی کے دل میں ایک خطرناک شبہ کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

دین محمد "پنجاب اینڈ سندھ بنک" میں معقول مشاہرہ پر ملازم تھا۔ مگر اس کی بیوی عمدہ کھانوں کے نام تک نہیں جانتی تھی، اس کے بچے مونگ پھلی اور بھونے ہوئے چنوں کے ذائقہ سے نا آشنا تھے۔ اور خود اس کو کبھی کسی نے دھوبی کا دھلا ہوا کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ صبح و شام دال روٹی اور ہفتہ میں ایک بار گوشت اور کبھی کبھی دال چاول یہ اس کی خوراک تھی۔ وہ کولھو کے بیل کی طرح دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر کے علاوہ کبھی کہیں نہ جاتا تھا۔ اپنے ساتھی کلرکوں کو سگرٹ پیتے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ان کا عبرتناک انجام پھر جاتا۔ وہ سوچتا یہ لوگ اپنے مستقبل سے کس قدر بے پرواہ ہیں۔ نہیں جانتے کہ عنقریب ان کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہونے والا ہے۔ اور ان کی آنکھیں بصارت سے محروم ہونے والی ہیں۔ بڑھاپا منہ کھولے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں، جب دفتر سے انہیں دھکے مار کر نکال دیا جائے گا۔ اور اپنا پرایا کوئی بھی آنکھ ملانا گوارا نہ کرے گا۔ مگر پیسہ ـــــ پیسہ ـــــ پیسہ۔ اس کے دل و دماغ پر گول گول روپہلی سکے ہمیشہ سایہ افگن رہتے۔ مگر اب اس کی زندگی میں انقلاب آچکا تھا۔ کام دیو بے طرح اس کے حواس پر مسلط ہو چکا تھا۔ اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے اس نے گھر کو دلہن کی طرح سجایا۔ دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کو سرخ روغن کے لباس میں ملبوس کیا۔ دیواروں کے تھوکوں بھرے سیاہ چہروں کو چونے کی تہوں میں چھپا دیا۔ اور "ہر چیز ملے گی چھ آنے" والے سے آملہ ہیر آئیل درجہ اول کی ایک شیشی خرید کر دالان کی انگیٹھی پر رکھ دی اور گھڑیاں گن گن کر دن کاٹنے لگا۔ اب اس کی شادی کے دن بہت قریب تھے۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کے رگ و ریشہ میں جوانی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اور مسرت و انبساط کا ایک بے پناہ طوفان نہایت عجلت سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس کی ڈاڑھی جو قینچی سے بھی دوچار ہونے کی بہت کم عادی تھی، اب استرے کی نذر ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کے آثار خضاب کی چادر میں لپیٹ دیئے گئے تھے وہ رات کی تنہائیوں میں سوچتا۔ پندرہ سولہ سال کی لڑکی، پھول سا چہرہ، رسیلی آنکھیں اور بلور کی طرح دمکتا ہوا جسم، کیا یہ سب کچھ، یہ بیش بہا خزانہ مجھے ملنے والا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ وہ تصور کی سنہری چلمنوں کی اوٹ میں یہ سب کچھ دیکھتا۔ اور اس کے ہونٹوں سے پانی کے چند قطرے نکل کر تکیے میں جذب ہو جاتے۔ کبھی خیال کرتا۔ کیا وہ مجھے بالکل اسی طرح چاہے گی، جس طرح ایک دلہن اپنے نوجوان دولہا کو چاہتی ہے۔ اُسے میرے کھردرے منہ اور ڈھلکے ہوئے جبڑے سے معلوم تو نہیں ہو جائے گا کہ میں بوڑھا ہوں۔ اسکے باپ سے بھی زیادہ بوڑھا۔ یہاں پہنچ کر بے اختیارانہ اس کے ہونٹوں سے ہوا کا ایک گرم جھونکا شانہ لڑاتا ہوا نکل جاتا، اور وہ بغیر کوئی اثر لئے تصور کی باگ جوانی کے لہکتے ہوئے سبزہ زاروں کی طرف موڑ دیتا اور دیکھتا کہ شہر بھر کے نوجوانوں میں وہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ اس کی خوبصورتی اور شہزوری کے قصے لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ اور لڑکیاں اس کا نام سن کر انگڑائیاں لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر شب انہیں خیالات کی رَو میں بہتا ہوا نیند کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا! جب کھانستا ہوا بڑھاپا گنگناتی ہوئی جوانی کو جلو میں لئے گھر میں داخل ہوا۔ سامنے ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ایک ملنگ نے یا علی کا نعرہ بلند کیا۔ اور مسکرا کر کہا

یوں بھی ہوتا ہے، سائیں بابا!

اس کا بڑھاپا اب بڑی بڑی بھری ہوئی جوانیوں کو آنکھیں دکھانے کے قابل ہو گیا تھا۔ فضلاں جب چھان چھان کرتی ہوئی صحن میں مٹک مٹک کر چلتی، تو دین محمدؐ کی رگوں میں جوانی دیپک راگ الاپنے لگتی۔ پلپلاہٹ تناؤ میں تبدیل ہو جاتی اور رخساروں میں سرخیاں سانس لینے لگتیں۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی زندگی کی ابتدا فضلاں کی آمد سے ہوئی ہے۔ وہ زندگی کے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتا تو اس کی آنکھوں میں ایک بھیانک زندان کی تصویر ناچنے لگتی۔ اور وہ کانپ اٹھتا مگر جلد ہی حال کی بے پناہ مسرتوں میں ڈوب کر رہ جاتا۔ اب دفتر کے در و دیوار اسے بچھو بن کر کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ دس سے چار بجے تک نہایت اضطراب کی حالت میں وقت بسر کرتا۔ رجسٹروں کے اوراق میں اسے فضلاں کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتیں۔ اس جنون کی وجہ سے بارہا حساب میں اس سے بڑی بڑی نمایاں غلطیاں سرزد ہوئیں۔ منیجر نے یہاں تک کہہ دیا کہ تمھارا دماغ اب کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ تمھیں خود بخود ملازمت سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ مگر دین محمدؐ کی دیوانگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کی بوڑھی ہوس بجھتے ہوئے چراغ کی طرح زیادہ لَو دینے لگی۔ منیجر کو آج ایک ٹی پارٹی میں شریک ہونا تھا۔ اس لئے وہ ڈھائی بجنے کے ساتھ ہی دفتر سے روانہ ہو گیا۔ دین محمدؐ کو یہ موقع کہاں، منیجر کے سیڑھیوں سے اترتے ہی کاغذات الماری میں بند کر کے گھر کی راہ لی۔ وہ سڑک پر اتراتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ایک ہی گام میں ختم ہو جائے۔ وہ گھر کے سامنے پہنچا تو خوشیا چپراسی اسے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل پر ایک دھکا سا لگا۔ اور آنتوں میں ایک ٹیس سی بل کھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خوشیا اٹھارہ بیس سال کا بانکا سجیلا نوجوان بغیر کام کے اس کے گھر میں

کیوں آیا اس نے پچھلے ہونٹ کو دانتوں میں چباتے ہوئے سوچا۔

ممکن ہے گھر میں کسی سودے کی ضرورت ہو' یا خوشیا ادھر سے گزرتا ہوا افسر کی بیوی سمجھ کر سلام کو چلا آیا ہو' یا دوپہر کا کھانا لیجاتے وقت اپنی کوئی چیز بھول گیا ہو۔ یا ــــ یا ــــ یایوں ہی چلا آیا ہو یہاں پہنچ کر اس کا دماغ چکرانے لگا' اور دل میں شعلے بھڑکتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اور وہ دروازہ کا سہارا لے کر اپنے منتشر حواس کو ٹھکانے لانے کی کوشش کرتا ہوا گھر میں داخل ہوگیا۔ گر فضلاں کے نشہ آور تبسم نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ اور اس کی غیرت کچھ دیر کے لئے گنگناتے ہوئے حسن کی پھلواری میں میٹھی نیند سوگئی۔

دوسرے دن فضلاں جب سو کر اٹھی' تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو باورچی خانہ میں کام کرتے ہوئے پایا اور مکان کے بڑے دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا ہوا دیکھا۔ اور چبارہ کے پردوں کو پہلے سے دگنا اونچا دیکھ کر اس انقلاب کی وجہ محسوس کی اور دل ہی دل میں زہریلی ناگن کی طرح بل کھانے لگی۔ اس کی شکن آلود پیشانی پر ایک خطرناک تحریر کے الفاظ دمکنے لگے۔ اور دو دن بعد دین محمد جب دفتر سے لوٹا تو اس تحریر کے معنی اس کی سمجھ میں کچھ اس طرح آئے کہ تلووں سے زمین سرکتی ہوئی معلوم دینے لگی۔ اس نے دیکھا کہ گھر کے تمام دروازے کھلے پڑے ہیں۔ اور فضلاں مع زیورات غائب ہے۔ وہ پہلے ہی خوشیا کی غیر حاضری کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔ گھر کا یہ عالم دیکھ کر اس کا شک یقین سے بدل گیا۔ دو رنگین جوانیاں ایک بڑھاپے کو سسکیوں میں تقسیم کرکے وہاں سے دور عشرتوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھیں۔

تین دن گزر گئے۔ مگر دین محمد کو کسی نے گھر سے نکلتے نہ دیکھا۔ وہ اس عرصہ میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا بغیر کچھ کھائے' پئے اور سوئے خدا جانے کیا سوچتا رہا۔ چوتھا دن اس کے لئے بے پناہ مسرتوں کو دامن میں لئے ہوئے طلوع ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچنے لگیں۔ اس نے پچھلی کوٹھڑی میں مقفل سامان کو جھوم جھوم کر اپنی اپنی جگہ پر سجایا۔ رضائیوں والے بھاری بھرکم صندوق کے پیچھے پھینکے ہوئے کپڑوں کو کھونٹیوں پر لٹکایا اور اپنا بہترین لباس زیب تن کرکے گھر سے نکل گیا۔

دو دن بعد سامنے ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں ایک ملنگ نے دیکھا کہ دین محمد بچوں کو کاندھوں پر اٹھائے اپنی پہلی بیوی سمیت گھر میں داخل ہو رہا ہے۔

الطاف مشہدی

ضروری اعلان:۔ جو مضامین سب رس میں شایع کرنے کے لئے وصول ہوتے ہیں انھیں مجلس ادارت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور جو قابل اشاعت قرار پاتے ہیں وہ سلسلہ وار شایع کئے جاتے ہیں اور ناقابل اشاعت مضامین کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ قابل اشاعت و ناقابل اشاعت مضامین کو حفاظت سے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے تاہم اس بارے میں دفتر سب رس پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس لئے مضمون نگار اصحاب اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کریں۔ اسٹامپ آنے پر ناقابل اشاعت مضامین واپس کر دیئے جائیں گے۔

مہتمم سب رس

تنقید و تبصرہ

قیمتی باتیں از جناب خواجہ فیض محمد فیض صاحب لودھیانوی منشی فاضل اورنٹیل ٹیچر اسلامیہ ہائی اسکول شیراں والا دروازہ لاہور۔ ناشر ریاض بک ڈپو محلہ داراشکوہ لاہور۔ قیمت دو آنے صفحات ۳۲۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ہندستانی بچوں کے لئے ایک سو منظوم نصیحتیں درج کی گئی ہیں۔ خط واضح اور کتابت و طباعت اچھی ہے بچے شوق سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔

دس نظمیں از فیض لودھیانوی صاحب ناشر ریاض بک ڈپو لاہور قیمت دو آنے صفحات ۳۱

اس میں بھی بچوں کے لئے اخلاقی اور اصلاحی اشعار درج ہیں چند نظموں کے عنوان ہیں۔ بچے، نوجوانوں سے خطاب تہذیب جدید۔ تجارت۔ ہمدردی۔ بیداری کا راگ۔ مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔

بچوں کی بہار از فیض لودھیانوی صاحب۔ ناشر ریاض بک ڈپو لاہور قیمت دو آنے صفحات ۳۲

یہ کتاب فیض صاحب کی مذکورۂ بالا دو کتابوں سے زیادہ مفید ہے اور شوق سے پڑھی جائے گی۔ اس میں بھی نونہالان قوم کے لئے علمی اور اصلاحی نظمیں شریک کی گئی ہیں۔ اور اس کا دیباچہ روزنامہ انقلاب لاہور کے مشہور مدیر عبدالمجید صاحب سالک سے لکھوایا گیا ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام مولفہ مولوی محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی صفحات ۲۵۰ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے اس اثناء میں چند نہایت ہی مفید مطبوعات شایع ہوئی ہیں جن کی یہ چوتھی کڑی ہے۔ اس میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اقتصادی نظام کی تشریح کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا ہے جس نے محنت اور سرمایہ کا صحیح توازن قایم کرکے اعتدال کی راہ پیدا کی ہے کتاب اس قابل ہے کہ عہد حاضر میں ہر تعلیم یافتہ نوجوان اسکا مطالعہ کرے اور موجودہ معاشی اور عمرانی کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

رسالہ گاؤں سدھار جلد ایک نمبر دو۔ بابت اپریل ۱۹۴۱ء چیف ایڈیٹر مولوی سید محمد نواب صاحب ایڈیٹر مولوی محمد عبدالقوی صاحب بی اے (مدراس)

یہ رسالہ حیدرآباد کے محکمہ اتحاد امداد باہمی کی طرف سے ہر مہینے تین زبانوں، اردو۔ تلنگی اور کنڑی میں شایع ہوتا ہے۔ مضامین میں تنوع اور افادیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس مہینے کے پرچے میں دیہی قرضہ۔ دیہات میں حفظان صحت۔ حیدرآباد میں تنظیم دیہی وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو دیہات کے باشندوں کے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

سیاسی معلومات از جناب اسرار احمد صاحب آزاد ناشر مکتبہ برہان نئی دہلی مجلد قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

اس کتاب میں تمام دنیا کی سیاسیات سے متعلق افراد و اقوام ممالک، مقامات اور معاہدات و اصطلاحات کی مکمل یادداشتیں پیش کی گئی ہیں۔ کتاب پانچ ابواب پر

منقسم ہے۔ پہلے میں مشہور سیاسی مشاہیر کے حالات حروف تہجی کے لحاظ سے درج ہیں۔ دوسرے میں ممالک و مقامات۔ تیسرے میں اصطلاحات اعلانات اور معاہدات۔ چوتھے میں تحریکات ادارت اور پانچویں میں متفرق امور سے متعلق جدید ترین اور مفید معلومات شریک کی گئی ہیں۔ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کرتی ہے۔ توقع ہے کہ مکتبہ برہان ایسی مفید کتابوں کی اشاعت سے اردو ادب میں اضافہ کرتا رہے گا۔

خطوط غالب

مرتبہ منشی مہیش پرشاد صاحب لکچرار اردو و فارسی ہندو یونیورسٹی بنارس۔

ناشر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد صفحات ۴۱۰ قیمت ۵ روپے۔

اردو و فارسی کے مشہور شاعر مرزا غالب کے اردو خطوط زبان اردوئے معلی کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس لئے بطور نصاب کے پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک خطوط غالب کے جتنے مجموعے اور ایڈیشن شایع ہوئے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کی وجہ سے اصل عبارتیں مسخ ہو گئی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مہیش پرشاد صاحب نے سالہا سال کی کاوش و تلاش کے بعد مرزا کے خطوط کا ایک صحیح ایڈیشن مرتب کیا اور اس میں بہت سے نئے خطوں کا بھی اضافہ کیا جو پہلے کے مجموعوں میں شامل نہ تھے۔ حسن اتفاق سے اس کام کی نظر ثانی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کی جو خود بھی خطوط غالب سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے بعض غیر مطبوعہ خط اس سے قبل چھپوا بھی چکے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں بعض باتوں کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ جن لوگوں کے نام مرزا غالب نے خط لکھے ہیں انکے حالات اور مرزا سے تعلقات کا مختصر سا تذکرہ بھی خطوں کے ساتھ درج کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس سے بہت سے خطوں کے سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے میں مدد ملتی۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جن لوگوں کے نام مرزا نے خط لکھے تھے ان میں سب سے پہلے مرزا تفتہ کے خطوط کو کیوں جگہ دی گئی۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ حروف تہجی کے لحاظ سے ناموں کی ترتیب دی جاتی یا جن لوگوں سے غالب کے تعلقات و مراسلت پہلے ہوئی ہے ان کے خط پہلے شریک کئے جاتے۔

بہرحال خطوط غالب کی اشاعت سے اردو کے ایک بڑے شاعر کی تحریروں کا بہترین ذخیرہ صحت و صفائی کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے اب تک اس معیار کی بہت کم کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

عورت مرد کے تعلقات

مولفہ لیو ٹالسٹائی۔ مترجمہ کدار ناتھ صاحب خورشید

صفحات (۸۴) قیمت ۱۰/- سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ناشر الاجپت رائے اینڈ سنس لاہور۔ یہ کتاب برہمچاری اصولوں کی تبلیغ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ فیشن پرستی اور عہد حاضر کی دوسری سماجی برائیاں اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب کہ لوگ عیش و عشرت اور مواصلت کے اصولوں پر سنجیدگی سے نظر ڈالیں۔

اردو بالغوں کیلئے

(انگریزی میں) مولفہ صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب

ناشر کتابستان الہ آباد۔ صفحات ۳۴ قیمت ۸/- اس کتاب میں اردو سکھانے کے صوتیاتی طریقے پیش کئے گئے ہیں۔ کئی نقشوں اور تصویروں کے ذریعہ سے اردو کے حروف صحیح اور حروف علت کے سمجھنے اور ملفوظ کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لوگ اردو زبان کے لسانی اور صوتی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کیلئے بھی اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ادارہ

اِدارہ کی خبریں

شعبے ادارہ کے مختلف شعبے برابر سرگرمِ عمل ہیں۔ اس مہینے تین شعبوں یعنے شعبۂ زبان، شعبۂ تاریخِ دکن اور شعبۂ انسائیکلو پیڈیا کے اجلاس ہوئے جن کی روئداد درج ذیل ہیں۔

شعبۂ زبان

۱۱ شہریور ۱۳۵۰ف کو ادارہ کے شعبۂ زبان کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، مولوی سید محمد صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سروری، نواب مرزا سیف علیخاں صاحب، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری، پنڈت دتشی دھر صاحب، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب معتمد شعبہ۔

ف ۱ ۔ سابقہ جلسہ کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اسکی توثیق فرمائی۔

ف ۲ ۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری نے تحریک فرمائی کہ چونکہ اردو زبان میں عمدہ ناولوں کی تعداد نہایت ہی کم ہے اس لئے ادارہ کو اردو کے اس جزو کی جانب بھی خاص توجہ اور ناول نویسی کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ پیش کردہ تحریک پر ہر پہلو سے کافی بحث کی گئی اور بالاتفاق طے پایا کہ ایک ذیلی مجلس مقرر کی جائے جو اس مسئلہ اور ان وسائل پر جو ناول نویسی کی ہمت افزائی کا باعث ہو سکتے ہیں مثلاً انعام وغیرہ غور کرے گی اور آیندہ اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ اس ذیلی مجلس کے اراکین حسب ذیل ہوں گے۔

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب سروری، مولوی سید محمد صاحب، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری، مولوی قاضی عبدالغفار صاحب اس ذیلی مجلس کے داعی ہوں گے۔

ف ۳ ۔ رکن مجلس ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کا مرسلہ خط مورخہ ۱۶ اسر جولائی ۱۹۴۱ء مجلس کے روبرو پیش کیا گیا۔ متن خط کے پیش نظر بالاتفاق طے پایا کہ چونکہ یہ خط ادارہ سے متعلق ہے اس لئے اس کو معتمد صاحب ادارہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ نیز طے پایا کہ آیندہ سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو شعبۂ زبان کے جلسوں کے انعقاد کی اطلاع نہ دی جائے۔

ف ۴ ۔ معتمد صاحب عمومی کی تحریک کہ شعبۂ زبان اردو انسائیکلو پیڈیا میں غیر زبانوں کے الفاظ کے لئے صحیح اعراب کے تعین میں مدد کرے منظور کی گئی۔ اور شعبۂ انسائیکلو پیڈیا سے خواہش کی گئی کہ وہ ایسے الفاظ کی فہرستیں روانہ کرے جن کو اردو حروف میں لکھنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔

ف ۵ ۔ صحافتی اصطلاحات کی تدوین کے لئے جو ذیلی کمیٹی کام کر رہی تھی اس کے احیا کی تجویز منظور ہوئی۔

شعبۂ تاریخ دکن

شعبۂ تاریخ دکن کا معمولی جلسہ ۲۹ امرداد ۱۳۵۰ف م ۴ر جولائی ۱۹۴۱ء جمعہ کو ادارہ ادبیات اردو میں منعقد ہوا۔ اس میں حسب ذیل اراکین شریک تھے۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، خواجہ محمد احمد صاحب، میر محمود علی صاحب، عبدالمجید صدیقی۔ اس وقت شعبہ میں مختلف مولفوں کے مسودات تاریخ موجود ہیں جو اشاعت کے طالب ہیں۔ یہ سب مسودے اراکین شعبہ کی رائے کے لئے پیش کئے گئے۔ مراد علی صاحب طالع کے مسودات کے متعلق قرار پایا کہ فی الحال امرائے پائیگاہ کا مسودہ ملتوی رکھا جائے۔ دوسرے مسودے سلاطین آصفیہ پر ہیں انکے متعلق مولوی خواجہ محمد احمد صاحب، محمود علی صاحب اور داعی شعبہ کی رائے حاصل کی جائے۔ اگر وہ ان اصحاب کی رائے میں اشاعت کے قابل ہیں تو ان کی اشاعت کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ظفر الدولہ پر ایک کتاب مولفہ عبدالقادر صاحب کا مسودہ بھی پیش ہوا ایک کے متعلق اراکین کی رائے یہ ہے کہ فی الحال ملتوی رکھا جائے۔ کہ مسجد کے مسودہ کے متعلق جو رہبر فاروقی صاحب کا مولفہ ہے قرار پایا کہ وہ قابل اشاعت ہے۔ اس کی اشاعت کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد زاہد صاحب حیدرآبادی کے مسودے بھی پیش ہوئے جو قلعہ معلیٰ، سکندہ وغیرہ ہیں۔ ان کے متعلق یہ طے ہوا کہ یہ مسودے شعبۂ تاریخ دکن کے فرائض سے خارج ہیں۔ ان کو کسی دوسرے شعبے کے سپرد کرنا چاہیئے۔

تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ادارہ کی کوششیں

ادارۂ ادبیات اردو نے

اپنے دیگر علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ تعلیم بالغان کی طرف بھی گزشتہ تین سال سے اپنی توجہ مبذول کی ہے اور اردو کا ذوق عام کرنے کی خاطر امتحانات کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ گزشتہ سال یعنی ۱۹۴۰ء میں ان امتحانات میں ۲۰۵ امیدوار شریک ہوئے تھے اور اس سال یعنی ۱۹۴۱ء میں ۶۲۰ امیدوار شریک ہوئے ہیں گویا ایک ہی سال میں ۳۶۹ امیدواروں کا اضافہ ہوا۔

خوشی کی بات ہے کہ خواتین میں بھی اردو کا ذوق بڑھتا جارہا ہے چنانچہ گزشتہ سال صرف ۳۴ عورتیں ان امتحانوں میں شریک ہوئی تھیں اور امسال ۱۱۳ کے اضافہ کے ساتھ جملہ ۱۴۷ خواتین شریک ہیں۔

اسی طرح غیر مسلم اصحاب میں بھی اردو سیکھنے اور اردو ادب کا ذوق پیدا کرنے میں ادارہ نے ایک اچھی کامیابی حاصل کی ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال ۵۲ غیر مسلم امیدوار اردو امتحانات میں شریک تھے اور اس سال ۹۳ شریک ہیں۔ یعنے ایک سال میں ۴۱ کا اضافہ ہوا ــــــ

ادارہ اور اس کے معاونین کی کوششوں سے گزشتہ سال ۱۶۵۰ ان پڑھ لوگوں نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا تھا اور اس سال ۴۲۵۰ افراد کو خواندہ بنایا گیا۔ اس تعداد میں ۲۰۵ عورتیں اور ۲۱۰ غیر مسلم افراد شامل ہیں۔

آخر میں ادارہ اپنے حسب ذیل معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ جنھوں نے مختلف مقامات پر اردو کی تعلیم اور اردو ادب کا ذوق عام کرنے میں خاموشی کے ساتھ ادارہ کا ہاتھ بٹایا۔ اور متوقع ہے کہ آیندہ سال ان معاونین کے علاوہ دوسرے اصحاب بھی اس نیک اور مفید کام میں ادارہ کی مدد کریں گے۔ ذیل کے سترہ مقامات کے صاحب ایثار خادمان اردو کی مثال یقین ہے کہ آیندہ سال دیگر بیسیوں مقامات کے اہل ذوق اصحاب کو سرگرم عمل بنا دے گی۔

۱۔ حیدرآباد:۔ رابعہ بیگم صاحبہ، بلقیس بانو صاحبہ، سید محمد صاحب، مظہرالدین صاحب قریشی، کلیم اللہ حسینی صاحب۔

کاماریڈی:۔ احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری، اور نرساگوڑ صاحب

۳۔ پربینڈہ:۔ محمد یونس صاحب پیش امام۔

۴۔ خانہ پور:۔ ابوسعد سید اسمعیل صاحب شورا پوری، عبدالکریم احمد صاحب مہتمم جنگلات، ڈاکٹر محمد خلیل، سید محی الدین صاحب، شمس الدین خاں صاحب، حکیم کامل فاروق خاں صاحب، عبدالرشید خاں صاحب، مہرالنساء صاحبہ،

۵۔ گلبرگہ:۔ محمود حسین صاحب، نصیرالدین صاحب، نیاز علی خاں صاحب نیاز

۶۔ کلیانی:۔ عطاء اللہ صاحب عطاؔ، احمد حسین صاحب تعلقدار، غلام معین الدین صاحب، عبدالکریم صاحب، تاج الدین صاحب۔

۷۔ پرلی:۔ غلام حسین صدیقی صاحب۔ اشرف الدین صاحب فیضی

۸۔ کشتگی:۔ قاضی محمد حسین صاحب بی، اے، بلونت راؤ گھاٹے صاحب

۹۔ ہنم ساگر:۔ محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری۔

۱۰۔ کیتل:۔ محمد حسین صاحب، سرفراز علی صاحب۔

۱۱۔ نرسی:۔ قاضی یوسف الدین صاحب فاروقی۔

۱۲۔ پربھنی:۔ حمید اللہ خاں صاحب شیداؔ، عارف الدین حسن صاحب

۱۳۔ چمپا پیٹھ:۔ داؤد خاں صاحب۔

۱۴۔ اندولہ:۔ سید علی صاحب رضوی۔

۱۵۔ گدوال:۔ شیخ احمد صاحب، محمد دولت صاحب، عبدالبصیر صاحب۔

۱۶۔ لنگسگور:۔ جڑ بیا گوڑا صاحب، چنن گوڑا صاحب۔

۱۷۔ ناگرکرنول:۔ حکیم شیخ منصور علی صاحب وکیل۔

اردو امتحانات "اردو فاضل" امتحانات کے ہال ٹکٹ اور مرکز

اردو عالم، اردو دانی اور خوشنویسی کے ہال ٹکٹ اجرا ہوچکے ہیں۔ بلدہ کے امیدوار اپنے ہال ٹکٹ دفتر ادارہ سے بہ اوقات صبح ۹ تا ۵ ساعت شام حاصل کرسکتے ہیں۔ امسال امتحانات حسب ذیل مرکزوں میں ۱۵، ۱۶، ۱۷ اردی بہشت ۱۳۵۰ف کو منعقد ہوں گے۔ بلدہ، کلیانی، پربھنی، گلبرگہ، کشتگی کاماریڈی، خانہ پور، نرسی، پرلی، پربینڈہ، کیتل۔

ہر مرکز میں خواتین کے لئے علحدہ انتظام کیا گیا ہے۔"

وقت نامۂ امتحانات

اردو دانی

۱۵ ار مہر پنجشنبہ ۔ ۱۰ تا ½۱۲ تحریری امتحان ۔ ۲ تا ۵ زبانی امتحان ۔

اردو عالم

۱۵ ار مہر پنجشنبہ ۔ ۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نثر و قواعد) ۲ تا ۵ دوسرا پرچہ (نظم و عروض)

۱۶ ار مہر جمعہ ½۹ تا ½۱۲ پانچواں پرچہ (خوشنویسی) ½۲ تا ½۵ پانچواں پرچہ (دفتری معلومات امور خانہ داری ٹائپ وغیرہ)

۱۷ ار مہر شنبہ ۱۰ تا ۱ تیسرا پرچہ (تاریخ ادب و مضمون نگاری) ۲ تا ۵ چوتھا پرچہ (عام معلومات)

اردو فاضل

۱۵ ار مہر پنجشنبہ ۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نثر) ۲ تا ۵ دوسرا پرچہ (نظم)

۱۶ ار مہر جمعہ ½۹ تا ½۱۲ تیسرا پرچہ (تاریخ ادب و تنقید) ½۲ تا ½۵ چوتھا پرچہ (عام معلومات)

۱۷ ار مہر شنبہ ۱۰ تا ۱ ۔ پانچواں پرچہ (مصنف کا مطالعہ) ۲ تا ۵ چھٹا پرچہ (مضمون نگاری)

خوشنویسی

۱۶ ار مہر جمعہ ½۹ تا ½۱۲ .... (ایک ہی پرچہ)

نوٹ :۔ (۱) جملہ امیدواروں کو چاہئیے کہ امتحان گاہ میں اجازت نامۂ شرکت اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

(۲) خوشنویسی کے امیدوار واسطی قلم اور سیاہ روشنائی اور دیگر امیدوار صرف نِبّی کے قلم اپنے ساتھ لائیں۔

(۳) دواتیں اور نیلی روشنائی اور جوابی بیاضیں امتحان گاہ میں ادارہ کی طرف سے مہیا کی جائیں گی۔

ادارہ کی شاخیں

ادارہ کی شاخیں بھی برابر سرگرم عمل ہیں۔ ان میں خاص طور پر کلیانی، پربھنی اور خانہ پور کی شاخیں روز افزوں ترقی کر رہی ہیں۔

شاخ کلیانی

شاخ کلیانی مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار اسسٹنٹ کلیانی کی صدارت میں کافی سرسبز اور بار آور ہوتی جا رہی ہے۔ آپ اردو کی ترقی کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ مولوی سید سبط نبی صاحب بی اے۔ یل یل بی منصف عدالت کلیانی اور مولوی محمد ریاست علی صاحب منتظم پولیس۔ جناب تحصیلدار صاحب و مسٹر وامن راؤ پیشکار وغیرہ اور دیگر عہدہ داران کلیانی بھی مستحق تشکر ہیں۔ جن کی امداد اور ہمدردی شاخ کے شامل حال ہے۔

آج کل شاخ کی مصروفیات امیدواران امتحان کی تعلیم پر مرکوز ہیں۔ مولوی غلام معین الدین صاحب معین رکن تشہیر۔ مولوی نیر الدین صاحب منتظم دار المطالعہ ۔ شیخ صالح صاحب صبح و شیخ مہتاب صاحب اور معتمد شاخ امیدواروں کی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔

شعبۂ طلبہ کلیانی

شعبۂ طلبا کی سرگرمیاں برابر جاری ہیں۔ اراکین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جن کی تعداد (۲۵) کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اس کے صدر مولوی مرزا محمد بیگ صاحب مرزا اور نائب صدر مولوی میر نذیر الدین صاحب نذیر مقرر ہوئے ہیں۔ اس کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ہر مہینہ میں دو بار کسی ایک عنوان پر تقریریں کی جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک حب وطن، ہمدردی اور علم پر تقریریں ہو چکی ہیں۔ آئندہ کے لئے اتفاق اور دولت کے عنوانات تجویز کئے گئے ہیں۔ تقاریر میں طلبہ خاصی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ برابر جاری رہا تو کچھ عرصہ میں اکثر طلبہ تقریر کرنے پر قادر ہو جائیں گے۔

تباریخ ۱۲ ار شہریور ۱۳۵۰ف شعبۂ طلبہ کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں شہاب الدین صاحب، آلِ حسن صاحب، وینکٹ راؤ صاحب [illegible] شعبۂ طلبا و منظور احمد صاحب معتمد شعبۂ طلبا اور انوار اللہ صاحب و عظمت صاحب اور مسٹر ترل راؤ مددگار صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ و مولوی مرزا

محمد بیگ صاحب صدر شعبۂ طلبا نے اتفاق پر تقریریں کیں جلسہ کامیاب رہا۔

شعبۂ طلبہ گلبرگہ اس ماہ حسب ذیل طلباء نے شعبۂ طلباء کی رکنیت قبول کی۔

سید حسن سجاد رزاقی۔ حبیب الرحمن۔ حامد بن احمد۔ فاروق حسین۔ یوسف حسین۔ بدیع الدین۔ منہاج الدین۔ عبدالحمید۔ عبدالغنی۔ عبداللطیف۔ محمد حسن مسعود۔ امین الدین۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

ترتیب کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس اثناء میں دوسرے مضامین کی بھی کمیٹیاں اپنے متعدد اجلاس منعقد کر چکی ہیں۔

شعبۂ تاریخ اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبۂ تاریخ کا پہلا اجلاس پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی صدارت میں بروز جمعہ ۲۹ امرداد ۱۳۵۰ف شام کے چار بجے منعقد ہوا۔

حاضرین:۔

مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب (۲) مولوی خواجہ محمد احمد صاحب (۳) مولوی میر محمود علی صاحب (۴) مولوی خواجہ خیرالدین صاحب (۵) مولوی بشیرالدین صاحب (۶) مولوی [illegible] صدیقی صاحب (۷) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ۔

۱۔ طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا میں مضامین تاریخ کی تکمیل کے لئے حسب تفصیل ذیل کام کو تقسیم کیا جائے۔

1 تاریخ دکن۔ — پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب۔ (اور بطور خاص عہد قدیم کے لئے) مولوی خواجہ محمد احمد صاحب۔

2 تاریخ ہند (معہ سیلون) — ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ صاحب ٹوپا۔ مولوی میر محمود علی صاحب

۳۔ افغانستان۔ ترکستان و وسط ایشیا۔ ایران۔ — ڈاکٹر قاری کلیم اللہ صاحب۔ مولوی سید یوسف صاحب۔ مولوی ابو نصر خالدی صاحب

۴۔ عراق۔ شام۔ فلسطین۔ عرب۔ (حصا، حجاز۔ یمن۔ نجد۔ حضرموت) ایشیائے کوچک۔ ارمنستان۔ (افریقہ میں) مصر و شمالی افریقہ — مولوی جمیل الرحمن صاحب۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ مولوی محمد غوث صاحب

۵۔ تبت۔ منچوریا۔ منگولیا۔ کوریا۔ چین جاپان۔ ایشیائی روس۔ سیام (یا تھائی لینڈ) فرانسیسی ہند چینی (کمبوج، ٹانکنگ۔ لاوس، انام) ملایا اور ریاستیں۔ جزائر شرق الہند (جاوا اور سماترا وغیرہ)۔ — پروفیسر ہارون خاں صاحب۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب

۶۔ انگلستان۔ — مولوی خواجہ خیرالدین صاحب۔ مولوی سراج الدین احمد صاحب

۷۔ فرانس۔ اسپین و پرتگال (بعد زوال غرناطہ) جرمنی و اسٹریا (معہ مقدس سلطنت روما) اٹلی (معہ سلطنت روما)۔ سوئستان شمالی یورپ۔ جزیرہ نمائے بلقان معہ یونان۔ سلطنت عثمانیہ و جمہوریہ ترکیہ۔ روس۔ جزائر بحر روم۔ (افریقہ میں) وسطی افریقہ۔ جنوبی افریقہ۔ اسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ۔ — نواب علی یاور جنگ بہادر۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب۔ مولوی خواجہ خیرالدین صاحب

۸۔ برِ اعظم امریکہ۔ — مولوی میر محمود علی صاحب۔ مولوی آغا محمد حسین صاحب۔ مولوی خواجہ خیرالدین صاحب

۹. سیاسیات { پروفیسر ہارون خاں صاحب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

۲. جن اصحاب کے نام خط کشیدہ ہیں وہ داعی ہیں اور ان کے پاس ان اصولوں کی ایک ایک نقل روانہ کرنے کا تصفیہ کیا گیا جو اردو انسائیکلوپیڈیا کے حجم اور معلومات کے معیار سے متعلق صدر مجلس میں طے ہوئے ہیں تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر فہرستوں اور مضمونوں کو مرتب کیا جائے۔

۳. طے پایا کہ ختم شہریور تک جملہ مضمونوں کی فہرستیں تیار کر کے اس مجلس کے سامنے پیش کی جائیں۔

۴. طے پایا کہ آئندہ اجلاس ۲ر مہر بروز جمعہ شام کے چار بجے منعقد کیا جائے۔

(ان تصفیوں کے مطابق کام جاری ہے اور تاریخ کی ذیلی مجلسوں کے کئی اجلاس اس اثنا میں منعقد ہو چکے ہیں۔)

شعبۂ اسلامیات

شعبۂ اسلامیات کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولانا سید مناظر الحسن صاحب گیلانی بروز سہ شنبہ ۲۶ر جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ م ۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۴۱ء دفتر ادارہ میں شام کے پانچ بجے منعقد ہوا۔

حاضرین:-

(۱) مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔
(۲) مولوی عبد الباری صاحب ندوی۔
(۳) ڈاکٹر زاہد علی صاحب۔
(۴) مولوی حسام الدین صاحب فاضل۔
(۵) مولوی احمد اللہ صاحب ندوی۔
(۶) مولوی عبد القادر صاحب صدیقی۔
(۷) ڈاکٹر قاری قطب الدین صاحب۔
(۸) مولوی عبد القادر صاحب سروری۔
(۹) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور
(۱۰) مولوی فیض محمد صاحب صدیقی معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

مولوی سید ہاشمی صاحب ندوی۔ مولوی عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی۔ مولوی سید ابراہیم صاحب اور ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

معتمد صاحب انسائیکلوپیڈیا نے وہ تمام فہرستیں اور انڈکس کارڈز پیش کئے جو علوم اسلامی سے متعلق اس وقت تک ادارے کی طرف سے مولوی عبد القادر صدیقی اور ابو الفضل صاحب ایم اے نے مرتب کئے تھے اور جن پر مولانا عبد الماجد دریابادی اور پروفیسر جمیل الرحمن صاحب نے نظر ثانی کی تھی۔

طے پایا کہ ان کارڈز کو چار سرخیوں کے تحت علیحدہ کیا جائے اور پھر ہر سرخی کے تحت جتنے کارڈز جمع ہوں ان کی فہرستیں حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کر کے مختلف ماہرین کے یہاں بغرض رائے و تقسیم کار روانہ کی جائیں۔

اسی وقت ایک ایک کارڈ کے اندراجات پڑھ کر سنائے گئے اور حسب ذیل چار سرخیوں کے تحت ان کو تقسیم کیا گیا۔

(۱) نقلیات (۲) عقلیات (۳) تاریخیات (۴) ادبیات۔

طے پایا کہ ان چاروں موضوعوں کے تحت چار ذیلی مجلسیں بنائی جائیں۔ ان مجلسوں میں جن اصحاب کو شریک رکھا جائے گا ان کے متعلق بعد میں غور کیا جائے گا فی الحال حسب ذیل نام منتخب کئے گئے۔

نقلیات۔ مولانا مناظر احسن صاحب۔ مولوی حسام الدین صاحب فاضل۔
مولوی احمد اللہ صاحب ندوی۔

عقلیات۔ مولوی عبد الباری صاحب ندوی۔ مولوی عبد القادر صدیقی صاحب۔

تاریخیات۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب۔ پروفیسر جمیل الرحمن صاحب۔

ادبیات۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب۔ ڈاکٹر زاہد علی صاحب۔ ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب

شعبۂ نسائیات

شعبۂ نسائیات کا پہلا اجلاس بروز جمعہ ۱۲ شہریور ۱۳۵۶ف شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین:-

(۱) محترمہ مسز ڈاکٹر جبار۔
(۲) " مس جیسی نندی صاحبہ
(۳) " مسز باقر علی خاں۔
(۴) " مس خورشید ویکاجی۔
(۵) " بلقیس بانو صاحبہ۔
(۶) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔
(۷) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔
(۸) نفیس محمد صدیقی معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

مسز میر حسن صاحب نے بذریعۂ ٹیلیفون شرکت سے معذرت چاہی۔

۱۔ طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا میں مضامین نسائیات کی تکمیل کے لئے ذیل کی تفصیل کے مطابق کام کو تقسیم کیا جائے۔

(۱) سوزن کاری۔ کارچوب اور کشیدہ کاری وغیرہ — محترمہ نفیس بانو صاحبہ۔
(۲) بچوں کی نگہداشت
(۳) امور خانہ داری } محترمہ مسز باقر علی خاں
(۴) پکوان (نمکین اور شیریں) — محترمہ مسز ڈاکٹر جبار
(۵) اشیائے خانہ داری — محترمہ مس خورشید ویکاجی
(۶) لباس
(۷) زیورات } مولوی آغا حیدر حسن صاحب
(۸) گھر کی آرائش — محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ
(۹) کھلونے
(۱۰) بچوں کے کھیل } محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ
(۱۱) رسم و رواج — مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
(۱۲) مشہور عورتیں
(۱۳) نسوانی تحریکات } محترمہ مس جیسی نندی صاحبہ
(۱۴) سنگار اور بال بنانا — محترمہ مس پدمجا نائیڈو

۲۔ طے پایا کہ یہ خواتین و اصحاب اپنے مفوضہ مضمون یا ذیلی شعبہ کے ذمہ دار رہیں گے اور اپنے کام میں حسب ضرورت دوسری خواتین و اصحاب سے مدد لیں گے۔

۳۔ طے پایا کہ سب سے پہلے ہر مندرجہ بالا عنوان سے متعلقہ اسماء و اصطلاحات کی فہرستیں تیار کرلی جائیں۔ اور پھر ان کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے کر پہلے انہی اسماء یا اصطلاحات پر نوٹ لکھے جائیں جو الف سے شروع ہوتے ہیں۔ ان کے بعد دوسرے حروف سے شروع ہونے والے الفاظ پر ترتیب وار کام کیا جائے۔

۴۔ طے پایا کہ مضمونوں اور مواد کے انتخاب میں ہندستان کے جملہ مذاہب اور تمدن کی نمائندگی کا خیال رکھا جائے۔

۵۔ طے پایا کہ ہندستانی امور پر بمقابلہ دیگر ممالک کے زیادہ شرح و بسط سے لکھا جائے۔

۶۔ حسب ذیل خواتین سے بھی استدعا کی جائے وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ نسائیات سے متعلقہ مضامین کی ترتیب میں تعاون کریں اور ادارہ کو مطلع فرمائیں کہ ان کو کس موضوع سے دلچسپی ہے۔

(۱) محترمہ مس زبیدہ یزدانی (باغ تاریخ)
(۲) " مس جلین (ناملی ہائی اسکول)
(۳) " مس سباراؤ (زنانہ کالج)
(۴) " بشیر النساء بیگم صاحبہ (ناملی ہائی اسکول)
(۵) " ڈاکٹر شری کھنڈے (زنانہ ہاسپٹل)
(۶) " مسز ڈاکٹر مقبول علی
(۷) " مسز میر حسن
(۸) " مسز نواب علی (زنانہ کالج)

(۹) محترمہ مسز علمبردار (جوبلی ہل)

(۱۰) " مسز چیانگ (چراغ علی گلی)

(۱۱) " جعفری بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)

(۱۲) " مسز امیر حسن (جوبلی ہل)

(۱۳) " جہاں بانو بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)

(۱۴) " محمدی بیگم مسز جمیل حسن جوبلی ہل

۷۔ طے پایا کہ آئندہ اجلاس مہر کے پہلے ہفتے میں مقرر کیا جائے۔ اور شہریور کے ختم تک جملہ خواتین و اصحاب اپنا اپنا مفوضہ کام مکمل کرکے ادارہ کے دفتر کو روانہ فرمادیں۔

شعبۂ تعلیمات

تعلیمیات سے متعلق مضامین کے اندراج کے لئے ملک کے مشہور ماہر تعلیم مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے (کیمبرج) اسی ٹی (لندن) کے حسب ایما اس طرح کام کو تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ مولوی میر احمد علی خاں صاحب — تاریخ۔ مسائل تعلیم۔ نظم ونسق تعلیم۔

۲۔ " ملک سردار علی صاحب — فلسفہ تعلیم۔ تعلیمی نفسیات۔

۳۔ " ملا فخر الحسن صاحب — تاریخ تعلیم۔ طریقہ تعلیم اردو۔ بیسک ہندستانی

۴۔ " عبدالعزیز صاحب — طریقۂ تعلیم حساب، ریاضی۔ نفسیات اطفال۔

۵۔ " ریاض الدین خاں صاحب — طریقۂ تعلیم جغرافیہ و تاریخ۔ اردو ادب۔

۶۔ " عبدالرحمن مہاجر صاحب — طریقۂ تعلیم سائنس و ریاضی۔ یورپی نظامات تعلیم

۷۔ " خواجہ یوسف الدین صاحب — طریقۂ تعلیم انگریزی۔ انگریزی ادب متعلقہ اطفال۔ بیسک انگلش۔ (مولوی خیرات علی صاحب زیدی مددگار فوقانیہ میدک)۔

۸۔ " فاروق حسین صاحب — ورزش جسمانی۔ حفظ صحت مدرسہ۔

۹۔ جناب جگ موہن لال صاحب — تعلیم مطالعہ قدرت و باغبانی۔ سائنس۔

۱۰۔ مولوی شیخ سمیع اللہ صاحب — تعلیم دستی۔ ڈرائنگ۔ پینٹنگ۔

۱۱۔ مولوی عبدالقادر بیگ صاحب — تعلیم دست کاری۔

۱۲۔ " شیخ حسین صاحب — خطاطی۔ (بنیادی یا بیسک رسم خط۔

۱۳۔ " حبیب احمد فاروقی صاحب — تجرباتی تعلیم۔ وپیشہ نمائی۔

۱۴۔ جناب ویدانتاچاری صاحب — جدید امتحانات۔

شعبۂ جغرافیہ

دوسرا اجلاس زیر صدارت مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب پنجشنبہ ۲۵ شہریور ۵۰ ف کو صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہوا۔

(۱) مولوی غلام قادر صاحب

(۲) " عبدالستار صاحب سجانی

(۳) " عبدالجبار صاحب سجانی

(۴) مسٹر قاسم علی سجن لال صاحب

(۵) مسٹر گنیش چند صاحب

(۶) مولوی محمد یوسف صاحب

(۷) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

(۸) سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا

۱۔ مولوی عبدالوکیل صاحب کی مرسلہ فہرست ریاضیاتی جغرافیہ پڑھ کر سنائی گئی۔ جس کی نسبت متفقہ طور پر خیال کیا گیا کہ یہ مبسوط اور مکمل ہے۔ یہ رائے ظاہر کی گئی کہ اس موضوع پر پانچ مستقل اور بڑے مقالے لکھے جائیں جن کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) نظام شمسی (۲) زمین (۳) آفتاب (۴) چاند (۵) سیارے

اور باقی الفاظ پر ذیلی طور پر چند جملے یا چند سطریں کافی ہوں گی۔ جو اسماء کہ علم ہیئت سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نسبت مولوی عبدالوکیل صاحب سے خواہش کی جائے کہ وہ صرف جغرافیہ کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ان پر مقالہ یا نوٹ لکھیں۔ صاحب موصوف سے یہ بھی دریافت کرنا طے پایا کہ آیا انھیں مذکورۂ بالا نقطۂ نظر پسند ہے یا وہ خود اس بارے میں کچھ اپنا خیال پیش کریں گے۔

۲۔ مولوی عبدالجبار صاحب سبحانی کی فہرست سمندر اور اس کے متعلقات پڑھ کر سنائی گئی۔ طے پایا کہ وہ الف سے شروع ہونے والے الفاظ پر نوٹ مرتب کرنا شروع کردیں۔ اس کے علاوہ سمندروں کی ساخت اور ان کی سیاسی و معاشی اہمیت سے متعلق بھی۔ عنوانات کا اپنی فہرست میں اضافہ کریں۔

۳۔ گزشتہ اجلاس میں کرۂ ہوا سے متعلق کام کسی کے تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ طے پایا کہ مولوی عبدالجبار صاحب کے سپرد یہ کام کیا جائے اور وہ اس سے متعلقہ الفاظ اور اصطلاحی کی فہرست مرتب کریں اور نوٹ لکھیں۔

۴۔ مولوی محمد یوسف صاحب کی فہرست اسٹریلیا سے متعلق سنائی گئی۔ مجلس کا خیال ہے کہ یہ کافی تفصیلی اور مناسب ہے۔ اسٹریلیا پر صاحب موصوف نے اپنا لکھا ہوا نمونہ کا مضمون سنایا جو ابھی نامکمل ہے۔ طے پایا کہ اس کو اسی طرح کمل کرلیا جائے۔

۵۔ مسٹر گنیش چند صاحب نے اپنی فہرست افریقہ سے متعلق سنائی اور افریقہ پر اپنا لکھا ہوا نمونہ کا مضمون بھی سنایا۔ یہ بھی زیر تکمیل ہے۔ طے پایا کہ یکسانیت کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کو نمونہ بنایا جائے۔

۶۔ مولوی غلام قادر صاحب اور مولوی عبدالغفور صاحب کی مرتب کردہ فہرست دنیا کی خطہ واری تقسیم سنائی گئی۔ اور فی الوقت استوائی خطہ پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا۔

۷۔ مسٹر قاسم علی سجن لال اور مولوی عشرت علی خاں صاحب نے فہرست پیش نہیں کی لیکن اول الذکر نے بیان کیا کہ یہ کام مکمل ہوچکا ہے۔ قاسم علی صاحب نے اپنے ذمہ یورپ اور برطانیہ کا علاقہ لیا ہے اور عشرت علی خاں صاحب کے تفویض ایشیا کیا گیا ہے۔

۸۔ پروفیسر ظہیر حسن صاحب (پٹنہ) کا خط پڑھ کر سنایا گیا۔ طے پایا کہ خطیب عبداللطیف صاحب کو کمرشیل جغرافیہ کی فہرست مرتب کرنے کے لئے لکھا جائے۔ اور بعد میں یہ فہرست ظہیر حسن صاحب کے یہاں نوٹ مرتب کرنے کے لئے بھیجی جائے۔

۹۔ طے پایا کہ مضامین میں نقشوں اور تصویروں کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔ اور مقالہ نگاروں سے استدعا کی جائے کہ وہ اپنے مضمون میں ان کی جگہ اور سائز وغیرہ کی نسبت ضروری اندراجات واضح کریں۔

ادارہ

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی، ایس، سی

جلد (۴) بابت ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء شمارہ (۹)

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

ٹیگور ——— فانی

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوش نوا ؎ شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑگیا (اقبال)

ٹیگور اسی سال چند ہی مہینے پہلے ڈاکٹر ٹیگور کا اسّی سالہ جشن سالگرہ منایا گیا اور کسی کو کیا خبر تھی کہ سالگرہ کی یہ تقریب آخری ہوگی اور اس کے بعد صف ماتم بچھانی پڑے گی۔ اگست ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں وہ علیل ہوئے اور روز بروز حالت بد سے بدتر ہی ہوتی گئی۔ ۷ اگست کی صبح اکیس کن تھی۔ ساڑھے دس بجے کے بعد سے وہ موت سے قریب تر ہوتے گئے اور دوپہر میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔

رابندرناتھ ٹیگور ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ٹیگور نے اپنی شاعری کی ابتدا آٹھ سال کی عمر سے کی۔ واقعہ یہ مشہور ہے کہ ان کے پھوپھی زاد بھائی "جیوتی" نے ان سے شعر کہنے کی فرمایش کی۔ پہلی دفعہ یہ غیر متوقع فرمایش ٹیگور کے لئے حیرانی کا باعث ہوئی لیکن انھوں نے جب اس کی تکمیل کی کوشش کی تو انھیں خود شاعری سے فطری لگاؤ محسوس ہونے لگا۔

پہلی دفعہ ٹیگور کی نظم "گیانانکر" نامی ایک ماہوار رسالے نے شایع کی اور پہلی کتاب ایک طویل نظم کی شکل میں "کویکاپنی" (شاعر کی کہانی) کے عنوان سے شایع ہوئی۔ اس کے بعد سے ان کی تصانیف کا سلسلہ قایم ہوگیا۔ انگلستان کے پہلے سفر میں مغربی تنقید اور مغربی خیالات سے وہ مستفید ہوچکے تھے لیکن مشرقیت کا رنگ ان پر اتنا چھایا ہوا تھا کہ نظم، نثر، افسانوں اور ڈراموں میں وہ ایک مشرقی مفکر ہی نظر آتے ہیں۔

"گیتان جلی" انھوں نے جس وقت شایع کی ان کی ادبی زندگی کا ایک دور ختم ہوچکا تھا لیکن شاعر کو یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ بنگالی زبان میں تو ابھی پہلا اڈیشن ختم نہ ہوا تھا اور انگریزی ترجمے کے کئی اڈیشن انگریزی سمجھنے والے ملکوں میں ختم ہوچکے تھے۔ انگلستان کے بڑے بڑے نقاد اور بڑے بڑے شاعر نظموں کے اس مجموعہ میں ایک نئی دنیا پاتے تھے۔ شہرت اور مقبولیت کی انتہا یہ ہوئی کہ ۱۹۱۳ء میں ٹیگور کو "نوبل پرائز" دیا گیا۔ آج تو خیر ہندوستانی نوبل پرائز سے واقف ہوچکے ہیں، ہندوستانیوں کو یہ انعام دوبارہ مل بھی چکا ہے اور آیندہ وہ اس کے دعویدار بھی ہیں لیکن ۱۹۱۳ء میں یہ انعام نہ صرف ہندوستان کی عظیم الشان کامیابی تھی بلکہ سارے مشرق کیلئے طرۂ امتیاز تھا۔

ٹیگور کی موت نے وہ آواز بند کردی جسکی صدائے بازگشت دنیا کے ہر متمدن گوشے میں سنائی دیتی تھی اور وہ طرۂ امتیاز چھین لیا جسکے آگے مغربی مفکر بھی اپنی پرغرور گردنیں نیچی کرتے تھے۔

فانی ٹیگور کے انتقال کے ٹھیک بیس دن بعد یعنی ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کی شام میں فانی بدایونی بھی دار فانی سے دار بقا کیطرف کوچ کر گئے۔ کم و بیش انھوں نے ساٹھ سال کی عمر پائی تھی۔ یوں تو انکی صحت ایک عرصہ دراز سے خراب تھی لیکن پچھلے چند دنوں سے مرض کی شدت اور عام جسمانی کمزوری نے انھیں صاحب فراش کر رکھا تھا۔

شوکت علی خاں فانی نے جب شاعری شروع کی تو عام طور پر لوگ غزل سے اکتا کر نظم کیطرف مائل ہو رہے تھے لیکن انھوں نے اپنی طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے غزل ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور نہ صرف آخر عمر تک اپنی روش پر کاربند رہے بلکہ اپنے لئے ایک طرز خاص بھی نکال لی۔ ان کے معاصرین میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی مرحوم، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی نے خاص طور پر قبولیت عام حاصل کی۔ حسرت موہانی کی غزلوں میں متوسطین کا رنگ پختہ نظر آتا ہے، اصغر مرحوم کے رنگ تغزل میں عرفانی رنگ زیادہ تھا، جگر میں ایک بانکپن ہے اور جوش غزل سے زیادہ نظم کیطرف مائل ہوگئے۔ فانی اپنے ان معاصرین میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔ حزن و ملال جو غزل کو موثر بنانے کے بہترین ذرایع ہیں فانی کے کلام کے خاص اجزا ہیں۔ اس کے سوا زندگی کے فلسفہ پر فانی نے متعدد زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ غالب کا ظاہری اسلوب جسمیں فارسی کی چست بندشیں اور معنی آفریں ترکیبیں شامل ہیں، اور میر کا داخلی رنگ جسمیں آہوں کا اثر زیادہ نظر آتا ہے، فانی کے ہاں کچھ اس توازن کے ساتھ سموئے گئے ہیں کہ ایک خاص رنگ پیدا ہوگیا جو فانی کا اپنا کہا جا سکتا ہے۔

فانی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے لئے موزوں طرز کا انتخاب کیا تھا اور اسپر مستقل مزاجی کے ساتھ عمر بھر طبع آزمائی کرتے رہے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رنگ آئے دن مشق سے پختہ اور پختہ تر ہوتا گیا۔

ادارہ

امیر مینائی

حضرت امیر مینائی کے ساتھ، ارباب ذوق اور اہلِ نقد ونظر نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ فصیح الملک حضرت داغ کی شاعرانہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ "امیر مینائی کے یہاں لکھنو کی نزاکتوں اور صنعتوں کے سوا کوئی اوریجنیلٹی نہیں پائی جاتی اور جہاں امیر نے داغ کا اتباع کیا ہے، وہاں ٹھوکر کھائی ہے۔"

میں بھی بہت دن تک اسی پروپیگنڈے اور افسوسناک مفروضہ کا شکار رہا، اتفاق کی بات کہ ایک دن مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مقالہ میں، مندرجۂ ذیل شعر میری نظر سے گزرا:۔

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

میں نے کتاب بند کردی اور بہت دیر تک اس شعر کو گنگناتا رہا، بعض احباب سے بھی اس شعر کا ذکر کیا، سب نے داد دی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ "تیر" امیر مینائی کے ترکش کا ہے۔ حیرت ہوئی کہ امیر مینائی بھی ایسا شعر کہہ سکتے ہیں؟ اس کے بعد حضرت امیر کا کلام پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، ایک دوست کی عنایت سے، امیر کے حالات، منتخب کلام کے ساتھ مل گئے! کلام پڑھا اور بار بار پڑھا، وجدان اور روح نے لذت حاصل کی، بہت سے شعر نشتر کی طرح دل میں ٹوٹ کر رہ گئے، کسی شعر پر پلکیں بھیگ گئیں اور کسی شعر نے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کردی۔ امیر مینائی کی شاعری کے متعلق سنی سنائی باتوں نے جو دل و دماغ پر پردے ڈال رکھے تھے، وہ اٹھ گئے اور دنیا کی ناقدر شناسی پر میرے وجدان نے ماتم کیا۔

حضرت داغ کو حضرت امیر سے ٹکرانا، فنِ نقد ونظر کی توہین ہے۔ دونوں اہلِ کمال اپنی جگہ منفرد شخصیت کے مالک ہیں، داغ کی سلاستِ بیان اور روزمرہ کا جس طرح جواب نہیں، اسی طرح امیر مینائی کی معنی آفرینی اور نازک خیالی اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ داغ اور امیر دونوں، آسمانِ تغزل کے آفتاب و ماہتاب ہیں، اردو زبان پر دونوں کا احسان ہے، افسوس ہے کہ تقابل کرنے والے، توازن کی حد سے گزر جاتے ہیں۔

حضرت امیر کے ان چند شعروں کو پڑھیے:۔

ہم اپنی خاک سے بعدِ فنا یہ کام لیتے ہیں
غبارِ راہ بن کر ان کا دامن تھام لیتے ہیں

رہو تم شوق سے عہدِ شباب و دورِ مستی میں
ہم اپنے سر بلائے گردشِ ایام لیتے ہیں

عجب دلچسپ نقشہ عالمِ ایجاد رکھتا ہے
جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں، اسے دل یاد رکھتا ہے

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول — آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا
حسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جتنی نگاہ — جس قدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

کیا ایسے بلند اور لطیف شعر کہنے والے کو "متشاعر" یا "چوچلے اور ضلع جگت کا شاعر" کہنا حقیقت کا انکار اور انصاف سے بغاوت نہیں ہے!

مجھے تو امیر کے اشعار پڑھ کر حیرت ہوئی کہ "قبا بر دوش، درود بر لب، تسبیح در دست اور مصحف در بغل انسان" "معاملہ اور تغزل" کے اس قدر چبھتے ہوئے اشعار کس طرح کہہ سکتا ہے؟ زہد اور رندی، سنجیدگی اور چھیڑ چھاڑ کا اتنا لطیف امتزاج بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ امیر شراب بھی پلاتے ہیں، آگ بھی برساتے ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور چٹکی بھی لیتے ہیں۔ جہاں تک زبان کے سنوارنے اور ادب کی خدمت کا تعلق ہے ان کی شاعری کا ایک رخ (Classical) ہے۔ ان کے بہت سے اشعار "ضرب المثل" بن چکے ہیں۔ زبان کا چٹخارہ، محاورات، روزمرہ، اور الفاظ کا برمحل استعمال، یہ تمام چیزیں امیر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

میں اربابِ ذوق اور شعر فہم حضرات سے سفارش کروں گا کہ وہ حضرت امیر مینائی کے کلام کا سبقاً سبقاً مطالعہ فرمائیں ادب اور زبان کو جتھا بندی اور پارٹی بازی سے بلند ہونا چاہیے، میری یہ نظم بھی میرے ان ہی خیالات کی "ناتمام ترجمانی" ہے

تاریخ ہے زبان کی افسانۂ امیر — ہے دفترِ ادب خطِ پیمانۂ امیر
کتنے چراغ اب بھی ہیں پروانۂ امیر — ہے کعبۂ خیال صنم خانۂ امیر

اربابِ فن کو اس کے تخیل پہ ناز ہے
ہر شعر جس کا نغمۂ فطرت نواز ہے

جس نے زبانِ بلبل و گل میں دیا پیام — جس کے تخیلات کا پرتو اودھ کی شام
تھا صاحبانِ علم و معانی کا جو امام — اردو ادب میں ہے سرِ فہرست جس کا نام

جس نے گرہ حقایقِ الفت کی کھول دی
قند و نبات ساغرِ اردو میں گھول دی

جس نے وصال و ہجر کے منظر دکھا دئے — رنگینیٔ خیال کے گلشن کھلا دئے
دلکش محاورات کے دریا بہا دئے — اردو زبان کے ہند میں سکے بٹھا دئے

شعر و ادب کے چہرے کی رنگت نکھار دی
جس نے زباں کی زلفِ پریشاں سنوار دی

جس نے شرابِ شعر کو دو آتشہ کیا　　جس نے بڑھایا اور محبت کا سلسلہ
جس نے فروغ انجمنِ فکر کو دیا　　جس نے سنایا عشق کا افسانہ بر ملا

جس نے غزل میں شوخ مضامیں سمو دئے
دل کی رگوں میں دشنہ و خنجر چبھو دئے

اشعار جس کے ملک میں ضرب المثل بنے　　جس نے رُخِ حیات سے پردے اٹھا دئے
جس کی زباں سے عیش کے نغمے سنے گئے　　پیدا ہوا جو شوخ مضامین کے لئے

شعروں میں جس کے کیف بھی ہے اور درد بھی
نغمہ کے ساتھ ساتھ ہے اک آہ سرد بھی

احسان ہے زباں پہ "امیر اللغات" کا　　ہر سطر جس کی راہِ طلب کی ہے رہنما
دامن ادب کا گوہرِ معنی سے بھر دیا　　اس واسطے کہ اس کا تخلص امیر تھا

مرقد پہ اس کے ابر کرم کا نزول ہو
ماہر کی یہ دعا ہے الٰہی! قبول ہو

ماہر القادری

غزل

تکلیفِ التفات گوارا نہ کیجئے　　برہم سکونِ یاس کی دنیا نہ کیجئے
آخر نگاہِ شوق نے بے پردہ کر دیا　　کیوں ہم کہا نہ کرتے تھے پردہ نہ کیجئے
دادِ کمالِ حسن ہے ناکامیٔ نظر　　شرمندۂ مجال تماشا نہ کیجئے
حسرت گناہ، ترکِ رضا یاس کفرِ عشق　　حیران ہیں کہ کیجئے کیا کیا نہ کیجئے
اذنِ جفائے خاص بھی دیگا نہ رشکِ غیر　　بیگانہ وار بھی مجھے دیکھا نہ کیجئے

مٹ بھی چکا قتیلِ غمِ عشق آپ کا
اب زحمتِ کرم کا ارادہ نہ کیجئے

حفیظ قتیل

غزل

سیرِ صحرا کیا کریں کیا دیکھیں گلشن کی بہار
یاد ہے اے جوشِ وحشت چاکِ دامن کی بہار

ہائے وہ نیچی نگاہیں دلفریب و دل نواز!
اور وہ بانکی ادائیں تیکھی چتون کی بہار

اے صبا، صیاد سے کہہ دے نہ آئے اس طرف
خار کی مانند کھٹکے گی نشیمن کی بہار

شعلۂ دل کا بھی آخر نازِ تابش بڑھ گیا
دیکھ کر چلمن سے باہر روئے روشن کی بہار

جس نے دیکھی ہیں خزاں کی بھی بہاریں اُن سے پوچھ
سامری کیا جانے تیری چشمِ پُرفن کی بہار

کچھ خبر ہے دیکھ او خورشید طلعت آئینہ
عقد پروین سے نہیں کم تیری سمرن کی بہار

دیکھئے کب آئے گی، پھر کب دکھائے گا خدا؟
لالہ و گل کی مہک، نسرین و سوسن کی بہار

اوپر اوپر ہی یہ کیا آتش بیانی جائے گی؟
پھول برسائے گی ہیرے ساتھ ساون کی بہار

دیکھ اے زاہد مے گلرنگ کا اعجاز دیکھ؟
بڑھ گئی تردامنی سے اور دامن کی بہار

کس کے نقشِ پا الٰہی بن گئے نقشِ طلسم!
اور ہی کچھ آج کل ہے کوئے دشمن کی بہار

چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کر کلیجے میں عزیز
ہائے رت برسات کی وہ، ہائے ساون کی بہار

نواب عزیز یار جنگ بہادر

غزل

کیا بات ہے اے بیتابیٔ دل، یاں ساز کوئی خاموش نہیں
نغموں سے بھرے ہیں ارض و سما، سننے کا مگر کچھ ہوش نہیں

پیمانہ بہ کف آیا تھا کوئی، مخمور محبّت ہونے کو
کہنے لگا پینے والے ہیں مجبورِ ہوس، مئے نوش نہیں

دنیا پہ تبسّم کیا کیجے، یوں ناز کا ماتم کیا کیجے
سر اپنا بھی ہے محوِ انا، لیکن یہ وبالِ دوش نہیں

کچھ اور ہے رنگِ ذوقِ طلب، کچھ اور ہے جینے کا مطلب
میخانۂ ہستی ویراں ہے، یاں شورِ ناؤ نوش نہیں

اک طور تھا اور اک موسیٰ تھے، وہ وقت گیا، وہ بات گئی
اے برقِ ازل مایوس نہ ہو اب بزم میں ہم مدہوش نہیں

ہاں شاعرِ دل، وہ گیت سنا جس میں محبت کی باتیں
اس تیری صدائے عریاں میں، وہ درد نہیں، وہ جوش نہیں

کچھ بول حدیثِ شوق ہے تو، کچھ دیکھ، نگاہِ ذوق ہے تو
نغماتِ فلک خاموش نہیں، انوارِ فلک روپوش نہیں

اس بزمِ طرب میں اے باقیؔ، رکھتے ہیں بڑے ارمانوں سے
وہ عشق جو ہم آواز نہیں، وہ حسن جو ہم آغوش نہیں

رکشا والا

بنگڑیاں میرے لئے کب لادو گے راموُ... ! دیکھو تو یہ نگوڑے ہاتھ کیسے برے لگتے ہیں۔ ؟... سہاگ کی قسم جلد لادیجو!

ہاں... چھایا — میری رانی... لادیں گے۔ ...پیٹ پُر تے پیسے ہی نہیں ملتے تو کیا سہاگ اور کیسی بنگڑیاں ....؟

اُف.... نا..... میرے رام ایسی باتیں بھلی نہیں لگتیں..... کہو جو نہ لائی ہوں..... اچھا چھوڑو کیا فائدہ ان باتوں سے.... کہو کئے پیسے چکالائے؟ دیکھو نیمو تو بھوکوں ہی بلک بلک کر سو گیا...... لاڈلا میرا.... !

چھایا... ! میں رکشا والا جو ہوں نا... !

ہاں — کون نہیں جانے ہے۔ کہو نا سیدھی سیدھی جو کہنی ہو! پھر ایسے سے کوئی کیا توقع رکھے... یہی نا۔ چھ آنے ....دھوپ — آندھی — کیچڑ — پانی — یہ سب ہی تو سر سے گزر جاتے ہیں دن تمام کی خاک چھاننے میں۔ چھایا — ! ملنے کا کیا... روپیہ، سوا روپیہ مل ہی جاتے ہیں.... مگر... ! مگر کیا۔ کہاں کھو آتے ہو یہ سارے پیسے۔ جاؤ تم بھی بڑے وہ ہو.... پی جاتے ہو گے؟

اے ایشور! بھلا ہو پاپیوں کا — اری پگلی.. ساہوکار کو دے جو آتا ہوں۔

کون ہے یہ ساہوکار؟ موئے کو غریبوں کے پیٹ پر پتھر ڈالتے شرم نہیں آتی — ؟

نہیں۔ چھایا۔ ! ان دھن ناگون کو بُرا نہیں بولتے — !

راموُ!!!... اپنا خون.... !!

نہیں..... دودھ..... چھایا۔ !.... مگر ان پر کیا شکوہ — یہ قسمت اور اس کے بنانے والے کا انصاف ہے..... ایک..... پرندوں کی چوں چوں کے ساتھ اپنے اور اپنے بال بچوں کے پیٹ کی پوں پوں بجانے کی فکر لئے اٹھتا ہے۔ بارش کی پرواہ کسے.... جاڑے کا لحاظ کیسا..... بدن پر چھیتڑے وہ بھی مشکل سے.... ! بابو کو پیٹھ پر لادے چھ میل پھرے.... تب کہیں چھ پیسے کسوٹی پر بندھے — ! دن کی بارہوں گردشوں تک ایسے کتنے چھ میل دیکھتے نہیں کٹتے ہوں گے.... کتنا پسینہ بدن پر سوکھ نہ جاتا ہوگا..... کتنا سانس پھول کر سرد نہ پڑ جاتا ہوگا..... پھر بھی شاباش... واہ ری قسمت..... بابو نا خوش ہی رہے..... کیوں؟ دیر جو ہو گئی نا — ! موٹر کر لیتے تو کبھی کے فارغ نہ ہو چکتے... اچھا کیا بابو نے۔ جو بھاؤ آٹھ پیسے کا ٹھیرا تھا سو چھ تھکے چکائے..... قصور ہی تو تھا.... اور کیا..... ہا ہا ہا! ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا — !

ہاں تو راموُ! چپ ہو گئے.... کیا سوچنے لگے تم — !

ارے یہ چوٹ.... ! اے پربھو! دنیا اندھی ہے... کہ.... ؟

تو چھایا... ! دن میں ایسے کتنے ہی بابو اپنی گاڑھی کمائی مجھے دیتے بگڑتے ہوں گے.. مگر... میں! .... سچ... سرمایہ دار کو اپنا خون... !... نہیں۔ چھلنی دل سے پسی ہڈیاں چھان کر دیتے ہوئے بھی ہر وقت ہنستا ہی تو رہتا ہوں..... سوچ تو ذرا... !... لیکن... وہ بے چارہ — مجھے مارے نہیں اور... خود.... ٹسوے نہ بہائے تو.... کیا کرے... آخر اس کے بھی تو بال بچے ہیں... آخر وہ شریف ہے.... شرافت! .... شرافت.... ! .... بس — ! ! چھایا.... ! آخر ہم کمینے ہی تو ٹھیرے.... کمینے! ... غربت — کمینی... ! کمینی... غربت...... !

محمد حبیب الدین احمد (عثمانیہ)

پٹرولیم کا رومان

جس طرح کوئلہ نباتی اجزا پر جراثیمی عمل کا حاصل ہے، اسی طرح پٹرولیم حیوانی مادہ پر جراثیمی عمل سے وجود میں آتا ہے، اگرچہ بعض سائنس داں کو صرف اس قدر اختلاف ہے کہ اس کی پیدائش میں حیوانی اور نباتی دونوں مادّے حصہ لیتے ہیں۔

اس کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ ڈیوٹرونومی میں چٹانوں سے تیل کے بہنے کا تذکرہ ہے۔ یہ اس زمانے میں بعض دواؤں کی تیاری اور اشیاء کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہیروڈوٹس، پلی نی اور بعض دیگر مصنفین نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کا مشہور سیاح مارکو پولو لکھتا ہے کہ لوگ کس طرح تیل لینے کے لئے دور دراز مقامات سے باکو جایا کرتے تھے۔ اس سے بھی قدیم تر زمانے میں حضرت نوح کی کشتی کے متعلق لکھا ہے کہ اس پر قیر (Pitch)، جو پٹرول کا تلچھٹ ہوتا ہے، لگایا گیا تھا تاکہ وہ پانی کے اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ یہی عمل حضرت موسیٰ کے اس جھولے پر کیا گیا تھا جس میں وہ بہ زمانۂ طفولیت دریائے نیل کے کنارے جھولا کرتے تھے۔ "مینارِ بابل" کی تعمیر میں جو رقیق مادّہ استعمال کیا گیا تھا وہ یہی قیر تھا۔ برما میں دریائے ایراودی کے کنارے جو کنوئیں ہیں ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے قدیم ترین ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بہت زمانہ قبل چین میں ابلتے کنوؤں (Artesian wells) سے پٹرولیم حاصل کیا جاتا تھا۔ روم کے جوپیٹر کے مندر میں سسلی کے چشموں سے حاصل کئے ہوئے پٹرولیم سے چراغ روشن کئے جاتے تھے۔

پٹرولیم کی جدید دریافت اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہوئی ہے جب کہ ممالک متحدہ امریکہ کے مغربی حصوں میں چشمہ ہائے نمک کی تلاش جاری تھی۔ نمکین پانی زمین میں سے پمپ کیا جاکر سطح پر چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ بخارات بن کر اڑ جائے اور نمک کے قلم رہ جائیں۔ مگر بعض موقعوں پر اس پانی کے ساتھ روغنی مادہ بھی پایا گیا جس نے ان چشموں کو بیکار کر دیا۔ یہی پٹرولیم تھا۔

۱۸۳۱ء میں منڈل نامی ایک شخص چند دوستوں کے ساتھ شکار کو گیا ہوا تھا۔ ایک نمک کے چشمے کے قریب جی بھر کر شکار کھیلنے کے بعد اس نے رات وہیں بسر کی۔ رات میں اتفاقیہ طور پر اس کی بندوق چل گئی اور گولی زمین میں دھنس گئی۔ صبح میں منڈل نے دیکھا کہ اس سوراخ میں سے ایک تیز بو کا روغنی مادہ ابھر رہا ہے جب اس نے آگ سلگائی تو کچھ شرارے اس تیل کی طرف بھی پہنچے جس سے ایک مہیب شعلہ اٹھا۔

اس واقعے کے پورے دو سال بعد ایک اور امریکی فرمن نامی نے اس کی افادیت کو پہچانا اور ۱۸۵۱ء تک اس نے ایک طریقہ معلوم کر لیا جس سے پٹرولیم کی تقطیر اس طرح ہو جائے کہ اس کی دھاکو خاصیت جاتی رہی اور جلنے میں جو ناقابل برداشت تیز بو پیدا ہوتی تھی اس کا ازالہ ہو جائے۔ نیویارک میں ایک کمپنی قایم کی گئی اور تھوڑی سی ناکامیوں کے بعد یہ لوگ اس قابل ہوئے کہ روزانہ کافی ڈبے پٹرولیم کے زمین سے نکال سکیں۔ تیل کی مانگ دیوانہ وار بڑھنے لگی اور اس اثنا میں بعض ایسے کنوئیں دریافت ہوئے جن میں سے روزانہ پچاس ہزار ڈبوں سے زیادہ تیل نکلنے لگا۔

آج کل سالانہ کم از کم ۲۰ کروڑ ٹن پٹرولیم زمین سے نکالا جاتا ہے اس مقدار کا نصف حصہ ممالک متحدہ امریکہ سے نکلتا ہے، اس کے دوسرے بڑے مخزن سوویٹ روس،

میکسکو، ویزویلا، ایران، شرق الہند اور رومانیہ ہیں ۔ اس سے نہ صرف مختلف استعمال کے لئے ایندھن ہی حاصل ہوتا ہے بلکہ بہت سے قسم کے ہلکے تیل، چکنائیاں اور پیرافین وغیرہ دستیاب ہوتے ہیں ۔

بعض بعض دفعہ اتفاقیہ آتشزدگی کی وجہ لرزہ براندام مناظر پیدا ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں ۔ کیلیفورنیا کے تیل کے مخزن میں سنہ ۱۹۲۶ء میں بجلی کے گرنے سے آتشزدگی ہوکر جو نقصان ہوا اس کا اندازہ چار کروڑ روپے لگایا گیا ہے ۔ رومانیہ کے ایک کنویں کو آگ لگنے کے بعد مسلسل تین سال تک جلتا رہا اس کے بعد کہیں اس کو قابو میں لایا جاسکا ۔ شہر اوکلاہوما کے تیل میں جب آگ لگی ہے تو اس سے ۷۰ فٹ سے زیادہ بلند شعلے اٹھے، قریب تھا کہ شہر کو جلاکر خاک سیاہ کردے مگر خوش قسمتی سے اس زمانہ میں ہوا کا رخ دوسری جانب تھا ۔ کام کرنے والوں نے ایک خاص قسم کے لباس اور ابرک کا خود پہنے ہوئے بڑی بے جگری سے ایک دو ٹن وزنی ڈاٹ کو کامیابی کے ساتھ اس پر بٹھا کر قابو پالیا ۔ مشرقی ٹیکساس کے نئے کنویں میں جب آگ لگی ہے تو رات کے وقت پچاس میل اطراف واکناف اس سے منور ہو جاتے تھے ۔ مسلسل دو ماہ کی کوشش کے بعد اس پر قابو حاصل ہو سکا مگر اس وقت تک تقریباً سات لاکھ روپے کا نقصان ہو چکا تھا ۔ ٹیکساس کے ایک اور کنویں میں ایک ہتھوڑے سے نکلی ہوئی چنگاری سے جو آگ لگی تھی اس نے چودہ آدمیوں کے نشانات کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا ۔

لانگ بیچ واقع کیلیفورنیا کے ایک کنویں میں جو آتشزدگی ہوئی اس میں یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر گھنٹہ کم از کم ۶۲۵ ڈبے پٹرول سطح زمین سے ۱۲۰ فٹ بلندی پر پھینکا جاتا تھا یہ ایک زہرہ گداز منظر تھا ۔ دس آدمیوں نے تین سو روپے فی کس فی گھنٹہ کے معاوضہ پر اس آفتِ ناگہانی سے دوچار ہونے پر آمادگی ظاہر کی ۔ یہ ایک جان جوکھوں کا کام تھا مگر وہ کود پڑے اور اس پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی یہ اور چیز تھی کہ تیل کی بوچھار نے عارضی طور پر ان لوگوں کی بصارت کھودی تھی ۔

(ماخوذ)

محمد ابراہیم

سرگزشت ادارۂ ادبیات اردو

"ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن پچھلے چند سال سے زبان اردو کی جو گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے "البیان" کے صفحات میں کئی بار اُن کا تذکرہ ہو چکا ہے ۔ یہ کتاب ادارہ کی خدمات کی مفصل تاریخ پر مشتمل ہے ۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ادارے کا کام سات شعبوں (یعنی زبان تنقید، تالیف و ترجمہ، تاریخِ دکن، شعراء و مصنفینِ دکن، سائنس اور علومِ نسوانی، تعلیم اطفال، امتحانات وغیرہ) پر مشتمل ہے ۔ ہر شعبہ اپنے اپنے علوم کے ماہرین کی نگرانی میں اردو ادب کی بیش قرار خدمات سرانجام دے رہا ہے ۔ ہماری رائے میں اس کتاب کی وسیع اشاعت کا انتظام ہونا چاہئے ۔ اگر یہ سرگزشت چند ہزار کی تعداد میں مفت بھی تقسیم ہو جائے تو کیا حرج ہے؟"

ماہ نامہ البیان امرتسر اگست ۱۹۴۱ء

فتح آباد پر ایک نظر

میرے دوست ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد صاحب نیر نے مندرجۂ بالا عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو ماہنامہ سب رس بابتہ ستمبر ۱۹۴۰ء میں شایع ہوا ہے۔ اور جس کا ذکر سرگزشت ادارہ کے صفحہ ۶۵ پر بھی کیا گیا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ فاضل مضمون نگار سے کتبہ جات کی قرأت اور تاریخی حالات کی صحت میں غلطی ہوگئی۔ کیونکہ موصوف کی دریافت میں جو کچھ معلوم ہوسکا وہی سپرد قلم کیا گیا ہوگا۔ اگر ادارہ ہماری اس جرأت کو مناسب خیال فرمائے تو ہم اپنے وطن مالوف سے متعلق غلط مواد کی تصحیح اور مزید حالات قلمبند کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسجد سنگین یہ مسجد فتح آباد کی قدیم آبادی موسومہ قصبہ (دھارور) کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ جس کو ایک قد آدم چبوترے پر سلطان محمد تغلق کے جنرل نے ہندی وضع پر تعمیر کروایا تھا۔[1] مسجد میں تیس سنگین چوگوشہ ستون ہیں۔ چھت بھی سنگین ہے۔ شاہراہ عام کی طرف جو صدر دروازہ ہے۔ اس کا چوکھٹ بھی پتھر ہی کا ہے۔ اس پر ایک کتبہ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر ۷۲۷ھ میں ہوئی ہے۔ اکثر عہدہ داران دورہ کنندہ اس کتبہ کو اٹھواکر اپنی قیام گاہ تک منگواتے ہیں۔ اس میں خط نسخ استعمال کیا گیا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے۔

پہلی سطر:۔ ایں عمارت در عہد خلافت ...... خلیفۂ زماں وارث ملک سلیمان ابوالمحامد۔

دوسری سطر:۔ محمد بن تغلق شاہ السلاطین خلافت ملک تاج الدین محمد عرف ...... لار

تیسری سطر:۔ بامید ..... دیدار بنا کردہ بندۂ محتاج محمد حاجی العشرین شعبان سنہ سبع وعشرین وسبع ہجریہ۔

یہ مسجد عام طور پر "ملاؤں کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ چراغ بتی، جاروب کشی، آب داری اور بانگ وصلوٰۃ کا انتظام ملاؤں ہی کے ذمہ ہے۔ جس کے لئے ملا بدرالدین صاحب وغیرہ کے نام سروے نمبرات (۲۰، ۶۹، ۷۰) لغایت بکر ۱۴ اگنٹہ محالی للعصہ کے انعامات سرکار سے بحال ہیں۔

جامع مسجد یہ مسجد بستی کی جدید آبادی پیٹھ (فتح آباد) میں ڈونگر جیس کے راستے پر لب سڑک واقع ہے۔ پوری مسجد سنگ بستہ ہے۔ سامنے ٹین کا سائبان ہے جس میں آہنی شہتیر لگے ہوئے ہیں۔ مسجد اور صدر دروازہ کے درمیان ایک کنواں بھی ہے۔ صدر دروازہ پختہ اور سنگ بستہ ہے۔ اس کے کتبے کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد خاندان نظام شاہیہ کے دسویں حکمران مرتضیٰ نظام شاہ دوم (۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۱ھ) کے عہد حکومت میں تعمیر ہوئی ہے۔ جس کو "نوراللہ" نامی شخص نے تعمیر کروایا ہے۔ کتبہ نستعلیق خط میں ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ سے بانی مسجد کے نام کو اور آخیر سطر سے سن تعمیر کو کسی کور باطن اور تنگ دل شخص نے ہتوڑے سے بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ کتبہ درج ذیل ہے۔ لفظ "غیب" سے سن تعمیر برآمد ہوتا ہے۔

الله محمد علی

زغیب آمدہ شد تاریخ مسجد — بکن تحقیق از مصراع اول
ولی بشمار از آں لفظ تحسین — بود مصراع اول لفظ اول

---

[1] گزیٹیر ممالک محروسہ سرکار عالی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲۲۵ و حقیقت ہائے ہندوستان قلمی ص۔

بنائی کرد نور اللہ مسجد　　زفیض فائض فضلِ مفضل
۱۰۱۲ھ مسجد جمعہ بپٹہ فتحاباد

مسجد کی خدمت کے لئے سلاطین سلف نے کثیر انعامات عطا فرمائے تھے جو ضبط ہوتے چلے گئے۔ آخر حافظ رسول خاں صاحب نے اس مسجد کا رہا سہا انعام اور خدمت پیش امامی خریدلی۔ اب ان کے پوتے حاجی کریم خاں صاحب اور ان کی برادری کے نام سروے نمبرات (۱۷، ۱۸) وصہ یکرپہ ۲ گنٹہ محاصلی ۱۳ روپے بشرط خدمت بحال ہیں۔

مسجد قلعہ یہ مسجد نظام شاہی خاندان کے چوتھے بادشاہ مرتضیٰ نظام شاہ اول (۹۷۲ھ تا ۹۹۵ھ) کے عہد میں سنجر خاں قلعدار نے تعمیر کروائی تھی۔ جیساکہ آگے چل کر اس کے کتبہ سے ظاہر ہوگا۔

اس سنگین مسجد کی لداؤ چھت گر پڑنے کے بعد ۱۱۹۳ھ میں مرزا احمدیار خاں نائب قلعدار شرف الدولہ بہادر نے اس کی مرمت کروائی۔ مگر جب وہ بھی گر پڑی تو امیر نواز الدولہ بہادر جاگیردار و قلعہ دار وقت نے ۱۲۵۵ھ میں دوبارہ تعمیر کروائی۔ امتداد زمانہ سے اب اس مسجد کی صرف دیواریں کھڑی ہیں۔ صحن میں ایک مختصر سا حوض بھی ہے جس کا کارنجہ اُکھڑ چکا ہے۔ مسجد کا قدِ آدم اور سنگ بستہ دروازہ کھڑا ہے۔ جس پر نستعلیق خط میں یہ اشعار کندہ ہیں۔

درعہد نظام شاہ عالی مقدار　　آں شاہ جہاں پناہ خورشید لقب
بانی بنائے خیر شد سنجر خاں　　آں منبع خلق و لطف و احسان و ادب
تاریخ بنائے خیراگر می خواہی　　از قبلۂ اہلِ عجز و اخلاص طلب

اردو کے جلیل القدر انشا پرداز اور مورخ مولوی بشیرالدین احمد دہلوی سے اس کتبے کے سلسلے میں دو فروگذاشتیں ہوئیں۔ چنانچہ وہ اپنی تصنیف واقعات مملکت بیجاپور میں اس کتبے کے پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی میں "پناہ" کے بجائے "بہ جاہ" لکھتے ہیں۔ دوسرا تسامح مادۂ تاریخ کے سمجھنے میں واقع ہوا ہے۔ مصرعۂ مذکور اس طرح ہے۔ ع

از "قبلۂ اہلِ عجز و اخلاص" طلب

فاضل مؤرخ نے پہلے حرف "از" اور اخیر لفظ "طلب" کو بھی مادۂ تاریخ میں شمول کرکے ۱۰۳۰ھ برآمد فرمائے۔ حالانکہ یہ اس قدر موٹی اور سطحی غلطی تھی کہ وہلۂ اول ہی میں انھیں تنبہ ہوجانا چاہیئے تھا۔ حقیقی ۱۰۳۰ھ نہیں بلکہ ۹۸۱ھ ہے۔ جو مادۂ تاریخ سے صاف طور پر مستنبط ہوتا ہے۔

اس مسجد کی جاروب کشی اور چراغ بتی کے لئے سید عبدالقادر و سید راجہ صاحبان کے نام سروے نمبرات (۲۳۹، ۲۴۰) وصہ یکرپہ ۳ گنٹہ محاصلی ۱۸ روپے کی سالانہ معاش مقرر و جاری تھی مگر ویرانی مسجد کی وجہ یہ معاش ۱۳۳۳ف سے جھارے کی مسجد پر منتقل ہوئی ہے۔ صاحبانِ معاش وہاں شرط خدمت ادا کرتے ہیں۔

مسجد چوک زمانۂ سابق میں یہاں صرف ایک چھپر تھا۔ جس میں خاص کر جھارے (نیاریئے) نماز ادا کرتے تھے۔ اس لئے ایک زمانے تک "جھارے کی مسجد" سے موسوم رہی۔ حضرت قاضی عبدالوہاب صاحب کے نسبی پوتے مولوی صلاح الدین صاحب کے فرزند مفتی محمد بہاء الدین صاحب فاروقی نے ۱۲۹۴ھ میں اپنے ذاتی صرفہ سے اس مسجد کی تعمیر کروائی جو ساٹھ سال تک قایم رہی۔ ۱۳۵۵ھ میں محلے کے چند مخیر اور ہمدرد اصحاب نے چندہ سے اس کو پختہ اور سنگ بستہ تعمیر کروایا ہے۔ یہ مسجد آج کل چوک کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ حسب فرمان خسروی جلالت الملک آصف جاہ سابع بذریعہ جریدۂ غیر معمولی منشرہ یکم شعبان ۱۳۳۳ھ آ (۱۲ روپے) سالانہ کی

معاش بوجہ ویرانی مسجد قلعہ، اس مسجد پر منتقل کی گئی ہے۔ سید عبدالقادر اور سید راجہ صاحبان خدمت ادا کرتے ہیں۔

مسجد قاضی

فتح آباد کے قاضی، محمد حسین فاروقی کے بڑے صاحبزادے قاضی عبدالوہاب فاروقی، بانیٔ قاضی پورہ (کھڑ کالی) ایک عالم باعمل، صاحب دل بزرگ اور باکمال شاعر تھے۔ آپ نے حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت اپنی حویلی سے متصل ذاتی صرفہ سے ۱۰۹۱ھ میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ جو "قاضی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد فتح آباد کی قدیم آبادی (قصبہ) کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ صدر دروازہ پر جو شاہراہ عام کی جانب ہے۔ بانیٔ مسجد کا طبع زاد قطعہ نستعلیق خط میں کندہ ہے۔ عبارت کتبہ درج ذیل ہے۔ "موجب اسباب فضل دیں" سے سن تعمیر برآمد ہوتا ہے

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

خادم شرع متیں کرد از کمال صدق وحال   مسجدی احداث بہر مقدم صاحب دلاں
ہاتف طبع سخن پرور بگوش ہوش گفت   "موجب اسباب فضل دیں" بگو تاریخ آں

بانیٔ مسجد خادم شرع عبدالوہاب ۱۰۹۱ھ

قاضی عبدالوہاب صاحب کی وفات کے بعد ۱۱۲۹ھ سے شاہان مغلیہ نے اس مسجد کے لئے معاش جاری فرمایا تھا۔ چنانچہ آج تک قاضی صاحب مرحوم کے ورثاء قاضی اکبر احمد اور اشرف الدین فیضی وغیرہ کے نام سروے نمبرات (۱۳۵، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷) بارقبہ ۵ ایکڑ ۲ گنٹہ محاصلی ماسہ کا معاش بحال ہے۔ صدر دروازہ جیسا مضبوط اور ایک شان لئے ہوئے ہے، مسجد ویسی ہی ردی حالت میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل عمارت کے منہدم ہو جانے پر یہ ٹین پوش عمارت کھڑی کردی گئی۔ بانگ وصلوٰۃ برائے نام ہوتی ہے۔

مقبرہ قلعدار خاں اورنگ جنگ

قلعہ فتح آباد عرف دھارور کی قلعداری پر ربیع الثانی ۱۰۴۲ھ میں نور محمد عرب کا تقرر ہوا۔ مغل بادشاہ شاہجہاں نے انھیں عرب خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔ اپنی قلعداری کے زمانے میں بطور یادگار بستی کے قریب ایک باغ لگوا کر اسے اپنے نام سے موسوم کیا جو آج تک "نور باغ" کے نام سے مشہور ہے۔ جب ۱۰۶۳ھ میں نور محمد عرب کا انتقال ہوا تو اُسی نور باغ میں دفن کئے گئے۔

مرزا علی عرب انہی کے صاحبزادے تھے جو "صاحب قران ثانی کے عہد میں پانصدی منصب اور دوسو پچاس سواروں کی افسری سے ممتاز تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائی سنہ جلوس میں با فزائش منصب قلعدار خاں خطاب ملا اور حراست و فوجداری اورنگ آباد پر مقرر ہوئے پھر قلعدار قندہار ہوئے۔ وہاں سے فتح آباد دھارور کی قلعداری پر تبدیل ہو کر بمقام (فتح آباد) دھارور انتقال فرمایا۔ ان کے والد عرب خاں مغفور کی قبر کے برابر ان کی بھی قبر ہے۔"[1]

قلعدار خاں کی قبر پر چار کمانیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کمانوں پر بیرونی جانب سے چار اشعار کندہ ہیں۔ ع

حبذا ای قبّۂ قدسی طواف

سے اس مقبرے کا سنہ تعمیر ۱۰۹۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ کتبہ درج ذیل ہے۔

۲۔ مغربی کمان — اس کمان کا وہ حصہ جس پر کتبہ تھا۔ اب وہ منہدم ہو چکا ہے۔ منہدم ہونے سے پہلے راقم الحروف نے اس پر جو شعر کندہ دیکھا تھا اس کا مصرعۂ اولیٰ حافظہ میں محفوظ ہے جو یہاں لکھا جاتا ہے۔

---

[1] تاریخ قندہار دکن مؤلفہ منشی امیر حمزہ صاحب صفحہ ۱۵ و ۲۰۸)

چوں بہ سیرِ جنت الماویٰ رواں

۱۔ جنوبی کمان ـــــ خان عالی قدر قلعدار خاں

آنکہ در فردوس دارد اعتکاف

۲۔ شمالی کمان ـــــ شد بنا از فضلِ معمارِ قدر

گنبدی بر مرقدش گردوں طواف

۳۔ مشرقی کمان ـــــ گفت ہاتف سالِ تاریخ بنا

حبذا ای قبۂ قدسی طواف

مراد باؤلی

یہ باؤلی دھارور کی (قصبہ) آبادی کے ایک فرلانگ کے فاصلے پر جانب شرق واقع ہے۔ اس کو مفتح خاں قلعہ دار قلعہ فتح آباد عرف دھارور کے چچا زاد بھائی مراد خاں نے ۱۰۸۷ھ میں تعمیر کروایا تھا۔ جس میدان میں یہ باؤلی ہے وہ تلاوڑی کے نام سے موسوم ہے جس پر سات پشت سے راقم الحروف اور اس کی برادری کا قبضہ ہے۔ اور انہی افراد سے متعلق قبرستان بھی ہے۔ اس باؤلی میں ایک کتبہ بھی ہے جو درج ذیل ہے۔

بدورِ حضرت اورنگ زیب عالمگیر	این چشمہ بنا کرد مراد ابن کبیر
در سنۂ چہل و یک از جلوس مقدس معلی	مطابق سنۂ یکہزار و یکصد و نہ ہجری

مقبرہ بنا کردہ محمد خاں

قدیم عیدگاہ سے تھوڑے فاصلہ پر تالاب کے قریب ایک عالیشان گنبد ایک سنگ بستہ چبوترے پر بنا ہوا ہے۔ گنبد میں جانے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے۔ مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کس شخص کا مقبرہ ہے؟ کب تعمیر ہوا؟ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "محمد خاں" نامی کسی صاحب نے بنوایا تھا۔ جناب مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب مہتمم سرائے فتح آباد پرانی تہذیب کی ایک آخری یادگار رہ گئے ہیں۔ موصوف کا خیال ہے کہ یہ "اعتبار الملک" کا مقبرہ ہے۔ کیونکہ اس مقبرہ سے متصل ایک انعام ہے جو "اعتبار الملک" کے نام سے موسوم ہے۔ مگر ابھی ہم مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ اس مقبرے کا کتبہ درج ذیل ہے۔

رواق باصفا چوں حسنِ دلبر

خجالت بردہ از وے قصرِ قیصر

بنا کردہ محمد خاں باتمام

رسانیدہ بفیضِ لطفِ داور

خلایق زاندہ و حسرت اور پرغم	جہاں تاریک و چشمِ حور پر نم
ملک را رائے با رائے تو باشد	چوں بر اوجِ فلک جائے تو باشد
بہشت عدن جائے تست دانی	سفر کردی ازیں دنیائے فانی
زہجرت چند بودہ ذکر کردم	چوں تاریخ و ناتش فکر کردم
اگر بگرفت ملک مکان اعلیٰ	دلا جو "زمن سبحان اسریٰ"

اس کتبہ کا آخری شعر صاف طور پر پڑھا نہیں جاتا۔ ہم ابھی اس پر غور کر رہے ہیں۔ تاکہ صحت کے ساتھ اس کا سن تعمیر برآمد ہو سکے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دوسرے مضمون میں یہاں کے قلعہ کے حالات اور اس سے متعلقہ کتبہ جات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ابو الفیض قاضی اشرف الدین فاروقی فیضی

اطلاع

جن اصحاب کا چندہ ختم ہو گیا ہے وہ براہِ کرم جلد روانہ فرمادیں یا سب رس تقسیم کرنے والے کو چندہ دے کر باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل فرمالیں۔

شاہکار!

وہ مصور تھا، مصورِ فطرت! اس نے فطرت کے ہر پہلو کو اپنی لانبی اور پتلی انگلیوں اور گوناگون رنگوں کی مدد سے تصویروں کی شکل میں اجاگر کرنے کا عزم صمیم کرلیا تھا۔ نیم شگفتہ پھولوں پر منڈلاتی رنگ برنگی تتلیوں، ہوا کے مست جھونکوں میں لہراتے ہوئے پتوں، شبنم کی بوندوں میں بھیگے ہوئے سبزے، شام کے قرمزی بادلوں، سیاہ آسمان پر جھلملاتے تاروں یا دوسرے قدرتی مناظر کے سوا اس نے کبھی کسی مرد یا عورت کی تصویر نہیں بنائی تھی۔ اس کی چھوٹی سی، گندی اور کند کوٹھڑی میں تصویروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سیل کے مارے کئی تصویروں کا رنگ گیلا ہو کر پھیل گیا تھا۔ بارش کے دنوں میں چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی میں بھیگ کر کئی تصویریں سڑے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر میں مل گئی تھیں۔ جن سے سخت بدبو نکل رہی تھی۔ ایک ٹاٹ کے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں جھینگروں اور کیڑوں کا شکار ہو رہی تھیں۔ بہت سی تصویروں کو چوہوں نے کتر کتر کر ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ کوٹھڑی کے فرش پر مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے دھبے تھے۔ رنگ کی پیالیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ لیکن اسے ان ساری باتوں کی کچھ پروا نہ تھی۔ وہ دن بھر پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتا اور رات کو اپنی اس مخصوص کوٹھڑی کے اندر ایک چٹائی کے ٹکڑے پر بیٹھ کر دیئے کی دھندلی روشنی میں تصویر بنایا کرتا۔ رنگ بکھرے پڑے رہتے اور اس کی کہنہ مشق انگلیاں گھنٹوں تصویر کشی کرتی رہتیں۔ جب تصویر تیار ہو جاتی تو وہ کچھ دیر اسے دیکھتا اور پھر قریب ہی کی تصویروں کے ڈھیر میں پھینک دیتا۔ چراغ کی دھندلی روشنی میں تصویریں بناتے بناتے اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی قوت گھٹ گئی تھی۔ اس کی اپنی دھن اور جنونِ تصویر کشی کے سبب اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ پچکے ہوئے گالوں پر ڈاڑھی کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر کے بال دھول میں اٹ کر بُری طرح الجھ گئے تھے——

حسبِ معمول آج بھی وہ ہڈیوں کا پنجر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا تصویر بنانے میں محو تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ یوں ہی بند تھا۔ دروازہ کی شگافوں سے آتی ہوئی ہوا کی پتلی سی لہر چٹائی کے سرے پر رکھے ہوئے چراغ کی لو کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ اس کانپتی ہوئی پیلی اور مدھم روشنی میں مصور کی پتلی اور مشاق انگلیاں ایک ہری بھری پہاڑی پر سے گرتے ہوئے جھرنے کا ایک نہایت ہی دلفریب منظر کھینچ رہی تھیں——

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر مصور ابھی تک اپنی تصویر بنانے میں ہی منہمک تھا——

کوٹھڑی کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ادھیڑ عمر کی ایک عورت ہاتھ میں مٹی کا پیالہ لئے ہوئے داخل ہوئی۔ عورت بھی مصور ہی کی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ اس کی میلی ساڑی کا تار تار منت کشِ پیوند تھا۔ میلی کچیلی کرتی پھٹ کر چھلنی ہو گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں کانچ کی ایک پتلی سی چوڑی تھی۔ اور دوسرا ہاتھ جس میں وہ مٹی کا پیالہ لئے ہوئے تھی کمزوری کے مارے غیر محسوس طریقہ پر کانپ رہا تھا—— عورت مصور کے پاس آکر بیٹھ گئی!

"کیا ہے؟" مصور نے چڑھ کر کہا۔

"تھوڑے سے چنے ابال کر پانی لائی ہوں۔ لو پی لو! جانے دن بھر کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہو اور رات کو تصویر کشی سوجھتی ہے۔ کچھ اپنا بھی خیال ہے یا یونہی تصویر بناتے بناتے پاگل ہو جاؤ گے؟"

مصور نے بیوی کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ لے لیا اور دو تین گھونٹ میں خالی کر کے زمین پر رکھ دیا ــــــ

"تم نے بھی کچھ کھایا پیا ؟"

"کھائی کیا خاک ! کل سے بخار میں بھنی جا رہی ہوں۔ آج شام کو نجم کی ماں کپڑوں کی سلائی کے دس آنے دے گئی تھی۔ ان میں سے سات آنے تو تمھارے کاغذ والے نے لے لئے اور ڈھائی آنے رنگ والے نے۔ آدھ آنہ کے چنے لائی تھی۔ اسی کا پانی تمہیں دے رہی ہوں "۔

مصور برش کو پانی میں بھگو کر رنگ کی ٹکیا پر پھیرنے لگا۔ کوئی مرے یا جیئے۔ تمھاری بلا سے۔ ایسی حالت میں بھی محنت مزدوری کر کے جو دو پیسے لاتی ہوں وہ تمھارے کاغذ برش اور رنگ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ کہتی ہوں دو چار تصویریں ہی دیدو۔ شاید انکے بیچنے سے چار چھ آنے مل جائیں۔ لیکن تمھیں تو ان کا سڑنا منظور ہے مگر بیچنا گوارا نہیں "۔

"پھر وہی پرانی بات۔ میں ان ناقص تصویروں کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا "شاہکار" جب بازار میں پہنچے گا تو تم مالا مال ہو جاؤ گی۔ سمجھیں ؟"

"نہ جانے تمھارا شاہکار کتنے برسوں سے تیار ہو رہا ہے ؟ کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ؟ شاید وہ میری موت کے بعد ہی تیار ہوگا ؟"

"نہیں۔ اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تھوڑے دن اور کسی طرح کام چلاؤ۔ پھر تم ملکہ بن جاؤ گی۔ تمھیں کسی بات کی کمی نہ ہوگی"۔ ایک پھیکی ہنسی ہنس کر عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیئے کی پیلی روشنی میں اس کے زرد گالوں پر دو گرم گرم آنسو ٹپک پڑے۔

(۲)

مصور کے کمرے کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اور سامنے تقریباً اتنا ہی صحن۔ صحن میں خشک پتوں، ٹہنیوں اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے۔ کونے میں دو اینٹیں رکھ کر چولھا بنا لیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف راکھ پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کی چار دیواری جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ بوسیدہ اینٹوں کے ٹکڑے مٹی اور چونا جگہ جگہ سے ڈھلک رہا تھا۔ چار دیواری کے برآمدے کے ٹھیک سامنے والا حصہ آم کے ایک درخت کی وجہ سے ابھی کافی اچھا تھا۔ دیوار کا وہ حصہ درخت کے تنے کو دونوں طرف سے دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ درخت کی ٹہنیوں میں چپٹے ہوئے پتے صحن میں جھول رہے تھے ــــــ

برآمدے کے ایک گوشہ میں مٹی کا ایک گھڑا تھا۔ دو ایک ٹوٹے، پھوٹے برتن اور پتھر کی ایک چکی پڑی تھی۔ دوسری طرف بان کی ایک چارپائی تھی۔ جس کی ڈوریاں جگہ جگہ سے ٹوٹ کر لٹک رہی تھیں ــــــ

کڑاکے کا جاڑا تھا اور اس پر سرد اور کپکپا دینے والی ہوا۔ مصور کی بیوی برآمدہ کے ایک کونے میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ بخار کی حدت سے سارا جسم پھنک رہا تھا۔ گویا کسی نے اس کے رویں رویں میں آگ لگادی ہو۔ سردی کے مارے اس کی ہڈیاں تک کانپ رہی تھیں ــــــ

آم کے درخت کی پیلی پیلی پتیاں ایک ایک کر کے صحن میں گر رہی تھیں۔ گویا اس عورت کی زندگی کی گھڑیاں پگھل پگھل کر بہہ رہی ہوں ــــــ

یکایک مصور صحن میں داخل ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ حرارت کا دباؤ سر کی طرف بڑھ جانے سے بوڑھی عورت درخت کی طرف دیکھ کر بڑبڑا رہی ہے ــــــ " وہ۔ دیکھو، وہ !.... اس کی پتیاں بھی جھڑی جا رہی ہیں !..... ہاں ٹھیک تو ہے۔ میرا آخری لمحہ رفتہ رفتہ قریب آرہا ہے۔ زندگی کے پل ایک ایک

کر کے کم ہو رہے ہیں۔" ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ ایک خشک ٹہنی کے سوائے دو پتوں کے سب کے سب پتے ایک ساتھ ہی گر پڑے۔ عورت کے ہاتھ پاؤں بالکل سرد ہو گئے۔ دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ بند ہونے لگی۔ ہوا کا ایک دوسرا جھونکا آیا ان دو پتوں میں سے ایک پتہ چار دیواری سے ٹکراتا ہوا کھڑکھڑا کر صحن میں آگرا۔ وہ خشک ٹہنی ہلی اور وہ آخری پتہ بڑی زور سے کانپ اٹھا۔

"ہاں۔ اب ایک ہی لمحہ کی تو دیر ہے.....!"

عورت کے منہ سے ایک دھیمی چیخ نکلی اور بے ہوشی کے سبب اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ مصور کمرہ میں جا کر اپنی تختی، رنگ کی پیالی اور برش اٹھا لایا۔

۳

دوسرے دن جب مصور کی عورت کی آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ آخری پتہ جوں کا توں ٹہنی سے چمٹا لٹک رہا تھا۔ وہی پتہ تو تھا۔۔۔۔ کنارے مڑے ہوئے تھے۔ سرا کچھ آگے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ آدھی سبز اور کچھ کچھ زرد رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ بیچ میں کیڑے کا کھایا ہوا چھید صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہی پتہ تھا۔ بالکل وہی! ہوا کافی تیز تھی لیکن پتہ بالکل ساکن تھا۔ اس کے دل میں امیدوں کا ایک طوفان سا مچ گیا۔۔۔۔ "کیا سچ مچ ابھی میری زندگی کا آخری وقت دور ہے؟" بڑی ہی تکلیف سے وہ اٹھی اور درخت کی طرف بڑھی، دیکھا۔۔۔۔ درخت کے تنے کے پاس اپنی اینٹھی ہوئی انگلیوں میں برش تھامے مصور مرا پڑا تھا اور چار دیواری کی ایک اینٹ پر ایک زرد پتہ کی تصویر کھینچی ہوئی تھی۔۔۔۔

یہ تھا مصور کا شاہکار!

(او۔ ہنری)

محمد عبدالقادر فاروقی

کپاس کی صنعت نے ہندوستان میں جنم لیا

انسان کی زندگی کی اہم ضرورتیں کھانا، کپڑا اور گھر ہیں امیر و غریب کسی کو بغیر ان کے چارہ نہیں، فرق اگر ہے تو درجہ کا چنانچہ جھونپڑی کے رہنے والوں کا لباس موٹا اور ستر پوش ہوتا ہے اور ان کی غذا بہت معمولی ہوتی ہے اس کے برعکس محلوں کے مکینوں کا کپڑا بڑھیا اور نفیس ہوتا ہے اور کھانا ذائقہ دار قسم قسم کا بہترین ہوتا ہے، ماہرین معاشیات اس بات کے قائل ہیں کہ جو ملک اپنے باشندوں کو محض ضروریاتِ زندگی وافر فراہم کر سکتا ہے اس کا اخلاقی معاشی اور سیاسی حیثیت سے درجہ بلند ہوتا ہے، ہندوستان چند صدیوں قبل ایسے ممالک کے زمرہ میں شامل تھا۔ جنگ عظیم میں اور اس کے بعد بھی اسے وہ درجہ نصیب نہ ہوا۔ حالیہ جنگ عظیم تو اسے خود مکتفی ہونے کے مواقع فراہم کر رہی ہے۔ اگر اب بھی وہ سابقہ حیثیت حاصل نہ کر سکا جس کا کبھی وہ حامل تھا تو وائے بر حالِ ہندوستان۔

کپاس صنعت بافندگی کی وہ بنیادی شئے ہے جس کے کپڑوں میں دنیا کی نوے فیصدی آبادی ملبوس ہوتی ہے۔ کپاس کو ڈھونڈ نکالنے اور اس سے پہلی مرتبہ تاگا کاتنے اور کپڑا بنانے کا سہرا ہندوستانیوں کے سر ہے۔ زمانۂ وید میں ایک دنیا فنِ پارچہ بافی سے واقف تھی تاگا کاتنے کا گھر گھر رواج تھا اور پچاس فیصدی گھروں میں کپڑا بُنا جاتا تھا اور یہ کپڑا اتنا مہین اور نفیس ہوتا تھا کہ آج وہی ہندوستانی اس کے بننے پر قادر نہیں بلکہ موٹے کپڑے میں صفائی و نفاست کے لیے لنکا شائر اور مانچسٹر کے مرہون منت ہیں۔

زمانۂ وید میں جلاہوں کے سوا عالم اور شاعر بھی اس فن سے واقف تھے اس فن کے عام ہونے کی اس سے زیادہ بڑی دلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

وید کی کتابوں سے چند فقرے یہاں درج کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کے طریقۂ بافندگی اور کپڑے کی ساخت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) "فکر مجھے اس طرح کھاتی ہے جیسے چوہا جلاہے کے تاگے کو کاٹ کھاتا ہے۔"

(۲) "دن اور رات اپنی روشنی اور اندھیرا اس وسیع زمین پر اس طرح پھیلاتے ہیں جیسے دو مشہور جلاہنیں کپڑا بنتی ہیں۔"

یہ طریقۂ کار ابھی تک ہندوستان میں رائج ہے اور راقم نے ناندیڑ میں اس طرح دو عورتوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ صرف بڑے پنے کے مال کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا اس زمانے میں بڑے پنے کا مال بھی تیار ہوتا تھا۔ پہلے فقرہ میں جلاہا مذکر ہے اور دوسرے فقرہ میں جلاہنیں جمع مونث ہے۔ معلوم ہوا کہ پورا خاندان اس کام میں مصروف رہتا تھا۔ مشہور کا لفظ دنیا کی بساط کے مشہور مہرے ساس اور بہو کو پیش کرتا ہے یا اس فن کے عام رواج کو ظاہر کرتا ہے۔

(۳) "بہترین کپڑوں میں ملبوس کہ آسمان والے رشک کریں۔"

یہ فقرہ اس زمانے کے کپڑے کی ساخت کو ظاہر کرتا ہے۔ بقول شاعر ایسا مہین و نفیس کپڑا فرشتوں کو بھی نصیب نہیں۔

وید کی تاریخ تصنیف نامعلوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح اور بارہ سو سال قبل مسیح کے درمیان کوئی تاریخ

یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ اس کتاب میں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا
کہ کپڑے کن ریشوں سے تیار کئے جاتے تھے۔ بعد کی کتابیں
راماین اور مہابھارت اور قوانین منو (ایک ہزار سال
قبل مسیح) میں جابجا ریشوں کا ذکر موجود ہے۔ راماین میں
سیتا کی شادی کے تحائف کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ تحفہ جات
اونی مال، پوستین (Furs)، قیمتی پتھر، رنگ برنگی مہین
ریشمی (ریشم نما) پوشاک، بیش بہا زیورات اور تکلف گاڑیوں
پر مشتمل تھے۔

رنگ برنگی ریشمی (Silken) پوشاک میں
شاید سوت کا میل ہوتا تھا یا صرف سوت کے کپڑے اتنے
مہین ہوتے تھے کہ ریشم جیسے دکھائی دیں اگر یہ دونوں بھی
نہ ہوں تو یہ ظاہر ہے کہ کپاس کے سوا ریشم اور اون کے
کپڑے بھی اس زمانے میں بنتے تھے اور رنگائی کا رواج
تھا۔ "رنگ برنگی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ رنگائی ترقی یافتہ تھی۔

مہابھارت میں ریشہ کے ساتھ ساتھ اس کے کپڑے
کا مقام تیاری کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ شہنشاہ یودھشٹرا
کو باجگذار شاہزادے تحائف روانہ کرتے تھے۔ ان کا ذکر
مہابھارت میں موجود ہے۔ ہندوکش کا پوستین (Furs)
گجرات کے ابھیرا کی طرف سے اونی شال، بھیڑ اور بکری کے
اون، کیڑے کے بنائے ہوئے تاگے (ریشم) اور پودے کے
ریشے (سن) کے کپڑے جو شمال مغربی ہمالیہ کے قبائل کے
بنائے ہوئے ہوتے تھے۔ خالص کتان کے کپڑے، جنگم،
کرناٹک اور میسور کی رعایا کی طرف سے اس شہنشاہ کو تحائف
میں روانہ کئے جاتے تھے۔

قوانین منو میں ریشہ جات پارچہ بافی اور رنگائی کے متعلق
تذکرے موجود ہیں۔ ایک مقام پر گنجی یا مانڈ کا ذکر کیا گیا ہے۔ آج
گنجی صرف تاگے کو پارچہ بافی کے قابل بنانے کے لئے نہیں لگائی جاتی
بلکہ کپڑے کو وزن دار اور اس کی جھلملاہٹ چھپانے کے لئے بھی
یہ طریقہ آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے بھی تھا فرق اتنا ہے کہ
یہ فعل اس وقت بُرا سمجھا جاتا تھا اور آج کوئی عیب نہیں۔ بلا روک
ٹوک چینی مٹی کا استعمال وزن کے لئے کیا جاتا ہے۔ غرض جو قانون
"قوانین منو" میں زیادہ گنجی کی روک تھام کے لئے درج ہے۔
حسب ذیل ہے۔

قوانین منو (باب جلد ۳۰) ایک جولاہا جسے دس پلے سوتی
تاگا دیا گیا ہے اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اسے چاول کے پانی (کانجی)
سے یا اسی قسم کی اور کوئی شئے سے جو پارچہ بافی میں استعمال ہوتی
ہے۔ گیارہ تک بڑھا کر واپس دے سکتا ہے۔ وہ جو اس کی
خلاف ورزی کرائے گا اسے ۱۲ پنے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔"

قوانین منو کے اس قانون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک ہزار
سال قبل مسیح ہندوستان میں سوت کو بننے کے قابل بنانے کے لئے
کانجی یا اس قسم کی دوسری شئے لگاتے تھے پھر کپڑا بنتے تھے۔ چند
جلاہوں نے زیادہ گنجی لگا کر دھوکا دینا شروع کیا تو اس کی روک
تھام قانون کے ذریعہ کی گئی۔

غرض راماین اور مہابھارت اور قوانین منو سے پتہ چلتا
ہے کہ کپاس کے ساتھ ساتھ دیگر ریشہ جات، ریشم، اون، کتان
کے بھی کپڑے اس زمانے میں تیار ہوتے تھے۔ رنگائی اس درجہ
ترقی یافتہ تھی کہ کپڑے رنگ برنگ کے تیار ہوتے تھے۔

"تاریخ صنعت کپاس انگلستان میں تحریر ہے کہ صنعت کپاس
کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی اور اس صنعت کو مستند تاریخ لکھے
جانے سے قبل کمال حاصل ہو چکا تھا۔

(۴۸۴ - ۴۰۴ - قبل مسیح HERODOTUS)
ہیروڈوٹس یونان کے مشہور فلسفی سیاح اور پہلے مورخ نے جلد دوم

میں کپاس کے متعلق اس طرح ذکر کیا ہے "اس ملک (ہندوستان) کے جنگلی پودوں کا پھل روئی ہوتا ہے۔ جو خوبصورتی اور نفاست میں بھیڑ کے اون سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور ہندوستانی اس کا بنایا ہوا کپڑا پہنتے ہیں۔"

تھیوفراسٹس (۳۷۰ تا ۲۸۰ قبل مسیح ارسطو کا چیلہ) کپاس کے متعلق اس طرح لکھتا ہے۔ "ہندوستانی جس پودے سے کپڑے بناتے ہیں اس کے پتے سیاہ شہتوت کے مماثل ہوتے ہیں۔ مگر پورا پودا (DOG ROSE) کتا گلاب کے مشابہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ انھیں کھیتوں میں قطار در قطار لگاتے ہیں جو دور سے انگور کی بیل کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ ان پودوں کو پھل نہیں لگتا بلکہ وہ خول جس میں اون رہتا ہے بند حالت میں تقریباً "بہی" کے سائز کا ہوتا ہے اور جب پکتا ہے تو پھٹ جاتا ہے تاکہ اون کو نکال دے جس سے سستے اور قیمتی کپڑے بنے جاتے ہیں۔" یورپ کے سیاح جو صرف اون سے واقف تھے۔ کپاس کو دیکھ کر اون پودوں سے یا خول سے دستیاب ہوتا ہے کہا کرتے تھے۔

روما کی عظیم الشان سلطنت ہندوستان سے کپڑا خریدا کرتی تھی۔ خاص طور پر مہین ململ۔ سلک۔ زربفت اور اس کی قیمت اس کے ہم وزن سونے میں ادا کرتی تھی۔

(۲۳ - ۷۹ عیسوی PLINY) پلینی اپنی تاریخ قدرت میں (Historia naturalis) جس کی تاریخ اشاعت ۷۷ عیسوی ہے لکھتا ہے "کوئی سال ایسا نہیں ہوتا جس میں ہندوستان سلطنت روما کے ایک سو ستر ملین (ایک کروڑ پانچ لاکھ روپیہ کے دار) نہ کھینچ لے جاتا ہو۔" بقول پلینی سلطنت روما کی دولت ہندوستان بہہ کر چلی آرہی تھی۔ اور یہ صرف یہاں کے کپڑوں کی بدولت، جو یہاں کی کپاس کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔

مسٹر جے۔ اے مان (J.A.MANN) جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (Journal The Royal Asiatic society) جلد ۱۲ ۱۸۶۰ء میں ہندوستان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ وہ "کپاس کے پودے کا پہلا مقام اور صنعت کپاس کا پیدائشی گھر ہے۔"

غرض مسٹر رچرڈ مارسڈن (Richard Marsden) کے الفاظ میں "بہترین تاریخی مواد جو فراہم ہو سکا ہندوستان کو صنعت پنبہ کا پیدائشی مقام بناتا ہے مگر کب یہ شروع ہوئی اور کب تک خالص دستی صنعت رہی یا کس تاریخ پہلی مرتبہ گنوار و میکانی اوزار استعمال کئے گئے یہ وہ اس کی تاریخی تفصیلات ہیں جو قدیم ترین زمانہ کے اطراف چھائے ہوئے کہر میں نہ ملنے کے لئے غائب ہو گئی ہیں۔" جب یہ کہر کسی قدر ہٹا تو موہن جی دارو کی کھدائی نظر آئیں اور قبل تاریخ کے تمدن کا انکشاف ہوا۔ ادھر سے یہ کہر محیط ہو گیا۔ ان کھدائیوں سے دیگر اشیاء کے ساتھ سوتی کپڑا اور سوتی تاگا بھی دستیاب ہوا ہے۔ کراچی سے تقریباً دو سو میل شمالی مشرق علاقہ سندھ میں دریائے اندلس کی وادی میں موہن جی دارو واقع ہے۔ کتبات جو ان کھدائیوں سے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ پتہ چلا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل یہاں متمدن اقوام بستی تھیں جو کپاس کے بنائے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔ سر جان مارشل (Sir John Marshal) ناظم آثار قدیمہ فرماتے ہیں۔ "بابی موفی اور یونانی کپاس کے نام (سندھو اور سندن علی الترتیب) ہمیشہ وادی اندلس کو کپاس کے اگنے کا مقام بتاتے رہے ہیں۔" کھدائیوں سے حاصل کیا ہوا سوتی کپڑا اور تاگا اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی کا رسالہ اسی سلسلہ میں

خامہ فرسائی کرتا ہے "آثار بتاتے ہیں کہ جو کپاس موہن جی دارو میں حاصل ہوئی ہے وہ (۸۰۰ آٹھ سو سال قبل مسیح) مقرر کردہ تاریخ سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ اس کی تاریخ تین ہزار سال قبل مسیح ہونی چاہیئے۔"

تصنیف ویدکی اوسط تاریخ (۲۶۰۰ سال) قبل مسیح نکلتی ہے جو کاٹن کمیٹی کی معین کی ہوئی تاریخ ۳۰۰۰ ہزار سال قبل مسیح سے قریب تر ہے۔ اور ویدکے اور دیگر حوالوں سے یہ بتایا جاچکا ہے کہ اس زمانہ میں یعنی آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل ہندوستانی صرف کپاس کو جانتے ہی نہ تھے بلکہ اس کے کپڑے بنانے میں ماہر بھی تھے۔ اور اس فن کا رواج عام تھا۔ یہ تو رہا صنعت کپاس کے کمال کو پہونچنے کا زمانہ اور اس کی ابتدا بقول سٹر مارسٹان "کہر" میں ہے۔ تاریخ کسی اور مقام کے متعلق یہ نہیں بتاتی کہ اس مقام پر پانچ ہزار سال قبل صنعت کپاس (عروج کا ذکر ہی کیا) ابتدائی حالت میں تھی، جب صورت حال یہ ہو تو ہر مورخ مجبور ہے یہ کہنے پر جو مسٹر اے، ایس، پیرس (A. S. Pearse) نے اپنی کتاب دی کاٹن انڈسٹری آف انڈیا (The cotton Industry of India) میں کہا ہے ہندوستان اس عظیم الشان (صنعت کپاس) کا پیدائشی مقام ہے جو آج دنیا کے ہر متمدن خط میں پھیل گئی ہے۔

میر لطیف علی

یادِ ماضی

ہم بھی کبھی اسیر تھے گیسوئے اعتبار میں
اب وہ لطافتیں کہاں جلوۂ نو بہار میں

حاصلِ زندگیٔ عشق یعنی متاع دو جہاں
بکھرے ہوئے ہیں لختِ دل دامنِ تار تار میں

دے نہ پیامِ فصلِ گل ڈوب چکی ہے نبضِ دل
کیسے بنائیں آشیاں رکھا ہے کیا بہار میں

عقل و خرد کا درس دے مجھ کو نہ پیرِ مدرسہ
خضرِ جنوں ہے راہبر منزلِ یادِ یار میں

قصۂ غم کا ہو بُرا وہ بھی نہ تاب لا سکے
تارے سے کچھ جھلک اٹھے نرگسِ شرمسار میں

ہے یہ کرشمۂ نگاہ عرصۂ کائنات کیا
ہے یہ فریب رنگ و بو کچھ بھی نہیں بہار میں

ہستی کو میری اے ظفر سمجھیں گے اہلِ عرش کیا
دل ہوں مگر بشکلِ غم سینۂ روزگار میں

محمد مظفر الدین ظفر

کہاں ہے مرد؟

مس نوشابہ ملک کی مشہور مقرر تھیں...... جیسی دلکش اور اثر آفریں ان کی شخصیت ویسی ہی دلکش اور اثر آفریں ان کی تقریر ... ان کی آنکھوں اور زبان دونوں میں جادو تھا۔ ان کی تقریروں کو سننے والے کچھ تو صرف انھیں دیکھتے رہتے اور کچھ صرف سنتے رہتے۔ ... سب سے مزے میں وہ رہتے جو دیکھتے رہتے اور سنتے رہتے' سنتے رہتے اور دیکھتے رہتے۔ لیکن دیکھنے اور سننے والے ان کے ہمجنس ہی ہوتے۔ مردوں کے مجمع کو انھوں نے آج تک مخاطب نہیں کیا۔ ان کی ساری تقریریں، طبقۂ نسوان، کے لئے مخصوص ہوتیں۔ چند دنوں سے مس نوشابہ، کسی غیر معمولی واقعہ سے متاثر نظر آتی تھیں.. ذہنی کشمکش کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا تھا، جس سے چھٹکارا پانے کے لئے مس نوشابہ تڑپ رہی تھیں، مچل رہی تھیں۔ لیکن مایوسی ہر طرف مسکراتی نظر آتی... جس دن انھیں ایک جلسہ میں خاص طور پر بلایا گیا تھا... وہ دن ان کی امیدوں کا آخری سہارا تھا... اس کے بعد ان کی زندگی ایک ڈراؤنا خواب ہو کر رہ جاتی۔ اجڑا ہوا باغ بن جاتی۔ مس نوشابہ صحن میں ٹہل رہی تھیں۔ جلسہ میں جانے کا وقت قریب آ رہا تھا... انھوں نے اپنی ماما کو آواز دی

.. "کوئی خط؟" مس نوشابہ نے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔ "جی نہیں"..

"کچھ..." "جی کچھ نہیں"... "ڈرائیور سے کہو وہ موٹر لائے"

چار بج رہے تھے۔ مس نوشابہ جلسہ کی شرکت کے لئے روانہ ہوئیں۔ ان کا ذہن موٹر کے انجن سے زیادہ تیز رفتاری سے اپنا کام کر رہا تھا۔

"کوئی خط نہیں، کوئی خبر نہیں... اوہ میں نے بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لی... خیر... میں عورت ہوں میں سمجھ لوں گی...."

مس نوشابہ مردوں کی طرف سے نہ جانے کیوں بُخار کھائے بیٹھی تھیں... ان کی اکثر تقریریں ایسی ہوتیں، جن میں "بے چارے" مرد خواہ مخواہ گھسیٹے جاتے۔ اور کسی نہ کسی عنوان سے ان پر تبرا کیا جاتا... اگر دوران تقریر میں مس نوشابہ بھاپ سے بھری کیتلی کی طرح اچھلتی دکھائی دیں، یا ان کے چہرے کا سرخ و سفید، رنگ صرف سرخ اور وہ بھی شوخ سرخ ہو جائے اور ان کی بھنچی ہوئی مٹھیاں میز سے "مکہ بازی" کرنے لگیں تو یقین مانئے وہ مردوں ہی کا ذکر خیر ہوگا "ایسے ہوتے ہیں، ویسے ہوتے ہیں یہ کرتے ہیں، اور وہ کرتے ہیں۔ اور اب ہمیں یہ کرنا چاہیئے، وہ کرنا چاہیئے۔" اور "انتقام" "انتقام" کی چیخوں سے "کمرۂ تقاریر" گونجنے لگے۔

اس دن تو ان کی تقریر نے ایسا جوش پھیلایا کہ معزز خواتین، میں سے ہر ایک نے بہ آواز بلند مردوں کے خلاف "تحریک ملامت" منظور کی۔ غضبناک چہرے.. دہکتی ہوئی آنکھیں... کٹکٹاتے ہوئے تیز تیز دانت... سب ڈھونڈ رہے تھے۔

"کہاں ہے مرد؟" اس وقت کسی مرد کی نظر اس مجمع پر پڑ جاتی تو عورتوں کو پردہ میں رکھنے کی مصلحت" حفظ ماتقدم" کے سوا کچھ اور سمجھ میں نہ آتی۔ یہی مجمع "انتقام" "انتقام" چیختا ہوا، چار دیواری کے باہر ہو جائے تو؟ کیا کچھ آفت نہ مچے..

" مردوں کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا"

مس نوشابہ.. نے اپنے ہاتھ کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

ایک کونہ میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ مس نوشابہ نے تقریر روک دی۔ ان کا چہرہ اس رکاوٹ اور انتشار پر غصہ اور ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔ جو بے چینی ایک منہ زور اور سرکش گھوڑے کو تھامنے والے سوار کو ہوتی ہے۔ مس نوشابہ اپنی تقریر کے رک جانے سے کچھ اسی قسم کی بے چینی محسوس کر رہی تھیں مصیبت

یہ تھی کہ مس نوشابہ کے جملے نے ایک خاتون کو ہچکیاں لے لے کر رونے پر مجبور کردیا۔ بازو بیٹھنے والیوں نے دم دلاسا دیکر پوچھا کہ " آخر کیا بات ہے ؟" ہچکیوں کی آڑ میں جن لفظوں نے اپنی آواز سنائی وہ یہ تھے.. " وہ جو... نوکری پر.. مجھے اکیلا چھوڑ کر.. گئے.... مصلحت ... ہے... کیا ؟ ہائے.... "

اور... دھاڑیں مار کر رونا جیسے کہتے ہیں، وہ شروع ہوگیا۔ انھوں نے تقریر سے پہلے ہی اپنی سہیلیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک بار رونا شروع کر دیتی ہیں تو کوئی قوت انھیں روک نہیں سکتی۔ گھنٹوں روتی رہتی ہیں۔" اب بھلا انھیں چپ رہنے پر آمادہ کرنا کس کے بس کا تھا۔ مس نوشابہ نے چیخا۔ " رونے دھونے سے کام نہیں چلتا۔ اب رو رو کر نہیں ہنس ہنس کر مردوں کو رلانے کا وقت آگیا ہے۔ اپنی حالت اور قسمت پر آنسو نہ بہاؤ میں کہتی ہوں اب وہ وقت دور نہیں جب کہ زمانہ کروٹ بدلے.. ہم مرد کی جگہ اور مرد ہماری جگہ نظر آئے۔ مرد نے جی کھول کر ہمیں ستالیا.. اب مظلوموں کی باری ہے کہ وہ بدلہ لیں...

ہچکیاں تالیوں کی آواز اور چوڑیوں کی جھنکار میں گھل مل گئیں... اور اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی.. مس نوشابہ کی آواز بجلی کی لہر کی طرح ساری فضا کو لرزا رہی تھی۔" .. بہنو زمانہ تمھارا ساتھ دے گا۔ علم کے ہتیار اٹھالو.. ہر میدان میں کود پڑو.. اس کائنات کے وارث تم بھی ہو۔ دل تمھارے سینوں میں بھی ہیں.. آنکھیں تمھارے چہروں پر بھی ہیں.. تمھارے دل جل جل کر اور گھٹ گھٹ کر ٹھٹھرنے کے لئے نہیں۔ تمھاری آنکھیں دیواروں کی سفیدی کو دیکھ دیکھ کر پھوٹنے کے لئے نہیں۔ تم دنیا کی زینت ہو.. دنیا اگر باغ ہے تو تم پھول ہو.. ہواؤں میں جھولو، فطرت کے نظاروں میں لہلہاؤ۔ تم.. میری پیاری بہنو۔ تم زندہ رہو.. تمھاری موجودہ زندگی اس " ممی" کی زندگی ہے، جو " نمائش" کے لئے مقفل اور پہرہ دار عمارتوں میں رکھی جاتی ہے۔ جس میں جان نہیں ہوتی۔ جس کے جسم کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جو صرف نمائش کے لئے ہوتی ہے جس سے زندگی چھن جاتی ہے۔ نہ میری بہنو" مس نوشابہ کی آواز بھرّا گئی، آنکھوں میں آنسو آگئے" انھوں نے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ اور دستی سے آنکھیں صاف کیں، .. " ہوں " انھوں نے مجمع پر نظر ڈالی، کونسی آنکھ تھی... جن میں آنسو نہ تھے ؟ کونسی دستی تھی جو تر نہ تھی ؟ کونسا گلا تھا جو ہچکیوں سے گھٹ نہ رہا ہو ؟ مس نوشابہ کو رحم سے کام لینا چاہیئے تھا۔ مردوں کے حق میں نہیں.. ان کی بہنوں.. عورتوں کے لئے، سب کی سب ہلکان ہوئی جارہی تھیں..... بھلا یہ بھی کوئی تقریر ہے کہ سننے والے کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا جائے۔ مگر مس نوشابہ تو اپنے سینے میں طوفان کو روکے ہوئی تھی... وہ اپنا پورا جوش دکھائے تو ان کی تقریر بھی ختم ہو۔" ہمیں مرد جانور سمجھتے ہیں.." ان کی آواز ہچکیوں اور ہو ہو کے دھیمے شور میں، آہستہ آہستہ گرنے والے پرنالوں میں بجلی کی کڑک کی طرح سنائی دی۔" ہماری عزت ان کی نظر میں لونڈیوں کی سی ہے.. حالانکہ ہمارے حسن کے آگے چاند شرماتا ہے۔ ہماری مسکراہٹوں پر پھولوں کی چٹک نثار ہوتی ہے۔ ہمارے جسموں کی لطافت حوروں کی نظروں کو چندھیاتی ہے۔ ہماری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک ہوتی ہے۔ ہمارے دل نورانی ہوتے ہیں۔ ہم وہ ہیں جن کی قوت کے آگے دنیا کا ذرہ ذرہ مسجود نظر آتا ہے.. مگر آدم کا ناخلف بیٹا مرد.. عورت کو کھلونے سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ کم سمجھ سمجھتا ہے.. اور دنیا کو اکیلا سنبھالنا

چاہتا ہے، مگر جب تک میں زندہ ہوں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ جہالت نے ہماری عقلوں کو ہم سے چھین لیا تھا۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ ہم بھول گئی تھیں کہ ہم عورت ہیں۔" عورت ہیں۔" کھلونا نہیں ہیں۔ غلام نہیں ہیں۔ کم سمجھ نہیں ہیں۔" مس نوشابہ کی آواز مریض کی کراہ بن رہی تھی اور کمرہ کی چھت لرزنے لگی تھی "میری پیاری بہنو" مگر پیاری بہنو کے کان گنگ تھے۔ ان کے جسم بید کی طرح کانپ رہے تھے۔ اور وہ صرف پھٹے ہوئے دیدوں سے مس نوشابہ کے جوش کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے دل شعلوں کی طرح جل رہے تھے۔ اور ان کے غضب ناک چہرے، دہکتی ہوئی آنکھیں اور تیز تیز دانت، سب مرد کو ڈھونڈ رہے تھے "کہاں ہے مرد؟" پانی کا ایک گھونٹ حلق سے اتار کر مس نوشابہ نے دھیمے لہجہ میں کہنا شروع کیا "مرد کی قوت کو توڑنا آسان نہیں ہے۔ ہمیں ساری دنیا کی قوت کو توڑنا پڑے گا۔ ہمیں اپنے حقوق منوانے پڑیں گے۔ اپنی آزادی کو ان کے مضبوط ہاتھوں سے چھین لینا پڑے گا۔ ہم مردوں کو قید کرنا نہیں چاہتیں ہم انھیں آزاد دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے برابر نہیں تو اس قدر پست بھی نہ سمجھیں۔ ان سے وعدے لے لیں کہ وہ عورتوں کے نازک دلوں کو "بیوفائی کی" گرم انگار" سلاخوں سے چھلنی نہ کریں... دھوکہ بازی، مکر، فریب اور جھوٹ سے توبہ کرلیں۔ شادی کا وعدہ کریں تو شادی کرلیں... مگر مرد "شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس مقام پر مس نوشابہ کی نظروں میں کسی کا تصور کوند گیا۔ مس نوشابہ نے جوش کے ساتھ کہنا شروع کیا۔" ان سے کہدوں گی کہ میں ان شرایط پر صلح کرنے آمادہ ہوں" حاضرین میں بےچینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور سب تعجب سے مس نوشابہ کی طرف دیکھنے لگیں" مجھ سے انھوں نے جو وعدہ کیا ہے۔ انھیں پورا

کرنا ہوگا۔ ورنہ... ورنہ... میں ساری دنیا کے مردوں سے بدلہ لوں گی۔ اتنے میں باہر سے ان کی ماما آئی۔ تیز تیز قدم اٹھائی وہ مس نوشابہ تک پہنچی۔ اور میز پر ایک چھٹی رکھ کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ مس نوشابہ نے چھٹی اٹھائی۔ اور پڑھنے لگیں۔

"پیاری بہنو' میں نے تمھارا قیمتی وقت ضایع کیا۔ گھروں میں تمھارا انتظار کیا جارہا ہوگا۔ آج میں جوش میں جانے کیا کیا کہتی رہی۔" سمع خراشی کا باعث بنی۔ لیکن میری بہنو۔ مجھے خوشی ہے کہ جو آگ میری سینے میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ آج تقریر بنکر نکل گئی۔ اور مجھے اور بھی خوشی ہوگی اگر اس آگ کی چنگاری ہر سننے والی کے دل میں سلگتی رہے۔ تمھیں دنیا کی ساری حقیقتوں سے انکار ہو لیکن اپنی مظلومی سے انکار نہ ہونا چاہیئے... اور مردوں کے خلاف جو میں نے کھری کھری سنائی ہے۔ اس کے لئے میں معافی چاہتی ہوں۔ کیونکہ ان مردوں میں... وہ مرد بھی شامل ہوگئے... جن میں ہم" دبے ہوئے قہقہوں کی آواز نے مس نوشابہ کو شرما دیا.....

"جی ہاں بعض مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں معاف کیا جاسکتا ہے۔ جو عورتوں کے لئے دنیا سے لڑ سکتے ہیں۔ یہ چٹھی جو ابھی آئی ہے.. وہ... کی ہے.. اس نے لکھا ہے کہ سوسائٹی، رشتہ دار، دوست احباب... دنیا، ان سب کی اس کو پروا نہیں... اسے اگر پروا ہے۔ تو میری ہے۔ ایک عورت کی... وہ مجھے لینے آیا ہے.. مجھے اجازت دیجیئے۔ تالیوں کی گونج میں مس نوشابہ نے دروازہ کا رخ کیا۔ کمرۂ تقریر میں ہنسی دل لگی، گانے اور ہلکی ہلکی چہلوں کی عملداری قایم ہوگئی.. اور عورت اپنی مظلومی، اور مرد کی جفاکاری، سب کچھ بھول گئی۔

رشید قریشی

چیخوف کی آپ بیتی

یہ آپ بیتی انطون چیخوف کے ایک خط مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۹ء سے لی گئی، جو کہ ڈاکٹر جی، آئی رسولی موکا موسومہ ہے۔ ۱۸۸۴ء میں جن ڈاکٹروں نے ڈگریاں لی تھیں، ان میں چیخوف بھی شامل ہے، ڈاکٹر رسولی موان لوگوں کی ایک انجمن امداد باہمی کے خزانہ دار تھے۔ اس خط میں چیخوف لکھتا ہے۔" جناب میری آپ بیتی طلب فرماتے ہیں، ناچیز تو آپ بیتیوں کا مریض ہے۔ اپنے مخصوص حالات کا مطالعہ، اس کے مصیبت یہ کہ ان کو طبع کرنے کی غرض سے قلمبند کروں، میرے لئے انتہائی تکلیف دہ امر ہے۔ تاہم ایک علٰحدہ کاغذ پر میں نے اپنی زندگی کے چند حقایق پیش کر دیئے ہیں۔ جناب! اس سے زیادہ کچھ لکھنا میرے امکان سے قطعی باہر ہے۔"

میرا نام انطون چیخوف ہے۔ میری پیدایش ۱۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو بمقام ٹگن راگ ہوئی۔ میری ابتدائی تعلیم ٹگن راگ کنسٹانٹین چرچ میں ہوئی۔ اس کے بعد ٹگن راگ گرامر اسکول میں پڑھتا رہا۔ ۱۸۷۹ء میں ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ طب میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں مختلف فنون کے متعلق عام طور پر میری کوئی مستقل رائے نہیں تھی۔ شعبۂ طب کو میں نے کیوں پسند کیا، اس کی کوئی وجہ مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس انتخاب سے مجھ کو بعد میں کوئی تاسف نہیں ہوا۔ ابھی میں سالِ اول میں تھا کہ میں نے روزناموں اور ہفتہ وار پرچوں میں مضامین شائع کرنے شروع کر دئے۔ اور اوائل ۱۸۸۰ء میں ان مصروفیتوں نے مستقل اور پیشہ ورانہ صورت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۸ء میں مجھ کو "پشکن پرائز" سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں مجرمین کی مقامی نو آبادی کے متعلق کتاب لکھنے کی غرض سے سنگھالین گیا۔ میری بیس سالہ ادبی خدمات مختصراً یہ ہیں، بے شمار قانونی رپورٹس تبصرے، چھوٹے بڑے مضامین، اطلاعات اور جو کچھ بھی آئے دن جرائد میں شایع کیا کرتا تھا ان سب کو تلاش و جمع کرنا دشوار امر ہے، ان کے سوا بشمول ناول و افسانہ، تین سو کتابیں شایع کیں۔ میں نے تھیٹر کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مڈیکل سائنس کے مطالعہ نے میری ادبی خدمات پر نہایت گہرا اثر ڈالا، اس سے میرے غور و تفکر میں وسعت حاصل ہوئی اور قیمتی معلومات سے بہرہ اندوز ہوا بحیثیت مصنف میرے نزدیک ان کی جو قدر و وقعت ہے، اس کا صحیح احساس اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو خود بھی ڈاکٹر ہو۔ اس میں میں ہدایت و رہنمائی کی قوت محسوس کرتا رہا۔ اور شکر ہے کہ خواص الادویہ کے علم نے مجھ کو اکثر غلطیوں سے پاک رکھا۔ طبی علوم کی معلومات اور سائنٹفک قواعد و ضوابط میرے لئے ہمیشہ نگران کار و نگہبان ثابت ہوئے۔ جہاں تک ہو سکا میں نے سائنٹفک اصول کو پیش نظر رکھا، اور جب کبھی یہ ممکن نظر نہیں آیا تو میں نے کچھ نہ لکھنے ہی کو ترجیح دیا۔ برسبیل تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کرتا ہوں کہ آرٹ سے پیدا کی ہوئی کیفیتیں، سائنٹفک اصول سے ہمیشہ مماثلت نہیں

چاہتا ہے، مگر جب تک میں زندہ ہوں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ جہالت نے
ہماری عقلوں کو ہم سے چھین لیا تھا۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ
دی تھی۔ ہم بھول گئی تھیں کہ ہم عورت ہیں۔" عورت ہیں۔"
کھلونا نہیں ہیں۔ غلام نہیں ہیں۔ کم سمجھ نہیں ہیں۔" مس نوشابہ
کی آواز مریض کی کراہ بن رہی تھی اور کمرہ کی چھت لرزنے لگی تھی۔
"میری پیاری بہنو" مگر پیاری بہنو کے کان گنگ تھے۔ ان کے
جسم بید کی طرح کانپ رہے تھے۔ اور وہ صرف پھٹے ہوئے
دیدوں سے مس نوشابہ کے جوش کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے دل
شعلوں کی طرح جل رہے تھے۔ اور ان کے غضبناک چہرے،
دہکتی ہوئی آنکھیں اور تیز تیز دانت، سب مرد کو ڈھونڈ رہے
تھے "کہاں ہے مرد؟" پانی کا ایک گھونٹ حلق سے اتار کر مس نوشابہ
نے دھیمے لہجہ میں کہنا شروع کیا "مرد کی قوت کو توڑنا آسان
نہیں ہے۔ ہمیں ساری دنیا کی قوت کو توڑنا پڑے گا۔ ہمیں اپنے
حقوق منوانے پڑیں گے۔ اپنی آزادی کو ان کے مضبوط ہاتھوں
سے چھین لینا پڑے گا۔ ہم مردوں کو قید کرنا نہیں چاہتیں ہم
انھیں آزاد دیکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ
ہمیں اپنے برابر نہیں تو اس قدر پست بھی نہ سمجھیں۔ ان سے وعدے
لے لیں کہ وہ عورتوں کے نازک دلوں کو "بیوفائی کی" گرم انگار"
سلاخوں سے چھلنی نہ کریں۔ دھوکہ بازی، مکر، فریب اور جھوٹ
سے توبہ کرلیں۔ شادی کا وعدہ کریں تو شادی کرلیں۔ مگر مرد
"شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس مقام
پر مس نوشابہ کی نظروں میں کسی کا تصور کوند گیا۔ مس نوشابہ
نے جوش کے ساتھ کہنا شروع کیا "ان سے کہدوں گی کہ میں
ان شرایط پر صلح کرنے آمادہ ہوں" حاضرین میں بے چینی کے
آثار پیدا ہونے لگے۔ اور سب تعجب سے مس نوشابہ کی طرف
دیکھنے لگیں "مجھ سے انھوں نے جو وعدہ کیا ہے۔ انھیں پورا

کرنا ہوگا۔ ورنہ... ورنہ... میں ساری دنیا کے مردوں سے
بدلہ لوں گی۔ اتنے میں باہر سے ان کی ماما آئی۔ تیز تیز قدم
اٹھائی وہ مس نوشابہ تک پہنچی۔ اور میز پر ایک چھٹی رکھ کر الٹے
پاؤں لوٹ گئی۔ مس نوشابہ نے چھٹی اٹھائی۔ اور پڑھنے لگیں۔
"پیاری بہنو" میں نے تمہارا قیمتی وقت ضایع کیا۔ گھروں میں
تمھارا انتظار کیا جارہا ہوگا۔ آج میں جوش میں جانے کیا کیا کہتی رہی۔ اور
سمع خراشی کا باعث بنی۔ لیکن میری بہنو۔ مجھے خوشی ہے کہ جو آگ میری
سینے میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ آج تقریر بنکر نکل گئی۔ اور مجھے
اور بھی خوشی ہوگی اگر اس آگ کی چنگاری ہر سننے والی کے دل میں
سلگتی رہے۔ تمھیں دنیا کی ساری حقیقتوں سے انکار ہو لیکن اپنی مظلومی
سے انکار نہ ہونا چاہیئے... اور مردوں کے خلاف جو میں نے کھری
کھری سنائی ہے۔ اس کے لئے میں معافی چاہتی ہوں۔ کیونکہ
ان مردوں میں... وہ مرد بھی شامل ہوگئے... جن میں ہم"
دبے ہوئے قہقہوں کی آواز نے مس نوشابہ کو شرما دیا.....
"جی ہاں۔ بعض مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں معاف کیا
جاسکتا ہے۔ جو عورتوں کے لئے دنیا سے لڑ سکتے ہیں۔ یہ چھٹی
جو ابھی آئی ہے۔ وہ... کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ سوسائٹی،
رشتہ دار، دوست احباب... دنیا، ان سب کی اس کو
پروا نہیں... اسے اگر پروا ہے۔ تو میری ہے۔ ایک عورت
کی... وہ مجھے لینے آیا ہے۔ مجھے اجازت دیجیئے۔ تالیوں
کی گونج میں مس نوشابہ نے دروازہ کا رخ کیا۔ کمرۂ تقریر میں ہنسی
دل لگی، گانے اور ہلکی ہلکی چھیڑوں کی عملداری قایم ہوگئی۔ اور
عورت اپنی مظلومی، اور مرد کی جفاکاری،... سب کچھ بھول گئی۔

رشید قریشی

چیخوف کی آپ بیتی

یہ آپ بیتی انطون چیخوف کے ایک خط مورخہ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۹۹ء سے لی گئی، جو کہ ڈاکٹر جی، آئی رسولی مو کا موسومہ ہے۔ ۱۸۸۴ء میں جن ڈاکٹروں نے ڈگریاں لی تھیں، ان میں چیخوف بھی شامل ہے، ڈاکٹر رسولی مو ان لوگوں کی ایک انجمن امداد باہمی کے خزانہ دار تھے۔ اس خط میں چیخوف لکھتا ہے "جناب میری آپ بیتی طلب فرماتے ہیں، ناچیز تو آپ بیتیوں کا مریض ہے۔ اپنے مخصوص حالات کا مطالعہ، اس پہ مصیبت یہ کہ ان کو طبع کرنے کی غرض سے قلمبند کروں، میرے لئے انتہائی تکلیف دہ امر ہے۔ تاہم ایک علیحدہ کاغذ پر میں لے اپنی زندگی کے چند حقایق پیش کر دیئے ہیں۔ جناب! اس سے زیادہ کچھ لکھنا میرے امکان سے قطعی باہر ہے۔"

میرا نام انطون چیخوف ہے۔ میری پیدائش ۱۷ر جنوری ۱۸۶۰ء کو بمقام ٹگن راگ ہوئی۔ میری ابتدائی تعلیم کنگ کنسٹانٹین چرچ میں ہوئی۔ اس کے بعد ٹگن راگ گرامر اسکول میں پڑھتا رہا۔ ۱۸۷۹ء میں ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ طب میں داخل ہو گیا۔ اس زمانے میں مختلف فنون کے متعلق عام طور پر میری کوئی مستقل رائے نہیں تھی۔ شعبۂ طب کو میں نے کیوں پسند کیا، اس کی کوئی وجہ مجھ کو یاد نہیں۔ لیکن اس انتخاب سے مجھ کو بعد میں کوئی تاسف نہیں ہوا۔ ابھی میں سالِ اول میں تھا کہ میں نے روزناموں اور ہفتہ وار پرچوں میں مضامین شایع کرنے شروع کر دئے۔ اور اوائل ۱۸۸۰ء میں ان مصروفیات نے مستقل اور پیشہ ورانہ صورت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۸ء میں مجھ کو "پشکن پرائز" سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں مجرمین کی مقامی نو آبادی کے متعلق کتاب لکھنے کی غرض سے سنگھالین گیا۔ میری بیس سالہ ادبی خدمات مختصراً یہ ہیں، بے شمار قانونی رپورٹس تبصرے۔ چھوٹے بڑے مضامین۔ اطلاعات اور جو کچھ بھی

آئے دن جرائد میں شایع کیا کرتا تھا ان سب کو تلاش و جمع کرنا دشوار امر ہے، ان کے سوا بشمول ناول و افسانہ، تین سو کتابیں شایع کیں۔ میں نے تھیٹر کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ میڈیکل سائنس کے مطالعہ نے میری ادبی خدمات پر نہایت گہرا اثر ڈالا، اس سے میرے غور و تفکر میں وسعت حاصل ہوئی اور قیمتی معلومات سے بہرہ اندوز ہوا بحیثیت مصنف میرے نزدیک ان کی جو قدر و وقعت ہے، اس کا صحیح احساس اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو خود بھی ڈاکٹر ہو۔ اس میں میں ہدایت و رہنمائی کی قوت محسوس کرتا رہا۔ اور شکر ہے کہ خواص الادویہ کے علم نے مجھ کو اکثر غلطیوں سے پاک رکھا۔ طبی علوم کی معلومات اور سائنٹفک قواعد و ضوابط میرے لئے ہمیشہ نگران کار و نگہبان ثابت ہوئے۔ جہاں تک ہو سکا میں نے سائنٹفک اصول کو پیش نظر رکھا، اور جب کبھی یہ ممکن نظر نہیں آیا تو میں نے کچھ نہ لکھنے ہی کو ترجیح دیا۔ برسبیل تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کرتا ہوں کہ آرٹ سے پیدا کی ہوئی کیفیتیں، سائنٹفک اصول سے ہمیشہ مماثلت نہیں

رکھتیں۔ مثلاً زہر کھانے کے بعد فی الحقیقت جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کی صحیح تصویر اسٹیج پر کھینچنا ناممکن ہے، لیکن ایسی تمثیل میں بھی سائنس کے حقائق کا احساس لازمی ہے۔ یعنی پڑھنے اور دیکھنے والے کے لئے یہ امر بالکل صاف ہونا چاہیے کہ یہ محض تمثیل ہے، مگر اس کا سابقہ ایک ایسے مصنف سے ہے جو صورت حال سے بخوبی باخبر ہے۔ میرا شمار ان قصہ نویسوں میں ہے جو سائنس کے متعلق منفیانہ پہلو اختیار کرتے ہیں، اور نہ میرا تعلق اس جماعت کے افراد سے ہے جو ہر چیز کے متعلق صرف اپنی ہی سمجھ سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

(نوٹ از مترجم :- چیخوف کو آپ بیتی لکھنے سے دلی نفرت تھی۔ اس کی پوری تحریرات میں صرف اتنا ٹکڑا مسلسل ملتا ہے۔ اس کی زندگی کے آخری اہم واقعات یہ ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں اس نے ایشیا اور مغربی یورپ کی سیر و سیاحت کی۔ ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹروں نے اس کے مرض دق میں مبتلا ہو جانے کی تشخیص کی، اور ان کے مشورے سے ۱۸۹۹ء میں بمقام کریمیا منتقل ہوگیا ۱۹۰۱ء میں ماسکو آرٹ تھیٹر کی ایک اکٹرس سے شادی کرلی۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام بیڈن ویلر (جرمنی) اس عظیم الشان ہستی نے اپنی لازوال خدمت اور شہرت کو چھوڑ، اس دار فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔ تجہیز و تکفین کی رسم ماسکو میں عمل میں لائی گئی)

یس۔ پی۔ اننتا

پاگل

بے چین یہ نگاہ یہ اکھڑے ہوئے قدم
کچھ تو بتا مجھے! تجھے کس بات کا ہے غم

بکھرے ہوئے ہیں بال، بدن پر ملی ہے خاک
آنکھیں ہیں سرخ سرخ، گریباں ہے چاک چاک

ہاتھوں میں کس لئے ہے یہ پتھر لئے ہوئے
اور پیچھے پیچھے شورش محشر لئے ہوئے

تو کس کی جستجو میں پریشاں ہے صبح و شام
اک جا نہیں ہے تیری سکونت، ترا مقام

پروا نہیں مصائب و آفات کی تجھے
خواہش نہیں جہاں میں کسی بات کی تجھے

یہ کیوں لگی ہے لب پہ ترے مہر خامشی
گرم سخن تھا محفل دنیا میں تو کبھی

شاید یہاں نہیں ہے کوئی تیرا ہم زباں
ہے اس لئے نگاہ تری سوئے آسماں

مرزا سیمابی عالمپوری

پکوان اور خانہ داری

جس طرح انتظام خانہ داری عورت کے اہم فرائض میں داخل ہے اسی طرح پکوان سے واقف ہونا بھی ضروریات زندگی میں سے ہے۔کیونکہ جب تک پکانے سے پوری پوری واقفیت اور اس کا تجربہ نہ ہو انتظام خانہ داری مکمل نہیں ہوسکتا۔چنانچہ اپنی اس ضرورت اور کمی کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس طرف غور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور اس لئے یہ ہنر جو خاص عورتوں کے لئے ہے توجہ کا محتاج بن کر رہ گیا ہے۔

ایک عام بات ہے کہ گھر والی سے گھر ہوتا ہے۔لیکن جب گھر والی ہی اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور بے پرواہ ہوگی تو وہ گھر چلے گا کیسے؟ اور بعض دفعہ یہ معمولی سی غفلت زندگیوں کی تباہی کا باعث ہوجاتی ہے۔چونکہ سب کی طبیعتیں یکساں نہیں ہوتیں اس لئے بعض اگر ہر حال میں خوش رہنے کے عادی ہوتے ہیں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھر اور اس کی ہر چیز کو مکمل دیکھنا چاہتے ہیں۔اور ایسی صورت میں ذرا ذرا سی غلطیاں مل کر رائی کا پہاڑ بن جاتی ہیں جس کو نفاق کی جڑ سمجھنا چاہئے۔حالانکہ ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں لیکن ان کا ہونا ممکنات سے ہے۔اس لئے ان ذمہ داریوں کو جو ہمارے جزو زندگی ہیں کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

آج کل کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکیاں کبھی خانہ داری اور پکانے کی طرف توجہ نہیں کرتیں۔بلکہ گھر کے کام کاج کو ذلیل اور اپنی شان کے خلاف سمجھ کر اس سے گریز کرتی ہیں۔جس کا ان کی آئندہ زندگی پر کافی برا اثر پڑتا ہے۔میں نے بارہا دیکھا ہے کہ اگر ایسی لڑکیوں کو گھر والوں نے کہہ سن کر کبھی کبھار باورچی خانے میں بھیجدیا ہے تو اس کے سوا نتیجہ کچھ نہیں نکلا کہ کبھی ہاتھ جلے یا کپڑے اور جو چیز وہ پکارہی تھیں ادھوری چھوڑ چھاڑ کر چلی آئیں۔اور پھر گھر والوں نے ایسی توبہ کی کہ چولھے کے پاس بھیجنے کا نام نہ لیا۔اب بتائیے کہ لڑکیوں کو پکانے یا خانہ داری کا سلیقہ آئے تو کیونکر؟ پہلے لڑکیوں کو معمولی تعلیم کے ساتھ امور خانہ داری اور پکانے میں خاص طور سے لگا دیا جاتا تھا۔اور جہاں لڑکی بڑی ہونے لگی اور ماں نے اس سے رفتہ رفتہ گھر کے کام کاج لینے شروع کئے اور اس طرح اس کی عمر کے ساتھ اس میں انتظام خانہ داری اور پکوان کا تجربہ اور سلیقہ کافی پیدا ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر میں ایک منتظم بیوی ثابت ہوتی تھی۔مگر اب ایسا زمانہ آیا ہے کہ سب نے اپنی ذمہ داری اور فرض کو بھلا کر اپنی لڑکیوں کو انگریزی تعلیم اور فیشن کے سپرد کردیا ہے۔اور کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ جس چیز کو وہ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے ہیں اس کا لڑکی کی آئندہ زندگی پر کتنا برا اثر پڑے گا۔ میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم نہ دی جائے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو پکوان اور امور خانہ داری سے بھی بخوبی واقف کرایا جائے۔تاکہ وہ اپنے گھر کا انتظام حسن وخوبی سے انجام دے سکیں۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی شادی ہوئی اور میاں شادی کے تھوڑے دن بعد ہی اس کو ضلع پر اپنے ساتھ لے گئے۔کچھ دنوں تو انھوں نے اپنی بہن کو ساتھ رکھا کہ نئی دلہن پر جاتے ہی گھر کا بار نہ پڑے آخر بہن بھی کب تک رہتی' کچھ دن کے بعد وہ بھی چلی گئی۔اور اب گھر کی دیکھ بھال مکمل طور پر بیوی کے سپرد کردی گئی۔جس گھر میں عرصے سے مردوں اور وہ بھی نوکروں کا بے ڈھنگا راج ہو وہاں کی بدانتظامی کا پوچھنا ہی کیا۔چنانچہ بیوی نے گھر سنبھالنا چاہا اور جو سمجھ میں آتا کرتی رہیں۔لیکن ناتجربہ کاری سے اکثر کام بگڑ جاتے اور یہ دل ہی دل میں خفیف ہوکر رہ جاتیں اور اپنی ناتجربہ کاری

اور غلط اندازے کی وجہ ہمیشہ پریشان رہتیں۔

آخر انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال گھر کو نوکروں کے بھروسے پر ہی چھوڑ دینا چاہئے تاکہ ان کی جان اِس عذاب سے بچے الغرض اس طرح وہ گھر جو اچھے انتظام اور سلیقہ کا محتاج تھا جوں کا توں ہی رہا۔ ایک دن میاں نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ اور بیوی سے اچھے اور نفیس کھانوں کی فرمائش کی اور خاص طور سے میٹھے پکانے کو کہا۔ اور ساتھ ہی وقت پر کھانا تیار کروادینے کی بھی تاکید کردی۔ اب بیوی کی سنئے کہ بچاری نے نہ کبھی خود پکایا تھا اور نہ پکوانے کا تجربہ رکھتی تھی۔ خیر دوسری چیزیں تو نوکروں نے تیار کرنے کی حامی بھری لیکن میٹھے بیگم صاحبہ کی پسند پر رکھے گئے۔ میٹھے تو اِن کو بہت سے معلوم تھے لیکن کبھی پکائے نہیں تھے۔ اس لئے نوکروں کو جو الٹا سیدھا یاد تھا بتا دیا اور انھوں نے جس طرح دل چاہا تیار بھی کردئے۔ غرض کھانا مہمانوں کے سامنے چنا گیا اور جب میٹھا کھانے کی نوبت آئی تو میٹھے میں مکھیوں کے پر اور کوڑے بھرے ہوئے۔ بچارے مہمان بغیر کھائے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ نوکروں نے حسب عادت شکر اور گھی وغیرہ کھلا رکھ دیا تھا جس کی وجہ سے مکھیاں اور کوڑے اس میں پڑ گئے اور جلدی میں نوکروں نے اس کی طرف غور نہ کیا اور ویسے کا ویسا جھونک دیا۔ اور اس طرح لگی لگائی لاگت بھی خراب ہوئی اور غریب گھر والوں کو ندامت و شرمندگی الگ۔ دوست بھلا کب چوکنے والے تھے دنوں اپنے میزبان کو ستاتے اور بناتے رہے۔

لیکن اس واقعہ کے بعد سے اس لڑکی کو اپنی سب سے بڑی ذمہ داری کا احساس اتنا ہوا کہ وہ گھر کے ہر کام میں خود حصہ لینے لگی اور کسی موقعہ پر بھی نوکروں پر بھروسہ نہ کرتی۔ اور خود کام کرنے کی وجہ سے تھوڑے عرصے میں خاصا تجربہ اور ہر چیز کا اندازہ ہوگیا۔ اور اب میٹھے میں کبھی مکھیوں کے پر اور کوڑے نظر نہیں آتے۔

کاش لڑکیاں اور لڑکیوں کی مائیں اس طرف خاص طور سے توجہ کریں اور لڑکیوں کو ضرور پکوان سے واقف ہونے کا موقعہ دیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پھر از سرِ نو خانہ داری اور پکانے کا شوق پیدا ہو رہا ہے اور ہر مدرسے میں تعلیم کے ساتھ اِس کی تعلیم بھی باقاعدہ ہو رہی ہے جس میں خاص طور سے مدرسۂ صنعت و حرفت میں ہر قسم کے پکوان اور خانہ داری کے ساتھ اور بہت سے مختلف کام بھی سکھائے جا رہے ہیں اور محترمہ مسز باقر علی خاں مہتممہ مدرسہ کی دلی خواہش یہ ہے کہ جملہ کاموں کے ساتھ لڑکیاں پکوان اور خانہ داری سے پوری طرح واقف ہوں۔ چنانچہ کثرت سے لڑکیاں پکوان سیکھ رہی ہیں اور دوسری ضروری معلومات بھی حاصل کر رہی ہیں۔

میری آرزو ہے کہ ہر لڑکی علم کے ساتھ ایک باسلیقہ بیوی ثابت ہو جو اپنے گھر کو حسن انتظام سے قابلِ نظیر بنا سکے۔

مسز اسد الزماں خاں

راکٹ اور سیّارے

معلوم یہ ہوتا ہے کہ دنیا والوں کی طبیعت اب دنیا سے سیر ہو چکی ہے۔ وہ اب قدرت کے دوسرے شاہکار کرّوں سے روشناس ہونا چاہتے ہیں چنانچہ اس صدی کے سائنسدان پوری دماغی محنت کے ساتھ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح ان سیّاروں کی سیر کریں جو اس وقت ہماری کمزوریوں کے باعث صرف آسمانی جگنو بنے ہوئے ہیں۔

نیوٹن کی دریافت ممکن ہے اس نئے دور کے بسنے والوں کے لئے نئی ہو مگر قدیم یونانی عالم یہ جانتے تھے کہ زمین میں کشش ہے۔ اور سیّارے بھی اس صفت کے حامل ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ انہوں نے محض اس کششی نظام کی بنیاد پر نجوم جیسا وسیع علم تمام و کمال تحقیق کے ساتھ رائج کر رکھا تھا اور اس علم کا جاننا تعلیم یافتہ طبقے کے ہر فرد کے لئے اسی قدر لازمی تھا جتنا کہ آج ہندستان میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے انگریزی جاننا۔ مگر اب جب کہ یونانی علوم، ہندستانی فنون کی طرح اپنے ماہرانِ مرحوم کے ساتھ دفن ہو چکے ہیں، علم نجوم نے فلکیات کے نام سے پھر ایک نئی نوعیت کا جنم لیا ہے۔

ان کوششوں کے سلسلے میں جو فلکیات کی تحقیق کے لئے کی گئی ہیں، فرانس، انگلینڈ، روس، جرمنی اور امریکہ کے سائنسداں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری کوششوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف اِن تجربوں پر غور کرتے ہیں جو سیّاروں تک پہنچنے کے لئے کئے گئے ہیں۔

ہوائی جہاز کی ایجاد نے حضرت انسان کو یقین دلا دیا کہ وزنی اجسام بھی زمین کی کشش کے خلاف نقل مکان کر سکتے ہیں۔ مگر اس میں توازن کے شرائط اور ہوا کو پیچھے ڈھکیلنے کی ضرورت نے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ خلاء میں یعنی ایسی جگہ جہاں ہوا نہ ہو، پرواز ناممکن ہے۔

۱۹۰۳ء میں جب رائٹ برادرس نے پہلی دفعہ پرواز میں کامیابی حاصل کی تو ایک روسی سائنسداں زیالکوسکی نے راکٹ ایجاد کر کے نظریۂ پرواز میں عظیم تبدیلی پیدا کر دی۔ راکٹ کو ہم ایک جلدی جلدی چلنے والی بندوق کے مماثل تصور کر سکتے ہیں۔ اگر کسی منجمد جھیل کی چکنی سطح پر ایک بہ داز توپ رکھی جائے اور اس سے پے در پے فائر کئے جائیں۔ تو توپ ایک معتدبہ رفتار سے پیچھے کی سمت حرکت کرنے لگے گی۔ راکٹ کی مشین اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس کا نوکدار سرا آسمان کی طرف ہوتا ہے اور نچلے حصے سے زمین کی طرف پے در پے دھماکے پیدا کئے جاتے ہیں۔ ان دھماکوں کے ردِّ عمل کے طور پر راکٹ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے۔

درحقیقت زیالکوسکی نے کوئی نئی بات دریافت نہیں کی بلکہ اس نظریہ سے چین کے باشندے ہزار سال پیشتر ہی واقف تھے۔ دھماکو اشیاء سب سے پہلے چینیوں نے بنائیں۔ مگر وہ اس کا استعمال تیر کے گھمانے میں کیا کرتے تھے۔ ان کا تیر کمان سے ایسا ہی نکلتا تھا جیسے رائفل کی گولی گھومتی ہوئی نکلتی ہے۔ یورپ میں بارود کا استعمال پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ پہلے پہل اس کو کھیل تماشوں کے کام میں لایا گیا مگر بعد میں جنگی ضروریات کے لئے اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ہوائی یا نارامنڈل جو آج بھی ہندستانی باراتوں میں چھوڑے جاتے ہیں پندرھویں صدی میں یورپ میں جنگی اغراض کے لئے استعمال ہوئے۔ نپولین نے انگلستان کے ساتھ لڑائی کی تو سر ولیم کانگر یونانی سائنسداں کی ایجاد کردہ ہوائیاں آتشباری کے طور پر شہروں پر برسائی گئیں شہر بولون جیسے حالیہ جرمن فوج بھی

لڑائی کے سبب کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے پہلی دفعہ ان ہوائیوں کا شکار بنا اور برباد ہوا۔

مسٹر کے۔ای۔زیالکوسکی کے نظریہ کی اشاعت سے کئی سائنسدانوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ۱۹۱۹ء میں رابرٹ گڈارڈ نے ایک پمفلٹ شایع کیا جس کا عنوان تھا "حکمۂ بلندی تک پہنچنے کا طریقہ" اس کی اشاعت نے ہر طرف عملی تجربوں کا آغاز کر دیا اور سیاروں تک رسائی ممکن سمجھی جانے لگی۔ ۱۹۲۳ء میں ایک آسٹرین سائنسداں مسٹر ہرمن آبرتھ نے جو ان تجربوں سے بالکل بے خبر تھا ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے بتلایا کہ تمام سیاروں کے درمیان راکٹ کے ذریعہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری کیا جا سکتا ہے۔ اس کے چار سال بعد میکس ویلر نے جرمن بین سیارات سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور عملی کام شروع کر دیا۔

مارچ ۱۹۲۸ء میں فرٹز فان اوپل موٹروں کے کارخانے کے مالک نے ایک راکٹ کار بنائی یعنی ایسی موٹر جو بغیر انجن کے صرف دھماکوں سے چلتی تھی۔ اس کار کو روسل شیم کے ریس ٹراک Race Track پر چلایا گیا۔ اس کامیابی کے چند ہی مہینوں بعد مسٹر اوپل نے برلن کے قریب ایوس اسپیڈ وے نامی مقام پر ایک راکٹ کار کے ذریعہ فی گھنٹہ ۱۰۲ میل کی رفتار کا مظاہرہ کیا۔ چند ہی دنوں بعد پہلی دفعہ جرمنی میں اس نظام کو پرواز میں استعمال کیا گیا۔ فریڈرک اسٹھابر نامی ایک شخص نے ایک گلائیڈر یعنی بغیر مشین کے ہوائی جہاز کو تقریباً ایک میل تک دھماکوں کے ذریعہ چلایا۔ اس اثنا میں اوپل نے اپنے تجربے جاری رکھے اور ایک گاڑی ریل کی پٹڑیوں پر دھماکوں کے ذریعہ ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی۔ فبروری ۱۹۲۹ء میں خود میکس ویلر نے ایک راکٹ کار بنائی جو برف پر ڈھائی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے میں کامیاب ہوئی۔ مگر چند ہی دنوں بعد ایک تجربے کے دوران میں دھماکے سے میکس ویلر کی جان ضائع ہوگئی۔ یہ پہلا آدمی تھا جس نے اس تحقیقات پر اپنی جان کی بھینٹ چڑھائی۔ مگر اس قربانی سے یہ معلوم ہوگیا کہ بارود اس کام کے لئے ناموزوں ہے۔ کیونکہ جب ایک دفعہ بارود سلگ جاتی ہے تو بجھ نہیں سکتی۔ اور راکٹ کا راس وقت تک قابو میں نہیں آسکتی جب تک کہ بارود ختم نہ ہو جائے۔

۱۹۳۰ء کی ابتدا میں بین سیارات سوسائٹی کے دو ممبروں نے مائع آکسیجن اور پٹرول کے آمیزے کو راکٹ میں استعمال کیا۔ اس سے جو دھماکہ ہوا وہ تمام دھماکوں سے بازی لے گیا۔ ساتھ ہی یہ محفوظ بھی تھا۔ اس سے ایک راکٹ ہوا میں چھوڑا گیا جو ۱۵۰۰ فیٹ کی بلندی تک جا سکا۔ گو کہ یہ بہت کم بلندی تھی مگر اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس میں زمین کی کشش کے خلاف کام کرنے کی قابلیت ہے۔

ادھر فرانس میں رابرٹ اینو پلٹے نے فرانسیسی فلکی سوسائٹی میں دوسرے سیاروں تک راکٹ کے ذریعہ سفر کے امکانات پر ایک تقریر کی اور چند ہی دنوں بعد اس کی مکمل تحقیقات شائع بھی کر دی گئی اور اس کو ایک مستقل مضمون قرار دے کر اس کا نام اسٹرانا ٹکس (Astronautics) رکھا گیا۔ اینڈرے ہرش نامی ایک بینکر نے ہر سال پانچ ہزار فرانک کا انعام اس شخص کے لئے رکھا جو اسٹرانا ٹکس پر بہترین تحقیقات کرے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں پہلی دفعہ پروفیسر آبرتھ کو یہ انعام دیا گیا۔

۱۹۲۹ء کے اختتام پر روس میں بھی دو سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ ایک پروفیسر کولاس اور ڈاکٹر جیکو وکی مشترکہ صدارت میں اور دوسری ایوان پی خارٹیکاف کی۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر گوڈارڈ نے مائع دھماکو شئے کی ایک

راکٹ چھوڑی جو نو سو فیٹ کی بلندی پر پھٹ گئی۔ چند ہی دن بعد ایک امریکن کروڑپتی لگن ہیم نے بیس ہزار پونڈ ڈاکٹر گوڈارڈ کو دئے تاکہ وہ تحقیقات جاری رکھے۔

۱۹۳۰ء میں نیویارک میں بھی ڈیوڈ لیسبر کی صدارت میں ایک بین سیارات سوسائٹی قائم ہوئی جس کا نام آج کل امریکن راکٹ سوسائٹی ہے۔ اس سوسائٹی نے ۱۹۳۳ء میں پہلی دفعہ راکٹ چلایا جو زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ مگر دوسرا راکٹ ڈھائی سو فیٹ کی بلندی تک پہنچ گیا جس سے ان کی ہمت افزائی ہوئی اور کام بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں برطانوی بین سیارات سوسائٹی مسٹر پی۔ ای۔ کلیٹر کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی کو برطانوی وزارت مالیہ نے کسی قسم کی امداد دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ان سائنسدانوں نے یہ محسوس کیا کہ راکٹ کو روکنے والی سب سے طاقتور چیز زمین کی کشش ہے۔ اگر کوئی راکٹ پچیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی سطح سے اٹھے تو وہ زمین کی کشش کے حدود سے باہر ہو جا سکتا ہے۔ مگر یہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ کیونکہ اول تو اس رفتار سے کوئی آدمی راکٹ میں سفر نہیں کر سکتا، دوسرے ہوا کی رگڑ سے اتنی گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ راکٹ جل پڑے گا۔ اس لئے یہ طے پایا کہ راکٹ کو اپنی رفتار پر اختیار ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ کم رفتار کے ساتھ کرۂ ہوائی سے باہر نکلے اور اس کے بعد اپنی رفتار بڑھالے اس کے لئے مسٹر کلیٹر نے ایک ماڈل بتلایا مگر اس ماڈل کو واپس لانے کے لئے ایک اسٹیشن کی ضرورت تھی اور اس پورے کام کے لئے دو کروڑ پونڈ کی ضرورت تھی اس لئے یہ اس وقت تک کے لئے مسترد کر دیا گیا جب تک کہ اس لاگت کو گھٹانے کی کوئی صورت نہ دریافت ہو جائے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا کوئی انسان اس رفتار پر زندہ رہ سکتا ہے؟ جرمن سائنسدانوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر رفتار آہستہ آہستہ بڑھے اور بڑھتے بڑھتے آٹھ دس منٹ میں پچیس ہزار میل فی گھنٹہ ہو جائے تو انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ خود اس میں رفتار پیدا ہو جاتی ہے۔ بعینہ اس طرح جیسے کہ ہم زمین پر زندہ ہیں جو بہت بڑی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ کرۂ ہوائی کے باہر چند ایسی برقی امواج چلتی ہیں، جو ممکن ہے راکٹ کو کوئی نقصان پہنچائیں گو ابھی اس کا یقین نہیں ہے۔

سورج کی آزاد کرنوں سے جب سابقہ پڑے گا تو امکان ہے وہاں گرمی اتنی زیادہ ہو کہ راکٹ پگھل جائے۔ ایسے بھی طریقے ہیں کہ اس گرمی کے مقابلے کے لئے راکٹ میں کوئی انتظام کیا جاسکے مثلاً راکٹ دوہری دیواروں کا بنایا جائے یا کسی اور مصنوعی طریقے پر ٹھنڈا رکھا جائے۔

سورج سے صرف حرارت ہی نہیں خارج ہوتی بلکہ بعض ایسی شعاعیں بھی نکلتی ہیں جو زمین تک پہنچ جائیں اور وہ خطرناک ہوتی ہیں۔ امکان ہے کہ ان سے بھی راکٹ کو کوئی نقصان پہنچے۔ شہاب ثاقب بھی ایک خطرناک رکاوٹ سمجھے جا سکتے ہیں کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے شہاب کی ٹکر راکٹ کو تباہ کر سکتی ہے۔ مگر تباہی کا اندیشہ انسان کی ہمت کو پست اور تجسس کو فنا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے وہ ان جاہلوں کی مانند ہیں جنھوں نے کولمبس سے کہا تھا کہ اگر تم اپنا جہاز افق کی طرف لے جانے کی ہمت کرو گے تو زمین کے کونے پر پہنچ کر گر پڑو گے۔

۲۵ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی راکٹ میں بیٹھے ہوئے آدمی کو اپنا وزن اتنا زیادہ معلوم ہوگا کہ اسے تکلیف

ہونے لگے گی گر کششی حدود سے باہر نکلنے کے بعد اسے اپنا وزن محسوس ہی نہ ہوگا۔ یعنی وہ بے وزن مسافر ہو جائے گا۔ لیکن بے وزنی نظام بدن پر کوئی اثر نہیں پیدا کرے گا۔ وزن کا تخیل صرف کشش کے ساتھ قائم ہے کشش کے بدلنے کے ساتھ ساتھ وزن بھی بدلتا جائے گا۔ کسی جسم کا وزن اگر زمین پر بارہ سیر ہے تو اسی جسم کا وزن چاند پر دو سیر اور زہرہ پر دس سیر ہوگا۔ یعنی راکٹ کو چاند کی سطح سے اٹھنے کے لئے جتنی قوت درکار ہے اس سے چھ گنی قوت زمین سے اٹھنے کے لئے چاہئے۔

زمین کی کشش کے حدود سے باہر ہونے کے بعد اگر راکٹ کا انجن بند کر دیا جائے اور وہ کسی دوسرے سیارے کی کشش کی وجہ سے اسی کی طرف جا رہا ہو، ایسی حالت میں اگر مسافر راکٹ کا دروازہ کھول کر باہر کو دپڑے تو بھی وہ راکٹ سے جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ مسافر اور راکٹ یکساں رفتار سے حرکت کرتے رہیں گے۔ یعنی نظری طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنی جان گنوائے بغیر راکٹ میں سفر کر سکتا ہے۔

ایک اور خدشہ یہ بھی ہے کہ اگر راکٹ اپنے مقام مقصود کو اس خلائے بسیط میں نہ پہچان سکے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شئے اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ یا تو وہ سورج کی طرف کھنچ کر جل جائے گا یا کسی اور سیارے کے اطراف ہمیشہ کے لئے گردش کرنے لگے گا۔ جیسے چاند زمین کے اطراف گھومتا ہے۔ یا کسی دوسرے سیارے سے جا ٹکرائے گا۔ ان خطرات کو جانتے ہوئے اپنے مقام مقصود کو نہایت انضباط سے معین کئے بغیر خلاء میں صرف وہی لوگ پرواز کر سکتے ہیں جو خود کشی پر تلے ہوئے ہوں۔ خود کشی کا یہ ایک نیا طریقہ تو ہوگا مگر اس میں مرنے والے کو کثیر مصارف برداشت کرنے پڑیں گے۔

چاند پر پہنچنا بہ نسبت اور سیاروں پر جانے کے بہت آسان ہے نہ صرف اس لئے کہ وہ ہم سے قریب ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ زمین کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد گھومتا ہے کسی سیارے کی طرف جس وقت جی چاہے پرواز نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کے لئے اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب کہ وہ اپنے مدار کے ایسے مقام پر آجائے جہاں جانا ہمارے لئے آسان ترین ہو۔ مثلاً مریخ پر ہم جانا چاہیں اور ایسے وقت جب کہ سورج، زمین اور مریخ کے درمیان ہو نکلیں تو ہمیں پہلے سورج سے سابقہ پڑے گا۔ دوسرے یہ فاصلہ ۲۳ کروڑ پچاس لاکھ میل ہوگا، برخلاف اس کے ہم ایسے وقت نکلیں جب کہ زمین مریخ اور سورج کے درمیان ہو تو ہمیں صرف پانچ کروڑ میل طے کرنے پڑیں گے۔ مگر ہمیں رفتار کم از کم ۵۰ ہزار میل فی گھنٹہ رکھنی پڑے گی تاکہ دو دن میں پہنچ جائیں۔

ایسے مسافر کو وقت کا اندازہ رکھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ کششی حدود کے باہر کوئی گھڑی کام نہیں کر سکتی۔ ہاں لاسلکی کے ذریعہ امکان ہے کہ زمین والے اسے وقت بتلاتے رہیں۔

جب راکٹ کسی سیارے کے کششی حدود میں داخل ہو جائے گی تو وہ اس قدر تیزی سے اس کی طرف چلے گی کہ اس کا روکنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسے موقع پر راکٹ کو پلٹا کر اس کا انجن اسٹارٹ کر دینا پڑے گا تاکہ اس کا عمل سیارے کی کشش کے خلاف ہو اور وہ آہستہ آہستہ سطح پر اتر پڑے۔

اس وقت جو دھماکو اشیا معلوم ہیں وہ ان سفروں میں اتنی خرچ ہو جائیں گی کہ اس قدر مقدار ساتھ نہیں رکھی جا سکتی اس لئے یہ سفر اس وقت تک کے لئے ملتوی ہیں جب تک کوئی ایسی شئے نہ دریافت ہو جائے جو نسبتاً کم مقدار میں زیادہ دھماکہ پیدا کر سکے۔ ممکن ہے کہ برقی قوت کے استعمال سے یہ مشکل آسان ہو جائے۔

بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اگر کسی سیارے پر طبعی حالات ایسے ہوں کہ وہاں زمین کا بسنے والا زندہ رہ سکے اور ایک دفعہ وہاں تک راکٹ کے لے جانے میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ہم وہاں ایک ایسا اسٹیشن تعمیر کر سکتے ہیں جہاں بہت سا دھاکو مادہ جمع رکھا جا سکے اور اس طرح آمد و رفت کا سلسلہ قائم کیا جا سکتا۔

اگر ہم قریب ترین سیارے یعنی چاند پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ چاند کا نصف حصہ ہمیشہ روشن اور نصف ہمیشہ تاریک رہتا ہے روشن حصہ کی تپش ۲۱۶ درجہ فارن ہیٹ اور تاریک کی - ۲۴۳ درجہ فارن ہیٹ ہے۔ ان دونوں تپشوں پر زندگی ناممکن ہے۔ گرچاند کی سطح آتش فشاں مادے کی بنی ہوئی ہے اور یہ مادہ حرارت کے لئے بہت ناقص موصل ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اس مادے میں ایسے تہ خانے بنائے جا سکیں جہاں کا درجۂ حرارت حسب مرضی رکھا جا سکے۔

سیاروں میں عطارد، سورج سے بہت قریب ہے۔ اس لئے بہت گرم۔ زحل، مشتری، یورانس، نیپچون وغیرہ بہت دور اور سرد بھی ہیں، صرف زہرہ اور مریخ ہی اس قابل ہیں کہ وہاں زندگی ممکن سمجھی جا سکے۔ گرزہرہ کی سطح بادلوں میں اس قدر گھری ہوئی رہتی ہے کہ اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکا گرچونکہ وہ حجم کے لحاظ سے زمین سے بہت ملتا جلتا ہے اس لئے ممکن ہے وہاں کے طبعی حالات زمین سے مشابہ ہوں۔ مریخ کی تپش ۷۰ درجہ فارن ہیٹ اور منفی ۴۰ درجہ فارن ہیٹ کے درمیان رہتی ہے جہاں انسان زندگی گذار سکتا ہے وہاں آکسیجن اور پانی بھی موجود ہے۔ اس لئے مریخ پر جانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

اس وقت تک تو یہ باتیں محض خیالی ہیں گر حضرتِ انسان سے کس حرکت کی امید نہیں۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

سیّد ظہیر الدین رونق

سب رس کے متعلق رائے :-

کتابت اور طباعت جاذبِ نظر۔ پروگریسو نظریہ۔ فنکارانہ طرز۔ اور اس کے ساتھ ہی افسانہ اور غزل کی رنگینیاں یہ دو چند خوبیاں ہیں۔ جو حیدرآباد دکن کے مشہور ادبی ماہ نامہ "سب رس" کو دیکھتے ہی تصور میں آتی ہیں۔ اس کے تازہ شمارے میں علی اختر کی نظم ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا افسانہ ہے۔ نواب عزیز یار جنگ کی غزل ہے۔ الطاف مشہدی کی مختصر نظم ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا ادبی مقالہ ہے۔ اور "سب رس" کی طرزِ خصوصی کے دیگر مضامین بھی جو اس کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ ایک خصوصیت سے میں سب رس کو تمام ماہ ناموں سے اونچا درجہ دیتا ہوں۔ اور وہ اس کا ادبی ادارہ ہے۔ "سب رس" ادارۂ ادبیات اُردو نے جو معیاری تعمیری اور ٹھوس کام زبان کی خدمت کا کیا ہے شاید ہی کسی اور ماہ نامے نے کیا ہو "سب رس" خصوصیت سے ان ترقی پسند ماہ ناموں کے لئے ایک مثال ہے جو جنسی بھوک کے افسانوں کو ادب اور فن کا نام دیتے ہیں۔ اور جن کے قلمی معاون اقبالؔ کے اس شعر کی زندہ تفسیر ہیں ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

سب رس کی ان انفرادی اور تعمیری خوبیوں کے لئے میں اس کے ادارہ کو اعماقِ قلب سے مبارکباد دیتا ہوں۔

اسٹار لاہور۔ ہفتہ وار ۱۳ جولائی ۱۹۶۱ء

نئی کتابیں

۱۔ رسائل طیبہ (مجموعہ مضامین طیبہ بیگم خدیو جنگ مرحوم) مرتبہ سکینہ بیگم ۲۸۰ صفحے قیمت عا سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد حیدر آباد دکن

۲۔ سفرۂ عام (اقسام کے پکوان) از منجولا بائی گورک شکر ۴۴ صفحے قیمت ۴ر خواجہ احمد معین الدین۔ کتب خانہ معینہ حویلی قدیم روڈ۔ کمان نواب سالار جنگ بہادر۔

۳۔ ہمارے مزدور (مزدوروں کے معاشی مسائل) از محمد عبد القادر لکچرار جامعہ عثمانیہ ۷۶ صفحے۔ انجمن ترقی اردو۔ دہلی۔

۴۔ رشوت خواروں کا حشر از محمد شمس الدین صدیقی سابق منصف ۸۰ صفحے از مصنف۔ کالی کمان حیدر آباد دکن۔

۵۔ شمع (ناول) از اے۔ آر خاتون دہلوی۔ ۵۰۴ صفحے قیمت عا از مصنفہ۔ جلال منزل۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی۔

۶۔ موج طہور (مجموعہ کلام) از بہزاد لکھنوی قیمت عسم۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

۷۔ مورخ کے افسانے از سید محمود مورخ قیمت عسم۔ گل فروش پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی۔

۸۔ نازیت کے کھلے راز مترجمہ نصیر یوسفی۔ ملک دین محمد اینڈ سنز۔ لاہور۔

۹۔ قدرتی علاج مرتبہ حکیم حافظ محمد سعید دہلوی۔ قیمت ۲ار ہمدرد دواخانہ۔ لال کنواں۔ دہلی۔

۱۰۔ بین الاقوامی سیاسی معلومات از اسرار احمد آزاد ۲۳۰ صفحے قیمت عہ مکتبۂ برہان۔ نئی دہلی۔

۱۱۔ صدکان گہر (رباعیات) از عشرت گیاوی قیمت ۱۰ر سید آل نبی حسنین منزل۔ گیا۔ صوبہ بہار۔

۱۲۔ باعیش وعشرت (مجموعۂ کلام) از عشرت گیاوی قیمت عا سید آل نبی حسنین منزل۔ گیا۔ صوبہ بہار۔

۱۳۔ ذکر و فکر (مضامین اور کہانیاں) از مقصود زاہدی ۱۲۸ صفحے قیمت ۸ر مکتبۂ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ

۱۴۔ تفسیر پارۂ عم۔ مرتبۂ ادارہ دار الاسلام ۹۶ صفحے ہدیہ ۸ر۔ "دار الاسلام" پوسٹ آفس جمال پور۔ پنجاب

۱۵۔ اسلام اور مسیحیت از مولوی ثناء اللہ امرتسری ۲۲۰ صفحے قیمت عہ دفتر اہلحدیث۔ امرتسر۔

۱۶۔ سیاست ملیہ (مسلمانان ہند کی سیاست کی تاریخ) از محمد امین زبیری ۶۰۰ صفحے از مولف۔ سول لائین علی گڑھ۔

۱۷۔ کام کی کتاب دو حصے (بے سِک اردو) از واحدہ خانم ۱۰۳۴ صفحے قیمت عا۔ مکتبۂ قرانیہ بمبو بازار۔ بنگلور سٹی۔

۱۸۔ دیہاتی تصویری کہانیاں دو حصے (دیہات سدھار) قیمت ۸ر اردو مرکز بک ڈپو۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور۔

۱۹۔ صحتی تصویری کہانیاں (تعلیم بالغان) حصہ اول۔ دوم وسوم قیمت عسم اردو مرکز بک ڈپو۔ لاہور۔

۲۰۔ سائینٹفک تصویری کہانیاں (تعلیم بالغان) قیمت ۵ر ۳ر اردو مرکز بک ڈپو۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور

۲۱۔ بچوں کی پھلواری (کہانیاں) قیمت ۵ر اردو مرکز بک ڈپو۔ فلمنگ روڈ۔ لاہور۔

۲۲۔ خطوط محمد علی۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۲۲۰ صفحے قیمت مجلد عا مکتبہ جامعہ دہلی۔

۲۳۔ مبادی سیاسیات (دوسرا ایڈیشن) از ہارون خاں شروانی ۶۰۸ صفحے قیمت صہ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

۲۴۔ بچوں کی بہار (نظمیں) از خواجہ فیض محمد فیض ۴۴ صفحے قیمت ۲ر ریاض بک ڈپو۔ لاہور۔

۲۵۔ آہیں (افسانے) از دکھی پریم نگری۔ قیمت عا۔ مکتبۂ ناہید۔ بائیکلہ بمبئی

۲۶۔ سسکیاں (") از قمر تسکین۔ " عا " "

مرزا سیف علی خاں

آہ! یہ زندگی

دھک۔ دھک۔ دھک...........

بڑی پریشانی کی حالت میں آنکھ کھلی، دل زور زور سے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی مسلسل دھڑ دھڑ دماغ پر ہتوڑے کا کام کر رہی تھی۔ بدن پسینہ میں تر بتر تھا اور میں پلنگ پر نیم افتادگی کی حالت میں پڑا تھا۔ لیٹے لیٹے میں نے تھکی ہوئی مضمحل نظروں سے آہستہ آہستہ کمرے کا جائزہ لیا۔ تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، ہوا بند تھی، ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی اس خاموشی میں دور کتوں کے بھونکنے کی آواز مخل ہوتی تھی۔

بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے میں نے سوچنا شروع کیا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے اتنا پریشان کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن بتدریج کم ہوتی جاتی تھی، لیکن اس کی جگہ خیالات نے لے لی، خیالات کی ایک برقی لہر تھی کہ دماغ میں بہی جاتی تھی۔ صبا رفتار گھوڑے تھے کہ اڑے جاتے تھے۔ پھر اس منتشر لشکر نے ذرا ترتیب و تنظیم پائی تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے پورا خواب یاد آگیا، مجھے اس کی جزئیات تک یاد آنے لگیں۔ کیا خواب دیکھا تھا؟ ---- اچھا چلئے۔

یہی مکان ہے، بازو مولوی عبدالسمیع صاحب کا شاندار بنگلہ ہے۔ شام کا وقت ہے۔ میں اپنے بالاخانے کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوں ---- عبدالسمیع صاحب کے مکان کی کھلی چھت پر کچھ صورتیں نظر آتی ہیں۔ یہ ان کی بیوی ---- یہ ان کی والدہ ہیں یہ کوئی خادمہ ہے جو ہاتھ میں کچھ لئے کھڑی ہے۔ یہ کون؟ ---- اوہو! یہ ان کی صاحبزادی ہیں ---- میرا دل دھڑکتا ہے، زور زور سے دھڑکتا ہے۔ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آتا ہوں۔ میرا دل رونا چاہتا ہے۔ پھر بے قرار ہو کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے ..... اے لو! وہ واپس جا رہی ہیں۔ تاریکی بڑھ رہی ہے۔ ارے ---- یہ کوئی اکیلا پیچھے رہ گیا ہے۔ شاید خادمہ ہے۔ نہیں ---- میرا دل اور زور سے دھڑکتا ہے ---- تاریکی اور بڑھ رہی ہے۔ ایک دھندلی سی شکل پچھلے پاؤں پلٹی ہے اور چھت کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے ---- میں الف لیلیٰ کے "بغدادی چور" کی طرح دبے پاؤں، گرنے کے خوف سے بے پروا، بے خوف کھڑکی کے راستے سے نکل کر سمیع صاحب کے مکان کی چھت پر نظر آتا ہوں ---- ایک لمحہ بعد ---- میں چھت کی سطح پر گھٹنے ٹکائے اور میرا سر منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کی آغوش میں ---- میں زار زار رو رہا ہوں۔ ایک نرم، شیریں، گھبرائی ہوئی آواز مجھ سے التجا کر رہی ہے۔ "دیکھو، روؤ نہیں، ارے ..... روتے کیوں ہو؟ ---- رونے کی آواز پر کوئی آنہ جائے۔ دیکھو، بس کرو، ---- بس ----" میں خاموش رہنے کے بدلے اور روتا ہوں، روتا ہوں، آغوش سے سر ہٹا کر پیروں پر رکھ دیتا ہوں، اُدھر سے کوشش ہوتی ہے کہ میں پیر چھوڑ دوں، میں پیروں کو آنکھوں سے لگائے ان کو آنسوؤں سے دھوتا ہوں، ان کو بوسے دیتا ہوں ---- اتنے میں، پیچھے سے ایک کرخت بھونڈی، بھدی آواز آتی ہے ---- کیا تھا؟ کوئی مردہ قبر سے چلّاتا تھا یا کوئی کتا بھونکتا تھا ---- ایک سخت اور کھردرے ہاتھ نے میری کلائی پکڑ لی..... میں گھسٹتا چلا جا رہا ہوں.....

جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

"نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں!"...... ہائے

محبت بھی کیا چیز ہے، اس نعمت اور سعادت کا حال کچھ ان سے پوچھو جو اس دولت سے سرفراز ہوئے ہیں۔ میرے دل سے ایک صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے "یہاں کسی کو نہ چاہنا اور کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے!"

بےچینی بہت بڑھ گئی تو اٹھا، کمرے میں ٹہلنے لگا، کھڑکی کھول دی، باہر جھانکا ــــــ سڑک سنسان اور خاموش تھی۔ سمیع صاحب کا شاندار اونچا بنگلہ رات کی تاریکی میں سیاہ بھوت کی طرح کھڑا تھا۔ دور کسی گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے، تھوڑی دیر تک اس کی آواز فضا میں گونجی۔ پھر ہر طرف وہی خاموشی ہی خاموشی تھی ــــــ

بستر پر جا لیٹا، پھر اٹھا، پھر لیٹا، ایک خلش تھی، ایک کھٹک تھی، ایک چبھن تھی، دل پر ایک گرانی تھی اور ایک گھٹا سی چھائی تھی، ایسی گھٹا جو نہ کھلتی ہے اور نہ برستی ہے، بس دم گھٹتا جاتا ہے۔ دل کہہ کہاں ماتم آرزو کرتا تھا "یہاں کسی سے چاہا نہ جانا بڑی بدبختی ہے ...... یہاں کسی ایک کا نہ ہو رہنا بڑی بدنصیبی ہے!!"

دور گھڑیال کی زبان نے اس خوفناک سکوت کو توڑا ...... ٹن۔ ٹن۔ ٹن ...... سوچتا تھا۔

کہاں میں، کہاں عبدالسمیع صاحب! وہ ٹھیرے دولت مند مرفہ الحال، مشہور، معروف ــــــ میں ٹھیرا دفتر کا ایک ادنیٰ ملازم، ایک حقیر کلرک ــــــ دن بھر دفتر کی مسلوں میں جان کھپاؤ تو مہینے پر تیس روپیوں کی صورت دیکھنی نصیب ہو۔ اس غدار اور معمور شہر میں گمنام، تنہا، لاوارث جس کا نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ دنیا میں بے طلب بھیجا گیا، جن کے پاس بھیجا گیا، وہ بھی میری آمد سے کچھ خوش نہ تھے۔ ماں نے جنا، آ گئے بس اللہ میاں کی حفظ و اماں۔ گاؤں میں رہا۔ گاؤں میں پڑھا، گاؤں ہی میں بڑا ہوا۔ قسمت میں شہر کا آب و دانہ تھا، اس نے اپنا رنگ دکھایا ــــــ اس بڑے شہر میں، جہاں ہزاروں اور لاکھوں آدمی بستے ہیں، میں اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا پاتا ہوں۔ کسی نے خواہش کی تھی، رہیے اب ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو۔ اس وسیع دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں ہزاروں اور لاکھوں کی آبادی میں بھی رہ کر کسی پاسباں اور ہم سخن کو نہیں پاتا، بیمار پڑتا ہوں تو کوئی تیماردار نہیں آتا ــــــ اور مر بھی جاؤں تو کوئی نوحہ خواں نظر نہیں آتا۔ سب ہنستے ہیں، بولتے ہیں، زندگی کے مزے اٹھاتے ہیں۔ مگر ہائے میری زندگی بالکل بے روح ہے۔ بجائے گوشت پوست کے انسان کے میں کل کا پتلا معلوم ہوتا ہوں۔ صبح اٹھنا، ناشتہ کرنا، دفتر جانا، دفتر سے آنا، شام کا کھانا کھانا، ادھر ادھر کے چند رسالے، یا افسانے، یا ناول پڑھ لینا، بستر پر کروٹیں بدلنا، رات گئے سو جانا ــــــ سو جانا کیا، منہ لپیٹے پڑے رہنا۔ یہ ہے زندگی۔ وہی آفتاب جو آج نکلا تھا، کل پھر نکلے گا، آہستہ آہستہ اپنی روشنی پھیلائے گا، دوپہر ہوگی، دن آہستہ آہستہ ڈھلتا جائے گا، سہ پہر ہوگی، شام ہوگی، رات آئے گی، بارہ بجیں گے، پھر ایک بجے گا، دو بجیں گے ...... دن نکل آئے گا۔ یہی زندگی ہے؟ اسی کو زندگی کہتے ہیں؟ یہی جینا ہے؟ اسی جینے پر لوگ مرتے ہیں؟ ــــــ بیماری، مفلسی، بےکسی، بےبسی ــــــ ان کا مجموعہ ہے زندگی ــــــ

ٹن، ٹن۔ ٹن۔ ٹن ......

مرغ بانگ دے رہے ہیں، راستے پر وقفے وقفے سے

راہ گیروں کے پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بعض مسجد یا مندر
جا رہے ہوں گے، بعض خرابات سے اٹھ کر آ رہے ہوں گے۔
کیسے خوش نصیب ہیں یہ لوگ کہ یہ پہاڑ جیسی رات اپنے محبوب
کی آغوش میں بسر کر چکے ہوں گے.....

آہ، یہاں کسی سے چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی
ہے! کاش! میرا بھی کوئی ہوتا یا میں کسی کا ہو رہتا، کسی کو
اپنا کر رہتا، اور یہ دو روزہ، نہیں نہیں، میرے لئے دو روزہ
نہیں، دو صد سالہ، بے روح اور بدمزہ زندگی یوں نہ کاٹتا۔
بیمار پڑتا تو کوئی اپنے ہاتھ سے دوا پلاتا، اور میں ایسے کے ہاتھ
سے دوا پیکر دوا پلانے والے پر سے سو نہیں، ہزار لاکھ صحتیں
نثار کرتا۔ مفلس ہوتا تو کوئی کہتا —— "غم نہ کرو۔ دیکھو میں
تمہاری ہوں۔" سرشار ہو کر یہ الفاظ سنتا اور کہنے والے پر ہر وہ
چیز جو میرے قبضہ و اختیار میں ہوتی صدقے اور نثار کر دیتا۔ بےکس
ہوتا تو کوئی کہتا —— "دیکھو، ہم ایک دوسرے کے لئے ہیں۔
ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں، ہمیں دنیا سے کیا کام؟ تم ہو
اور میں۔ بس، یہی ہماری دنیا ہے۔" میرا خیال ہے، خوش
بیاں اور جادو زبان واعظ جس جنت کا نقشہ کھینچتے ہیں،
وہ بھی اس کے آگے، میری جنت کے آگے، ہیچ ہوتی!

زندگی واقعی یہی ہے جیسی کہ میں بسر کرتا ہوں تو ایسی زندگی
کو سلام —— دن بھر محنت کروں؟ کس لئے؟ رات کو مچھروں،
کھٹملوں کی ایذا سہوں؟ کیوں سہوں؟ جاڑے میں ٹھٹھروں، برسات
میں بھیگوں، گرمی میں جھلسوں! کیوں؟ دنیا بھر کے لوگوں کی
جھڑکیاں، سختیاں، اور ہر طرح کی ذلتیں اٹھاؤں؟ کیوں؟
کیا فائدہ؟ پیٹ کے لئے یہ کھٹ کھٹ، یہ دوڑ دھوپ! یہی
ناکہ اس دوزخ میں ایندھن ڈال کر زندگی کی مشین کو چلاتا ہے؟
زندہ ہی کیوں رہوں؟ کس کے لئے زندہ رہوں؟ —— ساری
محنت، ساری مشقت، ساری ذلت اس لئے ہے اس کے نتائج
کسی کے قدموں پر نثار کر دئے جائیں، اور اس کے بدلے میں
ایک دل نواز مسکراہٹ، ایک جاں بخش تبسم سے خوش کام
ہوں۔ ساری سردی، ساری گرمی، اس لئے سہی جاتی ہے کہ
کسی کی موجودگی میں فطرت کی رنگا رنگی، بوقلمونی، اور تنوع
کا لطف اٹھایا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو اس بے روح، خشک
اور تاریک زندگی اور زندہ درگوری میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔
قبر کا کونا، سرد، بے روح، تنگ، تاریک، حشرات الارض
سے بھرا ہوا...... آہ، یہاں کسی کو نہ چاہنا، کسی سے
چاہا نہ جانا کیسی بدبختی اور بدنصیبی ہے...... آہ، آہ! کسی
سے چاہا نہ جانا، ...... کسی سے چاہا نہ جانا، ...... کیسی
بدنصیبی ہے ...... کیسی بدنصیبی، کیسی بدنصیبی ہے...

آنکھ کھلی تو دیکھا دن کی تیز روشنی، کھلی کھڑکی سے
ہو کر آنکھوں پر پڑ رہی تھی، ہاتھ بڑھا کر گھڑی اٹھائی، نو بجکر
بیس منٹ ہوئے تھے۔ لوگ خدا کا نام لے کر بستر سے
اٹھتے ہیں، میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بستر سے
اٹھتا ہوں۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا، پاس کے ہوٹل میں
ناشتہ کروں گا، دفتر کو یقیناً دیر ہو جائے گی، جاتے
ہی منتظم صاحب کی ڈانٹ استقبال کرے گی ——!!

ساحر

ہندوستان کی ناپید صنعتیں

موجودہ زمانے میں ہندوستان کی حیثیت ایک پس ماندہ ملک کی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں یہاں کی صنعت وحرفت نہایت ادنیٰ اور معمولی ہے۔ آبادی کا ایک کثیر حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور زراعت یہاں کا عام پیشہ ہے' ان حالات کے پیش نظر بعض لوگ اس خیال کے حامی ہو گئے ہیں کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور قدرت نے اس کو زراعت ہی کیلئے بنایا ہے لیکن یہ خیال درست نہیں۔ یہ خیال درحقیقت ان لوگوں کا ہے جو ہندوستان کی قدیم صنعتی عظمت سے یا تو واقف ہی نہیں یا واقف ہونے کے باوجود ذاتی مفاد کے تحت اس کو ایک زراعتی ملک بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کی صنعتی تاریخ بہت قدیم ہے۔ موجودہ زمانے کے اکثر و بیشتر ترقی یافتہ ممالک جب کہ تہذیب وتمدن کے ابتدائی دور میں تھے' ہندوستان کی تہذیب وتمدن مقابلتہً بہت ہی ترقی یافتہ تھی۔ ملک کے طول وعرض میں مختلف قسم کی مصنوعات تیار کی جاتی تھیں' جن سے نہ صرف ملک کے باشندے مستفید ہوتے تھے بلکہ یہ دور دراز مقامات پر روانہ کی جاتی تھیں۔ بیرونی ممالک کے تاجروں کو ہندوستانی اشیاء کی تجارت سے بہت فائدہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی ممکنہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہندوستان کی تجارت کسی طرح ان کے ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ باہمی بغض وعداوت کی صورت میں نمودار ہوتا تھا اور بالآخر ہندوستانی تجارت کا اجارہ حاصل کرنے کے لئے مختلف لڑائیاں ہوتی تھیں جن سے تاریخ کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں اسی لئے تھیں کہ پیداوار خام اور مصنوعات کے لحاظ سے ہندوستان کو مقابلتہً بہت اہمیت حاصل تھی۔ بعض انگریز مورخین نے ہندوستانی مصنوعات کی خوبی ونفاست کا نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنی مختلف تصانیف میں ذکر کیا ہے۔

ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں سوتی صنعت بہت مشہور ہے۔ یہاں کے صناعوں نے اس صنعت میں وہ کمال دکھایا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ڈھاکہ ململ جس کا نام آج بھی سنا جاتا ہے اس قدر باریک اور نفیس تیار کیا جاتا تھا کہ اس کی سات تہہ جسم پر ڈالنے کے بعد بھی جسم نہیں ڈھنک سکتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب اپنی بیٹی پر یہ کہتے ہوئے خفا ہوا کہ کپڑوں کے نیچے سے اس کا جسم نظر آ رہا تھا۔ شہزادی نے جواب دیا کہ وہ اس وقت ململ کے سات کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ موجودہ زمانے میں مشین کے ذریعے باریک ململ تیار کیا جاتا ہے مگر اس میں قدیم ہندوستانی ململ کی باریکی' نفاست اور عمدگی نہیں پائی جاتی۔ اُس زمانے میں ململ کے نام بھی عجیب تھے۔ مثلاً "آب رواں" "بافت ہوا" "شبنم" وغیرہ ـــــ یہ ایسے نام ہیں جن سے کپڑے کی باریکی اور نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ ہندوستانی ململ اس قدر باریک ہوتا تھا کہ بیس گز لمبے ٹکڑے کو لپیٹ کر ایک انگوٹھی میں سے بہ آسانی گزارا جاسکتا تھا۔ کپڑے کی بُنائی کے لئے سوت اس قدر باریک تیار کیا جاتا تھا کہ وہ بعینہٖ مکڑی کے جال کے مشابہ ہوتا تھا۔ ہندوستانی ململ کی باریکی اور نفاست کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ اس کپڑے کو جب مانچسٹر کے صناعوں نے دیکھا تو وہ کہہ اٹھے کہ ہندوستان کا ململ' ململ نہیں بلکہ اس کا سایہ ہے۔

اسی طرح ایک اور انگریز مورخ تعجب خیز لہجہ میں کہتا ہے کہ ہندوستانی ململ یا تو پریوں کا بنایا ہوا ہے یا کیڑے مکوڑوں کا ـــــ انسانوں سے تو یہ کام ناممکن ہے!! ـــــ یہ تھی اعلیٰ مہارت ہمارے صناعوں کی عہد قدیم میں۔ اس قسم کے صناع اور اس قسم کی مصنوعات موجودہ زمانے میں ناپید ہو چکی ہیں۔

سوتی صنعت کے علاوہ ہندوستان کی اونی صنعت بھی بہت مشہور تھی۔ کشمیر کے شال مقبولِ عام تھے۔ یورپی ممالک کو بکثرت روانہ کئے جاتے تھے۔ خصوصاً فرانس ان کا بڑا خریدار تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی یہاں پر شال تیار کئے جاتے ہیں مگر قدیم کاریگروں اور ان کی دست کاری معدوم ہو چکی ہے۔ رام پور کی چادریں، کشمیر، لودیانہ اور سندھ کے چغے، ملتان، مچھلی پٹن، کوکناڈا اور ورنگل کے قالین بہت مشہور تھے۔ ۱۸۵۱ء میں جو نمائش لندن میں کی گئی تھی، اس میں ورنگل کے قالین سب سے بہتر ثابت ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ اب بھی ورنگل اور دیگر مقامات میں قالین تیار کئے جاتے ہیں لیکن ان کا بازار محدود ہو چکا ہے اور ان کی اہمیت صرف مقامی رہ گئی ہے۔

ریشم کی صنعت کو بھی ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ٹسر، مونگا اور ایری مختلف ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔ ان سے ریشم نکالا جاتا تھا اور طرح طرح کے خوبصورت کپڑے بُنے جاتے تھے۔ ریشم اور سونے چاندی کے تاروں کو ملا کر اعلیٰ قسم کے قیمتی کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ ان کپڑوں پر بہترین قسم کی گل کاری کی جاتی تھی جس کی نفاست اور پاکیزگی اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ کمخواب، ہمرو، مشجر اور مشروع اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ مغلیہ دور میں یہ صنعتیں بہت ہی ترقی یافتہ حالت میں تھیں۔ درباری سرپرستی کی وجہ سے کاریگروں کی خوب ہمت افزائی ہوتی تھی اور جدت کا میدان روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا۔ گوناگوں حالات کی بنا پر یہ صنعتیں ناپید ہو چکی ہیں۔

ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت بھی بہت ہی قدیم زمانے سے مروج ہے۔ دہلی میں لوہے کی موجودہ لاٹ سمودر گپت کے زمانے کی یادگار ہے۔ اس لاٹ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے (۴۵۰۰) سال قبل ہندوستانی صناع لوہے کی صنعت میں کس قدر مہارت رکھتے تھے۔ ایک مستند مورخ نے لکھا ہے کہ آج سے دو ہزار سال قبل بھی ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت انتہائی عروج پر تھی۔ چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی اشیاء نہایت خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ تیار کی جاتی تھیں جن سے نہ صرف ملک کے باشندوں کی احتیاجات پوری ہوتی تھیں بلکہ یہ بیرونی ممالک کو بھی روانہ کی جاتی تھیں۔ آسام میں بڑی سے بڑی توپوں کی نالیاں ڈھالی جاتی تھیں۔ توڑے دار بندوق اور نہایت عمدہ قسم کی تلواریں پنجاب، سندھ، بنگال اور مدراس وغیرہ کے علاقوں میں تیار کی جاتی تھیں۔ کشمیر اور کچھ میں خوبصورت اور مضبوط زرہ بکتر تیار کئے جاتے تھے۔ احمد نگر کا علاقہ تیر کے نیزوں کے لئے خاص طور پر مشہور تھا۔

تلوار اور دیگر قسم کے آلات اور اوزار کے دستوں اور پلڑوں پر سونے چاندی کا نقشی کام کیا جاتا تھا۔ گلٹ سازی اور میناکاری کی صنعت میں بھی ہندوستانی صناعوں کو کافی مہارت حاصل تھی۔ جے پور، بہاول پور اور کچھ میں سونے کا کام ہوتا تھا۔ ملتان، لکھنؤ اور رام پور چاندی کے کام کیلئے مشہور تھے۔

مذکورہ صنعتوں کے علاوہ ہندوستان میں شیشہ سازی کی صنعت بھی مروج تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ شیشہ سازی کی صنعت ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں سے ہے۔ چنانچہ

راتھ شاستر اور رگ وید جیسی قدیم کتابوں میں بھی اس صنعت کا ذکر ہے۔ دورِ مغلیہ میں یہ صنعت بہت ہی ترقی پذیر حالت میں تھی۔ عمدہ قسم کے آئینے، شیشے کے جھاڑ، کونڈے اور طرح طرح کا آرائشی سامان تیار کیا جاتا تھا جس سے امیر امراء کے محل سجائے جاتے تھے۔ رنگین شیشے کے خوبصورت برتن بھی تیار کئے جاتے تھے۔ بیجاپور میں شیشے کے گلاب دان اور حقے برآمد ہوئے ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سولھویں صدی کے بنائے ہوئے ہیں۔

شکر سازی کی صنعت کے متعلق بعض مورخین کا کہنا ہے کہ اس کی ایجاد سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی۔ قدیم زمانے میں شکر کی برآمد دور دور ممالک کو ہوتی تھی۔ خصوصاً یورپ میں شکر کی سربراہی ہندوستان اور اس کے گرد و نواح سے ہوتی تھی۔ قدیم یونان میں شکر کو "ہندوستان کا میٹھا نمک" کہا جاتا تھا۔ ساتویں صدی سنہ عیسوی میں شہنشاہ چین نے اپنے ہاں کے چند افراد کو ہندوستان میں بمقام بہار روانہ کیا تھا تاکہ فن شکر سازی میں مہارت حاصل کریں۔

جہاز سازی بھی ہندوستان کی قدیم صنعت ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کا ثبوت مختلف مورخین کی تصانیف سے ملتا ہے۔ چھوٹی کشتیوں سے لیکر بڑے بڑے جہاز تیار کئے جاتے تھے۔ ساحلی تجارت کے علاوہ دور دراز مقامات کی تجارت ہندوستانی جہازوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے مابین اسباب کی نقل و حمل میں ہندوستانی جہازوں سے مدد لی جاتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بھی ہندوستانی جہاز انگلستان کو مال لے جاتے تھے۔ ۱۸۱۱ء میں ایک فرانسیسی سیاح نے لکھا ہے کہ "قدیم زمانے میں ہندوستانیوں نے فن جہاز سازی میں خوب کمال دکھایا تھا۔ اس فن میں یہ لوگ اب بھی یورپی افراد کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستانی فن جہاز سازی کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے ذریعہ اپنی صنعت میں بہت کچھ اصلاح کی۔"

ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ تہذیب و تمدن کی گوناگوں ضروریات سے متعلق مختلف چھوٹی چھوٹی قابلِ قدر اور غیر معمولی مہارت طلب صنعتیں جاری تھیں۔ ان میں سے اکثر معدوم ہو چکی ہیں اور بعض کس مپرسی کی حالت میں پڑی سسک رہی ہیں۔ یہاں پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم صنعتیں کیوں معدوم ہوئیں؟ اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ حکومت مغلیہ کے زوال کے بعد درباری سرپرستی اٹھ گئی۔ اشیاء کی کھپت میں غیر معمولی کمی ہو جانے کی وجہ سے صناع بیکار ہو گئے۔ ابتداً ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ پالیسی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مصنوعات ہندوستان سے انگلستان لیجائی جائیں۔ لیکن بعد میں قومی مفاد کے تحت یہ پالیسی بدل دی گئی۔ اب یہ کوشش کی جانے لگی کہ انگلستانی مصنوعات کے لئے ہندوستان میں بازار فراہم کئے جائیں۔ چنانچہ اس کے لئے ہندوستان کی مختلف مصنوعات پر انگلستان میں بھاری محاصل عاید کئے گئے اور مختلف تدابیر کے ذریعہ انگلستانی مصنوعات، ہندوستان میں فروخت کی جانے لگیں۔ صنعتی انقلاب کی بدولت مختلف قسم کے آلات، اوزار اور مشین ایجاد ہوئے۔ جس کے ذریعہ کم سے کم مصارف میں زیادہ سے زیادہ اشیاء تیار کی جانے لگیں۔ ہندوستان کی دستی مصنوعات انگلستان کی مشین کی بنی ہوئی ارزاں اشیاء کا مقابلہ نہ کر سکیں اور بالآخر یہاں کے صناعوں کو

اپنا پیشہ ترک کرکے زراعت یا کسی اور پیشے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ رجحان بتدریج بڑھتا گیا حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد ہندوستانی آبادی میں قابل لحاظ اضافہ ہوگیا تو ہندوستان کو زرعی ملک کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کی گئی)

یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستان صرف زراعت ہی کے لئے موزوں ہے۔ ہندوستان کو قدرت نے ایسے ذرایع عطا کئے ہیں جن کی بدولت وہ ایک طرف تو زرعی لحاظ سے ترقی کرسکتا ہے تو دوسری طرف صنعت و حرفت میں بھی موجودہ ترقی یافتہ ممالک کا ہم پلہ ہوسکتا ہے۔

محمد ناصر علی

انقلاب

(سانیٹ)

دل کے بجھتے ہی دل افروز نظارے نہ رہے
آبشاروں کے ترنّم میں ہے وحشت سی نہاں
مست جھونکوں میں ہیں جھجکی ہوئی آہیں لرزاں

بھولی چڑیوں کے وہ بے باک طرارے نہ رہے
خلوتِ شب میں ستاروں کے اشارے نہ رہے
رامش و رنگ کے فردوس پڑے ہیں ویراں
نکہت و نور کی دنیا ہے نظر سے پنہاں

کالے بادل کے وہ گلرنگ کنارے نہ رہے
ایک جھلسا ہوا لاشہ ہے چمن زارِ حیات
اک دہکتا ہوا انگارا ہے ہنستا ہوا پھول
سبز اشجار ہیں کملائے ہوئے خشک ببول

زندگی تند گھٹاؤں کی ستائی ہوئی رات
ان کے جانے سے وہ احساس نے پلٹا کھایا
میں نے ہنسنا بھی اگر چاہا تو رونا آیا

احمد ندیم قاسمی

تنقید و تبصرہ

شمیم کے سو شعر:- (سید مظفر حسین شمیم کی غزلوں کے سو منتخب شعر) مرتبہ سید جمیل الدین۔ پاکٹ ایڈیشن حجم ۲۹ صفحہ قیمت ۴ پتہ عثمانیہ بکڈپو ۱۵ محمد علی بلڈنگ بمبئی۔

اس چھوٹی سی بیاض میں جناب شمیم کی کوئی چالیس غزلوں کے سو منتخب شعر درج ہیں۔ شمیم صاحب کے کلام میں جذبات کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔ کلام کا معیار بھی بلند ہے بعض اشعار میں انقلابی رنگ کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے۔

عشرت گیاوی کے سو شعر:- جیبی سائز۔ مرتبہ سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی حجم ۳۲ صفحہ قیمت ۲ پتہ سید آل نبی حسنین منزل۔ گیا۔ صوبہ بہار۔

الف کی ردیف کی حد تک کوئی تیس غزل کے سو شعر چنے گئے ہیں۔ انتخاب اچھا ہے۔ ہر غزل میں سے دو دو چار چار شعر لئے گئے ہیں بعض غزلوں سے کچھ زیادہ بھی چنے گئے ہیں۔ جناب عشرت کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ اعلیٰ جذبات کی تصویریں موجود ہیں کلام میں تنوع، پختگی اور اعلیٰ تخیل کی اچھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

ذکر و فکر:- از مقصود زاہدی حجم ۱۰۰ صفحہ قیمت ۸ پتہ مکتبہ ساغر ادبی مرکز۔ میرٹھ۔

اخلاقی۔ معاشرتی۔ نفسیاتی مضامین اور کہانیوں کا یہ مجموعہ مقصود زاہدی کی پہلی تصنیف ہے۔ جناب ساغر نظامی نے اپنے پیش لفظ میں مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ ساغر صاحب لکھتے ہیں "اس کتاب کے مضامین اور چھوٹی کہانیاں صاف بتا رہی ہیں کہ مدہوش جوانی کے مقابلے میں زندگی کے تلخ تجربات مقصود کے دل پر گہرا نقش چھوڑتے ہیں۔۔۔۔۔ مقصود زندگی کی ان گلیوں میں گھوم کر آیا ہے جہاں رومان زادوں کا دم گھٹتا ہے"۔ اس مجموعہ کے مضامین میں "ہندوستان میں طبقاتی تقسیم" اور "فریب خیال" خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ کہانیاں بھی نتیجہ خیز ہیں۔ طرز بیان دلچسپ ہے۔ بعض الفاظ کی تکرار گراں گزرتی ہے مثلاً "لوگ باگ" اگر اسیطرح مشق جاری رہے تو بقول ساغر صاحب کے کسی دن ایک جدید مصنف مقصود کی روح میں پیدا ہو جائیگا۔ مقصود کو اپنا یہ سفر جسکی پہلی منزل سامنے ہے، جاری رکھنا چاہیئے۔

ادب لطیف (افسانہ نمبر) بابتہ مئی و جون مرتبہ چودھری برکت علی بی اے و چودھری نذیر احمد حجم ۱۶۰ صفحہ قیمت ۱۲ پتہ مکتبہ اردو۔ لاہور۔

لاہور کے مشہور ماہنامہ کے اس خاص نمبر میں بیس افسانے شریک ہیں۔ "ہمارے افسانے" کے عنوان سے پروفیسر فیض احمد فیض نے افسانوں اور فن افسانہ نگاری پر ایک مختصر تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ افسانوں میں اکثر کہنہ مشق لکھنے والوں کے افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احتشام حسین، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، اختر انصاری، شکیلہ اختر، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، محمد امین شرقپوری وغیرہ کے افسانے کافی دلچسپ اور سبق آموز ہیں، ترجموں میں انگریزی، روسی، چینی اور دوسری زبانوں کے عمدہ افسانے شریک ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ افسانہ نمبر بہت دلچسپ ہے اور کاغذ کی گرانی کے اس دور میں بلحاظ حجم کے بہت سستا ہے۔

نبیٔ عربی صلعم از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی حجم ۱۶۰ صفحہ قیمت ۱۲ پتہ منیجر ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔

تاریخ اسلام کے مختصر نصاب کی یہ پہلی کتاب ہے جسکو مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کیلیے حسب فرمائش ناظم ندوۃ المصنفین جناب مولف نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سیرت رسول اکرم سے متعلق اہم واقعات اختصار کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جملہ مضامین عربی کی مستند کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں اور سلیس زبان میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں بچوں کے علاوہ بڑے بھی اس مختصر سیرت سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

افسانہ نمبر استار ہفتہ وار لاہور باتصویر مرتبہ قمر جلال آبادی حجم ۶۴ صفحہ قیمت ۲ سالانہ چندہ چار روپے پتہ دفتر استار ہسپتال روڈ لاہور۔ استار کا زیر نظر، اگست کا پرچہ افسانہ نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں کئی دلچسپ افسانے کہانیاں، غزلیں، نظمیں، فلمی خبریں وغیرہ ہیں۔ بعض افسانوں میں تھوڑی سی عریانیت آگئی ہے یہ حذف کر دیجاتی تو نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کے جذبات میں اس قسم کے افسانے پڑھنے سے جو ہیجان پیدا ہوتا ہے اس کا اندیشہ باقی نہیں رہیگا۔

"س"

ادارہ کی خبریں

شعبے

اس مہینے ادارے کے دو شعبوں کی مجلس انتظامی کے اجلاس منعقد ہوئے۔

شعبۂ نسواں بتاریخ یکم مہر ۱۳۵۰ف ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کا اجلاس دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حسب ذیل خواتین موجود تھیں۔

(۱) رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبہ
(۲) بلقیس بانو بیگم صاحبہ
(۳) تصدق فاطمہ صاحبہ
(۴) سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ

بسلسلۂ انتظام امتحانات ادارۂ ادبیات اردو واقع ۱۵، ۱۶، ۱۷، مہر ۱۳۵۰ف طے پایا کہ چونکہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد اب واپس آگئی ہیں اس لئے بہ حسب سابق وہی صدر نگران کار کی خدمت انجام دیں گی اور مسز سروری صاحبہ، تصدق فاطمہ صاحبہ و محترمہ بلقیس بانو بیگم صاحبہ بحیثیت مددگار نگران کاران کی مدد کریں گی۔

رابعہ بیگم صاحبہ ۱۵ مہر ۱۳۵۰ف کو بمعیت تصدق فاطمہ صاحبہ و بلقیس بانو بیگم صاحبہ اردو دانی کے امیدواروں کا تقریری امتحان لیں گی۔

شعبۂ انسائیکلوپیڈیا ادارے کے شعبۂ انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کا ایک اجلاس بتاریخ ۱۱ مہر یوم شنبہ شام کے پانچ بجے بصدارت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور دفتر ادارہ میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

(۱) ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل
(۲) عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے
(۳) سید شاہ محمد صاحب ایم ایس سی
(۴) عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی
(۵) سید محمد صاحب ایم اے

حسب ذیل امور طے پائے۔

(۱) طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے ایک بورڈ آف اڈیٹرز بنایا جائے جو مختلف علوم و فنون کے ماہرین پر مشتمل ہو اور جس کے ارکان کی فہرست مرتب کر کے آئندہ مجلس انتظامی کی منظوری حاصل کی جائے۔

(۲) اعراب کے مسئلہ کو شعبۂ زبان کے سپرد کیا جائے اور ایسے الفاظ کی فہرستیں طلب کی جائیں جن میں اختلاف ہے۔

(۳) زبان کی یکسانیت کو قائم رکھنے کے لئے حسب ذیل حضرات کی ایک کمیٹی بنائی گئی جو انسائیکلوپیڈیا کے مضامین پر اس نقطۂ نظر سے غور کرے گی۔

(۱) ڈاکٹر زور صاحب ایم اے پی ایچ ڈی
(۲) سروری صاحب ایم اے ایل ایل بی
(۳) شاہ محمد صاحب ایم ایس سی
(۴) سید محمد صاحب ایم اے
(۵) لطیف احمد فاروقی صاحب ایم اے ایل ایل بی۔

شاخیں

اس مہینے حسب ذیل چار مقامات میں ادارہ کی شاخوں کے قیام کی منظوری صادر کی گئی۔ کپل، برلی، ہمناباد، چیتاپور۔

ادارے کی شاخوں کی مصروفیتیں

شاخ برلی یکم تیر ۱۳۵۰ف دن کے چار بجے حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔

مولوی غلام حسن صاحب صدیقی خطیب برلی نے ادارۂ ادبیات اردو کے

اغراض ومقاصد کی تشریح فرمائی۔ ان بعد مولوی اشرف الدین صاحب فیضی
نے اردو زبان اور ادب کی حفاظت اور ترقی کے سلسلے میں جامعہ عثمانیہ کے
مائہ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور فخر وطن وناز ش آب
پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی کوششوں کو واضح طور پر سمجھایا۔
فاضل صدر جلسہ نے بھی اردو امتحانات کی اہمیت پر کافی روشنی
ڈال کر حاضرین کے شوق پر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ باتفاق آرا حسب ذیل
عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر ـــــ حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل (پنجاب)

معتمد ـــــ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اردو عالم (ادارہ)

اراکین ـــــ (۱) مولوی سید عبدالرزاق صاحب جعفری اردو عالم

(۲) مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اردو عالم (ادارہ)

(۳) مولوی افلاطون خاں صاحب آئین

(۴) ابوالخیر فاروقی

(۵) محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں اردو

آخر میں معتمد صاحب نے امیدواران اردو فاضل، اردو عالم
اور اردو دانی کے درس و تدریس کے لئے اپنا دیوان خانہ مرحمت فرمایا جہاں
امیدواروں کو بلا اجرت تعلیم دی جاتی ہے۔ اور ازراہ عنایت غریب
امیدواروں کے لئے ہر قسم کی امداد کا وعدہ فرمایا۔

(اقتباس از رپورٹ مورخہ ۱۲ ر شہریور ۱۳۵۰ف روز جمعہ جو شاخ
ادارۂ ادبیات اردو پرلی کے ماہانہ جلسہ میں سنائی گئی)

اس شاخ نے مقامی تاریخی تحقیقات کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کرلیا
ہے۔ اس سلسلہ میں معتمد نے "پرلی" کے تاریخی حالات لکھنے شروع کردئے
ہیں۔ یہ ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ اور یہاں ہندوستان کے بارہ جوتر لنگوں
میں سے ایک جوتر لنگ ہے۔ جو سری ویجناتھ جی کے نام سے موسوم ہے۔
مولوی اشرف الدین صاحب فیضی "تاریخ فتح آباد" پر کام کر رہے
ہیں۔ سب رس بابتہ اپریل ۱۹۴۱ء میں "فتح آباد پر ایک نظر" کے عنوان
سے مولوی سراج الدین صاحب نیر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ چنانچہ
اس جلسہ میں فیضی صاحب نے اپنا وہ مضمون سنایا جس میں نیر صاحب
کے مضمون کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

نیر کے آخری ہفتہ میں ہمارے ادارہ کے سرگرم رفیق، مولوی
اشرف الدین صاحب فیضی نے اردو امتحانات کے سلسلے میں نیک نور، فتح آباد
اور سائیگاؤں جاگیر کا دورہ کرکے وہاں سے اردو امتحانات کے لئے امیدوار
ہی فراہم نہیں کئے بلکہ ان کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ بندوبست کردیا۔

شاخ پربھنی

آنریبل سید عبدالعزیز صاحب صدرالمہام عدالت وامور مذہبی
کے استقبال کی اعلیٰ پیمانے پر تیاری کی گئی تھی۔ مارکٹ کے ٹین
ہال کو نہایت سلیقہ سے سجایا گیا تھا اردو کے قدیم وجدید ادبا وشعرا کی تصاویر
لگائے گئے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے تمام شعبوں کو اجاگر کرکے یہ بتلایا گیا
کہ ادارہ اردو زبان وادب کی خدمت میں کس قدر سرگرم عمل ہے۔ مقامی
شاخ کی ڈیڑھ سالہ جد وجہد سے جو کام انجام دئے گئے ہیں ان کی تفصیل
دکھلائی گئی کہ سال ۱۹۴۰ء میں شاخ ہذا سے پندرہ طلبا امتحان اردو عالم
میں شریک رہے۔ جن میں ایک درجہ اول اور باقی تیرہ درجہ دوم میں
کامیاب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے جس میں
ملک وبیرون ملک کے متعدد رسائل اور اخبارات منگوائے جاتے ہیں۔ تا ایں
۱۲ ر تیر ۱۳۴۹ف سے ۹ ر شہریور ۱۳۵۰ف تک (۳۷۱۱) ناظرین کی تعداد
رہی اور کتب کے مطالعہ کرنیوالوں کی تعداد (۷۱۱) رہی۔ ونیز صحافی
کی کلاس قائم کی جاکر ۸ طلباء کو جلد سازی سکھلائی گئی اب تعلیم بالغان کا
مسئلہ زیر غور ہے۔ سال حال اردو دانی میں (۲۲) اردو عالم میں
(۲۴) اور اردو فاضل میں (۱۲) طلبا۔ خوشنویسی میں ایک جملہ (۵۹)
طلبہ شریک ہوئے ہیں۔

آنریبل عبدالعزیز صاحب ۱۰ ر شہریور ۱۳۵۰ف کو ٹھیک ساڑھے
چھ بجے رونق افروز ہوئے۔ مستقر ضلع کے تقریباً تمام عہدہ داران شریک تھے۔
خاص طور پر مولوی ولی حسن صاحب اول تعلقدار۔ راجہ ڈھونڈے راج بہادر

ناظم عدالت۔ حبیب الرحمن صاحب زاید ناظم عدالت۔ غلام دستگیر صاحب مددگار ناظم انجمن اتحاد باہمی محمد عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری۔ مولوی ابرار حسین صاحب صدر مدرس فوقانیہ وغیرہ وغیرہ موجود تھے۔ ان کے علاوہ وکلاء و معزز شہریوں کی کثیر تعداد شریک جلسہ تھی۔ کمیٹی استقبالیہ کی جانب سے مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری و حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد اعزازی شاخ پربھنی و مولوی محمد مظہر علیخاں صاحب وکیل ہائیکورٹ نائب صدر بزم نے استقبال کیا۔ گلپوشی کے بعد مولوی محمد مظہر علیخاں صاحب وکیل نے ادارہ ادبیات اردو کے شوروم کا معائنہ کرایا۔ اور ادارہ کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا۔ موصوف نے دلچسپی سے ملاحظہ فرماکر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور شاخ پربھنی کی سرپرستی قبول فرماکر ایک سو دس روپیہ کا عطیہ عطا فرمایا۔ جس کے جواب میں ادارہ کی جانب سے مولوی محمد مظہر علیخاں صاحب وکیل نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

شاخ خانہ پور

یہ شاخ کوشش کر رہی ہے کہ مسلمان اور ہندو طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو شرکت امتحان کے لئے تیار اور اردو عالم و فاضل کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا

کمیٹی نسائیات

شعبۂ نسائیات کا دوسرا جلسہ ۲ر مہر سنہ ۱۳۵۰ف ۴½ بجے شام میں ادارہ کے دفتر پر منعقد ہوا۔ حسب ذیل خواتین و حضرات نے شرکت کی۔

(۱) محترمہ مسز جبار

(۲) محترمہ مسز میر حسن

(۳) " مس خورشید ویکاجی

(۴) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

(۵) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

(۶) مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے۔ ایم ایڈ

(۷) سید بادشاہ حسین

مس ویکاجی نے اپنا مرتب کیا ہوا "پکوان" کا انڈکس کمیٹی میں پیش کیا۔ چونکہ "آ" کے الفاظ پر نوٹ مرتب کروانے کی بہت عجلت ہے اسلئے حسب ذیل الفاظ فہرست سے منتخب کئے گئے اور ان پر نوٹ مرتب کرنیکا کام بھی موجودہ خواتین ہی میں تقسیم کیا گیا۔

آچار ــــــ مسز میر حسن

آب شولہ ــــــ مس خورشید ویکاجی

آئسکریم ــــــ مس خورشید ویکاجی

آٹنگ ــــــ مس خورشید ویکاجی

آداب، گھریلو ــــــ مسز جبار

طے پایا کہ مس خورشید ویکاجی کی فہرست پر معتمدین نظرثانی کر کے مسز میر حسن کے ہاں بھیجیں گے اور مس ویکاجی اور مسز میر حسن کے باہمی مشورہ سے کام کی تقسیم ہوگی۔ فی الوقت مس خورشید ویکاجی اپنے ترکارکاری کی فہرست مرتب کریں گی اور بجائے مسز جبار کی نگرانی کے وہ خود کام کی نگرانی کریں گی۔

طے پایا کہ دھلوائی کی فہرست مسز میر حسن کے پاس بھیجی جائے تاکہ وہ مکمل کرسکیں۔ کیونکہ اس کے الفاظ پر نوٹ وہی مرتب کریں گی

طے پایا کہ ترکاریوں کے ناموں کے ساتھ جو نباتیاتی نوٹس ہوں گے ان کے ساتھ ان ترکاریوں کے پکوان کے ناموں کی فہرست شامل کردی جائے گی۔

طے پایا کہ مولوی ہاشمی صاحب کی فہرست زیورات پر معتمدین نظرثانی کر کے ایسے الفاظ کا تعین کرینگے جن پر الگ الگ نوٹس لکھے جائیں گے۔

طے پایا کہ آئندہ اجلاس تک دوسرے مضامین کی فہرستیں بھی طلب کرلی جائیں گی اور ان کو دوسرے اراکین کے ہاں گشت کروایا جائے گا

کمیٹی نباتیات

بتاریخ یکم مہر ۱۳۵۰ف اردو انسائیکلوپیڈیا (شعبہ نباتیات) کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت کی۔

بصدارت پروفیسر سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبدالباری صاحب ایم ایس سی۔
مولوی معین الدین صاحب ایم ایس سی۔
مسٹر مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی
مولوی عبدالسلام صاحب ام ایس سی
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
فیض محمد معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا

اس جلسہ میں نباتیات کے الفاظ کی مرتبہ فہرست پر نظر ثانی کی گئی اور طے پایا کہ مکمل فہرست صدر موصوف اپنی نگرانی میں تیار کرلیں گے۔ نیز مقالوں کی ترتیب کے متعلق ضروری امور طے کرلئے گئے اور صدر جلسہ نے بڑی حد تک کام بھی تقسیم کردیا۔

طب مغربی

۵ مہر ۱۳۵۰ف شام کے پانچ بجے ادارہ کے دفتر پر شعبہ طب مغربی کا پہلا جلسہ ہوا حسب ذیل اصحاب شریک تھے۔

(۱) ڈاکٹر برج موہن لال صاحب پرنسپل میڈیکل کالج
(۲) ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ ایم بی بی ایس
(۳) ڈاکٹر منور علی ایف آر سی ایس
(۴) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
(۵) سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا

ڈاکٹر نبکٹ چندرا اور بعض دوسرے ڈاکٹروں نے جنھیں اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اپنی اتفاقی اور غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے شرکت سے معذرت چاہی اور ساتھ ہی یقین دلایا کہ جو کام ان کے تفویض کیا جائے گا وہ بخوشی کرنے آمادہ ہوں گے۔

(۱) طے پایا کہ کارڈز کے ترجموں کی نظر ثانی اس فہرست کی مدد سے کرلی جائے۔ جو میڈیکل کالج میں مرتب ہورہی ہے اور ان اصطلاحوں کی نقلیں مقالہ نگاروں کے ہاں بھیج دی جائیں تاکہ وہ اصطلاحوں میں یکسانیت کا خیال رکھیں۔

(۲) طے پایا کہ اشاریہ کی تکمیل کے بعد (فی الحال الف کی حد تک) کمیٹی کا دوسرا جلسہ طلب کیا جائے اور کام کی تقسیم مکمل کی جائے۔

(۳) طے پایا کہ آئندہ جلسہ کا وقت رات کے آٹھ بجے کے بعد رکھا جائے کیونکہ ڈاکٹروں کو ان کی کثیر مصروفیات کی وجہ سے دن میں شرکت کے مواقع نہیں مل سکتے۔

(۴) طے پایا کہ ڈاکٹر بدر الدین صاحب بدر، ڈاکٹر عزیز حسن صاحب، ڈاکٹر شاہنواز صاحب، ڈاکٹر فضل کریم صاحب، ڈاکٹر ہینگل اور ڈاکٹر علی حسین صاحب سے بھی اشتراک عمل کی درخواست کی جائے۔

مقالہ نگاروں کو ہدایتیں

اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد کے لئے الفاظ و مصطلحات کا انتخاب ہوچکا ہے۔ اور مضامین کی ترتیب کا کام جاری ہے۔ حیدرآباد اور ہندستان کے سیکڑوں علما اور ماہرین علوم و فنون اس عظیم الشان کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اور روزانہ متعدد مقالے اور مضمون وصول ہورہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مرتبین کی سہولت کے لئے حسب ذیل ہدایتیں شائع کی جاتی ہیں۔

(۱) ہر مضمون یا نوٹ میں صرف مستند مواد اور واقعات درج ہوں۔ ذاتی رائے قیاس یا رجحان کو قطعاً دخل نہ دیا جائے۔

(۲) عبارت واضح صاف اور سلیس ہو۔ انشا پردازانہ یا صحافتی یا مبہم اسلوب بیان سے احتراز کیا جائے۔

(۳) مضمون کے آخر میں حوالے کی کتابوں کے علاوہ کتابیات کے

عنوان کے تحت اس موضوع سے متعلق دیگر کتب کے نام بھی درج کئے جائیں۔

(۴) حوالے کی کتابوں کا سنہ طباعت اور اگر ضرورت محسوس ہو تو ان صفحوں کے نمبر بھی لکھے جائیں جن سے مرتب نے مواد حاصل کیا ہے۔

(۵) ختم مضمون پر کتابیات کے آخر میں مضمون نگار اپنے نام کے سرحرف (جو وہ رکھنا چاہتے ہوں) درج کریں۔

(۶) اگر کسی انسائیکلوپیڈیا یا اسی قسم کی کسی دوسری کتاب سے مواد حاصل کیا گیا ہو تو حتی الامکان اس امر کی کوشش ہونی چاہئے کہ ان اصل کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جائے جن سے اس ماخذ نے مواد حاصل کیا ہے۔

(۷) انگریزی یا دوسری زبانوں کے الفاظ پہلے اردو رسم الخط میں اور بعد کو (قوسین میں) اصل زبان کے رسم الخط میں لکھے جائیں۔

(۸) غیر زبان کی اصطلاحوں کے ساتھ اردو اصطلاح یا تشریح ضرور درج کی جائے۔

(۹) دوسری زبانوں کے علاوہ وہ الفاظ جو انگریزی کے توسط سے اس وقت تک اردو میں آچکے ہیں ان کا تلفظ انگریزی کے مطابق لکھا جائے۔ لیکن ساتھ ہی قوسین میں اصل زبان کا تلفظ بھی لکھ دیں مثلاً۔ وکٹر ہیوگو (فرانسیسی- وکتور ایوگو)

(۱۰) دوسری زبانوں کے الفاظ کا صحیح تلفظ ظاہر کرنے کے لئے اعراب کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔ ادارہ کی مختلف مجلسیں اعراب اور علامتوں کے تعین پر غور کر رہی ہیں۔ قریب میں ان کی نسبت قطعی تصفیوں کا اعلان کیا جائے گا۔ اور اس طرح اردو زبان کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہو سکے گی۔

چند نئے مقالہ نگار

اردو انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد کے لئے جو اصحاب الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ و مصطلحات پر نوٹ تحریر کر رہے ہیں وہ ختم ماہ مہر تک اپنے مضامین روانہ فرمائیں اس سلسلہ میں یہ خبر اردو دنیا میں مسرت سے سنی جائے گی کہ مسٹر محمد علی جناح سے اقلیت پر، مہاتما گاندھی سے اہمسا پر، مسز سروجنی نائیڈو سے آزادی پر، مولنا ابوالکلام آزاد سے آدم پر، پنڈت جواہر لال نہرو سے اشتراکیت پر، نواب بہادر یار جنگ بہادر سے اتحاد المسلمین پر اور مسٹر کے ایم منشی سے اکھنڈ ہندوستان پر، اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے مضامین اور مقالے لکھوائے جا رہے ہیں۔

معاشیات کے مقالے

معاشیات کے مختلف موضوعوں پر حسب ذیل اصحاب مقالے تحریر کریں گے۔ یہ ہندوستان کے بہت بڑے ماہرین معاشیات ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر پرشوتم داس صاحب	بمبئی
۲۔ بی ایس لکشانم صاحب	مدراس
۳۔ ڈاکٹر جی کے مدن صاحب	بمبئی
۴۔ جے جے انجیرا صاحب	بمبئی
۵۔ بی، کے۔ آر، وی۔ راؤ صاحب	الہ آباد
۶۔ بی۔ کے اوادکر صاحب	شملہ
۷۔ ڈاکٹر کاروے صاحب	پونا
۸۔ ڈی۔ بی کالے صاحب	؍؍
۹۔ بی۔ ال۔ پنجابی صاحب	بمبئی
۱۰۔ ڈاکٹر گنگولی صاحب	دہلی
۱۱۔ کے۔ جی امبیگر صاحب	کانپور
۱۲۔ ڈاکٹر جے ای گرنگری	شملہ
۱۳۔ آنریبل سر منوہر لال صاحب	؍؍
۱۴۔ ایس کے رودرا صاحب	الہ آباد

۱۵۔ ڈاکٹر جی. آر. مسرا صاحب بنارس
۱۶۔ ڈاکٹر آر. کے مکرجی صاحب لکھنؤ
۱۷۔ پروفیسر مرنجان صاحب بمبئی
۱۸۔ سی. ایس. وکیل صاحب ″
۱۹۔ کے. ٹی. شاہ صاحب ″
۲۰۔ ڈاکٹر بالکرشنا صاحب بنگلور
۲۱۔ ایس. ایم. سبارا ؤ صاحب ″
۲۲۔ پی. جی. ٹامس صاحب مدراس
۲۳۔ ایچ. ال. ڈے صاحب ڈھاکہ
۲۴۔ جے. پی نیوگی پروفیسر اکنامکس کلکتہ
۲۵۔ آنریبل ڈاکٹر پرامتھم بنرجی ممبر کونسل دہلی
۲۶۔ جی. بی. بیری صاحب پروفیسر اکنامکس بمبئی
۲۷۔ ام. ای. حسین صاحب ″ ″ ″
۲۸۔ ڈاکٹر ایس. ام. داس صاحب گپتا لکچرار اکنامکس ڈاکہ
۲۹۔ بی. ین نائیڈو صاحب پروفیسر اکنامکس چدم برم
۳۰۔ وی. ال. ڈی. سادھنا صاحب پروفیسر اکنامکس میسور
۳۱۔ گوپال سامی صاحب مہاراجا کالج میسور
۳۲۔ ڈاکٹر جی گیڈگل پولٹائز آف اکنامکس پونا
۳۳۔ ایس. اے محمد پروفیسر اکنامکس بنگال
۳۴۔ ڈاکٹر ایس. سی حسین صاحب اکنامکس لاہور
۳۵۔ پروفیسر برج نرائن صاحب ″ ″ ″
۳۶۔ ڈاکٹر ایس. ام کھیر پروفیسر اکنامکس ″
۳۷۔ کیو. ام فرید صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج پنجاب
۳۸۔ خان بشیر احمد خاں صاحب سکریٹری پنجاب کارپوریشن مومنٹ لاہور
۳۹۔ ڈاکٹر ال. کے. حیدر صاحب چیرمن شعبۂ اکنامکس علیگڑھ
۴۰۔ محمد عاقل صاحب قرول باغ دہلی
۴۱۔ احمد حسین صاحب مارکٹنگ آفسر جیوٹ کمپنی کلکتہ
۴۲۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب پروفیسر اکنامکس پٹنہ
۴۳۔ پریم چند صاحب ہندو یونیورسٹی بنارس
۴۴۔ شیخ عطاءاللہ صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۴۵۔ ایس. ایم. شفیع صاحب ″ ″ ″
۴۶۔ احمد مختار صاحب اسمٰعیل کالج اندھیری بمبئی
۴۷۔ ایس. یم اختر صاحب اسلامیہ کالج لاہور
۴۸۔ سر موہن لال صاحب کے. ٹی. فینانس ممبر شملہ

اردو امتحانات

اس سال ادارے کے اردو امتحانات تیئس زنانہ و مردانہ مرکزوں میں منعقد ہوئے۔ اور ہر مرکز میں ایک صدر نگران کار صاحب ادارہ کی طرف سے روانہ کئے گئے جنھوں نے مقامی عہدہ دار اصحاب کی خواتین کی مدد سے زنانہ مرکزوں کی نگرانی کا انتظام کیا۔

پربھنی۔ سید بادشاہ حسین صاحب۔
پرلی۔ سید مہدی علی صاحب ایم ایس. سی۔
پربینڈہ۔ سید معین الدین صاحب ایم ایس. سی
کیل۔ مولوی خیرالدین صاحب
کشٹگی۔ اکبرالدین صاحب صدیقی بی اے
گلبرگہ۔ مہندر راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی
خانہ پور۔ ڈاکٹر غفار بیگ صاحب
کلیانی۔ عبدالمجید صاحب صدیقی یم۔ اے۔ ال ال بی
نرسی۔ خواجہ نصراللہ صاحب ایم ایس. سی
کاماریڈی۔ میر کاظم حسین صاحب بی۔ اے
زنانہ ہائی اسکول نامپلی۔ سکینہ بیگم صاحبہ
ہسٹی کالج بلدہ۔ سید محمد صاحب ایم اے۔

امتحانات کے نتائج | ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے
جو اردو امتحانات (اردو دانی۔ خوشنویسی۔ اردو عالم۔ اردو فاضل) دو ہفتہ قبل تیئیس مختلف مرکزوں میں مختلف مقامات پر منعقد ہوئے تھے۔ ان کے نتائج ماہ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں شایع کئے جائیں گے۔
اس بارے میں امیدواروں یا ان سے متعلقہ اصحاب کو ادارے سے استفسارات کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی چاہیے۔ دفتر ادارہ اس قسم کے خطوط کا جواب نہیں ادا کرسکتا اور نہ اس قسم کی یاد دہانیوں سے نتائج وقت سے پہلے شایع ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ممتحنین میں متعدد ایسے ہیں جو بیرون ممالک محروسہ کے ہیں۔

نئی مطبوعات

میر محمد مومن:۔ سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور پیشوا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم حیدرآباد کے مشہور تعمیر کار اور مصلح اور بانی دائرہ میر مومن کے حالاتِ زندگی اور علمی و رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل تذکرہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے مرتب کرکے شایع کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب جو تین سو سے زیادہ صفحات اور ۳۴ عکسی تصاویر پر مشتمل ہے۔ کئی سال سے زیر طبع تھی۔ دکن کی علمی و سیاسی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حیدرآباد کے اس سابق وزیر اعظم کے کارناموں کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

بلقان:۔ ادارۂ ادبیات اردو نے عام معلومات کی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب اس کی آٹھویں کڑی ہے۔ اس میں مولوی حفیظ صدیقی صاحب بی، ایس، سی رکن ادارت ماہنامہ سب رس نے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

شعبۂ طلبہ گلبرگہ | بتاریخ ۸ر مہر ۱۳۵۰ف ایک جلسہ مولوی احمد عبدالعزیز صاحب لکچرار معاشیات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تقریریں "پردے کی اچھائیاں اور برائیاں" پر ہوئیں محرک سید محمد نور الحسن تھے اور ان کی مخالفت حمید الدین نے کی۔ اس کے بعد دونوں پہلوؤں پر مختلف طلبہ نے تقریریں کیں۔ بڑا دلچسپ مباحثہ رہا۔ اعتراضات بھی اچھے تھے اور ان کا جواب بھی محرک صاحب نے معقول و دلچسپ دیا۔

بعد ازاں صدر صاحب جلسہ نے دونوں پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور پھر بتغلیبۂ آرا یہ طے پایا کہ پردہ ضروری ہے۔

مولوی نصیر الدین صاحب نظامی لکچرار گلبرگہ کالج ہمارے ادارہ و شعبہ کی ترقی کے لئے ہر ممکنہ کوشش کررہے ہیں۔ اور وقت بوقت اپنے قیمتی مشوروں سے رہنمائی فرماتے ہیں۔

یہاں اراکین شعبہ سرگرم کار ہیں۔ چنانچہ (قاضی محلہ) میں ایک شاخ شعبۂ طلبہ گلبرگہ قایم ہونے والی ہے۔

شعبہ طلبہ بلدہ کی جانب سے ایک جلسہ منعقد ہونے والا ہے جس کی اطلاع مقامی اخباروں میں چھپ جائے گی۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق نئی رائیں

اردو انسائیکلوپیڈیا کی گونج پچھلے کئی سالوں سے ہے کئی جگہ یہ کام شروع ہوا لیکن ابتدائی منازل ہی میں ختم ہوگیا اب ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے یہ بار عظیم اپنے سر لیا ہے اردو انسائیکلوپیڈیا کا ابتدائی نمونہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جہتی علوم و فنون کا یہ خزینہ اگر شایع ہوگیا تو واقعی اردو کو سربلند کردے گا اس انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں حیدرآباد اور ہندوستان کے ماہران علوم و فنون کا زیادہ سے زیادہ ہاتھ ہے۔ تمام شعبہ جات تقسیم کردئے گئے ہیں اس تقسیم کار سے امید پائی جاتی ہے کہ ادارہ ادبیات اردو ضرور اس اہم خدمت کو انجام دے سکے گا۔ ابتدائی نمونہ بڑی حد تک قابل اطمینان ہے میں داعی ہوں کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کو مرتب کرنے والے

افراد کو خدا ہمت و استقلال عطا فرمائے اور ادارۂ ادبیات اردو وائسا ٹھوس خدمت کے صلہ میں شہرت دوام حاصل کرے۔

—— **شاعر** آگرہ جولائی ۱۹۴۱ء

سرزمین دکن جہاں سب سے پہلے اردو یونیورسٹی بنی اب وہاں سے اردو انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت و تدوین کی خبر آئی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی اور ان کے دیگر رفقائے کار نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی طباعت اور اشاعت کا کام اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے اس کتاب کی ترتیب کا کام کوئی آسان بات نہیں ہے۔ مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کا جب کام شروع کیا گیا تھا تو ایک مخلص مرہٹہ نوجوان نے تمام ملک کا دورہ کرکے کتاب کے دو ہزار گاہک بنائے تھے جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ کتاب کو دو سو روپے فی جلد سے فروخت کرسکیگا تو اس نے ایک باقاعدہ دفتر پونہ میں قایم کرکے کام شروع کردیا تھا مسٹر کیلکر کا نام اس مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے بھی ایسی کوشش ہونی چاہیئے۔

اس کام کے دو پہلو ہیں ایک علمی اور دوسرا اقتصادی علمی کام کرنیوالے لوگوں سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ غریب روپیہ پیسہ کا بھی خود انتظام کرینگے ادارۂ ادبیات اردو کو چاہیے کہ علمی کام کرنیوالے لوگوں سے علیحدہ ایک علمی کام کرنیوالوں کی کمیٹی بنائے جو اس عظیم الشان کام کے سر انجام دینے کیلئے سرمایہ جمع کریں امید ہے کہ حیدرآباد گورنمنٹ بھی اس کام کو انجام دینے کیلئے ادارہ کا ہاتھ بٹائیگی یا دار الترجمہ حیدرآباد سے ضروری تراجم کی امداد دلائیگی خدا کے فضل سے حیدرآباد کی یونیورسٹی میں اسوقت کافی پروفیسر موجود ہیں جن میں سے کم و بیش سب صاحب اس قومی اور ملکی ضرورت کو پورا کرنے میں حصہ لیں گے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کو ہم اس کی اس سعی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

—— **پیسہ اخبار** لاہور ۳ جولائی ۱۹۴۱ء

ادارۂ ادبیات اردو نے اردو کی ایک عظیم الشان خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ حیدرآباد میں جدید و قدیم علوم و فنون کے اساتذہ اور ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت موجود ہے جن کی موجودگی میں اس کام کے انجام کی پوری توقع کی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو کے ہمدرد اور بہی خواہ اس کام میں اس کی ہمت بڑھائیں۔

—— **معارف** اگست ۱۹۴۱ء

اس وسیع علمی مہم کو ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے جس کو دونوں سہولتیں حاصل ہیں۔ سرمایہ بھی۔ اور قابل کام کرنے والوں کا اشتراک بھی۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ یہ کام ادارہ کے ہاتھوں بہترین طریقہ پر انجام پائے گا۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کا جو نمونہ ملا ہے پیش نظر ہے اسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اشاعت سے اردو زبان کی ایک بہت بڑی کمی پوری ہوگی۔ اس کی مجلس انتظامی کے اراکین و معاونین میں ہمیں ملک کی وہ تمام ہستیاں نظر آتی ہیں جو اپنی علمی قابلیت کا جواب نہیں رکھتیں۔ اور ان کے اشتراک سے جو چیز نکلے گی وہ یقیناً لاجواب ہوگی۔ ہم اردو داں حضرات سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کی خریداری قبول فرماکر اس عظیم الشان مہم میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔

—— **رسالہ ہل** الہ آباد اگست ۱۹۴۱ء

یہ نمونہ، بڑی اور چوڑی تقطیع کے ۱۵ صفحوں پر چھپا ہے۔ ہر صفحہ میں تین گنجان کالم ہیں۔ لیکن کتابت و طباعت صاف اور اتنی ضخامت میں چھوٹے بڑے ملاکر ۱۹ مقالے درج ہیں۔ زبان صاف، بیان واضح، مضامین سب کے سب سنجیدہ، پُرمعلومات، مستند، ایک انسائیکلوپیڈیا کی شایان شان۔

مجلس ادارت کے صدر، اردو کے مشہور خادم و کارکن، ڈاکٹر زور ہیں، دو معتمد ہیں اور چھ ارکان کی کمیٹی ان کے علاوہ۔ کل فہرست مباحث ۲۶ ابواب میں تقسیم ہے۔ ان میں سے ہر شعبہ متعدد ماہرین فن کے ہاتھوں میں ہے۔ کم از کم یہ نمونہ جس معیار کو پیش کر رہا ہے، وہ ہماری توقعات سے بلند تر ہے۔ اردو زبان کی یہ ٹھوس، سنجیدہ اور قابل قدر خدمت اردو کے ہر ہوا خواہ کی تائید اور عملی ہمدردی کی مستحق ہے۔

صدق جون ۱۹۴۱ء

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ 395 M
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
اکتوبر ۱۹۴۱ء

سب رس

جلد (۴) بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء شمارہ (۱۰)

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

تین گھنٹے ٹیگور کے ساتھ!

چند برس پہلے کی بات ہے کہ سید محمود صاحب اور میں مہمان خانہ "راک لینڈ" کے برانڈے میں کھڑے حسب ذیل اعلان پڑھ رہے تھے۔

اعلان

سوءِ اتفاق سے ڈاکٹر ٹیگور کچھ علیل سے ہو گئے ہیں اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق انھیں آرام کی ضرورت ہے اس لئے وہ ملاقاتیوں کو وقت دینے کے قابل نہیں ہو سکیں گے، براہ کرم انھیں معاف فرمایا جائے۔ معتمد

میں نے اس اعلان کو لاپروائی سے پڑھا لیکن سید صاحب پر اس کا کافی اثر معلوم ہوتا تھا۔ زبان سے تو میں کچھ نہ کہہ سکا لیکن مسکرا کر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہر بڑے آدمی کی آمد پر اسی قسم کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ ملنے والوں کا ہجوم ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ نہ ہو جائے۔

"صاحب! آپ لوگ اگر آٹوگراف لینے آئے ہیں تو اپنی کاپیاں چھوڑ جائیے" نوکر نے پڑھایا ہوا سبق دہرایا "تین چار روز بعد معتمد صاحب ان پر دستخط لے لینگے اور آپ کسی وقت آکر انھیں لے جائیں"۔

سید صاحب نے اس کو لطف خاص جانا اور فوراً ہی جیب سے آٹوگراف بک نکال کر نوکر کے حوالہ کر دی۔

"سوچ کیا رہے ہیں آپ؟ دے کیوں نہیں دیتے بیاض" سید محمود نے گویا موقع سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یاد دلایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ بھی بیاض کیوں نہ واپس لے لیں" میں نے کہا "پھر کسی روز آکر ہم خود دستخط کروالیں گے" "اب رہنے بھی دو" سید صاحب بولے "دوبارہ کون آئے اور پھر کسے معلوم کہ ملاقات ہو بھی سکے یا نہیں"۔ سید صاحب کی اس ترغیب کے باوجود میں نے بیاض نہیں دی۔

تین روز بعد پھر راک لینڈ پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں برانڈے میں پہنچا ہی تھا کہ ساڑھے آٹھ کا گھنٹہ بجا۔ اس دفعہ بھی وہی اعلان موجود تھا۔ میں نے بغور پڑھا کہ شائد الفاظ میں کسی قسم کی تبدیلی کی گئی ہو مگر وہی الفاظ بدستور باقی تھے البتہ نہ کوئی مہمان خانہ کا ملازم تھا اور نہ ٹیگور کا معتمد۔ چند لمحے باہر انتظار کرنے کے بعد میں ملحقہ کمرے میں پہنچا اور ٹوپی میز پر چھوڑ کر سگرٹ جلایا۔ ایک آرام دہ کرسی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کس طرح ٹیگور تک پہنچنا ممکن ہے؟

جب دوسرا سگرٹ بھی ختم ہوا اور کوئی ملازم خبر لینے نہ آیا تو مجھے خیال ہوا کہ تھوڑی سی بے تکلفی برتنی چاہیے۔ بغیر کسی قسم کا خاص منصوبہ سوچے میں مہمان خانہ کے اندرونی حصہ کی طرف گیا۔ فی الوقت تو مجھے نوکر کی تلاش تھی لیکن جب کوئی نظر نہ آیا اور ادھر ادھر گھومنے کے بعد ایک برانڈے میں ڈاکٹر ٹیگور نظر آئے تو طبیعت بے چین ہو گئی۔ ایک آرام کرسی پر وہ لیٹے ہوئے تھے بازو ایک تپائی پر تازہ اخبار اور دو ایک کتابیں دھری تھیں۔ صندلی رنگ کے لبادہ پر ان کی سفید ریش کچھ عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی اخبار ان کے ہاتھ میں تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسے پڑھ رہے تھے۔ میری آمد کو انھوں نے محسوس کیا لیکن پروا نہ کی۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ حسنِ اتفاق سے جو موقع ملا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں مگر جھجک اور تکلف کی وجہ سے قدم اٹھتے نہ تھے۔ میں گہری سوچ میں تھا لیکن ان کے سامنے اس طرح کھڑے ہو کر سوچتے رہنا بھی بے موقع سا تھا۔ قطعی فیصلہ کرنے کے لئے وقت درکار تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ برانڈے میں اسی طرح بے معنی طور پر گھومتا رہوں۔ نوکروں کا دُور تک پتہ نہ تھا۔ میں ادھر ادھر گھوم کر پھر ٹیگور کے سامنے سے گزرا مگر اب بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ ایسے میں ایک آواز میرے کان میں آئی۔ آواز دھیمی، سریلی اور رس بھری تھی۔

"ایک منٹ کے لئے تکلیف کریں گے آپ؟" ٹیگور پوچھ رہے تھے۔

اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے حواس مجتمع کئے پھر بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ٹیگور کس سے مخاطب ہیں ——— میرے سوا کوئی اور وہاں نظر نہ آتا تھا اور میں اجنبی تھا ——— نہ باہر لگا ہوا اعلان، کہیں

ٹیگور اسی کی طرف اشارہ کرنا تو نہیں چاہتے؟" دفعتاً مجھے خیال آیا اور ساتھ ہی مجھے اس طرح بلا اطلاع گھس آنے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی۔

"میں آپ کو ذرا سی تکلیف دینا چاہتا ہوں" میں نے اس دفعہ اچھی طرح دیکھا کہ ٹیگور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "بہت اچھا ابھی آیا" کہنے کی میں نے ہمت کی۔

"معاف کیجئے، یہاں کوئی نوکر نظر نہیں آتا"

"جی ہاں میں بھی نوکر ہی کی تلاش میں تھا ___ بوائے! بوائے!! ___ نوکر کو پکارتے ہوئے میں نے کہا" فرمائیے نا آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے معلوم ہوتا ہے کہ نوکر سب ناشتہ کر رہے ہیں، میرے لائق کوئی خدمت؟"

"میرا معتمد اوپر ہے یا باہر چلا گیا، ذرا دیکھ لیجئے"

"بہت بہتر"

میں فوراً اوپر گیا لیکن چونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ معتمد صاحب کس کمرے میں رہتے ہیں اس لئے بڑی مشکل ہوئی ان کی تلاش میں۔ بالآخر جب بغیر کچھ معلوم کئے ہوئے واپس ہو رہا تھا ایک نوکر اتفاقاً ملا۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ معتمد صاحب آدھ گھنٹہ پہلے جا چکے ہیں۔

"معتمد صاحب آدھ گھنٹہ پہلے جا چکے ہیں" میں نے واپس ہو کر اطلاع دی۔

"شکریہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی"

"جی نہیں، آپ اس کا خیال نہ فرمائیں ___ آپ کو کس چیز کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے فرمائیں"

"شکریہ، کوئی خاص بات نہیں، ضرورت ہوگی تو آپ سے مدد لے لوں گا"

اتنے میں باہر موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس وقت میری مدد کی ضرورت ہے۔

ٹیگور ہنس پڑے اور میں باہر پہنچا۔ ایک صاحب پتلون پر لمبا کالا کوٹ مدراسیوں کی وضع کا پہنے صافہ باندھے اور ستار ہاتھ میں لئے میرے منتظر کھڑے تھے۔

"میں کوی کے چرنوں میں بیٹھ کر ستار پر ایک راگنی بجانا چاہتا ہوں" پنڈت جی نے کہا۔

"مگر ان کی طبیعت ناساز ہے ___ دیکھئے نا یہ اعلان" یہ کہہ کر میں نے اعلان ان کی آنکھوں کے آگے کر دیا جس کو پڑھے بغیر انھوں نے سلسلہ جاری رکھا۔

"مگر پرسوں ان کے سکرٹری صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی طرح آج وہ مجھے موقع دیں گے۔"

"سکرٹری صاحب اس وقت موجود نہیں ہیں، آپ پھر کسی وقت ان سے مل کر اس کا تصفیہ کریں" یہ کہہ کر میں واپس ہونا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولے "کرپا کیجئے صاحب کرپا، میں سکندرآباد سے ٹیکسی پر آیا ہوں، اس سے پہلے بھی چکر کر چکا ہوں۔ میں زیادہ تکلیف نہ دوں گا، صرف دس منٹ ستار بجاؤں گا۔ یقیناً کوی خوش ہوں گے، سنتا ہوں کہ انھیں ستار سے بڑی دلچسپی ہے ___ مہربانی کیجئے، میں بڑا ممنون ہوں گا" ستار تپائی پر رکھ کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی تک لے گئے۔

"میری بڑی آرزو ہے، آپ دیا کریں تو مجھے موقع مل جائے گا" مجھے سوچ میں دیکھ کر انھوں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"ایک صاحب آپ کو ستار سنانا چاہتے ہیں، دس منٹ سے زیادہ وقت نہ لینے کا وعدہ کرتے ہیں" میں نے واپس ہو کر ٹیگور کو اطلاع دی" میں نے ٹالنے کی کوشش کی مگر انھیں اصرار ہے کہ موقع دیا جائے"

"اچھی بات ہے بلا لیجئے"

پنڈت یہ مژدہ سن کر خوشی سے پھول گئے۔ ٹیگور کو انھوں نے مودبانہ طور پر بڑے سلیقہ سے پرنام کیا اور کوی کے چرنوں میں آرزو کے مطابق بیٹھ گئے اور فوراً ہی تار چھیڑنے شروع کئے۔ دس منٹ بعد انھوں نے کہا اسی راگنی کو میں حلق سے بھی ادا کروں گا۔

"ڈاکٹر صاحب ٹال نہیں جانتے" میں نے جرأت آمیز قدم اٹھایا۔

"لیکن گانے کو زبان سے زیادہ تعلق نہیں" پنڈت جی نے فوراً ہی جواب دیا۔

دس منٹ تک وہ گاتے رہے۔ ختم کرتے ہی ٹیگور نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ستار بجانے کی بڑی تعریف کی اور وہ اس اخلاقی تعریف کو حسن طلب سمجھ کر دوسری گت چھیڑنے ہی والے تھے کہ ٹیگور نے انہیں منع کیا یہ کہہ کر آپ تکلیف نہ کریں اس وقت میری طبیعت کچھ زیادہ راغب نہیں معلوم ہوتی۔

پنڈت نے جاتے جاتے چرن چھوئے، پرنام کیا اور دل بھر کر مسکرا لیا۔

جب یہ چلے گئے تو ٹیگور نے مجھ سے پوچھا "آپ کو بھی موسیقی سے کچھ لگاؤ ہے؟"

"اس حد تک لگاؤ ہے کہ سن لیتا ہوں اور بغیر سمجھے بوجھے جتنا لطف مل سکتا ہے حاصل کر لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے "آپ کے ہاں موسیقی کا کیا حال ہے؟"

"اتنا شوق تو نہیں جتنا بنگال میں ہے" میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ بولے "آپ کھڑے کیوں ہیں؟ کرسی لے لیجئے نا ——— معاف کیجئے آج آپ کو مہمان خانے کی نگرانی کے سوا میرے معتمد کے خدمات بھی انجام دینے پڑ رہے ہیں۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ ایک طرف ٹیگور مجھے اس مہمان خانہ کا منتظم سمجھ رہے ہیں اور دوسری طرف ملاقاتی مجھے ان کا پرائیوٹ سکریٹری سمجھتے ہیں۔

"نہیں کوئی بات نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کی ہر طرح خاطر اور خدمت کرنا ہمارا فرض ہے" میں نے گول گول الفاظ میں جواب دینا مناسب سمجھا۔

"ہاں تو آپ موسیقی کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے" ٹیگور بولے۔

"میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں گانے کا اتنا شوق نہیں جتنا کہ بنگال، مہاراشٹرا اور آندھرا میں ہے۔"

"آپ کے ہاں مدرس میں موسیقی تو شامل نہیں ہوگی"

"جی نہیں ——— لیکن اب بعض مدارس میں ابتدائی جماعتوں میں اس کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔"

"کوئی موسیقی کا اسکول ہے یہاں؟"

"جی نہیں کوئی خاص اسکول نہیں۔"

"یہی وجہ ہے ——— بنگال میں ایسے بے شمار مدارس ہیں جہاں باضابطہ طور پر صرف موسیقی ہی سکھائی جاتی ہے۔"

"درست ہے اسی وجہ سے زیادہ چرچا ہے ——— اور آپ کے شانتی نکیتان کا کیا حال ہے؟"

"شانتی نکیتان؟ ——— آپ نے دیکھا ہے مدرسہ؟"

"جی نہیں، مجھے بدقسمتی سے موقع نہیں ملا؟"

"آپ کلکتہ آئے ہیں؟"

"نہیں شمال مشرقی ہندوستان کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"اس مدرسے سے دلچسپی ہے آپ کو"

"بہت"

"یہاں لوگ عام طور پر کیا خیال کرتے ہیں ——— بعض مقامات پر تو میں نے سنا کہ لوگ اسے تفریح گاہ سمجھتے ہیں۔"

"سنجیدہ طبقہ تو اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور طریقۂ تعلیم میں اس کو ایک انقلابی زینہ سمجھتا ہے"

"سنجیدہ طبقے کو چھوڑیئے، ہمیں تو عوام سے واسطہ ہے۔"

"عوام بھی اتنے بدظن نہیں"

"اتنے نہیں مگر ہیں ضرور، کیوں یہی ہے نا مطلب" میں مسکرا رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب ہنس رہے تھے۔

"آیئے نا کسی وقت! آپ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے، اب تو اس کے کئی شعبے ہو چکے ہیں اور آپ اس کو مشرقی وضع کی ایک بڑے درس گاہ پائیں گے"

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک نوکر دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا ایک

میم صاحب آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے وہ اعلان دکھایا مگر ہتی نہیں۔" میں اٹھ کر باہر گیا۔ ایک لمبی تڑنگی ادھیڑ عمر کی مغربی نژاد عورت بے چینی کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ لپکی اور مسکراہٹ کو ہر لحظہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"صبح بخیر! میں مس ——— ہوں" افسوس کہ مجھے اس کا نام اب یاد نہیں رہا۔ میں نے بھی سلام کا جواب سلام سے اور مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور اس کو اعلان دکھلانے میں جلدی کی۔

"یہ تو میں دیکھ چکی ہوں" اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا "آپ نے میرا نام سنا ہوگا"۔

"جی ہاں یاد تو پڑتا ہے لیکن" میں نے اخلاق میں جھوٹ کی آمیزش کی۔

"مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور بھی میرے نام سے ناواقف نہ ہوں گے" اس نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"ممکن ہے"

"اور یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ امریکہ سے ہندوستان تفریحی سفر پر آئی ہوں۔ تصویریں کھینچنا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ابھی تک میں نے ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیکڑوں تصویریں کھینچی ہیں۔ ان میں مناظر بھی شامل ہیں اور شخصیتوں کی شبیہیں بھی شامل ہیں۔"

کہنے کو جھوٹ کہہ چکا تھا کہ میں اس کے نام سے واقف ہوں لیکن اب معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ وہ خیر سے مصورہ ہے۔

"کیا آپ ٹیگور کی تصویر کھینچنا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں، بالکل صحیح ہے"

"اس کے لیے آپ کو پھر کبھی آنا پڑے گا"

"نہیں نہیں، میں بہت جلد حیدر آباد سے جانے والی ہوں۔ زیادہ دیر تکلیف نہ دوں گی آپ مطمئن رہیں ——— کیا ڈاکٹر ٹیگور بستر پر ہیں؟"

"نہیں آرام کرسی پر"

"تب تو ٹھیک رہے گا ——— میں اسی حالت میں تصویر کھینچ لوں گی۔ خاص نشست کی ضرورت نہیں۔"

"پھر بھی"

"کچھ نہیں صرف بیس پچیس منٹ کا معاملہ ہے، آپ میری مدد فرمائیں، آپ کو رشوت میں ایک دوسری تصویر دوں گی یا آپ کی خود کھینچ دوں گی" وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے واپس ہو کر ٹیگور کو حالات سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اچھا بلا لو۔ ٹیگور کے سامنے پہنچتے تک اس نے میرا کئی دفعہ شکریہ ادا کیا۔ ٹیگور اس کی تعظیم کے لئے اٹھنا چاہتے تھے مگر وہ مانع ہوئی۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ میری تصویروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" اس نے آس پاس کا ماحول درست کرتے ہوئے ٹیگور سے پوچھا

"معاف کیجیے اس وقت مجھے آپ کی تصویریں یاد نہیں"

مصورہ نے بعض رسائل کے نام لیے جن میں اس کے تصویریں ابھی حال میں شایع ہوئی تھیں اور ٹیگور نے بمشکل یاد کیا کہ ان میں سے بعض ان کی نظر سے گزری ہیں۔

"آپ کی پنسل کاری واقعی خوب ہے" ٹیگور بولے

"شکریہ! میں زیادہ تر پنسل کاری ہی کرتی ہوں، خصوصاً آپ کے ملک کی تصویریں تو میں نے پنسل ہی سے کھینچی ہیں ——— مسٹر حسین! کیا میں یہ تپائی ہٹا کر اس طرف قریب کر سکتی ہوں"

"کیوں نہیں ——— کیا کسی چیز کی اور ضرورت ہوگی؟"

نہیں ——— البتہ دو ایک تکیے مل سکتے تو شاعر کی گردن کے نیچے رکھ دیے جاتے تاکہ چہرہ ابھرے۔"

"اچھی بات ہے ——— بوائے! دیکھو، اندر سے دو تین تکیے تو لانا۔" نوکر تکیے لینے لپکا۔ ٹیگور نے کہا "اگر آپ کو یہ ماحول پسند نہیں تو میں اندر کمرے میں چلا جاؤں"

"جی نہیں، اندر تو اندھیرا ہے ابر کی وجہ سے۔ نہیں مناسب ہے

آپ آرام سے تشریف رکھیں" مصورہ بولی اتنی دیر میں نوکر تکیے لے کر پہنچ گیا۔
"آپ کو تکلیف دے سکتی ہوں" مصورہ بولی اور اس نے تکیے ٹیگور کی گردن کے پیچھے رکھ دیے۔
"تصویر پوری کھینچیں گی یا صرف بسٹ ؟" ٹیگور نے دریافت کیا۔
"میں سمجھتی ہوں کہ بسٹ تو اس "پوز" میں اچھا نہیں رہے گا، کرسی سمیت تصویر کھینچوں گی ـــــ ڈاکٹر صاحب آپ نے بھی کبھی بسٹ کھینچے ہیں ؟"
"کھینچے تو ہیں لیکن بہت ہی کم ـــــ آپ نے میری تصویریں دیکھی ہیں؟"
"ہاں، کئی تصویریں"
"کیا خیال ہے آپ کا ان کے متعلق ؟"
"میرا"
"میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کے ملک والوں کے خیالات معلوم کروں، بیشک ان کے لئے میری تصویریں بالکل ہی غیر متوقع ہیں، میری تصویروں میں مادیت عنصر بالکل نہیں ہوتا"
"جی ہاں ہندو فلسفہ ہوتا ہے"
"ہندو فلسفہ کا ذکر نہیں بلکہ میری تصویریں اصل خیال کا سایہ ہوتی ہیں۔ انسان کے تخیل میں وہ تنظیم اور وہ مادیت نہیں ہوتی جو عام طور پر تصویروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تخیل کی دھندلی تصویروں کو اصلی خدوخال اور رنگ اور شکل میں ظاہر کروں ـــــ
"تو گویا آپ کی تصویریں بھی اشعار ہوتی ہیں" میں نے کہا۔
"ہاں، بالکل صحیح ہے" ٹیگور بولے۔
"اسی وجہ سے آپ مصوری کے عام اصولوں کی پیروی نہیں کرتے" میں نے پھر کہا۔
"جی ہاں، عام اصول تو کیا میں خاص اصول کی بھی پیروی نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو مصور ان معنوں میں نہیں کہتا جن معنوں میں دوسرے لوگ مصور ہیں"

مصورہ نے اس وقت تک ایک بڑے ڈرائنگ پیپر کو لکڑی کے تختہ پر لگا لیا تھا کئی زاویوں سے شاعر کو دیکھ کر اس نے ایک زاویہ پسند کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے خاکہ کشی کی اجازت طلب کی۔
"کیا میں اس اثنا میں کتاب پڑھ سکتا ہوں کیونکہ آپ کی طرف دیکھتے رہنا میرے لئے بہت بار ہو گا" ٹیگور نے پوچھا "ضرور ضرور کیوں نہیں"
ٹیگور کی نظریں کتاب پر جمی تھیں، مصورہ اپنی قلم کاری میں مصروف تھی اور میں نے اجازت طلب کر کے ایک سگرٹ جلا لیا۔ رہ رہ کر میری آنکھیں کبھی مصورہ کی پنسل کو دیکھتی تھیں اور کبھی شاعر کے چہرہ کو۔ پانچ ـــــ دس۔ پندرہ ـــــ بیس ـــــ پچیس منٹ اسی طرح گزرے۔ اس اثنا میں ٹیگور کے معتمد صاحب بھی تشریف لا چکے تھے۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر کچھ حیران سے تھے لیکن ان کو علیحدہ لے جا کر میں نے انہیں سمجھایا کہ دو گھنٹہ سے میں ان کے فرائض بجا لا رہا ہوں۔ ان کے لئے سوائے اظہار ممنونیت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ دبی زبان سے انہوں نے یہ پوچھ لیا کہ شاعر ان کی غیر حاضری کو محسوس تو نہیں کر رہے تھے کیونکہ انھوں نے کافی دیر لگا دی تھی۔ میں نے اطمینان دلایا کہ میری موجودگی میں ٹیگور نے ان کی غیر حاضری محسوس نہ کی۔
کوئی آدھ گھنٹہ میں مصورہ نے پنسل اسکیچ مکمل کر لیا۔
"معاف کیجئے، میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی" انھوں نے تصویر ٹیگور کو دکھاتے ہوئے کہا "دیکھوں تو آپ اسے کیسے پسند فرماتے ہیں"
کچھ دیر تک ٹیگور دیکھتے رہے اور میں بھی قریب ہو کر دیکھتا رہا۔
"بڑی اچھی تصویر بنائی آپ نے، کافی مشق معلوم ہوتی ہے" بالآخر ٹیگور بولے۔
"شکر ہے کہ آپ نے پسند کی، میں سمجھتی ہوں کہ میری محنت ٹھکانے لگی ـــــ ابھی اس پر ایک آدھ گھنٹہ اور کام کروں گی گھر جا کر"
"کیا یہ آپ شاعر کو تحفہ دیں گی ؟" میں نے پوچھا
"یہ نہیں، اس کو تو اپنے ہاں رکھوں گی البتہ اس کی ایک نقل بھیج دوں گی"

تصویر ابھی تک ٹیگور کے ہاتھ میں تھی۔ معصورہ نے قلم شاعر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے خواہش کی کہ وہ اس پر اپنے دستخط فرما دیں جس کو ٹیگور نے خوشی سے منظور کیا۔ تصویر لے کر وہ خوش خوش روانہ ہوئی

" آپ کے پرائیوٹ سکریٹری آ چکے ہیں، فرمائیے تو انھیں بلاؤں" میں نے پوچھا۔

" ہاں ضرور بلوائیے "

میں نے نوکر کو آواز دی اور معتمد صاحب کو بلوا بھیجا۔ ڈاک آ چکی تھی۔ معتمد صاحب اپنے ساتھ کئی خطوط اور متعدد اخبار ساتھ لے آئے۔ ٹیگور نے بعض خطوط کے جواب لکھوائے اور بعض کے جواب معتمد کو اپنی طرف سے دینے کے لئے کہا۔ ان میں آخری خط کسی پبلشنگ ہاؤس کا تھا، افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت کی اجازت طلب کی تھی۔ مجھے فوراً اپنا ایک واقعہ یاد آیا۔

" اگر اجازت ہو تو ایک بات کہوں، اس خط سے یاد آ گئی" میں نے پوچھا۔

" ضرور ـــــ" وہ مسکرا کر بولے۔

" پچھلے سال میں نے آپ کے بعض افسانے اردو میں ترجمہ کئے تھے اور ان کو مجموعہ کی شکل میں چھاپنے کی اجازت کے لئے آپ کو لکھا تھا لیکن آپ نے " لانگ منس " سے اجازت حاصل کرنے کی ہدایت کی "

" مجھے آپ کے خط کا خیال نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے بعض افسانوں کا حق اشاعت " لانگ منس کے پاس محفوظ ہے اسی لئے میں نے لکھا ہوگا آپ ان ہی سے اجازت لے لیں "

" ترجمہ کا حق بھی آپ نے ان ہی کو دے رکھا ہے "

" ہاں ترجمہ بھی حق اشاعت ہی میں شامل ہوتا ہے ــــ لیکن یہ آپ نے نہیں بتایا کہ کمپنی نے آپ کو اجازت دی یا نہیں ؟"

" نہیں ــــ انھوں نے روپیہ مانگا "

" ہاں مانگا ہوگا "

" مگر آپ شاید نہیں جانتے کہ اردو کتابوں سے اتنا مالی فائدہ نہیں ہوتا کہ ترجمے حق اور اشاعت کے اخراجات برداشت کرنے کے بعد مترجم کے لئے کچھ بچ رہے بلکہ نقصان ہونے کا اندیشہ رہتا ہے"

ٹیگور ہنسنے لگے اور بولے " اردو زبان ہی پر کیا موقوف ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی یہی شکایت ہے ــ تو پھر کیا ہوا آپ نے کتاب چھاپی نہیں ؟"

" جی نہیں، چھاپنے کی کس طرح جرأت کر سکتا "

" آپ کو میرے افسانے بہت پسند ہیں "

" جی ہاں بہت "

" آپ کچھ طبع زاد بھی لکھتے ہیں "

" جی ہاں لکھتا ہوں "

" افسانوں کے سوا ادب کی کسی اور صنف سے بھی دلچسپی ہے "

" ڈراموں سے خاص دلچسپی ہے تنقیدی مضامین بھی لکھتا ہوں "

" شاعری کا ذکر نہیں کیا آپ نے ؟"

" جی نہیں میں شعر نہیں کہتا "

" عجیب بات ہے، میں نے سنا کہ اردو زبان میں نثر نگاروں کی بہ نسبت شاعر بہت زیادہ ہیں "

" صحیح ہے ــــ لیکن افسانوں کے ترجموں کی اجازت کا سوال رہ جاتا ہے "

" میرے نوجوان دوست! جن افسانوں کے حقوق میں کمپنیوں کو دے چکا ہوں ان کے بارے میں مجھے مجبور سمجھو البتہ نئے افسانوں کے متعلق میں کوئی انتظام کر سکتا ہوں "

" کوئی نیا مجموعہ زیر ترتیب ہے کیا ؟"

" میرا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی میرا نیا افسانہ چھپے اور تم اس کا ترجمہ کرنا چاہو تو فوراً ہی مجھ سے اجازت حاصل کر لو تا کہ میں کمپنی کو حقوق بیچتے وقت اس کی اطلاع دے سکوں "

" بہت بہتر ــــ ایک خواہش اور بھی ہے آپ سے ؟"

" وہ کیا "

" یہ میری آٹوگراف بک ہے ــــــ "

" لائیے میں بڑی خوشی سے دستخط کردوں "

" دستخط نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی شعر لکھیں "

" شعر؟ "

" جی ہاں اور وہ بھی تازہ ترین شعر، بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ آپ خاص طور پر میرے لئے ہی ایک شعر کہیں اور اس کے سارے حقوق بھی مجھ ہی کو حاصل ہوں "

" عجیب دلچسپ بات ہے" ٹیگور ہنسنے لگے" میں ضرور کوشش کروں گا مگر فرمائش پر شعر نہیں کہا جاتا ــــ مگر دیکھئے میری بھی ایک بات سنئے "

" فرمائیے "

" ایک شعر کہنا میرے لئے بہت مشکل ہے اور پوری نظم آٹوگراف بک کے لئے موزوں نہیں ــــ ایسا کیجئے تاکہ میں نے پرسوں ہی ایک تازہ نظم کہی ہے۔ ابھی اس کو اشاعت کے لئے نہیں بھیجا۔ اس میں کا ایک شعر آپ کو دیتا ہوں "

" اور وہ شعر آپ اس نظم میں شامل نہیں فرمائیں گے؟ "

" نہیں ــــ وہ شعر تو آپ کا ہو جائے گا "

میں نے بیاض دی اور انھوں نے ایک شعر اس پر لکھ دیا چھوٹی سی بیاض کا پورا صفحہ بھر گیا۔ اسی دوران میں باہر موٹر کی آواز سنائی دی اور فوراً ہی معتمد نے اطلاع دی کہ شریمتی سروجنی آئی ہیں۔ ٹیگور مجھے بیاض دے کر اٹھنے لگے۔

" اجازت دیجئے اب" میں نے کہا

" اچھی بات ہے شکریہ "

میں نے واپس ہوتے ہوئے دیکھا کہ شریمتی سروجنی اپنی دونوں لڑکیوں مس پدماجا اور مس لیلامنی اور لڑکے بابا کے ساتھ آرہی ہیں اور دور سے مجھے سروجنی کے یہ الفاظ سنائی دیے۔

" اوہ! آپ یہاں ورانڈے میں بیٹھے ہیں، موسم کا لطف اٹھا رہے ہوں گے، کوئی نظم تو نہیں ہو رہی تھی "

سید بادشاہ حسین

ٹیگور اور اُن کی شاعری

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں ان کی شاعری نے بین قومی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ شاعر مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے جس میں مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے نے ٹیگور کی شخصیت، ان کی ادبی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ان کے فلسفہ زندگی پر روشنی ڈالی ہے ٹیگور کا پیام گاندھی اور ٹیگور اور شانتی نکیتن پر علحدہ ابواب میں تفصیلی بحث کی ہے اس کتاب کے لئے خود شاعر نے اپنی ایک نفیس تصویر بھیجی تھی جو اس میں شایع کی گئی ہے۔

یہ کتاب شاعر کی زندگی میں لکھی گئی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ چند دن بعد یہ سب ختم ہوجائیں۔

تعداد صفحات (۱۲۸) مع تصویر شاعر قیمت عہر

حیات بعد الممات

لوگوں میں ایک غلط خیال پیدا ہوگیا ہے کہ "بھوت" اور "روح" دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو خوف محسوس ہو یا ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو ہم انھیں بھوت کے کارنامے تصور کرتے ہیں۔ اس طرح سب سود مند کام "روح" سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ حکمار یورپ جنھوں نے سائنٹیفک طور پر اس موضوع کی داغ بیل ڈالی ہے دونوں چیزوں میں مطلقاً کوئی فرق نہیں مانتے۔

لیکن اگر کچھ امتیاز پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "روح" وہ چیز ہے جو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن جب ارواح وجود اثیری میں نمودار ہوکر سامنے آئیں تو ہم انہیں بھوت کہہ سکتے ہیں۔

حیات بعد الممات پر جن لوگوں نے دماغ ریزی کی وہ ایک مدت کی تحقیق اور جستجو کے بعد آج اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس آسمان کے درے ایک دنیا اور بھی ہے۔ اور اب کچھ عرصہ سے یہ خیال یا یقین بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے کہ ارواح ہم سے میل جول کرنے کے کسی قدر آرزو مند بھی رہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ غیر فانی مخلوق کس طرح یا کس طریقے سے ہم سے میل جول کرتی ہے۔ صرف مثالوں سے ثابت کی جاسکتی ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ یا بعض اوقات اس کے وجود یا صحت سے انکار کردیتا ہے۔ اور بیان کرنے والے کو "دروغ گو" کا خطاب ملتا ہے۔ لیکن دل میں ہم اسی بات کو "بعد از فہم" یا "پراسرار" ضرور باور کرتے ہیں۔

لارڈ کیلیون کا قول ہے:۔

"جس بات کو ہم بعید الفہم کہتے ہیں دراصل ہم اس کا مفہوم یا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔"

لارڈ موصوف کا یہ قول ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم غور و فکر کرنے کے خوگر ہوں تو ہر عقدہ کی کسی نہ کسی روز گرہ کشائی کرسکیں گے۔

لیکن یہ بھی تو نہ ہو کہ جتنا سوچو گے اتنا ہی ڈوبو گے۔

پروفیسر آسف حال فرماتے ہیں:۔

"کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنے عقائد کی اصلاح کے لئے پادریوں سے مشورہ کرتے پھریں۔ اس کائنات میں ہر صاحب ذوق کے لئے تحقیق اور جستجو کا میدان کھلا ہوا ہے۔"

ارواح کا وجود اثیری میں نظر آنا یعنی مادی حالت میں دکھائی دینا کوئی عجیب بات نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ارواح ہمیشہ نظر نہیں آیا کرتے اور یہ بھی مشکل ہے کہ ہمارے وہ عزیز جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہوں۔ حسب خواہش ہمیں نظر آجایا کریں۔ ان کا نظر آنا محض محبت کے معیار پر منحصر ہے۔ اس جگہ یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ ارواح کے کارناموں "بھوت یا جن" کی کارستانیاں نہیں سمجھ لینا چاہئے۔

مذہب "جن" کے وجود کے متعلق جو چاہے کہے۔ لیکن سائنس نے ابھی تک جنات کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ بات صرف یہ ہے کہ ارواح ہم سے جدا ہوکر جب چاہیں ہم پر اپنے قرب کا احساس "پیدا کرسکتے ہیں۔ یا مادی حالت اختیار کرکے (وجود اثیری) ہم کو اصلی روپ میں نظر آسکتے ہیں۔ اور اگر ضرورت

سمجھیں تو ہم سے ہم کلام بھی ہو سکتے ہیں یا اپنا پیغام اشاروں سے سمجھا سکتے ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ جب کسی روح کو دیکھ پاتے ہیں تو ہمارا خیال یا ذہن فوراً بھوت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ہم اس سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ جیسے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ بھوت اور روح دو مختلف چیزیں ہرگز نہیں۔ ہاں اس میں کچھ کلام نہیں کہ ارواح بعض اوقات ہماری دستگیری کے لئے اس عالم رنگ و بو میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی انتقام لینے کے لئے بھی۔

ممکن ہے کہ اس خشک مضمون کا مطالعہ اکثر حضرات کو بار معلوم ہو۔ اس لئے میں چند واقعات پیش کرکے بھوت کے وجود پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ اور واقعات بھی ایسے مستند جن کی سچائی کی شہادت اکثر حکمائے مغرب دے چکے ہیں۔

ٹیلیفون کا پیغام

مسٹر ایلیٹ او ڈافل جن کا بیان بھوت کے وجود کے متعلق حکمائے مغرب کے یہاں بہت مستند سمجھا جاتا ہے ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میرا ایک دوست ڈاکٹر تھا۔ ایک روز وہ رات کے گیارہ بجے کے قریب ایک مریض جس کا نام رچرڈ تھا کو دیکھ کر گھر آیا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈاکٹر نے رسیور اٹھا کر پوچھا کہ کون ہے آواز آئی۔

"مسٹر رچرڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ جلد تشریف لائیے۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو ابھی ابھی ان کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہ تو بہت اچھے تھے۔

آواز آئی۔

"آپ جلد تشریف لائیں ان کی حالت مخدوش ہو رہی ہے"

ڈاکٹر پھر اپنا بیگ اٹھا کر رچرڈ کے مکان پر پہنچا نوکر دروازہ کھولا۔ اور ڈاکٹر کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"شکر ہے! آپ ابھی واپس نہیں گئے۔ مسٹر رچرڈ کی حالت بہت خراب ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ "میں تو گھر سے آرہا ہوں۔ مکان پر سے کسی نے ٹیلیفون جو کیا تھا۔"

"نہیں جناب!" نوکر نے حیران ہو کر "کسی نے ٹیلیفون نہیں کیا۔"

ڈاکٹر نے اندر جا کر مریض کو دیکھا۔ مریض پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور دل کی حرکت بہت بے قاعدہ سی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے ایک انجکشن دیا۔ کچھ دیر بعد مسٹر رچرڈ کی طبیعت سنبھل گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ میں گھر پر موجود تھا۔ ورنہ آپ کو پریشان ہونا پڑتا۔ میں ٹیلیفون سنتے ہی چلا آیا۔"

مسٹر رچرڈ نے حیران ہو کر کہا کہ ٹیلیفون کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں تو بھلا چنگا تھا۔ اچانک دل پر کچھ بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ ساتھ ہی آپ تشریف لے آئے۔ پھر اس نے اپنے نوکروں سے پوچھا کہ کس نے ٹیلیفون کیا تھا۔ لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ جب دوسرے لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو بہت سوچ بچار کے بعد یہ رائے قایم کی گئی کہ کسی غیر مادی روح کی طرف سے ڈاکٹر کو پیغام دیا گیا تھا۔ بہرکیف یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور اسے غلط کہہ دینا محض کور باطنی ہو تو ہو۔

امتا

ایک اور حیرت انگیز واقعہ سنئے۔

۱۸۵۸ء میں یورپ میں ایک کتاب "گھوسٹلی وزیٹرز" کے نام سے شایع ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اسی کتاب میں سے لیا گیا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے۔

مسٹر بی میرا بہت عزیز دوست تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ لیکن چوتھے بچے کی پیدائش ماں کے لئے پیغام موت لائی۔ بیوی کے مرنے کا میرے دوست کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ آبائی گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ جار ہا۔ اور بچوں کی پرورش کے لئے انا رکھ لیں۔ ماں کے مرنے کے باعث بچے کسی قدر بے قابو سے ہو گئے۔ نوکر چاکر تو کام کاج میں لگے رہتے۔ انا چھوٹے بچے کو کھلاتی۔ باقی تینوں دن بھر مکان میں کھیلتے۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ ایک روز تینوں بچے کھیلتے کھیلتے تہ خانے میں چلے گئے۔

تہ خانے کا کمرہ بہت بڑا تھا۔ روشنی صرف ایک دو سوراخوں سے آتی تھی۔ وہ بھی دھندلی دھندلی سی۔ اس کمرے کی دیواروں پر کچھ مناظر کشی کی گئی تھی۔ یہ تصویریں دیکھتے ہوئے اچانک بچوں کے دل میں خوف محسوس ہوا اور وہ وہاں سے بھاگ کر ایک دوسرے کمرے کی طرف گئے۔ لڑکی جو سب سے بڑی تھی ادھر آ گئے تھی دروازہ پر پہنچ کر اچانک رک گئی اور چلا کر بولی۔ امی! امی جان!" بچے اور بھی دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگے اور باپ کے پاس آ کر دم لیا۔ لڑکی نے سارا ماجرا باپ سے کہا کہ وہ اس کمرے میں گھسنے ہی کو تھی کہ اس نے اپنی ماں کو دروازے میں کھڑے ہوئے پایا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر انھیں اندر آنے سے روک رہی تھی۔

مسٹر بی یہ سن کر ایک خادم کو ساتھ لے کر تہ خانے میں گیا۔ اور شمع روشن کر کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کمرے میں جس کے دروازے میں بچوں نے اپنی ماں کو کھڑے دیکھا تھا ایک کنواں سا تھا۔ یہ کنواں آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس واقعہ کو اکثر لوگوں نے مستند خیال کیا ہے۔ اور ارواح کی بحث میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم واقعات کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بچوں کی ماں کی روح یا "بھوت" اپنے بچوں کو خطرے سے بچانے کے لئے اس دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا ہوگا۔ بچی جس نے ماں کو دیکھا تھا مشکل سے نو یا دس سال کی تھی انصاف تو فرمائیے کہ معصوم بچی کو جھوٹ کہنے سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

ایم اسلم

وطن کی امانت

یہ آنکھوں میں پھیلے ہوئے سرخ ڈورے یہ لبریز ساغر یہ رنگیں کٹورے
یہ مہکے ہوئے نرم ہونٹوں کی باتیں شرابوں میں کھوئی ہوئی مست راتیں

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ٹھنڈی ہوائیں یہ بہتے سفینے یہ پینے کے دن یہ بہکتے مہینے
یہ ساقی یہ مطرب یہ میٹھے ترانے نگاہوں میں کروٹ بدلتے فسانے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ لچکیلی انگڑائیاں یہ جوانی یہ بوتل یہ بوتل میں پھولوں کا پانی
یہ مواج سینے سرکتے دوپٹے سنبھلتے، مچلتے، تھرکتے دوپٹے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ بانہیں یہ باہوں میں گاتے ہوئے چوڑے مدھر راگنی گنگناتے سے چوڑے
یہ شانے یہ شانوں پہ لہراتے گیسو یہ ناگوں کی مانند بل کھاتے گیسو

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ پلکیں یہ پلکوں کی اوٹوں میں اک شے یہ ہنسی یہ ہنسی کے ہونٹوں پہ اک لے
یہ بربط یہ نغموں کی آباد بستی تبسم کا جادو، ترنم کی مستی

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ساون کی رُت یہ نشیلی فضائیں یہ میخانہ بردوش کالی گھٹائیں
یہ ریشم میں لپٹے ہوئے نرم بازو یہ پھولوں سے ملتے ہوئے گرم بازو
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مسکاتا جوبن یہ شرماتی آنکھیں یہ نیچی یہ ترچھی یہ گھبراتی آنکھیں
یہ پازیب کے ساز کا گنگنانا حسینوں کا چلتے میں محشر اٹھانا
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ نیندوں کا عالم یہ خوابوں کی دنیا ہرے، سرخ، نیلے نقابوں کی دنیا
یہ پردوں کے پردے میں اک بیحیائی یہ ساغر بکف جھومتی پارسائی
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ معبد یہ ملّت فروشی کے اڈّے خصومت، کدورت فروشی کے اڈّے
یہ لیڈر ہمارا دیا کھانے والے یہ قومیں کی قومیں نگل جانے والے
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ ملاّ گدائی سکھانے کے ماہر یتیموں کو رہزن بنانے کے ماہر
یہ بیواؤں کی عصمتوں کے محافظ یہ سوئی ہوئی قسمتوں کے محافظ
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ پنڈت ہوئی قوم بیمار جن سے لگا ہم کو غربت کا آزار جن سے
یہ چاندی کے ٹکڑوں پہ جاں دینے والے غریبوں کا خوں چوسنے والے لالے

مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

(۲)

وطن کیلئے مجھ کو پالا ہے ماں نے　　　جوانی کے سانچے میں ڈھالا ہے ماں نے
جوانی مری زلزلوں کی جوانی　　　حوادث کے ہونٹوں پہ میری کہانی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

امیری کو نیچا دکھا کر رہوں گا　　　جھکا کر رہوں گا مٹا کر رہوں گا
یہ ذلت کی گودی میں سو کر رہے گی　　　یہ ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر رہے گی
میں مُردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

قضا سے لگاہیں ملاتا رہوں گا　　　مصائب کو آنکھیں دکھاتا رہوں گا
تبسّم کے موتی لٹاتا رہوں گا　　　مسرّت کی شمعیں جلاتا رہوں گا
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

جوانی مری بیکسوں کا سہارا　　　وطن کے غریبوں کی آنکھوں کا تارا
یہ شعلوں پہ لہرا کے باقی رہے گی　　　یہ توپوں سے ٹکرا کے باقی رہے گی
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہوں گا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

یہ مردوں کو جینا سکھا کر رہے گی　　　یہ مرقد کو ایواں بنا کر رہے گی
وطن اس کے ہاتھوں سے دلشاد ہوگا　　　وطن اس کے کرنے سے آزاد ہوگا
میں مردوں کو جینا سکھا کر رہونگا
وطن کی امانت ہے میری جوانی

الطاف مشہدی

مجبوریاں

دنیا میں سب ہی خوش رہنا چاہتے ہیں۔ کون ہے جو مسرتوں میں زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔ کیا کسی نے کسی کو رنج و مصیبت حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے دیکھا ہے۔ انسان زندگی کی ہر ہر گھڑی کو خوشی میں بسر کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش مسرت و سکون کے لئے ہوتی ہے۔ اس کو رنج و غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ مصیبت سے کوسوں دور بھاگتا ہے اس کو رنجوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اگر رنج و راحت صرف انسانی کوششوں کا نتیجہ ہوتے تو آج دنیا میں ہم کسی کو مبتلائے الم نہ دیکھتے۔ کوئی جان بوجھ کر مصیبت میں نہیں پڑتا لیکن

اتفاقات ہیں زمانے کے

مجبوری اسی کا تو نام ہے کہ ہم اپنی طبیعت کے بالکل برخلاف حرکت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ مجبوریاں انسان سے کیا نہیں کرواتیں۔

دنیا کے واقعات اور اس کی رفتار یکساں نہیں۔ زندگیوں میں انقلاب آجاتے ہیں۔ زندگی سے آزادی چھین لی جاتی ہے لیکن پھر بھی زبان نہیں ہلا سکتے اس لئے کہ خود زندگی مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ کوئی اپنی عزیز ترین چیزوں کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر دیتا ہے۔ کوئی اپنے مطمح نظر کو خود نظروں سے دور کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مجبور ہے۔ کسی کا سرمایہ لوٹ لیا جاتا ہے عمر بھر کی پونجی تباہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کو خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مجبور ہے۔ کوئی دنیا کے خلاف کام کرتا ہے۔ دنیا والے اس کو برا سمجھتے ہیں۔ نکتہ چینیاں کرتے ہیں مگر کوئی کیا جانے کہ وہ اپنے کردار میں کس قدر مجبور ہے۔

واقعات کسی کو چوری کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لوگ اس کو چور کہتے ہیں لیکن وہ کیا جانیں کہ وہ مجبور ہے۔

ایک بُری حرکت کو دیکھنے والے برا اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی نظروں میں برا ہے مگر انھیں کیا معلوم کہ کرنے والا مجبور ہے۔ قدرت جب خود فطرت کی مخالف ہے تو یہ مجبوریاں کیوں ختم ہوں۔

فطرت انسانی اور قضا و قدر کا بیر توازل سے ہے۔ تم چاہتے کچھ ہو، ہوتا کچھ ہے تم اپنی سہولت کے مطابق لائحہ زندگی بناتے ہو۔ لطیف تصورات میں وقت بسر ہوتا ہے۔ شیریں خواب مست بنا دیتے ہیں۔ آنے والی خوشی کے صرف خیال سے تم اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب ہستی سمجھنے لگتے ہو لیکن زمانہ اپنا کام کرتا ہے۔ وہ وقت آتا ہے جب یہ خیالی طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ تصورات کی لطافت گم ہو جاتی ہے۔ شیریں خواب بھیانک تعبیر پیش کرتے۔ تمھارے دل کو ٹیس لگتی ہے۔ زندگی کا خاکہ الٹ جاتا ہے۔ تم مجبور کرائے جاتے ہو کہ ان آلام کا مقابلہ کرو۔ کیونکہ تمھاری زندگی مجبور کرتی ہے کہ تم کسی طرح اپنی زندگی کی کشتی کو چلاتے رہو گو اس کی رفتار تمھاری فطرت کے کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہو۔

تم گرمی میں سرد پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہو لیکن قدرتی طور پر تمھیں گرم پانی ملتا ہے۔ سردیوں میں جب کہ تم فطری طور پر گرمی ڈھونڈتے ہو سرد ہوائیں قدرت کی ستم ظریفی کا ثبوت دیتی ہیں۔

زندگی مجبوریوں میں بسر ہوتی ہے اور مجبوریوں میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ سولی کے تختہ پر کھڑا ہوا شخص اپنی جان شیریں

دے رہا ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ مجبور ہے۔

بسترِ مرگ پر پڑا ہوا انسان جانتا ہے کہ اب ہر چیز کو چھوڑنا پڑے گا لیکن کیا کرسکتا ہے۔ انسان دنیا سے جاتا بھی ہے تو مجبور ہو کر۔

موت بھی تو مجبوری کا دوسرا نام ہے خواہ وہ فطرت کی موت ہو یا خواہشات کی یا تصورات کی ہو یا زندگی کی۔ مرجانا مجبور ہو جانا ایک ہی تو ہے قدرت اور فطرت میں خود جب تضاد موجود ہے تو پھر زمانے کی چال سے سرتابی کیوں اس کی سرد مہریوں کا شکوہ کس لئے؟

رنج و غم سے بھاگنے کی کوشش کس بھروسہ پر؟ زمانے کے خلاف مقابلہ کرنے کی آرزو کس برتے پر؟ اس کی چال بجا اس کا ستم روا۔ اس کی ستم ظریفی جائز اس کا طریقہ قابل آفریں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

سعید النساء بیگم

پھول سا ہاتھ

نہ شرما دیکھ ادھر اپنا بڑھا ہاتھ
مرے ہاتھوں میں دے یہ پھول سا ہاتھ
نگہ کو پیار اس پر آ رہا ہے
شکیب و صبرِ دل سے جا رہا ہے
حیا سے خوبصورت سر جھکا دے
بڑھا دے ہاتھ ادھر ظالم بڑھا دے
کہ مجھ کو اس سے الفت ہو گئی ہے
مری روح آہ اس میں کھو گئی ہے
اجازت ہو تو ہونٹوں سے لگا لوں
نہیں بجھتی لگی دل کی بجھا لوں
کلی سے بھی ہے نازک یہ حسیں ہاتھ
یہ نازک پیارا پیارا مخملیں ہاتھ

دُھلا ہے یہ ستاروں کی چمک سے
معطر ہے ہوا اس کی مہک سے
نزاکت کی حسیں تصویر ہے یہ
مرے ہر شعر کی تفسیر ہے یہ
مرے باغ محبت کا ہے یہ پھول
کہ ہے یہ باغ جنت کا حسیں پھول
مری فردوس! میری مہ لقا سُن
مری پیاری مری شیریں ادا سُن
مرے ہاتھوں میں دیگی تو اگر ہاتھ
نہ چھوڑوں گا ترا میں عمر بھر ہاتھ

نہ شرما دیکھ ادھر اپنا بڑھا ہاتھ
مرے ہاتھوں میں دے یہ پھول سا ہاتھ

راجہ مہدی علیخاں

مقدّس شہر!

میں اپنے عنفوان شباب میں سنتا تھا کہ ایک ایسا شہر ہے جس کے بسنے والے آسمانی صحیفوں کے مطابق بالکل مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ــــ میں اس شہر کو ڈھونڈ نکالوں گا اور اس سے برکت حاصل کروں گا۔

یہ شہر بہت دور و دراز فاصلہ پر تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے مدت درکار تھی۔ میں نے سفر کا پورا سامان تیار کرلیا۔ اور فلک نیلی فام پر صبح کے ستارے کے نمودار ہوتے ہوتے چل پڑا ــــ چالیس دن کے بعد میری متجسس نگاہوں نے شہر کو دیکھ لیا۔ اکتالیسویں دن سورج کے ساتھ ساتھ میں بھی شہر میں داخل ہوگیا۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب میں نے یہاں کے باشندوں کے صرف ایک آنکھ اور ایک ہی ہاتھ دیکھا۔ میں نے حیرت زدہ ہوکر اپنے آپ سے کہا ــــ "اتنے مقدس شہر کے باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ!"

میں نے دیکھا کہ وہ خود حیرت و استعجاب کے بحرِ بے پایاں میں غوطہ زن ہیں۔ میرے دو ہاتھوں اور میری دو آنکھوں نے انھیں بھونچکا سا کر دیا تھا۔ وہ میرے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے تھے تو میں نے پوچھا ــــ "تمھارا یہ حال کیونکر ہوا؟ تمھاری داہنی آنکھ اور داہنا ہاتھ کیا ہوا؟" ــــ

وہ میرے سوال پر اور بھی متعجب ہوئے اور کہنے لگے۔ "چلو ہمارے ساتھ اور دیکھو اس کی کیا وجہ ہے؟" میں ان کے ساتھ ہوگیا۔ وہ مجھے ایک عبادت گاہ میں لے گئے۔ یہ عبادت گاہ شہر کے بالکل وسط میں تھی۔ میں نے اس عبادت گاہ کے عین بیچ میں آنکھوں اور ہاتھوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر دیکھا۔ ان میں کچھ سڑ اور گل گئے تھے تو چند سے پیپ اور پانی رس رہا تھا! میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے غمگین لہجے میں کہا ــــ "افسوس تمھارے ساتھ ناانصافی کی گئی"۔

لیکن ان لوگوں نے ذرا بھی افسردگی کا اظہار نہ کیا۔ ایک بڈھے نے آگے بڑھ کر کہا ــــ "یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ کسی برتر و اعلیٰ قوت کا نہیں! خدائے تعالیٰ نے ہمیں اس حالت میں گناہوں اور برائیوں پر فتح بخشی ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ایک بلند مقام پر لے گیا۔ باقی سارے لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ اوپر لیجاکر مجھے ایک کتبہ دکھایا ــــ "اگر تمھاری داہنی آنکھ تمھیں ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال باہر پھینکو۔ کیونکہ سارے جسم کے مسموم ہونے کے بجائے ایک عضو کا نقصان اچھا ہے۔ اور اگر تمھارا داہنا ہاتھ تمھیں جرم اور گناہ پر مجبور کرے تو اسے کاٹ ڈالو۔ کیونکہ زہرا اور پاپ کی لوٹ ــــ ایک عضو ہی الگ ہوجائے اور سارا جسم متاثر ہونے نہ پائے تو بہتر ہے۔"

اس عبارت کو پڑھ کر میں سب کچھ بھانپ گیا۔ میں نے منہ پھیر کر سارے لوگوں کو مخاطب کیا۔ تم میں کوئی عورت یا مرد ایسا نہیں جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں آنکھیں ہوں۔

لوگوں نے جواب دیا ــــ "نہیں۔ ہم میں کوئی ایسا نہیں! یہاں ان بچوں کے سوا جو کم عمر ہونے کی وجہ اس کتبے کو پڑھ نہ سکے اور اس پر عمل کرنے کے قابل نہیں کوئی شخص صحیح سلامت نہیں ہے"۔

جب ہم عبادت گاہ سے باہر آئے۔ تو میں فوراً ہی اس "مقدس شہر" سے بھاگ آیا۔ کیونکہ میں بچہ نہ تھا۔ اس کتبہ کو اچھی طرح پڑھ سکتا تھا ــــ!

(ترجمہ) **خلیل جبران** ــــ **محمد عبدالقادر فاروقی**

سوز و ساز

رضیہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا" ڈاکٹر صاحب میرا وقت قریب آچکا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اپنی داستان زندگی آپ سے بیان کردوں وہ کہانی جس میں میری زندگی کا راز پنہاں ہے. ممکن ہے اس کے کہہ دینے سے میرے دل میں لگی ہوئی آگ کچھ سرد پڑجائے. غور سے سنئے میری کہانی دلچسپی اور عبرت سے معمور ہے"

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں. آج سات سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر دار کو چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پھر قسمت کی گردش نے مجھے نئے نئے روپ دکھائے. میرے والدین مجھے بہت عزیز رکھتے تھے. جب میں انٹرنس کا امتحان کامیاب ہوئی تو میرے والدین کو میری شادی کی فکر دامنگیر ہوئی. آہ کسے معلوم تھا کہ یہی کامیابی اور اس کی مسرت میری تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بنے گی. بچپن ہی سے مجھے اپنے چچازاد بھائی ممتاز سے محبت تھی اور جب ہم بڑے ہوئے تو ہماری یہ محبت عشق کی نوبت تک پہونچ گئی. ممتاز کے ساتھ گزری ہوئی ایک ایک ساعت اب تک میرے سینے پر نقش ہے اس کے الفاظ محبت" ابھی تک برابر میرے کانوں میں گونج رہے ہیں. میری دلی آرزو تھی کہ اپنے جسم و جان کو ممتاز کے قدموں پر نچھاور کردوں. مگر میرے والدین اس چیز کے لئے تیار نہ تھے کہ میری شادی ممتاز کے ساتھ ہو. کیونکہ ممتاز کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی ـــ قصہ مختصر میرے ہزار انکار اور نارضامندی کے باوجود مجھے ایک ایسے شخص کے حوالے کردیا گیا جو مجھے کسی طرح پسند نہ تھا ـــ آپ اسے جو چاہے کہیں مگر یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان ہمیشہ اچھی چیز کو پسند کرتا ہے. میرے شوہر اور مجھ میں کچھ مناسبت ہی نہ تھی. میں نوجوان، تھوڑی بہت حسین اور تعلیم یافتہ تھی اور وہ نہ صرف ان پڑھ اور جاہل تھے بلکہ سیاہ فام عمر رسیدہ اور کج فہم البتہ وہ مالدار ضرور تھے. اور ان کی یہی دولت نے میری روح کو نہیں میرے جسم کو ـــ ایک بے حس جسم کو خرید لیا تھا ـــ امیروں کی دولت غریبوں کی آزادی اور زندگی خریدنے کے لئے ہی تو ہوتی ہے. اپنی دولت ہی سے تو وہ غریبوں کی عصمت اور عزت سے کھیلا کرتے ہیں ـــ بہرحال میرا ان کا نباہ ناممکن تھا. میں دولت کی بھوکی نہ تھی بلکہ محبت کی ـــ میرا دل تو ممتاز کی نذر ہوچکا تھا ـــ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر ہی مجھے طلاق دے دیا گیا ـــ والدین کے دروازے میرے لئے بند تھے ـــ اپنی عزت اور دوشیزگی کو چور چور کرنے کے بعد میری صورت ممتاز کو دکھانے کے قابل نہ تھی. کسی شخص سے نکاح یا شادی کا خیال کرنا سماج اور دنیا والوں اور "نیک بندوں" کی لعنتوں اور ملامتوں کا مرکز بننا تھا ـــ

رضیہ کے گال پر آنسو ڈھلک رہے تھے." ڈاکٹر صاحب" اس نے کہا ـــ " یقیناً میری کہانی آپ کے لئے تعجب خیز ہوگی خیر آگے سنئے ـــ اب میرے لئے فلم کمپنیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا ـــ میں نے اسی کو غنیمت جانا کیا کرتی پیٹ بھرنا تھا ـــ فلم کمپنی میں پہونچ کر مجھ جیسی تعلیم یافتہ اور حسین عورت کا مشہور ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنی عزت اور عصمت کی قربانی کرنی پڑی شہرت اور دولت کی ترقی کے لئے یہ چیز ضروری تھی ـــ کیا کرتی مجبور تھی ـــ غرض کامل تین سال تک میں فلم کمپنی میں نوکر رہی اور کئی ایک فلموں میں کام کیا ـــ مگر اس سے بھی میری طبیعت اکتا گئی ـــ میں نے

نوکری چھوڑ دی ـــــ تھوڑی بہت دولت جو جمع ہوئی تھی اس میں زندگی گزارنے لگی ـــــ فلم کمپنی کی ملازمت نے میرے شوق آرائش میں اور اضافہ کر دیا تھا چنانچہ میں روز آئینہ بناؤ سنگھار کر کے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتی اپنے لوچدار جسم اپنے قدرتی حسن ، آرائش وزیبائش کو دیکھتی تو جذبات سے مغلوب ہو جاتی عین اس وقت مجھے میرا ممتاز یاد آتا ـــــ کاش اس وقت وہ میرے پاس موجود ہوتا ـــــ مگر وہ کہاں اور میں کہاں ـــــ

میرے لئے حسن پرستوں کی کمی نہ تھی صبح سے شام تک میرے چوکھٹ پر مجمع لگا رہتا ـــــ مگر اب میری حیثیت ایک بازاری حسن فروش سے زیادہ نہ تھی ۔ شرافت اور عزت کے آئینے چکنا چور ہو چکے تھے ـــــ صبح سے شام تک اہل غرض میری زنجیر در کھٹکھٹائے اور چند چاندی کے ٹکڑوں کے لئے مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑتا جو کسی شریف کو نہ کرنا چاہئے ـــــ میں ان کی خاطر کرتی ان کو خوش کرنے کے لئے ہنستی اور ہر طرح کی خوشامد کرتی مگر میرا دل روتا تھا ـــــ میرے تبسم میں میرے دل کی آہیں پنہاں ہوتیں اور میری باتوں میں میرے دل کے درد بھرے ہوئے ہوتے ـــــ ذرا غور تو کیجئے کہ کیسے کیسے لوگ میرے در پر جبیں سائی کرتے تھے ۔ وہی لوگ جن کو اپنی شرافت نسبی و حسبی پر زعم تھا ۔ وہی لوگ جو بڑے باعزت اور نیک نفس مشہور تھے ، زاہدوں اور عابدوں کا زہد و تقویٰ بھی شاید میرے دروازہ پر کئی مرتبہ ٹوٹ گیا ـــــ نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا ایسے لوگ بھی میری پابوسی کرتے جن کے چہرے نورانی ڈاڑھی سے منور تھے اور جو بزرگ اور نیک مشہور تھے انھوں نے دنیا کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے آپ کو "نیک" مشہور کیا تھا ۔

مگر میرے آگے ان کے سب طلسم ٹوٹ چکے تھے ، مجھے ان لوگوں سے سابقہ تھا جو شراب کے نشہ میں چور میرے کمرے میں لوٹتے پھرتے ـــــ میں ان کی باتیں سنتی ، ان کی مار پیٹ سہتی انکو سمجھاتی ـــــ غرض سب کچھ کرتی ـــــ آہ وہی لوگ جن کو معذوروں ، محتاجوں اور فقیروں کو ایک پیسہ دینا بار معلوم ہوتا میری معمولی اور مصنوعی ادا پر سیکڑوں روپے تصدق کر دیتے ۔ میں دنیا کا تماشا دیکھ رہی تھی ۔ کیا انصاف کے یہی معنی ہیں کہ عبادت گزاروں ، محتاجوں اور غریبوں کو تو پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہو لیکن عیاشوں ، حسن پرستوں اور بدکاروں کی جیبیں دولت سے بھاری ہوں ـــــ غرض زمانہ گزرتا گیا ۔ تقریباً چار سال تک عصمت فروشی میرا ذریعۂ معاش رہا لیکن یقین جانئے ممتاز کی یاد میرے دل سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا نہ ہوئی ۔ میں خود اپنی اس زندگی سے متنفر اور شرمندہ تھی مگر کیا کرتی پیٹ پالنا تھا ۔ کچھ دن بعد ہی اس زندگی سے بیزار ہو گئی اور اس "پیشہ" کو چھوڑ دیا ۔ پھر زمانے کے ہاتھوں طرح طرح کے مصائب اٹھانے کے بعد میں پیٹ بھر کھانے کے لئے محتاج ہو گئی ۔ یہی نہیں بلکہ بیمار پڑی تو دوا کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی ـــــ غور کیجئے میری اس تباہی ، بربادی اور گناہ آلودہ زندگی کا باعث کون ہے ۔ یہی میرے "والدین" اور میرا "سماج" ـــــ وہی والدین جنھوں نے دولت کی حرص میں مجھے ایسے شخص کے حوالے کیا جس کے ساتھ گزر ناممکن تھی ـــــ اور میرا سماج وہ ہے جس میں لڑکی کو اپنے حق میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگر کچھ کہے تو پھر چوطرف سے انگشت نمائی ہوتی ہے ـــــ بے حیائی ، بے شرمی ، اور بے عزتی کے دھبے اس کے دامن پر لگائے جاتے ہیں ۔ غور تو کیجئے کہ ایک معصوم ہستی کی زندگی کا سودا ہو رہا ہو اور خود اس کو کچھ کہنے کا حق

نہ ہو ـــــ انصاف فرمائیے ایک نوجوان اور محتاج بیوہ اگر نکاح کا ارادہ کرتی ہے یا نکاح کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو سماج اس کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اس کو ذلیل وحقیر کیا جاتا ہے لیکن اگر ایک حریص بڈھا دو دو بیویاں رکھنے کے باوجود جب تیسرا نکاح کرتا ہے تو کیوں اس وقت سماج کی آنکھوں پر پٹیاں بندھ جاتی ہیں کیوں اس وقت سماج اندھا اور گونگا ہو جاتا ہے۔ ـــــ

بہرحال میری حالت زار پر رحم کر کے ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے پاس مجھے پناہ دی اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود میں صحت نہ پا سکی مگر آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ خدا آپ کو ضرور دے گا۔ آپ میرے بے غرض محسن ہیں۔ کاش میری اس داستان سے میرے والدین بھی واقف ہو جائیں وہ ابھی زندہ ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہو جائے کہ ان کی حرص وہوس نے ان کی بیٹی کو کس نتیجہ پر پہونچا دیا۔ کاش میری اس دردبھری کہانی سے دنیا سبق حاصل کرے ـــــ رضیہ کا دم پھولنے لگا اس کی آنکھیں پھرنے لگیں اور ایک ہچکی کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک حسرتناک نظر ڈالتے ہوئے ہمیشہ کے لئے سو گئی ـــــ ڈاکٹر حیرت اور رنج کے عالم میں کھڑا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے ـــــ

کاظم علی خاں

سحر

اندھیرے کی رانی چلی جا رہی ہے
جوانی کے ڈھلنے پہ غم کھا رہی ہے

ستاروں کی دنیا مٹی جا رہی ہے
پھریرا اڑاتے سحر آ رہی ہے

سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے

رخِ ماہ پھیکا پڑا جا رہا ہے
شبِ غم پہ نورِ سحر چھا رہا ہے

زمانے میں اک انقلاب آ رہا ہے
وہ دریا پہ ملّاح کچھ گا رہا ہے

سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے

صبا باغ میں پھول مہکا رہی ہے
کلی اپنی مستی میں اترا رہی ہے

محبت ہر اک شئے میں تھرا رہی ہے
جوانی، جوانی نظر آ رہی ہے

سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے

سید ناظم علی ناظم

سنگ تراش

سنگ تراش اپنے تصور سے کھیل رہا تھا۔ بے ڈول پتھر کا ٹکڑا آہستہ آہستہ ایک حسین صورت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

وقت یکساں رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

بالآخر مجسمہ تیار ہو گیا۔ حُسن کی وہ تمام باریکیاں جنھیں ظالم زمین نے ڈھانک لینے کی کوشش کی تھی پھر ایک بار سنگ تراش کی نظروں کے سامنے تھیں۔

دریچے میں پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر ایک تتلی آئی۔

سنگ تراش اسے دیکھنے لگا۔

مگر وہ پھول پر نہ بیٹھی۔

سنگ تراش کی ہنسی ختم ہونے لگی جب اس نے دیکھا کہ تتلی مجسمہ کے ہونٹوں پر بیٹھ رہی ہے وہ غصہ میں بھرا ہوا اٹھا۔

"یہ میری تخلیق ہے۔ رقابت میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ دوڑا کہ تتلی کو پکڑ لے۔

اس کے زبردست ہاتھ تتلی پر پڑے اور وہ مجسمہ کے ہونٹوں پر چپک کر رہ گئی۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔ مجسمہ نیچے گر پڑا۔۔۔۔

پتھر کے ٹکڑے زمین پر بکھر گئے۔

سنگ تراش نے ایک چیخ ماری اور ٹکڑوں پر گر پڑا۔

ٹوٹے ہوئے مجسمے کے لب صحیح و سالم ایک طرف پڑے تھے۔۔ اور۔ ان پر مری ہوئی تتلی اسی حالت میں موجود تھی۔

"آہ" سسکتے ہوئے سنگ تراش نے تتلی کی طرف دیکھ کر کہا "تو نے وہ کیا جو مجھ سے بھی نہ ہو سکا۔"

فقیر

دُور افق کی پہاڑیاں پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں تاکہ دنیا والے شاہ خاور کا چہرہ دیکھ سکیں۔ مرطوب ہوائیں جس کے فراق میں رات بھر نالہ و شیون کرتی رہیں اور جن کے آنسو ابھی تک سبزہ پر بکھرے پڑے تھے۔ کلیوں کی پتیاں جنھیں ان کے جذبۂ محبت نے رات کی تاریکی میں ایک دوسرے سے چمٹائے رکھا تھا' شرماتی ہوئی علٰحدہ ہونے لگیں۔ اور بلبل نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔

فقیر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ یاس کی روندی ہوئی جوانی اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

ہاتھ میں کاسہ لئے وہ بستی کی طرف چلا۔

دن بھر مارا مارا پھرنے کے بعد وہ واپس ہوا۔ خیرات اس کی جھولی میں تھی۔۔۔۔ اس کی دن بھر کی کمائی۔۔۔۔۔۔ مغرب کی طرف افق کی لکیر بے چینی سے سورج کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ببول کے درخت پر ایک قمری کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ان کی چونچیں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتیں جیسے وہ دن بھر کی روئداد ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔

فقیر نے انہیں دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کاش میں بھی کسی کو اپنی دن بھر کی محنت کا ثمر بتلا سکتا۔۔۔ بھلا ہو اس کا جس نے مجھے فقیر بنایا" وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ جھونپڑی کی طرف روانہ ہوا۔ یکایک کچھ سوچ کر وہ واپس ہوا۔ جھولی میں سے کچھ چاول اور روٹی کے ٹکڑے نکالے اور درخت کی طرف پھینک دئے معصوم پرندے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

فقیر کچھ دور چلا گیا۔

قمری کا جوڑا نیچے اترا اور کچھ دانے کھا لئے۔

فقیر مسرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "روز میں تمھیں اپنی محنت کی روئداد سنا دیا کرونگا۔۔۔ مگر۔۔ کہیں تم بھی بے وفا نہ ثابت ہونا"

سید ظہیر الدین رونق

تین سبق

مدتیں گزریں جب دنیا کمسن تھی اس قدیم زمانے میں جب طلوع آفتاب سے قبل ستارے نغمہ سرا ہوتے تھے اس وقت ان کے گیت صاف سنائی دیتے تھے کیونکہ دنیا بالکل خاموش تھی اور آسمانوں کی موسیقی میٹھے میٹھے سروں میں پہاڑوں اور وادیوں میں سے آبجو کی مانند بہتی ہوئی دنیا کو اپنے رمزوں سے بے کھٹکے سیراب کرتی تھی۔ کہ ایک ننھے سے انسانی بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چلانے لگا۔ اس نے دنیا کی طرف دیکھا اور حیران ہوا آسمان کی نیلی نیلی وسعتوں پر نگاہ دوڑائی اور اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔ اس نے چاہا کہ وہ کسی تاریک غار میں گھس جائے یا جنگل میں گنجان درختوں کے سایہ میں اپنے آپ کو چھپائے۔ کیونکہ وہ خائف ہو رہا تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں ڈر رہا ہے۔

یکایک خدا نے اس بچے کو آواز دی۔ وہ اب ڈرتا نہیں تھا اور اس کے دل میں تاریک غار یا گنجان جنگلوں میں چھپنے کی خواہش بھی نہ رہی تھی۔ اس نے جواب نہ دیا کیونکہ وہ اس سے آگاہ نہ تھا۔ کہ جواب کیونکر دیتے ہیں :۔

اور خدا نے کہا۔

تجھے ایک سبق سیکھنا ہے اپنا پہلا سبق پڑھ اور دن بھر اسے یاد کرتا رہ جب رات کا سایہ اس راستے پر دراز ہونے لگے جس پر تو گامزن ہے، تو تھک جائے اور چل نہ سکے تو میں تجھے سلادوں گا اور جب تو جاگے گا تو میں تجھے دوسرا سبق دوں گا۔

بچے نے خدا سے سبق لیا اور یہ آسمان کے تاروں کی طرح چمک رہا تھا اس کی آنکھوں کو یہ ایک باب زریں کی طرح نظر آیا جو کھلا ہوا ہو لیکن دور، دور، بہت دور......... اتنی دور کہ کوئی ستارہ بھی اتنی دور نہ ہوگا اور اس دروازہ میں سے اسے ایک سفید نورانی روشنی نظر آئی اور ایک عجیب و غریب طریقہ سے بچے کے دل نے محسوس کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور وہاں پہونچ کر رہے گا۔ نظارہ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر سبق اس کے پاس ہی رہا۔

اور وہ سبق یہ تھا" میں میں ہوں" بڑا مشکل اور ادق سبق تھا بچے نے گھنٹوں اس پر صرف کر دئے اور اس میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ دن ڈھل چکا ہے اور روشنی بتدریج کم ہوتی جارہی ہے وہ اپنا سبق یاد کرتا رہا جو اسے خدا نے دیا تھا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ تھک کر چور ہو گیا لیکن اب وہ چھوٹا بچہ نہ تھا کیونکہ دن بہت طویل تھا اور عمر کی وجہ سے اس کا جسم نحیف ہو کر جھک گیا تھا اس کے بال سفید ہو چکے تھے پیشانی پر جھریاں نمودار ہو چکی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔" میں بہت تھک گیا ہوں"

اور خدا نے مسکرا کر کہا

" اب سو جا اور آرام کر"

انسان سو گیا اور پھر اٹھا مگر اس دفعہ اس میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا نہ اسے اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش تھی اس نے اپنے اوپر جگمگاتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھا اور اس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ کیوں؟ آہ! اسے یہ معلوم نہ تھا وہ کچھ سننے کا منتظر تھا!

اور خدا نے کہا

دیکھ یہ تیرا دوسرا سبق ہے اسے پڑھ اور جب شام ہو اور تو تھک جائے تو یہاں آنا۔ میں پھر تجھ پر نیند طاری کروں گا۔ بچے نے خدا سے سبق لے لیا اور دنیا میں چلا گیا اور دنیا کے درختوں پھولوں اور اس کی زندہ مخلوقات کو دیکھتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنا سبق بھی یاد کرتا رہا ——— دوسرا سبق یہ تھا تو تو ہے۔

اس دن کے لمحے بھی تیزی کے ساتھ گزر گئے کیونکہ جب اس نے یہ سبق پڑھا تو اسے آسمانی دنیاؤں کی موسیقی اور صبح کے ستاروں کے نغمے سنائی دینے لگے۔ جب اس کے پاؤں نئی نئی دنیا کو چھوتے تھے اور وہ اپنے سبق کو دہراتا تھا۔ تو شاید یہ عظیم الشان کائنات کے نغمے کی صدائے بازگشت تھی یا اس کے اپنے دل کی کہ وہ پھولوں اور سبزے میں سے موسیقی بن کر نکلتی تھی۔ اس وقت وہ پہلی مرتبہ مسرت سے آشنا ہوا اور خوشی اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شام کا سایہ اس کے راستہ میں محیط ہونے لگا آفتاب غروب ہوگیا تب انسان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔

"اے خدا ہم بہت تھک گئے ہیں"۔

اور خدا نے کہا۔

سوجا اور آرام کر کل میں تجھے اور سبق پڑھاؤں گا۔

جب تیسرے دن بچہ جاگا۔ اس نے انگڑائی لی اور اپنی آنکھیں ملیں لیکن اس نے اوپر کی طرف دیکھا نہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اس نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی اور کہا۔

میرا ساتھی کہاں ہے۔

پھر خدا نے اسے تیسرا سبق دیا۔ اور آہ! یہ مشکل ترین سبق تھا اور جب اس نے اس کو دیکھا تو اسے چند لمحوں کے لئے غش آگیا پھر ایک عجیب لرزہ اس کے جسم پر چھا گیا اور اپنی چھڑی ہاتھ میں لے کر وہ نکل کھڑا ہوا۔

تیسرا سبق یہ تھا "یہ نہ کر وہ نہ کر"

شام کے وقت جب سورج چھپ گیا تو وہ بہت افسردہ ہوگیا تھا اور اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے شاید یہ اس کے بالوں کی سفیدی تھی۔ یا ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن مگر ایک روشنی تھی جو اس کے ہونٹوں اور ابروؤں پر کھیل رہی تھی۔ وہ سو گیا اور اپنی نیند میں ایک چھوٹے بچے کی طرح مسکراتا رہا:۔

دن کے بعد دن گزرتے گئے جب صبح ہوتی اور بچہ جاگتا تو اس کی آنکھ ایک نئی دنیا پر پڑتی لیکن کبھی اس کے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ اب اسے خوف کیوں نہیں معلوم ہوتا وہ اپنے بھائی بندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہا۔ اور جواب میں وہ بھی مسکراتے رہے لیکن انھیں کبھی خیال نہ آیا۔ کہ کیوں؟

لیکن چند روز بعد بچہ اپنے سبق سے غافل ہوگیا۔ خدا ہر روز اسے سبق دیا کرتا تھا مگر چند دن وہ سبق لینا بھول گیا اور اپنی بھول میں وہ اس سیدھے راستے سے بھٹک گیا جو نورجا و داں اور باب زرین کی طرف جاتا تھا۔ وہ مرغزاروں میں سنہری تیتریوں کے پیچھے بھاگتا رہا یا شہابا کی چمک کے پیچھے دوڑتا رہا۔ پھر جب رات ہوئی تو وہ مسکرا نہ سکا۔ وہ سو گیا۔ جب جاگا تو اس نے پھر وہی سبق دہرانا شروع کیا۔

کچھ روز وہ اپنے راستے سے بھٹکا رہا پھر اس نے الٹے پاؤں صعوبتوں اور تکلیفوں میں سے گزر کر راستے کو ڈھونڈ لیا۔ کیونکہ انسان ہمیشہ آزاد تھا۔ کیا اس نے پہلے ہی سبق میں یہ نہ پڑھا تھا "میں میں ہوں"

("ربلی اہلین" کے زرین خیالات کا ترجمہ اور اقتباس)

شنکر موہن لال ماتھر

محرومی

ہمنشیں! کیونکر سناؤں اپنی رودادِ حیات   آہ ہے تاریک تر مجھ سے جبینِ کائنات!
اب مری ہر سانس میں لہرا رہی ہیں بجلیاں   دل نہیں ہے دل مگر اک مرکزِ دردِ نہاں
خود ہی میرے حال پر گریاں ہے میرا حالِ زار   دردِ محرومی ہے پیشانی سے میری آشکار
زندگانی بن گئی ہے سربسر تصویرِ یاس   میں جواں ہوں پھر بھی ہمدم میری آنکھیں ہیں اداس

پھول کھلتے ہیں مگر میں مسکرا سکتا نہیں
خاک ہے وہ بحر جو طوفاں اٹھا سکتا نہیں

جذب و اضطراب

محسوس ہو رہا ہے یہ اب بے خودی کے بعد   اک زندگی ملی ہے مجھے زندگی کے بعد
نامحرمی، دلیلِ خبر تھی خدا گواہ!!!   حسنِ یقیں سے دور ہوں نامحرمی کے بعد
میں ہوں وہ نامرادِ محبت، ہزار حیف!   رازِ فریب کچھ نہ کھلا دوستی کے بعد
اب میں حیات و موت کے جھگڑوں سے ہوں بلند   دنیا بدل گئی ہے مری بے کسی کے بعد!
وہ التفاتِ یار کا موسم گزر چکا!   اب وہ رُخِ حیات نہیں بے رخی کے بعد
دنیا، حجابِ حسن و لطافت میں تھی نہاں   یعنی جنونِ ہوش نہ تھا بے خودی کے بعد

کیونکر کہوں کہ عہدِ جوانی گزر گیا!
دو اشک بھی ضرور ہیں کاوش ہنسی کے بعد

کاوش

ہندی اور مسلمان

اردو ہندی کی نزاع قدیم ہے۔ اس کا تصفیہ اگرچہ ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہو گیا ہے اس لئے کہ یہ جھگڑا جہاں تک سمجھ میں آتا ہے سیاسی نہیں بلکہ قومی ہے اور غالباً یہی سبب رہا ہو کہ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کو یہ کہنا پڑا کہ یہ دونوں دو مختلف زبانیں ہیں اور فریقین کو الگ الگ اس کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ میں یہاں موصوف کے اصل الفاظ نقل کرتا ہوں۔

"اپنا دل بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ وتیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی زبان ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی کے لفظ ہندوستانی استعمال کرنا چاہیے.... میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کا بہلانا مقصود ہے اور یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھر مار کر دیں۔ اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دئے جائیں بس میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے کہ ایسی اردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندوستانی کا لقب دے سکتے ہیں"[1]

سچ تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر جس زبان کی آبیاری کی اور جو تقریباً اٹھارہویں صدی تک خالص ہندوستانی کہی جانے کی مستحق تھی آج پامال ہو رہی ہے، اور یہ محض اس لئے کہ ہم واقعات کو اپنی ذاتی خواہشوں پر قربان کر رہے ہیں۔ ہندوستانی کی ترویج میں جتنا ہندوؤں کا حصہ رہا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی مسلمانوں کا بھی تھا لیکن اب مسلمانوں کی ہندی خدمات پس پشت ڈال دی گئی ہیں اور ان پر یہ عام اعتراض ہے کہ انھوں نے زبان ہندی کو اپنا نہیں سمجھا، ان کی شاعری میں ہندی عنصر اور ہندوؤں کے کلچر کی کوئی نمایندگی نہیں، ہندی مسلمانوں کی زبان نہیں، اس لئے کہ ان کے جذبات اور زبان ہندی میں ہم آہنگی ناممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ چند اعتراضات ہیں جو عموماً کئے جاتے ہیں۔ عرصہ ہوا رسالہ "الندوہ" اور "ہندوستانی" نے بعض غلط فہمیوں کا پورا پورا ازالہ کر دیا تھا لیکن ہٹ دھرمی ہے کہ لوگ اب بھی یہی کہے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر مسلمانوں کی ہندی خدمات پر ایک نگاہ بازگشت ڈال لی جائے اور بالترتیب ان خدمات کا اعادہ کیا جائے۔

اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا طبعی میلان ہندی کی طرف تھا۔ خلفائے عباسیہ میں شروع سے یہ جذبہ موجود تھا اور ان کے یہاں سنسکرت کا چرچا بھی ہو چکا تھا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں جید علما مناظرے کے لئے ہندوستان بھیجے جاتے تھے، جن کے سنسکرت کے اسکالر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ سنہ ۴۲۲ تا ۹۰۰ ہ کے درمیان مسلمانوں کا جو گروہ وارد ہندوستان ہوا اسی میں ابوریحان بیرونی جیسا اسکالر موجود تھا جس کی سنسکرت دانی اس پایہ کی تھی کہ اس نے مختلف عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، اور سنسکرت علوم و فنون کے متعلق جو کتابیں اس نے لکھیں اس کے لئے اس نے سنسکرت کی بیشتر اور اہم مستند کتابوں سے مواد اخذ کیا۔ یہ بات بھی قابل یادداشت ہے کہ خلافت عباسیہ میں ہندوستان اور سندھ میں مسلمانوں کی مستقل سکونت ہو چکی تھی، بعد میں وہ اندرون ملک گھسے اور پنجاب، صوبہ متحدہ، ملیبار اور دکن میں قیام کر کے ہندی و سنسکرت سیکھنی شروع کر دی تھی اور بے شمار فاضل و شاعر

---

[1] "ہندوستانی" بابتہ جولائی ۱۹۳۴ء

مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔

تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ مسعود سعد سلمان جو دور غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے مسلمانوں میں سب سے پہلے اسی نے بھاشا زبان شروع کی۔ یہ واقعہ امیر خسرو سے تقریباً ۲۰۰ برس پہلے کا ہے۔ مسعود سعد سلمان نے ایک دیوان ہندی میں بھی لکھا تھا مگر افسوس کہ وہ مفقود ہے اگر مل سکتا تو اس وقت کے مسلمانوں کی ہندی دانی کا اندازہ ہوسکتا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس شاعر کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"الحاصل وے راسہ دیوان بود تازی، ہندی، پارسی"

مسعود گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا اس لئے ایک ہندی نژاد کا ہندی میں باکمال ہونا محل تعجب نہیں۔

مسعود کے بعد حضرت امیر خسرو آئے۔ انھوں نے سنسکرت اور بھاشا میں جو کمال پیدا کیا وہ ظاہر ہے۔ مثنوی "نہ سپہر" میں انھوں نے خود اپنے سنسکرت پڑھنے اور سیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کا جتنا کلام فارسی میں ہے اتنا ہی ہندی میں بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بھاشا کا خالص کلام ناپید ہے محض وہ کلام مشہور ہے جس میں انھوں نے فارسی اور ہندی کو جذب کر دیا ہے یہ ہندی میں بائبل کے موجد ہوئے ان کی پہیلیاں، مکرنیاں، انمل، ڈھکوسلے وغیرہ سب اختصار کے ساتھ آب حیات میں درج ہیں۔

امیر خسرو کے بعد کبیر آئے۔ یہ راما نند کے چیلے تھے۔ ابھی تک ان کا ہندو یا مسلمان ہونا ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ اور اگر وہ ہندو کہے جا سکتے ہیں تو ایک گروہ مسلمان ماننے کے لئے بھی تیار ہے خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔ ان کا سکندر لودی کے زمانہ میں موجود ہونا مسلم ہے جس نے کبیر کو لامذہبیت کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور بعد کو رہا کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے کبیر کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ ان کا کلام اس قدر مشہور ہے کہ صرف ایک دوہرے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

دین گوایو دنی سے دنی نہ آئیو ہاتھ
پیر کلہاڑی ماریو گا پھل اپنی ہاتھ

کبیر سر بر سرائے دنیا ہے کیوں سوتے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

سکندر لودی کی وفات پر رجب ۹۱۵ھ میں سلطان ابراہیم حسین لودی تخت نشین ہوا تو اسی کے زمانے میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ بابر کو فتح ہوئی اور ابراہیم لودی کھیت رہا۔ اس کی وفات کی بہت سی تاریخیں کہی گئیں لیکن قوم بقال کے کسی شخص نے ہندی میں یہ تاریخ بھی بے مثل کہی[1] ؎

نو سے اوپر تھا بتیسا | پانی پت میں بھارت ولیا
اٹھواں رجب بار سکروارا | بابر جیت، براہیم ہارا

ہندوستان میں بابر کی آمد آمد کے ساتھ تیموریہ آفتاب طلوع ہوا۔ بابر ہندوستان کے لئے اجنبی تھا۔ یہاں کے رسم و رواج، طرز معاشرت، نباتات، حیوانات وغیرہ کو اپنے یہاں کے مقابلہ میں بالکل مختلف پایا اور ان سے دلچسپی لیتا۔ وہ ہندوستان کی ان اشیاء کا جو اس کے لئے عجیب و غریب تھیں نام پوچھتا تھا اور اگرچہ صحیح تلفظ نہیں ہوسکتا تھا تاہم اپنے وقائع میں ان کو اسی طرح لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ یہاں کی زبان کی طرف توجہ کرتا۔ اسے ہندوستان میں نہایت قلیل عرصہ تک رہنے کا اتفاق ہوا تاہم اس نے یہاں کی زبان اور لسانیاتی خصوصیات سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کر رکھی تھی اور کثرت کے ساتھ بابر نامہ میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں سے سوائے معدودے چند آج بھی بولے جاتے ہیں مثلاً ہاتھی۔ کلہرن (کالا ہرن) کویل۔ کرنی (کھرنی) گدہل (گرہل) بدہل (برہل)۔ کروندہ چرونجی۔ کنیر۔ کیوڑا۔ ڈاک چکی۔ کہار وغیرہ۔ ان تمام ہندی الفاظ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں بولی جاتی تھی۔ بابر کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

---

[1] حیات جلیل

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی

فقرا لبیخہ بس بولنو سید دریانی و روتی

پہلے مصرعہ کو آج کل یوں کہہ سکتے ہیں "مج کو نہ ہوتی کچھ ہوس مانک و موتی" دونوں مصرعوں کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے لعل اور موتیوں کی پرواہ نہیں۔ فقیروں کے لئے صرف پانی اور روٹی کفایت کرتے ہیں[1]۔

بابر کے وقت میں یوسفی ہندوستان میں موجود تھے۔ فنِ طب میں ریاض الادویہ ان کی بہت مشہور کتاب ہے۔ چھپ بھی چکی ہے۔ اس کے علاوہ رسالۂ ماکول و مشروب، فوائدالاخیار۔ جامع الفوائد رسالۂ قارورہ۔ رسالہ نبض وغیرہ ہیں۔ فنِ انشا میں ان کی مشہور تصنیف انشائے یوسفی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک دلچسپ تالیف "قصیدہ در لغات ہندی" ہے جس میں کل چوالیس شعر ہیں اور جو خالق باری کے رنگ میں ایک منظوم لغت ہے[2]۔

حکیم یوسفی کے ہم عصر مولانا جمالی ہیں ان کا حسب ذیل ریختہ ملاحظہ ہو۔

ہر دو تیرا کتا ہے	موتیا بن بر در تو ستا ہے
خوار شدم زار شدم لٹ گیا	در رہِ عشق تو کر ٹھا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کٹن	اس کا کہا مت کرو یہ جھٹا ہے
گاہ نگفتہ کہ جمالی تو بیٹھ	تم کرو کیا اپنا کرم پھٹا ہے

حکیم یوسفی اور جمالی کے بعد دور شیر شاہی میں ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت تصنیف کی۔ جائسی کبیر کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ ان کی مثنوی کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ قدرتِ زبان اور سادگی کے لحاظ سے راماین سے کسی طرح کم نہیں۔

ہندی کی ترقی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ اکبر کا زمانہ آیا۔ اکبر کو اوائل عمر ہی سے ہندوستان میں رہنے کا موقعہ ملا اس وجہ سے اسے ہندوستانی زبان سے کافی واقفیت ہوگئی تھی۔ ترکی اس کی گھریلو زبان تھی، فارسی میں اسے کافی مہارت تھی اور ہندی سے بھی وہ ناآشنا نہیں تھا۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ ہندی نہیں جانتا تھا تو محل کی ہندو رانیوں سے کس زبان میں گفتگو کرتا تھا؟ ترکی اور فارسی کو تو وہ سمجھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندی موسیقی سے بیحد شوق رکھتا تھا، ہندی مطربوں اور شاعروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ برہمنوں کا اس کے دربار میں عروج تھا اور اکبر خصوصاً سنسکرت کی خدمت اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہی نہیں اکبر خود بھی سنسکرت کا بیحد دلدادہ تھا وہ سنسکرت میں شاعری بھی کرتا تھا اور ہندی شاعری میں اپنا تخلص اکبر رائے رکھا تھا۔ اسی بادشاہ کی بے دریغ فیاضیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں سنسکرت کا ذوق پیدا ہوا اور بیسیوں سنسکرت کتابوں کا مسلمانوں نے ترجمہ کر ڈالا۔ دربار کے عمائدین، امراء و شعراء سنسکرت سے کماحقہٗ واقف تھے۔ شیخ مبارک ہی کو لیجئے تو ان کے متعلق عام اتفاق ہے کہ وہ شعر و سخن، عروض و معما، تاریخ و انشاء تفسیر اور سنسکرت میں ہندوستان کیا دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فیضی انہیں کے بڑے بیٹے ہیں۔ علم حساب و ہندسہ کی مشہور کتاب لیلاوتی اسی کی احسان مند ہے جس کا ترجمہ اس نے فارسی میں سنسکرت سے کیا تھا۔ یہ کتاب بیدر کے مشہور پنڈت بھاسکر کی باکمال لڑکی کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ حساب کی ایک دوسری کتاب بھی سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی اور بھگوت گیتا کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکبر ہی کی سنسکرت نوازی کا نتیجہ تھا کہ راماین اور مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور زیج میرزائی کا ترجمہ سنسکرت میں کیا گیا۔

اسی طرح ابوالفضل کا ہندی میں فاضل ہونا صرف آئین اکبری

---

[1] اورینٹل کالج میگزین بابتہ مئی ۱۹۳۱ء۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا مضمون "اردو زبان کی لغت" ہندوستانی ۱۹۳۱ء

رہی سے ظاہر ہے کہ اس میں سیکڑوں ہندی کے الفاظ۔ میووں، درختوں پھولوں، غلہ، ترکاریوں، کھانوں، کپڑوں، ہتھیاروں کے نام اور بہت سی دوسری اصطلاحیں ایسی ملتی ہیں جو ہندی ہیں اور آج بھی وہ برابر استعمال ہوتی ہیں۔ ابوالفضل کی ہندی دانی کا ایک ثبوت یوں اور بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ خود آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ علم ہئیت کی ایک کتاب کا ترجمہ حسب الحکم بادشاہ ہندی زبان میں کیا۔

اکبر کے زمانے میں یقیناً ہندی کو غیر معمولی ترقی ہوئی اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ عمائدین اور شہزادے ہندی زبان میں شاعری کرنے لگے تھے۔ شہزادۂ دانیال کے متعلق تزک جہانگیری میں ہے کہ

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود۔ گاہے بزبان اہل ہنود بہ اصطلاح الیشان شعری گفت۔"

اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں کی سنسکرت اور ہندی دانی، عربی وفارسی میں مہارت تزک جہانگیری سے ثابت ہے۔

"خانخاناں در قابلیت واستعداد یکتائے روزگار بود۔ زبان عربی، ترکی، فارسی وہندی میدانست وازاقسام عقلی ونقلی حتیٰ کہ علوم ہندی بہرۂ وافی میداشت۔ بزبان فارسی وہندی شعر نیکو می گفت"

عبدالرحیم خود بھی شاعر تھا اور شاعر نواز بھی تھا چنانچہ مشہور شاعر "گنگ کوی" کا مربی بھی تھا۔

تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کا اکبر کے یہاں یہ عروج ہوا کہ ہندوستانیوں کے علاوہ ایرانیوں کو بھی اس کا چسکا لگ گیا تھا۔ فارسی شعرا جو اس وقت دربار میں موجود تھے اکثر ہندی الفاظ نظم کرتے اور بولتے تھے۔ ملا دو پیازہ کو دیکھیے کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود ظرافت کے پیرایہ میں برابر ہندی میں شاعری کیا کرتے تھے چنانچہ کلام کا نمونہ دیکھیے۔

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا ایسا لگے ہے مجھکو جوں کھانڈ کا کھلونا
شوخی نپٹ کرت ہے تک چھکنی ہاتھ ملکر تیں تاک شیخ کینتی ایسی طرح ملونا
دوپیازہ از دل وجاں قرباں چرا نباشم جوبن لے مدھ کا ماتا وہ سانولا سلونا

اس وقت کی شاعری کا ایک نمونہ اور دیکھیے۔ ملا نوری فیضی کے دوست تھے۔ اعظم پور کے قاضی زادوں میں سے ہیں۔ شاعر فارسی کے تھے اور فن بدیع ومعما میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ریختہ میں بھی ان کی کئی غزلیں محمد شاہی عہد تک مشہور تھیں چنانچہ قائم[1] نے ذکر کیا ہے۔ ایک شعر نوری کا ملاحظہ ہو۔

هر کس که خیانت کند البته بترسد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جہانگیر بھی اکبر کی طرح ترکی سے واقف تھا۔ فارسی میں اتنی دستگاہ رکھتا تھا اور ایسے ذوق سلیم کا مالک تھا کہ اساتذہ کے مصرعوں پر برجستہ مصرعہ لگا دیا کرتا تھا۔ ہندی سے بھی یقیناً واقف تھا اس وجہ سے کہ وہ ایک ہندو ماں سے پیدا ہوا اور ابتدا ہی سے ایک ہندی ماحول میں رہا۔ دوسرا ثبوت ہندی دانی کے متعلق یہ ہے کہ تزک جہانگیری میں ہندی الفاظ اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اس سے اس کا ہندی زبان پر عبور معلوم ہوتا ہے دو چار الفاظ دیکھیے۔

"شیرمار۔ روپ سندر۔ ہنسراج۔ تالاب۔ گلہری۔ کالا پانی۔ بن مانس" وغیرہ وغیرہ جن میں سے اکثر اس وقت بھی مستعمل ہیں اس عہد کی شاعری کا نمونہ دیکھنا ہو تو خاکی نامی درویش[2] کا یہ ریختہ دیکھیے۔

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سریجن
تجھ سیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

سلاطین مغلیہ عموماً جس طرح شاہی زبان یعنی فارسی کی

---

[1] مخزن نکات۔ [2] تذکرۂ میر حسن

سرپرستی کرتے تھے اسی طرح بھاشا کی بھی عزت افزائی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ جہانگیر کا خود بیان ہے کہ ایک اچھوتے مضمون کی نظم کے صلے میں اس نے ایک ہندو شاعر کو ایک ہاتھی فرط خوشی سے انعام میں دیا۔ ہندی تصانیف کے ساتھ مغلوں کا شغف اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابیں یاد کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ میر ہاشم محترم مہابھارت کے صفحے کے صفحے زبانی سنا دیا کرتے تھے ہفت اقلیم کی عبارت سنئے۔

"امروز در ہندوستان است تمام کتاب مہابھارت را کہ مستجمع اسامی غریبہ و حکایات است در ذکر دارد"

جہانگیر کے بعد شاہجہاں بھی ہندی سے واقفیت رکھتا تھا۔ فارسی تو اس کی خاص زبان تھی ہی مگر فارسی کے علاوہ لوگوں سے ہندوستانی میں بھی گفتگو کرتا تھا۔ عبدالحمید لکھتا ہے۔

"بیشتر بہ فارسی در کمال فصاحت و بلاغت تکلم می فرمایند و بہ بعضے ہندوستانی زبانان کہ فارسی ندانند بہ ہندوستانی"[1]

شاہجہاں نامے اور دوسری کتابیں بھی اس وقت کے بہت سے ہندی الفاظ کی حامل تھیں جو آج بھی متروک نہیں ہوئے ہیں مثلاً بھول کٹورہ۔ دل بادل۔ چبوترہ۔ پالکی۔ رتھ وغیرہ۔

حیرت ہوتی ہے کہ اورنگ زیب کو لوگ ہندوؤں کی طرف متعصب اور متہتک بتاتے ہیں لیکن بھاشا کی ترقی اس کے وقت میں بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ ایران کا مشہور شاعر ضمیر اسی زمانہ میں ایران سے آیا اور بھاشا میں انتہائی کمال پیدا کر کے ہندی راگ کی مشہور کتاب پارجاتک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ آزاد بلگرامی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"...... بواسطۂ جدت ذہن و نظم ہندی طبع او آں قدر دخیل شد کہ از جملۂ استادان فن برآمد۔ زبانش بہ تلفظ ایں زبان خوب نمی گردید اما نظم او بسیار پختہ واقع می شد۔ ترجمہ پارجاتک در فن قصہ نغمات ہندی از وست۔ در ہندی پنتھی تخلص میکرد"[2]

[1] شاہجہاں نامہ جلد اول [2] ید بیضا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں بقول مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی بھاشا کی زباں دانی کا چسکا اس قدر زیادہ پڑ گیا تھا کہ بڑے بڑے علماء و حضرات اولیا و صوفیا سب کے سب اس میں کمال پیدا کرتے تھے[3]

اورنگ زیب کے بعد اعظم شاہ اور فرخ سیر کے زمانے میں بھی ہندی نوازی اور ادبیات میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ جعفر زٹلی ناصر علی سرہندی، میر عبدالجلیل بلگرامی، سید غلام نبی اور خود آزاد بلگرامی سب کے سب ہندی میں ماہر رہے ہیں انھوں نے ہندی کتابیں بھی لکھیں۔ یہی جذبہ محمد شاہی دور تک قائم رہا چنانچہ آزاد بلگرامی[4] لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے علماء نے جے سنگھ کے حکم سے شرح چغمنی اور دوسری کتابوں کا جو علم ہیئت اور ہندسے میں تھیں عربی زبان سے ہندی میں ترجمہ کیا۔

یہاں تک مسلمانوں کی ہندی اور سنسکرت خدمات دکھانے کے بعد ہم اس بات کی قدرے کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کی شاعری میں ہندی عنصر کی موجودگی اور ہندو کلچر کی نمایندگی ظاہر کریں۔ یہ بھی ایک عام اعتراض ہے کہ مسلمانوں کی شاعری فارسی سے متاثر ہے۔ اس میں وہی لالہ و گل کی بہاریں ہیں، بلبل و قمری کے نغمے ہیں۔ شیریں و فرہاد کی داستانیں ہیں اور رستم و سہراب کی نوحہ خوانی ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ اگرچہ مسلمانوں کی شاعری کے اکثر عناصر عجمی ہیں تاہم ہندی کلچر کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے اثرات مسلمانوں کے یہاں نہ ملتے ہوں مثلاً ہندو تہذیب، معاشرت، مذہب، آداب و رسوم اور جملہ ہندی عناصر اس میں موجود ہیں ہندی کے سیکڑوں لفظ ولی، حاتم، آبرو، مضمون اور فائز دہلوی[5] کے یہاں جو شمالی ہند کا سب سے قدیم شاعر ہے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہی میر، انشاء، سودا، مظہر، امانت، منیر وغیرہم کی حالت ہے

[3] ہندوستانی اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء [4] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان [5] صدرالدین فائز دہلوی پر پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ایک نہایت جامع مقالہ دہلی کانفرنس میں پڑھا تھا اور ثابت کیا تھا کہ وہ شمالی ہند کا سب سے پہلا شاعر ہے اس لئے اس کا دیوان سنہ ۱۱۲۸ھ میں یعنی ولی سے پانچ سال قبل مدون ہو چکا تھا۔

سودا کے متعلق آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ "مرزا اکثر ہندی کے مضمون اور الفاظ نہایت لطیف طور پر تضمین کر کے زبان ہندی کی اصلیت کا حق ادا کرتے ہیں (آب حیات) چنانچہ ان کی پہیلیوں مرثیوں اور قصیدے سے ظاہر ہے۔ ان پہیلیوں کو دیکھئے جن کی زبان باوجود زمانہ کے فرق کے امیر خسرو کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔

شمشیر کی پہیلی

(۱) سر پر متھ مکھ پر بار ؛ اس نار کا ہے یہی بچار
جیتے ہم کرے وہ دُو ؛ جب وہ ناری پیاری ہوتے

سپر کی پہیلی

(۲) ایک نار بھونرا سی کالی ؛ کان نہیں وہ پہنے بالی
ناک نہیں وہ سونگھے پھول ؛ جتنا عرض اتنا ہی طول

باز کی پہیلی

(۳) بعض بات کہی نا جائے ؛ ناری ہو کر نر کہلائے

قندیل کی پہیلی

(۴) سہرا باندھا پاؤں پر اور رنگ ہوئے اس کے ساتھی
پیٹ میں واکے آگ لگا دی گلے میں اس کے ڈالے پھانسی

اسی طرح ہندی شاعری کے تشبیہ و استعارے بھی پوری طرح سے مسلمانوں کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بحریں بھی ہندی اثرات سے تبدیل ہوئیں۔ مثنویاں ہندو قصوں اور افسانوں پر لکھی گئیں۔ مسلمان شعراء میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت ہندوانہ موضوعوں پر نظمیں لکھنے میں بہت نمایاں ہے جنھوں نے "بل دیوجی کا میلہ" "کنھیا جی کی شادی" "ہر کی تعریف" "درگا جی کے درشن" "مہادیو کا بیاہ" وغیرہ عنوانات سے اکثر و بیشتر نظمیں لکھیں اور ان سے ہندو مذہب کے بہت سے رسوم اور حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے زیورات، توہمات، ہندو رسوم، رنڈاپا، شادی بیاہ، ہندو تیوہار سب قسم کی نظمیں موجود ہیں مگر طوالت کے لحاظ سے مثالیں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

غرض کہ اگر ہم انصاف سے دیکھیں تو شعراء سے لے کر مسلمان بادشاہوں تک کا کلام اور معاشرت ہندوستان کی تہذیب اور معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور واجد علی شاہ[۱] سب کے یہاں ہندی تہذیب کے نشانات نہایت واضح ہیں۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے ہندی ادب کی ترویج میں کوئی کمی نہیں کی ان کا فطری میلان بھی ایک حد تک اسی کی طرف تھا اور خود ان کی شاعری و ادب ہندی اثرات اور تمدن و تہذیب و معاشرت کا پرتو ہے۔ رسالہ کی گنجائش مضمون کی وسعت کے ساتھ سازگار نہیں اسلئے اختصار مد نظر رہا ورنہ اگر اس موضوع کی تفصیل کر دی جائے تو مستقل ضخیم کتابیں تیار ہو جائیں۔

اقبال انصاری

---

[۱] واجد علی شاہ، اختر تخلص کرتے تھے۔ موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں۔ ہندی شاعری سے بجد دلچسپی تھی ٹھمریاں اور گیتیں ان کی بہت مشہور ہیں۔ کل کتابیں ایک سو بیس سے زیادہ ہیں۔ واجد علی شاہ کی تقریباً پچاس تصنیفیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں موجود ہیں جنھوں نے بیس سال کی کوشش کے بعد ان جواہر پاروں کو اکٹھا کیا ہے اور ایک مبسوط مقالہ واجد علی شاہ کی "ادبی خدمات" پر لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھ چکے ہیں۔

اندازِ عمل

(عرب کی بہیمیت و بربریت)
"ایک طویل نظم کے چند بند"

اہلِ دانش کو تحیر ہے کہ وہ ملکِ عرب جہل و افلاس کا رہتا تھا جہاں لہو و لعب
حُسنِ اخلاق، نہ تہذیب، نہ کچھ علم و ادب ایک ویرانہ تھا معمورۂ آلام و تعب
جور و بیداد کا افسانہ فضا کہتی تھی
خوف و دہشت کی اسی بن میں بلا رہتی تھی

منزلوں سایۂ اشجار نہ پانی کا نشاں اس پہ گرمی وہ ستم کی کہ نہیں تابِ بیاں
ریگِ تفتہ سے ہوئے جاتے تھے ذرّے بریاں اخگرِ کورۂ حداد کا تھا جن پہ گماں
قلب بھنتے تھے، جگر بریں طپاں رہتے تھے
ایسے آلام میں یہ سوختہ جاں رہتے تھے

دستِ مفلس کی طرح رہتے تھے خالی جنگل جس طرف دیکھا، نظر آتا تھا میداں چٹیل
اگر ایسا ہی نمو نے کیا پُر زور عمل جھنڈ اُگ آئے ببولوں کے یہ ہاتھ آیا پھل
آفتیں قحط کی ہر سال جو پیش آتی تھیں
کھیتیاں زیست کی پامال ہوئی جاتی تھیں

آب نایاب تھا اک ریگ کا دریا تھا رواں نام چشمے کا کہیں اور نہ کہیں کوئی کنواں
ابرِ رحمت سے اگر بھر گئے چھقّر اُس آں ہوگئی عید، ملا راحت و عشرت کا نشاں
ایک میلا سا لبِ آب لگا رہتا تھا
گدلے پانی کو جو دریائے لبن کہتا تھا

کملیاں تان کے آ بیٹھتے تھے پانی کے قریں — پہلے جو آتا تھا ہو جاتی تھی ملک اس کی زمیں
بعد والوں کو نہ ملتی تھی جگہ جب کہ کہیں — خانۂ حسرت و اندوہ کے ہوتے تھے مکیں
تلخیاں سہتے تھے اور خونِ جگر پیتے تھے
قابضِ آب کے الطاف پہ یہ جیتے تھے

دوست اور قبائل جو رہے ان کے سوا — قابضِ آب کے قبضے ہی میں تھی ان کی بقا
منتیں کرنے پہ جب اذن انھیں ہوتا تھا — مردہ اجسام میں آ جاتی تھیں جانیں گویا
آئے دن جانِ عطش کے جو الم سہتی تھی
آمد و رفت لبِ آب یوں ہی رہتی تھی

ایسے آلام و مصائب میں یہ تھا ان کا حال — شعلہ خو، عربدہ جو، مستعدِ جنگ و جدال
یونہی سی بات بڑھی اور انھیں آیا جلال — کشت و خوں ہونے لگا خون سے میداں ہوا لال
رن وہ پڑتے تھے کہ صدہا کے گلے کٹتے تھے
دشت پٹ جاتا تھا کشتوں سے تو جب ہٹتے تھے

کبھی گھڑ دوڑ میں ان بن ہوئی تکرار بڑھی — فیصلے کے لئے شمشیرِ شرر بار بڑھی
اور کبھی گھاٹ کے جھگڑے پہ یہ گفتار بڑھی — لڑنے مرنے کے لئے قومِ جفا کار بڑھی
تیغ کے گھاٹ سے جانیں اماں پاتی تھیں
زورقیں عمر کی ڈوبی ہوئی رہ جاتی تھیں

تغلب و بکر کی آپس میں نزاعِ لفظی — بڑھتے بڑھتے ہوئی یہ حد کہ کٹی نصف صدی
مٹ گئے نام قبائل کے چھڑی جنگ ایسی — مدتوں ملک میں اک آگ پڑی بھڑکا کی
مرغِ وحشی قفسِ تن سے اڑے جانوں کے
شمعِ ارماں کے قریں ڈھیر تھے پروانوں کے

بارشِ خوں یہ نہ تھی سیم و گہر کی خاطر — نہ یہ کوشش تھی بلاؤں سے مفر کی خاطر
خوں فشانی یہ نہ تھی دردِ جگر کی خاطر — نہ یہ ہنگامہ کسی دفعِ ضرر کی خاطر

یہی علت تھی کہ سب علم سے بیگانے تھے
جہل کے دیو تھے، کج فہم تھے، دیوانے تھے

آپ ہی آپ رہا کرتے تھے اکثر تن پھن
ان کے اجناس خصائل میں معائب کے تھے تھن
چین سے بیٹھنے کی تھی نہ کسی وقت بھی دھن
ان کے نغمات مفاسد کی شرانگیز تھی دھن

رقص بسمل کے تماشے یہ پسند آتے تھے
ٹھٹ کے ٹھٹ گھاٹ پہ شمشیر کے للچاتے تھے

فرش تھا پاس نہ کچھ اور یہی سامان گزر
کملیاں دوش پہ رہتی تھیں فقط آٹھ پہر
وہی بستر تھیں، وہی فرش، وہی پردۂ در
اور وہی وقت ضرورت تھیں بجائے چادر

وہی اونٹوں پہ کسی جاتی تھیں محمل کی طرح
وہی بارش میں بھی کام آتی تھیں منزل کی طرح

دوش ہستی پہ دھرے جہل کے یہ پشتارے
لیے گھرے پھرتے تھے اس دشت میں مارے مارے
وحشیوں کے سے تھے اخلاق و خصائل سارے
گھاٹیاں گونج اٹھیں مل کے جو نعرے مارے

بز کوہی تھے پہاڑوں میں تھا مسکن ان کا
بربریت سے نجس رہتا تھا دامن ان کا

خیمہ نشین تھیں، نہ رہنے کو محل اور نہ قصور
نہ امارت کا حشم اور نہ حکومت کا ظہور
نہ کہیں دبدبۂ شان و شکوہ تیمور
ان کی ایام گزاری کا عجب تھا دستور

بے نتھے بیل تھے جو چاہتے تھے کرتے اچھے
آئے دن آپ ہی آپس میں کٹے مرتے تھے

حسن اخلاق نہ تہذیب نہ رسم تعظیم
نہ تمدن کا چمن اور نہ اوامر کی نسیم
نہ سیاست کے شگوفے نہ عطا کی تسنیم
چتر اجلال کہیں اور نہ تخت و دیہیم

فوج ہی فوج تھی جس کا کوئی سردار نہ تھا
کوئی اس قافلے کا قافلہ سالار نہ تھا

سید ابوالقاسم سرور

گُل بوٹے

ہمارے ایک دوست کو کرایے کے مکان کی ضرورت تھی، ایک روز ہمیں ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل ہوئی اور علی الصباح مکان کی تلاش میں نکل پڑے کئی مکان دیکھ ڈالے مگر ایک بھی پسند نہ آیا۔

مارکٹ کی شاندار گھڑی ٹن ٹن بارہ بجا رہی تھی کہ ایک مکان پر "کرایہ پر دیا جاتا ہے" دیکھ کر موٹر سے اتر پڑے اور کمپونڈ میں داخل ہوئے۔

پہلی نظر ایک بھینس پر پڑی جو ورانڈے کے کھمبے سے بندھی ہوئی تھی، دوسرا کھمبا ایک بکری کی حفاظت کر رہا تھا، ورانڈے کے قریب جا کر ہم نے پکارا۔

"کوئی ہے؟"

دروازے کا ایک پٹ کسی قدر کھلتا نظر آیا، اندر سے کسی نے جھانکا اور نہایت فصاحت سے فرمایا "اوئی ماں مٹی پڑو دو مردوے کھڑیں، اری مردار گل بہار اجا دیکھ!! باہر تیرے کون باوایاں آئیں"؟ ایک چھوٹی سی آٹھ برس کی گل بہار باہر نکلی اور ہم سے پوچھا۔

"کون ہے کیا ہونا"؟

ہم نے کہا "کسی مرد کو بھیجو مکان دیکھنے آئے ہیں۔ کرایہ پر لینا چاہتے ہیں"!

اندر سے آواز آئی "بس یہی کام ہے! نو آتا میں آتا مکان میں کیا ہیرے موتی جڑیں! مکان سری کا مکان ہے!! جا بول مُردار تیرے سرکار کو"!!!

اس اثنا میں ہمیں ورانڈے کی آرائش پر غور کرنے کا جو موقع ملا تو ہم نے صاحبِ خانہ کے سلیقہ کی دل ہی دل میں خوب داد دی، ایک تخت پر دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر چند پلیٹ اور چمچے بکھرے پڑے تھے، ایک صراحی جو صافی سے بے نیاز تھی ایک طرف رکھی ہوئی تھی، صراحی سے لگا ہوا ایک المونیم کا گلاس تھا جو ایک عرصہ سے شرمندۂ صفائی نہ ہوا تھا، تخت سے ذرا ہٹ کر ایک "کموڈ" فوری امداد کے لئے تیار رکھا تھا تخت کے نیچے چوپنی، بھوسے اور ہبولے کے دو چار تھیلے پڑے تھے، ایک کونہ میں ہری گھاس اور کچھ "برگ سبز" اپنے اندر "معرفت کردگار" کا ایک دفتر لئے ڈھیر ہو رہے تھے، دیوار پر چار انگرکھے کچھ کرتے، پاجامے اور لنگیاں ٹنگی ہوئی تھیں، الگنی پر ساڑیاں ہوا کھا رہی تھیں۔

ورانڈے کی اس آرائش و زیبائش کو ہم ابھی بہ نظرِ غور دیکھ ہی رہے تھے کہ "گل بہار" کے مولوی نما سرکار برآمد ہوئے۔ سر پر شاندار عمامہ اور اس کے نیچے ایک فٹ کی گھنی کھچڑی داڑھی، ہاتھ میں پیلے منکوں کی لانبی تسبیح، جسم پر ڈھیلا ڈھالا کرتہ ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ، کاندھے پر تیلیا رومال۔

ہمیں دیکھ کر مولویانہ انداز سے "سلام علیکم" کہا، سلام کا جواب دے کر ہم نے اپنے آنے کی وجہ بتائی اور مولانا کے حسب الحکم ہم ان کے پیچھے ورانڈے سے ملے ہوئے ایک کمرے یا مولانا کے "ڈرائینگ روم" میں داخل ہوئے۔

صوفوں اور کرسیوں کے عوض اس کمرے میں ہم نے چند نادر چیزیں دیکھیں۔ مثلاً اناج کے تھیلے، مرچ اور املی کے بورے غلہ رکھنے کے ڈبے، گھی اور تیل کے پیپے، تمباکو کے گٹھے، آم کے انڈکے اچار کے مٹکے اور مربے کے کئی روغنی گھڑے، غرض کہ کمرہ کیا تھا "نانک رام" کی دوکان تھا، اس کمرے کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دو کمرے تھے، ایک مولانا کی عبادت گاہ معلوم ہوتا تھا، اس میں ایک طرف

مصلّے بچھا ہوا تھا، اور ایک کونے میں چند کتابیں منوں گرد و غبار کے نیچے دبی پڑی تھیں، دوسرے کمرے میں "گل بہار" کی بیگم صاحبہ "گل بہار" سے یوں مخاطب تھیں۔

"اری حرام زادی، ایسیچ پیاز کاٹتی! چھلٹہ (چھلکا)
تک بروبر (برابر) نیں (نہیں) نکلا۔ کیری کے ٹکڑے دیکھو
کاٹی سو!! اری مردار، خام پارہ، کام چور، نوالے حاضر! دیکھتے
دیکھتے بڈی (بڈھی) ہوگئی پن تیرے کو ابی (ابھی) تک
پیاز کاٹنا آیا نہ کیری کترنا آیا۔ اب تو مکان میں لوگاں
(لوگ) ہے بول کو چپ بیٹھیوں، ماری نیں، پھر کو ایسیچ کتری
تو مارتے مارتے فرش کر دیوں گی، اِتے (اتنے)
جوتیاں ماروں گی سر میں ایک بال بی نیں ہوں گا سمجھ کو
رہو!! ایک دن تیری ناک چوٹی کاٹ کو گھر سے بارو (باہر) ڈھیلے
باہر نیں کر دی تو میرا نام پلٹ کو رکھنا!!!"

اس پرلطف گفتگو میں ہم کچھ ایسے محو ہو گئے کہ گھر دیکھنے کے عوض جی چاہ رہا تھا کہ بس ان "ارشادات عالیہ" کے انمول موتیوں سے اپنا دامن بھرتے جائیں، مولانا کی بے چینی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی صورت ہم کو جلد دفع کرنا چاہتے ہیں، مگر ہم "وقت کی نزاکت" کا خیال کر کے ہر کمرے کو بڑے اطمینان سے دیکھ رہے تھے، مولانا کے "تیور" کہہ رہے تھے کہ دو "غیر محرموں" کا ان کی ایک عمدہ "محرم" کی "پرائیوٹ" گفتگو سننا مولانا پر بڑا شاق گزر رہا تھا۔ مکان کا معائنہ ہم نے ختم ہی کیا تھا کہ اندر سے ارشاد ہوا۔

"اری مردار! جا دیکھ!! وہ مونڈی کٹے گئے نئیں؟
اندر بیٹھے بیٹھے خفکان (خفقان) ہوگیا! سرکار
سے پوچ (پوچھ) کو آ، آج کھانا کھاتیں یا بھکلے
(بھوکے) رہتیں؟ ہنڈیاں چلّے (چولھے) پر پڑیں
ہور (اور) اپے ٹھک ٹھک کو مکان بتاریں!!"

"باغبان"

"بھولنے والے سے"

زمیں پر زندگانی بدلیاں جس وقت برسائیں
رباب آسمانی پر ستارے مل کے جب گائیں
درِ میخانہ جس دم چھاؤں میں تاروں کے کھل جائے
سحر کے راگ کا دیوتا رسیلے سُر میں جب گائے
مہکتی ہو فضا جس وقت خوشبوئے گُل تر سے
گھٹا برسات کی میدان میں جب جھوم کر برسے
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

کوئی ساز جنوں پر زندگی کے راگ جب گائے
سنہری وادیوں میں کیف کی بجلی سی لہرائے
چمن میں ڈالیوں پر جب پرندے چہچہاتے ہوں
کنار آب جو مہکے ہوئے جھونکے جب آتے ہوں
دلوں میں ولولے اٹھ اٹھ کے جب بے چین کرتے ہوں
بہار رنگ و بو کے جس گھڑی گیسو سنورتے ہوں
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

نہال تازہ جب رقص ہوا سے جھوم کر لچکیں
جگا دیں خواب سے روحوں کو جب گاتی ہوئی شاخیں
ہوائیں رقص کرتی ہوں، فضا جب گنگناتی ہو
کوئی آنکھوں میں پھرتا ہو کسی کی یاد آتی ہو
تو پھر اے بھولنے والے ہمیں بھی یاد کر لینا!

جوہر فریادی

نئی کتابیں

۱۔ تیس دن میں اردو۔ (اردو، ہندی، انگریزی اور بنگلہ ایڈیشن) قیمت ۴ر منیجر شمسی پریس بکڈپو گیا۔

۲۔ الف لیلیٰ کی ایک رات (افسانے) قیمت ۸ر مکتبۂ بہار۔ گیا۔

۳۔ کیا خوب آدمی تھا (مشاہیر کی نسبت ریڈیائی تقریریں) حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ۸ر حالی پبلشنگ ہاؤز۔ دہلی۔

۴۔ قلم نما (فلم کے متعلق تنقیدی مضامین) از نصیر الدین ہاشمی۔ حجم ۸۸ صفحے قیمت ۶ر کتاب خانہ۔ عابد روڈ

۵۔ اقبال کشیدہ کاری (سلائی کے نمونے اور طریقے) مرتبہ ادارہ سہاگ قیمت عہ۔ سہاگ انڈسٹری ہاؤس۔ بلال گنج۔ لاہور۔

۶۔ شہد کی مکھیوں کا کارنامہ از نواب منظور جنگ ۹۶ صفحے قیمت مجلد ۱۲ر کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔

۷۔ تذکرۂ حبیبی حصہ اول و دوم (شاہ حبیب حیدر قلندر کے حالات) حجم ۲۹۲ صفحے قیمت ؁ کتب خانہ انوریہ۔ کاکوری۔ لکھنؤ۔

۸۔ براہین وحی از محمد حسین عرشی و محمد اقبال حجم ۱۰۲ صفحے قیمت عہ دفتر امت مسلمہ۔ امرتسر۔

۹۔ گناہ کے افسانے از خوشتر قیمت عہ۔ پریم شاستر بکڈپو۔ لاہور

۱۰۔ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن قیمت عہ اردو اکیڈیمی پنجاب۔ لاہور

۱۱۔ کلیات اکبر تین حصے (جدید ایڈیشن) از اکبر الہ آبادی قیمت للعہ کتاب خانہ۔ عابد روڈ۔

۱۲۔ شب حسرت دو جلد (ناول) از تیرتھ رام فیروزپوری۔ قیمت عہ دائرۂ ادبیہ۔ لاہور۔

۱۳۔ گناہ کی راہ (ناول) از تیرتھ رام فیروزپوری قیمت عہ۔ دائرۂ ادبیہ لاہور

۱۴۔ گسٹاپو (ناول) مترجمہ بشیر احمد حجم ۲۲۴ صفحے قیمت عہ۔ ہاشمی بکڈپو لاہور

۱۵۔ پراوسن (افسانے) از گورکھ ناتھ حجم ۱۶۰ صفحے قیمت عہ کتاب خانہ عابد روڈ۔

۱۶۔ خانہ بربادی (افسانے) از میاں وجودی حجم ۱۰۰ صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۷۔ طوفان (افسانے) از رابندر ناتھ ٹیگور حجم ۲۴۰ صفحے قیمت عہر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۸۔ وفا کی انتہا (ناول) مترجمہ میر حسین علی حجم ۱۸۸ صفحے قیمت ۱۲ر دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۱۹۔ پاکیزہ محبت (ناول) از ملکہ راج حجم ۲۴۸ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۰۔ بھوک (افسانے) از حمید الدین حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۱۔ محقق خاتون (ناول) از حاجی حفیظ الدین ۳۴۴ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۲۔ ذرۂ عظیم (ناول) ترجمہ برج کماری ۱۳۶ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۳۔ طوفان جنگ (تاریخی ناول) از شیو برت لال ۲۲۲ صفحے قیمت عہ۔ دائرہ ادبیہ۔ لاہور

۲۴۔ لکھنوی پریاں (ناول) از حامد حسین ۲۰۰ صفحے قیمت عہ دائرہ ادبیہ۔ لاہور۔

۲۵۔ جوش وطن (قومی نظمیں) از انوپ چند آفتاب قیمت ۴ر از مصنف زین پانی پتی

۲۶ محاسن سجاد (سوانح محمد سجاد مرحوم) مرتبہ مسعود عالم ۱۰۰ قیمت عہ الہلال بک ایجنسی بانکی پور۔ پٹنہ

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

سالنامہ رسالہ جدید اردو باتصویر بابت ۱۹۴۱ء

مرتبہ پرویز شاہدی و محمد ظہور احسن قاضی حجم ۱۰۲ صفحات قیمت ۱۲ / پتہ ۶۲ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

رسالہ "جدید اردو" نے اس دفعہ اپنے سالنامے کو کافی دلکش اور دلچسپ بنایا ہے۔ کاغذ کی روز افزوں گرانی کے باوجود عمدہ چکنے کاغذ پر یہ سالنامہ صاف ستھری لکھائی چھپائی کے ساتھ شایع ہوا ہے ادبی اور تاریخی مقالے، اخلاقی افسانے، معیاری ڈرامے، اخلاقی نظمیں، تغزلیہ غزلیں، رباعیاں قطعے۔ غرض کہ اس سالنامہ میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک معیاری ادبی پرچہ میں ہونا چاہیے۔ جناب پرویز شاہدی اور ظہور احسن قاضی کی کوششیں پروان چڑھ رہی ہیں اور اردو کا یہ نونہال پھولنے اور پھلنے لگا ہے۔

رسالہ سہیلی

لاہور کا باتصویر "اولاد نمبر" بابتہ مئی و جون ۱۹۴۱ء مرتبہ زہرا سعدیہ حجم ۸۰ صفحے چندہ سالانہ پانچ روپیہ پتہ برانڈرتھ روڈ۔ لاہور۔

رسالہ سہیلی کے اس خاص نمبر میں اکثر مضمون بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت، ورزش اور ان کی صحت کے متعلق تجربہ کار مضمون نگاروں نے لکھے ہیں۔ دودھ پلانے کے طریقے اور اوقات، زچہ اور بچہ کی نگہداشت، بچوں کی خوراک، حفظان صحت کے اصول، بچوں کی مخصوص بیماریاں اور ان کے علاج کے متعلق بہت سی کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں چند اچھی اخلاقی نظمیں ایک مختصر مزاحیہ ڈراما اور ایک طویل دلچسپ افسانہ بھی پڑھنے کے قابل ہے، اس کے علاوہ عورتوں کی مغرب زدگی، ذمہ داریاں فرائض اور ان کی صحت کے متعلق بھی چند اچھے مضمون لکھے گئے ہیں۔

رسالہ کے آخر میں ڈاکٹر خدیجہ بیگم کا وہ خطبۂ صدارت درج ہے جو آپ نے زنانہ اسلامیہ کالج انجمن حمایت اسلام میں پڑھا تھا، اس خطبہ میں موصوفہ نے اسلام کی روشنی میں طالبات کو جو نصیحتیں کی ہیں اور اخلاق کے جو سبق دئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ غور سے پڑھے اور سمجھے جائیں۔

رُوحِ مکاتیب حصہ اول

مرتبہ ساغر نظامی حجم ۲۵۰ صفحے قیمت عہ پتہ مکتبہ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ۔

رسالہ "ایشیا" میرٹھ بابتہ ماہ جون ۱۹۴۱ء کا یہ خاص نمبر ہے اس میں ملک کے مشہور انشا پردازوں اور شاعروں کے وہ خطوط درج ہیں جو مرتب کے نام لکھے گئے تھے۔ اس نمبر کا آغاز راجندر ناتھ شیدا ایم اے کے قابل مقالے سے ہوتا ہے جس میں جناب شیدا خطوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں "خطوط بجنس خود بھی ادب کی عمدہ مثالیں ہو سکتے ہیں، وہ تفصیل و اختصار کی قیدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور طبیعت کی بیساختہ تراوش ہونے کی وجہ سے اپنے لکھنے والوں کی فطرت کو ایک بڑی حد تک بے نقاب کرتے ہیں، ان میں وہ تمام موضوع معرض بحث میں آ سکتے ہیں جو کسی بھی اونچے ادب کا اگار خانہ ہیں"۔

اس مجموعہ کی خصوصیت بقول جناب ساغر یہ ہے کہ "یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں بیک وقت متعدد اسالیب نظر آتے ہیں"، دوسرا یہ کہ اس میں "جماعت مکتوب نگار ہے اور فرد مکتوب الیہ یعنی ایک شخص (جناب ساغر نظامی) کو بہت سے اشخاص مخاطب کرتے ہیں"۔ بہرکیف یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے میں بھی اس کی ایک جلد ضرور رہے۔

رشوت خواروں کا حشر

مرتبہ محمد شمس الدین صدیقی سابق منصف حجم ۸۰ صفحے۔ قیمت لکھی نہیں ہے پتہ از مولف۔ کالی کمان حیدر آباد دکن۔

یہ رسالہ مولف نے حکومت سرکار میں انسداد رشوت ستانی کے اقدام کو اخبار میں پڑھ کر لکھا ہے۔ اس میں نواب مختار الملک مرحوم، نواب میر لایق علی خاں مرحوم، نواب سر آسمانجاہ مرحوم کے زمانے میں انسداد رشوت ستانی کے سلسلہ میں جن عہدہ داروں کو معطل اور برطرف کیا گیا تھا

اس کی تفصیل جریدۂ اعلامیہ کے حوالہ سے لکھی گئی ہے اس کے علاوہ مولف کے چند اخلاقی مضامین بھی ہیں۔

محبت کے افسانے مرتبہ محمد یعسوب الحسن حجم ۸۰ صفحے چھوٹی تقطیع قیمت ۵ رتبہ دفتر خضر راہ۔ بارود خانہ اسٹریٹ۔ لاہور۔

رسالہ "خضر راہ" کا یہ خاص نمبر ہے۔ اس میں قاضی عبدالغفار، سدرشن، محمد لطیف، پروفیسر عابد علی عابد۔ ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ کے مختصر افسانے اور کہانیاں ہیں۔

تذکرۂ تاج الاولیا مرتبہ محمد حسام الدین حجم ۱۹۴ صفحے قیمت عہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ حیدرآباد۔

ناگپور کے مشہور بزرگ حضرت بابا تاج الدینؒ کی سیرت اور ملفوظات کا یہ مجموعہ ہے جس کو موصوف کے بھانجے نے مرتب کیا ہے۔ اس میں باباصاحب کا خاندان۔ ان کی ولادت، تعلیم، ریاضت، کرامات وغیرہ کے متعلق صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ "س"

نقش اول مرتبہ بیگم صالحہ عابد حسین حجم ۲۳۲ صفحے۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔ قیمت عـ۸ مجلد، حالی پبلشنگ ہاؤز۔ دہلی سے مل سکتی ہے۔

لائق مصنفہ کے انداز بیان میں گھلاوٹ، بیساختہ پن، سادگی وجاذبیت بلاکی ہے۔ حصہ اول چھ افسانوں پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں بھی چھ افسانے ہیں اس طرح اس پوری تصنیف میں بارہ افسانے گویا مشتری کے بارہ چاند ہیں جو اپنی آب وتاب سے اس کی درخشانی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یوں تو ہر افسانہ ایک طویل وبسیط تنقید کا اہل ہے لیکن دامان باغباں میں اتنی گنجائش کہاں کہ ان سب پھولوں کی پوری پوری سرگذشت سمیٹ لے۔ مختصر یہ کہ اس کا ہر افسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک جداگانہ حسن وجاذبیت کا حامل ہے۔ اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی ــــ ہر شخص کی زندگی جو بذات خود ایک افسانہ ہے۔ ان کے مطالعہ سے اس کی اخلاقی، اصلاحی وتمدنی اصلاح ہوجاتی ہے۔ نری مضمون نگاری یا افسانہ نویسی وانشاپردازی کسی مصرف کی نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس کا مواد کسی پڑھنے والے کی رہبری نہ کرے جیسے کسی زبردست شعر کی مقبولیت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ سننے والا بول اٹھے کہ اگر میں شاعر ہوتا تو ایسا ہی شعر کہتا ــ اسیطرح سے ایک افسانہ یا مضمون کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگے کہ واقعی ہم بھی ایسا ہی لکھتے اگر کبھی ہمیں لکھنے کا اتفاق ہوتا۔ بعض وقت ان کا پلاٹ آپ بیتی کا پرتو لئے ہوئے اپنی ہی آنکھیں کھول دیتا ہے۔

میرے خیال میں اگر زندگی میں کسی کو ذرا سا بھی موقع مل جائے تو وہ اپنی اولین فرصت میں نقش اول کا ضرور مطالعہ کرے۔ "بڑے میاں" "تارہ" "اورشینہ کا گھر" سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں کتنا مسالہ بھرا پڑا ہے جس سے ہم اپنی زبان اور اپنے خیالات کو وسعت دے سکتے ہیں۔ خوبی تو ترجمہ کی ہے جنھوں نے بڑے حسن وسلیقہ سے اسکو اپنا لیا ہے۔ محبت کی فتح سے ثابت ہوتا ہے کہ دھن دولت، ذات پات حسب نسب پریم نگری میں بے معنی سے بول ہیں۔ پک نک تو ایک خاصہ کی چیز ہے۔ اور آنکھ کا ڈاکٹر ایک دلنشیں ڈراما۔ سیدہ، ہر گھرانہ میں کاش ایسی ایک ہی لڑکی کم از کم ہوجائے۔ ایک پیسہ ــ اف! یہ سرمایہ داری وافلاس کا بدنما داغ۔ دیکھئے کب یہ دھبہ مٹتا ہے۔ "خان بہادر ہانکے پکارے کہتا ہے" بترس از آہ مظلوماں ــــ الخ ــ شادی، ایک کامیاب افسانہ ہے۔ غرض کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے۔

اگر ہر گھر میں اس تصنیف کے ان دلچسپ افسانوں کو ہر شخص پڑھ لے تو اسکی زندگی کیا سے کیا ہوجائے۔ لائق مصنفہ قابل مبارک باد ہیں۔

"ت ج"

ادارہ کی خبریں

نواب سالار جنگ بہادر کا معائنۂ ادارہ

حیدرآباد کے امیر اعظم نواب میر یوسف علی خاں بہادر سالار جنگ سرپرست ادارہ نے بتاریخ ۸ ستمبر ۱۹۴۱ء مطابق ۱۸ شعبان ۱۳۶۰ھ ادارہ کا معائنہ فرمایا۔ اس تقریب میں ادارہ کی طرف سے ایک پُرتکلف عصرانہ دیا گیا تھا جس میں نواب خسرو جنگ بہادر صدرالمہام فوج سرکار عالی، مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات، مولوی حسین علی خاں صاحب پرووسٹ جامعہ عثمانیہ، مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات، اور ادارہ کے اکثر معتمدین شعبہ جات و دیگر اراکین نے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک گروپ فوٹو لیا گیا جو سب رس کی اس اشاعت میں شریک کیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب معز نے ادارہ کے ہر شعبہ کا تفصیل سے معائنہ فرمایا۔ اور ادارہ کی مجوزہ عمارت کے "سالار جنگ ٹاور" کا نقشہ بھی پسند فرمایا۔ ادارہ کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کو بھی نواب صاحب معز نے دیر تک ملاحظہ فرمایا اور اس بارے میں نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ سے تبادلۂ خیال بھی فرمایا۔

نواب معین الدولہ بہادر کی وفات

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ادارہ کے قدیمی سرپرست اور حیدرآباد کے امیر اکبر نواب امانت جنگ معین الدولہ بہادر نے اس مہینے کی ۴ تاریخ مطابق ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ کو فالج کے حملہ کی وجہ سے اچانک وفات پائی۔ نواب صاحب مرحوم کو ادارہ سے ذاتی دلچسپی تھی۔ اور وہ سب رس کے قدیم ترین قلمی معاون تھے۔ چنانچہ ان کی متعدد غزلیں سب رس میں چھپ چکی ہیں۔ اور ایک نظم "شیر" بھی سب رس میں شایع ہوکر بڑی مقبولیت حاصل کرچکی ہے۔ نواب صاحب نے اس نظم کے لئے ادارہ سب رس کی فرمایش پر ایک خاص تصویر اتروا کر روانہ فرمائی تھی جس میں ان کے شکار کئے ہوئے جملہ شیر بھی نمایاں تھے۔ نواب معین الدولہ بہادر کو ادارہ سے جتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا کہ انھوں نے ادارہ کے مشاعرے میں جو ان کی وفات سے صرف نو روز قبل منعقد ہوا تھا اپنی ایک خاص غزل روانہ فرمائی تھی۔ یہ غالباً ان سخن ور اور علم دوست نواب صاحب کی آخری غزل تھی۔ ان کی وفات سے حیدرآباد کی علمی دنیا اور خاص کر ادارۂ ادبیات اردو کو بڑا نقصان پہنچا۔ چند سال قبل انھوں نے اپنا دیوان "معین سخن" مرتب کر کے شایع کیا تھا جس پر ادارہ کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب سے بڑے اصرار کے ساتھ مقدمہ لکھوایا تھا۔

نواب معین الدولہ بہادر کی وفات سے جو نقصان پہنچا ہے وہ اگرچہ ناقابل تلافی ہے لیکن ایک حد تک تسلی ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرزند اکبر نواب محمد ظہیرالدین خاں بہادر بی اے امیر پائیگاہ مقرر ہوئے ہیں جو ادارہ ہذا کے قدیمی رفیق ہیں اور توقع ہے کہ وہ نواب معین الدولہ بہادر کی جگہ ادارہ کی سرپرستی قبول فرمائیں گے۔ نواب ظہیرالدین خاں بہادر بقول اعلیٰ حضرت بندگان عالی آصفجاہ سابع ایک نیک کردار جوان صالح ہیں۔ ان کا سفرنامۂ یورپ و امریکہ اردو زبان کی ایک دلچسپ اور مقبول کتاب ہے جو چند سال پیشتر شایع ہوئی تھی۔ وہ شمس الامراء بہادر کی علمی خدمات پر بھی ایک کتاب تحریر فرما رہے ہیں جو شایع ہونے کے بعد اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم بہادر کی سرپرستئ ادارہ

ادارہ کے بہی خواہوں اور کارکنوں کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ ہز اکسلنسی کرنل ڈاکٹر سر محمد احمد سعید خاں بہادر ایل ایل ڈی نواب چھتاری وصدر اعظم دولت آصفیہ نے ازراہ علم پروری ادارۂ ادبیات اردو کی سرپرستی قبول فرمائی ہے یقین ہے کہ یہ "دور سعید" ادارہ کی

علمی و ادبی خدمات اور اردو کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مسعود و مبارک ثابت ہوگا اور ارباب ادارہ حسب دلخواہ اپنی مساعی میں کامیابی حاصل کریں گے۔

مشاعرہ ادارۂ ادبیات کی طرف سے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۱ء مطابق ۲۲ شعبان کو ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں ادارہ کے اکثر معاونین و رفقا اور معتمدین شعبہ جات نے شرکت کی۔ اس ادبی صحبت میں شرکت کی عام اجازت تھی چنانچہ دور دور سے بلا امتیاز مذہب و ملت لوگ آئے اور اس خاص محفل سے استفادہ کیا۔

شعرا میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، نواب شہید یار جنگ بہادر شہید، قاضی زین العابدین صاحب عابد، حضرت امجد، حضرت علی اختر، ماہر القادری صاحب، مخدوم محی الدین صاحب، محمد علی صاحب نیر، ڈاکٹر سکینہ صاحب، آزاد صاحب، نظر صاحب، محبت صاحب، عابد علی صاحب سعید، مہندر راج صاحب، علی احمد صاحب، مشتاق احمد صاحب، خیرات صاحب، الہام صاحب، طالب صاحب، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نواب معین الدولہ بہادر معین نے بھی اپنی خاص غزل روانہ کی تھی۔

سامعین میں ہندو، مسلمان، طلبہ اور اعلیٰ عہدہ دار سب دوش بدوش شریک تھے۔ جدید ترقی پسند نظموں کے ساتھ ساتھ قدیم طرز کی معیاری غزلیں مساوی داد حاصل کر رہی تھیں۔ غرض ہر قسم کے امتیازات کو دور کرکے ادارہ کی اس ادبی محفل نے حیدرآباد میں ایک اچھی روایت قایم کی ہے۔

افتتاحی تقریر مشاعرہ کے آغاز سے قبل مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے ریسرچ اسکالر اسٹاف اردو جامعہ عثمانیہ نے ایک تعارفی تقریر کی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حضرات۔ اردو زبان اور ادب کی خدمت میں ادارۂ ادبیات اردو جو کچھ حصہ لے رہا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ آج کا مشاعرہ بھی اس جذبے کا ایک روشن اظہار ہے۔

آپ کو علم ہوگا کہ قدیم زمانے سے مشاعرہ ایک کھلا میدان رہا ہے جہاں نہ صرف شاعر کی تربیت ہوتی تھی بلکہ سامعین کا ذوق بھی جلا پاتا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد میں دورِ قدیم کے اس ادارے کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ ایک حیثیت سے مقام شکر بھی ہے کیونکہ جہاں ایک طرف زمین کا نصف مغربی کرہ جنگ کی آتشباریوں سے جل رہا ہے وہاں مشرق کے اس بعید گوشے میں ہم بحمداللہ فنونِ لطیفہ کی خوشگوار خدمت کرنے کے قابل ہیں۔

آج سے ادارہ ادبیات اردو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے خاص مشاعرے مقرر کرے جہاں اساتذہ اور نوخیز شاعر دونوں ایک خاص جذبہ عمل لیکر جمع ہوں اور شاعری کے ذریعے اردو ادب کی کچھ خدمت کریں۔

آج کل کے شاعروں کی نوعیت کچھ خاص ہے۔ وہ شاعر جو ادب کے جدید رجحانات سے متاثر ہیں اور ترقی پسندی کا جذبہ رکھتے ہیں ایک جوش اور جدت کے ساتھ قدیم اسلوب شعر گوئی میں کچھ تبدیلیاں کر رہے ہیں اور اپنا ایک علیحدہ محاذ قایم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مشاعرہ بھی ترقی پسندی یا تغیر پسندی کا ایک پُرجوش مظاہرہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی کا جذبہ عموماً نوجوانوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ آج کل کے نوجوان ہماری تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کی پیداوار ہیں۔ بعض مشاعرے اس قسم کے منعقد ہونے کی توقع کی جاتی ہے اور ہوتے بھی ہیں جہاں قدیم انداز کے شاعر جمع ہوں اور پرانی روایات کے مطابق بزم شعر و سخن گرم کریں۔ ان دو جدا جدا تحریکوں کے باوجود خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے قدیم دبستان کے شعرا اور بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو آہستہ آہستہ نوجوانوں کا ساتھ دینے اور ان کا ہاتھ بٹانے آمادہ ہیں۔ آج کا مشاعرہ غالباً قدیم اور

جدید ذوق کی ہم آہنگی کا آئینہ دار اور سنگم ثابت ہوگا۔

جدید شاعروں کی ایک خصوصیت ترنم سے پڑھنا ہے۔ لیکن قدیم مشاعروں کی تحت اللفظ غزلخوانی بھی اپنی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مشاعروں میں سامعین دونوں طرز کے پڑھنے والوں کی قدر افزائی کریں تو اچھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترنم شعر کے لطف میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ تحت اللفظ پڑھنے سے شعر کی خامیاں چھپ نہیں سکتیں۔ ایک علمی خیال یہ ہے کہ مشکل اور تفکری شاعری گو اعلیٰ ادب کا اہم عنصر ہوتی ہے، مگر مشاعروں کے موزوں نہیں ہوتی، کیونکہ یہاں ایک قسم کی مجموعی ذہنیت سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ مشکل ادب کو مشاعرے کے قابل بنانا خود اہل ذوق کا کام ہے۔ حیدرآباد میں ذوق شعری اگر ترقی کر رہا ہے تو ضرورت ہے کہ ہم مشاعرے میں خاص قسم کے ادبی کارناموں کو بھی توجہ سے سننے کے لیے تیار رہوں۔ آج کے مشاعرے میں توقع ہے کہ ایک طرف ہم غزل کی قدیم صنف میں اہل ذوق کی خیال آرائی سنیں گے، تو دوسری طرف نظم کے قالب میں جدید شاعر کے جذبات اور احساسات کا مطالعہ کر سکیں گے۔ چونکہ شعرا بہت ہیں اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ حضرت شعرا ایک غزل یا ایک نظم سے زیادہ سنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں گے۔

میں آخر میں ایک خوشخبری سناؤں گا، اور وہ یہ ہے کہ تغیر پسند ادب کا ساتھ دینے میں پرانے شعرا نوجوانوں سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ شاعری کی قدیم روایات کے برخلاف، جہاں بڑے بڈھوں اور اساتذہ کو آخر وقت تک بیٹھنا پڑتا تھا، آج ان کی خواہش ہے کہ وہ پہلے اپنے کلام سے ہمیں محظوظ فرمائیں۔ یہ ایک انقلابی صورت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب کے علمبردار ہمارے بزرگوں کے اس جذبے اور جوش کا زیادہ خیر مقدم کریں گے!

حضرات! حیدرآباد میں حضرت ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو " اردو کے بوڑھے " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہمارے ملک کے ہونہار فرزند اور اردو ادب کے سرگرم کارکن، ڈاکٹر زور کو ان کی حالیہ مصروفیتوں کی مبارکباد دیتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں ——

خدا ہمارے " **اردو کے نوجوان** " کو سلامت رکھے!

قرارداد تعزیت حضرت فانی

اس تقریر کے بعد باقی صاحب نے حضرت فانی کی وفات حسرت آیات پر جو قرارداد تعزیت پیش کی اور جس کو جملہ شرکائے مشاعرہ نے ایستادہ ہو کر منظور کیا وہ درج ذیل ہے:-

مشاعرے کے آغاز سے قبل ہم ہندوستان کے ممتاز شاعر حضرت فانی مرحوم کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں، جو چند روز ہوئے ہم سے جدا ہو گئے اور اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً آج زینت محفل رہتے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر حسب ذیل قرارداد تعزیت منظور فرمائیں۔

" ہم حضرت فانی مرحوم جیسے مفکر شاعر کے انتقال پرملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم نے اپنی بلند پایہ غزلوں میں زندگی کے یاس و الم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ آپ کی وفات سے اردو زبان کا ایک محسن اور بزم سخن کا ایک ممتاز رکن گم ہو گیا۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگاں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" آمین

مجلسِ ادبیاتِ اطفال یہ ادارہ کا ایک شعبہ ہے جو علحدہ شاخ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اس کی صدارت نامور فاضل سید علی بلگرامی مرحوم کی دختر نیک اختر محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ بی اے آنرز کیمبرج (بیگم نواب زین یار جنگ بہادر) صدر کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کے تفویض ہے، اور اسکے معتمد مولوی میر حسن صاحب ایم اے ہیں۔ اس مہینے بتاریخ ۱۰ر ستمبر ۱۹۴۱ء اس کا ایک اجلاس ادارہ کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں طے پایا کہ اس مجلس کی پہلی کتاب چیونٹی معتمد کے مقدمہ کے بعد شایع کر دی جائے۔

۲۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے رکن مجلس کی مصنفہ بچوں کی نظمیں ایک باتصویر مجموعہ کی شکل میں جلد شایع کی جائیں۔ مجموعہ کے نام اور نظموں کی تعداد اور تصویروں کے بارے میں مصنفہ سے مشورہ کر لیا جائے۔

۳۔ "عرب اور دنیائے اسلام" کا مسودہ ڈاکٹر زور صاحب کے سپرد کیا گیا تاکہ موصوف اس کی زبان پر نظر ثانی کر کے اس کو بچوں کے مطالعہ کے قابل بنائیں۔ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب نقوی مہتمم تعلیمات سے استدعا کی جائے کہ وہ اس کے لئے تصویروں کا انتظام فرماویں۔

۴۔ "کشمکش ثانی" از شجاع احمد صاحب قائد چار تصویروں کے ساتھ چھپوائی جائے۔

۵۔ ڈاکٹر زور صاحب سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اردو کے ایک قدیم شاعر محمد قلی قطب شاہ اور ایک جدید شاعر اقبال پر بچوں کے لئے دو جدا جدا کتابیں تحریر فرماویں تاکہ ڈسمبر تک شایع کی جاسکیں۔

۶۔ مسیح الدین خاں متین کی بچوں کی نظموں کا مجموعہ مولوی میر حسن صاحب ایم اے معتمد مجلس کو نظر ثانی کے لئے تفویض کیا گیا۔

چیونٹی مجلسِ ادبیاتِ اطفال کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی اور ادارہ ادبیات اردو کے سلسلہ مطبوعات کی نہترویں کڑی ہے جس کو ادارہ کے رفیق رائے ہمیندر راج صاحب سکسینہ ایم ایس سی نائب صدر انجمن طیلسانین عثمانیہ و استاد شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ نے بڑے سلیقہ سے تالیف کیا ہے۔ اس میں تقریباً بیس عکسی تصویریں شریک ہیں۔ کتاب کا سرورق بھی بچوں کی دلچسپی کے لئے رنگین بنایا گیا ہے۔ کتاب میں چیونٹی کی سوانح عمری، سماجی زندگی، گھریلو زندگی، عام عادتیں اور مصنوعی چیونٹی گھر بنانے کے عنوانات کے تحت بڑی مفید اور دلچسپ معلومات شامل ہیں۔

سر عقیل جنگ میڈل ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحان اردو فاضل میں اول آنے والے طالب علم کو ایک طلائی تمغہ ہر سال عطا کیا جائے گا جو نواب سر عقیل جنگ بہادر صدر المہام و نائب صدر اعظم دولتِ آصفیہ نے از راہِ علم نوازی عطا فرمایا ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا اس عظیم الشان تالیف کا کام روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس اثنا میں بعض مشاہیر نے اس کام کی نسبت جن اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے بعض کے اقتباسات یہ ہیں۔

مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ۔ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ متعدد مشاہیر نے بھی اس اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے موقر مقالوں کی تحریر کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں دوبارہ اس عظیم الشان کارنامے کی تکمیل اور ہر طرح کی کامیابی کی توقع کا اظہار کرتا ہوں۔"

مسز سروجنی نائیڈو۔ "آپ کا ادارہ اردو زبان اور ادب کی ترقی و تحفظ کے لئے جو نمایاں کام انجام دے رہا ہے اس کی مدد کرتے رہنے میں مجھے ہمیشہ دلی مسرت حاصل ہوتی رہے گی۔"

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ایم اے پروفیسر اردو اسمٰعیل کالج بمبئی تحریر فرماتے ہیں۔ "آپ نے انسائیکلوپیڈیا کا کام اپنے ذمہ لے کر اپنے لئے غیر فانی عزت اور نیک نامی کا سامان پیدا کرلیا ہے۔ اور جب تک اردو زندہ ہے اردو دنیا آپ کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ اللہ پاک آپ کو اور آپ کے رفقائے کار کو زندگی وصحت دے کہ وہ اس کو مکمل کریں۔ مہدی مرحوم کے عہد میں انسائیکلوپیڈیا کا جو تصور تھا وہ ان کے مضمون سے ظاہر ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین نے اس بات کی کوشش شروع کی تھی اور خیال تھا کہ مرحوم راجہ صاحب محمودآباد اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ دیں گے لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ اس کے بعد جب مرہٹی انسائیکلوپیڈیا شایع ہوئی اور اس کے چیف ایڈیٹر نے یہ اعلان کیا کہ اگر ہندی اردو والوں نے جلد اس کا ترجمہ نہ کیا تو وہ خود یہ کام انجام دے گا۔ لیکن اس پر بھی رگ حمیت وغیرت کو جنبش نہ ہوئی۔ البتہ سیرت سے متعلق مضمون پر بعض اعتراضات کئے گئے۔ شاید قضا وقدر کے کارکنوں کو یہ منظور تھا کہ یہ کام بھی اسی ادب نواز وعلم پرور سرزمین میں ہو جہاں کی عثمانی فیاضی کا کوئی جواب نہیں۔ اردو کی واحد جامعہ کی اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوسکتی ہے کہ اس کے اساتذہ اس کے تعلیم یافتہ نوجوان اور دوسرے ہمدرد ایک ایسے عظیم الشان کارنامے کا اس جوش وولولے۔ نظام۔ اور استقامت کے ساتھ بیڑا اٹھائیں۔ آپ کی مختلف کمیٹیوں کی جو روئداد سب رس میں چھپتی رہتی ہے وہ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ اللہ پاک اس چیز کو تکمیل تک پہنچائے۔"

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبہ فارسی واردو لکھنؤ یونیورسٹی اردو انسائیکلوپیڈیا کے لئے خواجہ حیدر علی آتش اور انیس ودبیر پر مقالے تحریر فرما رہے ہیں۔ آتش کے مقالے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم آپ کی قوت عمل میں اور اضافے فرمائے۔ اور آپ کو تا دیر زندہ وسلامت رکھے۔ آپ سے اردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اور انشاء اللہ بہت دنوں تک پہنچتا رہے گا۔"

شعبۂ زراعت و باغبانی

بتاریخ پندرہ ستمبر ۱۹۴۱ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبۂ زراعت وباغبانی کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ ڈاکٹر کالی داس سہانی ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی ناظم زراعت (تحقیقات)
۲۔ رائے مہندر بہادر بی اے۔ ایم ایس سی ناظم زراعت (تبلیغ)
۳۔ مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے سی ٹی پرنسل مددگار ناظم زراعت۔
۴۔ ڈاکٹر وحید الدین صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۵۔ ڈاکٹر میر حسین علی صاحب رضوی بی اے جی۔ پی ایچ ڈی۔
۶۔ ڈاکٹر قادر الدین خان صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۷۔ مولوی رسول سلطان صاحب ایم ایس سی۔
۸۔ مولوی عبد الحمید صاحب بی اے جی۔
۹۔ ڈاکٹر بی جی کرشنا بی ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔
۱۰۔ جناب اردشیر بہمن جی مہرجی خورشید بی اے۔ ایم ایس سی۔
۱۱۔ مولوی عاقل خاں صاحب ایل اے جی۔
۱۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
۱۳۔ سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

طے پایا کہ اسماء اور مصطلحات کی جو فہرست محکمۂ زراعت میں موجود ہے اس سے ادارہ کے مرتب کردہ کارڈز کا مقابلہ کرلیا جائے۔ اور ان کارڈوں کے مندرجہ الفاظ ومصطلحات کی ایک نقل مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب کی خدمت میں روانہ کی جائے تاکہ وہ ان دونوں فہرستوں کا مقابلہ کریں اور متعلقہ اصحاب کے مشورے اور ڈاکٹر کالی داس سہانی اور رائے مہندر بہادر ناظمائے زراعت کی نگرانی میں ایک مکمل

فہرست زراعت و باغبانی سے متعلقہ الفاظ کی تیار فرمائیں۔ اور بعجلت ممکنہ الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ کا انتخاب کر کے مطلع کریں تاکہ آیندہ کمیٹی میں ان پر مضمون لکھوانے کی نسبت عملی تصفیے کئے جائیں۔

شعبۂ قانون

بتاریخ ۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء صبح کے نو بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبہ قانون کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ جسٹس ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ایل ایل ڈی رکن ہائی کورٹ

۲۔ جسٹس رائے بشیشور ناتھ صاحب بی اے ایل ایل بی رکن جوڈیشل کمیٹی۔

۳۔ خواجہ زین العابدین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا۔

۴۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدوسی بی اے۔ ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ۔

۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔

۶۔ سید بادشاہ حسین معتمد اردو انسائیکلو پیڈیا۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ بی سی ایل۔ پی ایچ ڈی۔ اور پنڈت سری پت راؤ صاحب ایڈوکیٹ نے بذریعہ تحریر اور مولوی عبداللہ صاحب وکیل تماپوری نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت چاہی اور آیندہ اجلاس میں شرکت کا وعدہ فرمایا۔ یہ طے پایا کہ جن قانونی الفاظ کے اب تک ترجمے نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کے ترجمے اور جن اصطلاحوں کے ترجمے ہو چکے ہیں ان کی نظر ثانی کا کام راجہ بشیشور ناتھ صاحب اور عبداللہ صاحب تماپوری کے تفویض کیا جائے۔ راجہ صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے کہ کون کون سے قانونی الفاظ اردو انسائیکلو پیڈیا میں شریک کئے جائیں۔ الفاظ کے تعین کے بعد آیندہ اجلاس میں یہ طے کیا جائے گا کہ کون کون سے الفاظ پر کن اصحاب سے مضامین اور مقالے مرتب کرائے جائیں۔

شعبۂ حیوانیات

بتاریخ ۴ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا کے شعبۂ حیوانیات کی مشاورتی کمیٹی منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

۱۔ ڈاکٹر بی کے داس۔ ڈی ایس سی صدر شعبۂ حیوانیات جامعہ عثمانیہ۔

۲۔ مولوی مہدی علی صاحب ایم ایس سی استاد حیوانیات و ایڈیٹر اردو انسائیکلو پیڈیا۔

۳۔ مولوی محتشم عابدی صاحب استاد حیوانیات۔

۴۔ رائے ستیہ نارائن سنگ صاحب ایم ایس سی استاد حیوانیات۔

۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔

۶۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ معتمد اردو انسائیکلو پیڈیا۔

۷۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔

اس وقت تک شعبۂ حیوانیات سے متعلق ڈاکٹر محمد بابر مرزا صاحب ایم ایس سی پی ایچ ڈی۔ اور مولوی مہدی علی صاحب ایڈیٹران

شعبۂ حیوانیات نے اس فن سے متعلق اسماء و مصطلحات کی فہرستوں کی تکمیل کر لی ہے اور مختلف ذیلی شعبوں کے کام کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ اس کی نسبت تبادلۂ خیال کیا گیا اور معلوم ہوا کہ اس شعبہ کا کام بڑی خوبی سے انجام پا رہا ہے۔ ڈاکٹر داس صاحب نے اس کی تکمیل میں ممکنہ امداد دینے اور سرگرمی کا اظہار فرمایا۔

معتمدین شعبہ جات کی طرف سے دعوت

چونکہ ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد اعزازی عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ماہ اگست میں صدارت شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ پر فائز ہوئے اس لئے ادارہ کے معتمدین شعبہ جات نے اس ترقی کی مسرت میں بتاریخ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء ایک عشائیہ کا انتظام کیا تھا جس کے رقعے نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار و ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ نے منجانب معتمدین تقسیم فرمائے۔ اور یہ عشائیہ نواب مرزا علی حسین خاں صاحب بی اے کے مکان واقع نارائن گوڑہ روبرو والی ایم سی اے ترتیب دیا گیا تھا جس میں اکثر معاونین و رفقا و اراکین ادارہ نے شرکت فرمائی اور متعدد اصحاب اور شعبوں کی طرف سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پھول پہنائے گئے۔

اردو امتحانات کی ایک نئی درس گاہ

اردو سیکھنے کے شائقین کی سہولت کے لئے درس گاہ اردو امتحانات کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ محلہ بیدڑواڑی میں قایم کیا گیا ہے یہاں محمود احمد صاحب انصاری روزآنہ بعد مغرب اردو زبان و ادب کی مفت تعلیم دیتے اور ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات کے لئے طلبہ کو تیار کرتے ہیں۔

اردو امتحانات کے مرکزوں کی روُدادیں

اردو امتحانات کے مرکزوں کی نگرانی کے لئے جو حضرات تشریف لے گئے تھے ان میں سے چند کی روُدادوں کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔ باقی ماندہ روُدادیں آئندہ شایع کی جائیں گی۔

مرکز کلیانی

پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی تحریر فرماتے ہیں:- گزشتہ سال کی طرح امسال بھی کلیانی کا مرکز میرے سپرد تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو چہارشنبہ کے دن میں اپنی گاڑی میں حیدرآباد سے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ عبدالکریم صاحب بھی تھے جو شاخ ادارہ کلیانی کے بانی ہیں۔ ہم شام کے پانچ بجے ہمناباد پہنچے اور رات وہیں بسر کی۔ ۲۱ اگست کی صبح کو تقریباً ۸ بجے کلیانی پہنچے اور مسافر بنگلہ میں دم لیا۔ عطاء اللہ صاحب منیجر اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ہیضے کی وجہ سے ہر جگہ پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ اسی وجہ سے ادارہ کا ارادہ یہ تھا کہ اس سال کلیانی میں امتحان نہ ہو یا اگر امیدوار امتحان دینا چاہیں تو ان کو حیدرآباد یا کسی قریبی مرکز میں منتقل کر دیا جائے لیکن اہل کلیانی کا اصرار تھا کہ امتحان حسب دستور اسی جگہ ہونا چاہیے۔ اس لئے وہیں امتحان کا انتظام کیا گیا اور مجھے عالم مجبوری میں جانا پڑا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ حالات امتحان کے متقاضی نہ تھے۔ امیدوار ان کے سرپرست اور نگران کار بہت پریشان تھے۔ بہت سے امیدوار غیر حاضر تھے۔ اور اکثر اہل کلیانی اور نگران کار دیکھتے دیکھتے ہیضے میں مبتلا ہو گئے جن کا جان بر ہونا دشوار تھا۔

جہاں تو ں ۲۱ اگست کو امتحان لیا گیا۔ اردو دانی کے جو امیدوار حاضر تھے انھوں نے صبح کو تحریری امتحان دیا اور دوپہر کو زبانی امتحان کی تکمیل کی گئی۔ اس کے ساتھ اردو عالم کے بھی دو پرچے ہو گئے۔ امتحان سے فارغ ہو کر میں حفظ ما تقدم کی خاطر ستاپور میں جا کر ٹھیرا جو کلیانی سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۲۲ اگست کو جمعہ تھا۔ اور وقت نامے کے بموجب ڈھائی بجے سے امتحان تھا۔ ستاپور رستے میں ایک بجے کے قریب

کلیانی آیا۔ اور وقت پر اردو عالم کا پرچہ دیا گیا اور امتحان ختم کر کے ہم بستا پور پہنچ گیا۔ بنگلہ پہنچنے کے بعد مجھے پیٹ میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی اور مقامی لوگوں کے مشورے سے میرا بلدہ فوراً آنا ضروری سمجھا گیا۔ ۲۳ اگست کے دو پرچے جو اردو عالم سے متعلق تھے۔ مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کلیانی کے سپرد کر کے میں تقریباً ۸ بجے شب کے راہی بلدہ ہوا۔ دوسرے روز ۲۳ اگست شنبہ کو احمد حسین صاحب نے امتحان کی تکمیل کر دی اور سر بمہر جوابی بیاضیں میرے ہاں روانہ کر دیں جو ہر طرح قابل اطمینان تھیں۔ موصوف شاخ ادارہ کے صدر ہیں اور مقامی عہدہ دار اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے ہر طرح قابل اعتماد ہیں اور مجھ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور اسی اطمینان کی وجہ سے میں بلدہ واپس آگیا۔ موصوف ادارہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ موصوف کی سرپرستی میں شاخ ادارہ کلیانی بہت سرسبز ہوگی حسب ذیل حضرات نے امتحان کی نگرانی کی۔

معلمہ ہمتا عبدالکریم صاحب، قاضی الدین صاحب، عطاء اللہ صاحب، محمد بیگ صاحب، شیخ صالح صاحب، ترل راؤ صاحب۔

مرکز پربھنی مولوی سید بادشاہ حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔ مدرسہ فوقانیہ پربھنی میں امتحانات کا مرکز رہا۔ دو کمرے مردوں کے لئے اور دو کمرے زنانہ کے لئے مخصوص کئے گئے۔ معقول انتظامات کی وجہ سے امتحانات میں بڑی سہولت ہوئی۔

زنانہ ہال میں حسب ذیل خواتین نے نگرانی کی۔

۱۔ رحیم النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ نسوان اردو تحتانیہ پربھنی۔ سوشیلا دیوی صاحبہ صدر معلمہ نسوان تحتانیہ مرہٹی پربھنی۔ جمال بی صاحبہ صدر معلمہ نسواں اردو تحتانیہ محلہ مومن پورہ پربھنی۔ اور حسب ذیل اصحاب نے مردانہ ہال کی نگرانی میں میرا ہاتھ بٹایا۔

محمد قاسم صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ سید امیرالدین صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ شیخ عبدالقادر صاحب مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ مسٹر مانک راؤ مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔ مسٹر رینکا داس مدرس مدرسہ فوقانیہ پربھنی۔

ان کے سوا معتمد صاحب شاخ بھی پورے امتحانات میں صبح سے شام تک برابر موجود رہے جس سے انتظامات میں سہولت ہوئی۔ اس ضمن میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ کی جانب سے متذکرۂ بالا خواتین و حضرات کا نگرانی امتحانات کے لئے شکریہ ادا کیا جائے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر صدر مدرس صاحب (ابرار حسین صاحب) کا بھی شکریہ ادا کیا جائے۔ انھوں نے مدرسہ کے کمروں کے استعمال کی اجازت دی گو کہ وہ خود مستقر پر موجود نہ تھے۔

پربھنی کی شاخ کھلے میدان میں ایک موزوں عمارت میں قائم ہے معتمد صاحب شاخ کی کوشش اور مہتمم صاحب آبکاری کی توجہ سے یہ عمارت شاخ کو مل سکی۔ خاصا اچھا مطالعہ گھر ہے۔ روزنامے، ہفتہ وار اور ماہوار جرائد آتے ہیں اور روزانہ کافی تعداد میں لوگ مطالعہ کرتے ہیں۔ انتظام بہت اچھا اور ہر چیز سلیقہ سے رکھی گئی ہے۔ ادارہ کی اکثر و بیشتر اور اردو کے دوسرے مصنفین کی تصاویر یہاں آویزاں ہیں اور امتحانات کے زمانہ میں طلبارات میں بڑی دیر تک یہیں مطالعہ کیا کرتے ہیں کیونکہ روشنی کا معقول انتظام ہے۔ مقامی عہدہ دار بھی ادارہ کی اس شاخ اور امتحانات سے واقف ہو گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس شاخ کو کامیاب بنانے میں معتمد صاحب شاخ کی پرخلوص کوششوں اور مہتمم صاحب آبکاری کی مخلصانہ دلچسپیوں کو بڑا دخل ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۴
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۴ — بابت نومبر ۱۹۴۱ء — شمارہ ۱۱

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

گارساں دتاسی

(اردو کا پہلا پروفیسر)

ذیل کا مضمون ڈاکٹر زورصاحب کی زیر طبع کتاب کا ایک حصہ ہے۔ (مدیر)

گارساں دتاسی صحیح معنوں میں اردو کا پروفیسر تھا۔ اس نے اس زبان کی بہی خواہی کا ہر وہ کام کیا جو ایک مخلص پروفیسر کو کرنا چاہئیے۔ نہ صرف اپنے طلبہ میں اردو کا ذوق پیدا کیا، بلکہ ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ مختلف مقامات میں اردو کی درسگاہیں اور اردو کی پروفیسری قائم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اردو کا ذوق پیدا ہو۔ لندن اور انگلستان کی دوسری قدیم یونیورسٹیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے ۲ فروری سنہ ۱۸۶۱ء کے خطبے میں اس امر پر زور دیا کہ آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور امریکہ میں بھی اردو کی پروفیسری قایم ہونی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"انگلستان کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں لندن میں اردو زبان کی تعلیم کو ناگزیر سمجھ کر رائج کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈبلن یونیورسٹی، اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹیوں، اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی طرف جلد توجہ کی جائے گی"۔

اسی طرح اس نے اس امر کی بھی تحریک کی کہ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں کو بھی اردو پڑھانے کے لئے مقرر کرنا چاہیے تاکہ انگریز صحیح اردو، تلفظ اور لب و لہجہ سے واقف ہوجائیں۔ اس نے کہا:۔

"بہتر ہوگا اگر کیمبرج یا اکسفورڈ میں کہیں ایک ایسا پروفیسر رکھا جائے جو اردو کا صحیح تلفظ اور تحریر و تقریر کی مشق کرائے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں (پیرس کے مدرسۃ السنہ میں) ایک زمانے میں دتاسی کے ساتھ مصری فاضل رفائل مونا شس اہل زبان ہونے کی حیثیت سے عربی کا تلفظ وغیرہ سکھاتے تھے"۔ (تقریر، ۲ فروری سنہ ۱۸۶۱ء)

دتاسی نے یورپ اور خاص کر انگلستان کے ان کتب خانوں اور ان کے نگران کاروں کا بھی موقع بہ موقع ذکر کیا ہے جہاں اردو کتابیں اور قلمی نسخے محفوظ کئے جارہے تھے۔ وہ ہر ایسی خبر سے خوش ہوتا تھا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اردو سے ہوتا۔ اردو کتابوں کی اشاعت اور اخباروں کے اجرا کی جو اطلاع اسے ہندستان سے ملتی اس کی خوشی میں اضافہ کا باعث ہتی۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہر اس انگریز کے لئے اردو پڑھنا لازمی کردیا گیا ہے جو فوجی ملازمت کے لئے ہندوستان جانا چاہتا ہے تو دتاسی کو بے حد مسرت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے ۲ فروری سنہ ۱۸۶۱ء کے خطبے میں بڑی خوشی سے اس کا اعلان کیا کہ:۔

"یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ آیندہ سے ان انگریزوں کے لئے جو ہندوستانی افواج میں نوکری کرنا چاہتے ہیں یہ لازمی قرار پایا ہے کہ اردو کے تین اقتباسات کا جن سے پہلے سے وہ واقف نہیں، انگریزی زبان میں ترجمہ کریں اس کے ساتھ ہی انھیں نظم و نسق کے متعلق کسی عبارت کا اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو، اور ہندی میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ایسا ہونا چاہئیے کہ ہندوستانی آدمی بھی اس کی عبارت کا مفہوم سمجھ سکے۔ اس امتحان میں کسی ایک انگریزی خط کا اردو میں فی البدیہہ مطلب بھی دریافت کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی امتحاناً ہندوستانیوں کے ساتھ اردو زبان میں گفتگو کرائی جاتی ہے"۔

اسی طرح ۱۸۶۱ء میں جب دتاسی کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ مقامی عدالتیں قایم کی جا رہی ہیں تو اس نے انگریزوں کو توجہ دلائی کہ وہ قانون پڑھ کر ہندستان جائیں ۔ وکالت اور بیرسٹری کے ذریعہ سے قسمت آزمائی کریں لیکن اس ترغیب میں بھی اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ اردو، لکھنا پڑھنا سیکھیں چنانچہ ساتھ ہی بڑی خوبی کے ساتھ اس کی بھی تبلیغ کر دی۔ وہ کہتا ہے :-

"ہندوستان میں آج کل مقامی عدالتیں ہر جگہ قایم ہو رہی ہیں۔ ان نوجوان انگریزوں کے لئے جن کی اپنے وطن میں قدر نہیں یہ موقع ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائیں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ہندستان جانے کا ارادہ کریں یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ دیسی لوگوں کی زبان کو مطالعہ کے ذریعے سیکھ لیں انہیں ہندستانی لوگوں کے ان محاوروں کو جاننا چاہئے جو ہر وقت گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں۔"

۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء کو جب انڈین میل میں سید عبداللہ پروفیسر اردو، لندن یونیورسٹی نے سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford Northcote) کے نام ایک خط شایع کیا کہ "آیندہ سے حکومتِ ہند سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں ہندوستان کی بعض مروجہ اور زندہ زبانوں کو لازمی قرار دے"۔ تو گارساں دتاسی نے اس کی پُر زور تائید کی اور سنسکرت اور عربی کے مقابلہ میں اردو، جاننے کے جو عملی فوائد ہیں ان کو واضح کیا۔ اس نے اپنی ۲ دسمبر ۱۸۶۸ء کی تقریر میں کہا کہ "میں سید عبداللہ کے اس خط کے مضمون کے ساتھ بالکل متفق ہوں" اور اس کے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تائید کرتا ہے کہ :-

"سید عبداللہ نے اپنے اس خط میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سول سروس کے ہر امیدوار کے لئے یہ لازمی قرار دینا چاہئے کہ وہ ملکی زبان میں پوری دسترس حاصل کرے۔ شکستہ تحریر بآسانی پڑھ سکے۔ اور اس زبان سے انگریزی میں اور انگریزی سے اس زبان میں بخوبی ترجمہ کر سکے۔ دراصل یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں۔ چنانچہ نظمائے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہیلی بری کالج کے طلبہ کے لئے انھیں لازمی قرار دیا تھا"

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے اس قسم کے مباحث کے فوائد اور حکومت کو متوجہ کرتے رہنے کی ضرورت، جس طریقہ سے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گارساں دتاسی اردو، کے حقوق کی حفاظت اور اس کی تائید کے لئے کس شدت کے ساتھ کمربستہ رہتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"حکومت کو اس جانب توجہ دلاتے رہنا مفید ہے...... اس واسطے کہ ہندستانی ہی ملک کی مشترک زبان ہے اور جیسا کہ میں بارہا پہلے بتا چکا ہوں اہلِ ہند کا ایک بڑا اور اہم طبقہ اس کے ذریعے اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اور ملک کے طول و عرض میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے ملتے ہیں۔ ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کو جو حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس زبان کا سیکھنا ازبس ضروری ہے"

گارساں دتاسی اردو، اور ہندی دونوں کا یکساں ماہر تھا۔ اس نے ابتدا ہی سے دونوں زبانوں سے متعلق کتابیں لکھیں۔ لیکن ان دونوں میں وہ اردو، کو ترجیح دیتا تھا اور انگریزوں کے اس رجحان کی مخالفت کرتا تھا جو ہندی کو اردو، کے مقابلے میں لا کھڑا کرنے کے لئے روز بروز شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی اکثر تقریروں میں اس رجحان کی مذمت کی۔ تقریباً پچاس سال کے تجربہ اور اردو، اور ہندی دونوں کی تعلیم و تعلم نے

اس کو اپنے ایقان میں پختہ بنادیا تھا۔

چنانچہ وہ کسی مسئلہ میں اس شدت اور آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتا تھا جتنا کہ اردو کی تائید کے لئے کرتا۔ اس کی آخری تقریروں سے ایک (۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء) میں اس نے اردو، ہندی جھگڑے کے ذکر میں علی الاعلان کہا کہ:۔

"اردو، نے ہندستان میں جو حیثیت قایم کرلی ہے وہ باقی رہے گی۔ وہ اگر چاہیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انھیں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ اس واسطے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں صدیوں سے جو الفاظ عام زبان پر چڑھ گئے ہیں وہ آسانی سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔ ان کی کوشش بالکل ایسی ہوگی جیسے انگریزی فضلاء یہ فیصلہ کریں کہ ان کی قوم ان فرانسیسی الفاظ کا استعمال ترک کردے جو انگریزی زبان میں نارمن فتوحات کے بعد گھل مِل گئے ہیں"

اس بحث پر بطور نوٹ کے گارساں دتاسی لکھتا ہے کہ" ، رمئی ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو میں میری ناچیز رائے سے موافقت کا اظہار کیا گیا ہے جو میں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے اس جلسہ کے متعلق ظاہر کی تھی جس میں اس پر بحث ہوئی تھی کہ آیا اردو، کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا ہندی کو اس ریویو نے لکھا ہے کہ:۔

" موسیو گارساں دتاسی نے اردو، کی حمایت میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ ہمیں ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔"

۴ر جولائی ۱۸۶۹ء کے "بمبئی پولا" میں میرے خیالات کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے۔" اس مذکورۂ بالا تقریر کے سلسلہ میں گارساں دتاسی نے کہا:۔

"میں اور مسٹر بیمز (M. Beams) اردو، کی حمایت میں تنہا نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ہم نہ اس کے قایل ہیں کہ عربی، فارسی الفاظ اردو، میں سے خارج کردئے جائیں اور نہ ہم ہندی کو بے وجہ اردو، پر فوقیت دینا مناسب سمجھتے ہیں۔"

اس تقریر سے دو سال قبل ۴ر دسمبر ۱۸۶۷ء کا افتتاحی خطبہ شروع کرتے ہی اس نے اردو، ہندی جھگڑے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ:۔

"بہر نہج لوگوں کا خیال ہندستانی کی نسبت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ روز بروز اس کی جو ترقی ہورہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جاسکتی ہے۔ اس مسئلہ کی نسبت کپتان ایچ مور (H. Moore) نے اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا ہے۔ موصوف مرکزی حکومت میں ترجمان کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

" اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرونِ ملک میں ہزار میل کی مسافت پر پھیل گئی ہے اور بھی ہندستان اور وسطِ ایشیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے میں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ ہندستانی زبان اس مقصد کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی اور عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔"

غرض کپتان مور کے خیالات بیان کرنے کے بعد دتاسی نے اس بحث کی وضاحت کی ہے اور آخر میں پھر اسی موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

جس کو وہ اپنا چہیتا موضوع کہتا ہے ۔

" میں اب اپنے چہیتے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں یعنی اردو کی ہندوستان میں اہمیت "

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کا کتنا دلدادہ تھا۔

دتاسی نے آج سے ستر سال قبل ہندستان کے اردو ہندی جھگڑے کی نسبت جو صحیح اندازہ قایم کیا تھا وہ آج کل کے بڑے بڑے حامیانِ اردو کے لئے سبق آموز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض اصحاب نے اس جھگڑے کی علمبرداری کرکے جو شہرت اور اہل اردو کی جو ہمدردیاں حاصل کی ہیں وہ گارساں دتاسی ہی کی ان تحریروں کے مطالعے اور اس کے دلائل کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ عہد حاضر کا اردو کا بڑے سے بڑا سیاس و مدبر بھی دتاسی ہی کا خوشہ چیں ہے۔ وہ اردو کی تائید میں ایسی مدلل، ثقہ اور وزنی تحریریں لکھ گیا ہے جو ہمیشہ اردو کی تائید اور مدافعت کرنے والوں کا مضبوط حربہ ثابت ہوں گی۔ اس نے اپنے ۴ر دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبہ میں کہا تھا۔

" یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح آج کل یورپ میں ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ پھر سے ازمنۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ...... ہندوستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کی ادبیات کو قدر اور احترام کے ساتھ دیکھا جارہا ہے۔ اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے چونکہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کی بجائے ہندی کو فروغ دیا جائے۔ حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ ہے۔ لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندستان کی زبان ہے اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں (فارسی و عربی) اسلامی مشرق کی قابل احترام السنہ ہیں اور دنیا کے تمام علما و فضلا ان دونوں کو ہمیشہ سے اسی نظر سے دیکھتے آئے ہیں "

اس کے بعد دتاسی نے اہل اردو اور اہل ہندی کے دلائل کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور آخر میں برطانوی حکومت کی حمایت ہندی کی اس طرح تشریح کرتا ہے :-

" برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہوجائیں گے اور چونکہ ہندستان کی آبادی کی کثرت انہی پر مشتمل ہے اس لئے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے "

ہندی کی تائید میں انگریزی اخبارات میں جو اداریئے اور مقالے شایع ہوتے تھے ان کا ذکر کرکے دتاسی نے ان کی مخالفت کی ہے اور کہتا ہے کہ۔

" میرے خیال میں اس مقالہ میں ہندی کی تائید میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں اور جو دعوے پیش کئے گئے ہیں ان پر بحث کی جاسکتی ہے لیکن اس جگہ میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس مقالے میں اردو کے متعلق کم از کم یہ تو تسلیم کیا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل کرلی ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے۔ عدالتوں اور شہروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ مصنفین اپنی کتابیں اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اسی کی غزلیں گائی جاتی ہیں اردو کے ذریعے اہل ہند یوروپین لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ غرض کہ اگر ان تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے تو اردو

کو ہندی پر فضیلت حاصل رہتی ہے جسے تسلیم کئے بغیر چارا نہیں۔"

غرض اسی طرح اردو کی موافقت میں دتا سی نے طویل بحثیں کی ہیں جو اس خطبے کے کئی صفحات پر مشتمل ہیں اور دوسری تقریروں میں بھی جگہ جگہ اس قسم کی بحثیں اور دلیلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ چونکہ اس کے خطبات کے اردو تراجم شایع ہو چکے ہیں اس لئے یہاں مزید مثالوں کی ضرورت نہیں۔

سید محی الدین قادری زور

لا قوۃ الا باللہ

کسی پردے یا اوٹ کے پیچھے سے اگر کبھی کوئی لکڑی نمودار ہو کر ہم کو مارے۔
اور لکڑی کے سوا دوسری کوئی چیز نظر ہی نہ آئے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ

ہم کو لکڑی نے مارا

(۲) اس کے بعد اگر صرف کوئی ہاتھ نمودار ہو کر ہم کو لکڑی سے مارے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ "ہم کو ہاتھ نے مارا"

(۳) اس کے بعد اگر کوئی شخص یا ذات برآمد ہو کر ہم کو لکڑی سے مارے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ ہم کو "فلاں شخص نے مارا"

ان تینوں صورتوں میں ضرب کا صدور تو لکڑی ہی سے ہوا ہے لیکن صورت اوّل میں

ضرب کا فاعل لکڑی کو ٹھرایا ہے،

صورت دوم میں ہاتھ کو فاعل ٹھرایا ہے۔

صورت سوم میں ذات یا شخص کو فاعل ٹھرایا ہے۔ ھذا مبلغھم من العلم

رُباعی

برہان و دلیل سب معطل ہو جائیں — جتنے جھگڑے ہیں دم میں فیصل ہو جائیں

ہر چند بہت سوال لاینحل ہیں — تم سامنے آجاؤ تو سب حل ہو جائیں

امجد حیدرآبادی

غزل

تم کو سوجھی ہے دل لگی کیسی
میرے رونے پہ یہ ہنسی کیسی

جان پر بن گئی محبت میں
موت ہے! موت! عاشقی کیسی

رس بھری آنکھ تیری اے ساقی
مست کردے گی بے خودی کیسی

گلشنِ حسن ہے چمن کیسا
دہنِ تنگ ہے کلی کیسی

عقدہ قسمت کا کھل نہیں سکتا
یہ گرہ تم نے ڈال دی کیسی

پی لیا ڈگ ڈگا کے ساغرِ مے
میکشوں کی ہے میکشی کیسی

چھا گیا حسن تم پہ یہ کیسا
آگئی تم میں نازکی کیسی

میرے ہی واسطے مرے ساقی
یہ بخالت یہ جز رسی کیسی

جگمگاتی ہیں آج تک آنکھیں
برقِ نورِ جمال تھی کیسی

طالبِ دید ہو اگر موسیٰ
ہوش میں آؤ بے خودی کیسی

کھل گیا غنچۂ مرادِ عزیز
یہ ہوا آج چل گئی کیسی

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

یاس

"سوچتی کیا ہو شہناز۔ دو ایک روز سے میں تمہیں کھوئی کھوئی سی دیکھ رہی ہوں۔" صالحہ نے شہناز کے گلے میں محبت سے اپنی باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں ـــــ چند حسین تصورات ہیں۔" شہناز نے جواب دیا۔

"حسین تصورات؟" صالحہ متعجب ہوگئی۔ "کیوں خیر تو ہے؟ کیسے تصورات؟ کاہے کے تصورات؟"

"ایسے تصورات صالحہ جن کی ابتدا مسرت آمیز رہی لیکن انتہا نہایت رقت انگیز اور المناک۔"

"تمھیں ہو کیا گیا ہے شہناز؟ ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کرتی ہو؟ ـــــ معلوم ہوتا ہے زندگی سے بیزار آگئی ہو۔" صالحہ ہنس کر بولی۔

"ہاں کچھ یوں ہی ہے بہن صالحہ! اگر زندگی صرف سانس کی آمد و شد کا نام ہے۔ حیات انسانی اگر کسی بڑی قوت کا کھیل ہے تو پھر خیر سے میں یہ دعا کروں گی کہ یہی ساعت میری زندگی کی آخری ساعت ہوجائے اور اسی وقت میں بقید مرگ ہوجاؤں ـــــ زندگی کے ستم اب مجھ سے اٹھائے نہیں جاتے۔"

"آج کیا بات ہے۔ میں نے اس سے پہلے تو تمھیں کبھی اس قسم کی باتیں کرتے سنا نہیں ـــــ ماجرا کیا ہے۔ کچھ کہو گی بھی" صالحہ نے شہناز کے سرخ گالوں کو چوما۔

"اونھ۔ ماجرا" شہناز نے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو گھورتے ہوئے کہا "کہا نا کہ بس زندگی سے اکتا گئی ہوں ـــــ اچھا چلو۔ تھوڑی دیر پائیں باغ میں تفریح کرلیں ـــــ نرم ہوائیں دماغ کو کچھ سکون تو پہنچائیں گی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی ہی تھی کہ صالحہ نے پکڑ کر اسے پھر سے کرسی پر بٹھا دیا۔

"میری جان کی قسم" اس نے ٹھیٹ نسوانی انداز میں کہا "تمہیں آزردہ دیکھ کر میرا دل نہیں کہتا کہ تفریح کروں۔ دل تڑپ رہا ہے کہ تسلی بخش گفتگو سے تمھارا دل بہلاؤں۔ اچھا کیا تم نے کسی سے محبت ......"

"تم نے مجھے پھر سے ایک عجیب کشمکش میں ڈال دیا" شہناز نے جواب دیا "خدا کے لئے یہ باتیں چھوڑو۔ کہیں پھر پرانے جذبات عود نہ کر آئیں۔ اور پھر گزرے ہوئے واقعات کی تجدید نہ ہو جائے۔ تمھاری قسم! ذرا مجھے پائیں باغ میں چلی جانے دو۔"

"سمجھ گئی" صالحہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو خیر تم نہ کہو ـــــ مگر یاد رکھو ـــــ نہ مانوگے تو مٹ جاؤگے"

"اور پھر مٹنے ہی اس لئے ہیں" شہناز نے گویا عالم ناامیدی میں کہا "حزن و یاس ہماری سرشت ہی میں لکھے ہیں ـــــ اری تم کیا آئی ہو منانے"

"اچھی بہن شہناز" صالحہ نے شہناز کی پیشانی چومتے ہوئے کہا "اس سے غیریت جسے تم اپنا جانتی ہو۔ اس سے پردہ جس پر تم نے کبھی بے اعتمادی کا گمان تک نہیں کیا۔ اس سے حجاب جس کی رفاقت پر تمھیں ناز ہے ـــــ"

"درد بھرے نالے سن کر کیا کروگی صالحہ"

"تمھارے دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔ اور میں کر ہی کیا سکتی ہوں ـــــ یہ لو ننھی اری تو کدھر آنکلی۔"

"امی آپ کو بلاتی ہیں" ننھی نے اپنی گڑیا سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اچھا چل میں ابھی آتی ہوں" صالحہ نے جواب دیا ـــــ ننھی دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر ہوگئی۔ شہناز۔ آسمان پر چھائے ہوئے نیلے بادل فضا میں ایک عجیب کدورت پیدا کردیتے ہیں اور جب تک برس نہ جائیں فضا صاف نہیں ہوتی ـــــ میں کہتی ہوں کہ طبیعت کو ہلکان کرنے کا ایک طریقہ صرف یہی ہے کہ جتنا

ہو سکتا ہے تم رو ڈالو ۔۔۔۔'

'اچھی صالحہ!' شہناز کی آنکھوں سے دو گرم آنسو نکل کر
اس کے گالوں پر بہنے لگے دنیا میں اگر کوئی میرا ہوتا! باپ کو تو
مرے خیر برسوں گزر گئے۔ اگر ماں بھی جی جاتیں تو میں اس
جانکاہ صدمے کو ان کی خدمت میں لگ کر بھلا دیتی۔
بھائیوں بہنوں سے تو خدا نے محروم ہی رکھا۔ اب وہ جو خالہ زاد
بھائی بہنیں ہیں تو انھیں مجھ سے کیا دلچسپی۔ میں تو ان کے لئے عذاب
جان ہوں' ایک بلائے ناگہانی ہوں ۔۔۔۔ تمھیں اب لے دے کے
میری رہ گئی ہو ۔۔۔۔ بتاؤ صالحہ ابدی حیات حاصل کرنے کا کوئی
ذریعہ ۔۔۔۔ موت کو دعوت دینے کی کوئی ترکیب ۔۔۔۔ اس دنیا
میں کتوں کی سی زندگی گزارنے سے فائدہ ۔۔۔۔ جسے اپنا سمجھ کر
دل دیا تھا۔ وہ بھی بے وفا نکلا ۔۔۔۔' صالحہ نے شہناز کے ساتھ
ٹپ ٹپ آنسو بہائے ۔۔۔۔ "میرے ماں باپ تھوڑی بہت پونجی
نہ چھوڑتے تو شاید بی اے کا امتحان دینے کے لئے میں کبھی لاہور
کی صورت بھی نہ دیکھتی ۔۔۔۔ صالحہ پیاری۔ شدت غم مجھے کھائے
جاتا ہے۔ اپنی داستان میں نے آج تک کسی کے آگے بیان نہیں کی۔
لیکن تم مجھے مجبور کرتی ہو تو لو سنو۔ لیکن جانو! میں اسے کسی افسانے
کی صورت بیان کروں گی اور نہ ۔۔۔۔۔۔ ہاں ۔ صنوبر کے درخت
جب ہوا کے تھپیڑوں سے جھومنے لگتے ہیں تو ان کے ان جھونکوں
سے ایک عجیب رومانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر سانس
پوشیدہ خواہشوں کو عمل کا جامہ پہنانے کا متمنی ہوتا ہے۔ رعنائی
انگڑائیاں لیتی ہے' دل مچلتا ہے ۔۔۔۔ حسن تڑپتا ہے۔
عشق کروٹیں بدلتا ہے ۔۔۔۔ زندگی کی وہ حسین شام ۔۔۔۔
آہ میں کبھی بھول نہیں سکتی ۔۔۔۔ تمناؤں کی وہ بے چینی
۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی ۔۔۔۔ اور پھر دل کو ایک سکون
۔۔۔۔ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی ۔۔۔۔ صنوبر کے سایوں
میں میرے دل کے ارمانوں کی تڑپ ۔۔۔۔ کیسے حسین دن تھے
وہ بھی' محبت بھرے ارمان بھرے۔ "ذرا" میں نے شام کی
ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ایک سائے کو روکتے ہوئے کہا۔
"ذرا ادھر دیکھئے" میرا دل بیٹھ گیا سائے نے پلٹ کر جواب دیا
'معافی چاہتا ہوں۔ شاید آپ کو دھوکا ہوا ہو خاتون ۔۔۔۔ میرے
رب! ۔۔۔۔' معافی کی خواستگار ہوں' میں نے لجاجت سے
اپنی ساری کی کور کو سلجھتے ہوئے کہا۔ 'مجھ سے غلطی ہوگئی' نیلے
آسمان! 'اوہ شہناز' سایہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اور ایک تعجب
خیز مسکراہٹ سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالا 'تم نے مجھے
شاید ارشد سمجھا ۔۔۔۔ ایں'

"ہاں ۔۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔۔ بہرحال آپ مجھے معاف کریں'
میں نے سائے سے التجا کی" میں نے جسارت سے کام لیا۔
'ان کتابوں کی قسم' سائے نے اپنی کتابیں میری طرف
بڑھائیں 'تم سے ایسی کونسی غلطی ہوگئی جو معافی مانگتی ہو۔'
'غلطی! ۔۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔۔ فاش غلطی ۔۔۔۔ کر دیجئے
نا معاف'

"تمھاری بھی خواہش ہے تو پھر لو معاف کیا ۔۔۔۔ ارشد
کو ڈھونڈھ رہی تھیں ؟ ۔۔۔۔'
'نہیں تو' میں نے جواب دیا۔ میں ارشد کو نہیں ڈھونڈھ
رہی تھی ۔۔۔۔ صنوبر کے سایوں میں زندگی کے لطیف جذبات کو
ابھار رہی تھی ۔۔۔۔ خیالات میں بلند پروازی پیدا کر رہی
تھی۔ دل کی دبی ہوئی چنگاریوں کو سرے سے مشتعل کرنے کی
سعی کر رہی تھی ۔۔۔۔ کہیں یہ سعی کچھ ناکام ہی رہتی نظر آتی
ہے ۔۔۔۔ اوہ معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے یکایک اتنی کھل
گئی ۔۔۔۔ پہلی ہی گستاخی کیا کم تھی جو میں نے ۔۔۔۔' زندگی بھر
میں پہلی بار آج ایسی میٹھی میٹھی باتیں سننے کا موقع ملا ۔۔۔۔

اور تم کہتی ہو کہ یہ گستاخی ہے، غلطی ہے، گناہ ہے ـــــ اگر گناہ بھی ہے تو مقدس، گستاخی بھی ہے تو پاکیزہ، غلطی ہے تو قابل فراموش ـــــ سایہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک نامعلوم خیال کے تحت تیز ہوتی جارہی تھی ـــــ میرے مالک!۔

'شہناز ـــــ' ایک دبی ہوئی آواز فضاء میں گونجی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غیر ارادی طور پر اپنے بڑے بڑے ہاتھ میرے برہنہ بازوؤں پر رکھ دئیے ـــــ ایک پھریری سی میرے جسم نے محسوس کی ـــــ میں بدستور اپنی آسمانی رنگ کی کور کو مسل رہی تھی ـــــ ؎

گونجتے ہیں شباب کے نغمے
مستیٔ بے حساب کے نغمے

افق مغرب پر سورج کی سرخ ٹکیہ پیام وداع دے رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے دل اور دماغ میں ایک تازگی سی پیدا کر رہے تھے۔ اور سائے ڈھل رہے تھے! او خدا کیا دل کو موہ لینے والا منظر تھا ـــــ صنوبر کے درخت اسی نزاکت کے ساتھ جھول رہے تھے۔

'کیسی حسین شام ہے ـــــ' اظہر نے فرحت بخش ہواؤں کے نرم تھپیڑوں سے متاثر ہو کر کہا ـــــ

"حسین ترین" میں نے جواب دیا ـــــ اور میری نظریں خود بخود اٹھ گئیں ـــــ دوچار ہوئیں ـــــ ایک عالم مدہوشی تھا ـــــ ایک حسن پوشیدہ بے نقاب ہو رہا تھا ـــــ اور پھر یکایک دونوں کی نظریں جھک گئیں ـــــ ع

نیچی نظروں میں کیا نہیں ہوتا ـــــ
اس دل کے تصدق جو محبت سے بھرا ہو
اس درد کے صدقے جو ادھر بھی ادھر بھی

زندگی کا ساز چھڑ گیا۔ دل کی وادیوں میں مسرت کے نغمے گونجنے لگے۔ اور ناامیدیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا انبساط اور خوشی کی روشنی میں تبدیل ہونے لگا ـــــ رباب حیات کا تار تار والہانہ انداز میں کرشمے دکھا رہا تھا ـــــ آہ کتنی مسرت زا شام ـــــ 'شہناز ـــــ' اظہر کہنے لگا ـــــ ذرا رک رک کر '.... پیاری .... شہناز ـــــ محبت کے گرم سانس اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ محبت لافانی ہے۔ انسانی حیات کی ہر خزاں رسیدہ شام محبت ہی کی بدولت صبح بہاراں میں بدلتی ہے ـــــ محبت ہی راجا ہے اور محبت ہی پرجا ـــــ محبت ہی کی کڑی خالق و مخلوق کو ایک دوسرے سے قریب تر کرتی ہے ـــــ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو دلوں کو گرماتا ہے۔ خالق عالم نے اگر محبت کی تخلیق نہ کی ہوتی تو حیات انسانی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی تو محض بے کار ـــــ ایک سوکھے ہوئے تالاب کی طرح بے سود۔ پت جھڑ درختوں کی طرح بے فائدہ ـــــ یہ صنوبر کے درخت جو مستانہ وار جھوم رہے ہیں محض ایک چنگاری سے مشتعل ہو کر ـــــ وہ محبت کی چنگاری ہے' اپنے خالق کی محبت! کائنات کا ذرہ ذرہ خود میں ایک وسعت لئے ہوئے؛ ساقی عالم کی محبت میں سرشار ہے ـــــ کہو شہناز ـــــ کیا تم اپنے دل کو اس نعمت غیر مترقبہ سے مملو نہیں پاتیں ـــــ' کیا تم میں محبت کا خیال کروٹیں نہیں لیتا ـــــ کیا تمہارا دل محبت کی غیر فنائیت سے متاثر نہیں ؟'

'اظہر ـــــ تم میرے دل کی خوابیدہ جذبات کو جگا رہے ہو ـــــ مجھے ایک ایسی غیر فانی دنیا میں گھسیٹ رہے ہو جہاں کا ذرہ ذرہ محبت ہی کے نشے میں چور ہے جہاں زندگی کی ساعتیں محبت ہی کے حسین آغوش میں کٹتی ہیں ـــــ جہاں حسن ہے، محبت ہے، عشق ہے اور پھر دل ہیں ـــــ عشق کی

گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے، محبت کی منور شعاؤں سے روشن ــــ حسن کی نگاہوں کے گھائل ــــ ہاں اظہر آج کی شام نہایت حسین ہے ــــ اتنی حسین جتنے ــــ" محبت کا ایک دھندلا تصور مجھے اظہر کے قریب ڈھکیل رہا تھا۔

" ہاں تم روشن ضمیر ہو شہناز، اظہر کے خوبصورت ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ ــــ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے کا وہ دن مجھے اب تک یاد ہے جب تم نے اپنے تیر نظر سے مجھے محبت کے دیوتا کی دنیا میں لا بسایا تھا۔ مجھے وہ دن اب تک یاد ہے جب تم پہلی مرتبہ ہمارا کرکٹ میاچ دیکھنے آئی تھیں ــــ اُف کیسا دن تھا وہ بھی ــــ آسمان پر بادل چھائے ہوئے۔ ہلکی ہلکی پھوار، سرد ہوائیں، ہماری جیت کے آثار ــــ اور سب سے بڑھ کر تمہارا خوشی میں وہ تالیاں بجانا۔ وہ مسرت اور شادمانی میں اچھلنا کودنا ــــ مجھے اب تک یاد ہے وہ دن شہناز ــــ لیکن ارشد ــــ شاید" یہ کہہ کر وہ رک گیا ــــ اور دو آنسو گہر آبدار کی طرح اس کی عینک کے نیچے سے ہوتے ہوئے اس کے گالوں پر آٹھیرے ــــ میں بیتاب ہو گئی۔

" بخدا اظہر" میں نے اس کے آہنی بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔" ارشد میرا بھائی ہے۔ چھوٹا بھائی ــــ سچ جانو ــــ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ میں اس کے ساتھ بطور ــــ بطور اس کے نگران پھرا کرتی ہوں ــــ اپنی خالہ کے حکم سے ــــ اسی دن سے یہ دل تمہارے بے پناہ حسن اور محبت کے ایک ہی حقیقی جذبہ سے متاثر ہے ــــ کہو کیا تمھیں یقین نہیں آتا ــــ آہ کاش میں اپنا دل نکال کر تمھارے آگے رکھ سکتی ــــ"

" اچھی شہناز" اظہر نے کہا ــــ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میری زندگی مسرت و انبساط سے مخمور ہے۔

چودھویں رات کا چاند ضو فشانی کر رہا تھا۔ اور اس کی روپہلی کرنیں صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر گنگا جمنی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ستارے آسمان کے سیاہ پردے پر ایک عجیب شان سے جھلملا رہے تھے ــــ ع

زندگی کی ہائے وہ اک رات کیا پرکیف تھی

" یہ ہماری محبت کی نشانی" اظہر نے میری پیشانی کو چوم چوم لیا۔ میں ندامت اور خوشی کے بے پناہ سیلاب میں ڈوب گئی۔ " تم نے آج تک مجھ سے شرارت کی۔ میں اب تک خاموش رہا کہ مبادا تمھاری دل آزاری ہو۔ اور ابھر آنے والے جذبات کے ایک ریلے کو دل میں روکے رکھا ــــ تم نے بھی بھڑک اٹھنے والے ان شعلوں کو دبائے رکھا ــــ میں تخیلات میں گم رہا۔ اور تم اندر ہی اندر میرے تخیلات کی ان سوکھی ہوئی ٹہنیوں کی آبیاری کرتی رہیں ــــ لیکن آج ــــ"

" آج کا دن دنیا بھر کے لئے مسرت کا دن ہے" ہم دونوں ایک زبان ہو کر بول اٹھے۔" لیکن نہیں ــــ صرف ہماری ہی دنیا کے لئے مسرت کا دن ہے۔" اظہر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

" ٹھیک ہے ــــ اور آج کی شام بھی نہایت حسین ہے۔ بہت حسین" وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ؎

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

ہماری محبت کا رشتہ قایم رہا اور سچ کہو تو یہ کڑی روز بروز مضبوطی ہی پکڑتی جاتی تھی۔ کالج کی کیف آور اور مست فضاؤں میں ہماری محبت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ رنج و غم کے بادل بہت جلد چھٹ گئے۔ اور دلچسپیاں بڑھتی گئیں ــــ اب امتحانات کے دن قریب آچکے تھے ــــ لیکن ہم دونوں

محبت میں ایسے مست، عشق کی فضا میں ایسے مگن اور مسرت آمیز خیالات کے سیلاب میں ایسے بہے جا رہے تھے کہ نہ ہمیں امتحان کی فکر تھی اور نہ کامیابی کا خیال ــــ اظہر نے تو خیر کچھ تیاری کی بھی تھی۔ لیکن میری یہ حالت کہ جیسی کوری کالج میں داخل ہوئی تھی ویسی کی ویسی ہی رہی ــــ بادلِ ناخواستہ امتحان تو دے دیا ــــ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

میری اس حالت کو دیکھ کر چو طرف سے اظہارِ تاسف ہونے لگا۔ اور ہر ایک کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی ــــ صبیحہ نے اپنی زرین نصیحتوں سے مجھے واپس اس راستہ پر لانا چاہا جہاں سے میں نے اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مقام سے میرے لئے کوئی اور راستہ تجویز کرے ــــ لیکن پیاری صالحہ! سچ جانو صبیحہ کی باتیں صبیحہ کی ہمدردانہ گفتگو، اس کی پاک محبت۔ اس کی نصیحتیں، کوئی چیز کام نہ آسکی۔ میں نے اتنی لانبی مسافت طے کر لی تھی کہ واپس ہونا مجھے دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔ خوش گوار سفر تھا ــــ آہ کتنا خوش گوار سفر ــــ صالحہ سچ کہتی ہوں استادوں کی گھرکیاں اور پرنسپل صاحب کی شفقت آمیز تقریریں بھی ہماری راہِ محبت میں حائل نہیں ہو سکیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد ــــ میں اپنے کمرے میں بیٹھی اظہر کی خیالی تصویر اپنی نظروں کے آگے کھینچ رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ــــ میرا تنفس تیز ہو گیا اور میں سمجھی کہ ضرور اظہر ہے۔ میں نے اندر سے دریافت کیا کون ہے، جواب آیا "میں صبیحہ"۔

تب میں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اور اٹھ کر دروازہ کی طرف بڑھی۔ "صبیحہ پیاری" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کہاں تھیں اتنے دنوں سے"۔ "اری میں تو اپنے ماں باپ کے گھر گئی تھی ــــ" اس نے کہا "میری یہاں اور کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کسی کو اپنا بنالیتی تو ایک بات بھی تھی۔" اور مسکراتے ہوئے میری طرف کنکھیوں سے دیکھنے لگی۔ "ہاں تو اندر آسکتے ہیں!"

"کیوں نہیں" میں نے جواب دیا "دیدہ و دل فرشِ راہ"

"اس خیال سے پوچھ لیا کہ کہیں تمھارے کاموں میں میری طرف سے خلل نہ آجائے" اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

" نوج! تمھیں تو ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کیسے کام، کا ہیکا خلل"۔

"یہی شاید کسی کو خط لکھ رہی ہوں گی اور......"

"بس خاموش رہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "یہاں تو بنی ہے اور تمھیں بنانے کی سوجھی ہے"

"ارے اللہ" اس نے اپنی کرسی میرے قریب کی۔ "اتنی سی بات پر اتنی خفگی۔ اچھا لو ہم آئندہ سے کبھی....."

"کبھی کیا کرو گی"

"کبھی اظہر میاں کا نام نہ لیں گے" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "سچ کہتی ہوں شہناز! ــــ اب کبھی جو اس مردوے کا نام ــــ لیا تو جو چور کی سزا وہ میری سزا!"

"ہٹاؤ بھی صبیحہ" میں نے کہا "کیا بکواس لئے بیٹھی ہو"

اب اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور مجھ سے قریب ہو گئی "شہناز پیاری!"

اس نے کہا "ایک بات بتاؤ گی ــــ پوچھوں؟ ــــ یہ تمھیں صرف اوقات میں کیا لطف آتا ہے"

"صرف اوقات کیا" میں نے دریافت کیا۔

"اور پھر نہیں تو کیا" اس نے جواب دیا "یہ محبت اور

یہ عشق و تعشق کا جنوں ......'

"ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں'

"اونھ۔ تم تو پوری فلسفی بن گئی ہو ——"

"خاموش رہو صبیحہ"

"شہناز۔ اگر اتنی محبت تمھیں خدا سے ہوتی تو شاید تمھارے لئے جنت کے سارے دروازے کھل جاتے —— اور پھر تمھارے طفیل میں ہم گنہگاروں کی بھی عید ہو جاتی۔"

"صبیحہ تم ناصح نہ بنو' میں نے ذرا تیز ہو کر کہا' مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔'

"تو گویا تم اس بت کافر کا پوجنا نہیں چھوڑو گی'

میں نے کہا 'ہاں!'

'چھوڑوں گی میں نہ اس بت کافر کا پوجنا'

"چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر؟" اس نے کہا۔

"نہ چھوڑوں گی۔ نہ چھوڑوں گی۔ ایک نہیں ہزار مرتبہ کہہ دیا۔"

"شہناز۔ بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو' صبیحہ آہستہ آہستہ سنجیدگی اختیار کر رہی تھی' ساری دنیا تمھیں کیا کہے گی۔ اپنا منہ کالا کرنے سے کیا فائدہ۔ کالج کے جس کونے میں جاؤ تمھارے ہی چرچے۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر تمھارا ہی نام —— ذرا اپنی حیثیت کا تو خیال کرو'

'بہت خیال کر چکی' میں نے کہا۔ 'زیادہ نہ کہو'

"تمھاری قسم خفا نہ ہو شہناز۔ میں تمھارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں'

'میں اپنے بھلے برے کو خوب سمجھتی ہوں صبیحہ'

'یہ دیکھو کہ کالج کے سارے اساتذہ اور استانیاں تم سے ناراض۔ ساری لڑکیاں تم سے خائف اور تمھاری صحبت سے کنارا کش —— لڑکے تو خیر ——' اس جملے پر وہ مسکرا پڑی اور میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا' یاد کرو وہ دن جب تم نے پہلی مرتبہ کالج کے حدود میں قدم رکھا تھا۔ کیسی بھولی بھالی لڑکی تھیں تم' نہ کسی سے واسطہ نہ کسی سے تعلق۔ تم تھیں اور تمھاری کتابیں۔ اب تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ بی۔ اے کا امتحان دینے کے لئے بھی تم نے کچھ تیاری نہیں کی۔ یہ گن ٹھیک نہیں بہن۔ یاد رکھو اگر تم میرا کہا نہ مانو گی اور اس نگوڑے اظہر کی محبت سے......'

'خاموش رہو صبیحہ' میں نے ترش رو ہو کر کہا' یہ کیا بات ہے کہ تم ہمیشہ اظہر کو کوستی رہتی ہو۔ اس نے تمھارا کیا بگاڑا'

"اور کیا بگاڑتا" صبیحہ نے جواب دیا "تمھیں جو تباہ کر دیا"

'تو تمھیں کیا اس سے'

'میری ایک دنیا لٹ گئی' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی 'تم نہیں جانتیں شہناز مجھے تم سے کتنی الفت ہے۔ تمھاری بدنامی کے چرچے میرے دل پر ٹھیس لگاتے ہیں۔ میں جب سنتی ہوں کہ میری شہناز کو فلاں نے یوں کہا اور فلاں نے اسے بری نظروں سے دیکھا تو میرے دل پر جیسے گھونسا لگتا ہے —— اور تم کہتی ہو کہ تمھیں کیا اس سے!——

—— خیر بہن دنیا ہی بے وفا ہے۔ تم سے کاہے کا گلہ —— اچھا لو۔ میری باتوں سے تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو میں خود یہاں سے چلی جاؤں' میری آنکھوں میں بھی دو آنسو چھلک آئے —— وہ اٹھی اور دروازے کے قریب گئی۔ لیکن مجھے سسکیاں بھرتی دیکھ کر رک گئی۔ 'رو نہیں شہناز —— رونے کا کون موقع ہے۔ آئندہ سے تم کبھی مجھے ناصحانہ گفتگو کرتے نہیں سنو گی' اس نے اپنی دستی سے میرے آنسو پونچھے اور

جانے ہی کو تھی کہ باہر سے ایک شور و غل اور دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"یہ کیا ہوگیا" اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "ارے کیا ہوگیا شاما ــــ" میں بھی کھڑکی کے قریب آ گئی۔

"ٹکر ہوگئی ہے موٹر سے" شاما نے نیچے سے بہ آواز بلند کہا۔ "کس کی؟"

"اظہر کی" بلند آسمان! اظہر کا نام سنتے ہی میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ہاتھ میں رعشہ پڑگیا۔ اور نہ جانے کس حالت میں بھاگتے ہوئے دوسری منزل سے میں میدان میں اتر آئی۔ دنیا کی ساری چیزیں مجھے تاریک نظر آرہی تھیں۔ اور صرف اظہر کا تصور میرے دل و دماغ پر مسلط تھا ــــ میں اس مجمع کو چیرتی پھاڑتی جو اظہر کے اطراف جمع تھا وہاں پہونچی ــــ آہ میرا اظہر! صالحہ ــــ وہ کس حالت میں پڑا تھا ــــ میں شاید بیان نہ کرسکوں ــــ خون میں لت پت ــــ آنکھیں آسمان سے لگی ہوئیں۔ زبان پر اس بے وفا شہناز کا نام۔

"شہناز۔ مجھے یاد رکھنا" یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ اور اس کی روح زندگی کے غیر فانی آسمانوں کی سیر کر رہی تھی۔

"آہ میرے اظہر" اور میں اس پر گر پڑی۔ اس کے بعد مجھے خود پتہ نہیں کہ کیا ہوا ــــ

"چار، چھ گھنٹے بعد جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے خود کو ارشد کے کمرے میں لیٹا پایا۔

"بہن شہناز" ارشد نے میرے چہرے سے اپنا چہرہ قریب لاکر کہا۔ "کیسی ہے طبیعت؟" دو گرم آنسو میرے چہرے پر سے ہوتے ہوئے نیچے گرے اور گر کر زمین میں جذب ہوگئے۔ صبیحہ پلنگ کے دوسرے بازو پر بیٹھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی ــــ

"آہ او حسین شام" شہناز کہنے لگی

یہ کیا دستور ہے یارب تری آباد دنیا میں ہم کوئی برباد کرتا ہے کوئی برباد ہوتا ہے

صالحہ نے اپنے دامن سے آنسو پونچھ کر کہا۔

"بہت ارمان ایسے ہیں جو جی کے جی میں رہتے ہیں"

"آپ کو امی کب سے بلاتی ہیں آپا جان" ننھی نے پھر سے کمرے میں داخل ہوکر کہا۔ "نہیں آئیں گی آپ؟" ــــ "چل ننھی چل"

عزیزہ رضوانہ

آئیں گے

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

یہی نگاہ، یہی شوخیاں، یہی انداز — یہی جمال، جبیں پر یہی تجلیٔ ناز!
اسی طرح سے سرِ دوش رقصِ زلفِ دراز — قدم قدم پہ بتاتے ہوئے حیات کا راز

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

نقاب اٹھائے ہوئے موجِ رنگ و بو ہو کر — چمن فروش بہاروں کی آرزو ہو کر
جہانِ شوق میں عنوانِ جستجو ہو کر — حیاتِ نو کا طرب آفریں لہو ہو کر

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

یہی ادائے جوانی، یہی غرورِ جمال — دماغِ شاعرِ فطرت میں اک لطیف خیال
چمن کی چاندنی، راتوں میں رقصِ بادِ شمال — نسیمِ صبح کا عالم، شعاعِ مہر کا حال

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

لبوں پہ نورِ تبسم، نظر میں رازِ شباب — ہوا کی رو میں کچلتا ہو جس طرح سے گلاب
شمیمِ صبح سے مہکی ہوئی بہار کا خواب — فضائے شام میں گاتی ہوئی روانیٔ آب

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

اسی خیال میں تھا میں کہ آپ آئیں گے — چھپے ہوئے تھے جو اسرارِ شوق پائیں گے
مرے تصورِ رنگیں پہ آ کے جائیں گے — نشاطِ روح مری روح میں سمائیں گے

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

خدا سے مانگ سکا میں نہ عشرتِ کونین — مرے نصیب میں تھی آج نعمتِ کونین
بتاؤں آپ کو کیا ہے حقیقتِ کونین — اس اک نگاہ پہ قربان دولتِ کونین

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ آپ آئیں گے

علی اختر

تحفہ

دنیا ساری کوزے میں دریا بند کرنے پر اکڑتی ہے تو میں نے سوچا لاؤ میں گلاس میں ساری دنیا کو بند کردوں، اس میں بھلا خاکسار کا تو کیا کمال ہوگا، کہئے گلاس کی بات کہ دیکھنے میں کچھ بھی نہیں لیکن سچ پوچھئے تو یہی سب کچھ ہے، اور اسی سے سب کچھ ہے۔ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھئے گا، فی الحال تو صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ ایک باپ، ایک بیٹا، اور ایک بھانجی ہی کا اس سے کتنا تعلق ہے، رہے باقی اور تو پھر کبھی سہی۔ باپ تھے حکیم صاحب، بیٹے تھے سراج میاں، اور بھانجی تھیں صفیہ

حکیم صاحب یوں تو حکمت کے لحاظ سے بھی برے نہ تھے، لیکن حق یہ ہے کہ حکمت سے زیادہ وہ اپنی وضعداری کیلئے مشہور تھے، اسباب ما یحتاج کا جہاں تک تعلق ہے فطرت نے حکیم صاحب کو نوازنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی تھی، اس پر مستزاد ان کا خاندانی وقار، وافر اولاد، فکر معاش سے بے نیاز، قدیم روش کے آدمی، گو جدید اثرات سے بھی بیگانہ نہیں، سلیم الطبع پیر مقطع، قبیلہ پرور، مذہب پرست، غرض ایسی ہی کئی خصوصیات تھیں کہ اپنے حلقہ میں دور دور تک وہ ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے اور اس پر انہیں ناز بھی تھا کہ سب گھر تو بیٹیوں کو پیام جاتا ہے، اور ان کے گھر بیٹوں کو پیام آتا تھا۔ چونکہ اساس اخلاقی میں تعلقات ازدواجی کو وہ بہت دخیل سمجھتے تھے، اور لڑکیاں سستی اور اچھی ملتی تھیں، ایک چھوڑ تین تین بیٹوں کی شادی انھوں نے مسیں بھیگتے کردی۔ اک رہ گئے تھے ان کے چھوٹے صاحبزادے، ان سے بڑی صاحبزادی اور سب سے چھوٹی بھانجی کہ دوسروں کے دیکھتے ان کی شادی کو دیر لگ گئی تھی، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ خدانخواستہ ان میں کوئی کھوٹ کسر تھی، بلکہ بیٹی کے لئے اچھے سے اچھے بر کی تلاش تھی، اور بیٹا بھانجی حکیم صاحب کے گھر کی عام روش کے خلاف آزاد خیال و روشن دماغ واقع ہوئے تھے، صاحبزادے نے صاف انکار کردیا کہ گریجویٹ ہونے سے پہلے وہ شادی نہ کریں گے، اور بیٹے بیٹی سے پہلے چھوٹی بھانجی کی شادی یوں بھی بے موقع تھی، اس لئے انھوں نے ان ہی کی مرضی پر ان کی شادی چھوڑدی تھی، یوں بھی یہ دونوں انھیں ضرورت سے زیادہ عزیز تھے، بھانجی یوں کہ مرحوم بہن کی واحد یادگار تھیں، اور بیٹے کا تو کیا پوچھنا، زر سے قسمت کھلائے تھے، پہلے تو کئی اولادوں کے مرنے کے بعد پیدا ہوئے پھر اس دن پیدا ہوئے جس دن ان کے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کوئی سراج السالکین پیدا ہوئے تھے، اور جس دن یہ پیدا ہوئے اسی دن ان کے پاس منصب کے اجراء کے احکام خلاف توقع آئے جس کے لئے وہ ایک عرصہ تک لڑ، تھک کر بیٹھ رہے تھے، اس پر حکیم صاحب کا گمان کہئے یا خدا کی شان کہ ان کی پیدائش کے بعد سے حکیم صاحب کی حکمت کو بھی بہت فروغ ہوا، پھر ان آثار رشد و ہدایت سے مسقف تھے جو ہمیشہ اس عمر کے بچوں سے غیر متوقع ہوتے ہیں، تقریباً ہر امتحان میں اول آئے ہر دفعہ انعام لائے، اور جو بڑی جماعتوں میں آئے تو وظیفے پائے، ایسی صورت میں ان کے جتنے اللے تللے نہ ہوتے کم تھے، اور یہی باعث تھا کہ ان کا اصلی نام تو کبھی غصہ میں ہی یاد آتا یا بیگانوں میں، ورنہ اتنے لاڈ کے نام مقرر تھے کہ ننانوے ناموں میں اب تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی، کبھی سراج میاں، کبھی سراج پاشا، کبھی منصبدار، کبھی چھوٹے میاں، کبھی چنو میاں غرض اتنے میاں کہ اس کے بعد کسی میاں کی آرزو باقی نہ رہی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جیسے جیسے دن گزرتے گئے حکیم صاحب محسوس کرتے گئے کہ ان کے لاڈلے بچے بے راہ ہوئے جاتے ہیں، یا تو یہ خود جدید وضع کے لوگوں سے اتنی نفرت رکھتے تھے کہ اسی سبب سے وہ اپنے مرشد کے سوا بہت کم کسی سے ملتے تھے یا یہ ہوا کہ خود ان کا لڑکا لڑکی فیشن کی پتلی بننے لگے، یہ گویا ایک طرح قدرت نے ان کی رعونت کی سزا دی تھی، آدمی دوسروں کے لئے تاکید کرتا ہے، اور اپنے لئے تاویل، جہاں یہ اوروں کو تنبیہ کیا کرتے تھے اب اپنے لئے تاویلیں کرنے لگے کہ ابھی تو بچپن ہے، سمجھ آئے گی تو یہ باتیں جاتی رہیں گی، پھر جو اصولِ اساسی میں وہ ان سے مختلف نہیں تو وجہ ظاہر کی حد تک شوق کرلیں، اس میں ہرج ہی کیا ہے، غرض اس چشم پوشی سے کہیئے یا خبثِ باطن سے، ان بچوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ رنگ نکھارا کہ ۴۱ء کیا ۴۵ء کے "ماڈل" معلوم ہونے لگے، اب وہ پچھتانے لگے کہ انھوں نے بیجا کیا کہ جدید تعلیم کے ڈھرے لگا چھوڑا، جس میں اور کچھ ہو نہ ہو تربیت کا تو نام نہیں، اور جس تعلیم سے تربیت نہ ہو اندھے کی آنکھوں پر عینک لگانے کے مساوی ہے، سراج کالج میں کیا آئے اپنے آپ کو پروفیسر سمجھنے لگے، اور صفیہ ہائی اسکول میں کیا آئیں اپنے آپ کو گویا یونیورسٹی سمجھنے لگیں، اور کچھ انھوں نے سیکھا نہ سیکھا، یہ تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے مزاج میں نزاکت، طبیعت میں نفاست، کمر میں لچک، چال میں ٹھسک اور بات میں چٹک پیدا ہوگئی ہے، اور اگر واقعات نے ساتھ دیا تو علم و فضیلت کے لحاظ سے وہ روشن خیال عورتوں کے ادعا کے مطابق "مردوں کے دوش بدوش" چلیں نہ چلیں، لیکن رعونت و حماقت کے اعتبار سے "مردوں کے پا بدوش" چلنے میں بھی دریغ نہ کریں گی، یہ تھے حکیم صاحب کے خیالات ان کے متعلق، اور اس میں تقویت دینے کے لئے ان لونڈوں نے اسباب بھی عجیب پیدا کرلئے، صفیہ نے نفاست کی انتہا یہ کردی کہ گھر میں اپنے لئے ایک کمرہ علٰحدہ مخصوص کرلیا، جس میں سوائے بہن کے اور کسی کا آنا انھیں گوارا نہ تھا، اور جانے کس سہیلی کو انھوں نے ایسا کرتے دیکھ لیا کہ خود بھی اپنے پانی کا علٰحدہ انتظام کرلیا، ایک نہایت خوبصورت صراحی منگائی، اس پر ریشمی جالی چڑھائی ماموں سے کہہ کر کوزے اور گلاس کا چاندی کا کیس تیار کروایا، اور اپنے کمرہ میں الگ رکھنے لگیں۔ یہ باتیں حکیم صاحب جیسے آدمی کو فطرتاً تلخ لگنی چاہیے تھیں، اور واقعات نے انھیں تلخ تر کردیا۔

جس طرح عموماً دو مشترک صفات کے طالب علموں میں چھیڑ ہوا کرتی ہے، سراج اور صفیہ میں بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن جو سراج صفیہ کے کمرہ میں داخل ہوا صراحی گلاس کو دیکھتے ہی قریب جاتے ہوئے بول اٹھا "اوہو! یہ ٹھاٹ! کہاں سے چرا لائیں صفی؟"

بہن بھی بیٹھی تھیں، بولیں "ارے بھئی، کہیں تم ہاتھ نہ لگانا، ورنہ یہ بگڑ جائیں گی، انھوں نے بڑے اہتمام سے اپنے پانی کا انتظام الگ کرلیا ہے!"

"تو پھر ہم بھی تو دیکھیں کہ انتظام ٹھیک ہے یا نہیں!"

صفیہ اٹھیں "دیکھئے چھوٹے میاں، براہ کرم آپ یہاں پانی پینے کی تکلیف نہ کیجئے!"

"کیوں بھئی، کیا یہ نہر فرات کا پانی ہے؟! اور کیا خدا نخواستہ آپ کے دشمن کوئی یزید ہیں؟! اب رہا میری تکلیف کا، سو بھلا پانی پینے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ یہ تو عین

ٹھنڈک کی بات ہے! اور پھر ایسی صراحی گلاس سے کہ جی چاہے
پانی کو چھوڑ کوزے گلاس ہی کو پی جائیں!"

یہ کہتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی ڈالا، صفیہ
چھیننے کے لئے جھپٹیں، اس وقت تک وہ ایک دو گھونٹ پی
چکا تھا، صفیہ نے جھنجھلا کر فریاد اٹھائی "دیکھئے بواجی! آپ
انھیں جتا دیجئے!"

بات تو کچھ بھی نہ تھی، لیکن ضد نے رنگ دیا۔ بہن نے
کہا "سراج پاشا، بھلا یہ بھی کوئی ضد ہے کہ کوئی آپ سے کترائے
اور آپ اس کے سر ہوئے جائیں! سنا ہے ان کی استانیوں
نے تعلیم دی ہے کہ ایک کا پانی دوسرا پیے، نہ ایک کے گلاس
میں دوسرا پیے، یہ صحت اور صفائی دونوں کے خلاف ہے،
اس لئے انھوں نے الگ انتظام کر لیا ہے!"

ایک قہقہہ مارتے ہوئے "بھئی، صفائی کی بھی ایک ہی
کہی، میں سن چکا تھا کہ اسکول جا کر، تعلیم کا نام تو صاف،
انھوں نے یہ نئے چوچلے سیکھے ہیں، اس لئے آج صبح جب کہ
یہ نہیں تھیں، میں نے اسی صراحی میں، اسی صفائی کے خیال
سے ناک چھنک دی تھی!"

صفیہ کراہت و غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گئیں،
گو تاڑنے والے یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ اس غصہ کی تہہ میں کئی
گدگدیاں بھی چھپی ہیں، تن تناتی ہوئی گئیں، صراحی مانجھی،
غلاف دھویا، گلاس مانجھا، اور پھر سے پانی بھر لائیں۔

سراج میاں نے فیصلہ سنایا "بھئی ہم تو آج سے
اسی برہمنی کا پانی پیا کریں گے، واقعی صفائی کا بہت خیال
رکھتی ہے!"

جی منہ دھو رکھئے!

خیر، یوں ہی سہی!

بات تو محض وقتی اور معمولی تھی، لیکن دونوں کی ضد نے اُسے
ایک مستقل چھیڑ کی صورت دے دی، صفیہ جتنی چڑتیں، سراج اتنے
ہی ان کا پانی پینے پر تلتے، اور دونوں میں تیج چلتی، حتی کہ انھوں نے
دسترخوان پر بھی پانی پینا چھوڑ دیا، ماما نے جو پانی پیش کیا کہا
"نہیں بھئی، ہمارا پانی تو وہاں (صفیہ کے کمرے کی طرف بتاتے
ہوئے) رکھا ہے! یہ پانی پینا صحت اور صفائی دونوں کے
خلاف ہے!"

"ارے، لاحول ولا، برف بھی بھلا کوئی پینے کی چیز ہے،
میں تو (صفیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) انگارے
ڈال کر پیتا ہوں، انگارے!"

یہ کہا اور صفیہ کے کمرہ کی طرف چلے۔ صفیہ چُرمُرا کر رہ گئیں،
لیکن ساتھ ہی انھوں نے ماما کو بھی چپکے سے کچھ اس طرح دیکھا،
جیسے بس چلے تو اسے کچا ہی کھا جائیں، اور جب سراج پانی
پی نکلے تو یہ الجھتے ہوئے اٹھیں، کوزے گلاس کو دھویا، اور
پھر سے پانی بھر دیا۔ یہ بھی ایک عجیب قسم کا مذاق تھا، اور سبھی کو
اس سے دلچسپی ہو گئی تھی، کبھی مزے لیتے، اور کبھی فہمائش بھی کرتے
کہ "بھئی پاشا، کسی کو اس طرح دق کرنے سے کیا فائدہ۔ میں
سوچتی ہوں کہ آخر تمھاری اور بی بی کی بنتی کیوں نہیں!"

"کہیں ہندو، مسلمان کی بھی بنتی ہے امی جان!"

صفیہ ان باتوں سے بظاہر تو بہت جلتیں، لیکن یہ بھی ایک
عجیب اتفاق تھا کہ اب وہ پانی کا پہلے سے زیادہ اہتمام کرنے
لگیں، جب سے ماما نے برف کی آس دلائی تھی، انھوں نے
ہر کھانے سے پہلے گلاس میں برف بھی ڈال کر رکھنا شروع
کیا، اور جب سراج میاں پانی پی لیتے تو الگ چیختیں کہ دیکھئے
امی جان، چھوٹے میاں نے میرا برف کا پانی پی لیا۔ اب انھوں نے
کوزے کا غلاف بھی بدل دیا اور اس پر اپنے ہاتھ سے

ایک نہایت خوبصورت " S " بھی کاڑھ دیا تھا۔

یہ مذاق یا چھیڑ، چھیڑ کی حد تو کافی دلچسپ سہی، لیکن آگے چل کر ایک دن اس نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی، جس نے حکیم صاحب اور ان کے سارے گھر کی زندگی و تخیلات میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیا، اور حکیم صاحب وغیرہ کے دلوں کو ایسا دھکا دیا کہ عمر بھر کو توبہ کرلی۔

بات یوں ہوئی، جیسا کہ میں نے کہا ہے، تعلیم اور لاڈ نے جہاں صفیہ کے دماغ کو خراب کر دیا تھا وہاں سراج کے دماغ کو بھی صحیح نہ رکھا تھا، آزادی و خود مختاری کی اسپرٹ نے ان کو بہ ظاہر ایک شتر بے مہار بنا دیا تھا، اس لئے وہ باپ کی ساری پابندیوں اور وضعداری کو ایک خرافات اور رسم ما فات سمجھنے لگے، اس سے باپ روز بروز ناراض ہوتے جارہے تھے، اس پر غضب یہ ہوا کہ سراج میاں جہاں بیاڈمنٹن کھیلتے تھے، اسی سے لگا ہوا ان کے کالج کے چپراسی کا مکان تھا، ایک دن گیند اس کے گھر میں چلی گئی، اور یہ بھی بے سوچے سمجھے اسے لانے کے لئے لپکے، چونکہ انھیں معلوم تھا کہ چپراسی انھیں جانتا ہی نہیں، بلکہ بڑی حد تک ان کا فیضیاب بھی ہے۔ جیسے ہی داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک پلنگ پر بڈھا چپراسی اور اس کے بازو ایک حسین اور نوخیز لڑکی بیٹھی ہے۔ کہتے ہیں کہ نوجوان خون پر پلیگ کی گلٹی بڑا تیز اثر کرتی ہے، لیکن میں نہیں سمجھتا وہ اتنا تیز اثر کرسکتی ہے، جتنا کہ ایک حسین و نوجوان عورت کے نظارے کے بعد عشق کی گولی، ایک تو نوجوانوں کی نظر پھر طالب علمانہ نظر، سراج میاں نے دفعتہً ایک کشش سی محسوس کی، اور ٹھٹک کر رہ گئے، پھر دوسرے ہی لمحے جو انھیں خیال آیا کہ وہ حکیم صاحب کے لڑکے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ایک بزرگ چپراسی کے سامنے، تو یک دم سنبھل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی چپراسی کی کوئی نواسی، پوتی لگتی ہوگی، لیکن ان کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔

اب التفات کے ساتھ ساتھ ان میں انسانی ہمدردی امنڈ آئی، چنانچہ اس کے بعد سے جب کبھی موقع ہوا انھوں نے اس ہمدردی کا صرف اس پر کرنا شروع کیا۔ طینت میں صداقت ہو تو خلوص کا جواب ہمیشہ خلوص سے ملتا ہے، اس لئے اگر اس لڑکی کو بھی ان کے ساتھ الفِ معہود سے زیادہ انس ہوگیا تو کوئی تعجب کی بات تھی، نہ غیر فطری، لیکن چونکہ غیر معاشری تھی اس نے کئی دلوں میں شرارے بھڑکا دیئے۔ حکیم صاحب جیسی تقدس مآب ہستی اس بات کو کیسے گوارا کرسکتی تھی جب کہ ان کے خاندان کی پشتوں میں بھی کبھی ایسے واقعات کی توقع نہ تھی۔ بہت کڑھنے لگے، پھر بھاوج کا نون مرچ ان کے زخموں پر آگ چھڑکے لگاتی تھی۔ لیکن حکیم صاحب ان کوہ صفت بردباروں میں سے تھے جنھیں شاید ہی کبھی غصہ آتا ہو، اور جب آجائے تو کسی کی جان کی بھی شاید ہی پرواہ کرتا ہو۔ وہ بگڑتے تھے، لیکن سوچتے تھے کہ اس کے تدارک کے لئے کیا اقدام مناسب کیا جائے، اپنے پرایوں کی انگلیاں الگ نشتروں کا کام کرتی تھیں، بالآخر تنگ آکر انھوں نے بیٹے کو ایک دو وعظ کے خوراک بھی پلا دیکھے، اس کا اثر نہ پایا تو ڈانٹ ڈپٹ بتائی، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکا جو کچھ چھپے دبے کرتا تھا، اب کھلے بندوں کرنے لگا، چنانچہ ایک دفعہ صفیہ نے سب کو خوش کرنے کے لئے جو طعنہ دیا "کہئے، آپ کی چپراسن کیسی ہے؟" تو بول اٹھا "یہ خدا آپ سے تو ہزار درجہ اچھی ہے!" یہی نہیں بلکہ وہ خاندان کی اور لڑکیوں اور خود صفیہ سے بھی پھکڑ مذاق کرنے لگا۔ حکیم صاحب کو اب اسی عزیز بیٹے سے نفرت بڑھتی جارہی تھی، التفات خاص تو درکنار انھوں نے

رسم گفتار بھی ترک کر دی، پھر جیب خرچ جو خود دیا کرتے تھے، اب
اپنی لڑکی صفیہ کے ہاتھ سے دلاتے لگے، اور ادھر ایک عرصہ
سے تو دینا ہی بند کر دیا، بلکہ وہ خود بھی جو وظیفہ لا کے پیش کرتا
اسے ایک حقارت سے لینے لگے، سراج ان سب باتوں پر
دل میں مسکراتا اور یہ سمجھتا کہ گویا یہ سب اس کے سامنے ہیچ
ہیں۔ اور جب واقعات کی اصلیت پر سے پردہ ہٹے گا تو یہ
سب اکڑ فون خود بخود جاتی رہے گی، لیکن صورت حال کچھ
اور ہی پیش آئی۔ حالات کی نوعیت سے فائدہ اٹھا کر بھاوج
نے دیور کو اور بھی اکسانا شروع کر دیا تھا کہ سراج اور صفیہ
کا یہ میل ملاپ، یا چھیڑ مذاق بھی ایک غیر شریفانہ نوعیت رکھتا ہے۔
بیوہ بھاوج کی عظمت حکیم صاحب کے دل میں ویسے ہی زیادہ
تھی، اور اب تو اور بھی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ابھی تک وہ غور
ہی کئے جا رہے تھے۔

ایک دن کی کرنی ایسی ہوئی کہ سراج صفیہ کے کمرہ میں
داخل ہوا، بہن بھی موجود تھیں، حسب عادت اس نے گلاس
اٹھایا، اور صفیہ بپھرنے لگیں "جناب، رہنے دیجئے، یہ آپ کا
ہمیشہ کا مذاق!"

چونکہ لہجہ میں کسی قدر ترشی تھی، اس نے گلاس میں
کلی کر کے رکھ دیا کہ "لو بھئی، تمھارا پانی واپس کرتے ہیں، روتی
کیوں ہو!"

منہ میں پان تھا، اس لئے کلی سے سارا پانی لال
ہو گیا، صفیہ کراہت سے جھلا اٹھیں "لاحول ولا، غلاظت کی
بھی کوئی انتہا ہے!"

"ارے، تم اسے غلاظت کہتی ہو! کرامت کہو کرامت
کہ ایک کلی میں تمھارے سڑے پانی کو شربت بنا دیا ہے شربت!"

صفیہ غصہ کو پیتے ہوئے، اس طرح بڑھیں گویا گلاس
کو پھوڑ دیں گی۔ سراج نے غضب یہ کیا کہ اس کے گالوں کو ہاتھ
میں پکڑ کے نرمی سے کہنے لگا "ارے ہے، میری رانی، تمھارا غصہ
بھی کتنا میٹھا ہے، لیکن بگڑتی کیوں ہو، لو اب سے نہیں پئیں گے!"

صفیہ نے ایسا محسوس کیا، گویا اس کے سارے جسم میں بجلی سی
دوڑ گئی ہو۔ وہ شاید ایک لفظ بھی نہ بول سکتی، لیکن معاً اسے خیال
آیا کہ وہ بہن کے سامنے ہے، اور اس سے بڑھ کر اس کی نظر جو چچی پر
پڑی جو دروازہ میں کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھیں تو اس کے
پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیوں کہ جانتی تھی کہ حکیم صاحب کی ان
محترم بھاوج میں جرمنی کے پانچویں کالم کی ساری خصوصیات موجود
ہیں۔ غصہ سے سراج کا ہاتھ جھٹکا اور بولی "چھوٹے میاں، آپ
شاید نہیں دیکھتے کہ آپ اپنی حد سے بہت آگے بڑھ رہے ہیں، میں
آج ہی ابا جان سے آپ کی اس حرکت کا ذکر صاف نہ کر دوں
تب کہنا!"

"ارے، تم کہہ کے کیا کر لو گی میرا؟ یہ دیکھا! (جیب میں
سے ایک رقعہ بتاتے ہوئے) آج وہ چیز پیش کرنے والا ہوں کہ
اگر آج تمھیں قتل بھی کر دوں تو ابا جان مجھے انعام ہی دیں گے!"

یہ واقعہ فی الوقت تو رفت و گزشت ہو گیا، لیکن، جانے
کیوں صفیہ کا دل ضرورت سے زیادہ دھڑکنے لگا۔ اسے کھٹکا
تھا کہ اگر حکیم صاحب گھر میں ہیں تو بھاوج فوراً برمے لگا چھوڑیں
گی، لیکن وہ یہ دیکھ کر کچھ مطمئن ہوئی کہ وہ اس وقت گھر میں
نہیں تھے، اور بھاوج اپنی دیورانی سے باتیں کرتی بیٹھی تھیں۔
اس نے گلاس دھویا اور پڑھنے میں لگ گئی۔ بہت دیر کے بعد
حکیم صاحب بڑے دروازے سے داخل ہوئے، جس سے صفیہ
نے اندازہ لگایا کہ بھاوج کے پاس سے نہیں آ رہے ہیں کیونکہ
تھوڑی دیر بعد بھاوج چھوٹے دروازہ سے آئیں۔ لیکن حکیم صاحب کو

غصہ میں دیکھ کر اسے کچھ وسوسہ بھی ہوتا تھا، پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ شاید یہ اس کے گمان کی وجہ ہو، یا حکیم صاحب کے دھوپ میں سے آنے کی۔ چونکہ بھاوج صاحب آ گئی تھیں اسے خیال آیا کہ کہیں وہ ذکر نہ کر دیں، اس لئے اپنی بریت کے طور پر خود اس نے کہہ دینا مناسب سمجھا، اور حکیم صاحب کے پاس آ کر رُکتے رُکتے لاڈ سے کہا "دیکھئے ابا جان، آپ چھوٹے میاں سے کہہ دیجئے کہ وہ ہمیں نہ ستایا کریں!"

"ہاں، اب وہ تمھیں کیا، کسی کو بھی نہیں ستا سکیں گے!"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے ہیں، صفیہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اسی غصہ کے عالم میں انھوں نے پوچھا "سراج کہاں ہے؟"

بھاوج بولیں "ہوں گے اُسی چپراسن کے پاس، اور کہاں ہوں گے!"

"ہوں!" حکیم صاحب نے غصہ کو نمایاں کیا۔

اتنے میں سراج گاتا، گنگناتا مکان میں داخل ہوا، باپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا، اور اپنے عادتی بھولے پن اور مسرت کے ساتھ "یہ دیکھئے، ابا جان!" کہتے ہوئے رقعہ پیش کیا۔

باپ نے غصہ سے رقعہ کو اٹھا کر پھینک دیا، اور آگے بڑھ کر چھڑی اٹھائی، بیٹا ٹھٹک کر رہ گیا، باپ آگے بڑھے اور بغیر کچھ بولے، چھڑی سے ہاتھ مانگنا اور پیٹنا شروع کیا، لڑکا بھی بغیر کسی سوال کے ہاتھ دیتا گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکیم صاحب آج کوئی "معجون وحشت" ضرورت سے زیادہ کھا گئے ہیں۔

دو ہی چار ماروں میں صفیہ تاب نہ لا سکی، اور روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ اسی کی شکایت سے حکیم صاحب کو اتنا غصہ آیا، اور سراج کو سزا مل رہی ہے، سب کے سب بھی مبہوت تھے، لیکن نہ کوئی کچھ کہہ سکتا تھا، نہ روک سکتا تھا، حکیم صاحب کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ لڑکے کے ہاتھ پھٹ کر خون نکل رہا ہے، البتہ جب چھڑی چرچر گئی تو مجبوراً ہاتھ روکنا پڑا۔ لڑکا اتنا نازوں کا پلا، اور نازک مزاج، کہاں تک تاب لاتا، آخر آنسو ڈھلکنے لگے، باپ نے جب سزا روکی تو فیصلہ سنایا "کمینہ پن کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اگر تم میں ذرا بھی شرافت ہے تو اب تم میرے گھر میں نہ رہو گے! سمجھے؟"

"تعمیل حکم میں مجھے کوئی عذر نہیں، لیکن میں اس کا سبب نہ معلوم کر سکا، ابا جان!"

باپ نے غصہ سے تن کر صفیہ کی طرف ہاتھ بتاتے ہوئے کہا "یہ صفیہ سے پوچھو!"

اب دفعتہً اسے خیالات آنے لگے کہ شاید آج صبح کی حرکت نے صفیہ کو اس قدر برہم کر دیا، اس کی زندگی نے عجب پلٹا کھایا، اس نے محسوس کیا کہ برے کا باپ بھی ساتھی نہیں، اور یہ کہ جس نازوں اور سہاروں کا اسے غرہ تھا وہ سب ہیچ ہیں، اور یہ کہ دنیا میں وہ اکیلا ہے، سب سے بڑھ کر اسے اس بات کی خلش تھی کہ اس نے صفیہ کی اتنی دل آزاری کر دی، حالانکہ یہ اس کی نیت نہیں تھی، انھیں خیالات میں غرق وہ صفیہ کے کمرہ کی طرف بڑھا اور دروازہ میں کھڑے ہو کر اجازت مانگی "صفیہ بیگم" میں حاضر ہو سکتا ہوں؟"

صفیہ جو رو رو کر بے جان ہو رہی تھی، دفعتہً چونک پڑی، اور آنسو پونچھ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سراج اندر گیا، اور بولا "مجھے معاف کیجئے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، لیکن میں نے محض دل لگی میں ایسا کر دیا تھا، ورنہ مقصود آپ کی توہین نہیں تھی!"

صفیہ جو پہلے ہی سے بدحال تھی، یہ سنتے ہی بے قابو ہو گئی، اور جس طرح جھبر جھبر ناجھرتا ہے، اس کے آنسو جھرنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نے

ہوتا تھا کہ وہ بولنے کی انتہائی کوشش کے باوجود بھی بے بس ہے۔
اور سراج نے معافی کے لیئے جو ہاتھ جوڑے تو ہتھیلیوں سے
رستا ہوا خون کہنیوں تک بہہ آیا تھا، صفیہ کی نظر کبھی اس پر
ہے تو کبھی سراج کے چہرہ پر۔ زبان جب عاجز ہوجاتی ہے تو آنکھوں
کو گویائی اور دل کو سماعت مل جاتی ہے، سراج کو خیال ہوا
کہ شاید اس نے یہ نہ کہا ہو۔ جانے، کیا سوجھی کہ اس نے بھی
خون کو دیکھا اور بولا "اوہ! کیا آپ براہ کرم تھوڑا سا کپڑا عنایت
فرمائیں گی؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صفیہ گویا ایسے ہی سوال کی منتظر
تھی، جھٹ سے اس نے اپنی ساڑی کا دامن پھاڑا اور شاید
باندھنے کے لیئے آگے بڑھی، سراج نے کچھ سوچ کر کہا "جی نہیں،
آپ تکلیف نہ کیجیئے، میں دھو کے باندھ لوں گا!" اور کپڑا
لے لیا۔

دسترخوان چنا جا چکا تھا، لیکن اس بے ہودگی میں کافی
دیر ہوگئی، کھانے کی خواہش کسے تھی، جھوٹے منہ جا بیٹھے۔ اس
اثنا میں ماما نے سراج میاں کے ہاتھ دھو کر پٹی باندھی، پھر رکتے
رکتے بولی "خاصہ حاضر ہے!"

"ابھی مجھے بھوک نہیں ماما جی، ٹھہر کر کھالوں گا، جلدی
کیا ہے!"

"آپ کی جیسی مرضی ہوتی، لیکن بڑی بیگم بہت دکھی ہیں،
اور آپ کو یاد فرماتی ہیں!"

"اچھی بات ہے چلو!"

لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ مخالفت کرے گا، لیکن اب
وہ نہایت سنجیدہ ہوگیا تھا، آن بیٹھا، ہاتھ سوج گئے تھے،
پٹی الگ بندھی تھی، پھر بخار بھی چڑھ آیا تھا، کیا کھاتا، چمچہ پکڑنے
میں بھی بہت تکلف ہوتا تھا۔

ماں نے نرمی سے پوچھا "میں کھلادوں، سراج؟"

"جی نہیں امی جان، آپ فکر نہ کیجیے، میں کھالوں گا!"

مشکل سے دو چار چمچے کھائے ہوں گے، ایک لقمہ لب تک گیا تھا،
کہ انگلیاں تھرتھرائیں اور چمچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماں کا دکھا
ویسے ہی ناقابل برداشت تھا، چٹ سے اٹھیں، اور بے قابو ہوکر
بیٹے کو گلے سے لگایا اور رونے لگیں۔ سب کے سب آبدیدہ ہوگئے۔

لوگوں کی بہتیری کوشش تھی کہ کسی طرح سراج جانے نہ پائے
لیکن دوسری ہی صبح انھوں نے دیکھا کہ وہ غائب ہے۔ سب کے
ہوش اڑ گئے۔ حکیم صاحب کی حالت اب سب سے زیادہ ردی
تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ جانے کس اضطراری یا جنونی حالت
میں انھوں نے یہ حرکت کردی۔ ورنہ ان سے زیادہ سراج
اور کس کو عزیز ہوسکتا تھا، اب وہ ندامت و رنج سے روتے
تھے اور ہاتھ ملتے تھے، اور ان سے بڑھ کر صفیہ بدحال ہوئی
جاتی تھی، ہر چند سہیلی یا بہن نے اصل واقعہ دریافت کرکے سمجھایا
کہ وہ بالکل بے قصور، اور ساری کارستانی چچی صاحبہ کی ہے، لیکن
اس کے ذہن میں یہی بیٹھ گئی کہ سب قصور اسی کا ہے، جتنا
سمجھاتی، اتنا ہی اس کا رونا بڑھتا، اب اس نے پانی کا
انتظام بھی ترک کردیا، اور کچھ وحشی وحشی سی رہنے لگی۔

مشکل یہ آن پڑی تھی کہ بات پھیلنے کا بھی ڈر تھا، اور
لڑکے کی تلاش بھی لازم تھی، اور یہ دونوں متضاد چیزیں تھیں،
سب ہی نے کافی احتیاط سے پتہ لگانا چاہا، لیکن بہ بغیر ذرائع
کے کس طرح ممکن تھا، کالج میں دریافت کرانا بھی حکیم صاحب
مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ جب الجھن زیادہ بڑھتی تو وہ رونے
لگتے، اسی غم کے عالم میں جب وہ دوسرے، تیسرے دن پہنچے

اتر کر اس جگہ آئے جہاں انھوں نے لڑکے کو سزا دی تھی، تو بہت دیر تک گم سُم کھڑے رہے، پھر جو نظر اٹھائی تو مقابل کی الماری کے نیچے کسی چمکتی ہوئی چیز پر جا ٹھیری، قریب گئے تو ایک لفافے سے کوئی سنہری چیز چمکتی نظر آئی، معاً انھیں اس لفافے کا خیال آیا جو ان کے لڑکے نے سزا سے پہلے نہایت ادب و مسرت سے پیش کیا تھا، دل کو ایک دھکا سا لگا، اٹھایا اور کھولا تو ایک سونے کا تمغہ، سند اور اپنے ایک دوست کا خط ملا۔

"مجتبیٰ،"

تسلیم۔

ایک سند اور ایک طلائی تمغہ ملفوف کر رہا ہوں، کئی دن سے ارادہ ہے کہ نیاز حاصل کروں، مگر جب سے یہاں آیا ہوں، دوری اور گٹھراگ کچھ ایسے بڑھ گئے ہیں کہ موقع ہی نہیں ملتا خیر

اس بات پر آپ کو فخر ہونا چاہیے، اور ہمیں رشک کہ خدا نے آپ کو ایک ایسے سعید و فہیم دلبند سے سرفراز فرمایا ہے جو آپ کے خاندان ہی کی نہیں بلکہ سارے ملک کی ناک ہوگا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ وہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی ایسا باہنر نکلے گا کہ بین الکلیاتی تقریری مقابلہ میں اول آئے، حالانکہ یہ اس کی پہلی تقریر تھی۔ خدا عمر و اقبال دے! لڑکا آپ کا ہے اور مسرت ہمیں ہوتی ہے۔

تفصیل تو کسی ملاقات پر ہوگی، اتنا سن لیجے کہ پرنسپل صاحب خود اتنے متاثر ہوئے کہ جب تقریر ختم ہوئی تو اچھل کر اسٹیج پر گئے پہنچ کر لڑکے کو گلے سے لگایا، بہت دیر تک تعریف کرتے رہے، دوسرے ہی دن یہ تمغہ اور اپنے دستِ خاص کی یہ تعریفی سند عطا فرمائی، مبارک ہو!

لیکن اس عریضہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ سند اور تمغہ لیکر وہ سیدھا میرے پاس آیا، میں نے بھی بے ساختہ گلے سے لگا لیا اور کہا "خوش رہو بیٹا، تم نے مجھے بہت خوش کیا!"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور!"

"تو پھر ارادہ ہے کہ ایسی تقریب میں وہ موٹر سیکل والی بات بھی چھیڑ دوں!"

"ضرور!"

"مگر چچا، اپنی زبان سے کہتے ہوئے طبیعت جھجکتی ہے انکار کر دیں تو میری کیا باقی رہ جائے گی! اگر مناسب سمجھیں تو آپ ہی کبھی تحریک کر دیجئے نا!"

"اچھی بات ہے، لاؤ، میں ایک ترکیب کروں، اپنا ایک خط اور تحریک کو ان کے ساتھ ملفوف کر دوں۔ نہ تمھاری زبان جائے، نہ میری۔ جائے تو تحریر ہی جائے! ہنسنے لگا۔

اب اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی تو بلا لیجے گا، لیکن جب تک کہ میں آؤں مٹھائی تیار رہے!۔ بچوں کو دعا، بڑوں کو آداب۔

مخلص

"سرور"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خط کی ہر سطر نے حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک قطار باندھ دی ہے، حکیم جی خط تو ختم کر چکے، لیکن آنسوؤں کو نہ ختم کر سکے، کسی کی آہٹ سنی تو پھر اوپر چلے گئے۔

(باقی آیندہ)

سید علی شاکر

خزانہ باؤلی بیڑ

آج سے کوئی تین سو ستر برس پہلے ۹۹۱ھ میں بیڑ کے جاگیردار اور احمد نگر کے وکیل السلطنت صلابت خاں نے اس انوکھے خزانہ آب کی تعمیر کر کے اس زمانہ کے لوگوں کو محوِ حیرت بنا دیا تھا۔ چار صدیاں گزرنے آئیں اور فن انجنیری ترقی کر کے آج اپنے معراج کمال پر ہے مگر اس شہ کار میں کسی نقطۂ نظر سے کسی قسم کا نقص نہیں اور بلا کسی ترمیم و تعمیر کے یہ اپنی تعمیری غرض کو پورا کر رہا ہے۔

بیڑ سے کوئی ساڑھے چار میل دور جانب شمال ایک پختہ اور سنگ بستہ مدور باؤلی بنائی گئی ہے۔ سطح زمین سے اس کی گہرائی کوئی ۸۰ فٹ ہے پہلے ۲۱ فٹ میں اس باؤلی کا قطر کوئی ۶۰ فٹ کا ہے اور نچلے حصہ میں ۴۱ فٹ کا جیسا کہ خاکہ میں بتلایا گیا ہے۔
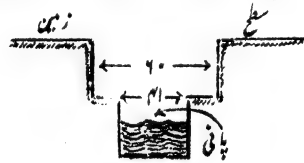
اس باؤلی کے نہ صرف اطراف میں پختہ بندش کی گئی ہے بلکہ اس کے نچلے حصے میں بھی کنکریٹ ڈال دی جاکر سوتوں کو روک دیا گیا ہے۔ لیکن تین نہریں جن میں سے ہر ایک کوئی ۴ فٹ چوڑی اور ۸ تا ۱۰ فٹ گہری اور مختلف طول کی اس کی تین سمتوں میں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سے دو نہریں فراہمی آب کے لئے ہیں اور تیسری اخراج کے لئے۔ اول الذکر میں سے ایک بند پڑی ہے اس وقت صرف ایک نہر سے پانی باؤلی میں داخل ہوتا اور دوسری سے خارج ہوتا ہے۔

دوسرے کالم میں خاکہ دیکھا جائے ←

اس زمانہ میں یہ چیز ایک معمہ تھی اور لوگ اس کو ایک عجوبہ خیال کرتے تھے۔ زمانۂ موجودہ کی وسیع معلومات نے اس ندرت میں کچھ کمی کر دی ہے لیکن یہ حیرت ہنوز باقی ہے کہ آج تک اس طریقہ کار میں اضافہ نہ کیا جا سکا۔ اس کو مختصراً اس طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ زمین پر کچھ بارش ہوتی ہے اس کا تقریباً ۶۰ فیصد حصہ بہہ جاتا ہے اور باقی ۴۰ فیصد حصہ زمین میں جذب ہو جاتا ہے اس مقدار میں کمی یا بیشی زمین کے کم یا زیادہ مسام دار ہونے پر منحصر ہے۔ یہ پانی زمین کی مختلف گہرائیوں میں پہنچ کر جس طرف اس کی پرتوں کی ڈھال ہوتی ہے، اس سمت میں بہتا رہتا ہے۔ یہی پانی ہے جو ہم کو باؤلیوں اور کنوؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ اورنگ آباد، برہان پور وغیرہ کے کارہائے آبرسانی جس اصول کے رہین منت ہیں خزانہ باؤلی کی تعمیر میں بھی اسی قدرتی اصول سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس خزانۂ آب کے لئے ایک ایسے مقام کا انتخاب کیا گیا جہاں تین طرف سے زمین کا ڈھلان اس کے جانب ہے۔ اور اس کے اوپر قریب سے ہی بنسرا ندی بہتی ہے ایک زمین دوز نہر اس ندی کے قریب تک بنائی گئی ہے اسی نہر کے ذریعہ زمین کا جذب شدہ پانی بہہ کر خزانہ باؤلی میں داخل ہوتا ہے۔ ایک اور نہر بھی اسی غرض کے لئے بنائی گئی تھی مگر وہ ایک زمانہ دراز سے

بند پڑی ہے۔ تیسری نہر جو تقریباً تین میل طویل ہے یہ بھی زمین دوز ہے، اسی کے ذریعہ پانی خارج ہوتا ہے گو چونکہ یہ نہر ندی کے نچلے حصے میں واقع ہے اس لئے ندی کا جذب شدہ پانی اس میں داخل ہوکر مقدار آب میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ اس کا تمام پانی چھن کر اور تقطیر ہوکر آتا ہے اور اس میں سطح زمین کے پانی کے راست شامل ہونے کا امکان نہیں اس لئے یہ نہایت مصفا ہوتا ہے۔ اس نہر کو بیڑ کی آبادی تک پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کو بنسرا ندی میں سے عبور کیا جائے، چنانچہ وہاں بھی اس کو زمین دوز اور اس قدر مضبوط بنایا گیا ہے کہ نہ تو ندی کا پانی اس میں داخل ہو سکا اور نہ طغیانی کا اس پر کوئی اثر ہو سکے۔ کوئی تین میل کے بعد یہ نہر بتدریج اپنی گہرائی میں کم ہوتی ہوئی سطح زمین سے آکر مل گئی ہے اور یہاں سے کھلی نہروں میں پانی زراعتی اغراض کے لئے لیا جاتا ہے اور کوئی پانچ سو ایکڑ زمین کو جو برگ زار کے نام سے موسوم ہے سیراب کرتا ہے۔

اس نہر کی نگہداشت کے لئے معائنہ کی باؤلیاں (Inspection wells) بنائی گئی ہیں جن میں سے نہر کے اندر اتر کر اس کی حالت کا معائنہ کیا جا سکتا ہے، یہ باؤلیاں بیڑ میں اساوی کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ برگ زار سے آگے ایک پختہ نہر کے ذریعہ بیڑ کی آبادی تک اس کا پانی پہنچایا گیا تھا اور احمد نگر دروازہ کے قریب ایک مقام پر جو کارنجہ کے نام سے اب بھی مشہور ہے ایک خوبصورت ہشت پہلو حوض میں یہ پانی چھوڑا جاتا تھا۔ عدم نگرانی اور عدم توجہ کی وجہ اس نہر میں شکست و ریخت ہوکر اس حوض تک پانی کا آنا بند ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کی معمولی ترمیم کی جاکر اس حوض میں دوبارہ پانی چھوڑا جاتا ایک تعلقدار وقت نے اس حوض کو پاٹ دے کر اس پر ایک بھونڈا سا گھنٹہ گھر بنوا کر اپنے مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ ایک زمانۂ دراز کے بعد جب یہ باؤلی محکمۂ

ہے محکمہ تعمیرات کی نگرانی میں آئی تو ۱۳۴۴ف میں میں نے ان نہروں کی صفائی کرائی۔ اخراجی نہر بنسرا ندی تک تقریباً صاف تھی مگر اس کے بعد سے وہ تقریباً کیچڑ اور روڑوں سے پٹی پڑی تھی جس کی وجہ پانی کی روانی بہت متاثر ہوگئی تھی، اس کو میں نے صاف تو کرا دیا لیکن یقین نہ آسکا تھا کہ خود بہ خود اس نہر میں خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ تجسس و کرید کے بعد معلوم ہوا کہ بہت دنوں پہلے ایک نیک نیت تعلقدار صاحب نے اس نہر میں اضافہ آب کے خیال سے بند نہر کے ایک حصہ کو توڑ کر اس میں بنسرا ندی کا پانی داخل کرایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندی کے گدلے پانی، کیچڑ اور پتھر نے اس نہر میں داخل ہوکر بتدریج اس کو بھرنا شروع کر دیا تھا۔ نیم حکیم خطرۂ جاں کی مثل شاید اس سے زیادہ کہیں اور صادق نہ آئے۔ محکمۂ تعمیرات کی نگرانی میں آنے کے بعد سے اس قدیم خزانہ کی حفاظت و سلامتی کا یقین ہوگیا ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اس باؤلی کے متعلق جو روایت مشہور ہے اس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس باؤلی سے ایک نہر احمد نگر تک بنائی گئی ہے اور اس طرح صلابت خاں نے اپنے بادشاہ کی خدمت میں یہاں کے پانی کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ اس کے ثبوت میں ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سیاح اس باؤلی پر تشریف لائے تھے پانی پینے کے لئے نیچے اترے ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا وہ باؤلی میں گر پڑا اور نہر میں بہہ گیا، یہ وہاں سے مایوس ہوکر نکلے اور گھومتے گھومتے جب احمد نگر پہنچے تو ایک تالاب میں اس عصا کو تیرتا ہوا پایا۔ ان روایتوں اور قصوں پر کسی قسم کی تنقید غیر ضروری ہے۔

محمد ابراہیم

من کے مندر کا پجاری

من کے مندر کا پجاری اپنی دیوی کو چھوڑ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ... بہت دُور ... جب دیبی کی پوجا ہی اُس کی زندگی کا سہارا تھی اور دیبی بھی اس کی پوجا سے خوش تھی تو ایسا کیوں ہوا ؟

بستی کے لوگ پجاری کو اس مندر سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں میں وہ گنہگار تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ ذات کا برہمن نہ تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ چھتری لڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے نہ کہ پوجا کے لئے مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ دیبی کی پوجا کے لئے ایک ایسا بہادر نوجوان چاہیے جو دیبی کے من میں جگہ پا سکے۔ دیبی کو ذات پات کی کیا پرواہ تھی۔ سب اس کے تھے اور وہ سب کی۔ جو مندر میں اس کا دھیان لئے ہوئے داخل ہوتا اس کی قدر کرتی اور جس کو چاہتی اپنے چرنوں میں جگہ دے سکتی تھی!

بستی والوں نے ایک برہمن کو جسے بستی کے لوگ مقدس سمجھتے تھے دیبی کی پوجا کے لئے مقرر کر دیا۔ اس کو دیبی بہت پسند تھی، پہلے بھی جب کبھی وہ پوجا کے لئے اس مندر میں داخل ہوتا تو دیبی کو تکتا اور پہروں تکتا اور اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ اس دیبی کا پجاری ہو جائے مگر اس نے اپنی اس خواہش کو کسی پر نہ ظاہر ہونے دیا کیونکہ اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ وہ چھتری نہ سہی برہمن تو تھا۔ بستی والوں نے پنچایت گھر میں اس کا تصفیہ کیا۔ اور سب نے ہم زبان ہو کر کہا کہ ایسی مقدس دیوی کا پجاری برہمن ہی کو ہونا چاہیے۔

دوپہر کا وقت تھا جب معمول پجاری اپنی دیوی کی پوجا میں کھویا ہوا تھا کسی نے آ کر اس کے کان میں چپ کے سے کہا کہ کل سے مندر میں دوسرے پجاری کا راج ہو گا۔ اس خبر کے سنتے ہی پجاری کے دل پر ایک غم کی بجلی گری جس کی تپش نے اس کو بے ہوش کر دیا۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا اور جب اس کو ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا تمام جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا ہے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور انگڑائی لیتے ہوئے، شام کے دھندلکے میں مندر کی پھلواری کی طرف بڑھا۔ وہ مندر چھوڑنے سے پہلے دیبی کی آخری پوجا سے اپنے دل کی تسکین چاہتا تھا۔ اس نے بہترین گلاب اور بیلا جو مندر سے ہم آغوش باغ کی بہار تھے، توڑے اور دیوی کو گلاب میں نہلا کر مانگ میں سیندور اور ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ ایک بیش بہا زرین ساڑی اور قیمتی جواہرات سے اس کا سنگار کیا۔ کافوری شمع جلائی اور آرتی لیکر آخری بار اپنی دیبی پہ نثار ہونے کے لئے پروانہ وار جھومنے لگا۔ آج اس کی ہر ادا میں مجنونانہ پن تھا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے بھجن میں پہلے سے زیادہ سوز تھا۔ اتنا سوز کہ سننے والوں کے دل کو جلا کر خاکستر بنا دے۔ کیوں نہ ہو یہ جو اس کا آخری بھجن تھا۔ جب بھجن ختم ہوا تو آرتی کی تھال اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زمین پر آ رہی اور وہ اس عالم بے خودی میں کھسکتا ہوا آگے بڑھا اور دیبی کے چرنوں سے لپٹ کر بوسے لینے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا رواں ہو گیا اس خیال نے اس کو بے چین کر دیا تھا کہ اس کے ہونٹ دیبی کے چرنوں کو پھر نہ چھو سکیں گے۔ دیبی کے پاؤں آنسوؤں سے نم ہو گئے۔ وہ اب دیبی کے سامنے گھٹنوں کے بل ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور غم کی حالت میں گھٹی سانس سے یہ الفاظ نکلے ہے کہ میری دیبی بستی والے نہیں چاہتے کہ تو میری ہو کر رہے۔ جب میں تیرے پاس تھا تو مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پریم کی دنیا اتنی دور ہوتی ہے۔ دیبی! تیرا پجاری اس پریم روگ کو من میں بسائے دور اپنی اجڑی دنیا ختم کرنے کے لئے جا رہا ہے۔ مجھے صرف یہ

معلوم کرنیکی ضرورت ہے کہ میری پوجا کو تونے قبول کیا ہے یا نہیں اور اپنے من کے مندر میں مجھے جگہ دی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر اسنے حسرت و امید سے دیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں محبت کی آگ پتھر کے سینے میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ اور وہ بھی موم کیطرح پگھل سکتا ہے۔ دیبی میں جنبش ہوئی اور آرتی کے پھول نیچے آرہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے اور اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور ہونٹوں پر آکر رک گئی۔ مگر وہ دیبی تھی انسان نہیں تھی اور زیادہ نہ بول سکی۔ اس کے پجاری کے لئے اتنا بھی بہت زیادہ تھا۔ جدائی کا غم اور محبت کی کامیابی کی خوشی دونوں نے مل کر اس کے دل میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اس کی آخری نظریں آنسوؤں کے بادل کو چیرتے ہوئے دیبی پر پڑیں اور وہ اپنی چھاتی پر صبر کی سل رکھ کر اپنی گٹھڑی سنبھالے مندر سے چل پڑا۔ رات ہو چکی تھی۔ فطرت بھی دو محبت بھرے دلوں کی جدائی کو دیکھ کر تڑپ اٹھی، آندھی اٹھی، بجلی کڑکی، بادل گرجے، اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ آسمان بھی اس سماں کی تاب نہ لاکر رونے لگا۔ مگر آسمان صرف آنسو بہانا جانتا ہے۔ اس کو تڑپانے میں ہی مزا ملتا ہے۔ ہنسانے میں نہیں۔ وہ محبت اور اس کی گہرائیوں کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

برہمن پجاری نے اپنے من کی مراد پائی اور دوسری صبح مندر میں اپنی دھونی رمائی۔ وہ جانتا تھا کہ دیبی کو کونسا پجاری پسند ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوجا میں ایسی مقناطیسی قوت پیدا کرنا چاہتا تھا جو دیبی کے دل کو اس کی طرف کھینچ لائے۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے اٹھتا اور شبنم سے لدے ہوئے خوبصورت مہکتے پھول دیوی کی پوجا کے لئے توڑ لاتا۔ دیبی کے جسم کو عطر و عنبر سے مہکا دیتا۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرتا۔ ماتھے پر ٹیکہ لگاتا۔ ہر روز دیبی میں ایک نیا روپ بھرتا اور تقدس کے پھول اس کے چرنوں میں رکھ کر آرتی اتارتا اور گڑگڑا کر اس سے التجا کرتا کہ اے دیبی تو مجھے اپنا بنالے۔ مگر اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اتنی التجا پر بھی دیبی نہ مسکراتی! یہ کیوں؟ اس لئے کہ دیبی کو ان پھولوں میں اگلی سی بوئے محبت نہ آتی اور نہ عطر میں وہ خوشبو جس سے اس کا دماغ تازہ ہو جاتا تھا۔ جب پجاری کے ہاتھ سیندور لگانے کے لئے اس کے ماتھے سے مس ہوتے تو غصے اور نفرت کی آگ اس کی آنکھوں سے نکلتی اور پجاری کے دل میں دیبی کے غصے کی دھاک بیٹھ جاتی اور اس کے قدم لڑکھڑا تے اور وہ اپنا سر ہاتھوں میں لئے بیٹھ جاتا۔ اس کا شیشۂ دل چور چور ہو جاتا۔ ان ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑنے کی فکر میں دیبی کے چرنوں پر اپنا سر رکھ دیتا۔ اس امید میں کہ شاید دیبی پھر کبھی مسکرا دے اور ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے مسالہ مل سکے۔ مگر پجاری کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ دیبی کبھی نہ مسکرائی پجاری کی آرتی دیبی کو کیوں پسند نہ آئی۔ کیا اس کے پھولوں میں تازگی اور عطر میں خوشبو سچ مچ نہ تھی۔ پجاری حیران ہو گیا۔ دل میں کہتا کہ پھول تو اسی بیل سے توڑ لایا ہوں، عطر وہی، سیندور وہی، بھجن وہی، مگر دیبی کیوں نہیں مسکراتی؟ اس کی بھونڈی سمجھ اس راز کو نہ پہچان سکی اگر وہ دل سے سوال کرنے کے بجائے اپنے ضمیر سے سوال کرتا تو یہ جواب ملتا کہ دیبی کی پوجا کا حق دار تو نہیں اور نہ دیبی تیری پوجا کو قبول کر سکتی ہے۔ اس کے پجاری کو تیری وجہ مندر سے نکالا گیا۔ وہ روتا، تڑپتا، آہ بھرتا بہت دور ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ کیا پجاری کمزور تھا۔ کیا اس کے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ تیرا مقابلہ کرتا۔ نہیں وہ تنہا تھا اور تیرے ساتھ بستی کے سب لوگ۔ وہ چاہتے تھے کہ تو اس کا پجاری بنے۔ ہاں صرف تو۔ مگر انھوں نے دیبی سے کیوں نہ پوچھا کہ اس کو کونسا پجاری پسند ہے۔ دیبی بول بھی نہ سکی۔ اس کو ڈر تھا کہ بستی کے لوگ اس کو مندر سے نکال باہر نہ کر دیں اور مندر میں دوسرا دیبی کا راج ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ دیوی تھی۔ حسد کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ جا... میری پوجا کرے بستی کے لوگ تو مندر میں آئیں گے۔ میری پرستش ہوگی۔ آرتی اتاری جائے گی۔ دعائیں مانگی جائیں گی۔

خوش ہوں گے کہ میں نے ان کے پجاری کو مندر میں جگہ دی۔ ہاں، مندر میں۔ دل میں نہیں۔ پجاری ان کا ہے میرا نہیں۔ وہ مندر میں بیٹھا کرے۔ پھول چڑھایا کرے۔ آرتی اتارا کرے اور بھجن گایا کرے۔ مجھے کیا؛ میں نہیں مسکراتی اور نہ مسکرانے کے لیے میرا دل چاہتا ہے۔ مجھے تو اپنے پجاری کی پوجا چاہیے۔

دن بیت گئے۔ پجاری امید میں رہا کہ میری پوجا قبول ہوگی اور دیوی اسی امید میں رہی کہ شاید میرا پجاری میری محبت سے مجبور ہو کر ایک دن میرے درشن کو آ نکلے۔ مگر افسوس کہ وہ کبھی نہ آ سکا اس کو بستی والوں کا، پجاری کا، اور ضمیر کی ملامت کا ڈر تھا۔ وہ نیک تھا۔ نتیجہ کے تصور نے اس کو ایسی حرکت سے باز رکھا۔

آخر کیا ہوا! ایک دن پجاری نے اپنی ان تھک پوجا سے تنگ آ کر دیوی کے چرنوں پر جان دے دی اور دیبی نے محبت کی آگ سے پژمردہ ہو کر اور ندامت کی تاب نہ لا کر اپنا گلا گھونٹ لیا۔ مگر خطا کس کی تھی؟ نہ تو دیوی کی اور نہ اس کے پجاری کی.......

بستی والوں کی..... اگر بستی والے دیبی کے من کے مندر کے پجاری کو مندر میں رہنے دیتے تو آج دیوی کے درشن سے محروم نہ ہوتے اور ایک نوجوان پجاری کی جان بھی نہ جاتی!!

سلیم النساء بیگم

عشرتِ حزیں

حلقۂ احباب میں جب جھومتی ہو زندگی
قہقہوں کی گونج میں کھو جائے آہوں کا خروش
گر رہے ہوں آسماں سے جب ہزاروں آبشار
آسماں پر بن رہے ہوں کہکشانی راستے
سیلِ موسیقی میں بہہ جائے سکوتِ کائنات
اور ایسے میں کسی کی مست نظروں کا پیام

سو گئی ہو حال کے زانو پہ جب فکرِ مآل
نور کے سانچے میں ڈھل جائے فضاؤں کا جمال
چاندنی کی گود میں سو جائے فطرت کا جلال
نیم وا کلیوں میں جاگے پھول بننے کا خیال!
ڈھل گئی ہو جب دلوں سے خود بہ خود گردِ ملال
ہاں فقط میرے لئے بن جائے مبہم سا سوال

پھر کسی صورت دلِ شاعر بہلتا کیوں نہیں
نغمہ و انوار کی زد میں مچلتا کیوں نہیں؟!

نظر حیدرآبادی

انیسویں صدی کے بعض سیاسی افکار

(۱) انفرادیئے (Individualists)

انیسویں صدی کے نصف اول میں انفرادیت[1] کے تخیل نے ایک نمایاں سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یورپ میں انقلابی انفرادیت کا جذبہ ترقی پر تھا۔ ایک طرف اعتدال پسند جمہوری بھی اس کے علمبردار تھے تو دوسری طرف انتہا پسند جمہوری بھی اس کے حامی تھے فشٹے اور کانٹ نے بھی اس نظریہ کی درمیانی صورت کو انسانی صفات سے متصف کیا۔ مشہور مفکر ولیم فان ہمبولڈٹ (۱۸۳۵-۱۷۶۹ء) نے اس نظریہ کو اپنی کتاب اختیارات مملکت کی تحدید میں ایک اعتدالی رنگ میں پیش کیا۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ حکومت ایک ناگزیر برائی ہے اور حکومت کے فرائض کار صرف جان و جانداد کی حفاظت تک محدود رہنے چاہئیں۔ اس کا خیال ہے کہ ایک فرد کی غیر محدود آزادی گفتار و کردار انسانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ انگلستان میں بھی انفرادیت کا یہ سخت گیر مزاجی نظریہ کچھ اہمیت حاصل کرچکا تھا۔ چنانچہ طامس پین کی تصانیف متعدد بار شائع ہوئیں اور انہیں برطانوی انتہا پرستی کی انجیل سمجھا جاتا تھا۔ رچرڈ کارلائل (۱۸۴۳-۱۷۹۰ء) نے پین کے نظریوں کی اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اس کے جریدہ "دی ریپبلیکن" (۱۸۱۹ء) نے بہت مقبولیت حاصل کی مگر اسے ضبط کرلیا گیا۔ میجر جان کارٹرٹ (۱۸۲۴-۱۷۴۰ء) بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے جو روسو کا ایک جوشیلا شاگرد تھا۔ بنتھم نے "انسانی حقوق" کو ایک "مزاجی افزا" قرار دیا۔ مگر اس کے باوجود ایک عرصہ تک کارٹرٹ نے "انسانی حقوق" کے نظریہ کی تبلیغ کی۔

انگلستان میں انفرادیت کا جو نظریہ رائج تھا وہ بنتھم کا اصلاح کردہ افادی (Utilitarian) نظریہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہا پسند فلسفیوں کا وہ نظریہ بھی رائج تھا جو بنتھم سے ماخوذ تھا۔ یہ انفرادی نظریہ تباہ کن حکومتی "مداخلت" کا ردعمل تھا جو اٹھارویں صدی میں نمایاں حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ یہ مداخلت غیر دانشمندانہ تھی۔ اس مداخلت کا مقصد محض مخصوص اشخاص اور سرمایہ دار طبقوں کا مفاد تھا۔ یہ تباہ کن مداخلت مذہب پر بھی کی جارہی تھی۔ یہ تاجرانہ مداخلت اقتصادیات پر بھی حاوی تھی۔ اس ہمہ گیر مداخلت کا دائرہ عمل صنعت تک بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ مستبدانہ مداخلت اندرون ملک اور سمندر پار کے مقبوضات کے معاملات میں بھی جاری تھی۔ فطری حکومت کے حامیوں نے فرانس میں اس حکومتی مداخلت کے خلاف اور آزادی کامل کے حق میں آواز اٹھائی۔ انگلستان کے وہ پراٹسٹنٹ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے جو کلیسائے انگلستان کے رکن نہ تھے ان میں گاڈون اور اڈم سمتھ جیسے ماہرین اقتصادیات بھی شامل ہیں فرانسس پلیس جیسے لیبر لیڈروں نے بھی اس تحریک سے دلچسپی ظاہر کی۔ بنتھم اور اس کے شاگردوں کے سے سیاسی مصلحین نے بھی اس نظریہ کو اختیار کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے اولین دور تک یہ نظریہ عام تھا۔ اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریہ نے انتہا پسندوں کو بیدار کیا کہ وہ پرانی ناانصافیوں اور دیرینہ کمزوریوں کو ختم کردیں۔

بنتھم کے تمام شاگردوں میں جیمز مِل سب سے بڑا آدمی تھا۔ اس کی زندگی کا اہم مقصد بنتھم کی تصانیف کا انگریزی ترجمہ کرنا تھا

---

[1] اس نظریہ کی رو سے ہر فرد کو عمل کی آزادی ہونی چاہیے۔ (مترجم)

اور اس طرح اس نے بنتھم کی دقیق اور مشکل تصانیف کو ایک اوسط فہم کے انگریز کے لئے قابلِ مطالعہ بنا دیا۔ اس نے اپنے استاد کے اصولوں میں بہت کم اضافہ کیا اور کہیں کہیں تھوڑا بہت اضافہ صرف بنتھم کے اصولوں کی نفسیاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے کیلئے کیا تھا۔ ہابس کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ انسان ایک خود غرض حیوان ہے اور اس کی نمایاں خصوصیات آزادی کی محبت اور قوت کی طمع ہیں۔ اس طرح اس نے یہ ثابت کیا کہ اگر اس منفعت اندیش فرد نے ایک مملکت کے قیام اور ایک حکومت کے استوار کرنے میں مدد دی تو اس نے یہ کام صرف ذاتی خواہشات اور افادی مقاصد کے تحت کیا۔ اور افادی مقاصد اپنی زندگی، آزادی اور ملکیت کے دفاع و تحفظ پر مشتمل تھے۔ اس نے یہ بھی تبلایا کہ جن انسانوں کو حکومتی اقتدار تفویض کیا گیا ہے وہ سب لازمی طور پر زیادہ قوت حاصل کرنے کی خواہش کریں گے اور اپنی رعایا کی مختلف آزادیوں کو غصب کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہمسایہ شہریوں کو بیدار مغز اور چوکسی رہنے کی تلقین کی اور انھیں یہ مشورہ دیا کہ قوتِ عاملہ کو کمزور کرنے کے لئے صرف ایک نمائندہ ایوان ہونا چاہیئے، رائے دہندگان کا حلقہ وسیع ہونا چاہیئے، انتخابات اکثر ہونے چاہئیں اور رائے خفیہ طریقہ سے دی جائے۔

جیمز مل ایک تند خو اور زبردست منطقی مفکر تھا۔ اس کا بیٹا جان سٹوئرٹ مل (۱۸۰۶ء-۱۸۷۳ء) نرم دل تھا اور اس کے ذہنی تخیلات باہم خلط ملط ہو چکے تھے۔ وہ طبعاً سریع الفطرت تھا لیکن بچپن میں اسے بہت زیادہ تعلیم دے کر اس کی یہ فطرت کچل دی گئی۔ مگر پھر بھی اس کی طبیعت تاثر پذیر رہی۔ لیکن اس کے تعمیری و تنظیمی جذبات ختم ہو گئے۔ سب سے پہلے اس نے بنتھم اور جیمز مل کے افادی نظریہ کو قبول کیا۔ پھر کالرج کی رومانیت کو اخذ کیا۔ بعد ازاں کارلائل کے تخیل کو اپنایا۔ کومت کی ثبوتیت[1] کو اختیار کیا۔ مسز ٹیلر کی نسائیت کے اثر کو قبول کیا۔ اور سینٹ سائمن کی نیم اشتراکیت سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس کے ذہنی تخیلات باہم خلط ملط ہو گئے۔ مل ایک ایسا افادیت پسند ہو گیا جو خوشی کے کیفیتی اور کمیتی امتیازات کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ ایک ایسا آتامی (Empiricist) جو شخص محض تجربہ کی بنا پر کام کرتا ہو اور نظریات و استدلال کا قائل نہ ہو) بن گیا جو وجدان و بداہت کی قوت کو محسوس کرتا تھا۔ وہ اس قسم کا حقیقت پسند ہو گیا جس کے اندر بلند تخیل کارفرما تھا۔ وہ ایک ایسا دہریہ بن گیا جو مذہب کا احساس رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسا انفرادیت پسند ہو گیا جو اشتراکیت کی طرف واضح رجحان رکھتا تھا۔ تاہم وہ ایک انفرادیت پسند تھا۔ اس کے طبعی مزاج کا انتہائی جذبہ شخصی آزادی سے محبت کی بنا پر تھا۔ اس کی بہترین سیاسی تصنیف آزادی پر گراں قدر مقالہ ہے۔ اس مقالہ میں وہ پوری قوت کے ساتھ آزادئ گفتار اور آزادئ عمل کو پیش کرتا ہے۔ وہ آزادی جو دیگر افراد کی مساویانہ آزادی میں مداخلت نہیں کرتی ——— وہ اس مقالہ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور خوشی کی بجائے خود شناسی کے جذبہ کو زندگی کا انتہائی مقصد قرار دیتا ہے۔ اُس نے اِس مقالہ میں حکومت کی اس قوت پر جو وہ ایک فرد پر استعمال کرتی ہے سخت پابندیاں عائد کی ہیں۔ اس کی دوسری زبردست سیاسی تصنیف "نمائندہ حکومت" (۱۸۶۱ء) ہے۔ اس کتاب میں وہ جمہوری طرزِ حکومت پر بحث کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ عام حقِ رائے دہی سے عوام کو جو تعلیم ملتی ہے صرف وہی تعلیم

---

[1] (Positivism) آغست کومت کا نظام فلسفہ جس کی رو سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جو دیکھی اور ثابت کی جا سکتی ہوں (مترجم)

جمہوریت کو دوسری ہر قسم کی طرزِ حکومت پر ترجیح دینے کے لئے کافی ہے۔

جب جان اسٹوئرٹ مِل آزادی اور اشتراکیت میں ہم آہنگی پیدا کر رہا تھا اس وقت ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰ء تا ۱۹۰۳ء) پُر زور طریقہ پر یہ ثابت کر رہا تھا کہ آزادی اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اپنی تصانیف "معاشرتی اعداد و شمار" (۱۸۵۱ء) اور "انسان اور مملکت" (۱۸۸۴ء) میں اس نے قانون سازوں کی غلطیوں کی مذمت کی ہے۔ حکومت کی مسلسل غاصبانہ حرکات پر افسوس کیا ہے کھوئی ہوئی آزادیوں کا ماتم کیا ہے۔ اور اس امر پر زور دیا ہے کہ مملکت کے فرایض پرانی حدود کے مطابق صرف انسان کی زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کے تحفظ تک محدود رہنے چاہئیں۔ پروفیسر ہکسلے اپنے دوست اسپنسر کے اس نظریہ کو "انکارِ قوتِ انتظامیہ" قرار دیتا ہے۔

(۲) اجتماعیئے (Collectivists)

اسپنسر نے "انسان اور مملکت" میں یہ ظاہر کیا تھا کہ انسان اور مملکت باہم متضاد ہیں۔ یہ وہی نظریہ تھا جس پر روسو نے اظہارِ تاسف کیا اور جس کے شبہات کو دور کرنے کی اس نے بہت کوشش کی تھی۔ یہ امر یاد رکھنا ضروری ہے کہ انسان اور مملکت کے بین تضاد کو دور کرنے کی روسو نے جو کوشش کی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قوم کی مشیتِ عامہ کے وجود کا اقرار کیا گیا اور اس مشیتِ عامہ کو قوم کے ہر فرد کی رائے کے مترادف سمجھا گیا۔ اس نظریہ کی بنا پر مملکت کو میکانکی کی بجائے نامیاتی سمجھا جانے لگا۔ اور مملکت کو دانش و تدبر، ضمیر اور قوتِ ارادی کی مالک شخصیت سمجھا جانے لگا۔ روسو کے اس شان دار تخیل نے کانٹ کی زبردست اور موثر ذہانت پر اثر کیا۔ اس نے اسے قانون کے ایک کلیہ کی شکل میں پیش کیا۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ قانون آزادی کے خلاف نہیں بلکہ آزادی کی ناگزیر شرط ہے۔ روسو نے اپنی انقلابی تعلیم کے انفرادی پہلو میں جس نظریۂ آزادی کا اظہار کیا تھا وہ کانٹ کی تعلیمات کا اصلِ اصول بن گیا۔

کانٹ کا قابل ترین اور جوشیلا شاگرد جے، جی فشٹے (۱۷۶۲ء تا ۱۸۱۴ء) بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں اسی نظریۂ آزادی کی دھن میں لگا رہا۔ فشٹے ایک وسیع المشرب شخص تھا۔ اس نے انفرادیت پر زور دیا۔ روسو کی مدح و ثنا کی۔ اور انقلابِ فرانس کا خیر مقدم کیا۔ اپنی زندگی کے اس دور میں فشٹے نے "انقلابِ فرانس" (۱۷۹۳ء) اور "اصولِ قانونِ فطرت" (۱۷۹۶ء) نامی کتابیں لکھیں۔ جب فرانس نے جرمنی پر حملہ کیا اور "جنگِ جینا" میں پروشیا کو آزادی سے محروم کر دیا تو فشٹے کے نظریہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "جرمن قوم سے خطاب" میں اپنے ہموطنوں کو لڑائی اور انتقام کے لئے ابھارا۔ وہ قوم پرست اور سیاسی رجعت پسند بن گیا۔ اور انفرادی آزادی کی بجائے اس نے قوم کے اتحادِ مقصد و عمل پر زور دینا شروع کیا۔ اس نے یہ تبلیغ شروع کر دی کہ قوتِ اقتدار کی ضرورت ہے۔ اطاعت لازمی ہے۔ فوجی خدمت ضروری ہے۔ اس نے مملکت کی قربانی کی بہت تعریف کی اور کہا کہ حفاظتی محاصل عاید ہونے چاہئیں تاکہ قوم کے ذرایع آمدنی میں وسعت پیدا ہو۔ یہ سب امور اجتماعیت کی صفاتِ خصوصی ہیں۔

---

[1] اس نظریہ کے حامی کہ ملکیت اجتماعی ہونی چاہیئے (مترجم)

مکمل تبدیلیٔ خیال کی بہترین مثال اس کی مذکورہ بالا اولین تصنیفات اور خود "مکتفی صنعتی مملکت" (۱۸۰۰ء) اور "اصول قانون" (۱۸۱۲ء) میں موجود ہے۔ تاہم ان متعدد نظریوں کے باوجود وہ کانٹ کی بجائے روسو کا معتقد رہا۔ اس نے صرف روسو کی تعلیمات کے قومی پہلو ـــــ یعنی مملکت کے نامیاتی وجود، قوم کی فرد پر قوتِ اختیار، اور مشیتِ عامہ کی حاکمیت ـــــ پر زور دیا تھا۔ یہ سب اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وہ ایک انفرادیت پسند سے اجتماعیت پسند بن گیا تھا۔

فشٹے کے نظریۂ اجتماعیت کو۔ ہیگل نے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ہیگل انیسویں صدی کا موثر ترین فلسفی تھا اور جامعہ برلن میں فشٹے کا جانشین مقرر ہوا تھا۔ اپنی کتاب "فلسفۂ قانون" (۱۸۲۱ء) اور پھر "فلسفۂ تاریخ" میں اس نے مملکت کی اس قسم پر زور دیا جس میں فرد کی حیثیت مکمل طور پر اطاعت گزار کی ہو اور فرد کو اجتماعی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ثابت کیا ہے۔ ہیگل خیالی دنیا میں بسنے والا ایک انسان تھا جو یہ یقین رکھتا تھا کہ کائنات کی بنیاد روح ـــــ یعنی ایک معقول رائے پر ہے۔ وہ ایک ایسا ارتقائی تھا جس نے اسپنسر اور ڈارون سے بھی پہلے اس امر کا اعلان کیا تھا کہ تاریخ لا متناہی اور قادرِ مطلق قوتِ ارادی کے مسلسل ارتقا کی شاہد ہے۔ وہ ایک ایسا اطلاقی تھا جو یہ خیال کرتا تھا کہ ارتقا کا عالمگیر طریق حریت اور قوتِ اقتدار، قانون اور آزادی، قیام اور حرکت استبدادیت اور جمہوریت، اور زندگی و موت کی طرح کے مخالف و متضاد اصولوں کا منطقی عمل اور ردِ عمل ہے۔ اور یہ کہتا تھا کہ حقیقتِ مطلق ان تمام بین متضاد امور کی ہم آہنگی و توافق پر مشتمل ہے۔ وہ یہ سیاسی فلسفہ پیش کرتا تھا کہ آزاد رائے فرد اور مملکت دونوں کی بنیاد ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس بنیادی آزادی کا احساس و اظہار پہلے پہل خارجی قانون میں ہوتا ہے، پھر داخلی اخلاق میں، بعد ازاں معاشرتی اصولِ اخلاق میں۔ اور آخر کار اس بنیادی آزادی کا احساس و اظہار ریاست کے سیاسی اصولِ اخلاق میں ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے ثقافتی ارتقا کی انتہائی منزل مملکت ہے۔ اور یہ مملکت مطلق العنان ہے جس میں ہر فرد مملکت کی حقیقی رائے اور بہ حیثیتِ مجموعی قوم کی رائے عامہ کے درمیان ہم آہنگی موجود ہوتی ہے۔ اور صرف مملکت ہی میں فرد آزادیٔ کامل حاصل کرتا ہے ـــــ اور یہ حقیقی آزادی صفاتی ارتقا اور ادائگیٔ فرض ہے۔ ہیگل کی تعلیمات کی شکل میں سیاسی نظریہ افلاطون کی تعلیمات پر واپس آگیا ہے۔

ہیگلی نظریہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ایک عجیب بوقلموں تاریخ کا حامل ہے۔ جب ترتیشک نے ہیگل کی تمثیلی مملکت کو ہوہن زولرن شہنشاہیت کے مترادف قرار دیا تو بسمارک، بنہارڈی اور ہر ایک جنگِ عظیم کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ جب فیورک اور کارل مارکس نے کائنات کی اساس کے روحانی ہونے سے انکار کیا اور اسے مادی قرار دیا تو انھوں نے اشتمالیت اور پرولتاری آمریت کیلئے راستہ صاف کر دیا۔ جب آکسفورڈ میں طامس ہل گرین اور اس کے شاگردوں نے ہیگل کے اس نظریہ کو جو اس نے اپنی کتاب "فلسفۂ قانون" میں پیش کیا ہے افلاطون، ارسطو، کانٹ، فشٹے، کارلائل اور ماریس کے قدیم نظریوں کے ساتھ ملایا تو اجتماعیت کے حق میں ایک جوش پیدا ہوگیا جس نے آخر کار فیبین اشتراکیت کی شکل اختیار کر لی۔

ـ طامس ہل گرین (۱۸۳۶-۱۸۸۲ء) ایک زبردست اور شریف الطبع انسان تھا مگر اعلیٰ پایہ کا مفکر نہ تھا۔ اس کی تحریر میں فصاحت بیان کی صفت موجود نہیں تھی۔ اس نے جرمن فلسفہ کو دوبارہ زندہ کیا۔ "مبادیاتِ اخلاقیات" اور "سیاسی ذمہ داری کے اصول"

میں اس نے ہیوم کی مادیت، بنتھم کی افادیت، اسپنسر کی انفرادیت جی ایچ ویلس کی تنوتیت کی مخالفت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان ایک روحانی ہستی ہے جو لا انتہا قیمت اور غیر محدود امکانات رکھتی ہے۔ اس کی ترقی کامل کے لئے آزادی کا ہونا ضروری ہے اور یہ آزادی صرف مملکت ہی میں قایم رہ سکتی ہے۔ نیز مملکت کا مقصدِ اعلیٰ ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہے جو ایک فرد کی مسرور زندگی کے راستہ میں حائل ہیں۔ گرین کے سیاسی فلسفہ میں کانٹ کا اثر ہیگل سے زیادہ نمایاں ہے۔

(۳) اشتراکی (Socialists)

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی کے نصفِ اول میں انفرادیت کا نظریہ عروج پر تھا۔ مگر اس نظریہ کے ساتھ ساتھ اشتراکیت (سماج کو ملکیت کی مساوی تقسیم کی بنیادوں پر دوبارہ قایم کرنے اور مقابلہ کی بجائے شراکت کا اصول جاری کرنے کا نظریہ) کی تین چھوٹی چھوٹی شاخیں بھی نمودار ہوتی گئیں اور آخر کار یہ تینوں شاخیں مارکسی اشتمالیت کی شکل میں متحد ہوگئیں۔

اشتراکیت کی پہلی شاخ فرانسیسی تھی۔ اس کا آخذ روسو کی غیر فانی تعلیمات تھیں۔ روسو نے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ انسانی تاریخ کے فطری دور میں تمام انسان آزاد اور ایک دوسرے کے برابر تھے۔ تمام اشیا مشترکہ سمجھی جاتی تھیں اور ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق ذخیرۂ عامہ سے چیزیں لے لیا کرتا تھا۔ جب شخصی ملکیت کے ادارہ کا قیام عمل میں آیا تو انسان کی مسرت اور اس کی معصومیت کا خاتمہ ہوگیا۔ مارلے نے اپنی کتاب "قانونِ فطرت" (۱۷۵۵ء) میں اور مابلے نے اپنی کتاب "اصولِ قانون" (۱۷۷۶ء) میں روسو کے نظریۂ اشتمالیت کو اور ترقی دی۔ علاوہ ازیں انقلابی عہد میں بابوف (۱۷۶۰ء) نے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ لیکن انقلابِ فرانس بنیادی طور پر ایک انفرادیت پسند تحریک تھی۔ اس کی اساس مساوات کی بجائے آزادی پر رکھی گئی تھی — اس لئے اشتمالیت کو کچھ عرصہ کے لئے پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ جب یہ انقلابی دور ختم ہوگیا تو اشتمالیت ایک اعتدال پسند اور دلآویز شکل میں دوبارہ نمودار ہوئی۔ کومت ڈی سینٹ سائمن (۱۷۶۰ تا ۱۸۲۵ء) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ غریب طبقہ کا مفاد اس امر میں مضمر ہے کہ زمین، زر اور پیداوار کے تمام ذرایع مشترک ہوں۔ ہر شخص اپنی بساط و قابلیت کے مطابق کام کرے اور اس کی خدمات کے مطابق اسے معاوضہ دیا جائے۔ اسی زمانہ میں سی، ایم، فوریئر (۱۷۷۲-۱۸۳۷ء) نے تجویز پیش کی کہ تمام بنی نوعِ انسان کو فیلانستری (فوریئر کے نظام اشتراکیت کے ہیرو) دوبارہ منظم کریں۔ تمام کو پانچ پانچ سو خاندانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔[1] ہر حصہ مکمل بالذات اور اشتمالی اصولوں پر مبنی ہو۔ پی، جے، پروڈہوں (۱۸۰۹-۱۸۶۵ء) نے شخصی ملکیت اور حکومت پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس کا خیال تھا کہ حکومت کا وجود صرف شخصی ملکیت کے ادارہ کے قیام کی وجہ سے ہے۔ اس نے اس امر کا اعلان کیا کہ قیمت کا واحد معیار اور اساس مزدوری ہے۔ لوئی بلینک (۱۸۱۱-۱۸۸۲ء) نے مزدوروں کو گلڈ[1] اشتراکیت کے اصولوں پر منظم کرنے کی ایک جامع تجویز پیش کی۔

---

[1] اشتراکیت کی وہ قسم جس کی رو سے سارے سماج کو مختلف پیشوں کی برادریوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور ہر پیشہ کی حکومت اسی کی کونسل کے ہاتھ میں ہو۔ (مترجم)

اشتراکی رجحان کی دوسری شاخ انگلستان میں نمودار ہوئی۔ گزشتہ زمانہ کے مفکر جان بال کے اعتراضات، مور کی تصنیف "یوٹوپیا" اور ہیرنگٹن کی کتاب "اوشیانا" کے سے تخیل، ایویرڈ اور ونسٹینلے کی طرح کے سترھویں صدی کے اشتمالیوں کی تصنیفات و تجربات، اور ولیم اوگل وی اور طامس سپنس کے سے اٹھارویں صدی کے مفکرین کے خیالات پر اس شاخ کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ یہاں طامس پین اور ولیم گاڈون کا ذکر کرنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے انفرادیت پسند نظریوں کے دوران میں چند بے ربط اور غیر متناسب اشتمالی خیالات پیش کئے ہیں۔ انیسویں صدی کے ربع اول میں چھ عظیم الشان ہستیوں نے ترقی پسند اشتراکی لائحہ عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ان شخصیتوں کی زندگیوں اور کارناموں سے مفصل آگاہی حاصل کرنے کے لئے قارئین کو پروفیسر فاکس وال کی کتاب "رائٹ ٹو دی ہول پروڈکس آف لیبر" (مطبوعہ اے۔ مینگر سنہ ۱۸۹۹ء) کا اور ایم۔ بیر کی تصنیف "تاریخ اشتراکیت برطانیہ" (سنہ ۲۱-۱۹۱۹ء) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان مفکرین کے نام چارلس ہال، رابرٹ اوون، ولیم ٹامپسن طامس ہاجسکن، جان گرے اور جان فرانسس برے ہیں۔ اپنے نظریات میں انھوں نے اکثر اقتصادی غلطیاں اور سراب آسا انکشافات کئے ہیں۔ کارل مارکس کی تعلیمات کی بنیاد انھیں غلط اقتصادی نظریوں اور انکشافات پر ہے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سنہ ۴۸-۱۸۳۷ء کی تحریک منشوریت میں اشتمالی عنصر غالب تھا۔ لڈلو، ماریس اور کنگسلے کی پیش کردہ عیسوی اشتراکیت بھی کچھ عرصہ (سنہ ۵۴-۱۸۴۸ء) تک مقبول رہی حالانکہ اس عیسوی اشتراکیت کا بنیادی نظریہ اشتراکیت کی بجائے تعاون تھا۔

اشتراکی رجحان کی تیسری اور آخری شاخ جرمنی میں پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد ہیگلی فلسفۂ مملکت اور اس کے واسطہ سے روسو کے نظریہ پر تھی۔ جرمن اشتراکیت کے مندرجۂ ذیل تین علمبردار تھے :۔

(۱) "کارل مارلو" (پروفیسر ونکل بلخ ۶۵-۱۸۱۰ء) اپنے زمانہ کی اقتصادی برائیوں کا علاج اس نے اجتماعی ملکیت تعاونی پیداوار، دولت کی تمام قوم میں تقسیم اور آبادی کو حد سے بڑھنے نہ دینے میں پایا۔

(۲) کے۔ جے۔ روڈبرٹس (۷۵-۱۸۰۵ء) اس نے قیمت کا مزدوری نظریہ پیش کیا۔ دولت کے سود اور زمین کے لگان اور کرایہ کو ایک ظلم قرار دیا۔ اس نے مستقبل کی ایک ایسی اشتمالی ملی مملکت کا نقشہ پیش کیا جس کا قیام اگرچہ مستقبل قریب میں ناممکن تھا مگر اس مملکت میں ہر فرد ایک دوسرے کے برابر ہوگا اور ہر شخص کو اس کی سماجی خدمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا۔

(۳) فرڈیننڈ لازیل (۶۴-۱۸۲۵ء) اس نے اگرچہ پروڈھون، بلینک، مارلو اور روڈبرٹس کی تعلیمات میں چنداں اضافہ نہیں کیا۔ مگر اس نے اشتراکیت کی نشر و اشاعت نہایت فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش سے کی۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں اس نے "انجمن مزدوراں" بنا کر "جرمن سماجی جمہوریت" قایم کی۔

اشتراکی رجحانات کی یہ تینوں شاخیں کارل مارکس (۸۳-۱۸۱۸ء) کی اشتمالیت کی شکل میں متحد ہو گئیں۔ مارکس کا لاطینی نام موڈیشیا تھا۔ وہ طریوس کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس نے بون اور برلن کی جامعات میں ہیگلی فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شروع شروع میں ایک انقلابی صحافی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ دور مختصر مگر کٹھن تھا۔ چنانچہ وہ پیرس بھاگ گیا اور وہاں (سنہ ۴۵-۱۸۴۳ء) پروڈھون اور دوسرے فرانسیسی اشتراکیوں سے اس نے بنی نوع انسان کی تنظیم نو کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ سنہ ۱۸۴۵ء سے سنہ ۱۸۴۸ء تک اس نے بلجیم میں عارضی

قیام گیا۔ ۱۸۴۸ء میں جرمنی واپس آکر ایک مختصر سا عرصہ رہا اور پھر لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام (۱۸۴۹ء–۱۸۸۳ء) مطالعہ، تصنیف، تنظیم اور تحریک میں صرف کئے ـــــــ یہ سب کام اس نے معاشرتی انقلاب اور عالمگیر اشتمالی دولتِ متحدہ کے قیام کے لیئے کیئے۔ اس کی تجاویز کے معاشرتی عناصر فرانسیسی، اقتصادی اجزا انگریزی اور سیاسی اصول المانوی تھے۔ اس نے اپنی تعلیمات و تجاویز کو مشہورِ عالم "اشتمالی منشور" ۱۸۴۸ء کی شکل میں بہترین و موثر پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ لندن میں ۱۸۴۷ء میں ایک اشتمالی کانفرنس ہوئی تھی اس کے نتیجہ کے طور پر مارکس کی تصنیف "سرمایہ" (۱۸۶۷–۹۴ء) "اشتمالی منشور" سے ضخیم ہے۔ اس کتاب کا اندازِ بیان نہایت مشکل ہے۔ مگر "اشتمالی منشور" میں پیش کئے ہوئے سیاسی نظریہ کے علاوہ اور کوئی نیا سیاسی نظریہ اس کتاب میں موجود نہیں ہے۔

مارکسی تعلیم کے مندرجۂ ذیل پانچ اجزا ہیں:ـ

(۱) تاریخ کے متعلق مادی نظریہ۔ اس نظریہ کے مطابق انسانیت کا ارتقا خیالات کی بجائے جسمانی ضروریات کی وجہ سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔

(۲) طبقاتی جنگ کا نظریہ۔ اس نظریہ میں تہذیب کے عروج و زوال، مملکتوں کے عروج و زوال، اور معاشرتی نظاموں کی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳) قیمت اور فاضل قیمت کا مزدوری نظریہ۔ اس نظریہ کی رو سے طبقاتی جنگ کو درست اور جائز قرار دیا گیا ہے۔

(۴) اقتصادی جبریت کا نظریہ۔ اس نظریہ میں مارکس نے سرمایہ دار تہذیب کا زوال ناگزیر بتایا ہے اور پرولتاری جنت کی پیشین گوئی کی ہے۔ اور (۵) ایک اشتمالی لائحہ عمل جسے بہت جلد بروئے کار لانے کو کہا گیا ہے تاکہ سرمایہ دار تہذیب کا ناگزیر زوال جلد نزوقوع میں آئے اور بے رحم قسمت کا ارتقا آسان ہو۔

(ترجمہ)

اکرام قمر ہوشیارپوری

اطلاع

جو اصحاب اپنے مضامین سب رس میں اشاعت کے لئے بھیجتے ہیں، اگر وہ قابل اشاعت قرار پائیں تو ان کو سلسلہ وار شایع کیا جاتا ہے۔ جو مضامین ناقابل اشاعت ہوتے ہیں ان کو واپس نہیں کیا جاتا۔

براہ کرم مضمون نگار اصحاب اپنے پاس مضامین کی نقل رکھیں۔

علم ہیئت و جغرافیہ

(اس مضمون میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں اڈیٹر کو ان سے اتفاق ہونا ضروری نہیں۔ جو صاحب بھی اس کا جواب لکھ بھیجیں اس کو شکریہ کے ساتھ شایع کیا جائے گا۔)

شاہ وکن نے علوم وفنون کے وہ دریا بہائے کہ جو لوگ پہلے سے علمی کاموں میں مشغول تھے، وہ میدانِ علم میں اور آگے بڑھ گئے۔ جو اقوام جو صدیاں گزرنے پر بھی علم وفن سے ناآشنا تھیں علم وفن کے میدان میں داخل ہوئیں اور آگے بڑھنے والوں نے اپنی جگہ خالی کی تو ان شائقین جدید نے ان کی جگہ لے لی۔ ہر کس وناکس تحصیل علم وکمال میں مشغول نظر آتا ہے اور ملک میں ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں کہ زمانہ ان پر فخر کرسکتا ہے ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ جن علوم وفنون کی کتابیں اس وقت زیر درس ہیں ان کو بھی ایک قدم آگے بڑھایا جائے۔ اور جن ابتدائی مضامین کے عامۃ الناس عادی ہوگئے ہیں۔ اور ابتدائی منزل کو معراج کمال سمجھے ہوئے ہیں' ان کے آگے علم وفن کا نیا باب کھول دیا جائے۔ اور یہی سلسلہ ترقی جاری رہے۔ تاکہ میدان علم وفن کورانہ تقلید کا اڈانہ بنا رہے۔ علم ہیئت و جغرافیہ بھی ایک فن ہے۔ اس فن کی جس قدر کتابیں زمانے میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا یہ نظریہ ہے کہ زمین اور چاند مل کر ایک ہی سیارہ ہے اور زہرہ وعطارد وتین سیارے، شمس کے اطراف چکر لگاتے ہیں اور شمس کے تابع ہیں۔ اور دورِ حاضر نے اس کا نام نظام شمسی رکھا ہے۔ اس کے سوا اور بہت سے نظریے ہیں۔ مثلاً فیثاغورس کا نظریہ۔ بطلیموس کا نظریہ اور دورِ حاضر یعنی ہیئت قدیم، متوسط، جدید۔ ان نظریوں پر تنقید اور غور وفکر کرنا رصدگاہ میں ایک زمانہ گزارنے کا نتیجہ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام سیارے زمین کے اطراف چکر لگاتے ہیں، جس میں بعض کی سیر مشرق سے مغرب کی طرف اور بعض کی مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ اس لحاظ سے اس نظام کا نام نظامِ ارضی قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ نظامِ ارضی کا یہ نظریہ ماہران ونقادان فنِ ہیئت وجغرافیہ کے آگے پیش کیا گیا اور اس کے دلائل عقلی ونقلی جو تجربہ ومشاہدہ سے ثابت ہیں دکھائے گئے اور ذکی الحس ماہران فن ہیئت وجغرافیہ نے اسے تسلیم کیا۔ اور بعض متحیر ومتردد ہیں۔ یہ چند سطور ان کے تحیر وتردد کو رفع کرنے کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ جغرافیہ پڑھانے کا پسندیدہ طرز تعلیم اور اصول تفہیم یہ ہے کہ جغرافیہ کی ابتدا، ساکن مسکن اور اس کے ماحول سے کی جائے۔ مثلاً ایک شخص اپنے گھر میں رہتا ہے تو جغرافیہ کی ابتدا اسی کے گھر سے کی جائے۔ پھر شہر، پہاڑ، دریا، سمندر وغیرہ دکھائے جائیں۔ نیوٹن کا قول ہے کہ حرکت کشش کے بغیر پیدا نہیں ہوتی حکما وفلاسفہ بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ اور ٹائچو براہی جو محققین فن ہیئت میں بہت بڑا پایہ رکھتا ہے........

.... اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ اور تمام سیارے اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں ٹائچو براہی کو اپنی رائے پر اتنا وثوق تھا کہ جب اس کے پاس نظام شمسی کے قائلین مارگلیسر۔ کوپرنیکس کپلر۔ نیوٹن نے دوائر فلکیات کے تجربات کو جو ماہر نظام شمسی نے بغرض تصدیق پیش کیا تو اس نے ان تجربات کو بغور ملاحظہ کرنے کے بعد بھی جواب میں یہی کہا کہ میرا پہلا قول ہی صحیح ہے۔ یعنی زمین ساکن ہے۔ اور تمام سیارگان زمین کے اطراف چکر لگا رہے ہیں۔ اس کا بیان کسی اور وقت وضاحت سے آئے گا۔

یہ تمام خیالات اور افکار پچھلے لوگوں کے ہیں جو ان کے تجربوں پر مبنی ہیں لیکن اس خیال کی تقلید ضروری نہیں۔ تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔ انسان کو کسی خیال پر اس وقت تک قایم نہ ہونا چاہیے جب تک خود بھی اس کی تحقیق وتجربہ

نہ کرے اس نظریہ کے تحت ہم نے تحقیق کا دروازہ کھٹکھٹایا نظامِ شمسی کے نظریہ پر پہلے زمین سے پتھر اٹھایا اور آسمان کی طرف پھینکا وہ زمین پر آرہا۔ اتفاقاً وہاں ایک بلند پہاڑ پر آم کا درخت تھا اوپر کی ڈالی سے ایک آم ٹوٹا خیال ہوا شاید آم آفتاب میں جگہ لے گا لیکن وہ بھی زمین پر آپڑا۔ بعد خیال آیا کہ طیارے ہوا میں ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز پھینکی جائے تو شاید سورج میں پہنچ جائے گی لیکن تجربہ نے بتلایا کہ وہاں سے بھی زمین پر ہی آگرتی ہے۔ پھر خیال نے پرواز کی کہ طیارہ شکن توپیں سمت الراس کی طرف گولا پھینکتی ہیں اور فی ثانیہ ان کے گولے میلوں بلند پہنچتے ہیں ممکن تھا کہ کسی وقت ان کا گولا غلطی ہی سے کبھی آفتاب میں ٹھہر جاتا لیکن تجربہ نے اس کی نفی کی۔

حالیہ جنگ میں یہ ہو رہا ہے کہ طیارے سے بجائے بم اندازی کے توپیں سر کر رہے ہیں اگر ایسا طیارہ پوری بلندی پر بھی چلا جائے اور وہاں سے ادھر کی طرف توپ سر کی جائے تو اس صورت میں بھی تجربہ میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے گا اور نہ گولا آفتاب میں جگہ لے سکے گا۔ بلکہ وہ بھی زمین پر آرہے گا پھر یہ فکر دامن گیر رہی کہ اور کون سا تجربہ کیا جائے جس سے سورج کی کشش کا پتہ چلے۔ خیال کی جولان گاہ میں ایک بات آئی کہ شہابِ ثاقب جو فضاء بسیط سے نکلتے ہیں وہ کہاں جاتے اور کہاں جمع ہوتے ہیں۔ دوربین سے دیکھا گیا بلکہ رصدگاہ کی اس دوربین سے دیکھا گیا جس سے یورانس اور نیپچون (فلک الثوابتہ اور فلک الافلاک) کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جو ہیئت جدید و متوسط اور قدیم کے آرا کے لحاظ سے ساری کائناتِ عالم کا انتہائی نقطہ ہے۔ ایسی دوربین سے دیکھنے پر بھی شہابِ ثاقب فضائے بسیط سے زمین پر ہی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ نظر تو آسمان کی طرف لگی ہوئی تھی ایک سال تک یہی عمل جاری رہا سال بھر تک تمام رات جاگتے جاگتے ختم کی گئی لیکن کبھی ایسا مشاہدہ نہ ہوا کہ کوئی شہابِ ثاقب سورج میں جاتا تو درکنار زمین کی مخالف سمت جاتا یا بازو سے کتراتا ہوا گزر رہا ہو بلکہ ہوا کی مخالفت کے باعث ترچھا ہوتا ہوا زمین پر گرتا ہوا دکھائی دیا۔ بسا اوقات اس کے ذرات بلکہ ایک ایک پونڈ کے ٹکڑے زمین پر پائے گئے جس سے ثابت ہوا کہ ان سب کا میلان گاہ زمین ہی ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ زمین ہی ہر چیز کا میدان ہے۔ اور وہی اس کا معاد قرار پائے گی۔ اور ان تمام تجربات سے زمین کی کشش ثابت ہوتی ہے۔ جب سائنٹیفک تجربہ نے بتایا کہ سب چیزیں زمین پر گرتی ہیں کوئی سورج کی طرف نہیں جاتی۔ تو معلوم ہوا کہ ساری کشش زمین میں ہے نہ کہ آفتاب میں۔

فیثاغورس اور دورِ حاضر کے ماہرین فن ہیئت و جغرافیہ جو ماہر فلکیات بھی تھے ان کا نظریہ یہ ہے کہ زمین مع چاند کے اور زہرہ عطارد یہ تینوں سورج کی کشش میں ہیں اگر ان کا یہ نظریہ درست رہتا تو مذکورہ تجربات میں سے کوئی چیز کبھی تو اپنا گھر سورج میں بناتی گو غلطی سے سہی۔

ہماری رائے ہے کہ فیثاغورس کو مذکورۂ بالا خیال اس وقت سے پیدا ہوا جب کہ وہ رصدگاہ میں بیٹھا ہوا زہرہ اور عطارد کو آفتاب کے مقابل دیکھ رہا تھا۔ اس کو آفتاب میں سیاہ دھبہ نظر آیا۔ اور جب یہ مقابل سے جاتا رہا تو آفتاب میں سیاہ دھبہ کا وجود نہ تھا۔ اور زہرہ و عطارد بھی اس وقت نظر سے اوجھل تھے۔ یہیں سے اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ زہرہ و عطارد اور زمین مع چاند کے آفتاب کا چکر لگا رہے ہیں۔

کیونکہ آفتاب زمین سے جسامت میں بہت بڑا اور زمین کی بہ نسبت آفتاب مختلف خوبیوں کی بدولت ممتاز ہے اور زمین کے

حیوانات و نباتات جہاں تک آفتاب کی روشنی رہتی ہے زندہ ہیں اور غالباً ایسے ہی تصورات کی بنا پر آفتاب کی پرستش کی جاتی تھی جس کا نمونہ اب تک موجود ہے یہ بھی ممکن ہے کہ فیثا غورس اور دورحاضر کے ماہرین کا نظریۂ نظام شمسی محض تفہیم کے لئے ہو۔ جو بطور مثال کے اختیار کیا گیا ہے۔ تاکہ بات جلد سمجھ میں آجائے اور فن سے لگاؤ پیدا ہو۔ ان کا خیال یہ ہوگا کہ آئندہ نسلیں تحقیق کریں گی اور معلومات حاصل کرکے اس پر اضافہ کریں گی اس کے قطع نظر ان لوگوں کو آلات مثل جہاز طیارہ، کیمرا، اور دوربین، ریڈیو وغیرہ جو فی زمانہ موجود ہیں نہ مل سکے۔ تاہم فیثا غورس اور دورحاضر کے ماہرین نے محنتِ جانکاہ سے کواکب و سیارگان کے عکوس نقشہ جات، محوری گردش دریافت کرنے کے آلات وغیرہ تیار کئے ہیں۔ جو خراج تحسین حاصل کرنے کے مستحق اور تاریخ عالم کے صفحات پر آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کے مدنظر صرف ایسے پرانے خیالات پر اس روشن زمانہ میں قناعت کرنا اور ان کی کورانہ تقلید کرنا درست نہ ہوگا۔
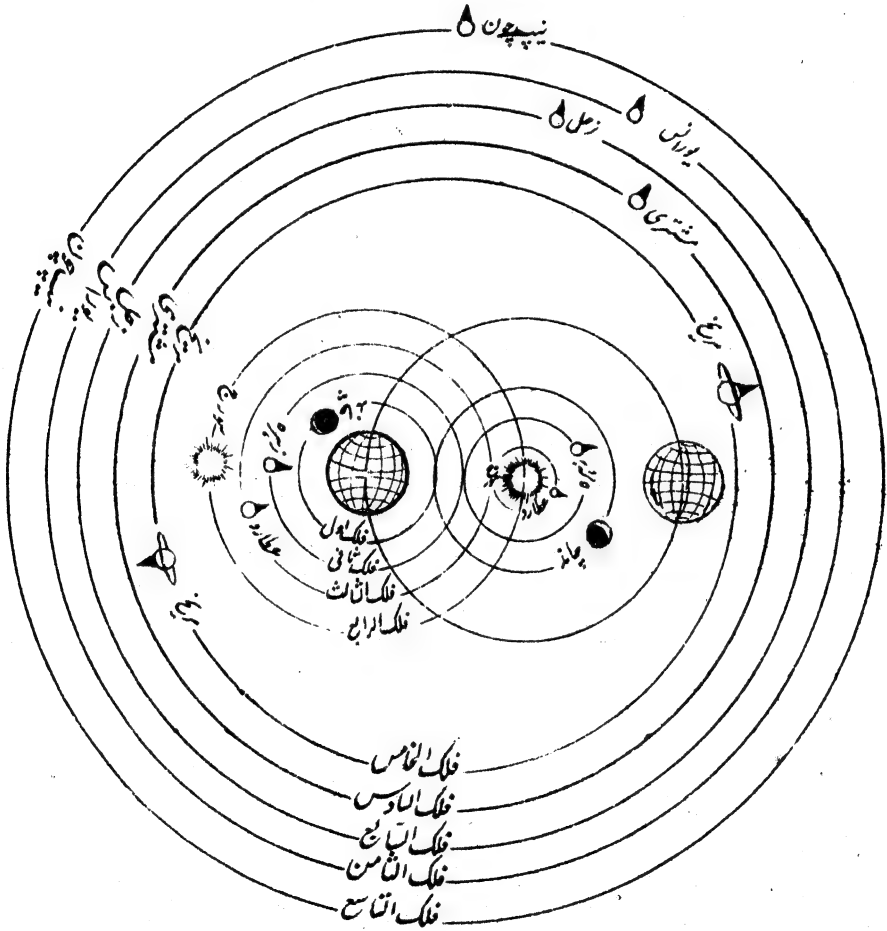
جو آلات فی زمانہ استعمال ہوتے ہیں ان کی مدد سے تحقیق کو آگے بڑھانا ہمارا فرض قرار پاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس سلسلہ میں ایک کتاب

لکھی ہے جس میں اپنی تحقیقات کے دلائل واضح طور پر پیش کئے ہیں جو براہین نظریہ محسوسہ۔ سمعیہ۔ لامسیہ۔ بصریہ پر مشتمل ہیں۔ اور جو بالکل سائنٹفک تجربہ پر مبنی ہونے کے باوجود عام فہم بھی ہیں۔ جس طرح یہ کتاب عقل ونقل و روایت کے مطابق اور صاحبان معقول وارباب منقول دونوں کے لئے مفید ہے۔ نیز اس کتاب میں دوائر فلکیات کثرت سے دیئے گئے ہیں۔ جس کے منجملہ ایک شکل ضرورتاً درج کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ رصادان عالم کو کہاں کہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ امید کہ نقادان فن ہیئت ہماری اس تحقیق وتدقیق پر غور کریں گے۔ جو دوائر متنازعہ فیہ ہیں، وہ دوائر زہرہ عطارد اور شمس ہیں اس لئے ان کے دوائر بھی علٰحدہ علٰحدہ بتا دیئے گئے ہیں۔ (نقشہ گزشتہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ان دونوں کواکب کی تصویروں سے اس بات کی کیفیت کا اندازہ ہوگیا ہے کہ کوئی سیارہ جب دوسرے کے لئے غائب ہوتا ہے تو محجوب میں کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ نیز موسم کا پیدا ہونا اور اس کا تغیر و تبدل۔ تواریخ شمسی وقمری چاند گہن و سورج گہن کے مسائل بتائے گئے ہیں اور ان کو دلائل معقول و منقول سے ثابت کیا گیا ہے۔ اور ایسے نظریے جن کے ثبوت میں کوئی معقول دلیل نہیں نظر انداز کئے گئے ہیں۔ چونکہ ہمارا مذہب معقول ہے ہم معقول بات کو پسند کرتے ہیں۔

سید اسمٰعیل

عید

عید کا دیکھو نظر آیا ہے چاند
عید کی لے کر خبر آیا ہے چاند

اک طرف شانِ امیری رقص و رنگ
اک طرف دنیا غریبوں کی ہے تنگ

اک طرف عیش و نشاطِ بے پناہ
اک طرف عسرت ہے حالت ہے تباہ

اک طرف سرمایہ داری باغ باغ
اک طرف مزدور کا دل داغ داغ

اک طرف خوش حالیاں اور واہ واہ
اک طرف بدحالیاں ہیں آہ آہ

اک طرف فرعونیت آمادگی
اک طرف ہے بندگی بے چارگی

اک طرف شورِ مبارک باد ہے
اک طرف بس نالہ و فریاد ہے

اک طرف وہ قہقہوں کا زور ہے
اک طرف آہ و بکا کا شور ہے

اک طرف پوشاک رنگا رنگ ہے
اک طرف عریانیوں کا رنگ ہے

اک طرف خوش حالی و آسودگی
اک طرف بدحالی و فرسودگی

اک طرف تحفہ ہے عطر اور پان کا
اک طرف بس خون ہے ارمان کا

اک طرف سب صاف ہیں اور پاک ہیں
اک طرف سب سر سے پا تک خاک ہیں

شیر خرما اور سوئیاں اک طرف
قلبِ سوزاں چشمِ گریاں اک طرف

دیکھکر یہ عید اور بیچ اور نیچ کی
عید کی آزاد نے بھی نیچ کی

اے مہ خوبی تو نازِ عید ہے
عشق تیرا بے نیازِ عید ہے

"عید گاہ ما غریباں کوئے تو
انبساطِ عید دیدن روئے تو"

سید محمد حسین آزاد

حیاتِ نو

نہ رو اے ہمنشیں! آئیں گے دن خوشیاں منانے کے!
لکھی جائیں گی تازہ داستانیں حسن و الفت کی
مسرت پھول برسائے گی باغِ زندگانی پر
نئے انداز ہوں گے حسنِ خود بیں کی اداؤں میں
بدل جائے گا سب کچھ، رنج کے دن، ہجر کی راتیں
مسرت صفحۂ ہستی سے نقشِ غم مٹادے گی
حیاتِ نو کے ہونٹوں پر تبسم کھیلتا ہو گا
زمیں کا چپہ چپہ غیرتِ باغِ ارم ہو گا

نئے انداز سیکھے گی یہ دنیا، مسکرانے کے!
فسانے محو ہو جائیں گے سب اگلے زمانے کے!
نظر افروز منظر ہوں گے سارے کارخانے کے!
نئے عنوان ہوں گے عشق و الفت کے فسانے کے!
عجب کچھ کیف پرور روز و شب ہونگے زمانے کے!
گزر جائیں گے یہ مایوس دن رونے رلانے کے!
بدل جائیں گے یہ بدلے ہوئے تیور زمانے کے!
لٹائے گا دُر و گوہر فلک اپنے خزانے کے!

غرض سارے اصولِ زندگی بدلے ہوئے ہوں گے
قفس کی تیلیاں تنکے بنیں گی آشیانے کے!

اختر

فریبِ تمنّا

شکارِ گردشِ دوراں بنا ہوا ہوں میں
کچھ ایسے سازِ شکستہ کی اک صدا ہوں میں
سمجھ سکے مجھے کیوں کر کوئی کہ کیا ہوں میں
ہنوز وہ ہیں اور ان کا فریب جلوہ گری
مرے وجود سے قایم ہے نظمِ دو عالم

تغیّرات کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں
دلوں میں درد کی صورت سما گیا ہوں میں
وہ ابتدا ہوں کہ خود رازِ انتہا ہوں میں
کہ شاخِ گل پہ نشیمن بنا رہا ہوں میں
زمانہ عکس ہے میرا اور آئینہ ہوں میں

نشاطِ ہستیٔ موہوم کچھ نہیں ہے ظفرؔ
فقط فریبِ تمنا ہے کھا رہا ہوں میں

ظفر (عثمانیہ)

نئی کتابیں

۱۔ بیان غالب (مجموعہ شرح کلام غالب) از آغا محمد باقر ۴۴۶ صفحہ قیمت عال۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب۔ لاہور۔
۲۔ پاکیزہ محبت (ناول) از پنڈت وگیپال وملکھراج سرا ، ۲۴۲ صفحہ قیمت عصہ پریم سنگھ کیشولال تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور
۳۔ خزینہ رباعیات از شفق عماد پوری ۲۴۵ صفحہ قیمت عہ شفق بک ڈپو۔ حاجی پور۔ رفیق گنج۔ گیا۔
۴۔ میلاد شہید (منظوم) (قصائد و نظمیں) مرتبہ انتظام اللہ اکبرآبادی ۴۸ صفحہ قیمت ۴ر مصطفائی بکڈپو متصل میوہ کٹرہ۔ آگرہ۔
۵۔ منتخب داغ حصہ اول و دوم (انتخاب کلام داغ) مرتبہ احسن مارہروی ، ۴۸ صفحہ قیمت صہ انوار احمدی پریس۔ الہ آباد
۶۔ پھریری (افسانے) از عظیم بیگ چغتائی قیمت عال۔ کتب خانہ تاج آفس۔ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔
۷۔ خونی تحریکیں (انقلابی تحریکیں) از اظہر امرتسری۔ ۳۰۰ صفحہ قیمت عہ۔ عالمگیر بکڈپو۔ لاہور۔
۸۔ نادر شاہ اور ستارہ (تاریخی ناول) از عبدالرحیم شبلی ۲۵۰ صفحہ قیمت عہ " " "
۹۔ سرگذشت اعظم کاروان (تاریخی ناول) از سید احسان علی شاہ ۳۰۰ صفحہ قیمت عہ " " "
۱۰۔ تاریخی افسانے از مولانا احمد ایم۔ اے ۳۰۰ صفحہ قیمت صہ " " "
۱۱۔ روسیو کی داستان عشق مرتبہ ادارۂ عالمگیر قیمت ۱۲ر " " "
۱۲۔ علم الحروف از حکیم محمود علی خاں ماہر ۲۵۰ صفحہ قیمت ے محمود منزل۔ روشن آرا روڈ۔ دہلی۔
۱۳۔ کلیات میر (نیا ایڈیشن) مرتبہ عبدالباری آسی و سید جعفر علی ۹۷۶ صفحہ قیمت صہ۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔
۱۴۔ مجموعہ قوانین دیوانی و مال جدید ترمیم شدہ قیمت ۵ر۔ شمس المطابع۔ نظام شاہی روڈ۔ حیدرآباد
۱۵۔ ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی جدید مرممہ قیمت عال۔ " " "
۱۶۔ ماوراء (نظمیں) از ن۔ م۔ راشد قیمت عصہ۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور
۱۷۔ پروانہ لق لق (مزاحیہ) از حاجی لق لق قیمت عصہ۔ " " "
۱۸۔ حسن کی قیمت (نیا ایڈیشن) از حکیم احمد شجاع قیمت عہ۔ " " "
۱۹۔ مشین اور مزدور از باری قیمت ۲ " " "
۲۰۔ جاگیرداری از عبداللہ ملک قیمت ۲ " " "
۲۱۔ ہندوستان کے لیڈر از یوسف مہر علی مترجمہ اکرام قمر بی اے قیمت ۲ر " "
۲۲۔ روزناموں کے اوراق (مختلف زندگیوں کا نفسیاتی مطالعہ) از مقصود زاہدی۔ مکتبہ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ
۲۳۔ روح مکاتیب (مشاہیر کے مکتوب) مرتبہ ساغر نظامی۔ " " "
۲۴۔ کاروان (انقلابی نظمیں) از قمر جلال آبادی ۶۴ صفحہ قیمت ۶ر دفتر اخبار اشارہ ہسپتال روڈ۔ لاہور
۲۵۔ پریم پجاری (نیا ایڈیشن) (ایڈورڈ ہشتم اور انکی محبوبہ کے حالات) قیمت ۹ر دفتر رسالہ چاند۔ اردو نگر۔ سہارنپور۔
۲۶۔ دنیائے آرزو (افسانوی روزنامچہ) از میرزا ادیب بی اے۔ ۲۲۰ صفحہ قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز۔ لاہور

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

اردو امتحانات

امیدوارانِ امتحانات اس سال ادارہ کے اردو امتحانات میں حسب تفصیل ذیل امیدواروں نے شرکت کی۔

امتحان	شریک	حاضر	کامیاب	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم
اردو فاضل	۵۵	۴۷	۳۶	۰	۱۴	۲۲
اردو عالم	۱۱۵	۹۹	۶۵	۱	۲۴	۴۰
خوشنویسی	۲۲	۱۹	۱۱	۴	۲	۶
اردو دانی	۴۳۵	۳۴۳	۳۱۷	بہ امتیاز ۷۸		کامیاب ۲۳۹

نتائج امتحانات

اردو فاضل

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

رول نمبر	نام		درجہ
۲۱	محمد حسین اظہر	(بلدہ)	دوم
۳۶	سید محمد نور الحسن انور	(گلبرگہ)	دوم
۲۲	محمد عبد الغنی فاروقی	(بلدہ)	دوم

۱۔ مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

رول نمبر	نام	درجہ
۱۰	مغل مرزا نذیر بیگ	دوم
۱۵	سید نور اللہ حسینی	؍؍
۱۴	میر محبوب علی خاں	؍؍
۱۲	سید احمد محی الدین	؍؍
۷	محمد عبد العزیز	؍؍
۱۹	محمد عبد الوہاب اکمل	سوم
۱۸	سید محمود شاہ قادری	؍؍
۱۳	محمد یوسف	؍؍
۴	حکیم شیخ منصور علی	سوم
۲	محمد مسعود مرزا خاں	سوم
۲۰	محمد عزیز الدین مبشر	سوم
۶	میر حبیب علی امدادی	سوم
۹	محمد غوث الدین داؤدی	سوم
۱	محمد احمد سعید خاں	سوم

۲۔ مرکز حیدرآباد (مدرسۂ فوقانیہ نسواں نامپلی)

رول نمبر	نام	درجہ
۱۱	سیدہ بدر رافعہ	دوم
۳	طیبہ بیگم	سوم

۳۔ مرکز پربھنی

رول نمبر	نام	درجہ
۲۴	سید مظفر علی رضوی	دوم
۲۷	شیخ امیر	سوم
۲۵	عبد الحبیب خاں	سوم
۲۳	محمد ناصر انصاری	سوم

۳۴	لکشمن راؤ	سوم	
۲۸	محمد عبدالرزاق فاروقی	سوم	
۳۰	سید صدرالدین ہاشمی	"	
۳۲	صالح بن محمد	"	
۲۹	امین الدین احمد	"	
۲۶	محمد نصیرالدین فاروقی	"	

۴- مرکز گلبرگہ

۳۶	سید محمد نورالحسن انور	دوم
۳۹	ملا ممتاز الدین احمد انصاری	سوم

۵- مرکز خانہ پور

۴۱	محمد شمس الدین خاں	دوم

۶- مرکز نرسی

۴۳	محمد نذیرالدین	دوم
۴۴	قاضی محمد شریف الدین	"
۴۵	محمد عبدالکریم	سوم

۷- مرکز پرلی

۵۳	اشرف الدین فیضی	دوم
۵۲	غلام حسن صدیقی	سوم

اردو عالم

۱	محمد ظہور الحق معین الدین احمد انصاری (بلدہ)	اول
۵۴	سید داؤد (پربھنی)	دوم
۱۰	شوکت النساء بیگم (بلدہ)	دوم

۱- مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

۱۶	محمد بن عمر باکلکا ساکت	دوم
۱۱۵	محمد عبدالرحمن فاضل	دوم
۱۵	سید عبدالغنی	دوم
۲۹	زنگیا دیو درگی	دوم
۱۱۳	غلام محمد	سوم
۱۷	سید احمد	سوم
۲۷	محمد خواجہ معین الدین	سوم
۱۱	سید نورالحسنین	سوم

۲- مرکز حیدرآباد (مدرسہ فوقانیہ نسواں نام پلی)

۱۰	شوکت النساء بیگم	دوم (مرکز میں اول)
۲	عطیہ	دوم (" " دوم)
۹	رضیہ بیگم	دوم (مرکز میں دوم)
۳	شمیم آرا	دوم
۳۴	وحیدالنساء بیگم	دوم
۸	عاشوری بیگم	دوم
۲۳	فاطمہ صغریٰ	سوم
۱۲	سیدہ رحیم النساء بیگم	سوم
۲۲	ساجدہ بیگم	سوم
۴	تمیزالنساء بیگم	سوم

۳- مرکز کلیانی

۳۵	سید منظور احمد	دوم (مرکز میں اول)
۳۶	محمد حمیدالدین	دوم
۳۴	محمد علی خاں	دوم
۳۳	خواجہ شمس الدین	سوم
۳۷	سید مہر علی	سوم

۴۔ مرکز پربھنی

۵۴	سید داؤد	دوم (مرکز میں اول)
۵۳	غلام احمد	دوم
۵۱	محمد عبدالرزاق عثمانی	سوم
۴۳	محمد عبیداللہ خاں	سوم
۵۰	سید عیسیٰ	سوم
۵۵	محمد علیم الدین	سوم
۵۸	محمد انصاری	سوم
۴۲	محمد عبدالکریم	سوم
۵۲	تاج محی الدین	سوم
۳۹	سید شمس الضحیٰ	سوم
۵۷	محمد بشیر	سوم
۴۷	سید حسین	سوم
۳۸	محمد عبدالوہاب	سوم

۵۔ مرکز گلبرگہ

۶۴	محمد عبدالغنی افسر	دوم (مرکز میں اول)
۶۳	سید امر مہدی نقوی	دوم
۶۲	سید حسام الدین	دوم
۶۵	محمد رحمت اللہ	سوم

۶۔ مرکز کشتگی

۶۶	سعدالدین خاں	سوم

۷۔ مرکز خانہ پور

۷۹	سید ناظر علی	دوم (مرکز میں اول)
۷۶	محمد عبدالمجید خاں قائم خانی	سوم
۷۸	محمد عبدالشکور خاں	سوم
۸۱	محمد عبدالوہاب	سوم
۷۷	محمد عبدالجبار خاں	سوم

۸۔ مرکز نرسی

۸۳	سید غلام دستگیر	سوم (مرکز میں اول)
۹۲	عبدالکریم خاں	سوم
۸۹	عبدالرحیم	سوم
۹۰	سید عثمان	سوم

۹۔ مرکز پرلی

۹۴	سید عبدالخالق	دوم (مرکز میں اول)
۹۵	سید شریف الحسن	سوم

۱۰۔ مرکز پرینڈہ

۹۶	عبدالرشید	سوم (مرکز میں اول)
۱۰۱	سید محمد ابراہیم	سوم
۱۰۰	محمد یونس	سوم

۱۱۔ مرکز کپل

۱۰۵	محمد عبدالمجید	دوم (مرکز میں اول)
۱۰۸	محمد عبدالرشید	دوم
۱۰۳	محمد شرف الدین	دوم
۱۰۴	سید اسمٰعیل علوی	دوم
۱۰۷	سید محبوب حسین	سوم
۱۱۱	محمد عبدالحق	سوم
۱۱۰	محمد امین الدین	سوم
۱۱۲	محمد عبدالقیوم	سوم

۱۲۔ مرکز کپل (نسواں)

۱۰۶	سیدہ حبیب النساء بیگم	سوم

خوشنویسی

۴	محمد غیاث الدین	(بلدہ)	اول
۳	محمد جہانگیر الدین	(")	اول
۲۱	سید مرتضیٰ قادری	(کپل)	اول
۲	محمد صلاح الدین	(بلدہ)	اول

۱۔ مرکز حیدرآباد

۱	سید اظہر حسین	دوم

۲۔ مرکز پربھنی

۶	سید شمس الضحیٰ	دوم

۳۔ مرکز کشتگی

۲۲	سید تاج الدین	سوم

۴۔ مرکز کاماریڈی

۱۴	سید عزیز الدین	سوم

۵۔ مرکز خانہ پور

۱۶	محمد قطب الدین	سوم
۱۹	شیخ داؤد	سوم

۶۔ مرکز کپل

۲۰	محمد مردان	سوم

اردو دانی

۲۳	فاطمہ	(حیدرآباد)	اول
۲۴	کلثوم فاطمہ	(")	دوم
۲۵	قیصر سلطانہ	(")	سوم

۱۔ مرکز حیدرآباد (سٹی کالج)

حسب ذیل امیدوار بدرجۂ امتیاز کامیاب ہیں۔

۱۶	مظہر القدوس
۴۶	محمد فضیل الدین
۴۷	امیر الدین
۴۸	محمد ابراہیم
۵۱	شیخ ابراہیم
۵۴	محمد جلال الدین
۵۷	محمد معین الدین
۵۸	خواجہ مصلح الدین صابری
۶۴	راج لنگم

حسب ذیل امیدوار کامیاب ہیں۔

۱۳	برج موہن لال
۱۵	محمد صلاح الدین
۱۷	خواجہ عقیل احمد
۱۸	خواجہ جمیل احمد
۳۶	محمد حنیف
۴۳	موہن راؤ
۴۴	محمد اسمٰعیل
۴۵	عبدالرحیم
۴۹	مگاسم راؤ
۵۰	محمد علیم الدین
۵۲	شیخ مولانا
۵۳	محمد مولانا
۵۶	میر شوکت علی

۶۲ محمد حسین
۶۳ سید فضل اللہ حسینی
۷۲ گنگا دیال
۷۳ آر بجرنگ پرشاد
۷۵ لکشما ریڈی
۷۶ کے نرسلو
۷۷ بی ویر بھدر پا
۷۸ محمد علی
۷۹ مرزا خواجہ بیگ
۸۰ محمد عبدالرشید
۸۱ ایشورایا
۹۲ زہری
۹۳ حبیب الدین
۹۴ جگناتھ
۹۵ غوث محی الدین احمد
۹۷ ڈی وینکیا
۱۰۰ مرزا محمد علی بیگ
۱۰۱ پانڈ رنگیا
۱۰۲ را ملو
۱۰۳ ایم ایس لنگپا
۱۰۵ محمد مولانا
۱۰۶ بندہ علی
۱۰۷ قمرالدین
۱۰۸ شیخ جہانگیر
۱۱۰ حبیب اللہ خاں
۱۱۱ میر عزیز الدین علی
۱۱۲ محمد قاسم
۱۱۵ محمد ہارون الرشید فاروقی
۱۱۸ محمد طاہر رشید فاروقی
۲۸۲ محمد اظہر الدین

۲- مرکز حیدر آباد (مدرسہ فوقانیہ نسوان نامپلی)

بدرجۂ امتیاز کامیاب

۹ امت المنان صداقت النساء
۱۰ امت المومن عصمت النساء
۱۱ حنیفہ بی
۱۴ رام دلاری سکینہ
۱۹ سعید النساء بیگم
۲۰ امام النساء بیگم
۲۱ حفیظ النساء بیگم
۲۶ اقبال جہاں بیگم
۲۷ نزہت آرا
۲۸ رضیہ
۲۹ فاطمہ بی
۳۱ روزان
۳۲ کریمن
۳۵ پشپا
۳۷ کنیز فاطمہ
۳۸ سیدہ راحت فاطمہ
۳۹ سیدہ عفت فاطمہ
۴۱ اظہر النساء بیگم
۴۲ امت الرافع شجیع النساء
۵۹ ملکہ بیگم
۶۴ وحید النساء
۶۵ خورشید النساء
۶۶ ذکی النساء
۶۷ عزیز خاتون
۶۸ سکینہ بیگم
۶۹ صفیہ بیگم
۷۱ لطیفہ بیگم
۸۳ حفیظہ بی
۸۴ ہاجرہ بانو
۸۵ نورجہاں
۸۶ آمنہ بیگم
۸۷ عائشہ بیگم
۸۸ بلقیس بیگم
۹۸ صالحہ بیگم
۱۱۴ رضیہ سلطانہ
۱۱۷ افسر سلطان

کامیاب

۶ انور بیگم
۷ حسینی بیگم
۸ افتخار جہاں بیگم
۲۲ تلاوت النساء بیگم
۳۰ روزما
۳۳ شریزہ
۳۴ داؤمنی
۴۰ سیدہ فیاض فاطمہ
۵۵ بی پاشا

۸۰ خورشید بیگم
۸۲ اقبال بیگم
۹۰ امیر النساء بیگم
۹۱ جہانگیر بی
۱۱۳ خورشید سلطانہ

۳۔ مرکز کلبانی (ذکور)

کامیاب

۱۸۰ نظام الدین (مرکز میں اول)
۱۲۰ بھیمنا
۱۲۱ عبدالقادر باگ
۱۲۲ نیلکنٹ پرشاد
۱۲۴ محمد عبدالرحیم
۱۲۵ مہادیپا
۱۳۰ عبدالقادر
۱۳۲ محمد عبدالرزاق
۱۳۶ محمد مستان
۱۳۷ میر محمود علی
۱۳۸ دستگیر حسین
۱۵۶ محمد حمید الدین
۱۵۷ سید اسمٰعیل
۱۵۸ مانک راؤ
۱۵۹ خواجہ حبیب اللہ خاں
۱۶۰ مساجی
۱۶۲ دتو سنگھ
۱۶۳ سید اقبال حسین
۱۶۷ میر انور علی
۱۶۹ محمد فخر الدین
۱۷۰ محمد عظمت اللہ خاں
۱۷۱ محمد عبدالرحیم
۱۷۲ محمد اکبر خاں
۱۷۳ محمد عبدالقادر
۱۷۶ نذیر الدین
۱۷۸ وزیر علی
۱۷۹ محمد اسمٰعیل

۴۔ مرکز کلبانی (اناث)

۱۴۱ زیب النساء بیگم (مرکز میں اول)
۱۳۹ زلیخا بیگم
۱۴۰ زاہدہ بیگم
۱۴۲ بیگم جانی
۱۴۴ محمودہ بیگم
۱۴۵ فرخندہ بی
۱۴۶ کریمہ بی
۱۵۲ سردار النساء بیگم
۱۵۳ خواجہ بانو

۵۔ مرکز پربھنی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۱۸۲ سید حسین (مرکز میں اول)
۱۸۳ مرزا واحد بیگ
۱۸۶ غلام ادریس

کامیاب

۱۸۴ شیخ محی الدین
۱۸۷ عبدالعزیز
۱۹۹ محمد ابراہیم
۲۰۱ سید روشن ہاشمی

۶۔ مرکز پربھنی (اناث)

کامیاب

۱۹۱ احمدی بیگم (مرکز میں اول)
۱۸۹ حمیدہ بیگم
۱۹۰ رابعہ بیگم
۱۹۲ حبیب النساء بیگم
۱۹۳ مہر النساء بیگم
۱۹۴ فاطمہ بی
۱۹۵ محمدی بیگم
۱۹۶ افسر بیگم
۱۹۷ رضیہ سلطانہ
۱۹۸ مصطفیٰ بیگم
۲۰۰ حلیمہ بی

۷۔ مرکز گلبرگہ (ذکور)

کامیاب

۲۰۷ محمد عبدالقادر (مرکز میں اول)
۲۰۴ محمد عثمان علی
۲۰۵ محمد عبداللہ
۲۱۵ سید سجاد احمد
۲۱۶ محمود علی
۲۱۷ محمد عبدالرحمٰن

۸۔ مرکز گلبرگہ (اناث)

کامیاب

۲۰۲ نور النساء بیگم (مرکز میں اول)

۲۱۲ کنیز فاطمہ

۹۔ مرکز کشتگی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۲۴۷ شیخ اسمٰعیل (مرکز میں اول)

کامیاب

۲۲۰ سدپا
۲۲۱ سدرامپا
۲۲۲ کرسدیا
۲۲۸ شیخ حسین
۲۴۹ ڈھونڈی با

۱۰۔ مرکز کشتگی (اناث)

کامیاب

۲۳۶ رضیہ بیگم (مرکز میں اول)
۲۴۵ عالم بی

۱۱۔ مرکز کاماریڈی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۰۰ ننگیا (مرکز میں اول)
۲۷۴ شیخ علی حسین

کامیاب

۲۵۴ بھومیا
۲۵۵ محمد ابراہیم
۲۵۶ شیخ حیدر
۲۵۸ اے ایس آر انجنیولو
۲۵۹ پٹور دھن
۲۶۱ سید حمید اللہ
۲۶۲ شیخ احمد اول
۲۶۳ شیخ احمد دوم
۲۶۴ سید کریم الدین
۲۶۵ محمد اعظم
۲۷۲ غلام محی الدین
۲۷۶ سید باقر علی
۲۷۷ محمد عبد الرزاق
۲۷۸ میر حسین علی
۲۷۹ محمد رفیع الدین
۲۸۰ سید واحد علی
۲۸۱ میراں محی الدین
۲۸۲ لوکا ملیا
۲۸۳ اپاوار پیٹیا
۲۸۷ شنکرپا
۲۸۸ گنگا ریڈی
۲۹۲ شیخ سمیع اللہ
۲۹۵ نرسلو
۲۹۷ راگھوراؤ
۲۹۸ پی متا ریڈی
۲۹۹ گلہ ونیکیا
۳۰۲ غلام احمد

۱۲۔ مرکز کاماریڈی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۰۸ نفیس فاطمہ (مرکز میں اول)

کامیاب

۳۰۹ لکشمی

۱۳۔ مرکز خانہ پور (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۱۷ عبد الصمد (مرکز میں اول)
۳۱۶ عبد الصمد

کامیاب

۳۱۰ ظہور علی خاں
۳۱۱ محمد عثمان
۳۱۲ سید اکرام حسین
۳۱۳ سید احمد
۳۱۹ سید اظہر حسین
۳۲۰ محمد عبد الستار
۳۲۱ محمد خواجہ
۳۲۲ گنگا دھر راؤ

۱۴۔ مرکز خانہ پور (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۲۴ خیر النساء بیگم (مرکز میں اول)
۳۲۷ بسم اللہ بیگم
۳۲۶ عزیز النساء بیگم
۳۲۹ رشیدہ بیگم
۳۳۱ شہزادی بیگم
۳۳۳ حمیدہ بیگم

کامیاب

۳۱۸ محبوب بانو
۳۲۸ زیب النساء بیگم
۳۳۰ مریم بیگم
۳۳۲ کریم النساء بیگم

۳۴۴ آمنہ بیگم

۱۵۔ مرکز نرسی (ذکور)

کامیاب

۳۴۹ سید امین (مرکز میں اول)
۳۲۶ مصطفیٰ خاں
۳۳۷ محمد ابراہیم
۳۴۴ ایوب علی
۳۴۵ شیخ چاند
۳۴۶ محمد ابراہیم
۳۴۷ جبار علی خاں
۳۴۸ عابد خاں
۳۵۰ سید ولی اللہ حسینی
۳۵۱ عبد الکریم
۳۵۳ رحمت علی خاں

۱۶۔ مرکز نرسی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۴۰ رفیع النساء (مرکز میں اول)
۳۳۸ اقبال النساء

کامیاب

۳۳۹ مکرم النساء
۳۴۲ اقبال النساء بیگم
۳۴۳ میمونہ خاتون

۱۷۔ مرکز پرلی (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۳۵۴ شیخ امیر (مرکز میں اول)
۳۶۱ خواجہ صدیق احمد
۳۷۰ ابوالخیر فاروقی

کامیاب

۳۵۵ محمد اسحاق
۳۵۶ سید رحیم الدین
۳۶۰ ملا محمد اسحاق
۳۶۴ سید عبدالباسط قادری
۳۶۸ اننت
۳۶۹ عبد الغنی
۳۷۱ سید اسد اللہ حسینی
۳۷۲ عبد الرب
۳۷۳ محمد ہاشم
۳۷۴ نصیر الدین
۳۷۵ ڈگمبر
۳۷۶ سلطان خاں
۳۷۷ باپو
۳۷۸ محمد قاسم
۳۷۹ کشن راؤ
۳۸۰ شیخ محبوب
۳۸۱ رؤف الحق
۳۸۳ تاج خاں

۱۸۔ مرکز پرلی (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۳۶۶ فاطمہ امت العزیز (مرکز میں اول)
۳۵۸ قمر النساء بیگم
۳۸۴ اقبال النساء بیگم

کامیاب

۳۵۷ اقبال بیگم
۳۵۹ سرلا دیوی
۳۶۲ زیتون بی
۳۶۳ عزت فرزانہ بیگم
۳۶۵ اصغر سلطانہ
۳۶۷ عائشہ امت الحمید
۳۸۵ حقانی بیگم
۳۸۶ امت الہادی بیگم
۳۸۷ افسر النساء بیگم
۳۸۸ وحید النساء بیگم
۳۸۹ صابرہ بیگم

۱۹۔ مرکز پرینڈہ

بدرجۂ امتیاز

۳۹۳ محمد خلیل (مرکز میں اول)
۴۰۶ سید احمد علی

کامیاب

۱۴۷ محمد قاسم
۳۹۰ بشیر الدین
۳۹۱ بھگوان راؤ
۳۹۲ شبیر علی
۳۹۴ محمد مظفر حسین
۳۹۶ محمود
۳۹۷ عطاء الرحمن
۳۹۸ محمد یونس
۳۹۹ عبد الغنی

۴۰۰ شیخ محمد
۴۰۱ محمد حسین
۴۰۳ محمد عبدالرحمن
۴۰۴ محمد امیرالدین
۴۰۸ نذیرالدین

۲۰۔ مرکز کپل (ذکور)

بدرجۂ امتیاز

۴۳۲ خواجہ معین الدین (مرکز میں اول)
۴۱۲ چندہ حسین
۴۱۳ ترمبک راؤ
۴۱۹ سید معین الدین علوی
۴۲۰ محمد فخرالدین

کامیاب

۴۰۹ سید سلطان محی الدین
۴۱۰ محمد عبدالرشید شاہ نوری
۴۱۴ سید حسین علوی
۴۱۵ سید فیاض الدین
۴۱۶ سید شاہد علی
۴۱۷ محمد رفیع الدین
۴۱۸ سید حسین کوتوال
۴۲۱ گنگیا نائک
۴۲۲ محمد جعفر
۴۲۳ محمد عبدالغفور
۴۲۴ محمد عبدالسلام
۴۲۶ واسدیو
۴۲۷ محمد حنیف
۴۲۸ محمد بادشاہ
۴۲۹ ایم سبویا
۴۳۰ سید قربان حسین
۴۳۱ محمد مخدوم علی
۴۳۵ سبویا

۲۱۔ مرکز کپل (اناث)

کامیاب

۴۳۳ امت العزیز

تمغے ۱۹۴۱ء کے کامیاب امیدواروں کے لئے مختلف علم دوست اصحاب کی طرف سے جو تمغے عطا کئے جا رہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

اردو فاضل

نشان سلسلہ	معطی	قسم تمغہ	نام حاصل کنندہ	وجہ تمغہ
۱	آنریبل سر عقیل جنگ بہادر	طلائی	محمد حسین اظہر	اول بہ امتحان
۲	محمد فاروق صاحب دوم تعلقدار	نقرئی	سید منظفر علی رضوی	اول بہ مرکز پربھنی
۳	محمد احسان اللہ صاحب	نقرئی	اشرف الدین فیضی	اول بہ مرکز پرلی

اردو عالم

نشان سلسلہ	معطی	قسم تمغہ	نام حاصل کنندہ	وجہ تمغہ
۱	آنریبل عبدالعزیز صاحب	طلائی	معین الدین احمد انصاری	اول بہ امتحان
۲	بزم رنداں پربھنی	نقرئی	سید داؤد	اول بہ مرکز پربھنی
۳	نواب محمد جلال الدین حسین خاں بہادر والی اسٹیٹ کلیانی	نقرئی	سید منظور احمد	اول بہ مرکز کلیانی
۴	شیخ حسین صاحب	نقرئی	سید عبدالخالق	اول بہ مرکز پرلی
۵	بلونت راؤ صاحب گھاٹے منصف	نقرئی	سعد الدین خاں	اول بہ مرکز کشتگی
۶	ہدایت احمد صاحب منصف	نقرئی	عبدالرشید	پرینڈہ

خوش نویسی

۱	ادارہ ادبیات اردو	نقرئی	محمد غیاث الدین	اول بہ امتحان
۲	سید سجاد حسین صاحب زراعتی تحصیلدار	نقرئی	سید تاج الدین	اول بہ مرکز کشٹگی

اردو دانی

۱	احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری	نقرئی	منگیا	اول بہ مرکز کاماریڈی
۲	نرسا گوڑ صاحب متاجر آبکاری	"	نفیس فاطمہ	اول بہ مرکز " (اناث)
۳	محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری	"	رضیہ بیگم	اول بہ مرکز کشٹگی (اناث)
۴	قاضی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر آبکاری	"	شیخ اسمٰعیل	اول بہ مرکز " (ذکور)
۵	سبط نبی صاحب منصف کلیانی	"	زیب النساء بیگم	اول بہ مرکز کلیانی (اناث)
۶	احمد حسین صاحب تعلقدار "	"	نظام الدین	" " " (ذکور)
۷	عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری	"	احمدی بیگم	اول بہ مرکز پربھنی (اناث)
۸	عبدالجلیل صاحب مددگار زراعت	"	سید حسین	" " " (ذکور)
۹	سید فیاض الدین صاحب سررشتہ دار عدالت منصفی	"	محمد خلیل	" " پرینڈہ
۱۰	سید قدرت اللہ صاحب قادری صدر مدرس تحتانیہ جالنہ	(نقرئی)	عبدالرشید	دوم " "

ان کے علاوہ امتحان اردو دانی میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونے والے جملہ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے آسان اور دلچسپ کتابیں بطور انعام دی گئیں۔

تبدیلی کتب نصاب

اردو امتحانات کی مجلس نصاب کی تحریک اور مجلس انتظامی کی منظوری کے بعد اردو عالم، اردو فاضل اور خوشنویسی کی نصابی کتابوں میں حسب ذیل تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ سنہ ۱۳۵۱ف م سنہ ۱۹۴۲ء کے امتحانوں کے لئے انہی تبدیل شدہ کتابوں کی تیاری لازمی ہے۔

امتحان	پرچہ	سابقہ کتاب	حالیہ کتاب
امتحان اردو عالم	پہلا	سی پارۂ دل یا	باغ و بہار مطبوعہ
"	"	چٹکیاں و گدگدیاں	اعظم اسٹیم پریس
"	"	قواعد اردو حصہ دوم	قواعد اردو حصہ سوم
"	دوسرا	تلخیص عروض یا حصر و عروض	بلاغت
امتحان اردو عالم	چوتھا	دنیا کی کہانی	اجتماعی زندگی کی ابتدا
"	پانچواں (خوشنویسی)	رسم الخط نذیر احمد	اردو رسم خط سجاد مرزا صاحب
امتحان اردو فاضل	پہلا	مضامین چکبست	آب حیات
"	تیسرا	آب حیات	جدید اردو شاعری
"	چوتھا	اجتماعی زندگی کی ابتدا	دنیا کی کہانی
"	"	آئین حکومت	۱۔ سیاسیات کی پہلی کتاب
"	"	"	۲۔ ہندوستان کی
"	"	"	برطانوی حکومت

" پانچویں پرچہ میں سنہ ۱۹۴۲ء اور سنہ ۱۹۴۳ء کے لیے حسب ذیل دو مصنفین میں سے کسی ایک کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ اقبال و شبلی۔

امتحان خوشنویسی۔ ایک پرچہ کی جگہ دو پرچوں میں لیا جائے گا۔ جس کا نصاب حسب ذیل ہے۔

پہلا پرچہ۔ ۱۔ انشائے نور احمد ۲۔ رسم خط آموز اظہر الدین صاحب

دوسرا پرچہ:۔ ۱۔ رسم خط از سجاد مرزا صاحب۔ ۲۔ رسم خط ... ۳۔ قواعد اردو حصہ سوم سررشتہ تعلیمات کا آخری حصہ متعلقہ اوقاف۔

ایک نئے امتحان کا آغاز یعنی امتحان اردو زباندانی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی منعقدہ ۱۴ آذر ۱۳۵۰ف نے مجلس اردو امتحانات کی حسب ذیل تجویز منظور کرلی ہے جس کی بنا پر ۱۳۵۱ف م ۱۹۴۲ء کے امتحانات کے ساتھ اردو زبان دانی کا بھی امتحان لیا جائے گا جس کی تفصیل یہ ہے۔

گزشتہ دو سال کے عرصہ میں اردو امتحانات کے متعدد مرکزوں اور ادارہ کی شاخوں نیز بیسیوں امیدواروں کی استدعا اور درخواست کی بنا پر یہ مجلس ایک ایسے امتحان کے قیام کی سفارش کرتی ہے جو اردو دانی اور اردو عالم کے امتحانوں کے درمیان ان امیدواروں کی سہولت کے لئے لیا جائے گا جنھوں نے اردو دانی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھی ہے اور جو چاہتے ہیں کہ علم کے اس ذوق میں اضافہ کریں جو امتحان اردو دانی کی تیاری اور لکھنے پڑھنے کی دنیا میں داخل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

(۱) اس امتحان کا نام امتحان اردو زباں دانی ہوگا۔

(۲) اس کا معیار سررشتۂ تعلیمات (کمشنری امتحانات) کے امتحان زباں دانی کے مماثل ہوگا۔ اور حکومت سرکار عالی کے جو دوسرے سررشتے اردو زباں دانی کا امتحان لیتے ہیں ان کے امتحانات سے بھی اس کی مماثلت برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۳) اس امتحان میں حسب ذیل دو پرچے تین تین گھنٹے کے ہوں گے اور ان کے علاوہ سو نشانات زبانی امتحان کے لئے مختص رہیں گے۔

پہلا پرچہ۔ نثر و نظم و قواعد .... ۱۰۰ نشانات

دوسرا پرچہ۔ پہلا حصہ (لازمی) مضمون نگاری و خلاصہ نویسی .... ۵۰ "

اس حصہ میں مضمون نگاری کے لئے ۳۵ اور خلاصہ نویسی کے لئے ۱۵ نشانات مخصوص رہیں گے اور اس میں جملہ امیدواروں کا امتحان لیا جائے گا۔

دوسرا حصہ۔ (اختیاری) .... ۵۰ نشانات

اس حصہ کے لئے حسب ذیل مضامین میں سے کسی ایک کی تیاری کرنی ہوگی۔

(۱) ترجمہ تلنگی یا مرہٹی یا کنڑی سے اردو میں۔

(۲) عام معلومات۔

(۳) ابتدائی امور خانہ داری (برائے طبقۂ اناث)

(۴) امتحان اردو زباں دانی کے لئے کامیابی کے نشانات ۳۳ فیصد اور کسی پرچے میں ۲۵ فیصد سے کم نہ ہوں گے۔

(۵) اس امتحان کی فیس شرکت عام امیدواروں سے چار روپے اور ان امیدواروں سے چھ روپے لی جائے گی جو کسی سرکاری محکمہ کی طرف سے اس امتحان میں شریک کیے جائیں گے۔

(۶) اس امتحان کے ہر دو تحریری پرچوں کا نصاب حسب ذیل ہوگا۔

پہلا پرچہ۔ نظم و نثر و قواعد۔ ۱۔ اردو کی چھٹی کتاب مرتبہ انجمن ترقی اردو۔ ۲۔ قواعد اردو حصہ اول مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب

دوسرا پرچہ۔ عام معلومات کے لئے "شہری اور دیہی معلومات" از غلام رسول صاحب اور ابتدائی امور خانہ داری کے لئے "خانہ داری" مرتبہ ادارہ ادبیات اردو۔

امتحان کے مرکزوں کی رودادیں

مرکز خانہ پور | ڈاکٹر عبدالغفار بیگ صاحب بی وی ایس کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے:

میں بہ حیثیت صدر نگران کار مرکز خانہ پور بتاریخ ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء شام کی لوکل ٹرین سے نظام آباد روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر ڈاکٹر زور صاحب، پروفیسر سروری، مسٹر فیض محمد، مسٹر غلام جیلانی اور مہتمم صاحب ادارۂ ادبیات اردو نے خدا حافظ کہا۔ رات کے گیارہ بجے ٹرین نظام آباد پہونچی۔ اسٹیشن پر ناظر علی صاحب سے ملاقات ہوئی جو مرکز خانہ پور سے مجھ کو لینے آئے تھے۔ صبح چھ بجے کی بس سے براہ نرمل ناظر علی صاحب کے ساتھ روانہ ہوا۔ ساڑھے دس بجے بس نرمل پہونچی۔ یہاں عبدالوہاب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو مثل ناظر علی صاحب میرے لینے کے لئے مرکز خانہ پور سے آئے تھے۔ خانہ پور بس اسٹانڈ پر شریک معتمد صاحب، طلبا، مدرسین، سب انسپکٹر صاحب آبکاری وغیرہ موجود تھے۔ مہتمم صاحب جنگلات کے مکان پر میرے قیام اور طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ جہاں میرا تعارف حسب ذیل اصحاب سے کرایا گیا۔ مہتمم صاحب جنگلات، تحصیلدار صاحب، انسپکٹر آبکاری، منتظم صاحب پولیس، ڈاکٹر صاحب وغیرہ۔ ادارۂ ادبیات کی خصوصیات اور ساتھ ہی اردو شاہ کار پیڈیا کے کام کا ذکر رہا۔

لوکل مدرسہ میں فرنیچر کی کمی کی وجہ سے امتحان مہتمم صاحب جنگلات کے مکان میں منعقد کیا گیا۔ امتحان خیر خوبی سے ختم ہوا۔ زبانی امتحان تحصیلدار صاحب کے مکان میں لیا گیا۔ جس کا انتظام مسز نورالدین اور مہرالنسا بیگم صاحبہ نے کیا تھا۔

خانہ پور کی آبادی تقریباً ۳۰۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس گاؤں کے اطراف گھنا جنگل ہے۔ جہاں ہر وقت اور خصوصاً رات کے وقت درندوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس مقام پر افلاس زیادہ ہے اس موضع کے لوگ زیادہ تر لکڑی کی تجارت کرتے ہیں۔ اور یہاں گنڑے کا کام بھی اچھا ہوتا ہے۔ امتحان ادارہ کے مطبوعہ اعلان کے بموجب مقررہ دنوں اور تاریخوں میں لیا گیا۔ مہر بند لفافہ پرچہ جات دو گواہوں کو دکھانے کے بعد اور ان کے دستخط لینے کے بعد چاک کیا گیا۔ جسٹس لچھا ریڈی رکن عدالت العالیہ نے جو بغرض تفریح خانہ پور آئے ہوئے تھے امتحان گاہ اور اس کے انتظام کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ خاص خصوصیت اس مرکز کی یہ تھی کہ تمام امیدوار جو امتحان میں شریک تھے سفید شیروانیوں میں ملبوس تھے۔

نورالدین صاحب بی اے، ایل ایل بی (عثمانیہ) اس تعلقہ کے تحصیلدار ہیں اور جب کبھی آپ مستقر پر رہتے ہیں طلبا کو درس دیا کرتے ہیں۔ الحاج عبدالکریم صاحب مہتمم جنگلات دفتری معلومات کی تعلیم دیا کرتے تھے اور آئندہ بھی اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد خلیل صاحب جو مستقر کے ڈاکٹر ہیں طلبا کو سائنس کا درس دیا کرتے تھے اور آئندہ بھی اپنی فرصت میں اس مشغلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

شمس الدین صاحب منتظم پولیس خود امتحان اردو فاضل میں شریک تھے۔ اور انھوں نے طلبا کو دامے۔ درمے۔ سخنے۔ غرض ہر طرح کی مدد کی ہے۔ اور سچ کہا جائے تو یہی اس مرکز کے روح رواں ہیں۔

عبدالرشید صاحب شاخ کے نائب معتمد ہیں اور معتمد صاحب کی غیر حاضری میں معتمدی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

تحصیلدار صاحب کی بیگم صاحبہ لڑکیوں کو سیون اور پکوان کی بھی تعلیم دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی امتحان اردو دانی کے لئے تیار بھی کیا ہے۔

مہرالنسا بیگم نے بھی جو زنانہ مدرسہ کی معلمہ ہیں لڑکیوں کو امتحان اردو دانی کے لئے تیار کرنے میں مدد دی۔

مرکز کاماریڈی | مولوی سید کاظم حسین صاحب بی اے (مدراس) اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔ مرکز کاماریڈی سے اس سال امتحان اردو دانی میں منجملہ ۶۰ درخواست گزاروں کے ۴۶ نے شرکت کی جن میں طلبہ کی تعداد ۴۴ اور طالبات کی ۲ رہی۔ امتحان ۱۵ ار اور ۱۶ ار مہر ۱۳۵۰ف کو مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی میں منعقد ہوا۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری نے قبل از قبل نشستوں کا معقول انتظام کیا تھا۔ مولوی عبدالرزاق صاحب نے جو دفتر انسپکٹر آبکاری کے اہلکار ہیں نگرانی میں کافی مدد دی۔

امیدواروں میں اکثر و بیشتر اطراف و اکناف کے قصبہ جات کے رہنے والے تھے۔ ہر امیدوار تھوڑی بہت اردو بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ اگر انھیں کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ امیدواروں کو فراہم کر سکتے انھوں نے کاماریڈی میں ادارہ کی شاخ قایم کرنے کا خیال بھی ظاہر فرمایا۔ کاماریڈی میں گو انجمن اتحاد المسلمین کی ایک شاخ قایم ہے لیکن اس سے اردو امتحانات کو عوام میں مقبول بنانے میں کسی قسم کی توقع نہیں۔ البتہ اگر ادارہ کی شاخ قایم ہو جائے تو آئندہ ترقی کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے۔

مدرسہ وسطانیہ کاماریڈی کے اساتذہ صاحبان ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں بشرطیکہ انھیں اس پر آمادہ کیا جائے اور یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سال امتحان اردو دانی میں ایک گریجویٹ یعنی طیلسانی بھی شریک تھے۔

مولوی واحد علی صاحب سب انسپکٹر آبکاری نے بھی اپنے حلقے سے چند امیدوار امتحان میں شریک کروائے۔

مرکز کشتگی | مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی بی اے کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے :۔ میں کشتگی بروقت پہنچا اور پرچوں کی تقسیم بروقت عمل میں آئی۔ امتحان گاہ کے لئے مدرسہ کی عمارت مخصوص کی گئی تھی۔ شرکا امتحان تو بہت زیادہ تھے لیکن وبائی امراض اور سقامت ہنگام کی وجہ سے امتحان کے وقت متعدد غیر حاضر تھے۔ نگرانی کا معقول انتظام کیا گیا۔ اردو دانی کے امتحان کے دن مولوی محمود حسین صاحب صدر مدرس اور ان کے ایک مددگار نگرانی کے لئے موجود رہے اور بعد کے دو دنوں میں دوسرے دو دو مدرسین نے نگرانی کے فرائض انجام دئے۔ سقامت ہنگام نے تو اب یہاں تک نوبت پہنچا دی ہے کہ سڑک کے علاوہ دور دراز کے کچے راستوں پر تنہا سفر خطرے سے خالی نہیں۔ کشتگی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ان کو تعلیم دینے کے فرائض بھی عہدہ داران مقامی نے اپنے تفویض کر لئے تھے اور رات میں دس بجے تک درس و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ لیکن ان میں بھی حاضر رہنے والے وہی لوگ ہوتے جن کا مستقر ہی کشتگی ہے اور جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ دونوں امتحانات کے موقعوں پر عہدہ داران مقامی نے نہ صرف شرکا امتحان ادارہ کو ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ دوران امتحان میں امتحان ہال میں تشریف لا کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا اور نہ صرف علم دوستی کا بلکہ میرے المکلف والداعی بن کر مہمان نوازی کا بھی۔

میرے محترم میزبانوں کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس وقت ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ویسے پرخلوص الفاظ بھی نہ مل سکے۔

مرکز کپل | مولوی خیرالدین صاحب وکیل دو اعظا کی روداد مرکز کا خلاصہ یہ ہے :۔ اسٹیشن کپل پر مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی اے ڈپٹی مہتمم تعلیمات ضلع کپل و دیگر اراکین ادارہ موجود تھے۔ موصوف نے میرے قیام اور دیگر امتحانات سے متعلق جملہ امور میں میری پوری امداد فرمائی۔

امتحانات مدرسہ فوقانیہ کی عمارت میں لئے گئے۔ ٹھیک وقت مقررہ پر بموجودگی مولوی سید عبدالحی صاحب مہتمم کوتوالی و مولوی بہادر خاں صاحب وکیل و مولوی مرزا سرفراز علی صاحب امتحانات کے پرچے جو سربمہر تھے کھولے گئے اور طلبہ کو تقسیم کئے گئے اور ختم وقت پر جملہ کاپیاں امتحان گاہ میں سربمہر کی گئیں اور یہی عمل جملہ پرچہ جات کے لئے کیا گیا۔

مرکز اناث مدرسہ سے قریب ایک مدرس صاحب کے مکان میں تھا اس کی نگران کار ایک مدرس صاحب کی اہلیہ تھیں۔

ختم امتحان پر ۱۸ ار مہر ۱۳۵۰ف کو ۱/۲ ۵ بجے شام کو مدرسہ فوقانیہ

کپل میں امتحانات ادارہ کے قواعد کے عنوان پر ایک تقریر کے لئے جلسہ قرار دیا گیا جس کی صدارت پنڈت وینکوبا راؤ صاحب اول تعلقدار ضلع کپل نے فرمائی۔ ابتداء میں تے اردو امتحانات پر ایک تقریر کی جو بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد مسٹر لکشمن اچاری کپل اور ایک دوسرے وکیل صاحب اور مرزا سرفراز علی صاحب مہتمم تعلیمات کپل کی تقریریں ہوئیں۔ صدارتی تقریر میں تعلقدار صاحب نے اردو کے امتحانات سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ اور ادارہ ومفر کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسہ میں تمام عہدہ داران کپل معززین رعایا وطلبہ کا کافی مجمع تھا۔

مرکز کپل کے امتحانات میں ایک امر نہایت مسرت بخش قابل اظہار ہے کہ مدرسہ فوقانیہ سے عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کی خدمت میں تحریک کی گئی تھی کہ امتحانات ادارۂ ادبیات اردو مدرسہ کی عمارت میں لینے کی اجازت دی جائے۔ عالیجناب نواب صاحب نے اس کی اجازت بطور خاص عطا فرمائی جس سے ان کی اردو سے دلچسپی ظاہر ہے۔

ادارے کی شاخیں

ہمنا باد ۲۰ آبان ۱۳۵۰ف کو ہمنا باد میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں ادارہ کی شاخ کے لئے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۔ سید اسمٰعیل صاحب وکیل ہائیکورٹ .... صدر
۲۔ مولوی سید شیر الزماں صاحب سوداگر......... معتمد
۳۔ ،، مرزا فقیر محمد بیگ صاحب .... رکن انتظامی
۴۔ ،، احمد خان صاحب .... ،،
۵۔ ،، سید امیر محمد صاحب سوداگر......... ،،
۶۔ ،، محمد مستان علی صاحب سوداگر......... ،،

کپل حسب تحریک مولوی مرزا سرفراز علی صاحب بی اے بی ٹی (ڈپ ایڈ ڈبلن) مہتمم تعلیمات ضلع کپل بتاریخ ۱۱ فروردی ۱۳۵۱ف اس شاخ کا آغاز ہوا۔

مولوی محمد حسین صاحب مدرس ذہلیہ پابے نے معتمدی و مولوی حاجی عبدالرزاق صاحب پیش امام مسجد یوسفیہ نے نائب معتمدی و مولوی قاضی امین الدین صاحب نے منتظمی کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے اراکین ادارہ ہذا مولوی میر سعادت علی صاحب و مولوی سید امین الدین صاحب وکلا و مولوی سید فیض علی صاحب و عبدالرشید صاحب مدرسین مدرسہ فوقانیہ کے تعاون سے کپل کو مرکز قرار دینے میں انتہائی جدوجہد سے کام لیا جو مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ کپل کی عمارت میں حسب منظوری عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ مرکز قرار پایا۔

مولوی خیر الدین صاحب نے صدر دفتر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے اس مرکز کی صدارت کی اور بطور امداد عالیجناب مہتمم صاحب تعلیمات و مولوی سید اختر علی صاحب بی اے و مولوی فیض علی صاحب مولوی کامل و مولوی محمد قمر الدین صاحب بی اے مسٹر نارائن راؤ صاحب بی ایس سی و مہنت راؤ صاحب گنگاوتی سرینواس راؤ صاحب مدرسین مدرسہ فوقانیہ اور زنانہ کے لئے مولوی سید فیض علی صاحب کی اہلیہ محترمہ نے نگرانی کی۔

بعد ختم امتحان بتاریخ ۱۱ بہمن ۱۳۵۰ف بوقت ۵ بجے شام بجانب ادارہ جلسہ منعقد ہوا جس میں جملہ معزز عہدہ داران مقامی و وکلا وغیرہ شریک رہے۔ حسب تحریک مہتمم صاحب تعلیمات و تائید مولوی قمر الدین صاحب عالیجناب وینکوبا راؤ صاحب تعلقدار ضلع کپل نے کرسی صدارت کو شرف بخشا۔

صدر نگران کار مولوی خیر الدین صاحب نے موضوع "امتحان" کی تشریح فرماتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور اس کے امتحانات کا تعارف کرایا۔ پھر مسٹر لکشما چاری صاحب وکیل نے تقریر کی۔ آخر میں انھوں نے اپنی مادری زبان کی تحصیل کی اہمیت اور ساتھ ہی ساتھ امتحان ادارہ کے تحصیل کی ترغیب دی پنڈت جنار دھن راؤ صاحب ایل ایل بی نے تشریح کی کہ پنڈت موصوف کے خیالات میں ہمیں فائدہ معلوم نہیں ہوتا پورے ہندوستان اور خاص کر

دکنیوں کو اردو کی تحصیل سے ضروریات زندگی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد مہتمم صاحب تعلیمات کپل کی تقریر نے تضیع اوقات کرنے والوں اور غافلوں کو تازیانہ کا کام کیا یہ فرمایا کہ "بیکار نہ رہ کچھ تو کیا کر" کا مفہوم اس طرح ادا ہوگا اور کچھ نہ کچھ تو کیا بہت کچھ حاصل ہو جائے گا اور ثابت کر دیا کہ انسان حصول علم سے انسان کہلانے کا مستحق ہے لہذا موقع کو غنیمت جان کر ان امتحانات میں شریک ہونے اور انسان بننے کی طرف تشویق دلائی جس سے علم سے گریز کرنے والوں میں بھی شوق پیدا ہوگیا۔

عالیجناب پنڈت وینکوب راؤ صاحب تعلقدار صدر نشین جلسہ نے قیام شاخ ادارہ سے خوشنودی ظاہر فرماتے ہوئے شرکاء کو مبارکباد دی اور حوصلہ افزا الفاظ سے جلسہ کو کامیاب بنایا۔

۱۸ مہر ۱۳۵۰ف ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں باتفاق آرا شاخ ہذا کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے۔

صدر۔ مولوی سید فیض علی صاحب مولوی کامل

معتمد۔ " محمد حسین صاحب مدرس وظیفہ یاب

نائب معتمد " حاجی عبدالرزاق صاحب پیش امام

منتظم " محمد امین الدین صاحب قاضی و مدرس

اراکین :-

۱۔ مولوی محی الدین شریف صاحب قاری

۲۔ " اختر علی صاحب بی اے

۳۔ مسٹر نارائن راؤ صاحب بی یس سی

۴۔ مولوی میر سعادت علی صاحب وکیل

۵۔ " عبداللہ خان صاحب رئیس کپل

۶۔ " فضل الرحمن صاحب حکیم یونانی

۷۔ " حسین شریف صاحب وکیل

۸۔ " نورالدین صاحب صیغہ دار تحصیل کپل

۹۔ " مرتضی قادری صاحب خوشنویس

۱۰۔ " محمد عبدالرشید صاحب مدرس

۱۱۔ مسٹر بشنو پنت صاحب ناظر تعلیمات ضلع کپل

۱۲۔ مولوی عبدالسبحان صاحب مدرس

۱۳۔ " محمد سرور صاحب مدرس

۱۴۔ " شرف الدین صاحب "

۱۵۔ " محمد عبدالملک صاحب تاجر اسٹیشنری مارٹ

۱۶۔ " عبدالحق صاحب صدر مدرس یلبرگہ

۱۷۔ " سید محبوب حسین صاحب صدر مدرس ہٹن ہال

پربلی شاخ ادارہ ادبیات اردو پربلی کا ایک غیر معمولی جلسہ بصدارت حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) بتاریخ ۲۳ مہر ۱۳۵۱ف روز جمعہ منعقد ہوا جس میں پربلی کے اصحاب ذوق اور علم دوست حضرات کے علاوہ محمد یسین صاحب جلالی اور سید داؤد صاحب ہاشمی اراکین ادارہ ادبیات اردو پربھنی نے بھی شرکت فرمائی۔

معتمد شاخ پربلی نے تفصیلی رپورٹ سنائی جس کا اقتباس یہ ہے۔

یکم تیر ۱۳۵۰ف کو ایک جلسہ منعقد ہوا اور باتفاق آرا منظور کیا گیا کہ پربلی میں ایک شاخ قائم کی جائے جس کے صدر حکیم مولوی فخرالدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) معتمد غلام حسن صدیقی خطیب اور اراکین مولوی سید عبدالرزاق صاحب جعفری مولوی افلاطون خاں صاحب آمین، مولوی اشرف الدین صاحب فیضی، ابوالخیر فاروقی اور محترمہ طاہرہ سلیم صاحبہ مقرر کئے گئے۔

حضرات! حقیقت یہ ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کی قدروقیمت اور اس کی حقیقی اہمیت نے ہمیں بھی واقعیت پسند اور حقائق آشنا بنادیا ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں تھا کہ صرف برائے نام پربلی میں شاخ قائم کردی جائے اور کام کی جگہ خالی رہے۔ جب شاخ کا قیام ہو چکا تو ہم لوگ بے محابا کام کی طرف دوڑ پڑے، چنانچہ حالیہ امتحان میں یہاں سے "اردو دانی" میں (۳۶) امیدوار شریک ہوئے، جن میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور ہندو مسلم سب ہی شریک ہیں۔ اسی امتحان کے ایک امیدوار کا ذکر

اس موقع پر شاید بے موقع تصور نہ فرمایا جائے گا۔ یہ صاحب ایک متمول اور سربرآوردہ خاندان کے سرپرست اعلیٰ ہیں ان کی عمر اندازاً و تخمیناً نہیں بلکہ حقیقت میں (۵۷) سال ہے ہماری کوششوں کا داؤ ان پر بھی چل گیا۔ چنانچہ وہ اس امتحان میں شریک ہیں اور اپنی مثال سے دوسرے ان پڑھ نوجوانوں کو درس شوق دے رہے ہیں۔

حضرات! یہ امتحان "اردو دانی" کا ذکر تھا۔ "اردو عالم" میں سر آغاز کار گیارہ امیدوار تعلیم پاتے رہے ان سب کی تعلیم اور باقاعدہ تدریس کا مفت بندوبست کیا گیا تھا۔ اسی طرح "اردو فاضل" میں چار امیدوار تعلیم پاتے رہے ان کی تعلیم کا بھی مفت انتظام کیا گیا تھا مگر بعض موانع کی وجہ سے دو شریک امتحان ہوئے۔

محترم حضرات! آخر میں، میں ایک مکتوب کا مختصر اقتباس آپ حضرات کو سنانا چاہتا ہوں۔ خط لکھنے والی ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون سیدہ عزیز النساء بیگم ہیں اور مدرسہ نسواں اردو میڈیم بیڑ کی صدر معلمہ ہیں۔ اس اقتباس سے آپ حضرات اس امر کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس قلیل مدت میں اس شاخ نے کس قدر شہرت اور اس کے کام نے کس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے۔

"قابل فخر ہیں ڈاکٹر زور اور وہ ہستیاں جنھیں طبقہ اناث کی تعلیم اور ان میں بیداری پیدا کرنے کا خیال آیا۔ مجھے یہ سن کر دلی مسرت ہوئی کہ ضلع بیڑ میں اس کام کی پہل مولوی غلام حسن صاحب صدیقی اور آپ (مولوی اشرف الدین صاحب فیضی) نے کی، پرلی امتحان گاہ سے اول آنے والی امیدوارہ کو میں انعام دوں گی۔"

حضرات! اس سال یہاں جو امتحانات ہوئے ان کی صدر نگرانکاری کے فرائض جناب پروفیسر مہدی علی صاحب نے انجام دیئے۔ صاحب موصوف نے یہاں تک تکلیف گوارا فرما کر اور ہمارے ناچیز کام کا عینی مشاہدہ فرما کر صرف یہی نہیں کہ ہم کو ممنون کرم فرمایا ہے بلکہ ہماری ہمتوں میں ایک نئی تازگی اور ہماری علالت میں اک تیزی کی روح پھونک دی ہے۔ ہمیں محترم پروفیسر صاحب سے توقع ہے کہ ہماری شاخ کے مخصوص حالات اور ہماری پُرخلوص خدمات ادب، ارباب ادارۂ ادبیات اردو پر ظاہر فرمائے جائیں گے۔ اس موقع پر اگر میں ایک باہمت شخص کی پیہم کوششوں اور نت نئی ہمدردیوں کا ذکر نہ کروں تو میری احسان فراموشی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کیا دھرا مولوی اشرف الدین صاحب فیضی کا ہے، ان کی کوشش اور قدم قدم پر رہنمائی اگر شامل حال نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

حسب احکام صدر ادارہ، نشان ۸۵۲/۴ مورخہ ۱۰ ؍ مہر ۱۳۵۰ف حسب ذیل کابینہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر حکیم مولوی فخر الدین صاحب منشی فاضل (پنجاب) معتمد غلام حسن صدیقی۔
خازن:۔ مولوی محمد نواز الدین صاحب کتب خانہ دار مولوی سید عبد الرزاق صاحب جعفری
اراکین:۔ مسٹر دینا نوبار اؤ ہوکے (عثمانیہ) مولوی افلاطون خاں صاحب آمین، مولوی شیخ حسین صاحب، محترمہ طاہرہ بیگم صاحبہ، محترمہ نیاز النساء بیگم صاحبہ، مولوی اشرف الدین صاحب فیضی فتح آبادی۔

اس کے بعد جناب صدر نے ایک معلومات آفریں صدارتی تقریر فرمائی آخر میں مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے معزز مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اعلیحضرت سلطان العلوم، خانوادۂ آصفی اور بانیٔ ادارہ محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صحت و سلامتی کی دعا پر جلسہ ختم ہونیکا اعلان فرمایا۔

عطیۂ مخطوطات | عالیجناب نواب عنایت جنگ بہادر نے ازراہ علم دوستی ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ مخطوطات کے لئے قدیم دکنی اردو کی قلمی اور نادر حسب ذیل اکیس ۲۱ مجلد کتابیں عطا فرمائی ہیں۔

تحفۃ الاحباب، راجی۔ سیف الملوک بغواصی۔ پنچھی باچا، وجدی۔ محبوب القلوب، دین دیپک، الفت۔ روضۃ الشہدا، ولی۔ حملۂ حیدری۔ صفا چندر بدن مہیار، مقیمی۔ چندر بدن مہیار، محمد باب۔ دیوان شیر محمد خاں، ایمان۔ ترجمہ شرح پنجمی۔ دیوان میر (فارسی و اردو) کلیات سودا۔ چہار درویش، میر امن دہلوی۔ قصہ اگر گل ہمیشہ بہار، نواب میر حسین علیخاں۔ رقعات بہار عالم۔ مرغوب، نواب میر حسین علیخاں۔ چہار درویش نواب میر حسین علیخاں۔ مذہب عشق۔ مثنوی بدر منیر۔

ادارہ کی طرف سے نواب صاحب موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

سب رس

جلد ۴ — بابت ڈسمبر ۱۹۴۱ء — شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

قطعہ تاریخ رحلت مولوی شوکت علیخاں فانی

شاعر نامی و صورت گر فطرت فانی　　وصل باقی کے لئے کر گئے رحلت فانی
لوح تربت پر لکھو مصرع تاریخ جلیل　　دہر فانی سے سدھارے سوے جنت فانی

۱۳۶۰ھ

فصاحت جنگ بہادر جلیل

بھوک

روتا ہے میرے ہمسائے کا بچہ کیا کروں

جی میں آتا ہے طبیعت کی روانی بیچ دوں
ایک دوشیزہ کی الفت کی کہانی بیچ دوں
جو کبھی نرم و حسیں باہوں میں گھبراتی رہی
ایک روٹی کے عوض وہ نوجوانی بیچ دوں
جو دھڑکتی چھاتیوں میں آرزو بن کر بسی
چند ٹکڑوں کے لئے وہ زندگانی بیچ دوں
جو کسی کی مدھ بھری آنکھوں میں محو رقص ہے
دل یہ کہتا ہے وہ انگوروں کی رانی[1] بیچ دوں
جو جوانی کے اجڑ جانے پہ بھی محفوظ ہے
آج کوئی لے تو وہ اشکوں کا پانی بیچ دوں
جو جوانی نے عطا کی ان کی چشم مست کو
میرے بس میں ہو تو وہ جادو بیانی بیچ دوں
یہ زمیں یہ آسماں یہ رفعتیں یہ عظمتیں
ایک بچے کے لئے دنیائے فانی بیچ دوں

روتا ہے میرے ہمسائے کا بچہ کیا کروں

الطاف مشہدی

[1] شراب
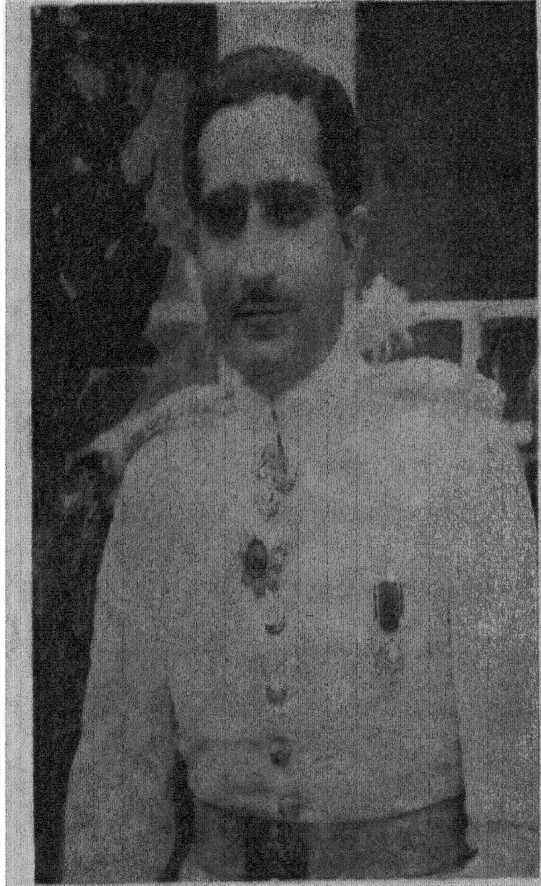
نواب علی یاور جنگ بہادر بی۔اے (آکسن)
معتمد محکمۂ امور دستوری و سابق پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ
صدر شعبہ تاریخ دکن انڈین ہسٹری کانگریس
(اجلاس پنجم منعقدہ حیدرآباد)

ہمدردانِ اردو سے ایک گزارش

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس وقت ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں نے پاکستان کا نعرہ بلند کر رکھا ہے ان کا مطالبہ ہے کہ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں انھیں اپنی حکومت قایم کرنے کی اجازت دی جائے۔ مجھے اس وقت مسلمانوں کے اس مطالبہ کے حسن و قبح سے بحث نہیں یہ ایک قطعاً جداگانہ موضوعِ بحث ہے۔ اگر اڈیٹر صاحب ماہنامہ "سب رس" نے اجازت دی تو اس پر پھر کبھی اپنی رائے پیش کروں گا۔ اس وقت البتہ اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ردِ عمل سے بیگانہ سیاست کو دیکھتے ہوئے اس تمنا کے بر آنے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے۔ میں نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ جس چیز پر مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ہے مسلمان اسی کی طرف سے غافل اور لاپروا ہیں۔ اگر آپ نے کبھی ہندوستانی سیاسیات پر غور کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے کی نوعیت مذہبی نہیں بلکہ لسانی ہے۔

زبان اور ادب کی اہمیت و ضرورت پر میں اس سے قبل بھی اپنی رائے پیش کر چکا ہوں۔ ہندوؤں نے اس معاملہ کو پوری طرح سمجھ لیا ہے اس لئے وہ اب اپنی تمام کوششیں ہندی ہی نہیں بلکہ سنسکرت زدہ ہندی کو آگے بڑھانے پر صرف کر رہے ہیں۔ اور میری ذاتی رائے یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت و کدورت کا پہلا بنیادی پتھر ٹھیک اس وقت رکھا گیا جب ہندوؤں نے زبان اور ادب کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کر کے اردو کو مسلمانوں کا رسم خط کہنا شروع کیا۔ اور اس کی جگہ پر سرکاری اور نیم سرکاری تحریروں میں دیوناگری رسم خط کو نافذ کرنے پر اصرار کیا۔ اس کے بعد نہایت منظم طور سے ان تمام اثرات کو ایک ایک کر کے مٹا دینے کی مسلسل کوشش شروع کر دی جو مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے سے ہندوستانی زبان پر پڑ چکے تھے۔ یعنی عربی اور فارسی کے عام فہم، رائج اور مشہور الفاظ کو خارج کر کے ایک جدید زبان کی تشکیل کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس زبان کا نام ہندی قرار پایا۔ ابتدا میں اس ہندی اور اردو میں صرف رسم خط کا فرق تھا مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنا چولا بدلنا شروع کیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، بابو راجندر پرشاد جیسے لوگوں نے بھی جو اچھی خاصی اردو لکھتے اور بولتے تھے ہر عربی اور فارسی لفظ کے لئے سنسکرت کا لفظ ڈھونڈنا شروع کیا۔ اس جدید زبان میں کتابیں لکھی گئیں۔ رسالے جاری کئے گئے۔ ہندو یونیورسٹی بنارس اور گجرات وغیرہ کے ودیا پیٹھوں میں اس زبان کی تعلیم شروع ہوئی۔

جس تیز رفتار کے ساتھ اردو اور ہندی دو قطعاً جداگانہ زبانیں بنتی رہیں اسی رفتار کے ساتھ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان غیریت اور جدائی کی ایک بہت وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ زبان کے اس سوال نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے کاٹ کر الگ کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آج دونوں قومیں ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات سے ناآشنا ہو گئی ہیں۔ زبان کے سوال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کاغذ کی طرح پھاڑ دیا ہے۔ ہندی اور اردو کا امتیاز دراصل زبان کا امتیاز نہیں بلکہ دلوں کا امتیاز تھا۔ جوں جوں زبانیں دو ہوتی گئیں دلوں میں بھی فرق آتا گیا۔ زبان کے اس جھگڑے کو چند لفظوں کا جھگڑا قرار دینا غلطی ہے۔ یہ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی احساسات کا بیرونی مظہر ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہندی زبان نام ہے زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہو جانے کی عملی کوشش کا۔

الغرض ہندوؤں نے اپنے عمل سے اس بات کا بالکل صاف اعلان کردیا ہے کہ وہ اپنی دنیا مسلمانوں سے بالکل الگ ہو کر بسانا چاہتے ہیں۔ اور ہندوستان میں صرف اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں جو گاتری کا جاپ کر سکتا ہے اور گائے کی پوجا ــــ ہندو اب کھلے طور پر اردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو اپنی زبان کہتے ہیں۔ موجودہ ہندی نصف صدی کی انتھک محنت کے بعد تیار کی گئی ہے۔ اس لئے وہ اسے چھوڑنے کو کیسے رضا مند ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اب ہندوؤں سے اس بات کا شکوہ ہی بالکل فضول ہے کہ وہ اردو کے مقابلہ میں ہندی کو کیوں بڑھا رہے ہیں وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ کی نشانی اب یہ توقع بھی عبث اور لے کار ہے کہ آئندہ کبھی ہندوؤں میں سرشار اور سر تیج بہادر سپرو جیسے لوگ پیدا ہوں گے۔ اب وہ آپ کے ساتھ مکتبوں میں بیٹھ کر گلستاں اور بوستاں پڑھنے کے لئے تیار نہیں اور نہ آپ کسی طرح انھیں اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں اندریں حالات یہ سوال اٹھانا کہ اردو کو ہندو کیوں مٹا رہے ہیں؟ ایک بے کار بات ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو اگر مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان اسے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو وہ اس کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ اور اردو کے احیا، و بقا اور نیز اس کی نشر و اشاعت کے لئے مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟

اس میں شک نہیں کہ جہاں تک شور و غل مچانے اور زبانی ہمدردی کرنے کا تعلق ہے ہمدردان اردو کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ کے مسلمانوں نے "ہندوؤں کی اردو سے دشمنی" کے خلاف اس قدر شور و غل مچایا ہے کہ زمین و آسمان کو سر پر اٹھالیا ہے۔ مگر ہندوؤں نے اپنے کان بند کر لئے ہیں۔ وہ آپ کے اعتراضات اور احتجاجات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ لہٰذا اب ان باتوں سے مسلمانوں یا ان کی زبان کو مطلق کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ موجودہ صدی زبانی ہمدردی کی نہیں بلکہ عملی جدوجہد کی ہے۔ اس زمانہ میں صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق ہے جو عملاً اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اردو اور ہندی کا جھگڑا کوئی جدید سوال نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً نصف صدی سے ہندو نہایت خاموشی لیکن پورے جوش انہماک اور استقلال کے ساتھ ہندی کو بڑھانے کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ پنجاب۔ یو۔ پی اور بہار کو اردو کا وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ میں ہی اردو پروان چڑھی ہے لیکن جب ہم ان صوبوں کی سالانہ رپوٹوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہر سال ہندی کی مطبوعات میں اضافہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اور برخلاف اس کے اردو کی مطبوعات کی تعداد میں ہر سال نمایاں کمی ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۰ء میں صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں اردو مطبوعات کی تعداد انگریزی مطبوعات کی تعداد سے بھی کم تھی۔ اور ان میں سے بھی زیادہ کتابیں مذہبی اختلافات اور سنی و شیعہ نزاع کے متعلق تھیں۔

کیا یہ حقیقت اور انکشاف ہی خواہان و ہمدردان اردو کے لئے باعث شرم و ندامت نہیں؟ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ اردو مطبوعات کی تعداد میں کمی کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ بھی برادران وطن کی اردو دشمنی کا نتیجہ ہے؟ فرمائیے آپ کے پاس ان کا کیا جواب ہے غالباً یہی کہ یہ ہولناک انجام ہے مسلمانوں کی غفلت اور بے عملی کا۔ ورنہ کس نے ان کا قلم پکڑا ہے اور کس نے ان کو کتابیں تصنیف کرنے اور شایع کرنے سے منع کیا ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کا نتیجہ اور ان دونوں کی مشترکہ کوششوں کا پھل ہے۔ اس لئے ہندی کی بجائے اردو کو ملک کی قومی زبان ہونا چاہیے۔ اردو کی ہندی پر برتری کے ثبوت میں مسلمان اردو رسائل وجرائد کی تعداد پیش کیا کرتے ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہندی کی اس قدر ترقی کے باوجود آج بھی ہندی رسائل وجرائد کے مقابلہ میں اردو رسائل وجرائد کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن کیا کبھی آپ نے اس تلخ اور ناگوار حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ جو تعداد آپ پیش کر رہے ہیں اس میں سے نصف تعداد ان رسائل وجرائد کی ہے جن کا وجود اور عدم برابر ہے۔ اور بقیہ نصف کی حالت یہ ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ بہی خواہاں اور ہمدردان اردو کی بے عملی اور غفلت کی وجہ سے ان کی مالی حالت حد درجہ کمزور اور پست ہے وہ گداگری اور ضمیر فروشی کر کے یا زیادہ سے زیادہ بلیک میلنگ کے ذریعہ زندہ ہیں۔ اب آپ ایک نظر ہندی رسائل وجرائد پر بھی ڈالیں۔ میں نے مانا کہ ان کی تعداد کم ہے لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت کہ ہندو ہندی کو اپنی قومی زبان سمجھتے ہیں وہ ہندی کی ترقی کے ساتھ اپنے مستقبل کو وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اور ہندی کی سرپرستی کرنا اپنے لئے باعثِ فخر خیال کرتے ہیں اسی وجہ سے ہندی رسائل وجرائد کی مالی حالت اس قدر مستحکم اور اطمینان بخش ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنی قوم اور اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اردو رسائل وجرائد کی حالت اس قدر پست وزبوں کیوں ہے؟ کیا یہ بھی برادرانِ وطن کی اردو سے دشمنی کا انجام ہے؟ کیا کوئی ایسا قانون موجود ہے جس نے آپ کو اردو رسائل وجرائد خریدنے ان کا مطالعہ کرنے اور ان کی سرپرستی کرنے سے روکا ہے؟ اس سلسلہ میں ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ اردو کے وہ رسالے اور اخبار جن کے مالکان اور اڈیٹر ہندو ہیں مسلمانوں کے رسائل وجرائد کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر حالت میں ہیں۔ روزنامہ "انقلاب" لاہور۔ روزنامہ احسان" لاہور کے مقابلہ میں روزنامہ "ملاپ" اور روزنامہ "پرتاب" کی اشاعت بہت زیادہ اور آخر الذکر اخباروں کی مالی حالت اس قدر مستحکم ہے کہ وہ حکومت پنجاب کی گراں قدر مالی امداد حاصل کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح ماہنامہ "ہمایوں" اور ماہنامہ "عالمگیر" کے مقابلہ میں "مست قلندر" اور "حسن پرست" کی نہ صرف اشاعت بہت وسیع ہے بلکہ ان کی مالی حالت بھی قابلِ رشک ہے۔ کیا بہی خواہان وہمدردانِ اردو اور بالخصوص مسلمان اس سے عبرت حاصل نہ کریں گے؟

اب ایک نظر اردو کتب خانوں پر ڈال لیجئے۔ یہ دیکھ کر بعد افسوس ہوتا ہے کہ مطبوعات کی تعداد میں ہر سال قابلِ شرم حد تک کمی ہو رہی ہے۔ اردو کی نشر واشاعت کے لئے جو پروپگنڈا ہو رہا ہے اس کا اثر بالکل الٹا پڑ رہا ہے۔ ان چند سو مطبوعات میں بھی زیادہ تعداد بازاری ناولوں گندے اور مخرب الاخلاق صنفی ونوعی لٹریچر، تھرڈ کلاس افسانوں اور مذہبی مباحث کی ہے ٹھوس علمی وادبی مطبوعات کی سالانہ تعداد ایک یا دو درجن سے زیادہ نہیں ہے اور یہ بھی اپنے اپنے ناشرین کے لئے ایک بار بنی ہوئی ہیں اگر انفرادی کوششوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس وقت اردو کے چار مرکز ہیں۔ لاہور۔ دہلی۔ لکھنؤ اور حیدرآباد۔ انہی چار مقامات سے اردو کی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اب آپ دیکھیں کہ لاہور سے جو سیکڑوں کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں وہ تمام کی تمام افسانہ اور ناول پر مشتمل ہیں۔ علمی وادبی مطبوعات کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ دہلی میں البتہ جامعہ ملیہ کے کتب خانہ سے چند علمی وادبی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مکتبہ برہان نے بھی تقریباً نصف درجن قابلِ قدر کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن بقیہ کتب خانوں نے اس وقت تک کوئی ایسی کتاب شائع

نہیں کی ہے جسے اردو ادب کے خزانہ میں گراں بہا اضافہ قرار دیا جا سکے۔ اور یہی حال لکھنؤ کے کتب خانوں کا ہے۔ اس سلسلہ میں حیدر آباد کے کتب خانے ضرور قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے تقریباً چھ درجن مفید کتابیں شایع کی ہیں۔ لیکن علمی و ادبی کتابوں کی مانگ مارکٹ میں جس قدر کم ہے اس پر قلم اٹھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہماری غفلت، لاپروائی اور بے علمی نے آج اس قدر افسوسناک صورت اختیار کرلی ہے کہ ملک میں بہت ہی کم کتب خانے ایسے ہیں جو بلا پس و پیش علمی و ادبی کتابیں شایع کرنے پر رضامند ہوں۔ کیونکہ اب یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ اردو داں حضرات کا مذاق اس قدر پست اور گندہ ہے کہ ملک میں علمی و ادبی کتابوں کی مانگ ہی نہیں۔ اگر کوئی علمی و ادبی کتاب شایع کی جائے تو وہ برسوں الماریوں کی زینت بنی رہے گی۔ اس لئے کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ ایسی تجارت پر اپنی کمائی لگائے جس سے فائدہ کی کوئی توقع نہ ہو۔ آپ کسی کتب فروش سے دریافت کرلیں۔ یہی جواب ملے گا کہ فی زمانہ عریاں اور گندے ناولوں اور افسانوں کی مانگ تو پھر بھی کافی ہے لیکن علمی و ادبی کتابوں کے خریدار ہزار میں ایک بھی نہیں۔ میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے گزشتہ سات سال کے دوران میں گل فروش پبلشنگ ہاؤس نے تقریباً سات ہزار کتابیں فروخت کی ہیں۔ اور ان میں ٹھوس علمی و ادبی کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں ہے۔ اب آپ ہی غور کریں کہ اردو داں پبلک کا ذوقِ ادب اس قدر پست کیوں ہے؟ کیا یہ بھی کانگریس یا برادرانِ وطن کی اردو سے دشمنی کا اثر ہے؟

اردو کے انشا پردازوں کی حالت جس قدر نازک اور افسوسناک ہے اس پر اب کچھ لکھنا بے کار ہے۔ یہ نہیں کہ اردو میں ٹھوس علمی و ادبی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے والوں کی کمی ہے۔ نہیں بلکہ اردو کے گر جانے کی وجہ ہماری غفلت اور بے علمی ہے۔ اہلِ قلم حضرات کو معلوم ہے کہ ان کے علمی و ادبی کارناموں کا کوئی قدر داں نہیں۔ اس لئے وہ اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت ہی نہیں کرتے ہیں۔ اور جو بھول کر یا غلطی سے کوئی علمی و ادبی کتاب لکھ لیتے ہیں تو اس دماغی محنت، کاوش اور جانفشانی کی وجہ سے انھیں مالی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور پیٹ پر پتھر باندھنے پڑتے ہیں۔

اب جب کہ اردو داں پبلک کی بد ذوقی، غفلت اور بے عملی کی حالت اس قدر افسوسناک ہے تو پھر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تو پھر ہم کس طرح اس بات کی شکایت کرنے میں حق بجانب ہیں کہ برادرانِ وطن اردو کے دشمن ہیں اور اردو کو مٹا رہے ہیں۔ اس باب میں میری ذاتی رائے تو یہی ہے کہ نہ کوئی اردو کا دشمن ہے اور نہ کوئی اردو کو مٹا رہا ہے اور نہ اردو کسی غیر کے مٹانے سے فنا ہو سکتی ہے۔ البتہ خود ہماری ہی بے عملی اور غفلت اردو کے حق میں پیغام موت بنی ہوئی ہے۔

مجھے اس وقت وقتی سیاسیات پر بحث کرنی مقصود نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشیدگی اور سیاسیات کے موجودہ رخ کو دیکھتے ہوئے اس بات کی پیشین گوئی کرنے کے لئے کسی نبی یا رسول کی ضرورت ہی نہیں ہے تو وہ دن دور نہیں کہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات وہی ہوں گے جو فرانس اور جرمنی یا اسٹریا اور ہنگری کے ہیں۔ اور کوئی کوشش بھی ان دونوں قوموں کو متحد کر کے ایک حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے پر رضامند نہ کر سکے گی۔ اب جس طرح فرانس اور جرمنی کی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ان دونوں ملکوں کو اپنی اپنی زبانوں کو ترقی دینے کا پورا حق حاصل ہے۔ اسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانیں بھی اپنی اپنی ہیں۔ اس لئے ہندوؤں کو ہندی کو ترقی دینے کا پورا حق حاصل ہے۔ اب اگر ہندوستان کے مسلمان اردو کو اپنی زبان تسلیم کرتے ہیں تو اپنی کوششوں سے اسے بڑھائیں۔ کون انھیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔ کون ان کی راہ میں حائل ہیں۔ البتہ اگر ہندوستان کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ خود تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں اور برادرانِ وطن اپنی زبان یعنی ہندی کو چھوڑ کر اردو کو بڑھائیں تو ان کی یہ خواہش احمقانہ ہے اور کبھی پوری نہ ہوگی۔

پانچ کہانیاں

(مسلسل افسانے)

علی گڑھ یونیورسٹی ہاسٹل کے ایک وسیع شاندار کمرے میں پانچ زندہ دل افراد' مسعود[۱]' آفتاب[۲]' مظفر[۳]' مشتاق[۴] اور انور[۵] علحدہ علحدہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے پرلطف گفتگو کے مزے لے رہے تھے' یہ سب کے سب امتحانات سے فارغ ہوکر وطن جانے کی خوشی میں پھولے نہ سمارہے تھے' چونکہ کل صبح کی ٹرین سے یہ تمام احباب ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے تھے' اس لئے آج شب کی یہ یک جائی کل کی جدائی کے سلسلہ میں منعقد کی گئی تھی' بذلہ سنجی اور پرمذاق گفتگو سے ہٹ کر بالآخر سبھوں نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا اہم اور انوکھا واقعہ بیان کرے' "اس طرح رات کا طویل حصہ پانچ کہانیوں کے سننے اور کہنے میں بہت جلد بیت جائے گا" تجویز معقول ہے" ہر ایک نے ہاں میں ہاں ملائی۔

پہلی کہانی

ابتدا مسعود صاحب سے ہوئی' یہ حضرت خوش رو خوش پوش ہونے کے علاوہ خوش مزاج بھی واقع ہوئے تھے' ان کے انداز بیان میں لطافت اور رنگینی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی' کرسی سے سیدھا ہوکر بیٹھے' حلق کو صاف کیا' اور اس طرح اپنی داستان حیات سنانے لگے ــــــ

پچھلے سال کی بات ہے' گرمیوں کی چھٹیاں ختم کرکے علی گڑھ آرہا تھا' چونکہ میں وقت سے پہلے ہی مکان سے نکل کر اسٹیشن پہنچ گیا تھا' ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی آہنی بنچ پر دراز ہوکر ٹرین کے انتظار میں' اپنی ایک نظم کے چند شعر گنگنا رہا تھا' مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے' کسی کی سریلی آواز نے مجھے اپنے خیال سے چونکا دیا' "اوہ ــــــ معاف کیجے گا" دفعتاً ایک لڑکی گزرتے ہوئے میرے سامنے آکر رک گئی" آپ ــــــ نہیں' نہیں" اس نے کچھ گھبراہٹ کی حالت میں کہا' "آپ وہ نہیں' مجھ سے غلط فہمی ہوئی"۔

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا ــــــ

وہی آواز' وہی صورت' ــــــ میں سمجھی" ــــــ

"کوئی دوست ہیں" ــــــ میں نے جملہ کی تکمیل کی ــــــ

"جی ہاں ــــــ عجیب اتفاق ہے"

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ آپ ناکام رہیں"

"میں اپنی اس غلط فہمی اور بیجا مداخلت کی وجہ سے معافی چاہتی ہوں" یہ کہہ کر وہ مڑی اور چل دی۔

ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہوا میرے لئے یہ منظر حیرت ضرور تھا۔ اور میں اس اجنبی لڑکی کے متعلق کوئی رائے بھی قایم نہ کرنے پایا تھا کہ میری نظریں بے ساختہ نیچے گرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر جا پڑیں۔

"ارے! میری زبان سے نکلا' "یہ ملاقاتی کارڈ" شاید اس اجنبی خاتون کا ہوگا' پھر یہاں کیسے؟ گر گیا ہوگا؟ نہیں گرا دیا گیا ہوگا" ایک سکنڈ میں کاغذ میری انگلیوں کی گرفت میں تھا' "شہناز فیروز" اس حسین و جمیل نام کے طلسمی اثرات نے مجھے چند ثانیوں تک محویت میں رکھا' میں حیران تھا' کون؟ ــــــ اور کہاں؟ جانتے ہیں؟ کہہ نہیں سکتا' میں کتنی دیران خیالوں میں کھویا۔ ہا۔ ٹرین کی آمد کی اطلاعی گھنٹی نے مجھے اپنے خیالوں سے چونکا دیا' فوراً

میں اپنی کتابوں کا بیگ سنبھال کر ٹرین کی طرف بڑھا پلیٹ فارم پر مسافروں کا اچھا خاصہ ہجوم تھا۔ میں نے کسی اچھے آرام وہ ڈبہ کی تلاش میں پلیٹ فارم کی دو تین چکریں لگائیں دفعتاً میری نظر ایں سکنڈ کلاس کے ایک خالی ڈبہ پر پڑیں، جس میں وہ پُراسرار خاتون تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے نام کا کارڈ ہنوز میرے جیب میں محفوظ تھا۔ ایک سکنڈ کے لئے میں رُک گیا۔

"آیئے گا" اس نے مجھے دیکھ کر کہا، جس کے جواب میں میں اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈبہ میں سوار ہوا، اور مقابل کی نشست پر اپنا قبضہ جمایا وہ بولی — "معاف کیجئے گا" — آپ نے کیا خیال کیا ہوگا؟ عجیب لڑکی ہے یہ، میرے ایک عزیز ہیں، بالکل آپ کی طرح — یہ صاحب، مجھ سے اس اسٹیشن پر ملنے والے تھے"

"اور بدقسمتی سے میں مل گیا" میں نے ہنستے ہوئے کہا — "عجیب اتفاق ہے، میں خوش ہوں کہ ہمارا یہ سفر آپ کی رفاقت اور ہمراہی کی وجہ سے طمانیت بخش ثابت ہوگا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم باہم متعارف ہوجائیں" یقین مانیے! میری حیرت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی، یا اللہ! یہ عجیب لڑکی ہے، میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں، یا طلسم ہوشربا کا کوئی رنگین باب میری نظروں کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ لڑکی حسن وشباب کا مکمل نمونہ لئے ہوئے رنگینیوں اور نگہتوں میں ڈوبی ہوئی تھی، اس کا حسن شعر اور افسانوں کا موضوع لئے ہوئے روح پرور واقع ہوا تھا۔

ع شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے۔

"سنئیے! اُس نے ترنم خیز لہجہ میں کہا، میرے شوہر، ڈاکٹر فیروز طبیعیات کے پروفیسر ہیں"۔

اوہ — آپ کے شوہر، میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"آپ جانتے ہیں ڈاکٹر فیروز کو"

"شاید" — میں نے ویسے ہی کہا۔

"آپ کو اُن سے مل کر مسرت ہوگی، وہ ایک اچھے اخلاق کے مالک ہیں، اب مجھے آپ سے متعارف ہونے کی عزت حاصل ہوگی"؟

"میری تعریف، میں نے متین تبسم کے ساتھ کہا، علی گڈھ یونیورسٹی کا معمولی درجہ کا طالب علم"۔

"حیدرآباد سے آرہے ہیں آپ"

"جی ہاں اپنے وطن سے"

"آپ نے اپنا نام تو نہیں بتایا"

"مسعود خالد پکار سکتے ہیں آپ"

"خوب گاتے ہیں آپ" میرے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا گیا،

"میں اور گانا — البتہ شعر پڑھ لیتا ہوں"

"آپ جو گا رہے تھے — کیا شعر تھا وہ — بھلا سا — ہاں، اُن کی نظر نوازادأوں کا شکریہ — پوری غزل تو آپ کو یاد ہوگی"

"مجھ سے — اس نے حسین تبسم کے ساتھ کہا" میں شاعرہ تو نہیں"

بے تکلفی معاف — میں نے ذرا شوخ لہجہ میں کہا "شاعر کا خیال تو ضرور ہیں۔ جملہ کے اختتام پر وہ کچھ شرما سی گئی۔

واقعات دلچسپ ہوتے گئے، لیکن حضرات! پیش قدمی زیادہ تر اُن صاحبہ کی طرف سے ہورہی تھی، لڑکی حد درجہ فیشن ایبل اور مغرب زدہ واقع ہوئی تھی، یورپ کی تعلیم نے اُسے آزاد خیال اور نڈر بنا دیا تھا۔ رات کا کھانا ہم نے ایک ساتھ ختم کیا آپ خوب جانتے ہیں، ایک نوجوان مرد اور حسین عورت کی قربت اس تنہائی کے موقع پر کتنی ولولہ خیز اور جذبات انگیز ہوتی ہے، پہلی مرتبہ اس کا خوبصورت سر دریچے کے قریب بے اختیار میرے شانہ سے ٹکرایا، ایک بجلی سی چھو گئی، خون کی روانی میں تیزی آگئی،

میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔

اور جب دوسری مرتبہ اس کی خواہش پر دریچہ بند کرنے جو اٹھا، میرا ہاتھ اُن کی حنائی انگلیوں سے مس ہو کر رہ گیا، جو دریچہ کے پٹ تھامے ہوئے تھیں، تھرماس میں پانی ختم ہو چکا تھا میں پانی لینے کے لئے ایک درمیانی اسٹیشن پر اتر پڑا، میرے واپس آنے تک انجن نے سیٹی دی، اور گاڑی حرکت کرنے لگی، میں فوراً اس کے ہاتھوں کا سہارا لئے ہوئے اوپر چڑھ آیا، اچھا ہوا شہ ناز تم نے مجھے تھام لیا۔ ورنہ گر پڑتا، میں نے بدستور اُسے تھامے ہوئے کہا، مخمور کن نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آہ وہ منظر کتنا پُر کیف حشر خیز تھا، ہم اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے، مجھ پر وہی کیفیت و مستی کا جذبہ طاری تھا، "شہ ناز" میں نے اس کی خوبصورت کلائی کو اپنی گرفت میں لے کر کہا، اس نے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا، اُف میری پاکبازی ہرن ہو گئی شیرازۂ ضبط و سکون بکھر کر رہ گیا، جذبات کا طوفان بڑی حد تک دل و دماغ میں ایک ہنگامہ مچا رہا تھا،

ارے یہ خاموشی تا بہ کے ۔۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

ایک خاص قسم کا ملکوتی تبسم ۔۔ جو اکثر دوشیزاؤں کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہے، اس کے احمریں ہونٹوں پر ناچ رہا تھا، "جی" ۔۔ وہی مستی بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا گیا، "آپ خوب سمجھتے ہیں"

حضرات! آپ خوب سمجھتے ہیں، اس میں میرا کیا دوش ہے، ایسے منظر اور فضا میں رہ کر فرشتے بھی گناہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے، میں تو رہا انسان اور وہ انسان جو جذبات انگیز شباب کے دور سے گذر رہا ہو۔ میرا پائے استقامت لڑکھڑائے بغیر نہیں رہا۔ اور ساغر ضبط و سکون چھلک پڑا ہم ایک دوسرے کے پرستار بن گئے، آہ کتنے رنگین اور پُر کیف تھے وہ لمحاتِ محبت جو سرور و بدمستی میں ڈوبے ہوئے جذبات انگیز ثابت ہوئے اور بہت جلد بیت گئے۔ صبح ایک اسٹیشن پر ہم بیدار ہوئے، وہ اپنا سب کچھ کھو کر بھی بیحد حسین اور مطمئن نظر آرہی تھے، رحم اور ہمدردی میں ملے جلے جذبات اب میرے دل میں اس کے لئے بڑے زور شور کے ساتھ لہریں لے رہے تھے ناشتہ کے بعد ہم نے لباس تبدیل کیا، ملاقات گہری ہوتی گئی۔ اس اثناء میں مختلف راز افشا ہو کر رہے، ایک گھنٹہ کے اندر ہم ناگپور پہنچ گئے پلیٹ فارم پر ایک صاحب جن کی عمر تخمیناً ۵۵ سالہ ہوگی منتظر تھے۔

"مسعود صاحب! شہ ناز نے تعارفی لہجہ میں کہا، یہ میرے شوہر ڈاکٹر فیروز ہیں۔"

اور یہ ۔۔ میرے دوست ۔۔ مسٹر مسعود خالد۔

میں حیران تھا ۔۔ آہ ۔۔ شہ ناز اور فیروز۔ کتنا بے ڈھب جوڑا۔

شہ ناز نے.... اصرار کیا کہ میں دو ایک روز اُن کے یہاں ٹھیروں ۔۔ اور اُس کے شوہر نے بھی اپنی بیوی کی تائید کی لیکن اس میں عذر لنگ کی آڑ لے کر کہ کل میری حاضری ہے اُن دونوں کو مطمئن بنانے میں کامیاب ہو گیا، بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ شہ ناز مجھ سے رخصت ہوئی، واقعہ کو گزرے ہوئے ایک سال ہوا، مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور اس کا ایک خط ملتا رہا، اس اثناء میں ہم نے کئی مرتبہ ایک دوسرے سے ملاقات کی اور بدستور اپنے جذباتِ محبت کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، ۔۔ لیکن آہ ۔ ایک ہفتہ ہوا مجھے اُس کی ایک درد انگیز تحریر ملی، سنئے وہ لکھتی ہے۔

"پیارے مسعود! ایک ہفتہ ہوا میرا بوڑھا شوہر اپنے کمزوری قلب کے باعث انتقال کر گیا۔ اُس کا بے حس دل زندگی میں میرے

لئے ویسا ہی تھا جیسا کہ اب — اس کی موت اور زندگی میرے لئے برابر تھی، لوگ کہتے ہیں بیوہ ہوگئی، اور میں کہتی ہوں جب کیا میرا سہاگ قائم تھا۔ اب بھی آزادی — کوئی پابندی جب تھی — نہ اب

سماج نے میری زندگی ایک ایسے بوڑھے مالدار کے ہاتھوں فروخت کر دی تھی، جس میں جوانی اور محبت کا نام و نشان تک نہ تھا "عورت کا دل" آپ جانتے ہیں، دولت سے سیر نہیں ہوسکتا، وہ محبت سے محبت کرتا ہے۔ اور کچھ نہیں، جب میں پہلی مرتبہ آپ سے ملی اور مل کر میں نے سب کچھ کھو کر بھی پالیا — یہی میری زندگی کا سرمایہ تھا۔ اب میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہی ہوں، میرے لئے کون سا بہتر سن راستہ ہوگا، ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، دنیا میں میرے لئے کہیں بھی جگہ نہیں، والدین مرچکے، کوئی قریبی رشتہ دار نہیں، سماج تو مجھے اپنی دنیا میں کبھی آنے نہ دے گا — آس کا ایک دھندلا سا ستارہ — جو آپ کی ہستی سے وابستہ ہے، میری زیست کو چمکانے کے لئے کافی ہے — اور یہی "ستارہ" مجھے منزل تک پہنچا کر رہے گا — ورنہ بصورت مجبوری — مجھے، اپنے دل کی پیاس" بجھانے کی خاطر — وہ سب کچھ گوارا کرنا پڑے گا، جو ایک پیشہ ور عورت کرسکتی ہے، فرق دونوں میں اتنا ہے کہ وہ بازاری عورت، اپنے پیٹ کے لئے۔ اور میں اپنے حسن و جوانی پر رحم کرنے کے لئے —

بتاؤ مسعود — میں تمہارے فیصلہ کی منتظر ہوں، کونسی راہ بتاؤ گے؟

تمہاری سب کچھ شہ ناز

سن لیا آپ نے شہ ناز کا خط — اب میرا فیصلہ بھی سن لیجئے۔ کل میں ناگپور پہنچ جاؤنگا، اور پھر شہ ناز — میری شریک حیات بنے گی۔ خواہ ایسا کرنے میں والدین، سماج اور دنیا، مجھے ٹھکرا دے — یہ رہا میری زندگی کا اہم ترین واقعہ۔

دوسری کہانی

ایک لمحہ کے لئے کمرے میں سکوت طاری تھا، سب کی نظریں آفتاب کی طرف جمی رہیں، یہ صاحب متین صورت بلند و پاکیزہ جذبات کے مالک تھے، فن لطیف ان کی زندگی کا حسین ترین مشغلہ رہ چکا تھا، اطمینان کے ساتھ سگریٹ جلایا، اور دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے کہنے لگے ع

ہماری زندگانی اک مرقع ہے حسینوں کا

انٹر پاس کرنے کے بعد مجھے لکھنؤ بھیجا گیا، ایف۔اے کے دو سال میں نے باتوں باتوں میں طے کئے، اس عرصہ میں والد کی بدلی لکھنؤ سے دہلی ہوگئی۔ وہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ امتحان سے فارغ ہوکر مجھے لکھنؤ چھوڑ کر دہلی بسانا پڑا، دلی کی فضا ہمیں کچھ راس نہ آئی، یہاں آکر والد دفعتاً علیل ہوگئے اور آن کی آن میں ایک ہفتہ کے اندر ہمیں بے سہارا چھوڑ کر جنت سدھارے، والدہ غم کی ماری دیوانی سی ہوگئیں، وہ تو اچھا ہوا کہ ماموں جان اگر ہمیں اپنے ہمراہ کانپور لے گئے، میں آسانی کے ساتھ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ والد مرحوم نے میرے نام دس ہزار کی کثیر رقم بنک میں رکھ چھوڑی تھی، لیکن ماموں کا خیال تھا کہ میں اپنی تعلیم یہیں ختم کر کے اس رقم سے کوئی ایسا کاروبار شروع کروں جس سے دولت کا انبار لگ جائے"

اُن کی لڑکی صبیحہ بچپن ہی میں مجھ سے منسوب کی گئی تھی۔ صبیحہ حسین کہلانے کی ضرور مستحق تھی، لیکن تعلیم کے معاملہ میں ماموں جان نے ہمیشہ بخالت سے کام لیا، والدہ یہاں آکر کچھ بیمار سی ہوگئیں، معقول علاج کرایا گیا، مگر صحت نہ ہوئی، ڈاکٹر نے انہیں

پہاڑی مقام پر لے جانے کی رائے دی، اور میں فوراً انہیں نینی تال لے آیا چند ہی روز میں یہ مقام ہمارے لئے دلکش اور صحت افزا ثابت ہوا، والدہ کی صحت ٹھیک ہونے لگی اور تو اور میں اس جنت بدوش خطے میں پہنچ کر ایک کیف و سرور کی دنیا میں کھو گیا، دن بھر حسین مناظر کا لطف اٹھایا کرتا، پھولوں سے لدی ہوئی وادیاں، برف سے ڈھکی ہوئی گھاٹیاں، شفاف جھیل کا کنارا، سورج کے طلوع و غروب کے زرین نظارے، آہ ان مناظر نے میرے شاعرانہ جذبات میں روح پھونک دی،

ایک دن جو میں صبح کی تفریح سے لوٹا ملازم کے ذریعہ اطلاع ملی کہ والدہ ہماری بازو والی کوٹھی کی چند مستورات سے ملنے گئی ہیں، یہ لوگ کلکتہ کے مشہور تاجر ہیں، خان بہادر سلطان حبیب نے دوسرے دن مجھے اپنے یہاں چار پر مدعو کیا، اتفاق کی بات ہے یہ صاحب والد مرحوم کے ملنے والوں میں سے نکلے، ان کے دونوں لڑکے اقبال، اور سلیم حال ہی میں آئی۔سی۔ایس کے امتحانات میں آچکے ہیں، اُن کی معیت میں یہاں بہت کچھ وقت سیر و تفریح میں کٹا۔

دوسرے دن میں علی الصباح تنہا جھیل کی طرف نکل پڑا، آج مجھ پر کچھ شعریت سی طاری تھی، حالتِ کیف و سرور میں میں نے ایک رومانوی نظم "وادی کی حور" کہی اور بیخودی میں اُن اشعار کو جھیل کی ایک بڑے چٹان پر بیٹھے ہوئے گنگنا رہا تھا، دفعتاً کسی نے میرے کندھے چھوئے۔

"کون؟ سلیم صاحب، میں چونک پڑا"

"معاف کیجئے گا، مخل تو نہیں ہوا"

"کوئی بات نہیں"

"یہ کیا کاغذ ہے" سلیم نے دریافت کیا

"کچھ نہیں، جذبات دل کی دھندلی سی تصویر"

"اوہ — آپ شاعر ہیں، اقبال یہاں آؤ، میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو آواز دی، جو ایک لڑکی ساتھ جھیل کے اُس کنارے کھڑا ہوا تھا "ارے بھئی اقبال"! سلیم نے کچھ قدم آگے بڑھا کر کہا "سنا تم نے، یہ چھپے رستم نکلے، ہر روز جو تنہا یہاں آتے ہیں نا، اس کا بھی راز نہیں معلوم ہے، یہ دیکھو آپ شاعر ہیں — شاعر"

اقبال نے تعجب کا اظہار کیا، — واہ جناب، چوری پکڑی آپ کی، چلئے اب آپ سستے نہ چھوٹیں گے، کچھ سنانا پڑے گا، "اُس حسین فضا میں گناہ نہ کرنا بڑا پاپ ہے" اس کے دوسرے بھائی نے کہا، یہ لوگ حد درجہ پر مذاق اور دلچسپ واقع ہوئے تھے، دو ایک گھنٹہ کی ملاقات میں وہ سب کے سب مجھ سے گھل مل گئے، انکی وجہ سے پہاڑ پر خوب لطف آنے لگا۔

"آپ کچھ سناؤ گے ہیں" "چلو اقبال، اُس سبزہ پوش پہاڑ پر چلیں — اور تم بھی بتول، اوہ معاف کیجئے مولنا! میں اپنی بہن سے تعارف کرانا بھول گیا، بتول فاطمہ میری بہن"

"شکریہ" میں نے کہا "یہ وہی آفتاب صاحب ہیں، جو کل ہمارے یہاں مدعو کئے گئے" — زمردی پہاڑی پر پہنچ کر ہم سب گھاس پر نیم دراز ہو گئے، ہاں تو — سلیم نے کہا وہی نظم، میں نے ترنم کے ساتھ سنائی — اور اس کے ایک دو شعر تو متعدد مرتبہ پڑھوائے گئے، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی تفریح کے بعد ہم اپنی اپنی قیامگاہ پر لوٹ آئے، رخصت کے وقت اُن بھائیوں اور بہن نے شام کی تفریح کے لئے سینما چلنے کی دعوت دی۔

آج صبح کی موٹر سے خالو جان اُن کے لڑکے اختر آگئے، اُن کے ساتھ گفتگو میں سارا دن کٹا، اختر کے ساتھ تیار ہو کر سلیم کے گھر پہنچا،

وہاں سے سب مل کر تماشا گھر پہنچے، رات کا کھانا سبھوں نے ایک پہاڑی ہوٹل میں کھایا، اور بہت رات گئے، چاند کی نقرئی بارش میں نہاتے ہوئے گھر پہنچے، اختر مصوّر تھا، اس نے یہاں اچھے اچھے مناظر کے عکس لئے، اپنا مختصر سا مصوّری کا سامان لئے میرے ساتھ علی الصباح جھیل کے کنارے پہنچا، یہاں بالکل غیر متوقع طور پر بتول سے مدبھیڑ ہوئی۔

"ارے آپ کدھر" اس کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا، بھیا تو آپ کو لینے گھر گئے ہیں، اختر منظر کی تلاش میں دوسری طرف چلا گیا تھا۔

"اور آپ کدھر" یہی سوال میں نے اس سے کیا ۔ بالکل اکیلی

"شعریت کے لئے منظر کی تلاش میں" ۔

"مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی ۔ اوہ ۔ آپ بھی شعر کہتی ہیں"

"آج سے ارادہ کر لیا ہے ۔ اگر آپ"

"ارادہ کی کیا بات ہے، شاعرانہ جذبات تو بلا ارادہ ہی پیدا ہو جاتے ہیں،

"گھنی جھاڑی کے جھنڈ میں کسی نے آواز دی، سلیم اسٹانڈ ہٹاتے ہوئے آرہا تھا، "بھیا سے اُس کا ذکر نہ کیجئے، اُس نے مدھم لہجہ میں کہا ارے تم کدھر" ۔ اقبال نے وہیں سے آواز دی، چلو آج مچھلی کا شکار کریں،

"شکار" ۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا، ارے بابا! کہیں خود شکار نہ ہو جائیں، بتول نے مسکرایا،

"ان صاحب کا جنون ملاحظہ ہو، سلیم نے اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، آج یہ پوری پہاڑی کی تصویر لیتے پھر رہے ہیں"

"شوق برا ہوتا ہے"، میں نے کہا،

جی ہاں، جیسے مچھلی کے شکار کا شوق، شاعری کا شوق، تصویر کشی کا شوق، وغیرہ وغیرہ" ۔ اقبال کہے جا رہا تھا،

"اور ہاں بھیا" بتول بولی، گانے بجانے کا شوق، اس پر سب ہنس پڑے، یاد رہے کہ سلیم کو گانے کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون سا ہو گیا تھا، خوب محظوظ ہو کر گھر لوٹے، رات کے کھانے پر سلیم اور بتول نے ہمیں مدعو کیا تھا، کھانے کے بعد سلیم نے باجے پر اچھے اچھے گیت سنائے، اور اس کے بعد بتول کی باری آئی، اُس نے حافظ شیرازی کی فارسی غزل سنائی، اس رات مجھ پر عجیب کیف و سرور طاری تھا، میں نے ایک طویل رومانوی نظم "فردوس خیال" کے عنوان سے کہہ کر اپنے آپ کو حد درجہ مسرور کیا، علی الصباح ہماری کوٹھی کے قریب غیر متوقع طور پر بتول ملی، اُسے میری تلاش تھی،

"آج یہ چاند کدھر نکل آیا ہے" میں نے بغیر کسی خیال کے اُس سے مذاق کیا ۔

"ایک نئے افق کی تلاش میں، اس نے برجستہ جواب دیا لیکن سویرے چاند نکلا نہیں کرتا" یہ میرا سوال کیا ؎

کہا روپ نے چاند ہے چودھویں
مگر چاند کیسے سویرے سویرے

"اگر آنکھیں ویسی ہی دیکھنے والی ہوں، تو ہر ذرہ آفتاب ہے"

جواب لاجواب کر گیا" میں آپ کے اِن بلند پاکیزہ جذبات اور شاعرانہ تخیلات کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا"

ہاں خوب یاد آیا، اس نے کہا، عرض کرنا یہ ہے، رات میں نے ایک نظم لکھی ہے "وادیٔ گل"، بس اس کے دکھانے کے لئے آپ کی تلاش میں نکل آئی، ایک چھوٹے سے ریتیلے نالے کے کنارے ہم بیٹھ گئے، نظم بحیثیت مجموعی بری نہ تھی، بجز دو ایک خامیوں کے اور کوئی غلطی نہ تھی،

"نظم تو بڑی شاندار ہے"

"سچ" ۔

"بالکل سچ" ۔ چند دن کی مشق میں آپ اچھی شاعرہ بن سکتی ہیں"

"مگر ایسے مناظر، فضائیں اور صحبتیں کہاں نصیب ہوں گی" میں نے سنا ہے کہ آپ دو ایک روز میں یہاں سے رخصت ہونے والے ہیں،

ہاں بتول! والدہ کی صحت اب رو بصحت ہو چلی ہے، اور پھر مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کا بڑا قلق ہے"

"ابا آنے پر ہم بھی کلکتہ جائیں گے" اس نے کچھ متاثر ہو کر کہا، دیکھئے خدا کب ملاتا ہے،

"کوئی مشکل بات نہیں، میں نے کہا ہم ضرور مل سکتے ہیں جبکہ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے جگہ ہو"، وہ چونک پڑی، جیسے میں نے اُس کے دل کی بات کہدی، آپ کیا کہہ رہے ہیں، ہم ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں"

ہاں سچے جذبات کے تحت ہماری دوستی برقرار رہ سکتی ہے، آپ بخوشی مجھ سے خط و کتابت کر سکتے ہیں، اب رہا ایک مرد اور عورت کے دوستانہ تعلقات اس وقت استوار نہیں ہو سکتے جب تک کہ محبّت کا عنصر اس میں شامل نہ ہو اور یہی جذبہ ایک دوسرے کی روح کی گہرائیوں میں جذب ہو کر ایثار کا مادّہ پیدا کرتا ہے،

"محبت کا معیار آپ کے نزدیک کیا قدر و قیمت لئے ہوئے ہے" یہ سوال اس کا عجیب و غریب جذبات کا آئینہ دار تھا

بتول! میرے نزدیک بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے، بقا اور فنا کی حدوں کو توڑتا ہوا ایک ایسے مرکز پر جا کر ختم ہو جاتا ہے جہاں عقل و جنون کی دور رس نگاہیں بھی چھو نہیں سکتیں"

"اوہ — آپ بہت دور پہنچ گئے" میں "پوچھتی ہوں" محبّت کا احساس کس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے" بالکل، غیر اختیاری فعل ہے یہ، ایک جذبۂ بے اختیار، ایک نامعلوم حرکت، غیر محسوس دھڑکن، خلش آمیز سرور، جو آنکھوں کی راہ سے

دل کی رگ رگ میں روح بن کر سما جائے — اور کچھ نہیں، شاعر کی زبان سے اس کی مختصر سی تعریف سنئے کہتا ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اور ایسی آگ پر قابو پانا اپنے بس کی بات نہیں، یہ شعر تو آپ بار بار باجے پر گاتی ہیں ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور نہ بجھائے نہ بنے

شاید محبت کے خونخوار ہاتھ ہی اس کو دبا سکتے ہیں لیکن — بتول میرا اپنا تو ایقان ہے۔ محبت کا تعلق جسموں سے نہیں روحوں سے ہے"

"شکریہ آپ نے تو وضاحت کے ساتھ محبّت کی تعریف بیان کر دی اور ایک حد تک مجھے رموزِ محبت سے واقف کار اور مطمئن بنا دیا" "کچھ نہیں، محبت وہ بحر ناپیدا کنار ہے جس کا ساحل ہے بھی نہیں بھی" ؎

اس بحرِ محبت کا ماہر ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

"آپ شادی شدہ ہیں"، یہ سوال میرے لئے بالکل نوکھا تھا

"بدقسمتی سے ابھی میں یہ عزت حاصل کرنے سے محروم ہوں، سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسا بدنصیب انسان ہوں جو کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی جگہ نہ نکال سکا"

"آپ کیا کہہ رہے ہو" بتول نے متاثر کن لہجہ میں کہا "میرے دل میں تو آپ کے لئے جگہ ہے،

"آپ کے دل میں"، میں نے حیرت و مسرت کے ملے جلے لہجہ میں کہا،

کیوں نہیں، میرا دل کوئی پتھر اور لوہے کا ٹکڑا تو نہیں،

"گویا تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میں نے ہنستے ہوئے جوش میں کہا،

میرے اس سوال کے جواب میں بتول کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آنسو دل کی صحیح طور پر ترجمانی کرتے ہیں، اس نے کہا،

"حقیقی معنوں میں آج ہم نے اپنی زندگی کا راز پالیا، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے سچے پرستار بن گئے، اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئے، دن بھر میں نے اپنے آپ کو محظوظ اور خوش نصیب تصور کیا آج میں نے اپنی محبت کی قیمت پالی،

دوسرے دن ہم پھر تنہائی میں ملے، کل ہماری یہاں سے روانگی تھی، ہم نے اس فردوس خطہ پر جہاں کے گوشے گوشے میں ہماری محبت کا راز پنہاں تھا، اپنے مستقبل کے متعلق شاندار پروگرام ترتیب دیا، اور دلوں میں جذبات محبت کا بے پناہ طوفان لئے ہوئے بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ رخصت ہوئے)

دوسرے دن میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی پہنچا۔ والدہ اور خالہ کانپور چلی گئیں، اور میں علی گڈھ چلا آیا۔ سرما کی چھٹیوں میں کلکتہ پہنچ کر میں نے بتول سے کئی ملاقاتیں کیں، اب ہمارے دلوں پر جذبات محبت کے نقوش اس قدر گہرے ہو گئے کہ تادم مرگ محو نہیں ہو سکتے۔

والدہ کانپور پہنچ کر پھر علیل ہوگئیں، والد کی بے وقت موت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا، اطلاع ملنے پر میں فوراً کانپور پہنچا، یوں تو والدہ کی تیمارداری میں گھر کے تمام لوگ مصروف رہتے، لیکن صبیحہ زیادہ تر اُن کی خدمت میں لگی رہتی، ایک رات وہ میرے ساتھ زیادہ رات تک جاگتی رہی۔

"ارے یہ لڑکی" والدہ نے کہا، "سوئیگی بھی یا نہیں"

"صبیحہ" میں نے کہا "اب تم چلی جاؤ ـــ میرے کہنے پر وہ چپ چاپ چلی گئی" "میری تو تمنا ہے کہ بہت جلد اس کو اپنی بہو بنالوں" اماں نے کہا،

"میں چونک پڑا ـــ لیکن امی ـ ابھی تو مجھے پڑھنا ہے" پڑھائی کا کیا؟ ـــ یہ تو عمر بھر لگا ہے، بات معقول تھی، میرے دل پر گھونسا لگا، آخر وہی بات آئی جس کا مجھے کھٹکا لگا ہوا تھا، خیال ہوا اپنی تال کا سارا واقعہ ماں سے کہدوں، وہ تو بیمار ہیں اثر لیں گی، یہ خیال کرکے چپ ہو رہا ـ میرے چہرے پر فکر کے آثار دیکھ کر والدہ نے کہا، تمہیں نیند آگئی ہوگی جاکر سو رہو، رات بھر مجھے نیند نہ آئی، آتی بھی کیسی؟ دل و دماغ روحی اذیت میں مبتلا تھے، "محبت اور فرض" ان میں سے میں کس کو ٹھکرا دوں، اسی کشمکش میں اُجالا ہوگیا، صبح درد کی شدت سے سر پھٹا جارہا تھا، دیر تک میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا ـ صبیحہ کسی ضرورت کے تحت ادھر سے گذری، میں نے اسے دیکھ کر آواز دی صبیحہ! ماں کی طبیعت کیسی ہے؟

"آپ کو پوچھ رہی تھیں"

"سر میں بڑا درد ہے، اس لئے نہ جاسکا" میں نے کہا۔

وہ گئی ـــ اور ایک منٹ کے بعد سر کو لگانے کی دوا لے آئی ـــ اسے لگائیے، رکھ جاؤ، دوا کو میز پر رکھ وہ چپ چاپ چلی گئی ـــ دو تین دن سے ماں کی طبیعت سنبھل گئی ـــ میں اُن سے اجازت لے کر علیگڈھ چلا آیا۔

میرے کانپور سے علی گڈھ آنے کے ایک ہفتہ بعد ماموں کا تار ملا" والدہ کا مزاج پھر دفعتاً بگڑ گیا ہے" تار لے کر اجازت حاصل کرنے کے لئے چانسلر صاحب کے پاس پہنچا، مگر امتحانات کی وجہ سے اجازت نہ مل سکی، آہ اس کے دوسرے دن مجھے والدہ کے انتقال کی اطلاع ملی ـ فوراً میں کانپور پہنچا، میرے وہاں پہنچنے تک کچھ بھی نہ تھا، سرمایۂ ممتا

پسرِ خاک ہو چکا تھا۔ دنیا میں اب میں یکا و تنہا رہ گیا بجز والدؒ
کی یاد کے اور کیا میرے پاس موجود تھا، میں کانپور میں زیادہ
نہ ٹھیر سکا، وحشت اور دیوانگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی، ماموں
بھی کچھ بیمار تھے۔ سارے گھر میں صرف صبیحہ تھی، جو کچھ کر سکتی
تھی، رخصت کے وقت وہ مجھ سے ملی، اس کی آنکھوں سے
جمنا گنگا بہہ رہے تھے، آہ غریب لڑکی، والدہ کے انتقال
نے اُسے بھی کافی متاثر کیا تھا۔ سکونِ قلب کی تلاش میں میں
کلکتہ پہنچا، بتول بھی والدہ کے انتقال کی خبر سن کر بہت زیادہ
متاثر ہوئی، وہاں کوئی ایک ہفتہ گزار کر علی گڈھ چلا آیا، رخصت
کے وقت بتول نے ضرورت سے زیادہ آنسو بہائے، اس کا
خیال ہے کہ اب وہ زیادہ دن میری جدائی میں برداشت نہیں کر سکتی،
اُس نے قطعی طور پر میری ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، اور اس کی
یہ آواز والدین کے کانوں تک پہنچ چکی ہے، علی گڈھ پہنچکر بھی
سکون و راحت کی دولت نصیب نہ ہو سکی، آہ ایک سال کے
اندر میری دنیا میں بیسیوں انقلابات آئے، اب میں اپنے
مستقبل کے متعلق غور کرتا ہوں وہ حد درجہ تاریک اور خطرات سے
بھرا ہوا نظر آتا، صبیحہ کے متعلق والدؒ کی نصیحت، اور بتول سے شادی کرنا،
یہ دو چیزیں میرے لئے عجیب کش مکش کا باعث تھیں۔ حیران تھا کہ مجھے
کیا کرنا ہوگا، ایک دو مہینے تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ آخر محبت فرض
پر غالب آ گئی۔ اس قسم کی میں نے ایک تحریر ماموں کے پاس روانہ کی "مجھے سخت
افسوس ہے کہ بعض حالات کے تحت میں اپنی والدہ کی نصیحت پر عمل نہ کر سکونگا،
بہتر یہ ہوگا آپ مجھ بدنصیب کو اپنی فرزندی میں لینے کا ارادہ فرمائیں"
اس کے جواب میں مجھے صبیحہ کی تحریر ملی، جو ماموں کے انتقال کی اطلاع لئے ہوئے
تھی، مجھے مجبوراً کانپور جانا پڑا، صبیحہ تمام رات میرے پاس بیٹھی روتی رہی،
آہ بدنصیب لڑکی، بچپن میں ماں کی محبت سے محروم، ایک چھوٹی پھوپی
تھی اور وہ بھی اللہ کو پیاری ہوئی، اور ایسے میں باپ بھی چھوڑ کر چلا گیا،

اب مجھے اُس کی ذات سے قدرے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی، میں نے
صبیحہ سے بہت کچھ حالات کہدیئے، بتول کی محبت اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔
صبیحہ نیک اور بلند و پاکیزہ جذبات کی مالک تھی، اُس نے جواب دیا،
"بتول ایک خوش نصیب لڑکی ہے، جو آپ کی کائنات پر چھا گئی مجھے
آپ سے کوئی شکوہ ہے اور نہ گلہ، رونا تو تقدیر کا ہے جو آپ کو اپنا
نہ بنا سکی، تعلیم اس قسم کی دی گئی تھی، بتول آپ کی محبت کی حقدار ہے،
آپ بخوشی اس سے شادی کر سکتے ہیں، لیکن براہ خدا ان مسرتوں
اور محبت کے صدقہ میں مجھے بھی کچھ بھیک دیجئے، اللہ مجھے اپنے پیروں
کے پاس پڑا رہنے دیجئے، میں کچھ نہیں چاہتی، صرف آپ کی
قربت، وہ رو رہی تھی، اس کا سارا بدن ہچکیوں سے لرز رہا تھا،
سچ بتائیے، وہ کہے جا رہی تھی، اب دنیا میں میرا کون ہے، صرف آپ"
"صبیحہ۔ میں نے بے قرار ہو کر کہا، کیا کہہ رہی ہو تم۔ زیادہ اُداس اور
دلگیر نہ ہو، مجھے اپنی عزیز ترین ماں کی نصیحت کا بڑا خیال ہے، مجھے
افسوس ہے کہ میں نے اتنے دنوں تک تمہیں جاننے کی کوشش نہیں
کی" "نہیں" یہ میرا قصور ہے" صبیحہ آنسو پاک کرتے ہوئے بولی،
"جو آپ کو اپنا نہ بنا سکی"، خیر! ان باتوں کو جانے دو صبیحہ صبح کا بھٹکا ہوا
شام کو گھر آ گیا، اب صبیحہ اور بتول میری دونوں آنکھیں ہیں، اور یہ آنکھیں میرے
لئے نعمت غیر مترقبہ ہیں جن کو میں اپنی زندگی میں جسم سے علحدہ نہیں کر سکتا، بتول
کو فوراً کانپور بلا لیا گیا۔ واقعات کی حقیقت کا اظہار میں نے نہیں صبیحہ نے کیا۔
اور بتول صبیحہ کی طرح میرے لئے قربانی دینے تیار تھی، بہت جلد وہ ایک
دوسرے کی پرستار بن گئیں۔ اور میں اُن دونوں دیویوں کا پجاری بن گیا،
اُن کے اصرار پر مجھے اپنی ادھوری تعلیم جاری رکھنی پڑی، اور مجبوراً یہاں
چلا آیا۔ ایک ہفتہ ہوا مجھے ان کی تحریر ملی ہے۔ اُن میں سے ایک کہتی ہے
"اب ہمیں ایک دوسرے کیلئے ساتھی مل گئے ہیں۔ ہمیں آپ کی اتنی ضرورت نہیں، جتنی
آپ کو"، دوستو! وہ دونوں حق بجانب ہیں لیکن مجھے تو ان کی ضرورت ہے۔
ـــــ یہ رہی میری اپنی کہانی

صابر کوسگوی

بِلّیاں

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں ملک اٹلی میں ایک شخص تھا جس کا قول تھا کہ جانور خواہ کسی نوع کے ہوں قابل احترام ہیں کیونکہ خدا نے انہیں بنایا ہے۔ عوام نے اس شخص کی بات کو ایک عرصہ تک تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ کرتے بھی کیسے؟ وہ ایک ایسی نسل سے تھے جس کو جانوروں کے مار ڈالنے میں مزا آتا تھا۔ اور وہ آئے دن اس مشغلہ میں منہمک بھی رہا کرتے۔ اس پر ہی ختم نہیں بلکہ اس نسل نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ آدمیوں کو مار ڈالنا ان کا اس سے بھی زیادہ خوش گوار مشغلہ تھا۔ اور آدمیوں کا ایک دوسرے کو قتل کرتے ہوئے دیکھنا وہ دنیا کا ایک دلچسپ ترین کھیل خیال کرتے تھے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ جانور مقدس کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایسی چیزیں جو کبھی بھیڑ بکریاں کہلاتی ہیں وہی کسی وقت گوشت کہلاتی ہیں اور کھانے پکانے کی غرض سے تول سے بازار میں بکتی ہیں۔ ان کو تقدس سے کیا تعلق۔ تقدس اور احترام کا یہ پرچارک جب کبھی بازاروں سے گزرتا تو لوگ اس کا مذاق اُڑاتے اور پھبتیاں کستے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا یہی شخص بستی میں سے گزر رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک بھیڑیا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس بھیڑیے نے شہر کے خدا جانے کتنی ہی بکریاں اور آدمیوں کے بچے ہضم کئے تھے۔ چلتے چلتے یہ شخص بستی کی شاہ راہ سے ہوتا ہوا ایک بڑے چوک میں ایک گرجا کے قریب پہنچا۔ بھیڑیا بھی اس کے ساتھ ہی لنگڑاتا لنگڑاتا ہانپتا کانپتا آ پہنچا۔ چوک کے درمیان فوارہ کا ایک ستون تھا اور اُس ستون پر پتھر کی ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ ہمارا دوست صلیب کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ بھیڑیا بھی اس کے پیچھے ہی پہنچا اور دو پیروں پر کھڑا ہو کر بہت معصوم آواز میں چوطرف دیکھنے لگا۔ اس عرصہ میں چوک میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جب مجمع ذرا بڑا ہو گیا تو بھیڑیئے کے ساتھی نے ایک وعظ شروع کیا جو بہت دیر تک جاری رہا۔ اس وعظ کا خلاصہ یہ تھا کہ جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے خصوصاً بیڑیوں کے ساتھ کہ وہ خاص خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ غالباً لوگوں نے اس شخص کی بات قبول کر لی تھی۔ کیونکہ کچھ دنوں کے بعد جب وہ مر گیا تو ایک بڑے گرجا میں اس کی لاش دفن کی گئی اور اُس پر دو گرجاؤں کا اور اضافہ کیا گیا۔ اب میرا تو یہ ایمان ہے کہ یہ اسی شخص کی دعا تھی کہ فلارنس کے سان لارنزو (San Larenzo) کی خانقاہ اور باغ میں ایک سو پر تین بلیاں پل رہی ہیں اور کیوں نہ پلیں؟ سینٹ فرانسس کہہ گیا ہے کہ جانور تمام مقدس اور قابل احترام ہوتے ہیں۔ ہاں بے شک جانور مقدس ہیں لیکن بلیوں کے بچے بھی تو ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سینٹ فرانسس کے مقولہ پر جو ایمان لائے وہ ان لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں جو ایمان نہیں لائے۔

سان لارنزو کے پجاری اور خادم سینٹ فرانسس کے مقولہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اب میرا خیال ہے کہ ایک زمانہ تک اُنہیں یہ بھگتان بھگتنا پڑے گا۔

یہ خانقاہ خاصی بڑی اور کشادہ ہے اور اس کے اطراف ایک برآمدہ چوطرف چلا گیا ہے۔ درمیان میں خود رو گھاس

کا ایک تختہ ہے جس میں سرو کے درخت جا بجا لگے ہوئے ہیں۔ خانقاہ کی دیواریں اس قدر بلند ہیں کہ اوپر کی طرف نظر کی جائے تو آسمان ایک چوگوشہ ٹکڑے کی طرح کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ برآمدہ کے متصل جگہ جگہ بادامی رنگ کے دروازے نظر پڑتے ہیں اور ہر دروازہ کے بازو پر اُس پادری کا نام اور دیگر تفصیلات ہیں جو اس کے اندر مکین ہے۔ یہ بالکل اسی اصول پر ہے جیسا کہ ویسٹ منسٹر میں ڈین کے احاطہ میں پایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس جگہ پادری اور بلیاں زیادہ ہیں۔

پادری خانقاہ کے اندر رہتے ہیں۔ بلیاں گھاس کے تختہ پر رہتی ہیں اور بعض اوقات وہیں مر بھی جاتی ہیں۔ پادریوں کی حالت کا میں نے کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن بلیاں بالکل ملول، اور اگر یہ نہ کہا جا سکے کہ اُن کے چہروں سے کسی غیر معمولی غم والم کی مُرجھاہٹ عیاں تھی تو کم از کم وہ سب کی سب صحت مند نہ تھیں۔ لڑنے جھگڑنے سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے کبھی اُن کی وہ لمبی روتی ہوئی تابہ اور وہ تنہائی کی دل گرفتہ لیکن سُریلی کراہیں نہیں سنیں، جو ہماری معمولی بلیوں کا چاندنی یا اندھیری راتوں میں اگلے یا پچھلے پہر ایک ضروری مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ ان میں وہ قناعت آمیز بے فکری بھی نظر نہ آتی تھی جو ہم کسی بہار کی صبح کھڑکی کی چوکھٹ پر لیٹی ہوئی بلی میں دیکھ سکتے ہیں ــــ وہ اس کی گول گول مینڈھا اور پاک صاف ریشمی دُم بگلہ کے سے سفید سینے سے نکلے ہوئے سفید بے داغ پیر، نیم وا آنکھیں جو کبھی کبھی اس بے ڈھنگی اور بے وقوف دنیا سے زِچ ہو کر بند کر لی جاتی ہیں، اُس میں گو افسردگی ہے، لیکن معتدل اور خوشگوار ہے۔ اور جس سے ایک ایسا فلسفہ ٹپکتا ہے جس میں رنج اور خوشی کو خاص توازن کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

لیکن سان لارنزو کی خانقاہ میں کچھ اور ہی رنگ تھا۔ شہر کی دھوپ اور گرد و غبار سے گھبرا کر میں ایک دن اس خانقاہ میں کسی قدر ستانے کے لئے آنکلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان بلیوں میں سب سے زیادہ چاق و چوبند بلی کو بھی وہ یک سُوئی نصیب نہیں ہے۔ سرد اور مرطوب اندھیروں اور پگھلا دینے والی دھوپ میں یہ اُداس اُداس سی پھرتی رہتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاقہ کش بلیوں کی یہ بے چین اور آوارہ روحیں ہیں جنھیں کسی جگہ بھی قرار نہیں ہے۔ یہ رنگا رنگ کی ہیں۔ بھڑک دار زعفرانی، ہپی کے رنگ کی اور ایک آنکھ پر نمایاں سفید داغ، بھورے بادامی اور جامنی کے ملے جُلے رنگ، چھینٹے دار اور چت کبرے، پٹول دار اور یکساں سفید اور کالی۔ لیکن وہ پُر اسرار مُردنی جو اُن کے بدن اور چہروں پر چھائی ہوئی تھی اُس نے اِس تمام بوقلمونی پر اوس ڈال دی تھی۔ اُن کی بھڑک آنکھوں کو چبھتی تھی اور اُن کی نفاست نے ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ کوئی بلی بھی یہ توقع نہ کر سکتی تھی کہ اس کی کوئی قیمت ہو سکیگی۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ بے ارادہ پھرنا اُن کا مشغلہ تھا چھجے کے پتلے سے پتلے کنارہ پر وہ بے لغزش اور بے آواز پا گزر جاتیں بے نیازی اور لا پروائی انتہا کی تھی۔ کبھی کبھی اتفاق سے کسی موڑ پر ایک دوسرے سے چھو کر گزرنا بھی ہو جائے تو کوئی توجہ نہ کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دُھن اور ایک مقصد نامعلوم ہے جس کی گہرائیوں میں ارد گرد کی چیزیں غرق ہو چکی ہیں۔ کوئی بلی بھی اپنے ساتھی کے لئے ایک نگاہِ غلط انداز کی روادار نہ تھی اور نہ کوئی مہربانی یا عتاب ہی کی علامت ایک دوسرے کے لئے دیکھنے میں آتی تھی۔ اُن ایک سو پر تین بلیوں میں ایک بھی ایسی نہ تھی جو یہ نہ سمجھ چکی ہو کہ بقیہ ایک سو دو اس خانقاہ میں موجود نہیں ہیں۔ کتنی روح فرسا یہ حقیقت ہے۔ کیا اِن میں انسانیت نام کو نہ تھی؟

یہ بے زبان اور لاوارث ہستیاں شہر کی گلی کوچوں سے ہنکائی ہوئی اس عالم گیر جائے پناہ میں بسیرا کرتی ہیں۔ یہ گویا سو کھیرتے ہوئے جو

جھاڑ سے چار و ناچار گِر جاتے ہیں۔ ایک نوالا روٹی کے لئے یہ کونا کونا پھرتی ہیں اور ایک دوسرے کو دم توڑتا ہوا دیکھ کر اُن کے مُنہ سے ایک "میاؤں" تک نہیں نکلتی۔ میں سینٹ فرانسس کو اگلے وقتوں کا ایک حکیم اور دانا خیال کرتا تھا لیکن میرے خیال کی تردید ہوگئی۔

اس وقت دن کے دو بجے تھے میں اُن کی بے معنی گُھما گھمی گھنٹہ بھر تک دیکھتا رہا۔ ناگہاں میں نے محسوس کیا کہ یہ جانور چاروں طرف سے میرے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھاس کے تختہ پر صف بہ صف یہ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میرے اور اُن کے درمیان صرف ایک گڑھا تھا جو برآمدہ سے متصل چلا گیا تھا۔ میں برآمدہ پر کھڑا تھا۔ اور یہ گھاس کے تختہ پر۔ کامل ایک سو تین بُجھی ہوئی مایوس اور ہراساں بلیاں میری طرف گھور رہی تھیں۔ اُن کی بے نور حلقہ زدہ آنکھیں میرے جسم میں چُبھی جا رہی تھیں۔ دو سو دو آنکھوں (ان میں سے چار صرف ایک ہی آنکھ سے کام چلاتی تھیں) کی برداشت میرے بس سے باہر تھی۔ حالانکہ میں ایک جہاں دیدہ، شادی شدہ اور بال بچوں والا آدمی ہوں میں بھاگ جانے کی راہ تلاش اور حواس مجتمع کر رہا تھا کہ میں نے دروازہ میں قدموں کی چاپ سُنی۔ ایک عورت ہاتھ میں ایک سیاہ چرمی تھیلا لئے ہوئے آرہی تھی۔ ہو نہ ہو وہ کسی اور بلی کو اس گروہ میں شامل کرنے لا رہی ہوگی تاکہ روز روز کی ہش ہاش اور فضیحتی سے خاندان آزاد ہوسکے۔ یہ تو ہرگز ممکن نہیں کہ وہ ان میں سے ایک آدھ بلی کو مستعار لے جانا چاہتی ہو۔ لیکن بات کچھ اور تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھی اور ہمارے اِن رفقار کی طرف مربیانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ بلیاں اس کو مجھ سے بہتر جانتی تھیں۔ عورت بظاہر غریب لیکن اپنے صاف سُتھرے سیاہ لباس میں خوبصورت نظر آرہی تھی خصوصاً اُس کی وہ بانکی ترچھی ٹوپی جو سفید بالوں پر مرصع کاری کر رہی تھی خوب تھی۔

عورت نے تھیلے سے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ اپنی آستینیں چڑھائیں اور ایپرن باندھا۔ اس عرصہ میں بلیوں کی بے صبری قابل دید تھی۔ اُن کی دُموں کی حرکت سے فضا میں تموج پیدا ہو رہا تھا اور میاؤں میاؤں کا ایک مشترکہ مسلسل شور خانقاہوں کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اُن کے پنجے فضا میں اُٹھتے اور خطرات بارش کی موسیقی کے ساتھ زمین پر آرہتے۔ ایک مکّار نے تو حد کر دی۔ یہ کانی بلیوں کی ٹولی سے تھی۔ کسی طرح گرتی پڑتی صفوں کو چیرتی ہوئی یہ آگے بڑھی اور اس کاغذ میں لپٹے ہوئے تحفہ پر منہ مار ہی دیا۔ لیکن عورت نے چابکدستی سے ایک ہنٹر اس کے رسید کیا جو پسپائی کے لئے کافی تھا اور وہ کان کھجاتے ہوئے واپس ہوئی۔ عورت نے کاغذ میں سے مزیدار سی کھانے کی کوئی چیز نکالی اور اب تقسیم کا عمل شروع ہوا۔

بلی عام طور پر بہت سُست رفتار سے کھاتی ہے اگرچہ اپنے حصہ کو بڑے تیز جھپٹے کے ساتھ اُچک لیتی ہے۔ سانپ کے بل کی طرح ایک جھٹکا لگایا اور نوالہ اُس کا ہوگیا۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے زمین پر لیٹ جاتی ہے۔ سر جھک جاتا ہے، دُم کھینچ لی جاتی ہے اور آنکھیں بالکل بند کرلی جاتی ہیں۔ یہ ہیں وہ آدابِ دسترخوان جو ایک شریف اور خوش باش بلی کے ہوتے ہیں۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ کئی دنوں کی صبر آزما گشت اور بہت سی ناکام گھاتیں اِن ایک سو تین کی صلاحیت اور سلیقہ کا خاتمہ کر چکی تھیں سچ پوچھو تو اس وقت اُنھوں نے شرمناک مظاہرہ کیا۔ تلچھٹ بھی ملا تو اس پر یہ قحط زدہ کی طرح گریں، اس پر پنجے بے ضرورت مارے۔ بے نور آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہیں، اور ایک ہی نوالہ میں ہڑپ کر گئیں۔ اس تناول ما حضر کے درمیان غرغراہٹ حلقوم سے اس طرح نکلتی رہی

جیسے بجلی کی کڑک کسی کوہستان میں سُنائی دیتی ہے ۔ وہاں اپنی باری کا انتظار کہاں تھا ۔ وہ دیر تک کھانے کا مزہ لیتے رہنے کے لئے ہونٹوں اور چھوں کو چاٹتے رہنے کا خیال کیسے تھا ؛ اور پھر کھالینے کے بعد وہ عادتی کھیل کی فرصت کیسے تھی ۔ وہ یہاں بھی ہر قوت کی سی بے چین اور آتش زیر پا تھیں ۔

اُن کی دعوت کا سماں کسی اُداس اور سنسان گرجا میں غول بیابانی کی بدمستیوں کی یاد دلا رہا تھا ۔

(ترجمہ) از ماریس ہولٹ ۔ نجم الدین انصاری

آمد

نقابِ ریشیں ہاتھوں سے سرکاتے ہوئے آئی
سیہ خانے میں میرے نور برساتے ہوئے آئی
طلوعِ ماہِ سیمیں کا گماں ہونے لگا مجھ کو
جبینِ نازکو اس طرح چمکاتی ہوئی آئی
زہے قسمت جسے عادت تھی مجھ سے منہ چھپانے کی
بہارِ لالۂ رُخسار دکھلاتی ہوئی آئی
کوئی اس کے خرامِ ناز کا انداز تو دیکھے
تجلّی رقص کرتی برق لہراتی ہوئی آئی
لباسِ ریشیں کو اُس کے گر پیمانہ کہہ لیجے
شرابِ حسنِ پیکر اس سے چھلکاتی ہوئی آئی
اداؤں سے محبت کا سبق دیتی ہوئی پہنچی
نگاہوں سے حیا کے پھول برساتے ہوئے آئی
مرے اشعار کی تفسیر اس کا پیکرِ رنگیں
مجھی کو وہ مرے اشعار سمجھاتے ہوئے آئی
اسی کی سانس خوشبو بن کے سنبلوں میں رہتی ہے
فضا کو اس کی اک اک سانس مہکاتے ہوئے آئی
خموشی اس کی دلکش تھی کہیں حسنِ تکلم سے
وہ چپ ہونے پہ بھی اک راز سمجھاتے ہوئے آئی

راجہ مہدی علی خاں

غزل

مجھ سے دنیا کو بدگمانی ہے
نوجوانی ہے نوجوانی ہے
دل ہے اور موسمِ جوانی ہے
آرزوؤں کی حکمرانی ہے
غم نہیں روحِ شادمانی ہے
موت ہی اصلِ زندگانی ہے
جس کا عنواں ہے گریۂ حسرت
ہمنشیں وہ مری کہانی ہے
سُرخیاں بہ رہی ہیں عارض پر
کتنی رنگین نوجوانی ہے
پھر سے نظریں ملائیے تو سہی
ہر نظر میں نئی کہانی ہے
جور مجھ پر نہیں کرم ہے رشید
غم نہیں اُن کی مہربانی ہے

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

ہندوستان کے فقیر اور سادھو

ہندوستان میں فقیروں اور سادھوؤں کی اتنی کثرت ہے کہ معاذاللہ۔ عام ہندوستانی خواہ وہ غریب ہوں کہ امیر۔ کسی فقیر کے سوال کو رد کرنے سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ اس کو وہ مذہبی گناہ سمجھتے ہیں۔ مسلمان ہوں یا ہندو۔ دونوں یہ خیال کرتے ہیں کہ فقیروں کے سوال کو پورا کرنا اور کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کرنا ثواب ہے۔ جب کوئی سادھو یا فقیر کسی کے در پر جا نکلتا ہے اور صدا لگاتا ہے :-

"دے داتا تیرے بچوں کی خیر"

اگر وہ مجبوری کے تحت اس سوال کو پورا نہ کرسکیں اور وہ خالی ہاتھ اُن کے در سے واپس چلا جائے تو انہیں بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ان کے گھروں کی برکت بھی چلی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں یہ تک ہوتا ہے کہ جب کوئی فقیر اُن کے در پر آکر سوال کرے تو وہ پہلے اس کو شکم سیر کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ وہ یہ تک خیال نہیں کرتے کہ اگر فقیر کا پیٹ بھر دیا جائے تو خود اُن کا پیٹ خالی رہ جائے گا۔ ایسا کرنے میں وہ بڑا مرتبہ سمجھتے ہیں۔ مشرقی لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ پہلے غریبوں کا پیٹ بھرو۔ بعد اپنی اپنی فکر کرو۔

"اوّل درویش بعد خویش"

ہمارے پاس ایسے نمونے بھی ہیں کہ پہلے زمانے میں بزرگ اور خدا رسیدہ لوگ جن کے علم اور معرفت کا دور دور چرچا تھا، ان میں سے بعض خدا کے خاص پیغمبر بھی تھے جن کا یہ خیال تھا کہ وہ دو دو روز فاقہ کرتے تھے۔ پہننے کو برابر کپڑا میسر نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود جو کچھ مل جاتا صبر اور شکر کے ساتھ کھالیتے اور خدائے تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جاتے۔ جس وقت وہ کھانا کھاتے اگر کوئی فقیر آکر سوال کرتا تو وہ فوراً جو دے سکتے اس کو دے دیتے اور خود بھوکے رہ جاتے۔ اسی طرح ہندو مذہب میں بھی سادھوؤں اور فقیروں کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں فقیروں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دنیا کے شاید ہی کسی اور ملک میں ہو۔ کہنے کو تو سب ہی فقیر کہلاتے ہیں، لیکن فقیر فقیر میں فرق ہوتا ہے۔ فقیروں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً معذور، پیشہ ور، مجبور، مجذوب وغیرہ۔

معذور فقیر وہ ہیں، جن کے ہاتھ پاؤں نہ ہوں۔ یا وہ آنکھوں سے معذور ہوں۔ یا فالج کے اثر سے کسی کام کے ناقابل ہوگئے ہوں۔ بعض لوگ پیدائشی معذور ہوتے ہیں۔ بعض غریب لوگ اپنے بچوں کو جو اچھے خاصے تندرست ہوتے ہیں، اپنا پیٹ بھرنے کا ذریعہ بنانے کے لئے معذور بنا دیتے ہیں۔ مثلاً آنکھیں نکال دیتے ہیں۔ یا ہاتھ پاؤں توڑ ڈالتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح اُن کو بچپن ہی میں بے کار کرکے ساتھ لئے در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ بعض وقت ایسے معذوروں کو ایک چھوٹی سی گاڑی بنا کر اس میں بٹھا دیتے ہیں یا لکڑی کا جھولا بنا کر رسیوں سے باندھ کر اس کے اندر بٹھا دیتے ہیں۔ اور خود اس جھولے کو لے کر گلی گلی پھرتے ہیں۔ لوگ ان کی حالت پر رحم کھا کر ان کو پیسے، کپڑا لتا جو خدا دے دیدیتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس کافی پیسے روزانہ جمع ہو جاتے ہیں بعض وقت پر فقیر اتنا کما لیتے ہیں جس سے چار، پانچ آدمی اچھی طرح پیٹ بھر کر کھا سکتے ہیں۔ یہ بھیک ہی کی لعنت ہے کہ وہ ایک ہونہار ہستی کو دنیا کی تمام لذتوں سے محروم کرکے اس کی معذوری کی نمائش کرتے اور لوگوں کے رحم کو اپنی معاش کا

ذریعہ بناتے پھرتے ہیں ۔

پیشہ ور فقیروں کی قسم سب سے بدتر ہوتی ہے ۔ وہ کاہل اور سست انسان ہوتے ہیں محنت کرنا نہیں چاہتے بلکہ لوگوں کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، محنت مزدوری سے جو تکلیف ہوتی ہے اس سے بچنے کے لئے وہ یہ سارا ڈھونگ رچاتے ہیں ۔

بعض فقیر خاندانی ہوتے ہیں ۔ اور کسی مشہور تارک دنیا درویش صفت بزرگ سے اپنا سلسلہ جوڑ لیتے ہیں ۔ اُن کے ٹھاٹ، آن بان اور فقیری شان دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ رنگ برنگ کے لباس وضع وضع کی شکلیں ۔ کسی کا گیروا لباس ہے تو کسی کا ہرا بانا ہے ۔ ڈاڑھیاں، پٹیاں خاص انداز سے جمی ہوئیں، صاف ستھرا لباس پہنے، عمامہ باندھے، ہاتھ میں عود بتیوں کا گٹھا یا عود دان، یا چراغ لئے، اپنے خاص خاص گیت گاتے پھرتے ہیں ۔

ایسے فقیروں کی بے شمار قسمیں ہیں ۔ ان میں رفاعی نقشبندی بہت مشہور ہیں ۔ رفاعی فقیر حضرت سید احمد رفاعی سے منسوب ہیں ۔ ان کا بھیک مانگنے کا طریقہ سب سے نرالا ہوتا ہے وہ ضرب میں لگا کر مانگتے ہیں ۔ کسی دکان پر جاتے ہیں اور اپنی آنکھ گرز کی نوک سے باہر نکال کر یا تلوار سے زخم لگا کر گالوں اور پیٹ میں سیخ چبھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اور جب تک اُن کی مقررہ بھیک نہ مل جائے وہاں سے نہیں ٹلتے ۔

نقشبندی فقیر عموماً جمعرات کو ایک شمع لے کر نکلتے ہیں اور جو پیسہ دے، اس کی کنپٹی پر کاجل کا ایک ٹیکہ لگا دیتے ہیں ۔ جو برکت یا حفاظت کا ٹیکا ہے ۔

مجبوری سے جو لوگ فقیری کا پیشہ اختیار کرتے ہیں، وہ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں ۔ بعض وقت یہ مجبوری کسی جسمانی نااہلی کے سبب ہوتی ہے ۔ اور کبھی دماغی ۔ وہ ایسی بیماریوں میں بھی مبتلا رہتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ان کو اپنے پاس نوکر رکھنا تو درکنار گھر کے اندر تک نہیں آنے دیتے ۔ یہ بیماریاں عموماً جذام، سرسام، گٹھیا وغیرہ ہیں ۔ جذام والے کے متعلق تو یہ حکم ہے کہ اس کو برچھے کی انی پر رکھ کر روٹی دی جائے ۔ غرض ایسی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو مجبوراً بھیک مانگنا پڑتا ہے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بھیک مانگتے ہوئے شرم آتی ہے ۔ مگر مجبوری ایسی شے ہے جس کے آگے انسان سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔

مجذوب ان لوگوں کو کہتے ہیں ۔ جو بظاہر دیوانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں ۔ اور خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں ۔ بعض لوگ ابتدا میں اچھے خاصے ہوتے ہیں ۔ لیکن بعد میں مجذوب ہو جاتے ہیں ۔ لیکن ہر دیوانہ مجذوب نہیں ہو سکتا ۔ مجذوب مجاذیب میں بڑا فرق ہوتا ہے بعض لوگ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مجذوب بنا لیتے ہیں ۔ یہ لوگ سڑکوں پر شور مچاتے پھرتے ہیں ۔ موٹروں اور گاڑیوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "کچھ دیدے تیرا بھلا ہوگا"، "یا بڑی نوکری ہو جائے گی" یا "ہم کو اجمیر کے خواجہ بلا رہے ہیں ۔ ٹکٹ دلا دے خدا تیرا بھلا کرے گا ۔ دیکھ تیرے کو خوشی ہونے والی ہے" غرض اس طرح وہ لوگوں کو پھانسنے کی فکر میں رہتے ہیں ۔ اکثر سادھو بھی یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں ۔

بعض لوگ حقیقت میں مجذوب ہوتے ہیں ۔ ان کی دعا میں تاثیر ہوتی ہے ۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں پورا ہوتا ہے ۔ ایک واقعہ میں نے سنا ہے ۔ لیکن آنکھوں سے دیکھا نہیں جس مجذوب کا میں ذکر کر رہی ہوں ۔ وہ زنانہ میں ۔ ایک دفعہ ان کے گھر میں ان کی دادی کچھ سی رہی تھیں ۔ تمام لوگ اپنے کام میں مشغول تھے ۔

مجذوب صاحب نے اپنی دادی کو مخاطب کر کے کہا "اے دہاں سے ہٹ جاؤ، وہ دیوار گر جائے گی"، لیکن دیکھنے میں دیوار اچھی خاصی مضبوط تھی۔ دادی پر ان کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ دیوانہ ہے۔ لیکن دیوار تھوڑی دیر میں گر گئی۔ اور بچاری دیوار کے نیچے دب کر مر گئی۔ اکثر ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ مجذوب جو کچھ کہتے ہیں وہ صحیح ہوتا ہے لیکن ع مجذوب ہی کہتے ہیں جو ہوتا ہے۔

بڑے بڑے بزرگانِ دین دنیا سے رحلت فرماتے ہیں تو لوگ اُن کی مزار کی نگرانی کرنے لگتے ہیں۔ وہ صبح شام جھاڑو دیتے ہیں چراغ روشن کرتے ہیں۔ یہ لوگ مجاور کہلاتے ہیں اُن کی گزر کا ذریعہ وہ نذرانہ ہوتا ہے جو معتقدین چڑھاتے ہیں۔ بعض بزرگوں کے عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتے ہیں۔ بعض بزرگوں کے عرس تاریخ نہ ٹالنے کی غرض سے معمولی طور پر کر دئیے جاتے ہیں۔ بڑے بزرگوں کے عرس کے لئے سرکار سے سالانہ رقم مقرر ہوتی ہے۔ اور بعض وقت معتقدین کے چندوں سے یہ رسم پوری کی جاتی ہے۔

اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ اطراف ہند سے لوگ ہر سال زیارت کی خاطر جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر فقیروں کا ایک تانتا لگا رہتا ہے۔ ایسی جگہ لوگ اپنی حیثیت کے موافق فقیروں کو روپیہ، پیسہ، دھیلا وغیرہ دے کر مدد کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر فقیروں کے سوال کو رد نہیں کرتے۔ اس لئے بعض فقیر وہاں عجیب عجیب طرح کی حرکتیں کرتے ہیں اور بعض وقت خوش اعتقادوں کی جیبیں خالی کراتے ہیں۔

جن بزرگانِ دین کی شہرت ہے وہاں پر جمعرات اور جمعہ کو فقیروں کا بڑا مجمع رہتا ہے۔ بہت سے لوگ عقیدت کے ساتھ جمعرات اور جمعہ کو درگاہوں پر فاتحہ پڑھنے بھی جاتے ہیں اور فقیروں کو ان کی عقیدتمندی سے فائدہ اٹھا کر مانگ کھانے کے لئے موقع مل جاتا ہے۔

اگر کسی ایک فقیر کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مکان میں فلاں دن خیرات ہوتی ہے تو یہ خبر ایسی جلدی پھیلتی ہے کہ بس ایک اچھا خاصا مجمع اس مکان کے پاس جمع ہو جاتا ہے۔ جدھر دیکھو بھیک مانگنے والوں کا ایک اژدہام نظر آتا ہے۔

ہمارے یہاں محرم کے فقیر بہت مشہور ہیں۔ حیدرآباد کا محرم قابل دید ہوتا ہے۔ مشہور علموں کی سواریاں خاص اہتمام سے نکلتی ہیں۔ جن کو دیکھنے اضلاع کے لوگ بھی آتے ہیں۔ اس زمانے بھی خیر خیرات بہت ہوتی ہے۔ اس لئے اطراف کے گاؤں کی عورتیں اور مرد بھیک مانگنے نکلتے ہیں۔ اور مرثیے پڑھ کر بھیک مانگتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں امیر، غریب، شریف غرض سب فقیر بن جاتے ہیں۔ امام حسینؓ کے فقیر کہلاتے ہیں۔ یہ فقیر ہرے رنگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور گلے میں آنٹیاں، جھولیاں ڈالے شان سے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رسمی فقیر ہوتے ہیں۔ اور اُن کی فقیری لطف کی ہوتی ہے کیونکہ اس زمانے میں ان کو کھچڑی، قبولی، شربت، روٹ پونگے جیسی لذیذ چیزیں کھانے کو ملتی ہیں۔

فقیروں کی اِن سب قسموں کے علاوہ ایک اور قسم مہذب فقیروں کی ہے۔ یہ لوگ صاف سُتھرے اور اُجلے کپڑے پہنے سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہیں اور جہاں کوئی شریف آدمی گاڑی میں یا پیدل نظر آگیا کہ یہ لوگ آہستہ سے

مسکین صورت بنائے اس کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اور شریف آدمی کی طرح سلام کرکے رازدارانہ انداز میں کہنے لگتے ہیں "جناب ایک گزارش ہے، میں اورنگ آباد، دہلی، لکھنو غرض کسی دور دراز مقام کا رہنے والا ہوں" اس کے بعد ایک طویل قصہ اپنی مصیبتوں کا شروع کردیتے ہیں۔ ایسا کہ سننے والا بیزار ہو کر پیچھا چھڑانے کے لئے روپیہ دو روپے ان کی نذر کردے۔ کیونکہ ان کی حالت کا لحاظ کرتے اس سے کم دینے کو شرم آتی ہے۔ یہ سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں۔

بعض شریر النفس فقیر ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دیجئے تو اپنے ساتھیوں میں پہنچ کر آپ کو بیوقوف بناتے ہیں اور نہ دیجئے گا تو گالی دیتے ہیں۔

غرض فقیروں کی یہ اتنی قسمیں ہیں کہ ان کے متعلق ذرا ذرا بھی لکھا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ ان کی بے شمار قسموں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقیر اور سادھو جن کو مذہباً بھیک لینے کا حکم ہے، وہ بہت تھوڑے ہیں۔ وہ کسی کو دق نہیں کرتے۔ بلکہ جو کوئی کچھ دے دے اُسے دعا دے کر قبول کرلیتے ہیں۔ اور خدا کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں ایسے ہی فقیروں کو دینا دراصل ثواب ہے باقی اچھے خاصے تندرست لوگوں کا بھیک مانگنا اور ان کو دینا دونوں گناہ ہیں اس سے قوم اور ملک کا بڑا بھاری نقصان ہوتا ہے ایسی بے محل بھیک کی وجہ سے کاہل اور سُست لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کو پیشے کے طور پر اختیار کرلیتی ہے۔ اور وہ لوگ جن کو کچھ کام کرنا چاہئے تھا بے کار رہتے ہیں جس سے قوم کو نقصان ہوتا ہے اور آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے کی کمائی کو ناجائز طور پر استعمال کرکے نقصان پہنچانے کا باعث ہوتا ہے اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ جو لوگ واقعی قابل رحم ہیں ان کو بھیک نہیں ملتی اور ہٹے کٹے عیش مناتے ہیں۔

چند دنوں پیشتر سے حیدرآباد پر ہر طرف کے فقیروں اور سادھوؤں کا ایسا شدید حملہ ہو رہا ہے کہ راستے سے گزرنا، بازار جانا اور کچھ خریدنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ بے شرم، فقیر موٹروں اور گاڑیوں کے اندر ہاتھ ڈال ڈال کر بھیک مانگتے ہیں۔ ایک سے پیچھا چھڑانے کے لئے کچھ دے دیجئے تو دوسروں کو خبر کر دیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے، گاڑی کے اطراف فقیروں اور بھکاریوں کا اچھا خاصا مجمع ہو جاتا ہے۔

یہ حالت ہندوستان کے کم شہروں میں دیکھی جائے گی۔ بنارس میں بھی جو سادھوؤں کا مرکز ہے، فقیر راستہ چلنے والوں کو اس طرح دق نہیں کرتے۔ اسی کو دیکھ کر ہماری حکومت نے "قانون انسداد گداگری" ...... بنایا تھا جس کی رو سے اچھے خاصے تندرست لوگوں کا بھیک مانگنا جرم قرار دیا گیا۔ اور جو معذور تھے انہیں معذور خانوں میں بھیجنے کا فیصلہ کیا جہاں ان کی ہر طرح خبر گیری کی جاتی ہے ہٹے کٹے فقیروں کو پکڑ کر جرمانے اور قید کی سزائیں دی جائیں لیکن یہ ایسے بے غیرت ہوتے ہیں کہ انہیں اس کا بھی خوف نہیں ہوتا۔ جرمانہ دینے کی بجائے اُلٹے وہ حاکم سے بھیک مانگنے لگیں گے۔ اور اگر انہیں تھپڑ کرکے چھوڑ دیجئے تو پھر یہ سند یافتہ فقیر بن کر شان سے نکلیں گے۔ اگر انہیں قید میں ڈال دیجئے تو بس انہیں بے فکری ہو جاتی ہے۔ گو کبھی کبھی انہیں ذرا محنت کرنی پڑتی ہے لیکن روٹی کپڑے کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔

فقیر [illegible] معذورین میں اس لئے رہنا نہیں چاہتے کہ وہاں کی باضابطہ زندگی انہیں قید معلوم ہوتی ہے۔ پھر ان کے شوق ذوق اور طلب کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ بہت کم فقیر اور سادھو ایسے ہوں گے جن کو کسی نشے کی عادت نہ ہو۔ بھنگ، چرس، افیون، سیندھی، شراب، مدک غرض دنیا کی ساری نشے کی چیزیں ان پر حلال ہیں۔

اس کے علاوہ، مرغ بازی، بلبل بازی، غرض کتنے ایسے شوق ذوق کے کام ہیں، جو ان فقیروں میں عام طور پر رائج نہیں ؟

اِن تمام حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم فقیروں اور سادھوؤں کو ملک اور قوم کے لئے ایک بدترین لعنت کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پیشہ ور فقیروں اور سادھوؤں کی یہ لعنت شہر سے جس قدر جلد دور ہو جائے اچھا ہے۔ اس سے ملک کو امن امان نصیب ہوگا۔

محمودہ صدیقی

روح فانی کی خدمت میں ــــــ نذرِ عقیدت

یہ ہے میرے اس مضمون کی سرخی جو بیک وقت عقیدت خیز و درد انگیز ہے ۔ مجھے اس کی سرخی بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے ۔ ہو سکتا ہے آپ کو ایسی نہ معلوم ہوتی ہو ۔ لیکن کم از کم میرے نزدیک ضرور ہے ۔ اس لئے کہ آج فانی یہاں ـــ اس دنیائے الم یا آغوش میں موجود نہیں ہیں اور بجائے اس کے کہ ان کی زندگی میں ان کی اصل حقیقت کا، اُن کے بلند مقام کا، ان کی سچی خدمات کا اعتراف کرنے کے میں اُن کے گزر جانے، ہم میں سے اُٹھ جانے اور "مسندِ یاسیات" کو خالی کرنے کے بعد یہ "ھدیۂ عقیدت" پیش کر رہی ہوں۔ مجھے اس جذبۂ عقیدت کی ادا کے متعلق ایک عام بات یاد آئی ـــ آج تک شاذ ہی کوئی ایسی ہستی ملے گی جس کی بڑائیوں اور نمایاں خصوصیات کا اعتراف اس کی زندگی ہی میں اسے نصیب ہوتا ہو ۔ شاید ہی کوئی ایسی خوش نصیب ہستی ہوگی جس کو شہرت کے دن دیکھنے ـــ اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھنے نصیب ہوئے ہوں گے ۔ ہر بڑے آدمی کی قدر مرے بعد ہوتی ہے ۔ نیک آدمی کی قدر بہت ممکن ہے اس کی زندگی میں ہو مگر "بڑا آدمی" تو اس فیض سے بالکل محروم رہتا ہے ۔ اور مشہور بات ہے کہ "نیک آدمی بڑا آدمی نہیں ہو سکتا" اور جیسے ہی وہ بزرگ ہستی "اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرتی ہے"، سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے ۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج تک یہ لوگ اصحاب کہف بنے ہوئے تھے اور اب اس عظیم المرتبت ہستی کی موت نے ایک تازیانے کا کام کر کے ان کو اس لمبی اور گہری نیند سے بیدار کر دیا ۔ یا یہ کہ ان لوگوں میں اتنا مادّہ نہ تھا کہ اس بزرگ ہستی کی بلند خصوصیات کا اس کے سامنے اعتراف کر لیتے ۔ اور ایسا کرنے کے لئے وہ اس دن کے منتظر تھے!

مثالاً ہم اقبال کو لیتے ہیں ۔ اس "شاعر اعظم" "شاعر مشرق" "دانائے راز" کی زندگی میں کیا ہم نے ایسی نظمیں، مضامین اور غنائیہ تمثیلیں، ڈرامے پڑھے تھے جو آج ہمیں چھوٹے اور بڑے پرچے میں ملتے ہیں ۔ آج لوگوں نے انہیں بہت بڑے بڑے خطابات عطا کئے ہیں ۔ کیا یہ کام یہ لوگ اُن کی زندگی ہی میں نہیں کر سکتے تھے ؟ "اقبال" اور "جوہر اقبال" کے پڑھنے والے ذرا سوچیں کیا اتنے بڑے لمبے چوڑے پر معانی گہری اور وسیع نظر کے حامل مقالے اس "دانائے راز" کی زندگی ہی میں نہیں لکھے جا سکتے تھے ؟ آخر کیوں نہ لوگوں نے ایسا اقدام کیا ؟ کیوں یہ ہمت دنیا کے آدمیوں میں اقبال ہی کی زندگی میں نہ آئی ؟

اس کے "اصل راز" کو سمجھنے کے لئے جہاں تک ہمیں علم اور تجربہ بتاتا ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایسے شہرۂ آفاق شخص کی زندگی میں لوگوں کو ایک قسم کا ڈر مسلط رہتا ہے وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے خیالات کی وہ تردید نہ کر بیٹھے ! ان کی تنقید کا منہ توڑ جواب نہ دے بیٹھے! یا اس کا ایک پہلو ہمارے سامنے یوں بھی آتا ہے چونکہ اس کی "معنوی تخلیق" کا عمل جاری رہتا ہے لہذا لوگ نئی چیزوں کی امید اور آس کی کشمکش میں وقت کی لہروں پر جھولا جھولتے رہتے ہیں ۔ مگر موت کے بعد اس کا "مکمل تخلیقی سرمایہ" سامنے رہتا ہے اب نہ ڈر رہتا ہے اور نہ کچھ خوف ۔ بلکہ اب آزادی سے جس پہلو پر اور جس زاویۂ نگاہ سے چاہیں اس کے کلام کا "تجزیہ" کر سکتے ہیں ۔

کیوں نہ ہم ایک ایسا قدم اُٹھائیں اس "بے حسی" کی دیوار کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیں جس نے ہمارے آگے حقیقت بینی کے راستے کو مسدود کر رکھا ہے ؟ کیوں نہ ہم ایک ایسی "نظر" پیدا کریں جن سے ہمیں ہر کھوٹے اور کھرے کی پہچان کی تمیز آجائے؟ کیوں

نہ ہم اس ہستی کی جو دراصل "کچھ" ہے اس کی زندگی ہی میں پہچان کرنی سیکھ جائیں؟ اور دنیا میں وہ کون سی بات ہے، وہ کونسا ایسا معمہ ہے جو حل ہونے سے رہا! صرف "قوتِ عمل" کا صحیح استعمال درکار ہے!

یہ میری بدقسمتی ہے ـــــ کاش ایسا ہوتا کہ میں اپنے اس ارادے کو جو میں نے ساقی نومبر ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے تنقیدی مضمون ـــ "دورِ حاضر کی اردو غزل گوئی ـــ طومارِ اغلاط" کو دیکھ کر سوچا تھا پورا کی ہوتی۔ تنقید فی نفسہ بری نہیں بلکہ تنقید کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ ذرا سے غور کے بعد ہمیں تنقید کے پس منظر میں یہ چیز عیاں نظر آتی ہے کہ جس پر تنقید کی گئی تھی وہ اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کی حامل تھی۔ لہٰذا تنقید کی زد میں اگر کوئی مضمون آجائے تو میں اُسے لکھنے والے کی ہمت کا مترادف سمجھتی ہوں۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ تنقید ہوئی فانی کی "باقیات فانی" پر ـ اور تنقید نگار نے جوش میں آکر ایسی سخت تنقید کی کہ فن تنقید کے بھی چھکے چھوٹ گئے۔

تو جس وقت میں نے مضمون دیکھا ایک جوابی مضمون لکھنے کی سوجھی۔ کیونکہ فانی سے بہت قریب رہ کر میں نے ان کا کلام دیکھا اور انہی کی زبان سے سنا تھا اور اُن کے جوشِ جذبات کا جو کلام سناتے وقت ان پر طاری ہو جاتا تھا، یہ اثر تھا کہ سننے والوں پر سکتہ کا سا عالم چھا جاتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ فانی کی آواز نہیں ہے بلکہ درونِ خانہ کے مکین نے بربطِ یاس پر وہ درد انگیز راگ اس ولولہ خیزی کے ساتھ چھیڑا ہے کہ اس کے ہر تار سے سننے والوں کے دل کے تار مل گئے ہیں اور سوائے ایک عالمِ یاس و درد کے کچھ نہیں۔ ہم ایک ایسی لگن میں ڈوب جاتے تھے ایک ایسی لہر میں بہہ جاتے تھے کہ خود اپنے کو فراموش کر جاتے تھے۔ پھر بھلا یہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے نغمے کس طرح اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے؟ کوئی کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ ان میں کوئی معنی نہیں مطلب نہیں؟

میں مضمون نہ لکھ سکی کیونکہ امتحان قریب تھا۔ اور جب اوروں کے جوابی مضامین میں نے پڑھے تو وہ جذبہ بھی سرد ہو گیا!

میں اس کو اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتی ہوں کہ حضرت فانی میرے والد کے قریبی دوست تھے۔ اور اکثر اپنے کئی واقعاتِ زندگی سنایا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت میری عمر کوئی آٹھ سال کی ہوگی حضرت فانی کو والد صاحب نے مدعو کیا تھا اور ان کا کلام سن کر ہم نے جو لطف اٹھایا تھا اس کا اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں حضرت فانی سے تقرب کی عزت حاصل تھی۔

یہ ایک قاعدہ کی بات ہے جب انسان کا دل مسلسل مصیبتیں اُٹھاتے اٹھاتے ٹوٹ جاتا ہے، اور آفات کا مقابلہ کرتے کرتے انسان کی کمرِ ہمت بیٹھ جاتی ہے تو وہ اس درجہ حساس ہو جاتا ہے کہ ؎ ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

ایسی حالت میں ایسا انسان ہوا کے سہارے ہی کو ایک پائیدار سہارا سمجھنے لگتا ہے۔ جہاں کسی نے دلجوئی کی اور ہمدردی ظاہر کی وہ اسی کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتا ہے اور اس سکونِ دل کے سہارے دل کی بھڑاس نکال کر جی ہلکا کرنے کے لئے اپنی وہ "جیون بیتی" سنانے لگتا ہے جسے اس نے بھی بڑی احتیاط سے من کی آہنی تجوری میں محفوظ کر دیا تھا ـــ اور اپنی دانست میں اسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جانے کا اہتمام کیا تھا چنانچہ حضرت فانی نے جس جانگداز حالاتِ زندگی کا میرے والد سے ذکر کیا تھا وہ ایک ایسا المناک افسانہ ہے کہ شائد ہی کسی حساس دل کو اس کے سننے کی تاب آئے!

حضرت فانی نے ایک دن اپنی زندگی کے اصل افسانے کو سنانا شروع کیا:۔ (اس کا خیال رہے میں حضرت فانی کا افسانۂ حیات سنا رہی ہوں

بالکل انہی کے الفاظ مجھے یاد نہیں۔ سارا خلاصہ ہے ان کی "آپ بیتی کا"۔)

دنیا میں جیسا ہوتا آیا ہے ہر شخص ذات پات، رنگ روپ، دین و مذہب کا لحاظ کئے بغیر محبت کرتا ہے اسی طرح حضرت فانی نے بھی محبت کی۔ مگر یہ ان کا لڑکپن کہئے کہ بچپن یا تقدیر کے کھیل کہ فانی نے محبت کو کھو کر محبت پائی ۔۔ یعنی ان کی "مقصودِ حیات"، جوان کی "دولتِ دل" "سرمایۂ دل" "نورِ دل" "سرورِ دل" الغرض سب کچھ تھیں اس دنیا سے گزر گئیں۔ وہ ان کی حقیقی چچازاد بہن تھیں۔ کتنا الم انگیز اور دردناک ہے یہ افسانہ! آہ ذرا غور سے سنئے!!

وہ فانی سے محبت کرتی تھیں۔ پرستاری کے درجے سے گزر کر بندگی کے درجے کو پہنچ گئی تھیں۔ ان کی ساری دنیا سمٹ کر حضرت فانی کی ذات میں مجتمع ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ ہوں اور ان کا مقصدِ زیست ۔۔۔ اور ساری کی ساری زندگی اسی عالمِ قرب و تقرب میں گزر جائے!

حضرت فانی ایک یتیم کی حیثیت سے چچا کے ہاں رہتے تھے۔ چچا نے حضرت فانی سے ایف اے پاس کرنے کے بعد کہا کہ "میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میری زندگی کا سہارا ..... یہی ایک لڑکی ہے ..... تم میرے بھائی کے نہیں میرے بیٹے ہو، گھر سنبھالو اور اسے بیاہ لو!" ۔۔ فانی کے سر پہ حصولِ علم کا بھوت سوار تھا۔ آپ محبت سے شجرِ دل کی آبیاری کرنے کی بجائے وہ آبِ علم سے اسے سینچنا چاہتے تھے۔ اس "سعادتمند بھتیجے" نے بی۔اے کے بعد اس "کارِ خیر" کو انجام دینے کا وعدہ کیا۔

دو سال کا طویل عرصہ؟ پل بھر میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ کجا دو سال! اُف!! اس انتظارِ روح فرسا کے تخیل نے جانِ حزیں پر بنا دی۔ اور وہ تنِ نازنیں فرش کی زینت بن گیا۔ محبت کا یہ خونیں ڈراما زندگی کے اسٹیج پر دو سال تک کھیلا جاتا رہا۔ اور ساری گھڑیاں گنتے گنتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ بی اے کے نتیجہ کی خوشخبری لے کر فانی گھر پہنچے تو کسی نے اس خبر پر اتنی زبردست خوشی و مسرت کا اظہار کیا کہ اس خوش آئند انتظار کردہ زمانے کی خوشی نے شادی مرگ کر دی ۔۔۔ اور وہ جانِ نازنیں اب فرش سے قبر میں گھر کر گئی۔

فانی پر بجلی گر پڑی! آسمان سر پر آ گیا!!! روح تک کانپ اٹھی!!! زمین لرز اٹھی!!! احساسات میں زلزلہ آ گیا!!! لاش لیں نظر آتا تھا کہ یہ کہہ رہی ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ✚ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس حادثۂ جانگداز نے جس کی خواب میں بھی فانی کو توقع نہ تھی فانی کی دنیا بدل ڈالی۔ وہ "رومانی شاعر" (جیسا کہ وہ خود کو بتاتے تھے) ایک دم زبردست "قنوطی شاعر" ہو کر رہ گیا۔ ان کے وہم کو بھی وہم نہ تھا کہ ان کی یہ "بساطِ امید" یوں الٹ دی جائے گی اور ان کے خبطِ علم سے ان کی زندگی کی سب سے بڑی "پونجی" یوں موت کے بیدرد ہاتھوں لٹ جائے گی۔ اور لٹے گی بھی تو ایسے جانگداز طریقہ پر کہ یاس سوائے "یادِ جانگداز" اور کچھ نہ بچے گا! کیا عشق گناہ ہے؟ اس کی اتنی زبردست سزا ملتی ہے اور یہ شعر حقیقت آفریں کیا ؎ عشق نظر آفریں اور نظرِ معصیت ✚ عشق تمنا نژاد اور تمنا گناہ

مگر ۔۔ مگر اب اس سے کیا؟ ؎ رات ہی رات میں تمام طے ہوئے عشق کے مقام ✚ ہو گئی زندگی کی شب اب میں سحر کو کیا کروں؟

اس "پیکرِ وفا" نے بازی جیت لی، اس نے خود کو اپنے "مقصدِ حیات" پر سے نچھاور کر دیا ؎

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ ✚ صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

اب اگر فانی نے غم کی دنیا میں خود کو سمو دیا تو کیا ہوا؟ ان کی زندگی بجائے خود ایک رستا ہوا زخم اور ایک پکا پھوڑا بن گئی تو اس سے کیا؟ ان کی تمام ہستی یاسیات میں ڈوب گئی تو کیا ہوا؟ انہوں نے کسی کو ٹھکرایا تو کیا فطرت چپ رہتی ہے وہ انتقام لیتی ہے۔ اور ایک نہ ایک وقت اس شدت کے ساتھ کہ روح تک کانپ جائے لرز جائے!! اور اس "گناہِ عظیم" کے کفارے میں فانی نے ایک ایسی

زندگی بسر کرنی شروع کی جو درد و غم، رنج والم و یاس میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس یاس انگیزی نے انہیں درد اور اس کی کسک سے لطف اندوز ہونے کا گر سکھایا۔ فانی کی دنیا کے افق پر اب سوائے درد و غم، رنج والم، حسرت و یاس کے اور کچھ طلوع نہ ہوتا تھا۔ فانی نہ تھے یہ سمجھ لیجئے مجسم "یاس و حسرت" تھے!!

اب فانی نے ایک لاابالی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ نہ انہیں کوئی اپنا محسوس ہوتا تھا اور نہ وہ خود کسی کو نظر آتے تھے۔ فانی نے دل بہلانے کے لئے وکالت پڑھنی شروع کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ وکیل ہو کر بریلی بھی چلے گئے۔ اس اثنا میں شاعری بڑے عروج پر تھی مگر زندگی سے جو جی اچٹ گیا تھا پھر نہ لگا۔

چونکہ فانی مجسم کشتۂ محبت تھے۔ لہٰذا کچھ تو ان درد بھری پکاروں کی وجہ سے جو شاعر اپنے (Counter Part) کے لئے بلند کرتا تھا۔ اور ان آنسوؤں، آہوں اور نالوں کے "زندہ نقوش" کی وجہ سے جو وہ گہری اندھیری اور بھری چاندنی راتوں میں بکھرا کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر بحیثیت عاشق کے لوگ انہیں بیحد چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی نے ان کی مجسم درد زندگی سے اتنا اظہار تاثر کیا ہے کہ "ساری عمر" کی دلہی منظور کی اور فانی کی موت سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے حقِ رفاقت ادا کر دیا!

آفریں صد آفریں بر عاشقِ صادق!! مگر اس عرصہ میں فانی کا ربابِ حیات وہی غم انگیز اور یاس خیز نغمے بکھیرتا رہا۔ اس کے اس درد بھرے راگوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ فانی کی محبت نے جو درد کا پہلو اختیار کیا تھا وہ آخر تک جاری رہا۔ اور جس رنگ سے اس افسانۂ الفت و نیاز کو فانی نے سنایا ہے اس کی داد نہ دینا ہماری کور ذوقی کا ثبوت ہے۔ فانی نے جس رنگ کو اختیار کیا اور وہ نہ ہوتا تو ہمیں فانی کے ثباتِ عشق میں لغزشیں نظر آتیں اور ایسی بے کیفی اس کے کلام پر چھا جاتی کہ اس کی موت کا بھی ہم کو احساس نہ ہوتا۔ کیونکہ آج ہم اصل ذاتِ فانی کے لئے غم کناں اور سینہ زن نہیں ہیں۔ ہم تو اس کو پیٹتے ہیں کہ آج شاعرِ فانی نہیں رہا۔ ایسا شاعر جس نے ہمیں وہ درد بھرے نغمے سنائے کہ جن کا غم آگیں اور درد آفریں راگ ہمارے ہر تارِ دل میں ایک مسلسل ارتعاش بکھیر رہا ہے! فانی اس درجہ گم شدۂ درد محبت ہو گئے تھے کہ انہیں ہر شئے میں درد کا پہلو روشن نظر آتا تھا۔ خود اس قدر ضم شدۂ الم ہو گئے تھے کہ ان کی ہستی اس شعر کا مصداق بن کر رہ گئی تھی۔ ؎

اس قدر خوگرِ فریاد ہوں میں صورتِ نَے — بات بھی منہ سے نکلتی ہے تو نالہ ہو کر

فانی عسرت سے عسرت میں تھے۔ اور اگر کوئی چاہتا تھا کہ کچھ مدد کرے تو قسمیں دے دے کر، الٹی معافیاں چاہ چاہ کر شرمندہ کر دیتے انہیں اپنی بیکسی اور بدحالی سے شکایت نہ تھی۔ ان کے دل کا زخم اتنا گہرا تھا کہ اس ناسور سے زیادہ انہیں اور کوئی تکلیف دہ، جان لیوا چیز نہ ہو سکتی تھی۔ دنیا سے دل اُٹھ چکا تھا۔ لہٰذا مصائب و آفات ان پر ذرہ برابر اثر نہ کرتے تھے، ایک دفعہ والد صاحب نے چاہا کہ کچھ شاعر کی نذر کریں اور اس کے لئے انہوں نے ان کے احساس بیکسی کو بیدار کرنا چاہا تو یہ کہا ؎

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا + دولت دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا۔ اور ہنس کر یہ شعر پڑھا ؎

"یاس" نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی — فانی نامراد کو موت کا آسرا دیا

"باقیات فانی" "عرفانیات فانی" خود فانی نے والد صاحب کو تحفتہً دیں مگر باہر کا باہر ہی نہ معلوم کون صاحب ہڑپ کر گئے، مجھے اس کا جتنا رنج ہے میں نہیں کہہ سکتی۔ شائد یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے یہ دونوں کتابیں کہیں نہیں پائیں۔ بازار پچھوایا!

تو اسٹاک ختم ۔ پھر سے اسٹاک آیا تو میرے پیسے ختم غرض یہاں چند اشعار لکھتی ہوں جو انہوں نے خاص طور پر والد صاحب کو دئیے تھے ۔ نہ معلوم مطبوعہ ہیں کہ کیا !

گلہ زمیں سے شکایت ہے آسماں سے ہمیں ۔۔۔ یہ دل رہے گا نکلوا کے دو جہاں سے ہمیں
ابھی یہ عذر بھی کرنا ہے پاسباں سے ہمیں ۔۔۔ جبیں کے نقش اٹھانے ہیں آستاں سے ہمیں
ست ہمیں نفسِ واپسیں سے ہے امید ۔۔۔ یہ ایک سانس ملا دے گی کارواں سے ہمیں
رہبر ہو خضر کا جو رہے ذوقِ خبر میں ۔۔۔ وہ نقشِ قدم میں ہوں تری راہ گزر میں
کانٹوں میں بھی پھولوں کی ادا تھی ترے آگے ۔۔۔ اب باغ میں جو پھول ہے کانٹا ہے جگر میں
اس عالم تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا ۔۔۔ میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں
جیسے کوئی جی کھول کے ہنسنے نہیں دیتا ۔۔۔ لے دے کے یہ اندازِ تبسم ہے سحر میں
ہر اشک تری یاد کے جلووں سے ہے معمور ۔۔۔ دنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں
اور ایک ہے منظر مری شوریدہ سری کا ۔۔۔ سودا ہے بعنوانِ محبت مرے سر میں

فانی ہے مری آہ و فغاں میں اثر الٹا
شاید مری تقدیر کی گردش ہے اثر میں

اس کے علاوہ فانی کے کئی ایک اشعار ہیں ، غزلیں ہیں جو اتنی مقبول ہیں کہ زبان زدِ خاص و عام ہیں ۔ ان کا ذکر پھر کسی وقت کروں گی ۔ فی الوقت اس مضمون کو اشاعت کے لئے دینے کا محرک ایک خاص واقعہ ہے ۔ میں اسے واقعہ ہی کہوں گی بلکہ چھوٹا سا حادثہ ۔ ساقی دلی سے نکلتا ہے یعنی ہندوستانی راجدھانی سے اور جس طرح راجدھانی اپنی ہمہ گیر اہمیت رکھتی ہے اسی طرح چونکہ دلی کی خاک پاک سے یہ رسالہ وابستہ ہے اتنی ہی ہمہ گیر اہمیت و مقبولیت رکھتا ہے ۔ جناب شاہد احمد صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں ۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء کا "ساقی" مجھ تک بھی پہنچا ۔ فانی جیسے شاعر کی موت کا کس کو دکھ نہ ہوا ۔ کس نے اس ہستی کی جدائی کی چوٹ محسوس نہ کی ؟ لہذا ہر شخص نے بقدرِ ہمت اظہارِ عقیدت کیا ۔ "فانی بدایونی" کے عنوان سے ایک مضمون جناب محمد احمد سبزواری کا ساقی میں چھپا ۔ بڑے شوق سے میں نے مضمون پڑھا کیونکہ یہ صاحب جامعہ عثمانیہ ہی کے ایم اے ہیں ۔ اور بھوپال میں مقیم ہیں ۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک جگہ پڑھا کہ "وفات سے دو ڈھائی سال پہلے ریاست کے ایک ضلع بیڑ میں تبادلہ ہوا اور وہیں مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے ! بات یہ ہے اگر کوئی کہے کہ 'دلی کرشنا ندی کے کنارے واقع ہے' " تو سننے والے کا کیا حال ہوگا ۔ میرا خیال ہے کہ سبزواری صاحب کا یہ مضمون (Burning Topics) کے عنوان کے تحت آسکتا ہے ۔ کیونکہ فانی صاحب کو خدمت سے علحدہ ہوئے کوئی کچھ اوپر چار سال ہوتے ہیں ۔ ترکِ ملازمت کے بعد سے وہ "تلے پلی" (جو بلدۂ حیدرآباد کا ایک مشہور محلہ ہے) میں آرائش بلدہ کے مکان میں مقیم تھے ۔ اسی گھر میں ان کی مخلص و وفادار بیوی نے دو سال سے زیادہ عرصہ کی جانکاہ بیماری سرطان میں مبتلا رہ کر انتقال کیا اور اسی میں خود حضرت فانی نے جان جان آفریں کے سپرد کی ۔

دوسری بات جو بہت زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ایک جگہ صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ فانی کو زندگی بھر ایسے پُر درد واقعات پیش آتے رہے جنہوں نے ان پر ایک خاص اثر کیا ..... دنیا ہی بدل ڈالی! اب سوچنا یہ ہے کہ وہ کون ایسے پُر درد واقعات تھے جنہوں نے فانی پر اتنا اثر کیا؟ جہاں تک میں سمجھتی ہوں ہر طرح کی غیر معلوم چیزوں کا کھپاؤ افسانوں، ڈراموں اور نظموں میں بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر کسی شاعر کے احوال زندگی — اور پھر "شاعر یاسیات" فانی مرحوم نور اللہ مرقدہٗ — پر مضمون لکھنے کو تو اتنی معلومات بھی چاہئیں۔ محض اس لئے لکھنا کہ مضمون ساقی میں چھپے گا ادب کے ساتھ کوئی اچھے سلوک کا مظہر نہیں۔

سب سے بڑا تعجب تو مجھے اس لئے ہوا کہ ایڈیٹر ساقی جیسے آدمی فانی جیسے شاعر کے حالات سے اتنے نابلد ہیں کہ ایسے مضمون کو شائع کیا؟ اس سے یہ بات تو ضرور پوری ہوئی کہ فانی کی موت کا اثر "ساقی" نے بھی لیا۔

میں سوچتی ہوں کہ ہندوستان کہاں ہے اور ہندوستان کے بسنے والے کہاں ہیں؟ ہمالیہ کی چوٹی برابر گڑھا بھی کھودیں تو شاید اس کی تہہ سے بھی پستی میں ہمارا پتہ نشان نہ ملے گا۔ کتنے بےحس ہیں ہم؟ کیا جمود ہے ہم میں؟؟ اف!!! اچھے کی قدر نہ کبھی کی گئی نہ کی جا رہی ہے — آگے کا حال اللہ جانے۔ اب تو جنگ ہو رہی ہے۔ سب مشاہیر اسی شکوے میں مرے کہ ان کا قدر داں نہیں ملتا!! فانی کی انوکھی ہستی نہ تھی بلکہ یہ ان لوگوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ تھا جن کو زمانے کے بیدرد ہاتھوں نے جی بھر کر پامال کیا تھا۔ اور جن کی ہمتوں کو ابھارنے کی بجائے ناقدری کی قبر میں سکون کی نیند سلا دیا گیا تھا۔

سعیدہ مظہر (زنانہ کالج)

غمِ فانی

غم زدوں کی زندگی کا ترجماں
عشق کے ماروں کا میرِ کارواں

غم کا پیغمبر جہاں سے اُٹھ گیا
وائے بر بدبختیٔ ہندوستاں

سردار علی الہام (عثمانیہ)

"افسانہ در افسانہ"

تم کو چاند کی سوگند نظم اک سنا دو نا — نقرئی فضا کو اور دل نشیں بنا دو نا!

دور تک کھلی چھت تھی، چاندنی کی راتیں تھیں
شوق کی فضائیں تھیں، دل کی کائناتیں تھیں
کوئی بار بار اپنی نظم گائے جاتا تھا
کوئی چاند کی صورت مسکرائے جاتا تھا
جیسے تار چھڑنے پر ساز گنگنا اُٹھے
تتلیوں کے گانے سے پھول مسکرا اُٹھے

"ہاں، تو پھر ہوا کیا جب گیت گا چکا کوئی
جی ہی جی میں خوش ہو کر مسکرا چکا کوئی
اس شبِ محبت کا کیا سماں رہا ہوگا
جیسے ایک اک لمحہ داستاں رہا ہوگا!

اک خموش سا نغمہ چاندنی کے تاروں پر
جیسے سحر کا عالم رات کے نظاروں پر
گاتے گاتے جب اپنے گیت تھک گیا کوئی
خامشی سے اکتا کر خود ہی کہہ اٹھا کوئی
گائیے بھی اور آگے گیت ابھی ادھورا ہے
اس حسین نغمے کا جانے ماحصل کیا ہے!

ہاں تو اس نے کیا گایا، کیا غرض تھی گانے کی — اک لطیف موسیقی چاند کو سنانے کی

آہ کیا مبارک تھی، وہ حسین ساعت بھی
چاندنی بھی، نغمہ بھی، حسن بھی، محبت بھی
دو محبتوں میں میں کاش جا پڑی ہوتی
کیسی برہمی ہوتی، کیسی دل لگی ہوتی!

"کچھ نہیں، بڑی ضد پر اس نے گنگنایا پھر
اپنی اپنی ہی دھن میں ایک بار گایا پھر
حسنِ عالم سیمیں، اے مرے مہِ تاباں!
اے مرے تصور کے خالقِ طرب ساماں
وہ ہیں، دل کی دنیا ہے، اک حسین ساعت ہے
آہ کس طرح کہہ دوں مجھ کو تم سے الفت ہے!"

"خوب اب سمجھ پائی، کس طرح ستاتے ہو
نظم کے بہانے سے تم مجھے بناتے ہو
چاند کی ضیا دیکھو جھلملائی جاتی ہے
اب معاف ہو، مجھ کو نیند آئی جاتی ہے!"

سلام مچھلی شہری

تحفہ

(بسلسلۂ گزشتہ)

یہ صدمہ الگ تھا۔ اور پھر گھر میں ہر شخص انہیں اور انکی بھاوج کو اس نظر سے دیکھنے لگا تھا جیسے برٹش امپائر کے طرفدار ہٹلر کو دیکھتے ہوں۔ کھوج بڑھ گئی لیکن سراج نے بھی کچھ ایسے غیر معروف محلہ میں ٹھکانہ کیا کہ یوں بھی پتہ لگنا مشکل تھا پھر انکی احتیاط وضعداری تو اور بھی ایک نخنہ تھی مہینہ کے ختم پر سراج نے اپنا وظیفہ منی آرڈر کیا بھی تو کالج کے پتہ سے، اور یہ کالج میں اس بات کو پھیلانا نہیں چاہتے تھے، لیکن کوئی بات کب تک چھپ سکتی ہے، رفتہ رفتہ سب ہی کو خبر ہوگئی، اور سب ہی کو افسوس بھی۔ بھائیوں اور عزیزوں نے جاکے طرح طرح سے فہمائش کی لیکن سراج نے سب کو ٹال ہی دیا، باپ سب کچھ کرتے تھے لیکن یہ ابھی گوارا نہ تھا کہ خود جاکے بلالائیں۔ آخر کو سوجھی کہ چپراسن سے اس میں مدد لی جائے لہٰذا اب اُس سے دوستی و مراسم بڑھنے لگے، وہی چپراسن جو کبھی ایک ذلیل و حقیر منہ زور عورت تھی، اب ان سب کے سر آنکھوں پر تھی۔ یہ غرض ہے اور غرض کی ترازو میں اونچ نیچ سب برابر تلتے ہیں۔ اس نے جو سفارش کی نتیجہ یہ نکلا کہ اُس نے خود اس کے ہاں آنا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد تجویز ہوئی کہ خود پرنسپل صاحب سے مدد لی جائے، چنانچہ سرور کے ذریعہ حکیم صاحب نے اُن سے ملاقات کی اور واقعات سمجھائے تو انہیں ان کی حرکت پر سخت رنج ہوا، لیکن پھر بھی تسلی دی کہ وہ کوشش کرینگے۔

چنانچہ باپ کے جانے کے بعد لڑکے کو بلا بھیجا اور جانتے تھے کہ کون لڑکا کس طبیعت کا ہوتا ہے، اس لئے بہت دور سے آنے کی کوشش کی تمہیدی و تعلیمی گفتگو کے بعد انہوں نے چھیڑا۔

”ایک بات میں تم سے پوچھ سکتا ہوں، گو مجھے اس کا کوئی ایسا حق بھی نہیں؟“

”یہ آپ کیا فرماتے ہیں، آپ تو میرے باپ سے بڑھ کر ہیں، فرمائیے کیا ارشاد ہوتا ہے!“

”نہیں اپنے باپ سے کوئی شکایت تو نہیں؟“

”اجازت ہو تو عرض کروں، کیا جناب نے کبھی محسوس فرمایا ہے کہ خادم کو کبھی جناب سے شکایت ہوئی ہو؟“

”نہیں!“

”پھر جب روحی باپ سے مجھے کوئی شکایت نہیں تو جسمی باپ سے کیونکر ہوسکتی ہے، خصوصاً جب کہ جسم روح کا تابع ہو!“

پرنسپل صاحب جتنے نمونۂ ہمدردی و شرافت تھے اتنے ہی نباضِ فطرت بھی، لڑکے کے بشرے سے بھانپ گئے کہ اس قسم کے سوالات کی ناپسندیدگی پر وہ ادب و احترام کا پردہ ڈال رہا ہے، لڑکے کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا، اور باپ کو صورت حال سے مطلع کر کے اپنی قصہ ختم کر دیا۔

یہ حکیم صاحب کی کوششوں کی انتہا تھی جو لڑکے کو بالواسطہ بلانے میں صرف کی جاسکتی تھیں۔ اس کے بعد وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ اسی کشمکش میں کوئی ڈیڑھ دو سال سے زیادہ گزر گئے۔ لیکن کوئی صورت نہ بنی، پھر لڑکی کی شادی قریب آرہی تھی، لڑکی کی شادی نے لڑکے کی جدائی کے صدمہ کو اور تیز کر دیا، اور اب وہ اُلجھن کو دور کرنے کے لئے حضرت کی قدمبوسی کیلئے زیادہ جانے لگے۔

حضرت جدّالابرار مولانا شاہ مرید یار خاں کو زشتی
عمّ نوالہٗ وقلّ مثالہٗ شہر کے اُن مخصوص پیرانِ طریقت میں
سے تھے جن کی ہمسری کا دعویٰ بہت کم کر سکتے تھے، اور
خصوصاً اس اعتبار سے تو کوئی بھی نہیں کہ حکیم صاحب جیسے
خشک، عالی وقار شخص اُن کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے
تھے، حکیم صاحب کو اُن سے ارادتِ خاص تھی، اس لئے
وہ اکثر اُن کی خدمت میں جایا کرتے اور سراج کو بھی ساتھ
لیجاتے، اور سراج بھی ہر چند سب ڈاڑھی والوں کو ایک
کوئی الگ ہی صنف کی نظر سے دیکھتا تھا، لیکن ان حضرت
سے وہ بھی بہت مانوس تھا اور سچ تو یہ ہے کہ کشف وکرامت
کے لحاظ سے وہ کچھ ہوں نہ ہوں، لیکن عام مرشدوں مولویوں
کے خلاف انسانی حیثیت سے وہ کافی بلند انسان تھے اور
ایک انسانی دل اپنے سینہ میں رکھتے تھے۔ اپنے مرید خاص
کی اس مصیبت کا حال سُنا تو بہت متاثر ہوئے۔ اور گو زبان
سے کچھ نہ کہیں، لیکن اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح
یہ بچھڑے باپ بیٹے مل جائیں۔

حکیم صاحب کو بھی ان کی تسلی و وعظ سے بہت کچھ
غم ہلکا معلوم ہوتا اور گو وہ کبھی حضرت سے دنیوی باتیں کرنے
کی جرأت نہ کرتے، لیکن اس صدمہ سے تنگ آکر اُنہوں نے
اپنے دل کا حال کہنا شروع کیا، اور جب بیٹی کی شادی قریب
آئی تو اپنی الجھن حضرت سے کہہ سنائی۔ حضرت کو محسوس ہوا کہ انہیں
ایک موزوں موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب سراج ان کی خدمت میں
حاضر ہوا تو باتوں باتوں میں اُنہوں نے پوچھ لیا "سراج بابا سنا ہے
تمہاری بہن کی شادی ہو رہی ہے کیا تم اس میں حصہ نہیں لوگے؟"

"جی ضرور!" کہہ کے لڑکا خاموش ہوگیا اور دوسرے دن
جب آیا تو ایک لفافہ میں دو سَو کے نوٹ رکھ لایا۔ حضرت کی خدمت میں
پیش کرتے ہوئے بولا "یہ ایک حقیر نذر ہے جو اپنی عزیز بہن کیلئے
میں پیش کرتا ہوں، براہ کرم آپ اسے اباجان تک پہنچا دیں!"

حضرت نے بڑی تحسین اور دعائیں دیں، اور کہا کہ فی الحال
تو وہ قبل از وقت ہے البتہ جب شادی قریب آئے تو وہ کہہ کے
منگالیں گے۔ اس کے بعد اُنہوں نے ایک دن اور وقت ایسا
مقرر کیا کہ دونوں باپ بیٹے جمع ہوسکیں۔ باپ پہلے آچکے تھے،
لڑکا بھی روپیہ لے کر حاضر ہوا، جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا باپ
کی سی پیٹھ دکھائی دی پھر جو آواز سُنی تو یقین ہوگیا، یکدم ٹھٹک گیا
پھر جو دیکھا کہ اور بھی مرید موجود ہیں اور حضرت کی بھی نظر پڑ چکی ہے
واپسی بد اخلاقی و بدنمائی ہوگی، حضرت کی خدمت میں سر جھکائے
بیٹھ گیا اور لفافہ پیش کر دیا۔ آج وہ بے طرح مضطرب تھا لیکن
اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ باپ نے اتنی مدت بعد
جو اپنے نورِ نظر کو دیکھا تھا تو اُن کی کیفیت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے
دونوں ہی بے تاب تھے، لیکن دونوں ہی ہٹ دھرم تھے۔
بالآخر جب باپ رخصت ہونے کو اُٹھے تو حضرت اور سبھی اُٹھ
کھڑے ہوئے، حضرت نے یہ کہتے ہوئے لفافہ دیا "یہ آپ کی بہت خدمت
میں ایک حقیر نذر ہے آپ کے صاحبزادے کی، اپنی بہن کی
شادی کے سلسلہ میں!" باپ نے نوٹ ہاتھ میں پکڑے، بیٹے
کی طرف بے اختیار حسرت و مسرت بھری نظروں سے دیکھا
اور ایک رقیق آواز میں بولے "کیا میرے لئے یہ کافی ہے؟"

بیٹے نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا، اور اپنی اُسی سادگی
اور بھولے پن سے کہنے لگا۔ "حضرت، مجھے اپنے وجود پر
شرمندگی ہے کہ میں اپنی بہن وغیرہ کی کوئی معقول خدمت نہ کرسکا
لیکن مجبوری ہے۔ آپ پر سب روشن ہے کہ ٹیوشن سے مجھے
صرف پچاس کی آمدنی ہے، زیادہ کو میں نے خود مناسب نہیں
سمجھا، جس میں سے آٹھ روپے مکان کے کرایہ کے جاتے ہیں۔

آٹھ نوکر کے، اور دس بیس کھانے میں، ایسی صورت میں اس سے بڑھ کر میرے پاس اور کیا جمع ہو سکتے تھے! ..... "

حضرت کی آواز بھی بھر آئی، انہوں نے بات کاٹی "بابا تم نے اپنے باپ کا مطلب غلط سمجھا، ذرا اُدھر دیکھو تو!" یہ کہتے ہوئے انہوں نے باپ کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ بیٹے کی نظر جو باپ پر پڑی تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور وہ ساری رنگت اور رونق فنا ہو چکی تھی جو انہیں اسطرح اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھا ظاہر کرنے کی بجائے کبھی بہت زیادہ جوان ظاہر کرتی تھی۔ خونی محبت نے جوش مارا، ساری رعونت جاتی رہی اور بیٹا بے ساختہ "ابا جان!" کہتے ہوئے پاؤں میں گر پڑا۔ باپ تو بے اختیار تھے ہی، اُٹھا کر گلے سے لگا اور بولے "مجھے معاف کر دو بیٹا، مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا!"

"جی نہیں ابا جان، یہ آپ کیا فرماتے ہیں، میں تو آپ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں!"

جب دونوں خوب رو چکے تو باپ نے کہا "بیٹا میرے گھر میں ایک تمہارے سوا کس بات کی کمی ہے، میں تمہارے روپے لے کر کیا کرونگا، میری سب سے بڑی دولت تو تم ہو۔ ایک بار صاف ہو کے کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا اور یہ کہ اب تم میرے ساتھ چلو گے!۔ کہو چلو گے نا؟"

"جی ہاں ابا جان، آپ کا حکم میرے سر آنکھوں پر ہے!"

"مجھے تم سے زیادہ تمہاری خودداری پر ناز ہے بیٹا!"

حضرت اور سب کے سب اس واقعہ سے بیحد متاثر اور خوش ہوئے، اور جب یہ جانے لگے تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ اس مسرت میں وہ روپے حضرت کی نذر کر دے کہ انہیں کے طفیل میں خدا نے انہیں یہ مسرت بخشی۔ اسکے بعد دونوں گھر آئے۔

آج کی خوشی کا اندازہ لگانے کیلئے حکیم صاحب اور ان کے گھر والوں کا ہی دل چاہئے۔ کسی کے شان گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ حکیم صاحب خود آج بیٹے کو گھر لا سکیں گے اور وہ بھی اسطرح انجان اور آسان کہ جیسے بازار سے کوئی سودا خرید لائے ہوں۔

سارے گھر میں ایک جشن تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیٹی سے پہلے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے، اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اسی ضمن میں اب سب سراج میاں کو مجبور کرنے لگے کہ وہ شادی کے لئے ہاں کہہ دیں، اب تو نہ بڑی بہن کی شادی کا حیلہ باقی تھا نہ گریجویٹ ہونے کا، بس مہینے دو مہینے ہی کی تو بات تھی کہ یہ گریجویٹ بھی ہو جاتے اور بہن کی شادی بھی۔ لوگوں نے تنگ کرنا شروع کیا کہ اب تو عذر کرنے ہی بنے گی، انہوں نے ایک نیا حیلہ نکالا کہ ایم۔ اے کے بعد کرونگا، لیکن یہ نئی چھیڑ بھی چل نہ سکی، کہنے لگے "خیر کم سے کم نتیجہ تو نکلنے دیجئے، کیا خبر کہ پاس بھی ہوں یا فیل!" اور لیجئے نتیجہ بھی نکلا اور یہ اوّل درجہ میں پاس بھی ہو گئے۔

بیٹی کی شادی کو ابھی مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ بیٹے کی کامیابی کا جشن آیا، سچ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حکیم صاحب کے مزہ کو تیز کرنے کے لئے بیٹے کی جدائی کا ایک چٹپٹا سا بگھار دیدیا تھا، ورنہ حکیم صاحب بڑا جم جم نصیب لائے تھے، ساری عمر خوشی میں گزری اور گزرنے کی توقع تھی۔

کامیابی کا جلسہ ہوا، لیکن نہایت "جرمن ڈزائن" یعنی بالکل نئی طرز کا۔ پارٹی دی گئی، مختصر مگر نہایت شاندار۔ مہمان جمع ہوئے اور دوست احباب کے تحفے برسنے شروع ہوئے، ان سے نمٹ کے سراج میاں جو گھر میں آئے تو یہاں بھی عزیزوں اور بھائی بہنوں کے تحفوں اور پھولوں کی بھرمار تھی، غرض سراج پھولوں سے چمن اور تحفوں سے سیٹھ مگن بنے ہوئے تھے بہن نے بات چھیڑ دی "دیکھئے صاحب، اسی خوشی میں آج شادی

کی بات بھی طے ہو جانی چاہیے !" سب نے یک زبان ہو کر اصرار
شروع کیا، لیکن جانے کیا بات تھی کہ سراج میاں ٹال ہی جاتے
اتنے میں بہن نے ایک سے ایک بڑے گھرانے کے پیامات
سنانے اور تصویریں پیش کرنی شروع کیں، سراج نے بھی
تعریفیں شروع کیں۔ لوگوں نے کہا" یہ کیا، تصویریں آپ کو
تعریف کیلئے بتائی جارہی ہیں یا انتخاب کیلئے ؟"
"بھئی دیکھئے جب ایک کام سے پوری طرح نمٹ لوں
تو دوسرا کام کروں، ابھی تو تحفے ہی پورے وصول نہیں ہوئے
اور آپ چاہتی ہیں کہ تصویریں پسند کروں !"
"ہیں ! اور کس کا تحفہ باقی ہے ؟"
"واہ صفیہ بیگم کا تحفہ تو ہمیں وصول ہی نہیں ہوا !"
اور حقیقت بھی یہ تھی کہ صفیہ بیگم تحفہ دینا تو کجا پارٹی ہی
میں برابر حصہ نہیں لے رہی تھیں کچھ مہمانوں اور دلہا (بھنوئی)
کی شرم کا حیلہ تھا، اور کچھ ان میں اب ایک تغیر سا آگیا تھا جبکہ
سراج کے آنے کے بعد بھی ان دونوں میں تقریباً تکلف حائل ہو گیا
کبھی رسمی گفتگو کرلی کرلی ورنہ خیریت، دونوں کی یہی روش تھی
لوگوں نے اسے خرابی صحت پر محمول کیا کسی نے کچھ کہا اور کسی نے
کچھ، غرض نہ وہ اس وقت ان کی محفل میں موجود تھیں نہ انہوں
نے تحفہ ہی دیا تھا۔ سراج کے اعتراض پر بہن بولیں" واہ آپ
تو ان سے انجان رہیے، اور وہ آپ کو تحفہ دیں گی، وہ تو کہتی
ہیں کہ جب تک آپ خود انھیں نہ بلانے جائیں وہ نہ آئیں گی!"
"ضرور، کیوں نہیں، لیجئے ہم ہی بلا لاتے ہیں !"
سراج میاں اٹھ کر جانے لگے۔ بھاوج نے طعنہ دیا" لیکن کیا
اب بھی آپ ان کا تحفہ قبول کرینگے ؟"
"کیوں نہیں ہم تو ضرور ان کا تحفہ قبول کریں گے، خواہ وہ
کوزہ گلاس ہی کیوں نہ ہو !"

سراج صفیہ کے کمرہ میں گئے صفیہ گم سم بیٹھی ہوئی تھیں اور
یہ عادت اُن کی عرصہ سے ہو گئی تھی، گو بہن کے سوا اس کا اندازہ
شاید ہی کسی کو تھا، گھلتے تو حکیم صاحب بھی تھے، اور صفیہ بھی،
لیکن مرد اور عورت کے گھلنے میں یہی فرق ہے کہ عورت گلر کی
طرح گھلتی ہے کہ اندر سے گھن اسے خالی کر دے، اور باہر سے
تماتا نظر آئے، اور مرد باہر سے گھلتا ہے اور اندر سے دوسری
بیوی یا خوشی کیلئے تیار ہوتا ہے۔
سراج کی آہٹ سنی تو صفیہ نے پوڈر مارنے اور سنورنے
کا بہانہ لیا۔ سراج نے پوچھا" کیا ہم اندر آسکتے ہیں صفیہ بیگم ؟"
وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن کوئی جواب دئے بغیر گردن جھکالی، گویا
وہ اس سوال سے ایک بیگانگت کی توہین محسوس کر رہی ہو۔
"دیکھئے آپ نے ہمیں کوئی تحفہ نہیں دیا :-"
صفیہ خاموش تھی۔
"کیوں آپ خاموش ہیں ! معلوم ہوتا ہے، ابھی آپکے
دل سے وہ غبار نہیں گیا، کیا آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا ؟"
صفیہ نے دیکھا کہ زیادہ خاموشی بے موقعہ ہوگی اسلئے
بولنے کی کوشش کی" میری کیا مجال ہے جو ایسا تصور بھی ذہن میں
لاسکوں !"
"پھر آپ خاموش کیوں ؟"
"جی سوچ رہی تھی کہ آپ مجھ ناچیز کا تحفہ قبول فرمانا
گوارا کرینگے بھی یا نہیں !"
(مسکراتے ہوئے)" جی کیوں نہیں، جب اتنے "چیزوں"
کا تحفہ قبول فرمایا ہے تو ایک "ناچیز" کا تحفہ قبول فرمانے میں ہمیں
کیا عذر ہو سکتا ہے !"
"شکریہ ! لیکن میں آپکو کیا تحفہ دے سکتی ہوں ؟"
"آپ جس قابل سمجھیں !"

صفیہ کی آج، جانے، ایسی حالت کیوں تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیم و امید، شرم و حیا اس کی رگ رگ میں مستولی ہے۔ وہ الماری کے قریب گئی، ایک نہایت خوبصورت مقوے کا ڈبہ نکالا، اور سراج کے قریب آکر اُس نے پھر ایک بار سراج اور اُس کی نظروں کا جائزہ سر سے پاؤں تک لیا، اور پھر ایک بار سہمی نظروں سے گویا یہ پوچھنا چاہا کہ "آپ کہیں اس کا بھی مذاق تو نہیں اڑائیں گے" جیسے جیسے وہ قریب آتی گئی اس کے ہاتھ، ہونٹ بلکہ سارا جسم کانپ رہا تھا، اور اس کے احمریں رخسار حسن و شباب کی انتہا سے تمتما رہے تھے تو اُسکی پیشانی شرم و حیا کی بوندوں سے گویا سرخ و سفید مخمل پر موتیوں کا حاشیہ ٹانک رہی تھی، اس نے آخری بار نظر سے نظر ملائی اور یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اُس کی سراج کے پاس کتنی قیمت ہے۔ اس کی آنکھیں شرم کے مارے جھکی ہوئی تھیں، اور کچھ آبدیدہ بھی، وہ ایکدم آگے بڑھی اور جھک کر "ناچیز کا ایک ادنی تحفہ" کہتے ہوئے ڈبہ کو سراج کے قدموں پر رکھ دیا، اور پرے ہٹ گئی۔

سراج کی حالت قابو سے باہر تھی، وہ یکدم جھکا اور "ارے یہ کیا تحفہ کو کوئی سر آنکھوں سے لگاتا ہے یا قدموں پہ رکھتا ہے؟" کہتے ہوئے ڈبہ کو اٹھالیا، کھول کر دیکھا تو وہی ساڑی تھی جسے صفیہ نے اُس کے زخموں کے لئے پھاڑا تھا۔

سراج کے دل میں بجلیاں سما گئیں، اور ایسا محسوس کیا کہ اس کا بخت عرش سے پرے کسی بلندی پر ہے، جیسے ہی اُس نے صفیہ کی طرف اس بے تابی سے نظریں اُٹھائیں اُس کی زبان سے صرف اتنا نکل سکا "صفی، تم!"

ان دو لفظوں میں جن جذبات کے دو جہان موجود تھے اُن کا احاطہ لفظ و قلم کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ صفیہ کے قریب گیا جو گردن جھکائے کھڑی تھی، اور تھرتھراتے ہاتھوں سے اپنے گلے میں سے ایک ہار نکال کر یہ کہتے ہوئے صفیہ کے گلے میں ڈالدیا:

"صفی!"

"جی!"

دل کے ٹکڑوں کو پھول کی پتیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں نا صفی؟

اتنے میں آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ "ارے بھئی کیا ہوا کوئی تحفہ ملا یا نہیں؟"

"بلانے کیا گئے خود بھی اُدھر کے ہو گئے!"........

"جی ہاں، ابھی آیا!" سراج میاں نکل آئے، تھوڑی دیر میں صفیہ بھی آبیٹھیں، بہن نے پوچھا "کہئے کیا تحفہ لائیں، کیا صراحی گلاس تو نہیں؟"

ایک قہقہہ پڑا، اتنے میں حکیم صاحب بھی آپہنچے، "کیا بات ہے بھئی؟"

"دیکھئے ابا جان کب سے ہم منا رہے ہیں، اور سراج میاں ہیں کہ برہمچاری رہنے کی قسم کھا بیٹھے ہیں، کچھ آپ ہی فرمائیے نا!"

"ہاں بیٹا آج تو تمہیں ہاں کرنی ہی پڑیگی! سب ہی کی تو خوشی ہے!"

"اچھی بات ہے ابا جان، میں شادی کر لونگا!"

سب نے اس خلاف توقع جواب پر حیرت و مسرت سے آنکھیں پھاڑلیں اور کہا "کیا سچ؟"

"جی ہاں!"

باپ کو بھی بہت حیرت و مسرت ہوئی، پوچھا "لیکن کہاں؟"

سراج پہلے تو کچھ شرما گیا، پھر یکایک کچھ سوچ کر تن کر کھڑا ہوا اور اُسی لہجہ میں جس میں باپ نے کہا تھا غصہ کی سی صورت بنا کر صفیہ کی طرف ہاتھ بتاتے ہوئے بولا "یہ صفیہ سے پوچھیے!"

یہ چونکہ سب کو وہ منظر یاد تھا، پھر ایک قہقہہ پڑا! لیکن

ہنسی سے زیادہ اس میں وہ خوشی شامل تھی جیسے اُس نے سب کے دل کی بات کہہ دی ہو، اور جب اس جذبہ کا جائزہ صفیہ کی صورت میں لینے کیلئے اُنھوں نے اُسے دیکھنا چاہا تو وہ اپنی جگہ سے کھسک چکی تھی۔

سیّد علی شاکر

"اربابِ شکستہ"

(۱) مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرو وہ آپ ہی آپ ٹل جائیگی۔

(۲) کسی کام کو شروع کرنے سے قبل یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ تم سے ہو نہیں سکتا۔

(۳) دشمن دوست سے بہتر ہے کہ اُس کا ظاہر و باطن تو یکساں ہے۔

(۴) جو تم کو بھول جاتا ہے اُسکو تم بھی بھلا دے سکتے ہو۔

(۵) جہاں سچائی نہیں ہوتی وہاں لفاظی بہت ہوتی ہے۔ صداقت کو کسی ملمع کی ضرورت نہیں۔

(۶) من مندر کے سپنے بڑے سہانے ہوتے ہیں انھیں شرمندۂ تعبیر نہ کرو۔

(۷) ہر وہ بات جو تمہارے ذہن میں آجاتی ہے کہنے کی نہیں ہوتی۔ اور یوں بھی زبان دل کی سچی ترجمان کب ہوئی ہے۔

(۸) حسّاس آدمی کیلئے بے پروائی بدترین قسم کا سلوک ہے۔

(۹) موت ہر وقت سامنے رہتی ہے۔ مگر نزدیک نہیں آتی۔

(۱۰) نیکی کی راہ پُرخطر ہوتی ہے لیکن اُس کا انجام شاندار ہوتا ہے۔

(۱۱) سچ کہو ہمیشہ سچ۔ خواہ یہ سچ تمھیں کتنا ہی مہنگا کیوں نہ پڑے۔

(۱۲) محبت کو عام کردو۔ دل مطمئن ہو جائیگا۔

(۱۳) اپنے جذبات کا تنور اپنے سینہ میں دبائے رکھو۔ اس دبی ہوئی آگ کو بھڑکنے نہ دو۔ پھر تو سارے سنسار کا جل بھی اسکو بجھا نہ سکے گا۔

(۱۴) حسّاس آدمی اگر کبھی کسی کو دھوکا دے تو اُس کا سارا جیون دُکھی ہو جاتا ہے۔

جہاں بانو

غزلیں

مرے نصیب کی اُس دن یہ زندگی نہ رہے
مذاقِ غم مرا جس دن تری خوشی نہ رہے

جلادے برقِ نشیمن گلوں کا دامن بھی
چمن میں ہم بھی نہیں ہیں بہار بھی نہ رہے

بجز ستم کوئی طرزِ "ستم" نہیں کہ مجھے
وہ غم قبول نہیں جو مری خوشی نہ رہے

حیات، موت سے بدتر ہے پھر بھی زندہ ہوں
مری طرح کوئی مجبورِ زندگی نہ رہے

حجابِ جلوۂ ساقی ہے میری بے ہوشی
کچھ اور چاہیے مستی کہ بے خودی نہ رہے

دلیلِ ہوش ہے یہ فرقِ جیب و دامن بھی
جنوں تو جب ہے کہ اتنی بھی آگہی نہ رہے

مری طلب ہے ترے لطف کا سبب ساقی
وہ جام مجھ کو نہ دے جس سے تشنگی نہ رہے

نقوشِ آرزو دھندلے ہیں اس سے بہتر ہے
کہ شمعِ زیست میں اتنی بھی روشنی نہ رہے

عجب نہیں وہ کریں ترکِ جور بھی تابشؔ
کہ عہدِ شوق و وفا استوار ہی نہ رہے

تابشؔ دہلوی

اپنی دُنیا آپ بنا لے!!
غم کی لے کو اور بڑھا لے

تیری صدا پر کان لگے ہیں
دور نہیں میں مجھ کو بُلا لے

عشق کا دل اب ٹوٹ رہا ہے
دیکھ منا لے اب بھی منا لے

کس کی رہی ہے کس کی رہیگی
پیتا جا او پینے والے

تو بھی اگر مدہوش ہو ساقی
گرتے ہوؤں کو کون سنبھالے

منزل میری آپہنچی وہ
پھوٹ گئے جب پاؤں کے چھالے

ایک ڈگر پر جینا کب تک؟
جی کو کوئی روگ لگا لے

اُس کے جلوے عام ہیں نادان
کیسی مسجد کیسے شوالے

سلیمان اریب

خانِ آرزو کا رسالہ سراج منیر

یہ رسالہ علامہ شہیر حضرت خانِ آرزو کی تصنیف ہے جس میں اُنھوں نے مولانا ابو البرکات منیر لاہوری کے اکثر اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مولانا نے عرفی شیرازی۔ طالب آملی۔ ظہوری ترشیزی اور زلالی خوانساری وغیرہ پر کئے تھے۔ منیر کے عنوانِ اعتراض میں تعصب و تحکم کا پہلو بہت نمایاں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دیرینہ کاوش کا انتقام لینا چاہتے ہیں اور قیاس بھی یہی کہتا ہے اس لئے کہ اکبر کے وقت سے ایرانی و ہندوستانی نزاع جڑ مضبوط کر چکی تھی اور شاہ جہاں کے زمانہ میں اس نے مستقلاً ادبی نوعیت اختیار کر لی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کی ادبی برتری اور متکبرانہ برتاؤ کے خلاف ہندی علماء نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنا تفوق جتانے کے لئے ایرانیوں کی جا و بیجا غلطیوں کو واضح کرنا شروع کیا۔ اُن پر تنقیدیں کیں اور یہ ثابت کیا کہ ہندی فضلا بھی اُن سے کسی حیثیت سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ملا شیدا کا قدسی پر اعتراضات کرنا اور منیر کا کارنامہ تصنیف کرنا اس دعوے کے بین ثبوت ہیں۔ ظاہر ہے کہ جذباتی تصنیفیں کما حقہٗ حقیقت پر مبنی نہیں ہو سکتیں اسی وجہ سے منیر کے اکثر اعتراضات غلط اور طعن آمیز ہیں۔ خانِ آرزو نے ان اعتراضات کی نہایت دیانت داری سے تردید کی ہے۔ البتہ جو اعتراضات صحیح ہیں ان کی داد بھی دی ہے اور یہی اُن کا سب سے بڑا کمال ہے۔ خانِ آرزو خود سراج منیر کی تالیف کا سبب یوں بیان کرتے ہیں :-

"اما بعد میگوید خوشہ چین خرمن سخن و دریوزہ گر این فن سراج الدین علی آرزو تخلص کہ ایں رسالہ ایست مسمیٰ بہ سراج منیر مشتمل براکثر اجوبۂ اعتراضات مولانا ابو البرکات منیر لاہوری کہ بر بعضے از اشعار چہار کس از شعرائے متاخر نمودہ و حل معنی ابیاتے کہ آں را بے معنی تصور فرمودہ۔ چوں راقم دریں باب خالی از تعصب و اعتساف است از حق شناساں متوقع انصاف است۔ و یکے از آں چہار سیدی محمد عرفی شیرازی است"

اس رسالہ پر تنقیدی نظر ڈالنے سے قبل اگر مولانا منیر اور علامہ خانِ آرزو کا کچھ تعارف کرا دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

منیر دورِ شاہ جہانی کے اُن ممتاز فضلا میں سے ہیں جن کا نام ہندوستان میں فن تنقید نگاری کے مخترعین کی صف اول میں دکھائی دیتا ہے۔ شعریت و ادبیت میں وہ نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ تذکروں نے ان کے متعلق عام طور پر بہت کم لکھا ہے۔ اس ضمن میں خود مولانا کے رقعات اور بہار سخن مصنفۂ محمد صالح کمبوہ لاہوری نہایت اہم ہیں۔ محمد صالح شاہ جہانی دور کا مورخ اور منیر کا قریبی رشتہ دار ہے اور اس سبب سے اس کا بیان بہت مستند ہے۔ بہت عرصہ ہوا پروفیسر محمود شیرانی نے ایک مضمون مولانا منیر پر لکھا تھا اور اس میں اُنھوں نے بھی انہی دو تصنیفوں ۔ انشائے منیر اور بہار سخن ہی سے مواد اخذ کیا تھا۔

منیر بروز چہارشنبہ ۱۹ شوال ۱۰۱۹ھ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام بقول آزاد بلگرامی اور شیر خاں لودی عبد المجید ملتانی تھا لیکن محمد صالح ان کا نام عبد الجلیل ابن حافظ ابو اسحاق لاہوری بتاتا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ جیسا بیان ہو چکا ہے محمد صالح منیر کا قریبی رشتہ دار اور ہمعصر ہے۔ عبد الجلیل فن خوشنویسی میں سارے ہندوستان میں مشہور تھے اور اکبر کے یہاں خوشنویسوں کے زمرہ میں

ملازم بھی تھے۔ وہ نہایت اچھی استعداد کے انسان تھے اور اساتذہ کے مشکل سے مشکل شعر حل کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ نیر کے علاوہ ان کے دو اور بیٹے تھے ایک ابوالفیض متخلص بہ فیض اور دوسرے ابوالفتح متخلص بہ ضمیر۔ اس طرح نیر کا پورا خاندان علمی و ادبی فضا میں سانس لے رہا تھا اور اسی ماحول کا نتیجہ ہے کہ خود نیر بھی اپنے زمانہ کے علماء میں سے ایک مانے جاتے ہیں۔

بہرحال نیر کا لاہوری ہونا مسلم ہے۔ ابھی پانچ ہی برس کے تھے کہ مکتب میں بیٹھے۔ شعر و شاعری کی طرف فطری میلان تھا چنانچہ ابتدا ہی سے اساتذہ کے شعر حفظ کرلیا کرتے تھے جو بعد میں ان کی شاعری کا سرمایہ بن گیا۔ چودہ [۱۴] برس کے سن میں نیر نے شعر کہنا شروع کیا اور فلکی، سنائی اور انوری کی تقلید کرنے لگے۔ ۱۰۴۵ھ میں مولانا نیر اکبر آباد گئے اور مرزا صفی مخاطب بہ سیف خاں کے یہاں دو سو بائیس [۲۲۲] روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ سیف خاں کے یہاں مولانا نسیمی۔ مولانا جلالی۔ مولانا کلامی اور مولانا یدیہی وغیرہ اہل کمال کا جلسہ رہا کرتا تھا۔ ان لوگوں نے نیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ سیف خاں کے یہاں فارغ البالی سے بسر کرنے لگے۔ نیر ایک دفعہ خان موصوف کے ساتھ بنگالہ بھی گئے اور یہیں اپنی مثنوی مظہر گل بنگالہ کے میووں کی تعریف میں اور کارستان سلاطین مشرق کے حالات میں تالیف کی۔ ۱۰۴۹ھ میں جب سیف خاں کا انتقال ہوا تو علماء کا شیرازہ منتشر ہوگیا مولانا نسیمی اور مولانا جلالی بہار کی طرف چلے گئے۔ مولانا نیر کچھ دنوں راج محل میں مقیم رہے اور پھر پٹنہ آئے۔ شائستہ خاں نے ان کی عزت و احترام کیا لیکن وہ وہاں نہ ٹھہرے اور اپنی خواہش اور اپنے دوست مولانا ابوالبقا کی وساطت سے جونپور میں اعتقاد خاں کے یہاں آئے اور ایک سو بیس [۱۲۰] روپے ماہوار پر ملازم ہوئے کچھ زمانہ تک جونپور میں رہنے کے بعد اعتقاد خاں کی سرد مہری سے عاجز آکر مولانا آگرہ چلے گئے اور شاہجہانی شعرا کے زمرہ میں شامل ہوئے۔ مولانا نیر نے ۱۰۵۵ھ میں چھتیس [۳۶] برس کی عمر میں انتقال کیا۔

باوجودیکہ مولانا نیر کو دنیا میں رہنے کا بہت کم موقعہ ملا تاہم انہوں نے متعدد تصنیفیں اور تقریباً ایک لاکھ شعر یادگار چھوڑے۔ ان کی تصنیفوں میں رقعات (۱۰۵۰ھ)۔ شعرائے ہند کا ایک تذکرہ (۱۰۵۲ھ یا ۱۰۵۴ھ) قصاید عرفی کی ایک شرح اور کارنامہ نہایت اہم ہیں۔ بدقسمتی سے یہ سب بہت کم یاب ہیں اور تذکرہ تو مفقود ہی ہے۔ شاعری میں ایک کلیات چھوڑا جس میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی گئی ہے۔ مولانا آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ

"صاحب طبع نیر نظم و نثر دلپذیر است۔ در منشآت خود گوید من بے خانماں کہ در قلمرو سخن وطن گزیدہ ام صد ہزار بیت بلند بنیاد نہادہ ام"

مولانا نیر کی تصنیفیں اگر مل سکیں تو ان کی قابلیت اور مبلغ علم کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا۔ رقعات اور کارنامہ (جس میں انہوں نے عرفی طالب۔ ظہوری و زلالی وغیرہ پر اعتراضات کئے تھے) کے اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ نیر فن نقد و تبصرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نثر نگاری میں بے مثل و بے نظیر تھے اور اسی مرصع و مسجع طرز میں اعتراضات بھی کرتے تھے جن میں سے اکثر غلط ہیں لیکن جو صحیح ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نیر کا ذوق کسقدر سلیم تھا چنانچہ سراج منیر نے بھی بعض جگہ ان کے پاکیزہ مذاق کی داد دی ہے۔

نیر اور خان آرزو دونوں اپنے اپنے زمانہ کے علامہ رہے ہیں مگر ان دونوں میں تقریباً ایک صدی کا فرق رہا ہے اور اس فرق زمانہ نے خان آرزو کو اس فن میں کامل بنادیا جس کی داغ بیل نیر نے ڈالی تھی۔ نیر کے لہجہ میں وہ متانت نہیں تھی جو اساتذۂ ایران کے مرتبہ کے مطابق ہوتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تنقید تنقیص ہوکر رہ گئی۔ اس کے برعکس خان آرزو نے نہایت سنجیدگی و راست بازی کے ساتھ ہمیں سمجھایا کہ صحیح تنقید کی تشکیل کن کن عناصر سے ہوتی ہے' دیانت نقد کسے کہتے ہیں اور بے باکی تبصرہ کیا چیز ہے۔ وہ اس جذبۂ ایمانداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے

ہیں کہ نہ عرفی و ظہوری کو چھوڑتے ہیں اور نہ منیر کی جنبہ داری کرتے ہیں ہر ایک کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیتے ہیں ۔ چونکہ میں خان آرزو کی علمیت و تنقید نگاری کے متعلق متعدد جگہوں پر لکھ چکا ہوں اس لئے یہاں محض مجموعہ نغز پر اکتفا کی جاتی ہے ۔ دو ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں ۔

" وے از جادو طرازان سحر بیان داستان دان نکتہ دان خاک پاک ہندوستان، صاحب تصانیف بسیار، مالک اشعار بے شمار، واقف فروع و اصول، ماہر منقول و معقول، جمع کمالات، منبع حسنات، بحلیۂ علم و حلم آراستہ، بہ زیور دانش و بینش پیراستہ، بہ اوصاف حمیدہ موصوف بہ اخلاق پسندیدہ معروف، نکتہ سنج، شیریں زبان، ظریف الطبع، عذب البیان بود ۔ بر کتب متداولۂ علوم رسمیہ بدرجۂ عبور داشت کہ درس شرح (مطالع) و شرح حکمت العین، مانند اس کہ در آں وان مروج بودمی داد ۔ اما چوں طبع نقادش بیشتر میل شعر داشت شاعری نام بر آورد حق آنست کہ وجود ایں چنیں کس در خاک پاک ہندوستان حکم اکسیر اعظم دارد ۔ جوہر قابلیت و کتاب دانی وے از تصانیفش بر منصفان اہل شعور ظاہر است و ہویدا "

بقول قاسم تصنیفوں کی فہرست یہ ہے ۔ فہرست نامکمل ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں خان آرزو نے لکھی ہیں

(۱) دیوانے در جواب بابا فغانی (۲) دیوان دیگر در جواب کمال خجند بہ بحر خفی و دیوان ضمیمے مشتمل بر انواع سخن دارد ۔ تصانیف دیگرش (۳) سراج اللغتہ (۴) چراغ ہدایت (۵) تنبیہ الغافلین ۔ (۶) رسالۂ در علم بیان (۷) شرح بعضے کتب فارسی ہم از یادگار است ۔

خان آرزو فارسی کے استاد ہونے کے علاوہ زبان اردو پر بھی پورا عبور رکھتے ۔ ان کا کوئی اردو کا دیوان موجود نہیں ۔ لیکن وہ ریختہ گویوں کے ابو الآبا ضرور ہیں اور اردو زبان کے اساتذہ انہیں کے شاگرد ہیں ملاحظہ ہو :۔

" نسحہ پرواز (سخن پرواز) الہام گوئی میاں آبرو و سرآمد سخن سنجان خوش نوا میرزا سودا و مملکت سخن سازی را یکہ تاز مرد خواجہ میر درد و شاعرے بے نظیر محمد تقی میر منجملہ فیض اندوزان آں گیہان خدیو سخن پردازی اند ۔ بنا بر کہ علماء اہل حق را دامت برکاتہم عیال امام ہمام قبلہ انام ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ می گویند اگر شعرائے ہندی زبان را عیال خان آرزو گویند می سزد ـــــ "

یہاں تک مولانا منیر اور علامہ خان آرزو پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد آئیے اب رسالہ پر تحقیق کی نگاہ ڈالیں ۔ سراج منیر جیسا میں لکھ چکا ہوں منیر کے کارنامہ کا جواب ہے ۔ کارنامہ دستیاب نہ ہو سکا اس وجہ سے راقم یہ جاننے سے قاصر رہا کہ اس میں کتنے شعرا پر اعتراضات تھے، اشعار کی تعداد کیا تھی اور شعرا کس ترتیب سے رکھے گئے تھے تاہم اگر ہم سراج منیر سے قیاس کریں تو پتہ چلتا ہے کہ پہلا شاعر عرفی شیرازی ہے جس کے اٹھارہ شعروں پر منیر نے اعتراضات کئے تھے اور انہیں اٹھارہ شعروں کی تردید و تائید خان آرزو نے اس رسالہ میں کی ہے ۔ عرفی کے چند شعر، منیر کا اعتراض اور خان آرزو کا محاکمہ لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد بالترتیب اور دوسرے شعرا کا ذکر ہو گا ۔

(۱) عرفی ؎　چہرہ پرواز جہاں رخت کند چوں محمل　　شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

اعتراض منیر ۔ منیر اس شعر کو بے معنی کہتے ہیں اور ثبوت یہ دیتے ہیں کہ جوں ہی آفتاب برج حمل میں جاتا ہے اسی وقت رات اتنی نہیں گھٹ جاتی ہے کہ " نیم رخ " ہو جائے اور نہ دن اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اس پر " مستقبل " ہونے کا اطلاق ہونے لگے ۔

محاکمہ خان آرزو ۔ خان آرزو کہتے ہیں کہ انصاف پسندوں پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ عرفی کا مقصد یہاں نیم رخ کہنے سے یہ ہرگز نہیں ہے کہ رات آدھی رہ جاتی ہے بلکہ اس نے کنایہ کیا ہے مطلقاً شب کے کم ہو جانے سے ۔ عرفی نے " نیم رخ " اور " مستقبل "

من حیث الایہام استعمال کیا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جوں ہی آفتاب برج حمل میں داخل ہو دن کافی بڑھ جائے اور رات بہت کم ہو جائے۔ عرفی کے مفہوم کی توضیح یوں ہو سکتی ہے کہ مثلاً میں کسی سے کہوں کہ آج رات کو جو میرے یہاں آئے گا پیسہ پائے گا۔ اب ضروری نہیں ہے کہ جوں ہی وہ شخص میرے یہاں آئے میں پیسہ دے دوں اور اپنا وعدہ پورا کروں بلکہ رات بھر میں کسی وقت بھی اگر دے دوں تو میں اپنے وعدے میں سچا ہی رہونگا۔ بعینہ یہی مفہوم عرفی کا بھی ہے کہ جب تحویل آفتاب ہوتی ہے تو دن بتدریج بڑھنے لگتا ہے اور رات گھٹنی جاتی ہے اُس کے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ فوراً دن بہت بڑھ جاتا ہے یا رات بہت گھٹ جاتی ہے۔ انوری نے عرفی سے پہلے اس مضمون کو یوں نظم کیا تھا ؎ جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

یہاں ارجل کے معنی سپید گھوڑے کے ہیں اور کسی طرح یہ ممکن نہیں کہ تیر کے خیال کے مطابق یہ شعر بھی صحیح ہو۔ لیکن بہر حال یہ شعر بالکل درست ہے۔ اِن دونوں شعروں کے تقابل سے ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ عیب بین نگاہیں کہیں اسے سرقہ نہ کہہ دیں اور عرفی کو مورد الزام ثابت کریں۔ اِن کا جواب خانِ آرزو کے قول کے موافق یہ ہو سکتا ہے کہ عرفی نے سرقہ نہیں بلکہ اخذ کیا ہے۔ اخذ دو قسم کا ہوتا ہے ایک من حیث العجز والسرقہ جو مذموم ہے اور دوم من حیث الجواب والتتبع اور یہ مستحسن ہے۔ استادوں نے بھی اسے جائز رکھا ہے مثلاً شیدا کا یہ شعر ؎ چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

رودکی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎ عشق را من پیمبرم لیکن حسن را آفریدگار توئی

لیکن پھر بھی شیدا کا شعر سرقہ نہیں ہے بلکہ اُس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور علمائے معانی نے لکھا ہے اگر پہلے شعر سے دوسرا بلیغ ہو جائے تو درست ہے جیسا کہ تلخیص المفتاح کے خاتمہ میں بھی مذکور ہے۔

عرفی (۲) شاہد عصمت تلاشِ صحبتِ من کے کند خونِ حیض دخترِ رز جو شد از لبہائے من

تیر کے خیال میں یہ شعر اخلاق سے گرا ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "این بیت رنگین نکتہ الشعر حیض الرجال را آب دادہ بہ فتوائے انصاف زبانیکہ باین بیت آلودہ گردد برو ے واجب است کہ از عرقِ انفعال تا ابد غسل کند۔ پیداست کہ ازیں دست سخن ناپاکیزہ را رنگین نگاشتن خونِ انصاف ریختن است"

خانِ آرزو یہ جواب دیتے ہیں کہ خونِ حیض کہہ دینے سے شعر مخرب اخلاق نہیں ہو سکتا اس سے زیادہ سخت قسم کے الفاظ اساتذہ نے استعمال کئے ہیں اور جائز رکھا ہے۔ مثلاً "قلتبان" انوری کے یہاں آیا ہے ؎

خسروا بندہ را چو دہ سال ست کہ ہمیں آرزوئے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نہ شود از مقیمانِ آستاں باشد
تا چہ باشد کہ در ممالکِ شام شاعرِ خام قلتباں باشد

یا خاقانی ؎ از آں شد پردۂ چشم بخونِ بکر آلودہ کہ یاد لعبتاں در دیدہ حقنِ کرد پنہانی

عرفی (۳) ذات تو اعتدال سلیماں مزاج عدل عقل تو مغز و جوہر کل استخوانِ علم

تیر "استخوانِ علم" پر اعتراض کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "استخوانِ علم استعارہ ایست بے مغز"

خانِ آرزو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "استخوان علم" مطلقاً استعارہ نہیں بلکہ استعارہ بالکنایہ ہے۔ علم کو ایک آدمی قرار دیا ہے اور اس کے لئے استخوان ثابت کر دیا ایسی صورت میں "استعارہ مذکور را ہمچو گفتن از بیک مغزی است" ہاں عبارت "سلیمان مزاج عدل" نہایت نامناسب الفاظ رکھتی ہے اس لئے کہ سلیمان کا تعلق عدل سے نہیں ہے بلکہ دولت و نگیں سے ہے۔ عدل کا تعلق نوشیروان سے مناسبت رکھتا ہے۔

عرفی (۴) در دہن بخت عقل ناوک لا ریختن   در کمر ورس عشق دست نعم داشتن

تیرؔ "کمر درس عشق" پر اعتراض کرتے ہیں۔ خانِ آرزو کہتے ہیں کہ یہ بھی استعارہ بالکنایہ ہے اور صحیح ہے۔

عرفی (۵) مضجع و شمنت بشرہا وفات   صدر ایوان رنج مسکوں باد

مولانا تیرؔ اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے نہایت طعن کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "ایں بیت زندہ دلاں را خبرے از مرگ معنی میدہد۔ جائے آں دارد کہ بر لوح مزار او بنویسند"

خانِ آرزو تیرؔ کے اس بے جا اعتراض اور طعن کے سبب جامہ سے باہر ہو جاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "دل مردہ باشد کہ بلطف لفظ و معنی ایں بیت نہ رسد و دلِ مردہ تر آنکہ بے معنی داند۔ ہیچ واضح نہ شد کہ ایں نکتہ داں ایں ہمہ حرف گیری بے جا را کہ غازۂ ملامت ابدیست چرا برائے خود اختیار کردہ۔ روئے تعصب سیاہ۔"

عرفی (۶) اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را   ہمت نخورد نشتر آرے و نعم را

تیرؔ اس شعر کو بے معنی ٹھہراتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "واقعی ایں بیت دل آویز را بیت ابرو تواں خواند باینمعنی کہ معنی ندارد"

خانِ آرزو اس طنزیہ فقرہ کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگرچہ یہ شعر مہمل و بے معنی نہیں ہے لیکن شاعر کی بلند ہمتی کی شان سے پست ہے۔ اصل عبارت جواب کی یہ ہے "۔ ہیچ لطف شاعرانہ ندارد ...... بلکہ باوجود تصحیح معنی خالی از اشکالے نیست۔ چہ لفظ آرے و نعم یالا و نعم مستلزم سوال است و سوال ننگ ہمت است باآنکہ از مقام معلوم می شود کہ برائے خود اثبات ہمت می نماید"

دوسرا شاعر جس پر تیرؔ نے اعتراض کیا ہے طالب آملی ہے جسے بلبلِ آمل کہتے ہیں۔ خانِ آرزو نے اس کے کل پندرہ[۱۵] اشعار لئے ہیں اور اعتراضات کے بعد محاکمہ کیا ہے ملاحظہ ہو۔

طالب (۱) افسرد آتش دل و آب سرشک ماند   برکیوان دیدہ خضاب سرشک ماند

تیرؔ کہتے ہیں کہ "کیوان دیدہ" بالکل بے معنی ہے۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ چونکہ تیرؔ نے "کیوان دیدہ" کی اضافت کو اضافت مشبہ و مشبہ بہ سمجھا ہے اس لئے یہ غلطی کی ہے۔ یہ استعارہ بالکنایہ ہے اور شاعر کے مناسب مذاق ہے۔ اس سے مراد مژگاں ہے۔

طالب (۲) آنم کہ طغاں شاہ سر کبر نشر او ہست   تخمیر بروتم ہمہ از عنصر باد است

تیرؔ نے اس شعر میں حشو بتایا ہے اور "تخمیر بروت" کا مضحکہ اڑایا ہے۔

خانِ آرزو نے بعض مہمل اعتراضوں کے جواب میں وہی لہجہ اختیار کیا ہے جو خود معترض کا تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ بروت را مخمر و مرکب نداشتن در خندۂ عالمے بر روئے خود وا کردن است و مطلب از خمیر مایہ ریشخند کہ خود آوردہ کم نخواہد شد۔ صدق

من قال من ضحک ضحک۔

طالب (۳) رمزکہ میرزند ز مسامات غمزہ اش صدنیش چاشنی بدل انگبیں زند

منیر۔ میں "مسامات غمزہ" کو کیا کہوں اور "نیش چاشنی" کو کیا لکھوں۔ اگر اس سے زیادہ عیب جوئی کروں گا تو زنبورطبع گو مجھے نیش بغض وعناد سے ایذا پہونچائینگے۔

خان آرزو کہتے ہیں شعر نہ سمجھنا اور اعتراض کر دینا غلطی ہے۔ ع بارے چو عسل نمی دہی نیش مزن۔ "مسامات غمزہ" میں اضافت تشبیہی نہیں ہے۔ جس کو سمجھ کر منیر نے اعتراض کیا ہے بلکہ یہ استعارہ بالکنایہ ہے اور "نیش چاشنی" نہایت نازک تشبیہ ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کے غمزہ کے ہر بن مو سے جو رمز نکلتے ہیں وہ اس قدر شیریں ہوتے ہیں کہ محض ان کی چاشنی یعنی تھوڑی سی مٹھاس شہد جیسی شیریں شئے کے دل میں بھی سیکڑوں نشتر لگاتی ہے۔ ایسی صورت میں کمال مبالغہ مقصود ہے۔

طالب (۴) خون اثر کہ زینت منقار بلبل است از ناخن ترنم زاغم فشردہ اند

منیر۔ "اگر در ناخن ترنم بندکنم مشتے احمقان را ایں سخن ناخن بدل میزند۔ چوں ناخن کاوش می کنند و گفتار را یک سر ناخن نمی پذیرند"

خان آرزو۔ ناخن زن بیجا کہ روئے سخن را خراشد و زمین غزل را کاود چوں ناخن تراشیدہ درخاک بہتراست۔

ع
ہرکہ شود دراز چو ناخوں بریدنیست بر من زبان طعن و سخن چیں بطبع گنج

اتنا لکھنے کے بعد خان آرزو نے محاکمہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ناخن ترنم" استعارہ بالکنایہ ہے۔ ہاں نسبت "زاغم" میں اُن کو بھی تردد ہے اس لئے کہ اس میں اضافت تشبیہی ہو نہیں سکتی اور استعارہ بالکنایہ بہت دوراز کار ہوگا۔

تیسرا شاعر زلالی خوانساری ہے۔ اس کے کل سات شعر ہیں۔

زلالی (۱) قلم ازمن بغواصی درآمد سرزلفش برقاصی درآمد

منیر کو "رقاصی سرزلف" پر اعتراض ہے۔ اس لئے کہ اس کے کوئی معنی نہیں۔

خان آرزو کہتے ہیں کہ "سرزلف قلم" استعارہ بالکنایہ ہے اور ممکن ہے کہ "سرزلف" سے مراد خط ہو ایسی صورت میں نہایت نازک تشبیہ ہوگی۔ "رقاصی سرزلف" کنایہ ہے زلف کی کمال خوشی سے من حیث الاستعارہ۔ لیکن دونوں مصرعوں میں کچھ ربط نہیں اس لئے اگر اعتراض کیا گیا تو بے جا نہیں ہے۔

زلالی (۲) چنیں از درد بُرد آشنا رنگ کمان و ترکش چیں بر سر جنگ

منیر اس شعر کو بے معنی ٹھہراتے ہیں اور شاکی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

خان آرزو بھی منیر کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ انصاف آنست کہ جامۂ الفاظ بر قامت معنی بسیار کوتاہ است و بعد برآمدن حاصل ہیچ نیست و حق درینجا بطرف ابوالبرکات منیر است۔

زلالی (۳) زاندام ایازان شوخ خونریز مقشر میکند بادام انگیز

بقول منیر یہ شعر بے مغز ہے۔

خانِ آرزو کہتے ہیں کہ معشوق کے بدن کو بادام مقشر سے تشبیہ دینا نہایت عمدہ ہے۔ ہاتفی کہتا ہے ؎

پاکیزہ تنے چو نقرۂ خام نازک بدنے چو مغز بادام

زلالی (۴) ایاز کش بدیواں بنا گوش نوشتہ شاہ بیت غارت ہوش

نیر۔ میں متحیر ہوں کہ "دیوان بنا گوش" کی تعریف کروں یا "شاہ بیت غارت ہوش" کی
خانِ آرزو بھی نیر کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "بنا گوش" کو دیوان سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی بلکہ صفحہ یا ورق سے جائز ہو سکتی ہے لہٰذا نیر کا اعتراض صحیح ہے۔

چوتھا شاعر ظہوری ترشیزی جس کی تعریف میں خانِ آرزو نے بہت مبالغہ کیا ہے اور غزل میں تمام متاخرین سے بہتر و افضل قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سبب ہے کہ عرفی و نظیری کو تو اس قدر مقبولیت حاصل ہو اور ظہوری کو کوئی جانے تو ساقی نامہ و نثر کی وجہ سے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ظہوری کی طرز ادا اور جدت اسلوب میں وہ شگفتگی و سادگی نہیں جو عرفی و نظیری کا طرۂ امتیاز ہے۔
بہر حال خانِ آرزو نے اپنے خیال کا اظہار یوں کیا ہے:۔

"باعتقاد فقیر (آرزو) مثل وے از آدم الشعرا کہ رودکیست تا ایندم بہم نرسیدہ چہ در نظم و چہ در نثر طرز تازہ او ہنوز بکر است۔ اگرچہ بلبل آملی (طالب آملی) دریں گل زمین مرغولہ ریز ترانہ گردیدہ اما در واقع آہنگ او آب و رنگ دیگر داشتہ۔ ہر چند کسے را برابر میلے نداوہ اند مخصر مسلم الثبوت ایں سخنور بہر اکابر عصر و اساتذہ کہ بعد او آمدہ اند رسیدہ و گویا مصداق معنی ایں بیت اوست ؎

ہم چشمی ماکرا مجال است فہمیدن شعر ما کمال است

ظہوری کے کل پندرہ[۱۵] شعر دئے ہیں۔ ہر ایک پر محاکمہ کیا ہے اور تردید و تائید کے ساتھ تنقید کا حق ادا کیا ہے۔

ظہوری (۱) بود زیب ہند ایں حنا عجب کہ بر کف نہی رنگ روید ز لب

نیر:۔ یہ شعر یقیناً پان کی تعریف میں ہے لیکن اپنے معنی نہیں دیتا۔
خانِ آرزو کہتے ہیں کہ ظہوری نے از روئے مبالغہ یہ کہا اور کس قدر عمدہ کہا ہے "بگفتن عجب از عہدہ بر آمدہ"

ظہوری (۲) بدستم دہ آں رشک یاقوت را کہ ساز و علاج عقل فرتوت را

نیر کہتے ہیں کہ دوسرا مصرعہ مہمل ہے۔
خانِ آرزو کہتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں ناسخ کی غلطی ہے ظہوری کا مصرعہ تو یوں ہے۔ ع
کہ سازد جواں عقل فرتوت را

ظہوری (۳) فلک بہر تعمیہ دیر خراب گل شادمانی گرفتہ در آب

نیر کہتے ہیں کہ شادمانی کو گل سے کوئی نسبت نہیں۔
خانِ آرزو کہتے ہیں کہ "گل شادمانی" میں اضافت تشبیہی نہیں ہے جو غالباً نیر کا خیال ہو۔ بلکہ "گل چیزے در آب گرفتن" کنایہ ہے کسی کام کے شروع کرنے سے اور یہ اہل زبان کی اصطلاح ہے لہٰذا اصطلاحوں سے معترض کا عدم وقوف ظاہر ہے۔

ظہوری (۴) دہد ابر تا کشت غم را آب ز باراں رواں کرد سیل شراب

نیر کہتے ہیں کہ "باراں" کو سیل شراب کہنا غلطی ہے۔ اگر سیل شراب کے بجائے "عالم آب" ہوتا تو بہت اچھا تھا۔
خان آرزو اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ چونکہ معترض ظہوری کے طرز سخن سے بیگانہ ہے اس وجہ سے عالم آب کو اپنی دانست میں مناسب سمجھا۔ یہ نیر کے خیال کے مطابق درست ہوگا ظہوری کے خیال میں نامناسب ہی تھا۔

یہ رسالہ ایک خاتمہ کے ساتھ ختم ہوگیا ہے جس میں خود خان آرزو نے نیر کے اشعار و فقروں پر اعتراضات کئے ہیں جو غالباً منشاء پر حرف گیری کرنے کے جوش میں انہوں نے کیا ہو۔ دو چار اعتراضات ملاحظہ ہوں۔

نیر (۱) تعالی اللہ ازیں شہر چمن خیز کہ یاد اوست بر دلہا فرح بیز
اعتراض خان آرزو:- "رنگین خیالاں می فہمند کہ چمن خیز ترانہ زاغ ایں بوم است نہ گلبانگ بلبل آن چمن"

نیر (۲) زبانم را ز معنی آبرو دہ ز شعر تر لبم را شست و شو دہ

خان آرزو:- دوسرے مصرعہ کے دو معنی ہو جاتے ہیں اگر بجائے حرف (ز ا) بار موحدہ استعمال ہوتا تو شعر زیادہ صاف ہو جاتا۔
خان آرزو نے نیر کے جن فقروں پر اعتراض کیا ہے اس میں سے دو ملاحظہ ہوں ایک جگہ نیر نے لکھا تھا:-
نیر (۱) "انگیز لب ما چہ توانم گفت کہ سخن از شرم لب می گزد"
خان آرزو نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "لب گزیدن" غصہ کی حالت میں مستعمل ہے نہ کہ شرم میں
نیر (۲) "لبعضے از کج طبعاں بایں بیت کہ از نزاکت ابرو نازک کردہ بکردار ابروئے خوباں ناز میکند"
خان آرزو کہتے ہیں کہ "ابرو نازک کردن" بہت کم استعمال ہوا ہے جو اصطلاح اہل زبان ہے وہ "پشت چشم نازک کردن" ہے۔

اقبال انصاری

محسوسات ماہر

جب موت زندگی سے ہم آغوش ہوگئی ہر بات ایک خواب فراموش ہوگئی
فصل بہار، میکدہ بردوش ہوگئی شبنم کی بوند بادۂ سرجوش ہوگئی
اللہ رے! تصور رنگیں کا اہتمام موج خیال، یار کا آغوش ہوگئی
پروانے اپنی دُھن میں تصدق ہوا کئے اور شمع اس ہجوم میں خاموش ہوگئی
نظارۂ نگاہ کا منظر بدل گیا آتے ہی اُن کے بزم ہی بے ہوش ہوگئی

اُس یاد پر ہے آج بھی ماہر مدار زیست
جو یاد اُن کے دل سے فراموش ہوگئی

ماہر القادری

محتسب اور میں

بدل کے بھیس خداوندگا زمانے میں — یہ کون کرتا ہے دیر و حرم میں شدادی!
یہ کس کے خوف سے پانی ہے مفلسوں کا لہو — یہ کس کے پاؤں پہ دم توڑتے ہیں فریادی!
جہاں میں کس کی سفیہانہ حرکتوں کے طفیل — بدل رہی ہے غلامی کا بھیس آزادی
یہ کس کے مکر سے ہے تنگ کارگاہِ حیات — رہا ہے کس کے ارادوں کا سنگِ بنیادی
یہ کس کے دم سے بھڑک اٹھے ہیں چار سو شعلے — یہ کس کی روح کا مقصد ہے فتنہ ایجادی
چبا رہا ہے کلیجے یتیم بچوں کے — مچا رہا ہے ہر اک بحر و بر میں بربادی

یہ کس نے عام کئے ولولے گناہوں کے
سبق پڑھائے کمینوں کو کج کلاہوں کے

مری رگوں میں ہے ایمان کی درخشانی — مرے وجود میں جلتی ہے شمعِ عرفانی
مرے کلام کے ہر حرف میں ہیں پوشیدہ — وہ راز جن سے ہوا ہے عروجِ انسانی
مجھے تو پاس ہے اُس "حادثے" کا اے ظالم — جھکے تھے میرے لئے جب فلک یہ نورانی
کسی غریب کا حق چھین کر مجھے نہ دکھا — کہ یہ ہے میرے لئے موجبِ پریشانی
میں تنگدست ہوں لیکن ہوس پرست نہیں — کہ روند روند دیا میں نے تختِ خاقانی!
مجھے خدا کی قسم ہے، کہ اِک خدا کے بغیر — جھکی نہ غیر کے قدموں پہ میری پیشانی!

مجھے "شراب نگاری" کا تو نہ دے الزام
چھلک رہا ہے مقدس لہو سے تیرا جام

یہ مانتا ہوں کہ وارفتۂ خیال ہوں میں — بجا ہے، میں ہوں کسی کی نظر کا دیوانہ
یہ سچ ہے میں نے صبوحی کے ساتھ راتوں کو — ہزار بار کیا ہے طوافِ مے خانہ
یہ سب درست، تراشے ہیں وہ صنم میں نے — نثار جن پہ ہو یونانیوں کا بُت خانہ
مگر نگاہ میں ہیں وہ حسین راہیں بھی — ہے جن کے ذروں میں روحانیت کا افسانہ
کبھی حسینؓ کی بے چارگی پہ رو دیا ہوں — دکھا گیا ہوں کبھی جرأتِ خلیلانہ
گناہ گار ہوں، حق سے مجھے گریز نہیں — ترے لبوں پہ ہے رقصاں ریا کا افسانہ

تو اپنے سبحہ و زنار کی حفاظت کر
ندیم کو نہ کبھی چھیڑنے کی جرأت کر

احمد ندیم قاسمی

پیمانِ وفا

"تم دنیا کی جھاڑ دو ہو" میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں جام شراب تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا آپ نے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جام نے آپ کو اتنا بے خبر کر دیا ہے۔ جو آپ مہملات بک رہے ہیں" امراؤ جان نے مجھ سے کہا۔

آہ! اس ایک جملے میں کائنات کے راز پنہاں ہیں۔ تم کہتی ہو یہ مہمل بات ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

آپ کی بکواس میری سمجھ میں نہ آسکی۔

کہہ تو دیا کہ اس میں دنیا کے راز مضمر ہیں۔

دنیا! دنیا کے راز مضمر ہیں۔ اس لغو جملے میں!

ہاں! ہاں! گناہوں کی راتیں، پاپ کے دن انسانوں کے بھید، دنیا کی دل چسپیاں معصوم انسانوں کی لغزشیں، غرض کہ اس مختصر جملے میں جسے تم لغو کہہ رہی ہو دنیا کی سیاہ کاریاں سما گئی ہیں۔

امراؤ نے ساغر تھاما اور میرے لبوں سے لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ حمید پیارے حمید جلد اس جام کو خالی کر دو تمھاری تمام تکالیف خود بخود دور ہو جائیں گی۔

نہیں۔ یہ لیجاؤ پھینک دو میں کبھی نہیں پیوں گا۔ میں نے پیالے کو دور ہٹاتے ہوئے کہا۔

حمید تمھیں کیا ہو گیا اپنی مسرت خیز گھڑیوں کو کیوں وسواس میں برباد کر کے رنجیدہ ہو رہے ہو۔

وسواس نہیں۔ الہام کہو الہام۔

ہائے کمبخت دیوانہ ہو گیا ہے۔ کیسی لٹکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اور کہتا ہے الہام۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حمید تم نہیں سمجھتے مسرت کی گھڑیاں خوشی کے دن، جوانی کی راتیں واپس نہیں آسکتیں۔ اس جنون سے بھاگو اپنے وسواس کو خیرباد کہو اور اپنی زندگی کو مسرت سے لبریز کر لو۔

بے شک یہ سب چیزیں واپس نہیں آسکتیں۔ میں جنون اور خبط میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ زندگی کی منزل بربادی کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کشتیٔ حیات خرافات کے بحر ذخار اور سیاہ کاری کے طوفان میں ہچکولے کھاتے ہوئے اس طرح خطرہ میں تھی کہ کوئی دم میں رسوائی کا ایک جھونکا ٹکرا کر فنا کر دیتا۔ لیکن خدا نے اپنی رحمت سے بچا لیا۔

اچھا سب کچھ دیکھا جائے گا یہ تو کہو تم نے میرے لئے جڑاوی ہار لانے کا وعدہ کیا تھا۔ لے آئے یا نہیں۔ اگر لاتے تو مسرت و شادمانی سے مجھ کو پہنا کر خراج محبت حاصل کرتے شاید اسی خفت کے مٹانے کے لئے تم نے یہ سوانگ بھرا ہے۔

(بات کاٹ کر اٹھتے ہوئے) ہاں ہاں۔ ہی سمجھ لو اب ہار لے کر ہی آؤں گا۔ یہ کہہ کر میں جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا اس ناگن کی حد سے باہر نکلنے لگا۔ میرا جسم لرز رہا تھا۔ اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لیکن میں اپنے کو سنبھالتا ہوا جلد جلد قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری اس حرکت کو وہ دیوانگی پر محمول کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو پکار کر کہنے لگی "اس کو باہر نکال دو" یہ الفاظ سن کر مجھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ لیکن میں صبر و تحمل سے کام لے کر بغیر کچھ کہے چلتا رہا۔ اس وقت میرے دل کی حرکت اس قدر تیز تھی کہ مجھ کو گمان ہو رہا تھا کہ شاید ان رسوائیوں اور

ذلتوں کا اثر ہے اور اب وہ بھی تنگ آکر ہڑتال کرنے کو ہے۔ جس کی وجہ سے مجھ کو راستہ ہی پر اپنی زندگی کو موت میں تبدیل کرنا ہوگا جب صبح ہوگی لوگ واقف ہوں گے ہسپتال لیجائیں گے۔ ڈاکٹر اپنا جراحی عمل کرنے کے بعد کہہ دیگا کہ موت قلب کی حرکت بند ہوجانے سے واقع ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ میری بیوی اس نیک ہستی پر اس سانحۂ جانکاہ کا کیا اثر ہوگا۔ میرے معصوم پیارے بچے کیسے بلک بلک کر روئیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی دل کی حالت اور خراب ہو رہی تھی۔ میرے تمام گناہ اور آلودگیوں نے گویا میرے جسم کو اس طرح مفلوج کر دیا تھا کہ قدم مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

اس پریشانی میں میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کوئی ٹانگا موٹر بنڈی جو کچھ بھی مل جائے اس میں بیٹھ کر گھر پہنچ جاؤں۔ لیکن میدان صاف تھا۔ نظر جس طرف اٹھتی مایوس ہی واپس آتی مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہی گناہوں کی سیاہی تمام کائنات پر چھاگئی ہے۔ ہاں! کہیں کہیں الّو بول رہے تھے۔ جن کی منحوس آواز سن کر یہ گمان ہوتا تھا کہ میری ہی سیاہ کاریوں کا ماتم کر رہے ہیں۔ اور غافل پڑی ہوئی کائنات کو جگاکر میرا حال سنانا چاہتے ہیں۔

میں اسی طرح راستہ طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ ڈگمگاتے قدموں پر دروازہ کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنڈی کھٹکھٹانے لگا۔ تمام لوگ غافل سو رہے تھے۔ دوسری آواز پر دربان نے للکار کر کہا کون ہے۔ اتنی رات گئے کیا کام ہے۔ میں آہستگی سے آواز صاف کرتے ہوئے پکارا۔

"جمشید خاں دروازہ کھول دو" جمشید دوڑتا ہوا آیا۔ دروازہ کھول کر کہنے لگا کون؟ سرکار ہیں۔

میں۔ ہاں! جمشید میں ہوں۔" یہ کہہ کر میں سیدھا زنانے میں چلا گیا۔ نوکر بچے سب سو رہے تھے۔ لیکن بازو کے کمرے سے آہستہ آہستہ باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں جوتا اتار کر آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی آڑ میں کھڑا آواز سننے لگا۔

میری بیوی کہہ رہی تھیں "اے کائنات کے مالک تیرے ہی قبضے میں سب کچھ ہے۔ تیرے ہی لئے دونوں جہاں کی بادشاہی سزاوار ہے۔ اے رحیم تو دلوں کے حالات سے آگاہ ہے۔ میری مصیبت سے بخوبی واقف ہے۔ تجھ سے اپنا دکھڑا کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔ مجھ کو صرف تیری مدد کی ضرورت ہے۔ رحم کر میرے حال پر اور میری بگڑی ہوئی زندگی کو سنوار دے۔ میرے مالک مجازی کو گناہوں کی تاریکی سے نکال کر نیکی کی راہ پر ڈالدے۔ اس کے دل کو نیکیوں سے منور کر دے۔" میں سنتا جا رہا تھا اور ندامت و انفعال سے پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کی الحاح وزاری نے میرے دل میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ میری آنکھیں اشک ندامت بہانے کے لئے بے چین تھیں۔ لیکن میں اس کی حضورِ قلبی میں اپنی مداخلتِ بیجا کو مناسب نہ سمجھتا تھا۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوئیں اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ فارغ ہوچکیں تو آنسو صاف کرتے ہوئے گہری سانس لیکر بچے کے قریب بیٹھیں۔ میں ڈرتا اور جھجکتا ہوا ان کے قریب آیا۔ اور ان کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ بیگم نے نگاہ اٹھائی، دیکھ کر چونک پڑیں۔ اور غور سے دیکھ کر کہنے لگیں "کون آپ ہیں" میں خلاف توقع اتنی رات گئے اچانک ان کے سامنے بحالتِ زار کھڑا تھا۔ یعنی مجسم گناہ مجسم نیکی کے حضور، سیاہ کاری پارسائی کے پاس، ظلمت نور کے سامنے میری قوت گویائی سلب ہوچکی تھی۔ لیکن میں نے اعترافِ گناہ کے طور پر معافی کی مجسم درخواست بنے ہوئے بیگم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بیگم نے کہا "میرے سرتاج کہئے کونسی مصیبت یا پریشانی نے آپ کو اس طرح مجھ گناہگار ذلیل ہستی کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ خدا کے لئے جلد اپنی تکلیف بیان کرکے میری پریشانی دور کیجئے۔ آپ فکر نہ کیجئے اگر آپ کی مصیبت دور کرنے میں میری جان بھی کام آئے تو میں ہرگز دریغ نہ کروں گی۔"

"بیگم خدا کے لئے اس پر رحم کرو جو اپنے اس ناروا سلوک اور ناجائز افعال سے منفعل تمھارے قدموں میں پڑا ہے۔ میں نے تمھیں بہت ستایا۔ تمھارے جائز حقوق کو تلف کرکے تمھاری امانت میں خیانت کی"

بیگم نے کہا "میرے سرتاج میں تمھاری گزشتہ باتوں کو فراموش کرتے ہوئے تم سے اس امر کی التجا کرتی ہوں کہ آئندہ...... "

میں نے (بات کاٹ کر) کہا "ہاں! ہاں!! آئندہ کے لئے میں وعدہ بلکہ حلفی وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے کو نیک اور باوفا شوہر ثابت کروں گا۔ انشاء اللہ تم مجھ کو اپنے وعدے پر ہمیشہ پابند پاؤ گی"

"میں نے تمھیں معاف کردیا۔ خدا سے اپنی آمرزش کی دعا کرو" بیگم نے کہا۔

"بے شک میں خدا سے اپنے قصوروں کا اعتراف کرکے توبہ کروں گا۔ جب یقین ہوجائے کہ تم نے معاف کردیا کیونکہ خدا اپنے گناہ تو معاف کرتا ہے، لیکن حقوق العباد معاف نہیں کرتا۔ جب تک کہ بندہ جس کا قصوروار ہے اس سے اپنے گناہ نہ بخشوا لے" میں نے بیگم سے کہا۔ "میں نے معاف کردیا۔ خدا بھی تمھیں معاف کردے" بیگم نے جواب دیا۔

میں بیگم کی اس فراخ دلی سے خوش ہو کر اس کا پرستار بن گیا۔ میری نظروں میں وہ آسمانی حوروں سے زیادہ پاک اور خوبصورت نظر آنے لگی۔ میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس میں مسرت کے آنسو چھلک آئے۔ دل سے ایک گہرا بوجھ اتر جانے کے بعد ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آنے لگی۔

اب میں خیالات کی دنیا میں گم ہوگیا اور اپنی بے راہ روی کے اسباب پر غور کرنے لگا۔ ہماری معاشرت میں جو خرابیاں ہیں ان میں شادی کی رسم سب سے زیادہ اہم ہے۔

ہمارے پاس شادی کو ایک معمولی بات سمجھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس سے بڑھ کر انسان کی زندگی میں کسی معاملہ کو اہمیت نہیں۔ انسان کی زندگی کا دارومدار اس کی خوشی اور اس کا اطمینان سب کچھ اسی پر منحصر ہے انسان جس کام کی ابتدا کرتا ہے اگر اس سے پہلے اس کے انجام سے واقف نہ ہو تو یقینی وہ کام بگڑ جائے گا۔ اسی طرح جب ہماری شادی ہوتی ہے تو ہم اس کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شادیاں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کو شادی کے سے پہلے اس کی اہمیت سے خاطر خواہ واقف کرائیں تو میرا خیال ہے کہ جس طرح دوسری قسم کی تعلیم دی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی کافی توجہ دلائی جائے۔ فریقین کو ان کے فرائض ذہن نشین کرائے جائیں تو خرابیوں کا انسداد ہوسکتا ہے۔ شادی کے بعد انسان بہت بڑی ذمہ داریوں کا حامل ہوتا ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوجائے تو بہت بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بیوی جو بڑی بڑی آرزوؤں کا ہجوم لئے ہوئے شوہر کے گھر آتی ہے، اگر اس کے خلافِ توقع واقعات پیش آئیں تو اس کے ارمانوں کی کھیتی سرسبز ہونے سے پہلے مرجھا جاتی ہے۔

اطمینان و مسرت انسان کیلئے ضروری ہیں۔ اس کے بغیر کوئی انسان ترقی نہیں کرسکتا۔ عورت مرد کی نصف سے زیادہ زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے ذمہ انسانوں کی زندگیوں کو بنانا اور بگاڑنا ہوتا ہے۔ وہ عمر کے ہر حصہ میں حکومت کرتی ہے: بچپن میں ماں باپ پر جوانی اور بڑھاپے میں شوہر اور بچوں پر۔ اگر ہم اس کو غلامی کی زندگی کی زنجیروں میں جکڑ کر قید کردیں گے، اس کے اعضاء اور دماغ کو مضمحل کردیں گے جو اپنی ملکیت پر غیر کا قبضہ پسند نہیں کرتی تو ہم اسکے اختیار کو چھین کر

دوسرے کے قبضہ میں دیدیں گے اور اس کے بعد اس سے اس کے فرائض کی کوتاہی پر باز پرس کریں گے تو کیا ہم راستی پر ہیں ؟

ایسی صورت میں جو کچھ غلطی اس سے سرزد ہو اس کے لئے مرد ہی موردِ الزام ہوگا۔ میری شادی کا بھی یہی حشر ہوا۔ شادی کے بعد کچھ دن تو یوں ہی گذر گئے جس میں کوئی بات قابلِ ذکر نہ تھی۔ لیکن چند سال سے میری طبیعت میں تغیر رونما ہوا اپنی بیوی سے میری دلچسپی کم ہوتی گئی۔ سونے کو ٹھکرا کر ملمع پر ہیرے کو چھوڑ کر شیشے کے ٹکڑوں پر مائل ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی بیوی بچوں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس ذلیل فرقہ نے مجھے تباہ کر ڈالا۔ میری دولت عقل شرافت عزت سب ذلت و رسوائی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ان بری صحبتوں سے شراب جیسی موذی چیز بھی میرے گلے پڑ گئی۔ حالانکہ میں اس سے انتہائی نفرت کرتا تھا لیکن جب انسان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ تو ضمیر پر بھی تاریکی چھا جاتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ جب ضمیر ہی ظلمت میں گم ہو تو روکے کون ؟

جب انسان کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کو اپنے کردار پر ندامت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ عادی مجرم بن جاتا ہے تو اس کے دل میں کسی قسم کا خوف باقی ہی نہیں رہتا۔ یہی حال میرا تھا۔ میں چھپ چھپا کر گناہ کرنے سے بھی جھجکتا تھا۔ مگر اب کھلم کھلا کرنے لگا۔ بیوی بچوں پر سختی اور ظلم کرتا ان کی دل آزاری کر کے مسرور ہوتا۔ شراب جیسی گندہ چیز کو پی کر مسرت کے گیت گاتا۔ گھر پھونک کر تماشا دیکھتا غرض سیاہ کاریوں نے میرے دل کو سیاہ کر دیا تھا۔ اب مجھ میں نیک و بد میں امتیاز کرنے کا شعور ہی باقی نہ تھا۔ مہینوں بیوی بچوں کو صورت تک نہ دکھلاتا۔ وہ میری صورت کیلئے ترستے اور میں اپنی سیاہ کاریوں میں مست تھا۔ امراؤ جان طوائف جس کے دام میں پھنس کر میں نے اپنی ہستی کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ میری ہر طرح نگران رہتی سوائے ان وقتوں کے جب اس کی فرمائشات کیلئے روپیوں کی ضرورت پڑتی، میرے اپنے گھر میں جانے کی روادار نہ ہوتی۔ بچہ بیمار تھا۔ میری یاد سے بے چین جس وقت میں ایسی ہی ضرورت سے گھر میں گیا تو وہ اس کمزور حالت میں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا لیکن مجھ پر تو اس وقت گویا بھوت سوار تھا بچے کو ہٹا دیا۔ بیگم کی آنکھیں اس کو برداشت نہ کر سکیں وہ کہنے لگیں۔ "ہائے کیا تم دنیا کی جھاڑو ہو، تمھیں اپنے گھر سے تعلق نہیں۔ بیوی بچوں سے محبت نہیں۔ ہمیں ذلیل کرتے ہو اور ذلیلوں کی منتیں کرتے پھرتے ہو۔ بیمار لڑکا جو تمھارے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس کو تم نے اس طرح ڈھکیل کر ہمارے جذبات کو ٹھیس لگائی ہمارے دلوں کو دکھایا۔ ایک روز تمھیں بھی خدا کو جواب دینا ہے۔" یہ سن کر میں شیر کی طرح گرجتا ہوا چلا گیا۔ شاید اس تیز روشنی کی کرن تاریکی کو چیرتی ہوئی میرے ضمیر تک پہنچ گئی جس طرح بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جانے سے پھر روشن ہو جاتا ہے اسی طرح میری زندگی نے پلٹا کھایا۔ یہ محسوس کر کے کہ ہائے میں دنیا کی جھاڑو ہوں" میرا دل شرم سے تڑپ گیا۔ بے شک برے انسان کے لئے جھاڑو کی مثال کتنی صحیح ہے جس طرح جھاڑو ہر برے بھلے ادنیٰ اعلیٰ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ جتنے غلیظ کام اس سے لئے جائیں گے وہ ویسی ہی نجس و ناپاک ہوتی جائے گی۔ یہی حال انسان کا ہے جیسے برے کام کرتا جائے گا اتنا ہی ذلیل اور رسوا ہوتا جائے گا۔ جسطرح جھاڑو ہمیشہ سے ہی نجس نہیں ہوتی نجاست لگ جانے پر ہی غلیظ ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی انسان بھی ہمیشہ سے برا نہیں ہوتا بری صحبت اور برے افعال ہی اس کو برا بنا دیتے ہیں۔ بس ان ہی خیالات نے میرے سیاہ کار دل کو منور کر دیا۔

اب جو کبھی میں سوچتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ شریف بیوی سے زیادہ انسان کا مونس و رفیق کوئی نہیں ہو سکتا۔ بیوی ہی بیوی ہو سکتی ہے رنج خوشی راحت مصیبت بیماری و صحت ہر حال کی شریک ہر مصیبت میں ساتھ دینے والی۔ یہ سب اس کے بہترین اوصاف ہوتے ہیں۔ اپنی ہستی کو مٹا دے گی لیکن ان میں سے کسی بات پر اس کے قدموں کو لغزش نہ ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ عورت اپنے شوہر اور اولاد پر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے ممکن ہے دوسروں کے لئے کار آمد ہو سکے۔

مسز سید حسین زیدی

تنقید و تبصرہ

شمع مصنفہ اے آر. خاتون دہلوی. ۲۸۴ صفحے قیمت عاں. پتہ ہلال منزل کوچہ پنڈت دہلی. "شمع" پر تو حقیقت میں پروانہ بن کر ہی تنقید لکھنی ہوگی. اس ناول کی خصوصیت ہے کہ یہ اسم بامسمیٰ ہے. نام، انسانی زندگی میں ایک خاص اثر رکھتا ہے. شمع کا کام جلنا ہے اور اپنی جلن سے اپنے ماحول کو روشن و منور کرنا. پس. اس ناول میں بھی اس کی ہیروین "شمع" اسی طرح جلتی سلگتی رہتی ہے. جس چیز نے اس کی زندگی کا خاتمہ بخیر کیا ہے وہ اس کی تعلیم ہے جو خودداری، بے نیازی حلم و بردباری سکھاتی ہے." شمع" ان خصوصیات کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے. حلیمہ بیگم کی جیسی خبیث کیرکٹر کی عورتوں سے خدا بچائے. واقعی اس طرز و طریقہ کی عورتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں. ع جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے. حالانکہ اپنی اس فطری کمزوری و پست فطرتی کا وقتاً فوقتاً وہ خوب نتیجہ بھگتتی ہیں. لیکن جب تک انھیں ایک زبردست ٹھوکر نہیں لگ جاتی جس سے وہ کم از کم منہ کے بل نہ گر جائیں، انھیں عقل نہیں آتی. کینہ پروری، لالچ اور انتہائی درجہ کا سفلہ پن ان کا نمایاں عیب ہے. سوسائٹی میں یہ مقبول نہیں ہوسکتیں. خاندان کے لوگ ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں. گر جہاں گل ہیں وہاں خار بھی ہیں. اگر یہ کانٹے نہ ہوں تو پھر پھولوں کی قدر کون کرے گا. گر خوبی یہ ہے ؎ پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو ؛ کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے.

طاہر، کا مکالمہ اور اس کی پر مذاق دلچسپ بات چیت ہر کس و ناکس کا دل موہ لیتی ہے اور درحقیقت یہی ایک کردار ایسا ہے جس سے اس ناول کی سوگواری نیز اس کے حزنیہ قسم کے پلاٹ میں ایک رونق اور چہل پہل سی آگئی ہے. مذاق ایسا شستہ جس سے کسی کی دل آزاری دل شکنی نہیں ہوتی. منصور کی حیا پروری، وفاداری اور نیک دلی نے اس کو انسان سے دیوتا بنا دیا ہے. جواہر مزی کی جیسی نمک حلال خادمائیں قسمت سے مل جاتی ہیں. شمع جو روح رواں ہے اس ناول کی، اس کی زندگی کے نشیب و فراز یہ ثابت کرتے ہیں کہ ع زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا. مصائب میں اس کی ثابت قدمی، اس کا استقلال و حلم، غرض وہ ہر لحاظ سے نہ صرف شمع، بلکہ ایک " شمع ہدایت " ہے.

بہ لحاظ زبان و انداز بیان شمع ایک محویت انگیز ناول ہے. قصہ مختصر ہم لائق مصنفہ کو ان کی اس کامیاب ادبی تصنیف پر دلی مبارکباد دیتے ہیں. خدا کرے ان کی شمع ہر دل عزیز بن جائے تاکہ بہت سی زندگیاں سنور جائیں. اور وہ لوگ جو تعلیم نسواں کے زبردست مخالف ہیں وہ سرسوتی دیوی کا کلمہ پڑھنے لگیں. "ج"

ہندستانی ادب ایڈیٹر غلام محمد خاں ایم اے عثمانیہ حیدر آباد سے ایک نیا ماہ نامہ ہندستانی ادب کے نام سے شایع ہو رہا ہے. اس کے چند شمارے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں. اس کے مضمون نگاروں میں عبدالقادر صاحب سروری. عبدالمجید صاحب صدیقی. عبدالرحمٰن خاں صاحب. عبدالقیوم خاں صاحب باقی. سید بادشاہ حسین صاحب خاص کر قابل ذکر ہیں. اسی طرح حصۂ نظم میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز. علی اختر صاحب. علی منظور صاحب. صفی اورنگ آبادی اور ماہر القادری کے نام جاذب توجہ ہیں. کتابت طباعت اچھی ہے. اگر یہی معیار قایم رہے اور مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں حسن ذوق کا لحاظ رکھا جائے تو یقین ہے کہ یہ رسالہ حیدر آباد کے اچھے اردو رسالوں میں شمار کیا جائے گا.

علم دولت از برج نارائن ایم اے ناشر لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور. یہ کتاب ایک ایسے پروفیسر صاحب نے لکھی ہے جو چھبیس سال سے اقتصادیات یا علم دولت پڑھاتے پڑھاتے اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ میں نے ساری عمر ضایع کی کیونکہ ہر سال جو سیکڑوں طالب علم علم دولت پڑھ کر پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں ان میں پروفیسر صاحب موصوف کے بیان کے مطابق شاید ایک بھی نہ نکلے جو انگریزی نہ جاننے والوں کو اپنا پڑھا ہوا پڑھا سکے یا سمجھا سکے. وہ کہتے ہیں کہ علم دولت انگریزی زبان میں پڑھا کر معلم اپنی عمر اور طلبہ کا وقت ضایع کرتے ہیں.

اس خیال کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ اردو کتاب مرتب کی ہے۔ جس کی نسبت ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر روزآنہ ایک گھنٹہ پڑھائی جائے تو تحتانیہ کی پہلی جماعت کے لڑکے دو مہینے میں بآسانی اس کتاب کو ختم کرلیں گے۔ انگریزی میں بھی مضمون پڑھانے کے لئے کم ازکم چھ مہینے درکار ہوں گے۔

شہنشاہیت | مترجمہ مظفر شاہ خاں ظفر۔ ناشر مکتبہ برہان نئی دہلی۔ یہ کتاب اصل میں جدید سرمایہ داری کی ایک مبسوط تاریخ ہے اور اس کے مصنف ضلع بجنور کے قومی کارکن گووند سہائے صاحب بی کام سابق پرائیوٹ سکرٹری وزیر مال حکومت یوپی ہیں۔ اب اس کو ہندی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔
اس میں مصنف نے یورپ کی سرمایہ داری کے نقائص بیان کئے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ سرمایہ دار ملکوں میں کس طرح محدود جماعتیں حکومت پر قبضہ کرکے بنی نوع انسان کو اپنا غلام بناتی اور دنیا بھر کے بازاروں پر قابض ہوکر اپنی ذات کے لئے عیش و آرام کے سامان مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں جتنی مختلف تحریکیں مثلاً فسطائیت۔ نازیت اور اشتراکیت وغیرہ کے ناموں سے جاری ہیں ان کی تاریخ بھی لکھ دی گئی ہے۔ اصل ہندی کتاب موجودہ جنگ سے پہلے قلم بند کی گئی تھی۔ اور اس میں مصنف نے اپنی وسیع معلومات کی بناء پر جنگ کی نسبت بہت سی پیشین گوئیاں کی تھیں جو صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔

تاریخ سعید | مولفہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب وکیل بنارس۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آنحضرت پیغمبر اسلام اور ان کے اہل بیت اور خلفاء نیز اولیا اور مشائخین کی تاریخہائے وفات درج کی گئی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے تھوڑے بہت سے حالات زندگی بھی ابتدا میں شریک ہیں۔ اکثر قطعات تاریخی خود مصنف کے نتائج فکر ہیں۔

جاہ و جلال | مترجمہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے۔ لکچرار گورنمنٹ کالج لاہور۔ کیرل چیپک چیکوسلوواکیہ کا مشہور ڈراما نگار تھا۔ جو ابھی ابھی ۱۹۳۹ء میں فوت ہوا ہے۔ اسی کے ایک ڈرامے پاور اینڈ گلوری کا یہ ترجمہ ہے جس کو پنجاب کے مشہور ادیب اور شاعر تبسم صاحب نے گورنمنٹ کالج کی ڈرامٹک کلب کے زیر اہتمام شایع کیا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی قوم کو اس آنے والے خطرے سے ڈرایا ہے جو بالآخر نازی حملے کی شکل میں چیکوسلواکیہ پر نازل ہوا اور اس دوبارہ غلامی کے صدمے سے خود مصنف کی وفات واقع ہوئی۔

ڈرامہ جاہ و جلال میں ہماری موجودہ سماج کے بنیادی محرکات کو واضح کرکے دکھایا گیا ہے اور اس عمرانی بحث و مباحث کے باوجود یہ ایک خشک علمی مقالہ نہیں بننے پایا۔ بلکہ اس میں ڈرامائی دلچسپیاں موجود ہیں۔ مترجم نے اپنے مسودے کی نظر ثانی لاہور کے دیگر مشہور ادیبوں مثلاً امتیاز علی تاج اور پروفیسر فیض احمد فیض سے بھی کرالی ہے۔

مدرسوں اور کالجوں کے طلبہ گورنمنٹ کالج ڈرامٹک کلب لاہور کی اجازت سے اس کھیل کو اسٹیج کرسکتے ہیں۔

گلبانگ آزادی | از نہال سہواردی ناشر مکتبہ برہان دہلی۔ یہ چھوٹی سی کتاب جناب نہال کی ان رباعیوں کا مجموعہ ہے جو صرف آزادی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک کی ردیف آزادی ہی رکھی گئی ہے۔ الفاظ کے تناسب ترکیب کی چستی اور تشبیہات و استعارات کی ندرت کی وجہ سے اس مجموعے کی اکثر رباعیاں نہایت دلچسپ اور پراثر ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ ایک ہی موضوع سے متعلق ہونے کے باوجود تمام رباعیوں میں شاعرانہ رنگ جھلکتا ہے۔

کارنامۂ پہلوی | از سید محمد حسن بلگرامی۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنو۔ مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی کو علم و فضل سے خاص شغف ہے۔ اس وقت تک ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اب باوجود ضعیفی اور آنکھوں سے معذوری کے انھوں نے اپنا سفر نامہ ایران کارنامۂ پہلوی کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس میں تینتیس ابواب ہیں اور ہر باب نہایت ہی ٹھوس اور مستند معلومات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس سفر نامہ کی ترتیب سے پہلے

ان تمام کتابوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے جو اس اثنا میں مملکت ایران پر لکھی گئی ہیں۔ اس طرح سے یہ کتاب اب محض سفرنامہ نہیں بلکہ جدید ایران کی ایک مستند اور مکمل تاریخ بن گئی ہے۔

شمس المعارف جلد چہارم مطبوعہ مرشد پریس دیوریہ۔ اس کتاب میں مولانا سید شاہ محمد سلیمان صاحب مرحوم کے مختلف خطوط شایع کئے گئے ہیں۔ جن میں سے اکثر تصوف و عرفان کے مسائل پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چونکہ اس عہد کے ایک نہایت ہی بلند پایہ اور صاحب کمال بزرگ کے خطوط ہیں اس لئے مذہبی مسائل سے لگاؤ رکھنے والے اصحاب کے حق میں ان کو نعمت غیر مترقبہ سمجھنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کتاب کی طباعت اور کاغذ موضوع کے شایان شان نہیں ہے۔ ق

دنیائے آرزو از مرزا ادیب بی اے ایڈیٹر مصور بمبئی حجم ۲۲۸ صفحے قیمت عہ پتہ نراین دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! یہ بڑی حسرت و یاس سے بھری دنیا ہے جو "سلیم" اور "شہاب" کی درد بھری افسانوی ڈائری اور "نالۂ دل" پر مشتمل ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیروزگاری کا حسرت ناک انجام پڑھنے والے کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔ یہ افسانے نہیں ہیں ہمارے تعلیم یافتہ بے کار نوجوانوں کی مصیبت کی داستانیں ہیں، وہ نوجوان جو تلاش روزگار میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور آخرکار بیروزگار رہ کر موت کی آغوش میں چین سے سو جاتے ہیں، اس ڈائری کا "نالۂ دل" پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں غلام ملک کے باشندوں کی زندگی کی لاجواب تصویریں ہیں، گداگری اور روحانیت پرستی پر خوب تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں کی شادی بیاہ کے اصول پر بھی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، غربت اور افلاس کی مختلف صورتوں کے ساتھ ساتھ قانون اور انصاف کی وہ مختلف شکلیں بھی بتائی گئی ہیں جو امیروں اور غریبوں کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا بہت درست ہے کہ "آج انصاف قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں ہے۔ حاکم کے قلم میں نہیں...... مذہب کا بنیادی اصول ہے انسانیت پرستی اور اہل مذہب کا سب سے پہلا اصول ہے انسانیت کو ذبح کرنا! مذہب کا پہلا سبق ہے دنیا کے ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھو اور موجودہ علمبرداران مذہب اپنے حقیقی بھائیوں کو بھی غیر سمجھ رہے ہیں"! دیہاتی زندگی کا بھی بہت اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پوری کتاب سبق آموز اور بصیرت افروز ہے، طرز نگارش اس قدر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں مرتبہ حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال حجم ۱۰۳ صفحے قیمت ایک روپیہ ناشر دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

اس کتاب کے پیش لفظ میں مرتب نے اپنی افسانہ نگاری کی داستان لکھی ہے اس کے بعد ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند، نیاز فتحپوری، ایم اسلم، سلطان حیدر جوش، جلیل قدوائی، مجنون گورکھپوری اور علی عباس حسینی وغیرہ نے افسانہ نگاری کے اپنے اپنے اصول اور طریقے لکھے ہیں اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ وہ افسانے کیونکر لکھتے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر افسانہ نگار اس کو پیش نظر رکھے۔

کملا مترجمہ راجہ مہدی علی خاں حجم ۲۳۱ صفحے قیمت مجلد عہ پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

یہ دلچسپ افسانہ بنگالی زبان کے مشہور ناول "باروادی" کا ترجمہ ہے جس کو راجہ مہدی علی خاں نے بڑی قابلیت سے کیا ہے اس ترجمہ کو بالکل اپنا لیا گیا ہے۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسری زبان کے ناول کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ ہر مترجم کو ترجمہ میں یہ خوبی پیدا کرنی چاہیے۔ اس ناول کو بنگال کے بارہ مشہور افسانہ نگاروں نے لکھا ہے اسلوب بیان اس قدر دلچسپ اور دلکش ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے تک چین نہیں پڑتا۔ بیچاری بے گناہ "کملا" پر ایک بد باطن شخص کی فتنہ پردازی کی وجہ سے سماج نے جو ظلم ڈھائے اور ستم توڑے ہیں اس کا اظہار بڑے دردانگیز اور رقت خیز پیرایہ میں کیا گیا ہے آخر میں صداقت کا بول بالا ہوتا ہے اور معصوم "کملا" کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ "س س"

نئی کتابیں

۱- کملا- (بنگالی ناول کا ترجمہ) از راجہ مہدی علی خاں- ۲۲۱ صفحے قیمت عہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور-
۲- دولتِ آصفیہ اور حکومت برطانیہ (نیا ایڈیشن) از ابوالاعلیٰ مودودی قیمت عہ کتاب خانہ- عابد روڈ-
۳- نقشِ اول (افسانے) از بیگم صالحہ عابد حسین ۲۳۲ صفحے قیمت عا- حالی پبلشنگ ہاؤس- دہلی-
۴- غریبوں کا بہشت (افسانے) مترجمہ آتش گوجرانوالیہ قیمت عسہ نرائن دت سہگل- لاہور-
۵- موت کا راگ (افسانے) از مرزا ادیب بی- اے قیمت عہ " " "
۶- ستارۂ صبح (افسانے) مترجمہ راجہ مہدی علی خاں قیمت عہ " " "
۷- رقاصہ (ناول) از شرت چندر چٹرجی قیمت عسہ " " "
۸- شمع دان (افسانے) مترجمہ راجہ مہدی علی خاں قیمت عہ " " "
۹- دنیا کی کہانی (بارہ ملکوں کی کہانیاں) قیمت ۱۰؍ پستک بھنڈار- لہریا سرائے- دربھنگہ-
۱۰- ننھوں کے دیس میں (گلیور کے سفر کے حالات) قیمت ۸؍ " " "
۱۱- شیطانی بوتل (جادو کی بوتل کی کہانی) قیمت ۶؍ " " "
۱۲- دنیا کے دس بڑے آدمی- قیمت ۸؍ پستک بھنڈار- لہریا سرائے- دربھنگہ-
۱۳- قیمت کے تیلے (بہادروں کے کارنامے) قیمت ۱۲؍ پستک بھنڈار- لہریا سرائے- دربھنگہ-
۱۴- ایجاد اور موجد (نئی ایجادوں کی تفصیل) قیمت ۹؍ " " "
۱۵- زندہ چین (کہانیاں) مترجمہ تمنائی قیمت عہ- نیا سنسار کتاب گھر- بانکی پور- پٹنہ-
۱۶- یورپ کا راون (ہٹلر کی سوانح) از لکشمن پرشاد ۱۸۰ صفحات نولکشور پریس- لکھنؤ-
۱۷- نشا (ڈراما) از کشن پرشاد کول ۲۱۰ صفحے " " "
۱۸- جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی- از شیخ رحمٰن بخش ۲۰۸ صفحے قیمت عہ- کتاب خانہ- حیدرآباد-
۱۹- گل خنداں (مزاحیہ مضامین) از آصف جہاں بیگم ۱۷۶ صفحے قیمت ۱۴؍ کتاب خانہ عابد روڈ-
۲۰- مسلمانانِ عالم (خلافت کی تاریخ) از کے- اے حمید- ۴۰۸ صفحے علمی پرنٹنگ پریس لاہور-
۲۱- موٹر وہیکلز ایکٹ بابتہ ۱۹۳۹ء مترجمہ لنت کمار ۹۶ صفحے- دین محمدی پریس- لاہور-
۲۲- دستاویز نویسی (تیسرا ایڈیشن) از بنالال ۶۵۰ صفحے- سلیمی پریس- الہ آباد-
۲۳- مجربات سیوطی از جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی ۲۴۰ صفحے- حجازی پریس- لاہور-
۲۴- خزانۂ طلسمات (تیسرا ایڈیشن) از ڈاکٹر گنیش داس چوپڑا ۲۴۰ صفحے- حجازی پریس- لاہور-
۲۵- ہوبیز از سید رضا احمد جعفری ۲۴۳ صفحے- مسلم پرنٹنگ پریس- لاہور-
۲۶- سحر سامری- از پنڈت سادھو رام ۲۴۴ صفحے- حجازی پریس- لاہور-

مرزا سیف علیخاں

ادارہ کی خبریں

مجلسِ انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس یکشنبہ ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو منعقد ہوا جسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس معتمد فینانس ممالک محروسہ سرکار عالی۔ نائب صدر ادارہ

مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم ایس سی۔ بی اے آنرز۔ منصرم ناظم تعلیمات سرکار عالی۔

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات سرکار عالی۔

مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی۔ شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ منشی فاضل۔ مددگار ناظم رجسٹریشن و اسٹامپس۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ معتمد ادارہ۔

(۱) ادارہ کے سرپرست نواب معین الدولہ بہادر کی وفات پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

(۲) امتحان اردو زبان دانی کے قیام کے لئے مجلس اردو امتحانات کی تجویز منظور کی گئی۔

(۳) اردو انسائیکلو پیڈیا کی مجلس انتظامی کے مجوزہ قواعد و ضوابط منظور کئے گئے اور ان کی اشاعت کی اجازت دی گئی۔

(۴) اردو انسائیکلو پیڈیا کی طباعت کے انتظامات کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ ٹائپ میں چھاپنا بہتر ہے۔

(۵) ۱۹۴۰ء کے حسابات آمد و خرچ پیش ہوئے جن کو بعد تنقیح شایع کرنے کی اجازت دی گئی۔

(۶) ادارہ کے شعبۂ نسوان کی طرح شعبہ جات اردو انسائیکلو پیڈیا، ادبیات اطفال اور اردو امتحانات کی رقموں کو جدا جدا کھاتوں میں منتقل کرنے اور ڈپازٹ وغیرہ کے تصفیے کئے گئے۔

(۷) اردو امتحانات کے نتائج پیش کئے گئے اور جلسہ تقسیم اسناد کے متعلق انتظامات کی منظوری دی گئی۔

(۸) نئی شاخوں کے قیام کی منظوری دی گئی۔

(۹) زیر طبع کتب کی اشاعت کی اجازت دی گئی۔

شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا

یہ شعبہ سرگرمی کے ساتھ مصروف ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ پہلی جلد جو الف ممدودہ کے الفاظ اور اصطلاحوں پر مشتمل ہے جلد شایع ہو سکے۔ اس کی طرف سے اردو انسائیکلو پیڈیا کے قواعد و ضوابط کتابی صورت میں شایع کئے گئے ہیں جو جملہ معاونین و سرپرستین کی خدمت میں بغرض اطلاع روانہ کئے جا رہے ہیں۔ اس میں مجالس ادارت (ایڈیٹوریل بورڈز) اور قلمی معاونین کی فہرستیں جملہ مجالس کے قواعد اور طریقۂ کار اور معاونین و مبصرین کے معاوضے اور دیگر ضروری معلومات شامل ہیں۔

مجلس قانون

اُردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبہ قانون کا اجلاس چہارشنبہ ۱۲ر نومبر ۱۹۴۱ء گیارہ بجے منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

جسٹس ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ایم اے ایل ایل ڈی۔ رکن ہائی کورٹ۔

جسٹس راجہ بہادر بشیشور ناتھ بی اے ایل ایل بی۔ رکن مجلس وضع قوانین۔

ڈاکٹر میر سیادت علی خاں ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔ بی سی ایل۔ سٹی مجسٹریٹ حیدر آباد۔

پنڈت سری پت راؤ صاحب بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ۔

مولوی عبداللہ صاحب تماپوری ایڈوکیٹ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی۔

مولوی سید بادشاہ حسین صاحب معتمد اردو انسائیکلوپیڈیا۔

نواب عسکر یار جنگ بہادر بی اے بیرسٹرایٹ لا۔ معتمد مجلس وضع قوانین نے بذریعہ تحریر شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

(۱) دھرم شاستر کے متعلق الفاظ کی فہرست مرتبہ راجہ بہادر بشیشور ناتھ پیش کی گئی اور مقالوں کی تقسیم عمل میں آئی۔

(۲) قانون انتقال جائداد کی فہرست بھی پیش کی گئی۔ اور طے پایا کہ انتقال جائداد پر ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب مقالہ لکھیں گے۔

(۳) نواب ناظر یار جنگ بہادر نے قانونی لغت مرتبہ سرسید احمد خاں مرحوم پیش کی اور تصفیہ پایا کہ اس لغت سے ضروری الفاظ منتخب کرکے راجہ بشیشور ناتھ بہادر مکمل فہرستیں تیار کریں۔

(۴) طے پایا کہ راجہ بشیشور ناتھ بہادر اور مولوی عبداللہ صاحب تماپوری کی فہرستیں وصول ہونے کے بعد تقسیم کار کے لئے کمیٹی طلب کی جائے۔

بیگم بہادر یار جنگ بہادر میڈل

ادارہ ادبیات اردو کے امتحان اردو عالم میں اول آنے والی طالبہ کے لئے محترمہ بیگم صاحبہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے جنھیں نسوانی فلاح و بہبود اور علمی ترقی سے خاص دلچسپی ہے ایک طلائی تمغہ عطا فرمایا ہے۔ جو ادارہ کے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں دیا جائے گا۔

کتب خانۂ ادارہ

ادارہ کا کتب خانہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ متعدد علم دوست اصحاب قلمی اور نادر مطبوعہ کتابیں بطور عطیہ روانہ کر رہے ہیں۔ راجہ دلسکھ رام صاحب بی ایس سی آنرز افسر انچارج بمیہ سرکار عالی و معتمد اعزازی مدرسہ مفید الانام نے پچپن مطبوعہ قدیم کتب از راہ علم دوستی عطا فرمائیں۔

مولوی محبوب علی خاں صاحب نے مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج کے توسط سے ایک قلمی دیوانِ ناسخ لکھنوی بطور عطیہ روانہ کیا۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے حسب ذیل قلمی کتب عطا فرمائیں۔

۱۔ انتخاب کلام مرزا نصیر۔ سودا۔ صاحبقراں۔ صاحب۔ یقین۔ یک جلد

۲۔ نظم انور۔ تنا دلی۔ دریک جلد

۳۔ ایمان درپن یک جلد

۴۔ مثنوی شہزادہ ماہ عالم بلا جلد

۵۔ چہار درویش منظوم یک جلد

۶۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام مجلد

۷۔ ست گرو پرشاد مجلد

۸۔ بھاگوت گیتا کا انتخاب بلا جلد

۹۔ نظم از بہادر اولیا حسینی بلا جلد
۱۰۔ قصہ بادشاہ روم رمضان شاہ بلا جلد
۱۱۔ کلام عاشق بلا جلد
۱۲۔ مناقب عادل بلا جلد
۱۳۔ سالوتر نامہ۔ نصاب العارفین حسینی بادشاہ فارسی محتشم وہ مجلس فارسی عقائد مولانا فارسی۔ رسالہ عقائد رسالہ اردو۔ فارسی نثر یک جلد از حسینی بادشاہ وغیرہ۔
۱۴۔ غزلیات عجز۔ بلا جلد

وزارت معارف سلطنت کابل نے ایک کتاب "دکابل کالنی" ۱۳۱۹ بطور عطیہ روانہ کی ہے۔

ان سب معطین کا ادارہ کی طرف سے نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیر دار ناظم اعزازی کتب خانہ بطور خاص شکریہ ادا کرتے ہیں۔

شاخیں

ادارہ کی شاخیں اردو زبان کو دور دور دیہات اور اضلاع میں پھیلانے کے لئے قابل اطمینان جد و جہد کر رہی ہیں۔

شاخ گلبرگہ

اس شاخ کے نئے معتمد مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے اپنے شرکار کار مولوی نصیر الدین صاحب بی اے لکچرار اور نیاز علی خاں نیاز اردو عالم کے ساتھ مولوی جمیل حسین صاحب ایچ سی ایس اول تعلقدار گلبرگہ اور مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل کی اعانت سے گلبرگہ اور اس کے اطراف واکناف میں اردو کی توسیع واشاعت اور ادارہ کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ نواب غوث یار جنگ بہادر سابق صوبہ دار گلبرگہ نے جو اس شاخ کے سرپرست تھے اس شاخ کی صحیح معنوں میں سرپرستی فرمائی اور اپنی روانگی سے قبل اس کو اس قابل بنا دیا کہ اس کا کام اطمینان کے ساتھ جاری رہ سکے جس کے لئے منجانب ادارہ ان کا پر خلوص شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

گلبرگہ کے حال صوبہ دار مولوی امیر علی خاں صاحب ایچ سی ایس کو بھی ادارۂ ادبیات اردو سے خاص دلچسپی ہے اور انھوں نے گلبرگہ پہنچتے ہی اس شاخ کی نگرانی وسرپرستی کا کام شروع کر دیا ہے۔ توقع ہے کہ ان کی ذاتی ہمدردی اور تعلق اور مولوی جمیل حسین صاحب اول تعلقدار کی دلچسپیوں کی وجہ سے یہ شاخ اور بھی ترقی کریگی۔ اور اس کے لئے گلبرگہ میں ایک مستقل مکان بھی فراہم ہو جائے گا۔

نواب غوث یار جنگ بہادر کے وداعی جلسہ میں مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے نے شاخ کی طرف سے تقریر کی اور نواب صاحب کو پھول پہنائے۔ نواب صاحب نے طلبہ اور معززین گلبرگہ کے ہمراہ ختم جلسہ پر شاخ کا معاینہ فرما کر اس کے انتظامات کے بارے میں خوشنودی کا اظہار فرمایا اور اس شاخ کو پچاس روپے اور ادارہ کی ایک دوسری شاخ واقع محلہ رو شنتین گلبرگہ کو بیس روپے بطور عطیہ عنایت کئے۔

تمغے

مرکز گلبرگہ سے اردو امتحانات میں اول آنے والے امیدواروں کو حسب ذیل اصحاب نے نقروی تمغے عطا فرمائے ہیں جن کا ادارہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

اردو فاضل۔ نواب غوث یار جنگ بہادر۔

اردو عالم۔ مولوی احمد محی الدین صاحب انصاری ایچ۔سی۔ایس۔ زائد ناظم صدر عدالت گلبرگہ۔

اردو دانی۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب بی ایس سی مددگار مہتمم تعمیرات وآبپاشی گلبرگہ۔

یوم ادارہ ومشاعرہ

شاخ گلبرگہ ۱۵ اور ۱۶ ڈسمبر ۱۹۴۱ء کو مولوی امیر علی خاں صاحب صوبہ دار کی صدارت میں بہ مقام ٹاؤن ہال گلبرگہ ایک عالیشان مشاعرہ اور یوم ادارہ منا رہی ہے۔ اس کے لئے حیدرآباد سے مشاہیر شعرا اور ادبا کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ جلسہ گلبرگہ کے شایان شان ثابت ہوگا کیونکہ مولوی جمیل حسین صاحب اول تعلقدار اور مولوی امیر علی خاں صاحب صوبہ دار اور مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی

پرنسپل کی علم دوستی اس کو کامیاب بنانے کی ضامن ہے۔

شاخ روضتین

گلبرگہ کے محلۂ روضتین میں ایک انجمن ترقی نوجوانان تین چار سال سے کام کر رہی تھی جس کے صدر مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) ناظم اسٹیٹ روضتین اور معتمد مولوی نیاز علی خاں صاحب نیاز اردو عالم ہیں اس انجمن نے اپنی ایک خاص عمارت بھی تعمیر کرلی ہے۔ اب یہ انجمن ادارہ کی شاخ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس میں ایک کتاب خانہ بھی ہے جو صدر انجمن کا عطیہ ہے۔ یہاں اردو امتحانات کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے لئے مولوی ذو الفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ کالج نے اردو دانی کی کتابیں اور شاخ گلبرگہ نے قلمیں اور دواتیں عطا کی ہیں۔ اس شاخ کو کامیاب بنانے میں حسب ذیل علم دوست بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔

عبد الغفور صاحب صیغہ دار صوبہ داری۔ محمد حبیب اللہ صاحب شیدائی۔ محمد اسحاق صاحب بی ایس سی مددگار مدرسہ وسطانیہ مومن پورہ۔ عبد الرحمن صاحب بھنڈاری۔ عثمان علی صاحب ساہو۔

شاخ چیتاپور

ماہ اکتوبر میں چیتاپور کے علم دوست اصحاب کو شاخ کے قیام کی اجازت دی گئی چنانچہ وہاں جو شاخ قایم ہوئی ہے اس کے صدر مولوی عبد القادر صاحب تحصیلدار اور معتمد مولوی محبوب خاں صاحب یوسف زئی بی اے ڈپٹی ایڈ ہیں۔ توقع ہے کہ یہ شاخ بھی ادارہ کی دوسری شاخوں کی طرح اردو کی تبلیغ و اشاعت میں کامیابی حاصل کرے گی۔ اس شاخ نے ۱۰ ستمبر کو ایک غیر معمولی جلسہ منعقد کرکے ڈاکٹر ٹیگور اور فانی مرحوم کی وفات پر قرارداد تعزیت منظور کی۔ اس شاخ میں حسب ذیل اصحاب دلچسپی لے رہے ہیں۔

مرزا قطب الدین بیگ صاحب۔ محمد شہاب الدین صاحب۔ عبد الکریم صاحب۔ عبد الجلیل صاحب۔

دوسری شاخیں

بشیر آباد، شاہ آباد، اور عادل آباد میں بھی ادارہ کی شاخیں قایم ہو رہی ہیں جن کی نسبت آئندہ مہینے تفصیلی معلومات شریک کی جائیں گی۔ شاہ آباد کی شاخ سید محمد نور الحسن صاحب انور اردو فاضل کی کوششوں سے انشاء اللہ بڑی کامیاب رہے گی۔

شعبۂ طلبہ ۱۹۴۱ء میں

اپریل اور مئی کی گرمائی تعطیلات میں بعض اراکین نے اضلاع پر شاخوں کے قیام کی کوشش کی چنانچہ کلیانی، گلبرگہ، پرلی وغیرہ میں شعبہ طلبہ کی شاخیں قایم ہو گئیں مدرسوں کے کھلنے کے بعد اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔

حسب ذیل طلبہ نے رکنیت قبول کرلی۔ محمود علی، مرغوب الدین، مسیح الدین خاں متین، محمود علی اکبر شیر، مظفر علی خاں، عارف علی خاں، عبد المنعم، حشمت اللہ خاں، سید محمد نور الحسن، انور شاہ آبادی، محمد قطب الدین (گلبرگہ)، محمد عبد الوحید، قاضی حمید الدین، محمد عبد الصمد، سید اکرام حسین، عبد المجید قریشی، عزیز احمد، قطب الدین (خانہ علم) نیاز علی خاں، محمود احمد انصاری، عبد الحمید خاں، عمر خاں، عبد الرشید، خواجہ معین الدین فائز، منظور احمد، عبد الرشید حالی، معین الدین، عبد الغنی، منہاج الدین، عبد المجید، خواجہ معین الدین ارشد، امین الدین، محمد حسن مسعود، عبد اللطیف، بدیع الدین، یوسف حسن، فاروق حسین، حبیب الرحمن، حامد بن احمد۔ سید حسن سجاد ابو ظفر محی الدین۔ شریف الحسن، ضمیر الدین، محمد عزیز الدین، مظہر حسین وغیرہ۔

۱۹ خورداد کو مادر دکن کا تعزیتی جلسہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قرارداد تعزیت سب رس میں اور مقامی اخباروں میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد شعبہ کے نئے سال کے لئے عہدہ داران و ارکان مجلس انتظامی کے انتخابات عمل میں آئے۔

نائب صدر ـــــ محمود علی　　معتمد ـــــ مرغوب الدین　　نائب معتمد ـــــ مظفر علی خاں

اراکین مجلس انتظامی :- معین الدین احمد انصاری، شیخ رحیم الدین ظہیر آبادی، مسیح الدین خاں متین، محمود علی اکبر شیر، حشمت اللہ خاں، عبد المنعم، عارف علی خاں

جائزہ لینے کے بعد شعبہ نے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ اس سال شعبہ کے معمولی جلسہ (۴) غیر معمولی (۳) اور مجلس انتظامی کے (۵) جلسے ہوئے جلسوں میں طلبہ کی کافی تعداد رہی۔ ایک تحریری مقابلہ بھی منعقد ہوا جس کے لئے چار عنوان مقرر کئے گئے تھے۔

(۱) سائنس اور دنیا کا مستقبل (۲) ضرورت ایجاد کی ماں ہے (۳) میرا مستقبل (۴) میرا محبوب شغلہ۔

بلدہ کے علاوہ اکثر اضلاع خصوصاً گلبرگہ وغیرہ سے بہت سے مضامین وصول ہوئے۔ اس مقابلہ میں شہاب الدین خاں اول رہے۔ اس کے بعد دو معمولی جلسے ہوئے اور گزشتہ سال کی طرح ۱۲ نومبر کو ایک تقریری مقابلہ منعقد ہوا۔ مدرسوں کی جانب سے ۱۸ طلبہ کی ۹ ٹیموں نے اس مقابلہ میں شرکت کی۔ یہ جلسہ ۱۲ نومبر کو احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں ۵½ بجے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک گھنٹہ قبل عنوان کا اعلان کیا گیا۔ ذیل کے دو عنوانوں میں سے کسی ایک پر تقریر کرنی تھی۔

(۱) ترقی کے لئے دولت سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔

(۲) دنیا کو شاعروں سے زیادہ سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔

اس مقابلہ میں مختلف مدرسے مثلاً دار العلوم، سٹی کالج، مدرسہ عالیہ، آل سنٹس، مفید الانام، دار الشفاء، گوشہ محل، مدرسہ آصفیہ کے نمایندے شریک تھے۔ حاضرین کی تعداد اتنی تھی کہ بہت سوں کو کھڑا رہنا پڑا۔ مولوی سید محمد صاحب اور مولوی حمید الدین صاحب شاہد نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔ محمود علی نائب صدر نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی۔ اور رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی سابق نائب صدر نے فن تقریر اور فی البدیہہ مقابلوں اور شعبہ کی نسبت تقریر کی۔ مقابلہ کا نتیجہ حسب ذیل ہے۔

(۱) مدرسہ مفید الانام اول (۲) دار العلوم دوم انفرادی طور پر حبیب الرحمن (مفید الانام) اول اور غلام یزدانی (سٹی کالج) دوم آئے۔

ادارہ کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں اول آنے والے مدرسہ کو کپ اور اول و دوم آنے والے طلبہ کو کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

اضلاع پر شعبہ کے قیام کی کوششیں مختلف طلبہ نے کی خصوصاً انور شاہ آبادی (گلبرگہ) قابل مبارکباد ہیں کہ وہ شعبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہم کو جو اطلاعیں اور روئدادیں وصول ہوئیں وہ ذیل میں درج ہیں۔

شاخ گلبرگہ

۲۶ خورداد سنہ ۴۹ف کو شعبہ طلبہ کے انتخابات عمل میں آئے جو حسب ذیل ہیں:۔

صدر۔ نیاز علی خاں ـــ نائب صدر۔ محمود احمد انصاری ـــ معتمد۔ نور الحسن شاہ آبادی ـــ نائب معتمد۔ عبد المجید خاں۔

اراکین۔ محمد عمر خاں، عبد الرشید سہروردی، خواجہ معین الدین فائز، منظور احمد، عبد الرشید، معین الدین، عبد الحمید، معین الدین ارشد۔

اس کے بعد بہت سے جلسے ہوئے جس میں دلچسپ عنوان پر طلبہ نے تقریریں کیں جن کی تفصیل سب رس کے گزشتہ پرچوں میں چھپ چکی ہے۔ اس شاخ نے اپنا ایک نظام نامہ بنایا ہے جو درج ذیل ہے۔ دوسری شاخوں کو بھی ایسے ہی نظام نامے بنا کر کام کرنا چاہیے۔

نشان سلسلہ	تاریخ	وقت	نوعیت جلسہ	موضوع	مقرر
۱	۵ آذر	۱۰ ساعت صبح	انعامی تحریری مقابلہ	فی البدیہہ	
۲	۲۲ آذر	۴ ساعت شام	غیر معمولی	فن مباحثہ	مولوی محمد بن عمر صاحب لکچرار
۳	۳ دے	"	" مباحثہ	تقریر تحریر سے بہتر ہے۔	

نمبر	تاریخ	وقت	نوعیت	موضوع	لکچرار
۴	۱۰ اردی	۴ ساعت شام	غیر معمولی	صنعتی کیمپ	مولوی وزیر احمد صاحب قریشی لکچرار
۵	۱۷ اردی	"	انعامی مباحثہ	تدریجی ترقی فوری تبدیلی سے بہتر ہے	
۶	۲۴ اردی	"	غیر معمولی	مذہب و سائنس	حافظ مولوی محمد حامد صاحب صدیقی لکچرار
۷	۶ بہمن	"	مباحثہ	تعلیمی ترقی کے لئے امتحانات غیر ضروری ہیں	
۸	۷ اسفندار	"	غیر معمولی	موجودہ جنگ کے معاشی مسائل	مولوی احمد عبدالعزیز صاحب لکچرار
۹	۱۴ "	۱۰ ساعت صبح	انعامی تحریری مقابلہ	اردو کی ترقی میں دکن کا حصہ	
۱۰	۴ فروردی	۴ ساعت شام	غیر معمولی	اقبال کا فلسفۂ خودی	مولوی محمد بن عمر صاحب لکچرار
۱۱	۱۲ "	"	مباحثہ	موجودہ تعلیم ناقص ہے	
۱۲	۱۹ "	"	غیر معمولی	اردو شاعری کے جدید رجحانات	مولوی نصیر الدین صاحب نظامی لکچرار
۱۳	۲۶ "	۹ ساعت شب	مشاعرہ	طرحی	
۱۴	۲ اردی بہشت	۴ ساعت شام	تعلیمی تفریح		
۱۵	۸ "	"	غیر معمولی	ٹیگور کی شاعری	مولوی سید محمد نورالحسن صاحب

(The page prints no column headings; the headings above were added.)

شاخ پرلی

ایک جلسہ ۳ ردے ۱۳۵۲ف محمد فخرالدین صاحب منشی فاضل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس دن "شہری زندگی دیہاتی زندگی سے بہتر ہے" کی موافقت اور مخالفت میں سعید الدین صدیقی، مظہر حسین، خیرالدین، عزیزالدین، ابوظفر محی الدین، شریف الحسن نے تقریریں کیں۔

دوسرا جلسہ ۱۰ ردے کو حکیم مولوی فخرالدین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محی الدین صدیقی نے گزشتہ جلسہ کی روئداد سنائی اور قرأت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ شریف الحسن، محمد خیرالدین، محمد سعید الدین صدیقی، عزیزالدین نے "ملازمت سے تجارت بہتر ہے" پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس شعبہ کا کام محمد عزیزالدین قریشی نائب صدر، ابوظفر محی الدین معتمد، اور سعید الدین صدیقی خازن نہایت محنت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ پرلی میں طلبہ برادری کو مستحکم کرنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

گلبرگہ میں فی البدیہہ انعامی تحریری مقابلہ

شعبہ طلبہ شاخ گلبرگہ کا ایک انعامی تحریری مقابلہ بتاریخ ۵ ر آذر ۱۳۵۱ف بوقت ۱۰ ساعت صبح منعقد ہوا۔ موضوع کا اعلان اسی وقت کیا گیا اور (۱½) گھنٹہ وقت دیا گیا۔ موضوع کا عنوان تھا "کسی ملک کی ترقی کے لئے ادبی ترقی نہایت ضروری ہے"۔ تقریباً ۲۰ طلبہ نے شرکت کی۔ نتیجہ حسب ذیل رہا۔

غلام محی الدین خاں اول (مستحق انعام مولوی سعید الدین صاحب لکچرار گلبرگہ کالج) فتح اللہ عثمانی - دوم (مستحق انعام مولوی محمد بن عمر صاحب لکچرار گلبرگہ کالج)

شعبۂ طلبہ گلبرگہ کی مجلس انتظامی

بتاریخ ۱۸ ردے ۱۳۵۱ف شعبہ طلبہ کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ زیر صدارت مولوی محمد بن عمر صاحب معتمد شاخ ادارۂ ادبیات اردو منعقد ہوا جس میں مباحثوں اور تقاریر وغیرہ کا نظام نامہ مرتب کیا گیا۔ اور طے پایا کہ اس سال کی مجلس انتظامی

حسب ذیل عہدہ داران و ارکان پر مشتمل ہوگی۔

صدر۔ جناب مولوی محمد ابن عمر صاحب معتمد ادارۂ ادبیات اردو گلبرگہ۔ نائب صدر۔ محمد نیاز علی خاں نیاز۔ معتمد۔ سید محمد نور الحسن شاہ آبادی۔ نائب معتمد۔ مسعود انصاری۔

اراکین :۔ وحید الدین احمد۔ شیخ محبوب علی۔ پی۔ جی دیسائی۔ عبد الحفیظ۔ سری راماچاری۔ قاضی حمید الدین۔ غلام محی الدین خاں۔

شعبہ طلبہ کا غیر معمولی جلسہ بتاریخ ۱۱ر دے ۱۳۵۱ف ایک غیر معمولی جلسہ بوقت ۵ ساعت شام بہ مقام دفتر شاخ ادارہ زیر صدارت جناب مولوی محمد بن عمر صاحب منعقد ہوا۔

جناب صدر نے مولوی محمد وزیر احمد صاحب قریشی لکچرار کا تعارف کرایا اور موصوف کی تقریر کا اعلان کیا۔ فاضل مقرر نے "صنعتی کیمیا" پر ایک پُر از معلومات تقریر فرمائی۔ پہلے علم سائنس اور کیمیا کی تعریف کی اور پھر کیمیا کی درجہ بدرجہ ترقی کا ذکر کیا۔ صنعتی کیمیا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سنہ ۱۸۹۲ء تک انگلستان میں علم کیمیا سے حقیقی طور پر استفادہ کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ یہ خیال سب سے پہلے جرمنوں کو ہوا۔ اس سلسلہ میں صنعتی کیمیا کے فوائد اور ترقی کے متعلق نہایت لبسیط تقریر فرمائی۔ اگرچہ مضمون خشک تھا مگر فاضل مقرر نے اس کو اپنے پیرایۂ بیان سے بہت دلچسپ بنا دیا۔ اور مسلسل ایک گھنٹہ تقریر کی۔

معتمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور فاضل مقرر کا بھی جنھوں نے باوجود مصروفیات کے اپنا قیمتی وقت ہمارے لئے دیا۔ ۶ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

شاخ کلیانی حسب سال گذشتہ امسال بھی کلیانی میں عرس حضرت راجہ شیر سوار رحمۃ اللہ علیہ کے موقع پر درگاہ شریف کے متصل دار المطالعہ قائم کیا گیا تھا تاکہ زائرین اس سے مستفید ہوں قیام دار المطالعہ کے سلسلہ میں مولوی غلام معین الدین صاحب معین رکن تشہیر، مولوی محمد علی صاحب اردو عالم اور معتمد و اراکینِ شعبۂ طلبہ بہت مصروف رہے۔ یہ اشخاص اگر اپنا عزیز وقت شاخ ہٰذا کے لئے موقف نہ کرتے تو دار المطالعہ کا قیام مشکل ہو جاتا۔ شاخ ان کی اس غیر معمولی خدمت کی دل سے قدر کرتی ہے۔ اور امید رکھتی ہے کہ آیندہ بھی وہ اسی طرح شاخ کے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔

دار المطالعہ کے لئے ایک جدید بورڈ تیار کیا گیا ہے اس میں جدت یہ کی گئی ہے کہ اس کو سب رس کے ٹائٹل کے مشابہ بنایا گیا ہے شاخ ہٰذا مولوی میر ظہیر الدین صاحب ہاشمی کی ممنون ہے کہ انھوں نے نہایت نفاست سے اس کو سب رس کے ٹائٹل کے مطابق بنایا۔

نواب سید محمد جلال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہٗ والئی اسٹیٹ کلیانی و سرپرستِ شاخ اردو کے بڑے حامی ہیں اور عرس شریف کے موقع پر شاخ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے آپ کی زیرِ صدارت ایک مشاعرہ منعقد ہوا جو نہایت کامیاب اور پُر لطف رہا اس میں تقریباً ۳۰ شعراء نے حصہ لیا بعض شعراء کو نواب صاحب ممدوح نے انعامات سے بھی سرفراز فرمایا اور مشاعرہ کے جملہ اخراجات جیب خاص سے مرحمت فرمائے۔

اس مشاعرہ کے لئے حسب ذیل طرحی مصرعے تجویز کئے گئے تھے۔

(۱) دیوانہ کو دیوانہ بنانے کے دن آئے　　(۲) پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے۔

نواب صاحب بہادر کی غزلیں خاص طور پر پسند کی گئیں۔

امسال جدید امتحان کا جو اضافہ ہوا ہے اس کی بے حد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اردو دانی اور اردو عالم کے درمیان کوئی امتحان نہ ہونے سے اردو دانی کے کامیاب طلبہ دوسرے سال اردو عالم میں شرکت نہیں کر سکتے تھے اب ان کا بڑھتا ہوا علمی ذوق مجوزہ امتحان سے پورا ہو سکے گا۔

شاخ پربھنی معتمد صاحب شاخ ادارۂ ادبیات اردو پربھنی اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ " اس ماہ شاخ پربھنی میں بڑی سرگرمی اور چہل پہل رہی سال حال شاخ ہذا سے کثیر تعداد میں امیدواروں کو امتحان میں شریک کرایا جارہا ہے جس کے لئے منظم کوششیں جاری ہیں اردو دانی اور اردو عالم کے درس باضابطہ ہورہے ہیں۔ تعلیم بالغان کی طرف اس مرتبہ خاص توجہ کی جارہی ہے اور امتحان اردو دانی کے لئے ایسے لوگوں کو تیار کیا جارہا ہے جن کی عمریں ۲۵ سال سے ۵۰ سال تک کی ہیں۔ اسی ماہ مولوی ابوالحسن صاحب صوبہ دار اورنگ آباد، مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے مددگار اعلادشمار اور جناب ماہر القادری صاحب وغیرہ نے شاخ کا معاینہ کرکے اظہار خوشنودی فرمایا۔ مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری شاخ ہذا میں ایک ریڈیو نصب کرانے کے لئے کوشاں ہیں تاکہ ہمارے طلبہ کی ذہنی تفریح بھی ہوسکے۔ ہم ڈسمبر میں شاخ کا سالانہ جلسہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس جلسہ کی صدارت کے لئے ہم عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد اعزازی ادارہ سے درخواست کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ اس کو قبول فرمائیں گے۔

اخباروں میں اردو سوسائٹی کے قیام کی اطلاع پڑھی نہ معلوم لوگ کیوں بلا وجہ اس قسم کی سوسائٹیاں اور ادارے قائم کرتے ہیں۔ اب ہم سب کو ادارۂ ادبیات اردو کے تحت اردو علم و ادب کی خدمت انجام دینا چاہیے۔ جلسہ کا پروگرام عنقریب روانہ کیا جائے گا۔"

حیاتِ میر محمد مومنؔ پر ہندوستان کے مشہور رسائل کی رائیں

حضرت میر محمد مومن کی حیات اور ان کے علمی اور سیاسی کارنامے تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ مشہور تصاویر بھی کتاب کی زینت ہیں۔ میر محمد مومن سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم تھے۔ آپ کی زندگی کے حالات دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر مولف ایسے مصلح درویش صفت اور بہر جہت لائق وزیر اعظم کے حالات کو تاریکی میں رکھتا تو یقیناً میر صاحب پر بڑا ظلم ہوتا اور یہ بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس وقت تک کے مورخین نے ایسی باکمال ہستی کے حالات کو منظر عام پر لانے میں جس بخل کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ افسوس ہے۔

ادب اردو کو ممنون ہونا چاہیے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا کہ ان کی تحقیق و تجسس نے اردو کتب خانہ کو ایک انمول جواہر پارہ حیات میر محمد مومن کی صورت میں عطا کردیا۔

لائق صد ستائش ہے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی یہ کوشش کہ وہ میر محمد مومن جیسی ہستیوں کے حالات کو منظر عام پر لارہا ہے۔ یقین کہئے اگر ہمارے سیاسی رہنما ایسی کتب سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں تو ہندوستان میں پھر وہی امن اور بحالی نظر آسکتی ہے جو اس ملک کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور بھلائی نہیں جاسکتی۔ **رسالہ ہل** ماہ نومبر ۱۹۴۱ء

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ آپ انہی صفحات میں ڈاکٹر زورؔ کی ایک نہایت ہی اہم کتاب "محمد قلی قطب شاہ" کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ جن لوگوں نے اس کتاب کو پڑھا ہوگا اغلب ہے کہ ان کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا ہو۔ محمد قلی قطب شاہ جن سماجی تمدنی اور علمی ادبی باتوں میں اپنے دوران حکومت میں دلچسپی لیتا رہا ان کے لئے اس کے پاس وقت کہاں سے آیا کہ وہ اپنی شعر و شاعری اور رنگ رلیوں کے باوجود اپنے زمانہ حکومت کو ایک پرامن اور خوشحال عہد کیونکر بناسکا۔ ڈاکٹر زورؔ کی زیر نظر تالیف اسی بات کا جواب ہے۔ میر محمد مومن محمد قلی قطب شاہ کا وزیر اعظم تھا اور یہ اسی کے مدبرانہ حسن انتظام کا نتیجہ تھا کہ محمد قلی کا دور ایک مثالی زمانہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی روایتی تحقیق اور دلچسپ انداز بیان سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کے بعد اس کے لائق وزیر سے بھی ہمیں شناسا کیا ہے۔ **ادبی دنیا** ماہ اکتوبر ۱۹۴۱ء